یٰاَهْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ

الخطبات الاحمدیہ

فی

العرب والسیرة المحمدیہ

من تصنیف

جناب فضیلت انتساب حکیم الامت و ملجائے ملت جوادالدولہ عارف جنگ

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں صاحب بہادر

کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، ایل۔ ایل۔ ڈی، ایف۔ آر۔ ایس،

بانئے مدرسۃ العلوم للمسلمین علیگڈھ

جس کو

ملک فضل الدین ملک چنن الدین ملک تاج الدین ککے زئی، تاجران کتب قومی

منزل نقشبندیہ

کوچہ ککے زیاں ——— بازار کشمیری

لاہور

نے

مسلم پرنٹنگ پریس لاہور میں حافظ غلام قادر کے اہتمام سے چھپوایا

خطبات
سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

المعروف بہ خطبات الاحمدیہ

مشہور مستشرق ولیم میور کی طرف سے آنحضرتؐ
پر کئے جانے والے اعتراضات کے مدلل ومحققانہ جوابات

سرسیّد احمد خاں

تعارف مولانا الطاف حسین حالیؔ

دوست ایسوسی ایٹس

ناشران وتاجران کتب

الکریم مارکیٹ اردو بازار، لاہور

Phone : 7122981 Fax : 092-42-7122981



بانی ادارہ:
پروفیسر رفیع اللہ شہاب (مرحوم)

محمد شاہد عادل نے
جی-ایف-پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر
دوست ایسوسی ایٹس الکریم مارکیٹ، اُردو بازار
لاہور سے شائع کی-
قیمت عام ایڈیشن: 225.00روپے
اعلیٰ ایڈیشن: 450.00روپے

فہرست مضامین کتب خطبات الاحمدیہ

پیش لفظ ____ 9

خطبات سیرت النبیؐ کا تعارف (مولانا الطاف حسین حالی) ____ 11

دیباچہ ____ 40

خطبہ اول

جغرافیہ جزیرۂ عرب مع نقشہ عرب ____ 52

عرب البائدہ یا خانہ بدوش صحرائی عرب کی قومیں ____ 60

جھوٹی روایتیں جو قوم عاد کی نسبت مشہور ہیں ____ 65

جھوٹی روایتیں جو قوم ثمود کی نسبت مشہور ہیں ____ 68

عرب العاربہ یعنی ٹھیٹ عرب ____ 69

قبائل عرب کی تفصیل ____ 86

عرب المستعربہ یعنی پردیسی عرب ____ 90

اسمٰعیلی یا بنی اسماعیل ____ 90

ابراہیمی یا بنی قطورہ ____ 113

ادومی یا بنی عیسو ____ 113

بنی ناحور ____ 114

بنی ہاران ____ 114

لفظ سراسین کی تحقیق ____ 123

حضرت ہاجرہ کے حالات کتب یہود سے ____ 124

خطبہ دوم

عرب کے رسومات وعادات اسلام سے پہلے ____ 131

خطبہ سوم

عرب کے مذاہب قبل اسلام ____ 142

بت پرستی ____ 143

لامذہبی ____ 144

خدا پرستی ____ 144
الہامی مذہب ____ 145
مذہب صابئی ____ 145
ابراہیم یا دیگر انبیائے عرب کا مذہب ____ 146
یہودی مذہب ____ 148
عیسوی مذہب ____ 149

خطبہ چوتھا

اسلام انسان کے لئے رحمت ہے اور تمام انبیاء کے مذاہب کی پشت و پناہ ____ 154

خطبہ پانچواں

مسلمانوں کی کتب مذہبی یعنی کتب احادیث کتب سیر کتب تفسیر کتب فقہ کے بیان میں ____ 193
اول کتب احادیث ____ 194
دوم کتب سیر ____ 197
سوم کتب تفسیر ____ 198
چہارم کتب فقہ ____ 201

خطبہ چھٹا

مذہب اسلام کی روایتوں کی اصلیت اور ان کے رواج کی ابتدا ____ 203
اس سزا کا بیان جس کا مستحق جھوٹ حدیث بیان کرنے والے کو جناب پیغمبر خدا نے قرار دیا ہے ____ 205
اس طرز تحریر کے بیان میں جو روایات کے لکھنے میں مستعمل کیا گیا تھا ____ 207
درجات حدیث کے بیان میں ایک راوی دوسرے راوی تک پہنچنے کے لحاظ سے ____ 208
درجات حدیث کے بیان میں بلحاظ راویوں کی چال وچلن یعنی ان کے ثقہ وغیر ثقہ ہونے کے بیان میں ____ 209
راویوں کے درجہ اعتبار کے بیان میں ان کے تفقہ فی الدین کے لحاظ سے ____ 209
جو روایتیں کہ یہودیوں کے ہاں مذکور تھیں ان کے بیان کرنے سے مسلمانوں کی ممانعت نہ تھی ____ 210
روایات میں اختلاف ہونے کے اسباب ____ 210
موضوع حدیثوں کا بیان ____ 211
سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے شبہات کی تردید ____ 213

خطبہ ساتواں

قرآن جناب پیغمبر خدا پر کس طرح نازل ہوا ____ 240
قرآن جب نازل ہوتا تھا لکھا جاتا تھا یا نہیں ____ 241
سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کیونکر ہوئی اور کس نے کی ____ 243
جناب پیغمبر خدا خود بھی قرآن مجید کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور
مسلمانوں کو بھی اس کے پڑھتے رہنے کی ہمیشہ ہدایت کرتے تھے ____ 244
نازل ہونا قرآن کا سات قرأتوں میں یا قرأت مختلفہ میں ____ 246
قرآن مجید کی آیات ناسخ و منسوخ ہونے کا بیان ____ 250
کیا جناب پیغمبر خدا قرآن مجید کی کوئی آیت بھول گئے تھے ____ 255
قرآن مجید حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں کس طرح جمع ہوا ____ 257
حضرت عثمانؓ کی خلافت میں قرآن مجید کی نقلوں کا تقسیم ہونا ____ 259
قرآن مجید کا اپنی طرز میں کامل ہونا اس کے الہامی الاصل ہونے کو ثابت کرتا ہے ____ 261
سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مورخوں کی غلطیاں نسبت قرآن مجید کے ____ 264

خطبہ آٹھواں

خانہ کعبہ اور اس کے گذشتہ حالات اسلام سے پہلے ____ 276
حضرت اسمٰعیلؑ کا حجاز میں آباد ہونا ____ 277
حجر اسود اور قربانی کی رسم کو اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص ابراہیم سے تعلق ہے ____ 278
کعبہ بلاشبہ بیت العتیق ہے ____ 282
سر ولیم میور کے اعتراضوں کی تردید ____ 283
تعمیر ابراہیم ____ 287
تعمیر بنی جرہم ____ 288
تعمیر عمالیق ____ 288
تعمیر قصیٰ ____ 289
تعمیر قریش ____ 289
تعمیر عبداللہ ابن زبیر ____ 292
تعمیر حجاج بن یوسف ____ 295

غلاف کعبہ 297
اصنام کعبہ 298
تصاویر خانہ کعبہ 299
زمزم 300
اسماء کعبہ 301
عمال کعبہ 301
واقعہ اصحاب الفیل 303

خطبہ نواں

آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ کے بیان میں 305
شجرہ نسب نامہ محمد رسول اللہ ﷺ تا حضرت ابراہیم علیہ السلام معہ نسب نامہ مؤلف خطبات تا محمد صلی اللہ علیہ وسلم 314

خطبہ دسواں

آنحضرت ﷺ کے بشارات کے بیان میں جو توریت اور انجیل میں مذکور ہیں 315
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہ بشارتیں ہیں 318
بشارات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تورات میں سے 321
بشارات محمد صلی اللہ علیہ وسلم انجیل میں سے 341

خطبہ گیارہواں

شق صدر کی حقیقت اور معراج کی ماہیت کے بیان میں 350

خطبہ بارھواں

اس خطبہ میں آنحضرت ﷺ کی ولادت سے آپؐ کی بارہ برس کی عمر تک کا حال ہے 376
خاتمہ 392

☆☆☆

پیش لفظ

سرسید احمد خان صاحب کی کسی کتاب کا تعارف کرانا سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے بعض قدامت پسند علماء نے سرسید احمد خان کی مخالفت کی وجہ سے مسلمان عوام کو ان کی کتابوں سے متنفر کر دیا تھا' اس لئے ان کی بلند پایہ علمی اور تحقیقی کتابیں مسلمانوں میں زیادہ مقبول نہ ہو سکیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہی حضرات جو عوام کو سرسید احمد خان کے مذہبی خیالات سے نفرت دلاتے رہے خود ان کی علمی اور دینی تحقیقات کو اپنے نام سے پیش کرتے رہے ہیں اس کی کچھ مثالیں ہم ان کی بلند پایہ تفسیر قرآن کے تعارف میں پیش کر چکے ہیں۔

برصغیر ہند و پاکستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت کے زوال کے بعد پوری قوم پر مردنی کی حالت چھائی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے سرسید احمد خان کو پیدا کیا انھوں نے اپنی ساری زندگی مسلمان قوم کی حالت بہتر بنانے کے لئے وقف کر دی۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے جو سیاسی' تعلیمی اور دینی خدمات انجام دیں وہ تاریخ میں سنہری حروف میں لکھی جائیں گی۔ قیام پاکستان کے بعد اہل پاکستان نے ان کی تعلیمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہزاروں تعلیمی ادارے ان کے نام سے قائم کئے اور آج شاید ہی پاکستان کا کوئی ایسا شہر ہو جہاں ان کے نام سے منسوب کوئی نہ کوئی تعلیمی ادارہ موجود نہ ہو۔

سرسید احمد خان کے کے ایک رفیق کار مولانا سید الطاف حسین حالی جنہوں نے اپنی مشہور زمانہ مسدس حالی کی وجہ سے عالمی شہرت پائی تھی نے سرسید صاحب کی ایک مبسوط سوانح عمری ''حیات جاوید'' کے عنوان سے تالیف کی تھی۔ اس میں انہوں نے بڑی تفصیل سے سید صاحب کی کتاب خطبات سیرت النبیؐ کا تعارف بھی کرایا ہے' جس پر کسی اضافے کی گنجائش ممکن نہیں اس لئے اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے اس تعارف کو ان کی کتاب حیات جاوید سے اگلے صفحات میں پیش کر رہے ہیں جن سے قارئین کو سیرت کی اس نایاب کتاب کے علمی مقام کا اندازہ ہو سکے گا۔

حکومت پاکستان کی جانب سے ہر سال سیرت النبیؐ کانفرنس کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر سیرت پر لکھی گئی کتابوں کو حکومت کی طرف سے گرانقدر انعامات دیئے جاتے ہیں۔ ان انعام یافتہ کتابوں میں سے بعض کتابیں ایسی تھیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی گئی تھی چنانچہ راقم نے ان کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے حکومت کی توجہ اس طرف دلائی تو ان کتابوں پر پابندی لگا دی گئی اس کے ساتھ راقم نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر حکومت سیرت النبیؐ کی تبلیغ اور اشاعت کے بارے میں مخلص ہے تو ان ناقص کتابوں کو انعام دینے کی بجائے ایک سال کے انعامات کی رقم سے سرسید احمد خاں صاحب کی کتاب خطبات سیرت النبیؐ کو شائع کرا کے مفت تقسیم کرے لیکن افسوس ہے کہ میری اس تجویز کو قابل قبول نہ سمجھا گیا اور عامۃ المسلمین کو اس نایاب کتاب سے فائدہ اٹھانے سے محروم کر دیا۔

مولانا سید الطاف حسین حالی صاحب نے اس نایاب کتاب کا جو تعارف کرایا ہے اس پر کسی اضافے کی گنجائش تو نہیں تاہم ایک دو امور کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس وقت ہمارے ہاں علامہ شبلی نعمانیؒ کی کتاب سیرت النبیؐ کو اس موضوع

پر سب سے بہتر کتاب تسلیم کیا جاتا ہے اور واقعی سیرت پر مروجہ کتابوں میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔ ان کے بعد جو کتابیں لکھی گئیں یا تو وہ ان کی کتاب کا چربہ ہیں یا ناقص لیکن قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ خود علامہ شبلی نے اپنی کتاب سیرت النبیؐ سر سید احمد خان کی علمی کاوشوں سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ روشن خیال اہل علم کو تو خیر سر سید احمد خان صاحب سے عقیدت ہے بعض قدامت پسند علماء بھی سر سید احمد خان کی کتاب خطبات سیرت النبیؐ [1] کو علامہ شبلی نعمانی کی لکھی ہوئی کتاب پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان علماء میں مولانا عبدالماجد دریابادی بھی شامل ہیں۔

سیرت النبیؐ کے موضوع پر ناقص کتابوں کو انعام دیکر جس طرح ہمارے معاشرے میں سیرت پاک کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی تھیں ان کا تقاضا تھا کہ سید صاحب کی نایاب کتاب کو دوبارہ شائع کر کے اہل علم کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔ ادارہ ''دوست ایسوسی ایٹس'' نے یہ کتاب دوبارہ شائع کر کے ایک بہت بڑی علمی اور دینی خدمت سرانجام دی ہے۔

پروفیسر رفیع اللہ شہاب
اچھرہ لاہور، ۲۲ دسمبر ۱۹۹۶

---

[1] اس کتاب کا اصل نام "الخطبات الاحمدیه فی العرب و السیرة المحمدیه" تھا۔ ادارہ نے اصل نام کو عام فہم کرنے کے لیے ''خطبات سیرت النبیؐ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

خطبات سیرت النبیؐ کا تعارف

مولانا سید الطاف حسین حالی

جب سرولیم میور کی کتاب لائف آف محمدؐ چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان میں پہنچی جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کے استیصال میں قسمہ لگا رکھا تھا' اس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش وخروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔ غالباً ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں سائنٹفک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ تھا اور دہلی سے منشی امو جان مرحوم اور جہانگیر آباد سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہ یہ بھی اس وقت تک سوسائٹی کے ممبر تھے علی گڑھ گئے تھے۔ نواب صاحب کے ہمراہ میں بھی گیا تھا گو ان کے خیالات معلوم کرنے کا اکثر موقع ملتا تھا۔ وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے' اکثر سرولیم میور کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں اسی وقت ہم نے بھی دیکھا کہ سرسید جاہلیت کے اشعار جن سے اس زمانہ کی بیہودہ اور نفرت انگیز رسمیں ظاہر ہوتی ہیں اور جو خطبات احمدیہ میں بجنسہ نقل کئے گئے ہیں۔ ایک مولوی سے انتخاب کرارہے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کا پختہ ارادہ سرولیم کی کتاب کا جواب لکھنے کا ہے۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ آخرکار جب انہوں نے دیکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ہندوستان کے تمام اسلامی کتب خانے برباد ہو گئے ہیں اور جن کی کتابوں اس مضمون کے لئے ضرورت ہے وہ یہاں دستیاب نہیں ہو سکتیں تو ان کو ولایت جانے کا خیال ہوا چنانچہ ایک دو برس بعد ہی سید محمود کا ولایت جانا قرار پایا تو وہ بھی ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

سرولیم میور کا جواب لکھنے سے دوستوں کا منع کرنا

سرسید کے بعض خطوں سے جو انہوں نے ولایت سے سید مہدی علی خاں کے نام بھیجے ہیں پایا جاتا ہے کہ ہندوستان سے چلتے وقت جب انہوں نے یہ ارادہ اپنے احباب پر ظاہر کیا تو ان کے بعض دوست جو سرکاری عہدہ دار سرولیم میور کی گورنمنٹ کے ماتحت تھے ان کو سرولیم کی کتاب کا جواب لکھنے سے مانع آئے مگر سرسید نے ان کا کہنا نہیں مانا اور ولایت پہنچتے ہی اس کی فکر میں مصروف ہوئے۔ انہوں نے انڈیا آفس کے کتب خانہ سے کتابیں بہم پہنچائیں برٹش میوزیم کی لائبریری سے بہت سی اطلاعیں حاصل کیں' سیر کی عربی کتابیں جو مصر و فرانس اور جرمنی میں چھپی تھیں وہاں سے منگوائیں اور چند لیٹن اور انگریزی کی پرانی کتابیں جو نایاب تھیں بہت گراں قیمت پر لندن کے بازار سے خریدیں اور شب و روز کی لگاتار محنت سے بارہ (ایسے) یعنی خطبے یا مضمون لکھ کر ایک لائق انگریز سے انگریزی میں ترجمہ کرائے اور لندن ہی میں خطبات احمدیہ کے نام سے اس کو چھاپ کر مشتہر کر دیا۔

خطبات کے لکھنے میں سرگرمی جو ولایت کے خطوں سے پائی جاتی ہے

اس کتاب کے لکھتے وقت جس قدر جوش سرسید کے دل میں تھا اور جو مالی مشکلات ان کو شائع کرنے میں پیش آئیں اور جو سخت محنت اس کے لکھنے میں ان کو کرنا پڑی اس کا کسی قدر اندازہ ان کے خطوں سے ہوتا ہے جو انہوں نے ولایت سے مولوی سید مہدی علی

خاں کے نام بھیجے ہیں۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلا دیا ہے اور اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہوگیا ہے اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے میں نے فرانس اور جرمنی سے اور مصر سے کتب سیر منگوانی شروع کر دی ہیں' چٹھیات روانہ ہوگئیں' سیرت ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن کی خرید لیں اور ایک آدمی مقرر کر لیا ہے جو لیٹن کا ترجمہ کر کے مضمون بتلا سکے۔

''ایک اور خط میں لکھتے ہیں ''مواعظ احمدیہ (یعنی خطبات احمدیہ) لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں۔ جانا آنا ملنا جلنا سب بند ہے۔ آپ اس کے پہنچنے پر میر ظہور حسین کے پاس جایئے اور دونوں صاحب کسی مہاجن سے میرے لئے ہزار روپیہ قرض لیجئے' سود اور روپیہ میں ادا کر دوں گا' گزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور لکھ دیا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے روپیہ بھیج دو کیا کہیے اس کتاب کے پیچھے خواب و خور حرام ہو گیا ہے خدا مدد کرے۔''

''ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔ ''میں روز و شب تحریر کتاب سید مصطفوی (یعنی خطبات احمدیہ) میں مصروف ہوں سب کام چھوڑ دیا ہے لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا روپیہ کہاں سے آئے گا۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں ''میں اپنا حال آپ کو کیا لکھوں' سکتہ سا ہو گیا ہے دن رات کی تکلیف سے میرا دل ہی خوب جانتا ہے' جلد اول خطبات احمدیہ کی تمام ہو گئی ہے اور اس مہینے میں چھاپہ بھی تمام ہو جائے گا' اب جو اندازہ اس کی ایک جلد کے چھاپے کی لاگت کا کیا گیا تو ڈھائی ہزار روپیہ سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے۔ ہوش جاتے رہے اور جان میں جان نہیں میر تراب علی نے نہایت مدد کی ہے تین سو روپیہ اس کے چندہ کی بابت بھیجے ہیں میری ظہور حسین صاحب نے ڈیڑھ سو روپیہ بھیجا ہے۔ مرزا رحمت اللہ بیگ صاحب نے اپنا چندہ سو روپیہ بھیج دیا۔ آپ زین العابدین سے روپیہ منگوا کر بھیج دیجیے اپنا ذاتی چندہ سو روپیہ کا بھی بھیج دیجیے۔''

جب ہندوستان سے سرسید کے دوستوں نے کچھ اور چندہ بھیجا ہے تو ان کو بے انتہا تقویت ہوئی چنانچہ اس کی رسید کے خط میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اگر آپ لوگ کچھ مدد نہ کرتے تو زہر کھا کر مر جانے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔''

مگر بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تخمینہ کتاب کے چھاپہ کا پہلے کیا گیا ہے اس سے بہت زیادہ صرف ہو گیا تھا۔ یعنی قریب چار ہزار کے خرچ ہوا جس میں سے کچھ کم سولہ سو روپیہ سرسید کے دوستوں نے ہندوستان سے چندہ کر کے بھیجا اور باقی روپیہ سرسید نے قرض لے کر ادا کیا۔ ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ولایت سے مراجعت کرتے وقت ان کے پاس زاد راہ کے لئے کچھ نہ رہا تھا اور نہایت پریشان تھے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''اب جب تک اور روپیہ قرض نہ لیا جائے مراجعت متعذر ہے۔ یہ تردداات ایسے جان کاہ ہیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ کتابیں مطبوعہ صندوقوں میں بند ہو رہی ہیں واسطے روانگی ہندوستان کے ان محصول وغیرہ میں بھی دو سو روپیہ سے کم خرچ نہیں ہونے کے۔ اب زیادہ حال ترددات کا لکھنا ناحق آپ کو تردد میں ڈالنا ہے۔''

شاید اسی آخری خط کے جواب میں مولوی سید مہدی علی خاں نے اپنی ساری تنخواہ بھیجنے اور کچھ قرض لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جس کے جواب میں سرسید نے ان کو لکھا کہ کتاب کے اخراجات کا صدمہ اور عین اسی صدمہ میں صدمہ غم انتقال ہمشیرۂ حامد و محمود کا لاحق

ہونا جیسا کچھ مصیبت کا وقت مجھ پر گزرا واقعہ کربلا سے کم نہ تھا۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

آپ نے جو الفاظ اپنی محبت اور الفت سے لکھے ہیں ان کا بہت بہت شکر کرتا ہوں اور بے تکلف لکھتا ہوں کہ اب کچھ حاجت نہیں رہی۔ تین ہزار روپیہ قرض لیا گیا' سب بے باق ہو گیا اب آپ کچھ قرض لیجیے نہ اپنی تنخواہ بھیجئے مگر خارجاً معلوم ہوا کہ سید مہدی علی خان اس خط کو پہنچنے سے پہلے اپنی تنخواہ کا روپیہ روانہ کر چکے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ سرسید اس کتاب کے لکھنے کو مذہبی فرائض میں سے زیادہ اہم اور ضروری فرض خیال کرتے تھے اور جب کہ وہ حسب دلخواہ تیار ہو گئی تو ان کو بے انتہا خوشی اور فخر اس کے لکھنے پر ہوا تھا۔ وہ سید مہدی علی خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر سمجھوں گا خدا قبول کرے'' ایک اور خط میں لکھتے ہیں ''میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم متبحر نے پڑھی جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے۔ جو الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے اور جس طرح میرے ہاتھ چومے اس کی لذت میں ہی جانتا ہوں'' ایک اور خط میں لکھتے ہیں ''آنحضرت ﷺ کی بارہ برس کی عمر تک کا حال لکھ چکا اور سر ولیم میور صاحب اور مصنفوں نے یہاں تک کے حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے نہایت محققانہ جواب ہیں اور یہ شرط کہ کسی شخص کے آگے ڈالا دو کیسا ہی بے دین کیوں نہ ہو اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو تو میرا نام ورنہ میرا نام نہیں۔''

خیر یہ خیالات تو سرسید کے اپنی کتاب کی نسبت ایسے ہیں جیسے ہر مصنف کے خیالات اپنی تصنیف کی نسبت ہوتے ہیں اس سے سوا اس کے کہ وہ اسلام کی حمایت کرنے سے بے انتہا خوش تھے اور کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔ سرسید سے پہلے بے شمار عالموں نے بمقابلہ عیسائیوں کے اسلام کی حمایت میں کتابیں لکھی ہیں۔ غدر سے پہلے خود ہندوستان کے علمائے اسلام نے (جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا) بڑی بڑی مبسوط کتابیں نہایت کوشش سے اسی مضمون پر تحریر کی ہیں پس تاوقتیکہ خطبات احمدیہ میں کوئی وجہ ترجیح کی نہ پائی جائے اس کو اگلے علماء کی کتابوں پر فوقیت نہیں دی جا سکتی مگر ہمارے نزدیک فی الواقع ایسی وجوہات موجود ہیں جن کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ سرسید سے پہلے کسی مسلمان سے اسلام کی ایسی خدمت بن نہیں آئی۔

خطبات احمدیہ کی ترجیح پہلی کتابوں پر جو اسلام کی حمایت میں لکھی گئیں

اولاً جہاں تک ہم کو معلوم ہوا ہے سرسید سے پہلے دنیا کے کسی مسلمان نے یورپ کا سفر محض اس غرض سے نہیں کیا کہ وہاں جا کر اسلام کی حمایت کے لئے بڑے بڑے کتب خانوں سے میٹریل جمع کرے وہیں بیٹھ کر عیسائیوں کی تردید اور اسلام کی تائید میں کتاب لکھے۔ یورپ ہی کی کسی زبان میں جو تمام براعظم میں عموماً بولی اور سمجھی جاتی ہو اس کا ترجمہ کرائے اور وہیں اس کو چھپوا کر شائع کرے اور اس طرح اسلام کی خوبیاں ان قوموں کے کان تک پہنچائے جنہوں نے تیرہ سو برس سے کبھی اسلام کی نسبت برائی کے سوا کوئی بات نہ سنی ہو۔

ریورنڈ ہوپڑ جواب سے تقریباً بیس برس پہلے لاہور ڈیوٹی کالج میں پرنسپل تھے اور جن سے میں خود بار ہا ملا ہوں انہوں نے میرے ایک دہلوی دوست سے جو ان کو اردو پڑھاتے تھے کہا کہ ''مسلمانوں سے نہایت تعجب ہے کہ سرسید احمد خان کو کافر ملحد اور

بد مذہب سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک جو کام سید احمد خان نے اسلام کی حمایت کا کیا ہے وہ آج تک کسی مسلمان سے بن نہیں آیا جب کہ مسلمان اسلام کے سوا سب مذہبوں کو باطل یا غلط سمجھتے ہیں اور اسلام کا ماننا تمام بنی آدم پر فرض جانتے ہیں تو ان کا فرض تھا کہ جن کو وہ گمراہ سمجھتے تھے ان پر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبی ظاہر کرتے ان کے ملکوں میں جا کر انہی کی زبان میں وعظ کہتے اور انہی کی زبان میں اسلام کی حمایت پر کتابیں لکھتے۔ میں نہیں جانتا کہ تیرہ سو برس میں سید احمد خاں سے پہلے کسی ایک مسلمان نے بھی ایسا کام کیا ہو۔''

مسٹر آرنلڈ جنہوں نے بھی پریچنگ آف اسلام لکھی ہے اور اس کے لکھتے وقت مسلمانوں کے لٹریچر سے بے مثل واقفیت حاصل کی ہے ایک نہایت سچے اور پختہ عیسائی ہیں ان کا بیان ہے کہ ''ایسی مثالیں تو پائی جاتی ہیں کہ کسی مسلمان نے بمقابلہ عیسائیوں کے اپنی زبان میں اپنے ہی ملک میں بیٹھ کر اسلام کی حمایت پر کوئی کتاب لکھی اور اس کا ترجمہ کسی یورپ کی زبان میں ہو گیا لیکن مجھے کوئی ایسی مثال معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے یورپ میں جا کر یورپ ہی کی کسی زبان میں اس مضمون پر کتاب لکھ کر شائع کی ہو۔''

سر سید کہتے ہیں کہ ''۱۸۷۰ء میں جبکہ خطبات احمدیہ چھپ کر لندن میں شائع ہوئی تو ان پر لندن کے ایک اخبار میں ایک انگریز نے لکھا تھا کہ عیسائیوں کو ہوشیار ہونا چاہیے۔ ہندوستان کے ایک مسلمان نے انہیں کے ملک میں بیٹھ کر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے دکھایا ہے کہ اسلام ان تمام داغوں اور دھبوں سے پاک ہے جو عیسائی اس کے خوشنما چہرے پر لگاتے ہیں۔''

دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ سر سید نے اس کتاب میں مناظرہ کے اس مخاصمانہ طریقہ کی جگہ جو مسلمانوں نے عموماً دائر و سائر ہے اور جس سے فریق مخالف کے دل میں بجائے رغبت کے نفرت اور بجائے آشتی کے ضد پیدا ہوتی ہے ایک ایسا دوستانہ اور بے تعصبانہ طریقہ اختیار گیا ہے جو کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتا اور مسلمانوں کے لئے ایسی مثال قائم کی ہے کہ جس کی پیروی کرنے کی نہایت ضرورت تھی۔

کرنل گریہم سر سید کی لائف میں خطبات احمدیہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے مصنف کا غیر معمولی تعمق نظر، غیر مذہبوں سے بے تعصبی اور اصلی عیسائیت کے سچے اصول کا ادب'' پھر اپنی قوم کے مذہبی لوگوں کو اس طرح آگاہ کرتے ہیں کہ جو لوگ مذہبی باتوں سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں دین محمدیؐ فی زمانہ انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت دین ہے اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بوناپارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب، مغائرت اور تنگدلی کی اس میں خیال کی جاتی ہے لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں، جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خان) نے اپنے دلی دوست سر ولیم کی کتاب ''لائف آف محمد'' کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب چٹکیاں لی ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور نکتہ سنج ناظرین کتاب، بہت سی باتوں میں سر ولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے۔ اس سے ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خطبات احمدیہ نے انگریزوں کے دل پر کیا اثر گیا اور جو کتابیں مذہبی مناظرہ کے متعلق برخلاف قدیم طریقہ کے شائستگی اور بے تعصبی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں وہ کس قدر مفید اور کسی فریق ثانی کو انصاف پر مائل کرنے والی ہوتی ہیں۔

تیسری وجہ

تیسری خصوصیت اس کتاب میں یہ ہے کہ سر ولیم میور نے وہ قدیم فرسودہ و بوسیدہ طریقہ جس کے بموجب مشنری اسلام پر نکتہ چینی کرتے تھے اور جس میں ان کو کبھی بمقابلہ اہل اسلام کے کامیابی نہیں ہوئی ترک کر دیا تھا اور اس کی جگہ اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں نکتہ چینی کا ایک ایسا طریقہ اختیار کیا تھا جو خاص کر تعلیم یافتہ لوگوں پر خواہ وہ مسلمان ہوں خواہ ہندو اور خواہ عیسائی، بہت زیادہ اثر کرنے والا تھا۔ مثلاً قدیم مشنری مسلمانوں کی کتب سیر و احادیث پر یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ مثل انجیلوں کے الہام سے نہیں لکھی گئیں اور اس لئے جن روایتوں سے آنحضرت کے معجزات اور پیشین گوئیاں ثابت کی جاتی ہیں وہ اعتبار کے لائق نہیں ہیں۔ مگر سر ولیم میور نے ان کے برخلاف تمام روایتوں کو جو مسلمانوں کی روایتوں تفسیروں اور سیر کی کتابوں میں مندرجہ ہیں، صحیح تسلیم کر کے آنحضرتؐ کی تعلیم اور اخلاق وغیرہ پر نکتہ چینی کی تھی یا مثلاً پادری فانڈر وغیرہ اسلام کے برخلاف عقلی دلیلیں پیش کرتے ہیں اور اس کی تعلیم کو انبیاء کی روحانی تعلیم کے منافی بیان کرتے تھے، مگر سر ولیم میور نے بجائے عقلی دلیلوں کے تاریخی شہادتیں پیش کی تھیں اور بجائے اس کے کہ اسلام کی تعلیم کی روحانیت کے برخلاف ثابت کریں اس کو زمانہ حال کی شائستگی اور تمدن و حسن معاشرت کے برخلاف ظاہر کیا تھا مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزل کو اسلام کی تعلیم کا نتیجہ قرار دیا تھا اور مسلمانوں بادشاہوں کی ہوا پرستی و سفاکی و خونریزی کا جواب دہ اسلام کو ٹھہرایا تھا۔ یہ باتیں گو فی نفسہ صحیح ہوں یا غلط مگر تعلیم یافتہ جماعتوں کے دل پر جادو کا کام کرنے والی تھیں۔ سر سید نے ان تمام مغالطوں کو نہایت معقول اور دل نشین دلائل سے رفع کیا ہے۔ انہوں نے دو طویل خطبوں میں صرف مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کا اور ان روایتوں کا جو ان کتابوں میں درج ہیں، مفصل حال بیان کیا ہے جو ان لوگوں کے لئے جو سچائی اور انصاف سے اسلام کے متعلق کچھ لکھنا چاہیں ہمیشہ کے واسطے ایک بے مثل رہنما ہے۔ ان خطبوں میں روایات کی تنقید کے جو اصول و قواعد محدثین نے مقرر کئے ہیں اور جو معیار انہوں نے معتبر اور غیر روایتوں کا قرار دیا ہے ان کی تشریح ایسے بسط کے ساتھ کی گئی ہے کہ اس پر غور کرنے کے بعد ان روایت کی کچھ وقعت باقی نہیں رہتی جن کی رو سے سر ولیم میور نے اسلام کی تعلیم اور بانی اسلام کے اخلاق پر نکتہ چینی کی ہے۔ انہوں نے نہایت صفائی اور وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو زمانہ حال کی شائستگی دنیوی ترقیات کی مانع ہو اور مسلمانوں کے اعمال اور کردار جن کے ثمرے وہ آج بھگت رہے ہیں ان کے جوابدہ خود مسلمان ہیں نہ اسلام۔ اور جو مباحث تاریخی یا جغرافیائی تحقیقات پر مبنی تھے ان کا فیصلہ ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ کسی منصف مزاج کو اگرچہ وہ اسلام کا کیسا ہی مخالف ہو اس کے تسلیم کرنے سے چارہ نہیں۔

چوتھی وجہ

مگر سب سے بڑی خصوصیت خطبات احمدیہ کی جو اس کو اگلے علماء کی کتابوں سے ممتاز ٹھہراتی ہے وہ یہ ہے اس میں برخلاف دیگر علمائے اسلام کے الزامی جوابوں سے بہت ہی کم تعرض کیا گیا ہے بلکہ ہر ایک اعتراض کا محققانہ جواب جو عیسائی اور لامذہب دونوں کو برابر دیا جا سکے لکھا گیا ہے۔ الزامی جوابوں سے سوا اس کے کہ صرف مسلمانوں کی تسلی ہو جائے یا بعض صورتوں میں عیسائی بھی ساکت ہو جائیں ان لوگوں کی زبان بند نہیں ہو سکتی جو اسلام اور عیسائیت دونوں مذہبوں سے الگ ہیں یا مطلقاً قید مذہب سے آزاد ہیں۔ یہاں بطور مثال کے مختصر طور پر ہم چند مقامات خطبات احمدیہ کے اس غرض سے دکھاتے ہیں تا کہ ناظرین کو معلوم ہو

جائے کہ عیسائیوں کے مقابلہ میں سرسید کا طریقہ استدلال کیا ہے اور جنہوں نے ان سے پہلے اس مضمون پر کتابیں لکھی ہیں ان کا طریقہ استدلال کیا تھا؟ مگر ہم باوجود اس کے کہ سرسید نے اِس مضمون کو پہلے کی نسبت بہت بلند کر دیا ہے مولانا رحمت اللہ اور مولوی آل حسن کے سرسید سے کچھ کم مداح اور شکر گزار نہیں ہیں جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مشنریوں کے حملوں سے بچایا اور ان سے مناظرہ کرنے کی سب سے پہلے بنیاد ڈالی اور جن کی کتابیں دیکھ کر پچھلوں کو یہ خیال پیدا ہوا۔

پہلی مثال

عیسائیوں کا جو طعن آنحضرت ﷺ پر بابت کثرت ازواج اور اسلام پر بابت اجازت تعدد ازواج اور اجازت طلاق کے ہے اس کی تردید میں ہمارے علماء نے بالکل الزامی جوابوں سے کام لیا ہے اور بلاشبہ اگر عیسائی اپنے مذہب کے اصلی اصول کے پابند ہوں تو یہ جواب ان کے لئے کافی ووافی ہے مثلاً ازالۃ الاوھام میں توریت کے حوالوں سے نہایت تصریح کے ساتھ حضرت ابراہیم کے تین نکاح' حضرت یعقوب کے چار نکاح' حضرت موسیٰ کے دو نکاح' اور حضرت داؤد کی نوے سے زیادہ بیویاں جن میں بعض منکوحہ اور بعض غیر منکوحہ تھیں اور حضرت سلیمان کی ایک ہزار بیویاں اور بعض اور انبیاء کی کثرت ازواج کو ثابت کیا گیا ہے۔ اس طرح طلاق کی طعن پر توریت سے جس کے احکام کو عیسائی منسوخ نہیں مانتے' ثابت کیا ہے کہ حضور موسیٰ نے جواز طلاق کا حکم دیا ہے۔ کتاب استفسار میں بھی اول اسی قسم کے الزامی جواب دیئے ہیں اور آخر میں جواب تحقیقی یہ لکھا ہے کہ کوئی دلیل عقلی یا نقلی توریت وانجیل سے بھی اس بات پر قائم نہیں ہے کہ جو بہت سی بیویاں کرے وہ نبی نہیں ہوسکتا یا خداتعالیٰ کسی نبی کو بہت سی بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور طلاق کی نسبت یہ لکھا ہے کہ اگرچہ انجیل میں طلاق کو منع کیا گیا ہے مگر توریت میں اجازت دی گئی ہے اور عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ توریت اور انجیل آپس میں متحد ہیں' ناسخ ومنسوخ نہیں۔

اگرچہ یہ جوابات جو ہمارے علماء نے دیئے ہیں مسلمانوں کی تسلی کے لئے اور عیسائی اپنے مذہبی اصول کے پابند ہوں تو ان کے ساکت کرنے کے کافی ہیں مگر عیسائی باوجود یہ کہ توریت کو الہامی کتاب اور قیامت تک غیر منسوخ جانتے ہیں' نہ توریت کے کسی حکم کو مانتے ہیں اور نہ توریت کے حوالوں پر کان دھرتے ہیں نیز عیسائی انبیاء کو مثل اسلام کے معصوم نہیں سمجھتے یہاں تک کہ ان میں سے بعض کی طرف بدترین گناہوں کو منسوب کرتے ہیں پس تاوقتیکہ عیسائیوں کو تحقیقی جواب نہ دیا جائے ان کی زبان بند نہیں کی جا سکتی اس کے سوا الزامی جوابات ان لوگوں کے لئے جو توریت وانجیل کو نہیں مانتے کافی نہیں ہیں جب تک اس زمانہ کی مسلمات کے موافق ان کا جوب نہ دیا جائے۔

شریعت اسلامی اور تعدد ازواج کا مسئلہ

مسئلہ تعدد ازواج اور جواز طلاق کی بحث خطبات احمدیہ میں بھی آ گئی ہے اس میں سرسید نے اول سر ولیم میور کا اعتراض نقل کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ تعدد ازواج اور طلاق کا حکم عام اخلاق کی بیخ کنی کرتا ہے' عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتا ہے اور حسن معاشرت کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

اس کے جوب میں اول تعدد ازواج پر لمبی بحث کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "اس معاملہ پر تین حیثیتوں سے بحث ہوسکتی ہے اول قانون قدرت کے لحاظ سے' سو ہم قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روحوں کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا

تھا کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو،ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک مادہ ایک نر ہوتا ہے برخلاف اس کے کہ جن ذی روحوں کی متعدد مادائیں ہونی مقصود تھیں ان کے ایک سے زیادہ بچے پیدا ہوتے ہیں اور نر و مادہ کی تعداد متناسب نہیں ہوتی اس قانون کے بموجب' جیسا کہ ظاہر ہے انسان دوسری قسم میں داخل ہے۔ مگر چونکہ رتبہ میں بوجہ اس بیش بہا قوت کے جو مدرک کلیات و جزئیات وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اور ذی روحوں کے قدرت نے اس کو عطا کئے ہیں ان کو احتیاط سے اور موقع بموقع بلحاظ امورات طبیعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی و قوانین حفظان صحت اور مختلف ممالک کی آب و ہوا کے کام میں لائے ورنہ اس میں اور دیگر حیوانات میں جو اس کے آس پاس پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے ایک بکرے یا مرغے سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتا۔ پس جس طرح کثرت ازواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی ایک سے زیادہ ہونے کا قطع التزام خلاف فطرت ہے۔''

اس کے بعد سر سید نے معاشرت کے لحاظ سے اسی مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ اسی بات کو توریت میں اس طرح بیان کیا ہے کہ جب خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا اس کے حق میں اچھا نہیں ہے تو اس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا اور وہ عورت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے فکر و تردد اور رنج و راحت میں شریک ہو۔ اپنی مجالست سے اس کی خوشی کو بڑھا دے' اپنی محبت بھری ہمدردی سے اس کی تکلیف کو کم کرے اور سب سے اخیر غرض جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کے ساتھ شریک ہو کر خدا کے اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ ''بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو'' مگر جب کبھی یہ مددگار کسی سبب سے اپنے ان قدرتی فرائض کے ادا کرنے میں قاصر ہو تو اس دانشمند حکیم خالق زن و مرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہوگی وہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یا ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی خاص حد تک ایک ہی وقت میں جورو ئیں رکھنے کی اجازت ہو اور یا پہلی زوجہ کو طلاق دینے کے بعد دوسری جورو کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی خاص ہونا چاہیے تھا' چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اس کی حاصل ہے سیاست مدن کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے یہ علاج کر سکتا ہے لیکن عورت کو اول قاضی کی اجازت حاصل کرنی چاہیے۔

''اگر اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں بڑا خلل واقع ہوتا اور انسان کو بدترین گناہوں کی طرف مائل ہونا پڑتا اگرچہ تعلیم و تربیت سے اس ضرورت کا کم ہونا ممکن ہے لیکن مٹنا محالات سے ہے۔ پس جہاں اس کے عمل میں نہ لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں جو حسن معاشرت کے لئے سم قاتل ہوں۔''

اس کے بعد وہ ڈیون پورٹ کی مانٹیگو کی رائے تعدد ازواج کی تائید میں نقل کرتے ہیں جس کا ماحصل یہ ہے کہ ''گرم ملکوں میں جہاں عورتیں جلد بڑھیا ہو جاتی ہیں ضرور ہے کہ تعداد ازواج کا قاعدہ جاری کیا جائے'' پھر مسٹر ہگنز کی رائے لکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ''علم قوائے انسانی اور علم طبیعیات کے ماہرین نے بعض وجوہات ایسی دریافت کی ہیں جو کثرت ازواج کے واسطے بطور ایک عذر کے متصور ہو سکتی ہیں اور ہم شمالی ملکوں کے سرد خون والے مینڈک کے سے مزاج کے جانوروں سے متعلق نہیں ہو سکتی ہیں'' اس کے بعد مسٹر ڈبلیو اوسلی صاحب کی یہ رائے نقل کی ہے کہ ''ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد و عورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے جہاں دونوں برابر برابر بتدریج عالم ضعیفی کو پہنچتے ہیں۔ مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہے کہ ضعیفی میں بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو بانی اسلام کے لئے اس بات کی کہ انہوں نے

متعدد جوروؤں کی اجازت دی ایک بڑی وجہ تھی اور یہ ایک کافی سبب اس بات کا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے اس مضمون کی نسبت اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کو ملکوں کی گورنمنٹوں کے آئین پر چھوڑ دیا کیونکہ جو بات ایشیا کے واسطے مناسب ہوگی وہ یورپ کے واسطے نامناسب ہوگی۔''

ان دونوں مذکورہ بالا رایوں پر سرسید یہ ریمارک کرتے ہیں ''افسوس کہ ان دونوں صاحبوں نے تعدد ازواج پر صرف امورات طبیعی کے لحاظ سے نظر کی ہے مگر مذہب اسلام میں یہ اجازت خاص خاص حالتوں میں صرف امورات طبیعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی بلکہ زیادہ تر اس لحاظ سے دی گئی ہے کہ تزوج کے تلخیوں کے واسطے اور مقاصد تزوج کے فوت ہو جانے کے حالت میں ایک تدارک خاص ہو جو عین مرضی آدمؑ و حواؑ کے پیدا کرنے والے کی اس کے قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔''

اس کے بعد سرسید ان اخلاقی خرابیوں کا ذکر کرتے ہیں کہ جو آنحضرتؐ سے پہلے عرب اور اس کے گردونواح کے ملکوں میں ازواج کے متعلق واقع تھیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''ایران میں قوانین نکاح بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے یہاں تک کہ بیٹے کو اس کی ماں ایسی ہی مباح تھی جیسے باپ کو اس کی بیٹی اور بھائی کو اس کی بہن۔ یہودیوں کے ہاں جو ایران کے گوشہ مغرب میں بکثرت آباد تھے ازواج کی رسم بلا کسی قید اور حد کے بے روک ٹوک جاری تھی۔ عرب میں ایرانیوں اور یہودیوں دونوں کی رسمیں یکساں جاری تھی تعدد ازواج کی کچھ انتہا نہ تھی۔ تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز یا رتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں۔ عیسائیوں کا حال ان سب کے برخلاف تھا ان کے ہاں ایک جورو بھی کرنی کچھ نیکی نہیں گنی جاتی تھی بلکہ رہبانیت اور تجرد محض کی عام ہدایت تھی اور مرد و عورت دونوں کے لئے وہی نیکی گنی جاتی تھی۔ ایسے زمانہ میں جبکہ عقل اور دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اخلاق اور معاشرت اس قدر بگڑ گئی تھی بانی اسلام نے ایک ایسا قانون جاری کیا جو بلحاظ اپنی اصلیت کے نہایت کامل اور عقل کامل کے بالکل مطابق اور انسان کی تندرستی اور بہبودی اور معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و مرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لئے اس کی تلخیوں کے دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔''

اس کے بعد انہوں نے مذہب کی حیثیت سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ''جس خوبی سے اسلام نے تعداد ازواج کو روکا ہے اس طرح نہ یہود یوں کے مذہب نے اس کی بندش کی ہے اور نہ عیسائی مذہب نے۔ یہودیوں کے ہاں بکثرت اور بالاتعین حد ازدواج موجود ہے۔ عیسائی مذہب نے بھی تعدد ازواج کی کہیں ممانعت نہیں کی۔ چنانچہ مسٹر بگنز لکھتے ہیں کہ ''میں نہیں جانتا متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت اسلام میں ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے؟ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کی نظیر پر جو خدا کی دلی مرضی کے مطابق چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لئے بنایا تھا یہ امر ہرگز اعتراض کے لائق نہیں ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیحؑ نے ان میں انجیلوں میں سے جن کو ان کے معتقدوں نے ان کے احکام قلمبند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں کی۔ جان ڈیون پورٹ نے بھی اپنی کتاب میں بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعداد ازواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے بلکہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔''

اس کے بعد سرسید نے نہایت مشہور و معروف عیسائی عالم جان ملٹن جو تعدد ازواج کا ایک مشہور حامی ہے اور جس نے اس امر کی تائید میں بائبل میں سے بہت سی آیتیں نقل کی ہیں اس کی تقریر نقل کی ہے جس میں تعداد ازواج کے جواز پر ایک لطیف اور دقیق

استدلال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ حال تو تعدد ازدواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا' اب ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کرنے کو پسند کیا ہے اور متعدد کو صرف ایک نہایت محدود و خاص حالت میں جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد و عورت کو جوڑا پیدا کیا' ضرور ایسا ہوگا جو قانون قدرت کے تو برخلاف نہ ہو اور معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے اور وہ یہی ہو سکتا ہے کہ عموماً کثرت ازدواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو اور وہ یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے۔ قرآن مجید نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پر پیچ مطلب کو نہایت فصیح و بلیغ دو لفظوں میں بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا **فان خفتم الا تعدلوا فواحدة** (یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروؤں میں عدل نہ کر سکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے) اس کے بعد ان کی تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ اس آیت کے اگر وہی معنی لئے جائیں جیسے کہ اکثر فقہاء اور علماء نے لئے ہیں تو بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شارع نے تعدد ازدواج کو گویا بالکل روک دیا ہے کیونکہ جو سچا دیندار ہوگا وہ بغیر اشد ضرورت کے کبھی تعدد ازدواج کی جو ایسی سخت شرط کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے جرأت نہیں کرے گا لیکن اگر اس آیت کے الفاظ کو بہ تعمق نظر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعدد کو شاذ و نادر صورتوں کے سوا قطعاً ناجائز ٹھہرا دیا گیا ہے کیونکہ یہ نہیں کہا تھا کہ **ان لم تعدلوا** بلکہ یہ فرمایا کہ **ان خفتم الا تعدلوا** پس اگر یہ ممکن بھی ہو کہ مرد متعدد عورتوں میں عدل کر سکے تو عدل نہ ہو سکنے کا اندیشہ کبھی زائل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ عدل کرنا مرد کی طاقت سے باہر ہے اور اس لیے مستثنیٰ صورتوں کے سوا اس کو متعدد جوروئیں کرنے کی کسی حالت میں اجازت نہیں دی گئی اور وہ یہ آیت ہے **ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء** (یعنی تم ہرگز طاقت نہیں رکھتے کہ عورتوں میں عدل کر سکو) اس کے بعد وہ خاص خاص صورتوں کو جن میں تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے بیان کر کے لکھتے ہیں۔

''ہاں بلا شبہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو جن کی زندگی کا منشا ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنا ہے ایک حیلہ ہاتھ آ گیا ہے۔ مگر اس عمدہ اس مفید قاعدہ کی بے جا عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی۔''

ان باتوں کو سمجھنے کے بعد ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے یقین کریں گے کہ جو تعدد ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے کہ جہاں ذرا دولت ہوئی اور دو دو تین تین اور چار چار بیویاں کرنے لگے اور ایک بازاری عورت کو داؤ پر چڑھایا اور نکاح کر مارا' جہاں مقدس بزرگ مولوی ہوئے اور اللہ میاں کے سانڈ بنے اور مریدنی کو لے ڈالا وہاں وعظ کہنے لگے اور سنت نکاح ثانی کو جاری کیا۔ قرآن پڑھاتے پڑھاتے دوسرا سبق خطبة النکاح کا پڑھانے لگے اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کر کے عورتوں کو کھنگالنا شروع کر دیا ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں' جن سے اسلام نفرت کرتا ہے اور وہ سب ہوا پرست اوباش ہیں' جن سے اسلام کا نام بدنام ہوتا ہے پس ایسے شخص کے افعال پر اسلام کی خوبی و حقیقت سے چشم پوشی کرنا چمگادڑوں کے لیے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔

طلاق کی شرعی حیثیت

اس کے بعد سر سید نے طلاق کے مسئلہ پر بحث کی ہے وہ اول حسن معاشرت کی نظر سے اس پر نظر ڈالتے ہیں اور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سب سے بڑا دشمن حسن معاشرت وتمدن کا طلاق ہے جس سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی سبب سے ایسی خرابیاں مرد عورت میں پیدا ہو جائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج طلاق ہے کیونکہ اس سے مرد عورت کو آزادی ہو جاتی ہے جن کے مزاج کے اختلاف سے دونوں کی زندگی تلخ ہوگئی تھی۔ بااین ہمہ اگر چہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو لیکن بلحاظ ان بداخلاقیوں کے جو اکثر اوقات نہایت آشکارا طور پر وقوع میں آتی ہیں اور نیز اس مضرت بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے تمدن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے۔ پس جبکہ طلاق کے ساتھ ایسی خرابیاں لگی ہوئی ہیں تو اس کو بطور ایک علاج کے سمجھ کر اسی حالت میں اس کی جانب رجوع کرنا جائز ہوسکتا ہے جبکہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہوں ایسے تردادت وتفکرات میں ڈالنے والی ہوں جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والے روز افزوں رنجشیں پیدا کرنے والے اور باہمی معاشرت کے بدلے دن رات کی لعن وطعن و جوتی پیزار میں رکھنے والے ہوں دور ہو سکتے ہوں۔ اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے جیسا کہ اسلام نے اسی حالت میں جائز رکھا ہے تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے مخالف نہیں بلکہ اس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔"

اس کے بعد مسئلہ طلاق پر اسلام اور مذہب موسوی وعیسوی کے بموجب گفتگو کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ "یہودیوں کے ہاں طلاق دینا بغیر کسی قید وشرط حالت کے مرد کے اختیار میں تھا۔ جب وہ چاہتا تھا طلاق نامہ لکھ کر جورو کو دے دیتا تھا اور اس پر کوئی گناہ عائد نہ ہوتا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں سوائے زنا کے طلاق کو اور کسی حالت میں جائز نہیں رکھا لیکن اگر فی الواقع عیسائیوں کے خیال کے موافق طلاق کے امتناع سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہی مطلب تھا تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسان کی طاقت سے باہر تھی چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معتقدوں نے ان سے کہا کہ اگر جورو سے مرد کا یہ طور ہے تو جورو کرنا خوب نہیں اگر یہ حکم اس طرح مانا جائے جیسا کہ آج کل عیسائی مانتے ہیں تو حسن معاشرت کے لئے نہایت ہی مضر ہے اور جو رنج دہ امور زن وشوہر میں واقع ہو جاتے ہیں جن سے تمام اغراض تزوج برباد ہو جاتے ہیں اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن ومرد دونوں کے لئے اور بہت سے خرابیوں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔"

اس کے بعد سر سید نے یورپ کے مشہور نامور عیسائی عالم جان ملٹن کی بہت لمبی تقریر اور محققانہ رائے جو وہ اس مسئلہ کے متعلق رکھتے ہیں نقل کی ہے اور بائبل کی جن آیتوں سے انہوں نے جواز طلاق پر استدلال کیا ہے وہ سب آیتیں نقل کی ہیں جس سے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ "حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو یہ فرمایا تھا کہ جو کوئی اپنی جورو کو سوائے زنا کے کسی سبب سے طلاق دے اور دوسرے سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے اور اس کے ہرگز

یہ معنی ہیں جو اس زمانے کے عیسائی سمجھتے ہیں' اس سے آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "اگر غور کیا جائے تو یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کی آیات پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس **پیشتر بتادیا تھا کہ طلاق** نہ بطور معجون مفرح کے استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرض لاعلاج کا علاج ہے۔"

جان ملٹن کی تقریر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "اب دیکھنا چاہیے کہ اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا؟ اس نے طلاق کو بطور **ایک مرض لاعلاج** کے جائز ومباح بتایا ہے مگر زن وشوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور عجیب قسم کا ارتباط واختلاط کا معاملہ ہے کہ جو اس **میں بیماری** پیدا ہو سوائے انہی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج **بجز** طلاق کے سوا اور کچھ نہیں ہے اس لئے بانی اسلام نے اس مرض کی تشخیص نہ کسی جج یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتوے پر بلکہ صرف شوہر کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لئے ابتداء میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونس غمگسار کے پیدا ہوئی تھی۔"

"اب اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف مرد کے اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت درجہ پر خاص اس معاملہ میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور ٹھیٹ مسلمانوں کو کی ہے۔"

بانی اسلام نے اسلام کے سچے پیروؤں کو بتایا کہ **ما خلق الله شيا على وجه الارض ابغض اليه من الطلاق** (یعنی کوئی چیز خداتعالٰی نے زمین کے پردہ پر ایسی پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک طلاق سے زیادہ مبغوض ہو)

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو طلاق لینا چاہتی ہیں یہ فرمایا **ایما امراة سالت زوجها طلاقا فی غیر ماباس فحرام علیها رائحة الجنة** (یعنی جو عورت اپنے خاوند سے بغیر سختی کی حالت کے طلاق چاہے اس پر جنت کی بوتک حرام ہے۔")

پھر لکھتے ہیں کہ "پیغمبر خدا ﷺ طلاق دینے والے سے ایسے ناراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوگیا کہ جو شخص اپنی جورو کو دفعتہً طلاق دے دے وہ قتل ہونے کے لائق ہے۔ چنانچہ نسائی نے روایت کی کہ ایک شخص نے اپنی جورو کو دفعتہً تین طلاقیں دے دیں یہ سن کر آنحضرت ﷺ غصہ میں بھرے ہوئے کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ کیا اس نے خدا کے حکم کو کھیل بنایا ہے؟ اور وہ بھی اس حالت میں کہ میں تم میں موجود ہوں یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کی کیا یارسول اللہ میں اس کو قتل نہ کر ڈالوں؟ یعنی وہ شخص آنحضرت ﷺ کی شدت غضب سے یہ سمجھا کہ اس شخص نے قتل کیے جانے کے لائق کام کیا ہے۔"

اس کے بعد ان کی تقریر کا ماحصل یہ کہ "بانی اسلام نے طلاق کے روکنے میں انہیں تہدیدوں اور ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ نکاح اور ملاپ قائم رکھنے کے لئے یہ تدبیر رکھی ہے کہ جب تک تین دفعہ طلاق نہ دی جائے زن وشوہر میں پوری تفریق نہ ہو اور دفعتہً تین طلاقیں دینے کی ممانعت فرمائی اور حکم دیا کہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب فاصلے سے طلاق دی جائے کہ ہر ایک میں تقریباً پچیس روز فاصلہ ہوتا ہے تاکہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپ میں صلح ہو جائے تو بدستور زن وشوہر میں اور دوسری طلاق کے بعد بھی بشرط مصالحت کے اسی طرح ملاپ ہو جائے لیکن اگر تیسری طلاق بھی واقع ہو جائے تو سمجھا جائے کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے اور پھر دائمی تفریق ہو جائے۔"

"علاوہ ان ہدایتوں کے عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور ان کے ساتھ مہربانی اور خاطرداری سے پیش آنے اور ان کی سختی اور

بدمزاجی کوتحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی نہایت تاکید فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں۔''

''اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دیتا ہے کہ وہ زن وشوہر کے حق میں ایک بیش بہا نعمت ثابت ہو اور اس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کی تمام تلخیاں رفع ہو جائیں یا کم ہو جائیں اور بغیر اس کے حالت میں معاشرت روز بروز خراب ہوتی جائے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ طلاق بجائے اس کے کہ حسن معاشرت کے حق میں مضر ہو وہ زن وشوہر دونوں کے حق میں ایک برکت اور حسن معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوگی۔ ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ پس ان کے افعال کی نقی نہیں ہونی چاہیے نہ مذہب اسلام پر ہم کو امید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب اسلام کے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو قبول کریں گے کہ جو عمدہ طریقہ اس بات میں اسلام نے اختیار کیا وہ عقل' انصاف اور معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اس استاد کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کیلئے اس کو جوڑا پیدا کیا تاکہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو۔''

دوسری مثال:

جہاد کے طعن پر بھی ازالۃ الاوہام اور استفسار وغیرہ میں عہد عتیق کے بیشمار حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ جس شدت اور سختی کے ساتھ جہاد کا حکم انبیائے بنی اسرائیل کو دیا گیا اور جس طرح انبیاء نے اس حکم کی تعمیل کی' اسلام میں ویسی شدت اور سختی جہاد کے حکم میں نہیں ہے یہ جواب بھی بلاشبہ عام مسلمانوں کے اطمینان اور عیسائیوں کے ساکت کرنے کیلئے جو کہ تمام عہد عتیق کو الہامی جانتے ہیں' کافی تھا مگر جو لوگ یہودی یا عیسائی مذہب کے قائل نہ تھے اور جہاد کو عموماً خواہ وہ کسی مذہب میں ہو' اصول تمدن اور حسن معاشرت کے خلاف جانتے تھے اور مسلمان فاتحوں کے افعال کی بدولت خود اسلام کو سب مذہبوں سے زیادہ بنی نوع انسان کی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے۔ ان کے لئے اور ان تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے جو ان معترضین کی تحریریں دیکھتے تھے' کافی نہ تھا۔

اسلام میں دشمنوں کے خلاف جہاد کا حکم

سرسید نے خطبات احمدیہ میں اور اس کے سوا اپنی اور بہت سی تحریروں میں اس مغالطہ کو اس طرح رفع کیا ہے کہ فی الواقع کسی انصاف پسند کو' خواہ وہ عیسائی ہو اور خواہ غیر عیسائی' اسلام کے مسئلہ جہاد پر نکتہ چینی کرنے کا محل باقی نہیں رہا سب سے زیادہ مفصل بحث انہوں نے اس مسئلہ پر اپنی تفسیر میں کی ہے مگر یہاں ہم صرف ان کی اس تحریر کا بہت مختصر خلاصہ جو خطبات میں درج ہے' لکھتے ہیں۔

سرولیم میور نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس نے مذہب کے معاملہ میں رائے کی آزادی بالکل روک دی بلکہ بالکل معدوم کر دی ہے۔ سرسید نے اس کے جواب میں اول ایک لمبی تحریر میں اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ جیسی آزادی رائے کی روک عیسائی مذہب میں ہے ایسا دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''اگر عیسائیوں کے قول کے موافق اسلام میں آزادی رائے نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اسلام کے قبول نہ کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے تو یہ اسلام پر ان جھوٹے الزامات میں سے ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اس پر لگائے ہیں یا تو وہ لوگ اصول اسلام سے ناواقف ہیں یا دیدہ و

دانستہ حق پوشی کی نظر سے ایسا کیا ہے۔ جبکہ اسلام دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے تو کیونکر یہ بات خیال میں آ سکتی ہے کہ وہ زبردستی منوایا اور قبول کروایا جاتا ہے جو لوگ اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ الزام قرآن مجید کے اس صاف اور روشن حکم کے کس قدر برخلاف ہے کہ ''لا اکراہ فی الدین قدتبین الرشد من الغی'' (یعنی دین کے معاملہ میں کچھ جبر نہیں کیونکہ ہدایت اور گمراہی میں صاف فرق ظاہر ہو گیا ہے)

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''جس اصول پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر استثناء کے قتل و غارت اور نیست و نابود کر دیں' اس اصول پر اسلام نے کبھی تلوار میان سے نہیں نکالی اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبلوانے کا ارادہ نہیں کیا ہاں بلاشبہ اس نے بھی تلوار نکالی مگر دوسرے مقصد سے یعنی خدا پرستوں کی جان و مال کی حفاظت اور ان کو خدا پرستی کا موقع ملنے کو اور یہ وہ منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص الزام نہیں لگا سکتا۔ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں پر بہت بڑا فرض تھا اور اب بھی بقدر ضرورت وقت کے ان پر فرض ہے کہ کافروں کے ملکوں میں جائیں اور خدا کی توحید کا یقین ان کے دل میں بٹھائیں۔ جہاں کوئی ایسے وعظ و نصیحت کا مانع نہیں ہے وہاں اسلام نے تلوار نکالنے کی ہرگز اجازت نہیں دی مگر جب خدا کے نام کی منادی روک دی جائے اور موحدوں کو امن میسر نہ ہو جیسا کہ مکہ میں کافروں نے کیا کہ جب مسلمان مکہ سے نکل گئے تو بھی ان کا تعاقب نہ چھوڑا' اس وقت بلاشبہ اپنے بچاؤ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے۔

مذکورہ بالا مضمون کو نہایت مفصل و شرح بیان کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ''اس بیان سے ان عیسائی مصنفوں کی بھی غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جو لکھتے ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزادی سے رہنے دینا مطلق نہیں ہے پھر لکھتے ہیں کہ' ہاں ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتح مندوں سے بعضوں نے نہایت بے رحمی سے دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کیا' مگر مذہب کا اندازہ ان کے افعال سے نہیں بلکہ اس بات سے کرنا چاہیے کہ آیا انہوں نے اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں؟ اس وقت صاف کھل جائے گا کہ ان کے افعال اسلام کے بالکل برخلاف تھے مگر اسی کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو مسلمان فتح مند اپنے مذہب کے پابند تھے وہ دوسرے کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بلالحاظ قوم و مذہب کے ہر طرح کا امن و آزادی بخشتے تھے۔''

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس سے اسلام کی طرف داری کی بالکل توقع نہ تھی' اسپین کے علم تاریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ اسپین کے بنی امیہ خلفاء کی حکومت میں ایک مشہور و معروف بات قابل بیان ہے کیونکہ اس سے اسپین کے ہم عصر' یعنی عیسائی اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانہ تک ان بادشاہوں کی بڑی عمدگی پائی جاتی ہے یعنی ان کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی کا دینا۔''

اس کے بعد گاڈفری ہگنز کی رائے اس امر کے متعلق نقل کی ہے جس کے چند فقرے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ کوئی بات ایسی عام نہیں جیسی کہ پادریوں کی زبانی اسلام کی مذمت اس وجہ سے سننے میں آتی ہے کہ اس میں تعصب زیادہ ہے اور مذہب کے لئے آزادی نہیں ہے۔ یہ عجیب زعم اور ریاکاری ہے۔ وہ کون تھا جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو بایں وجہ کہ وہ عیسائی مذہب قبول

نہیں کرتے تھے جلاوطن کر دیا تھا؟ اور وہ کون تھا جس نے میکسکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام کے دے دیا تھا اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے؟ مسلمانوں نے بمقابلہ اس کے یونان میں کیا کیا؟ کئی صدیوں سے عیسائی امن و امان کے ساتھ اپنی ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور ان کے مذہب ان کے پادریوں ان کے بشپ' ان کے بزرگوں اور ان کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے جو لڑائی بالفعل یونانیوں اور ترکوں میں ہو رہی ہے وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں ڈیمرار کے حبشیوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہبی نہیں ہے (خیال رہے کہ مصنف مذکور کے زمانے میں یونان ترکوں کے قبضے میں تھا۔)

''ایک نہایت دانشمند مگر غیر معتقد عالم نے مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ ''وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی سب ان میں خوش و خرم تھے اگر چہ بظاہر مور اس وجہ سے جلاوطن کئے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی مانک (راہب) سمجھتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت کی سزا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا۔''

''خلفاء کی تمام تاریخ کی کوئی بات ایسی نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ (عیسائیوں میں) مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا اور نہ کوئی مثال اس بات کی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب نہ چھوڑنے کے سبب آگ میں جلایا گیا ہو اور نہ مجھ کو یقین ہے کہ زمانہ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے اسلام قبول نہیں کیا۔''

اس کے بعد جان ڈیون پورٹ کی کتاب اپولوجی سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہیں ''خونریزی اور بربادی ان نو احمقانہ جہادوں کی جو عیسائیوں نے تقریباً دو سو برس تک ترکوں پر کئے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے' پھر قتل کرنا ان شخصوں کا جو اس عقیدہ کو نہیں مانتے تھے کہ انسان کو دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے لوتھر کے پیروؤں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائی شمال تک ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی میری کے حکم سے قتل ہونا' فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا' چالیس برس تک اور بہت سی خونریزیوں کا ہونا' فرانسس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک عدالت مذہبی کے حکم سے قتل ہونا جواب تک اس لئے قابل نفرین ہے کہ وہ عدالت کی رائے سے ہوا تھا علاوہ اس کے وہ بیس برس کی خرابیاں جبکہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں اور بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے زہر خوانی اور قتل کی وارداتوں کا ہونا اور آخر کار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لئے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لئے قتل ہونا اس میں شک نہیں کہ ایسا مکروہ اور گویا ایک غیر منقطع سلسلہ مذہبی لڑائیوں کا چودہ برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا۔''

اس کے بعد مشہور عیسائی مورخ مسٹر گبن کی رائے اس آزادی کی تائید میں جو اسلام نے غیر قوموں کو دی ہے نقل کی ہے پھر ایک آرٹیکل سے جو یورپین مصنف نے ایسٹ اینڈ ویسٹ اخبار میں چھپوایا تھا' مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے ''اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی کسی کو ایذا نہیں پہنچائی' کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو سزا دینے کے لئے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا' ہاں اس نے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر ان کا جبراً جاری نہیں کیا۔ اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خاصیت پائی جاتی ہے۔ جو دوسرے مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے۔''

اس کے بعد فلسطین کے ایک عیسائی لامارٹین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں۔"

پھر ایک انگریزی سیاح سیلڈن کا یہ قول نقل کیا ہے جو اس نے بطور طعن کے مسلمانوں کی نسبت کہا ہے یعنی یہ کہ "وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔"

تمام اقوال نقل کرنے کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "دیکھو یہ سب رائیں بہت سے بے طرفدار اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سر ولیم میور کے اس بے سند دعوے کے کیسے برخلاف ہیں کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے۔"

خطابات احمدیہ کے مضامین کا خلاصہ

ان دو مثالوں کے بعد ہم سرسید کی کتاب کی نہایت مختصر کیفیت جس سے مصنف کی محنت اور جانفشانی کا جو اس کتاب کے لکھنے میں اس نے کی ہے کسی قدر اندازہ ہو سکے گا اور ناظرین کے ذہن میں کتاب کی حقیقت کا ایک دھندلا سا خیال پیدا ہو جائے گا بیان کرتے ہیں۔

پہلا خطبہ

پہلے خطبہ میں جو سب سے بڑا اور بجائے خود ایک کتاب ہے عرب کا نہایت مفصل تاریخی جغرافیہ مسلمانوں کے بعض مسلمات کے ثابت کرنے کے لئے جن کا سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں انکار کیا ہے' بطور بنیاد مباحث آئندہ کے بیان کیا گیا ہے تا کہ آئندہ خطبات میں اس بات کا فیصلہ آسانی سے ہو سکے کہ مثلاً جبل فاران جس کا نام توریت کی ایک آیت میں آیا ہے اور جس سے مسلمان آنحضرتؐ کی نبوت کی بشارت نکالتے ہیں آیا وہ بقول اہل اسلام جبال عرب میں سے ہے یا بقول سر ولیم میور کے جبال شام میں سے؟ یا یہ کہ فی الواقع حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کے بیٹے عرب کے مختلف حصوں میں جیسا کہ مسلمان کہتے ہیں آباد ہوئے یا بقول سر ولیم میور کے آباد نہیں ہوئے؟ یا یہ کہ آنحضرتؐ کا اسمٰعیلؑ کی اولاد میں ہونا ثابت ہے یا بقول سر ولیم میور کے ثابت نہیں ہے؟ اس خطبہ میں سرسید نے توریت کے حوالوں اور عیسائی محققوں کی شہادتوں سے اپنے ہر ایک دعوے پر سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے برخلاف استدلال کیا ہے۔

دوسرا خطبہ

دوسرے خطبہ میں عرب جاہلیت کی رسوم و عادات اور خیالات و عقائد اچھے یا برے جہاں تک کہ شعرائے اور دیگر معتبر ذریعوں سے معلوم ہوئے بیان کئے ہیں اور جس قدر باتیں اشعار سے استنباط کی ہیں ان کے ساتھ وہ اشعار یا مصرعے بھی نقل کر دیئے ہیں جن سے ان باتوں کا سراغ لگایا گیا ہے کہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ لوگوں کو اس بات کا اندازہ کرنے کا موقع ملے کہ اسلام سے پہلے عرب کی کیا حالت تھی اور اسلام کے بعد ان کے اخلاق اور عادات اور عقائد و خیالات کس درجہ تک تبدیل ہو گئے۔

تیسرا خطبہ

تیسرے خطبہ میں ان ادیان مختلفہ کا جو اسلام سے پہلے عرب میں شائع ہوئے اور اس بات کا بیان ہے کہ اسلام ان تمام ادیان

میں کون سے دین سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے؟ اس خطبہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اہل عرب اسلام سے پہلے چار فرقوں میں منقسم تھے۔ بت پرست، خدا پرست، لا مذہب اور معتقدین مذہب الہامی۔ ان میں سے اول کے تین فرقوں کا ذکر کرنے کے بعد عرب کے الہامی مذاہب کی تفصیل بیان کی ہے۔ (۱) مذہب صائبین (۲) مذہب ابراہیم اور دیگر انبیائے عرب یعنی ہود، صالح، اسمٰعیل اور شعیب علیہم السلام کا (۳) مذہب یہود (۴) مذہب عیسوی۔

اسکے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعتہً اسلام نمودار ہوا اور اس کو حیرت آمیز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا اور دفعتہً جزیرۂ عرب کے چاروں کونوں کو صدق کے نور سے بھر پور کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مفصل بیان کیا ہے کہ اسلام نے عرب کے مذاہب مذکورہ میں کیا کیا اصلاحیں کیں؟ کن کن باتوں کو قائم رکھا اور کن امور پر ان سے مخالفت کی؟ اس کے بعد جو اکثر عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام در حقیقت اصول و عقائد متفرقہ منتشرہ مذاہب سابقہ کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے اس کا اس طرح جوب دیتے ہیں کہ "ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہو گی کہ یہ مشابہت اصول کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول سے اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہی غیر متنہی اور کامل ذات ہو، ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی جس طرح کہ خدا تعالیٰ سے اپنا مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے اور جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کی اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لئے دو متناقض اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیے جنہوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا۔ جنہوں نے دنیا کے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنہوں نے اپنے با ایمان متبعین کے لئے بے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیئے۔"

چوتھا خطبہ

چوتھے خطبہ میں اس بات کا نہایت شافی ثبوت دیا ہے کہ اسلام انسان کے حق میں رحمت اور اس سے موسوی عیسوی مذہب کو نہایت فائدے پہنچے ہیں۔ اس خطبہ کو سرسید نے اس طرح شروع کیا ہے کہ "یہ مضمون جس کو اب ہم لکھنا چاہتے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ ہم کو اس کا لکھنا یا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے نہایت بے تعصب دل پیدا کرنا چاہیے کیونکہ طرفدار دل سچے اور صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچتا اس الزام کے رفع کرنے سے تو ہم مجبور ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان مذہب میں جو فی الواقع خوبی ہے اس کو ظاہر کرتے ہیں مگر جہاں تک ہم سے ہو سکا ہے ہم نے نہایت ٹھنڈی طبیعت اور ناطرف دار دل اور سیدھی سادی سچی نیت سے یہ مضمون لکھا ہے اور اسی لئے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اس رائے پر دوسرے کو یقین نہ دلا سکیں گے تو اس کو رنجیدہ بھی نہیں کریں گے۔"

خطبہ ۴ کا پہلا حصہ

مصنف نے اس مضمون کو چار حصوں میں منقسم کیا ہے جن میں سے پہلے حصہ میں فائدے بیان کئے ہیں جو اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں اور اس کے ثبوت میں ان مشہور اور نامور عیسائی مصنفوں کے اقوال نقل کئے ہیں جنہوں نے اسلام کے حق میں مذہب اسلام کے مفید ہونے کی نسبت شہادتیں دی ہیں جیسے سر ولیم میور جن کی نسبت سر سید لکھتے ہیں کہ وہ ایک نہایت دیندار

عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے ایڈورڈ گبن' جان ڈیون پورٹ' ٹامس کارلائل وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا حصہ

دوسرے حصے میں ان عیسائی مصنفوں کی رائے کی تردید کی ہے جنہوں نے اسلام کو نوع انسان کی معاشرت کے حق میں مضر بتایا ہے اور اس میں بھی یورپ کے بہت سے نامور اور محقق مصنفوں کی شہادتوں سے استدلال اور اسلام کا مقابلہ حسن معاشرت کے لحاظ سے عیسائی مذہب کے ساتھ کیا ہے۔

تیسرا حصہ

تیسرے حصہ میں ان فائدوں کا بیان ہے جو یہودی اور عیسائی دونوں مذہبوں کو بالاشتراک اسلام کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔ یہ دونوں حصے خطبہ مذکور کے چونکہ بہت طولانی ہیں اور خلاصہ میں اس کی خوبی باقی نہیں رہ سکتی اس لئے ان کو اصل کتاب میں دیکھنا چاہیے مگر تیسرے حصہ میں صرف ایک فقرہ بطور نمونہ کے یہاں لکھا جاتا ہے۔
وہ لکھتے ہیں کہ "اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں سے نہایت بداخلاق افعال قبیحہ منسوب کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ان تحریروں کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی اور عیسائی ان تمام تحریروں کو الہام ربانی اور ان نبیوں اور مقدس لوگوں کو ان افعال قبیحہ کا مرتکب یقین کرتے تھے۔ (یہ وعدہ عتیق کی ان آیتوں کی طرف اشارہ ہے جن میں حضرت لوطؑ ' حضرت داؤدؑ وغیرہ کی طرف زنا اور دیگر افعال قبیحہ کی نسبت کی گئی ہے) اسلام نے ان معصوم نبیوں اور خدا پرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا اور جو اتہام یہودیوں اور عیسائیوں نے ان پر لگائے تھے ان کو فتح مندی سے دفع کیا اور ان بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بہت بڑے حصہ پر یقین کرا دیا۔ مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلہ پر یقین دلانے سے کہ انبیاء و پیغمبر سب پاک و معصوم ہیں توریت کو بڑے غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کر دیا اور جن وجوہ سے وہ غلطی میں پڑے تھے ان کو دریافت کیا۔ پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی حضرت ابراہیمؑ ' حضرت لوطؑ اور ان کی بیٹوں حضرت اسحٰقؑ یہودا حضرت یعقوبؑ کی بیویوں اور بیٹوں' ہارونؑ داؤد سلیمانؑ کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب رہتی جیسی ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے۔ وہ تمام دنیا کی نظروں میں ایسے ہی حقیر ہوتے ہیں جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جن کو دائم الحبس کر کے کالے پانی بھیجتے ہیں یا ان کے گناہوں کی سزا کے لئے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں۔ صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پہنچا دی جس کے وہ مستحق تھے۔"

چوتھا حصہ

پھر اسی خطبہ کے چوتھے حصے میں ان فائدوں کو بیان کیا ہے جو اسلام کی بدولت خاص عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "دنیا میں مذہب اسلام سے زیادہ کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کسی مذہب کو اس قدر فائدے نہیں

پہنچائے ہیں۔عیسائی مذہب کی بنیاد اس نیک اور حلیم شخص (یعنی حضرت یحیٰ علیہ السلام پیغمبر) سے ہے جو خدا کا رستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دار و مدار اس عجیب شخص پر ہے جس کو انہوں نے اتنا بزرگ اور مقدس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر) مذہب اسلام ہی کا یہ احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت مستقل ارادہ اور نڈر دل اور نہایت استوار قدمی سے مذہب کا طرفدار ہوا اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علانیہ اور دلیرانہ اس بات کا اعلان کیا کہ جان دی باپٹسٹ (یعنی حضرت یحیٰ علیہ السلام) بلاشبہ سچے پیغمبر اور حضرت عیسیٰؑ بے شک عبداللہ اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے۔پس کون سا مذہب اس بات کا دعویٰ کرسکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ تر مفید ہے اور اس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے۔''

''جو سب سے بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہوگئی ہے وہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ اس لازوال سچ کے بھی متناقض تھا اور ان خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا جو حضرت عیسیٰؑ نے فرمائی اور حواریوں نے انجیل میں لکھی تھیں۔ یہ امر اسلام کی لازوال عظمت کا باعث ہے کہ اسی نے خدائے ذوالجلال کی پرستش کو پھر جاری کیا اور اس خاص مذہب کو پھر سرسبز کیا جس کی خاص تلقین حضرت نے کی تھی۔اسلام ہمیشہ اس زمانے کے عیسائیوں کو ان کی غلطیوں سے متنبہ کرتا رہا اور اب بھی متنبہ کرتا رہتا ہے' اسلام نے عیسائیوں سے اسی سچے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کا وعظ حضرت مسیح نے کیا تھا۔جیسا کہ قرآن میں آیا ہے ''**قل یا اھل الکتب تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبدا الا اللہ و لا نشرک بہ شینا**'' بہت سے عیسائیوں کی آنکھیں اسلام کی روشنی میں کھل گئیں اور اس ذلیل حالت سے وہ خبردار ہوئے جس میں مبتلا تھے اور انہوں نے پھر اس رتبہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جو پہلے ان کو حاصل تھا۔یعنی انہوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدے کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہ لاشریک کہا اور عیسیٰ مسیحؑ کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چنانچہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب یونیٹیرین (یعنی موحدین) سے معزز ہے۔''

اگر یہ عقیدہ تھوڑی دیر کے لئے دنیا سے اٹھایا جائے تو مسٹر گبن کی یہ رائے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جائے گی کہ ''اگر سینٹ پیٹر یا سینٹ پال (یعنی پطرس حواری اور پولوس مقدس) پوپ کے محل میں آجائیں تو غالباً وہ اس دیوتا کا نام دریافت کریں گے جس کی پرستش ایسے پراسرار رسومات کے ساتھ اس عظیم الشان عبادت گاہ میں کی جاتی ہے۔آکسفورڈ یا جنیوا میں جاکر ان کو چنداں حیرت نہ ہوگی مگر گرجا میں جاکر سوال و جواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق القول مفسروں نے ان کی تحریرات اور ان کے مالک یعنی عیسیٰؑ مسیح کے کلمات کی تفسیر کی ہے اس پر غور کرنا پڑے گا (صادق القول کا لفظ مسٹر گبن نے بطور طنز کے لکھا ہے جس سے مراد تحریف کرنے والے مفسر ہیں۔''')

اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ ''جو فائدے اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچائے ان میں سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات ناجائز سے نجات دی اور عیسائیوں میں ایک زندگی کی روح پھونک دی۔تمام عیسائی پوپ کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پورا با اختیار نائب سمجھتے تھے اور اس کو معصوم جانتے تھے جیسے کہ اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کو سمجھتے ہیں۔ان کا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ دوزخ اور اعراف اور بہشت کے دروازوں کے کھولنے کا پوپ کو بالکل اختیار ہے۔پوپ گنہگاروں کے گناہوں کے بخش دینے کا دعویٰ رکھتا ہے۔پوپ کو پورا اختیار تھا کہ جس ناجائز چیز کو چاہے جائز کر

دے۔ درحقیقت پوپ بلحاظ ان اختیارات کے جو اس کو حاصل تھے اور جن کو وہ کام میں لاتا کسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کم نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن ہی نے عیسائیوں کو اس خرابی سے مطلع کیا اور جو خرابیاں اس سے پیدا ہوتی ہیں ان کو بتایا اور جا بجا عیسائیوں کو اس غلامانہ اطاعت پر ملامت کی اور ان کو سمجھایا کہ اس رسوائی اور بے عقلی کی اطاعت کو چھوڑیں اور خود آپ اپنے لئے سچ کی جستجو کریں۔ چنانچہ قرآن مجید فرمایا:

یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ"

اور پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امرو الا لیعبدوا الھا وحدا لا الہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون"

"جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم جو اس وقت عیسائی تھے آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور ان کے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے عدی اس بت کو اپنے گلے سے نکال پھینک۔ چنانچہ نکال ڈالی۔ جب وہ واپس آئے تو آنحضرت ﷺ قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے۔ "**اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ**" جب آپؐ پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ "ہم تو ان کی پرستش نہیں کرتے" آپؐ نے فرمایا کہ یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کر دیتے ہیں اس چیز کو جسے خدا تعالیٰ نے حلال کیا پھر تم بھی اس کو حرام سمجھتے ہو اور حلال ٹھہراتے ہیں وہ اس چیز کو جسے خدا نے حرام کر دیا سو تم بھی اس کو حلال سمجھنے لگتے ہو؟ عدی نے کہا ہاں یہ تو ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا بس یہی ان کا پوجنا ہے۔"

"ایک مدت تک عیسائی اسلام کو عداوت سے دیکھا کئے اور اس کے ہر ایک مسئلہ سے بے سمجھی سے نفرت کرتے رہے مگر بعض نیک دل عیسائیوں نے کچھ تھوڑی بہت غور سے اسے دیکھا اور کالون اور لوتھر مقدس کے دل پر اس کا کچھ کچھ اثر ہوا جب کہ ان دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جن میں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوا دوسرے خدا یا جھوٹے خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اس سچے مسئلہ نے ان کے دل پر اثر کیا اور جیسی کہ قران نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ اور پادری ہے وہ چلا اٹھے کہ پالیا اور اسی وقت پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور غلامانہ اور ذلیل حالت سے جس میں وہ خود اور ان کے تمام ہم مذہب مبتلا تھے نکل آئے اور صاف صاف اس کے خلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہو گئے جس کی بدولت ہم کروڑوں عیسائیوں کو پروٹسٹنٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام عیسائی مذہب کو یہ نعمت نہ بخشتا تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھولک فرقہ کے لوگ بت پرست ہیں اور حضرت مسیحؑ کی مجسم مورت صلیب پر لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں بس عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے۔"

"چونکہ درحقیقت لوتھر مقدس نے مذہب اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی اس لئے اس کے مخالف علانیہ اس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان تھا کہ کوارٹر لی ریویو نمبر ۲۵۴ میں لکھا ہے کہ جینی برارڈ نے پوپ کی خاطر سے جرمنی کے ریفارمروں اور خصوصاً لوتھر کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ وہ عیسائیوں میں مذہب اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اس مذہب میں لانے کی کوشش کر کرتے ہیں مرا کسی کی یہ رائے ہے کہ اسلام میں اور لوتھر کے عقیدہ میں کچھ بہت فرق نہیں ہے۔ چنانچہ دونوں کا میلان جو بت پرستی

کے خلاف ہے اس پر غور کرو مارٹینس' الفانس اور والڈس کہتے ہیں کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثابت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام میں اور لوتھر کے مذہب میں ایک رتی بھر کا بھی تفاوت نہیں ہے۔ محمد (ﷺ) نے انہی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد (یعنی پیروان لوتھر) کرتے ہیں۔''

تاہم لوتھر نے اپنی کوشش کو نہیں چھوڑا اور آخر کار اس عظیم الشان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا جو عموماً مذہب پروٹسنٹ یا ریفارمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے جو ایک مرشدانہ غلامی تھی' آزاد کر دیا ہم کو یقین ہے کہ اگر لوتھر مقدس اور زندہ رہتے تو ضرور وہ مسئلہ تثلیث کے مخالف ہوتے اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جو درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی مسئلہ تلقین کیا تھا لوگوں میں پھیلاتے اور آخر اس نبی آخر الزماں ﷺ پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے۔

پانچواں خطبہ

پانچویں خطبہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں یعنی کتب حدیث' کتب سیر' تفاسیر اور کتب فقہ کی تصنیف کا منشاء اور غرض اور ڈھنگ بیان کیا ہے تاکہ غیر مذہب کے محقق اور نکتہ چین جو اسلام کی نسبت آئندہ زمانہ میں کچھ لکھنا چاہیں ان کو مسلمانوں کی مذہبی کتابوں کی طرز تصنیف سے آگاہی اور بصیرت حاصل ہو اور وہ ان مصنفوں کی طرح جو اسلام کی مذہبی کتابوں سے ناواقفیت کے سبب غلط میں پڑے ہیں گمراہ نہ ہوں اور ان کی رہبری کے لئے ایک سیدھا رستہ بن جائے۔

چھٹا خطبہ

چھٹا خطبہ مذہب اسلام کی روایات پر لکھا گیا ہے کہ یہ خطبہ کسی قدر طولانی ہے اس لئے صرف اس کی سرخیاں لکھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس میں اول روایت کی اصلیت اور یہ کہ ان کے رواج کی ابتداء کیونکر ہوئی اور نیز یہ کہ دین اسلام انہیں صحیح روایتوں پر منحصر ہے جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتی ہیں نہ دیگر دنیوی امور سے بیان کیا ہے پھر جھوٹی روایت کے' راویوں کے درجہ اعتبار بلحاظ ثقہ کے یہودیوں سے روایت کرنے کی اجازت جو آنحضرتؐ نے صحابہ کو دی اختلاف روایت کے اسباب' احادیث موضوعہ کا بیان' یہ تمام باتیں مفصل بیان کی گئی ہیں اس کے بعد سر ولیم میور نے جن روایات سے استدلال کر کے اسلام اور بانی اسلام پر اعتراضات وارد کئے ہیں ان اعتراضوں کا نہایت شافی جواب الزامی اور تحقیقی دونوں سے دیا ہے۔

یہ دونوں خطبے یعنی پانچواں اور چھٹا نہایت ضروری مفید اطلاعوں پر مشتمل ہیں جو اسلام کی مذہبی کتابوں اور روایتوں پر ایسی روشنی ڈالتے ہیں جس کے اجالے میں کوئی غیر مذہب مصنف بشرطیکہ اس نے آنکھیں بند نہ کر لی ہوں' ٹھوکر نہیں کھا سکتا۔

ساتواں خطبہ

ساتویں خطبے میں اول قرآن مجید' اس کا نزول اس کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب' اس کی مختلف قرأتیں' آیات' ناسخ و منسوخ کی بحث' اس کے جمع ہونے کا زمانہ اس کی نقلوں کی اشاعت اور اس کا کامل اور الہامی ہونا بیان ہوا ہے اور اس کے بعد سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیاں جو انہوں نے قرآن مجید کے متعلق کی ہیں بیان کی ہیں۔

ان غلطیوں کا اصل منشاء وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ''مسلمان بادشاہوں یا عالموں کو تو خدا نے توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری زبانوں میں ترجمہ کراتے اور مختلف ملکوں میں شائع کرتے۔ یورپ کی زبانوں میں بے شک اس کے ترجمے ہوئے مگر وہ سب غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کئے ابتداء میں جس طرح پر بذریعہ ان ترجموں کے قرآن کا رواج یورپ میں ہوا اس کا بیان گاڈفری ہگنز نے عمدہ طرح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ ''اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح پر شائع ہوتا ہے کہ ہر لفظ قابل تبدیل (یعنی محتمل المعنیین) متین اور شائستہ معنی سے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت جس کا مضمون کسی جوڑ توڑ اور ناقابل برداشت غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پہنانے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے ایک بے قدر اور خراب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی' تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور بندھ سکتا جس کی وساطت سے یورپ میں قرآن کی اشاعت ہوئی۔''

اس کے بعد سرسید نے سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کی غلطیوں کی تشریح کی ہے اور جو اعتراض انہوں نے غلط فہمی سے قرآن پر وارد کئے ہیں ہر ایک کا جواب دیا ہے۔

آٹھواں خطبہ

آٹھواں خطبہ خانہ کعبہ کے حالات اور اس کی تاریخی اور جغرافی تحقیقات پر مشتمل ہے۔ یہ خطبہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ یقطان جس کا ذکر توریت میں جا بجا آیا ہے اہل عرب کا اس کی اولاد میں ہونا' حضرت اسمٰعیلؑ کا مکہ کے قریب آباد ہونا' خانہ کعبہ کی تعمیر اور اس کی تمام مراسم کا ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ سے تعلق ہونا' یہ سب بناوٹ اور افسانہ ہے اور ہر قسم کی تاریخی سچائی اور مورخانہ احتمالات و قیاسات سے نہایت بعید ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''حجر اسود کو بوسہ دینا' کعبہ کے گرد طواف کرنا اور عرفات میں منیٰ میں رسمیات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیمؑ سے یا ان خیالات و اصول سے جو غالباً ان کی اولاد کو ان سے پہنچے کسی طرح تعلق نہیں ہے۔ یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مختص المقام تھیں یا ان کو بت پرستی کے ان اصول سے جو جزیرہ عرب کے جنوب میں جاری تھے تعلق تھا۔'' اس دعوے سے ان کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جو آگے چل کر آنحضرت ﷺ کے بنی اسماعیل ہونے سے انکار کیا ہے اور آپ کے نسب نامہ پر شبہات وارد کئے ہیں ان کے لئے ایک وجہ ہاتھ آئے۔

سرسید نے اس خطبہ میں نہ صرف مسلمانوں کی تاریخوں سے بلکہ زیادہ تر یورپ کے عیسائی محققوں اور جغرافیہ دانوں کی تحقیقات سے حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی اولاد کا حجاز یا عرب میں ہونا ثابت کیا ہے اور اس کے بعد توریت کی نہایت صریح شہادتوں سے اس امر کا ثبوت دیا ہے کہ حجر اسود اور قربانی کی رسم اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد سے تعلق ہے انہوں نے توریت کے بہت سے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اولاد یعنی حضرت اسحٰقؑ ' حضرت یعقوبؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سب کا یہی طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لئے ایک بن گھڑا پتھر مثل حجر اسود کے کھڑا کر کے مذبح بناتے تھے اور اس کو بیت ایل یعنی بیت اللہ کہتے تھے اور تمام مراسم جو موسم حج میں خانہ کعبہ اور اس کے قرب و جوار میں مسلمان ادا کرتے ہیں ان سب کا تعلق حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ ایسے طور پر ثابت کیا ہے جس سے فی الواقع سر ولیم میور کے شبہات ہر منصف مزاج آدمی کی نظر میں نہایت بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

مثلاً وہ کعبہ اور حجر اسود کی نسبت کتب پیدائش اور کتاب خروج کے متعدد بابوں اور آیتوں کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں ''حجر اسود وہی مذبح ہے جس کو خدا کے حکم سے ابراہیمؑ اسحٰقؑ یعقوب اور موسیٰ علیہم السلام بناتے تھے۔ یہ سب بزرگ ایسے پتھر کی تعظیم کرتے تھے یعقوب نے اس پر تیل ڈالا جو اس زمانے کے دستور کے موافق غایت الغایۃ تعظیم پرستش کے قریب تھی۔ یعقوبؑ نے کہا کہ یہ جگہ خانہ خدا ہوگی اور خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تا کہ تمہاری شرمگاہ اس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے پس اب کونسا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت بنی ابراہیمؑ کی رسم سے جدا کر کے عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں۔''

''ایک گھر کا خدا کے واسطے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا' جیسے کہ کعبہ ہے اور اگر ابراہیمؑ کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی حضرت موسیٰ ؑ) جس نے بمقام گبعون بیابان میں خدا کا گھر بنایا اور وہ کون تھا (یعنی حضرت داؤدؑ) جس نے خرمنگاہ ارنان یبوسی کو خدا کا گھر بنانے کو مول لیا اور پتھر ولکڑی ولوہا و پیتل اس کے بنانے کو جمع کیا اور وہ کون تھا (یعنی حضرت سلیمانؑ) جس نے بعد کو خرمنگاہ ارنان یبوسی میں نہایت عالیشان مکان بنایا جس کو خدا کا گھر اور بیت المقدس نام ملا پس کعبہ کی بنا کو اور اس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیم کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے۔''

عرفات ایک ایسی چیز ہے جو تمام دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی عرفات کا استعمال بجز خاندان ابراہیمؑ کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا یہی وہ مقام ہے جہاں حاضر ہونے کو حج کہتے ہیں۔ وہاں کوئی چیز نہیں ہے پہاڑ تلے کا میدان ہے' اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کی یاد کرتے ہیں' وہاں خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام نے کوہ سینا کی تلیٹی میں سنائے تھے۔ پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیمؑ سے۔

اس کے بعد منیٰ کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''منیٰ کا مقام صرف قربانی کے لئے ہے وہاں بجز قربانی کے اور کوئی رسم نہیں ہوتی تمام توریت قربانی کی رسم سے بھری پڑی ہے۔ جہاں بیت اللہ بنا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی اور اسی قربانی کے سبب سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا منیٰ اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہیں اس لئے قربانی نذر کرنے کے لئے وہ مقام قرار دیا گیا تھا ہاں ابراہیمؑ و یعقوب و اسحاق اور موسیٰ اور داؤد علیہم السلام اور سلیمان علیہ السلام کی قربانی اور اسلام کی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اس قربانی میں جانور کو مار کر اس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے اس خیال سے کہ خدا کو اس کی خوشبو یعنی چراند پسند آتی تھے اور اسلام میں وہ قربانی غریب و محتاج لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے تا کہ وہ بھوک میں سختی سے محفوظ رہیں اگر اسی امر کے سبب سر ولیم میور نے منیٰ کی رسومات کو بت پرستی کی رسوم تصور کیا ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر ذی عقل اس پہلی قربانی سے اس پچھلی قربانی کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا۔''

یہ خطبہ بہت لمبا ہے اس کی اصل خوبی بغیر اس کے کہ اس کو اول سے آخر تک اصل کتاب میں دیکھا جائے معلوم نہیں ہوسکتی اس میں سر ولیم میور کے شبہات کی تردید کرنے کے بعد خانہ کعبہ اور مکہ معظمہ کی تاریخ محققانہ طور سے مفصل بیان کی گئی ہے۔

نواں خطبہ

نواں خطبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب کی تحقیقات پر ہے۔ اس خطبہ کے لکھنے کا منشا یہ تھا کہ سر ولیم میور نے اپنی کتاب

میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بنی اسمٰعیل ہونے سے انکار کیا ہے چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''غالباً یہ کوشش کہ وہ (یعنی آنحضرتؐ) اسمٰعیلؑ کی نسل سے ثابت کئے جائیں ان کی حین حیات میں پیدا ہوگئی تھی اور اس طرح پر محمد (ﷺ) کے ابراہیمی ؑ نسب نامہ کے ابتدائی سلسلے گھڑے گئے تھے اور بنی اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بے شمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچے میں ڈھالے گئے تھے'' سر ولیم میور کو نسب پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت غالباً اس سبب سے ہوئی کہ آنحضرت ﷺ کا نسب سیر کی کتابوں میں صرف عدنان تک مسلسل بیان ہوا ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے مگر عدنان کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام تک جتنی پشتیں اہل سیر نے لکھی ہیں ان میں اختلافات واقع ہوئے ہیں۔

اس بنا پر اس خطبہ اول میں سرسید نے ایک نہایت عمدہ تمہید لکھی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ''زمانہ جاہلیت میں عرب کے لوگ کوئی فن نہیں جانتے تھے مگر دو باتیں ان میں بے مثل تھیں ایک شاعری دوسرے علم الانساب چونکہ ان کے ہاں کتاب کا رواج نہ تھا اور صرف حافظہ پر مدار تھا اس لئے وہ اپنے اپنے قبیلہ کی تمام پشتیں تا بمقدور از بر یاد رکھتے تھے اور اپنے نسب پر فخر کرتے تھے اور اپنے حریفوں کے نسب میں عیب نکالتے تھے مگر چونکہ بغیر کتاب کے کسی قبیلے کی تمام پشتوں کو بہ ترتیب یاد رکھنا غیر ممکن تھا اس لئے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور اشخاص کے نام تو ضرور یاد رہتے تھے لیکن باقی کے نام کچھ یاد رہتے تھے اور کچھ بھول جاتے تھے مشاہیر کے نام یاد رہنے کا ایک یہ بھی سبب تھا کہ ان کے نام اور ان کے کارنامے اشعار میں بیان ہوتے تھے اور بڑے بڑے معرکوں میں وہ اشعار پڑھے جاتے تھے ان وجوہات سے ہر شخص اپنے تئیں اور اپنے ہمسایہ اور مخالف کو بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قبیلہ اور کس نسل سے ہے اور کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے اور جھوٹ موٹ اپنے کو کسی دوسری نسل کا بتا سکے اگرچہ کسی کو کسی قبیلے کی نسلیں بہ ترتیب یاد نہ ہوں مگر ہر ایک قبیلے میں جو نامور اور قابل اشخاص ہوتے تھے وہ سب کو یاد رہتے تھے اس لئے جب اسلام کے زمانہ میں کتابت اور تصنیف و تالیف کا رواج ہوا اور ایک مدت کے بعد مؤرخین نے کسی کا پورا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہا ان کو ایسی دقتیں پیش آئیں جن کا حل کرنا بہت دشوار تھا کیونکہ نسب ناموں کے بہ ترتیب یاد نہ ہونے کے علاوہ دوسری مشکل یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں ہوتے تھے اور پھر ایک ہی شخص کے کئی کئی نام ہوتے شام و عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ نسب نامہ کے اشخاص میں جو شخص مشہور و معروف ہوتا باپ کی جگہ اس کا نام لے دیتے تھے جیسا کہ انجیل متی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت لکھا ہے کہ ''نسب نامہ عیسیٰؑ بن داؤد ابن ابراہیمؑ'' حالانکہ مسیح سے داؤد تک اور داؤد سے ابراہیم ؑ تک بہت ہی پشتیں درمیان میں تھیں مگر چونکہ داؤد ؑ اور ابراہیمؑ نہایت مشہور اشخاص تھے اس لئے مسیح ؑ کو داؤدؑ کا اور داؤدؑ کو ابراہیمؑ کا بیٹا بتا دیا۔''

''عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنا کرسی نامہ بیان کرتے وقت جب آباؤ اجداد کے نام ان کی یاد کے موافق ہو جاتے تو اخیر یاد رہے ہوئے شخص کا بیٹا کہہ دیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے ان اسباب سے مورخوں کو ان کے نسب نامے سلسلے وار لکھنے میں سخت مشکلات پیش آئیں۔''

آنحضرت ﷺ کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنے والوں کو بھی یہی مشکلیں پیش آئیں۔ آپ کو اپنا کرسی نامہ بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ تمام عرب کے لوگ یقیناً آپ کو قبیلہ قریش سے اور قریش کو معد ابن عدنان کی اولاد میں اور عدنان کو قیدار ابن اسمٰعیلؑ ابن ابراہیمؑ کی اولاد میں جانتے تھے اور اسی قدر ان کا جاننا آپ کے بنی اسمٰعیلؑ ہونے کے لئے کافی تھا' گو کہ درمیان میں کتنی ہی پشتیں گزری ہوں۔ اسی لئے کوئی صحیح روایت آپ کے نسب نامہ کے متعلق موجود نہیں ہے سوائے اس کے کہ آپ نے فرمایا:

''ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ اور میرے والی ہیں۔''

''پس جب لوگوں نے آنحضرت ﷺ کا نسب نامہ بالترتیب لکھنا چاہا تو ان میں اختلاف ہونا ایک ضروری امر تھا آنحضرتؐ سے لے کر معد ابن عدنان تک کسی مورخ کا اختلاف نہیں ہے۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ معد ابن عدنان سے اسمٰعیلؑ تک کی پشتوں میں ہے صرف پانچ شخص ہیں جن کے لکھے ہوئے نسب ناموں میں معد ابن عدنان سے لے کر ابراہیمؑ تک پشتوں کا بیان ہوا ہے۔''

اس کے بعد سرسید نے تین نسب ناموں کو غلط بتایا ہے کیونکہ ان میں سے قطع نظر اختلافات کے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو زمانہ عدنان اور ابراہیمؑ کے درمیان گزرا ہے وہ نو یا دس یا گیارہ پشتوں میں سے (یعنی فی صدی تین پشتوں کے) مسلمہ قاعدے کے موافق پورا نہیں ہوتا اب دو نسب نامے باقی رہ گئے ایک برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کا دوسرا الجرا کا۔ ارمیا نبی جیسا کہ بائبل سے ثابت ہے خود معد ابن عدنان کے زمانے میں تھے اور بخت نصر کے ہنگامہ میں انہوں نے معد کو بچایا تھا اور اپنے ساتھ لے گئے تھے یہ قوی قرینہ اس بات کا یہ ہے کہ ان کو معد کا نسب نامہ اسمٰعیلؑ ابن ابراہیمؑ تک لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی اور اس نسب نامہ کو مسعودی اور واقدی دونوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے مگر اس نسب نامہ سے بھی اگر اس میں آنحضرت سے عدنان تک جتنی پشتیں ہیں ان کو شامل کر لیا جائے تو وہ زمانہ جو آنحضرتؐ سے ابراہیمؑ تک ہے پورا نہیں ہوتا۔

جو شجرہ الجرا نے لکھا ہے وہ بھی اب تک ایک جدا نسب نامہ سمجھا جاتا تھا مگر سرسید نے نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ وہ جدا نسب نامہ نہیں ہے بلکہ برخیا کے نسب نامہ کا تتمہ ہے کیوں کہ اس کو تتمہ فرض کرنے کی صورت میں آنحضرتؐ سے اسمٰعیلؑ کی ولادت اور آنحضرت کی ولادت کے درمیان گزرا ہے یعنی دو ہزار چار سو پچھتر برس کا زمانہ۔

سر ولیم میور بطور طعن کے لکھتے ہیں کہ ''آنحضرتؐ کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے'' اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ ''بلاشبہ اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ وہ اسمٰعیلؑ کی اولاد تھے اور بنی اسرائیلؑ اسحٰق علیہ السلام کی۔ وہ ان پڑھ جاہل تھے اور یہ لکھے پڑھے قابل پس یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے اس کو دریافت کریں یا جس بات کی تفصیل آنحضرتؐ نے نہیں فرمائی اس کا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں خصوصاً اس وجہ سے کہ آنحضرتؐ نے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی تھی۔''

''پس جبکہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے نسب نامہ لکھنے کا خیال ہوا جس کا کبھی مذکور آنحضرتؐ کی زندگی میں نہیں ہوا تو بلاشبہ انہوں نے اپنے بنی اسرائیل بھائیوں سے جو لکھے پڑھے تھے اور تاریخ نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا ان کے ہاں رواج تھا مدد لی۔''

اس کے بعد سرسید کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ''نہایت تعجب ہے کہ عیسائیوں نے کیوں اس امر کو ثابت کرنے کی بے فائدہ سعی کی ہے کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے اور از راہ طعن ہماری نسبت کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں باتیں یہودیوں سے لی ہیں گویا وہ سمجھتے ہیں کہ اسلام یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا مذہب ہے اور جیسے کہ عیسائی مذہب یہود کا بالکل محتاج ہے اسی طرح اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے ہم نہایت خوشی سے اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور جو مشابہت ان دونوں ربانی انہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اس کو نہایت فخر سمجھتے ہیں صرف ہم

مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدمؑ ونوحؑ اور ابراہیمؑ و موسیٰؑ وعیسیٰؑ اور محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین سب کا ایک ہی دین تھا جیسا کہ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا "قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا للہ" ہم مسلمانوں کا فخر یہی ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰؑ روح اللہ کے پیرو ہیں جنہوں نے یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کو خبر دی تھی اور ان کی پیروی کی ہدایت کی تھی مگر یہودیوں نے ان تینوں کو اور عیسائیوں نے اس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا نہ مانا اور ان کی سچی پیروی ہم مسلمانوں ہی نے کی۔"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ "آنحضرتؐ کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے خدا کے اس وعدہ کا پورا ہونا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰؑ کی زبانی کیا تھا کہ میں تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا' کچھ اس بات پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسمٰعیلؑ کی نسلیں محمدؐ سے لے کر اسمٰعیلؑ تک ہم کو ترتیب وار اور پوری پوری یاد ہوں اور نہ اس بات پر منحصر تھا کہ وہ کرسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہودی روایتوں اور برخیا کی تحریروں سے لیں' وہ اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے ایک کے لئے ہونا تھا سو محمد رسول اللہ ﷺ کی نسبت پورا ہوا۔تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب و جوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مؤرخ خواہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے اور مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کرتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ بنی ہاشمؑ قریش اسمٰعیل ابن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں۔محمد رسول اللہ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ ابیکم ابراھیم (علیہ السلام) جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے۔"

اس کے بعد ابوالفداء مسلمان مورخ اور مسٹر گبن اور ریورنڈ فاسٹر عیسائی مؤرخوں کی شہادتیں نقل کی ہیں جن میں سے گبن کا قول یہ ہے کہ محمد ﷺ کو حقیر اور مبتذل نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک احمقانہ افترا ہے۔ایسا افترا کرنے سے بجائے اس کے اس سے مخالف کی خوبیوں کو گھٹائیں ان کو اور زیادہ بڑھاتے ہیں۔اسمٰعیل سے ان کی نسل کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔بالفرض اگر کرسی نامہ کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہ ہوں اور ابہام میں ہوں تو اور بہت پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف ونجیب ہیں۔وہ قریشی اور بنی ہاشم ہیں جو اہل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرمانروا اور کعبہ کے موروثی محافظ تھے۔یہی رائے مسلمان مورخ یعنی ابوالفداء کی ہے اور یہی گواہی ریورنڈ مسٹر فاسٹر نے دی ہے۔

اس کے بعد سرسید لکھتے ہیں کہ "اب ہم اس خطبہ کے خاتمہ میں اپنے پیغمبر کا نسب نامہ جس طرح کہ ہم نے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں اور چونکہ مجھ کو بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اسی آفتاب عالمتاب کے ذروں میں سے ہوں اس لئے اپنے نسب کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیا ہوں تاکہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اس سرور دو جہان سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اس سرور عالم میں ہے جس کے سبب **لحمک لحمی و دمک دمی** ہمارا موروثی خطاب ہے اس ظاہری ارتباط سے معزز ہو جائے۔"

گرچہ خرد نسبتے ست بزرگ
ذرہ آفتاب تابانیم

دسواں خطبہ

دسواں خطبہ ان بشارتوں کے بیان میں ہے جو توریت اور انجیل میں آنحضرتؐ کے نبی ہونے کی بابت مذکور ہیں۔ اس خطبہ میں اول سرسید نے قرآن مجید کی وہ آیتیں نقل کی ہیں جن میں اس بات کا بیان ہے کہ توریت وانجیل میں آپ کو نبوت کی خبریں دی گئی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے وہ وجوہات بیان کی ہیں جن کی سبب سے اکثر قدیم مسلمان عالموں نے انبیائے سابقین کی کتابوں کا پورا پورا اعتبار نہیں کیا اور اس لئے انہوں نے توریت وانجیل میں ان بشارتوں کی زیادہ تفتیش نہیں کی اور تحریف کا عذر پیش کر کے ان بشارتوں کے نشان دینے سے جن کی قرآن میں جابجا خبر دی گئی تھی دست بردار ہو گئے پھر ان محققین کا ذکر کیا ہے جنہوں نے نہایت کوشش اور استقلال سے ان کی تفتیش کی' اور توریت وانجیل میں بہت سے ایسے مقامات دریافت کئے جہاں آنحضرتؐ کے نبی ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔ مگر چونکہ ان کی نشاندہی ہوگئی بشارتیں جو ہمارے مذہبی کتابوں اور تفسیروں اور سیر وتواریخ میں مذکور ہیں ان کی بابت کچھ پتہ نہیں دیا گیا کہ وہ بائبل کی کونسی کتاب اور کون سے باب اور کون سی آیتوں میں بیان ہوئے ہیں اور نہ یہ بتایا گیا ہے کہ قلمی قدیم نسخے میں جن میں کثرت سے اختلاف عبارت تھے اور جن کے جدا جدا نام تھے ان میں سے کون سے نسخہ میں وہ بشارتیں پائی گئیں اور نہ یہ جتایا گیا کہ بائبل کی بہت سی کتابیں' جو اب مفقود ہیں' یا جن کو عیسائی اب نامعتبر سمجھتے ہیں وہ بشارتیں ان میں سے لی گئی ہیں یا موجود مسلمہ کتابوں میں سے۔ اس لئے سرسید نے صرف چند بشارتیں جو آنحضرت ﷺ کے حق میں نہایت صراحت کے ساتھ صادق آتی ہیں اور جو موجود مسلمہ مجموعہ عہد عتیق وعہد جدید میں موجود ہیں' جس کو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں اس خطبہ میں بیان کی ہیں۔

(ان میں اکثر بشارتیں سرسید سے پہلے ہمارے زمانے کے بعض علماء نے مسلمہ مجموعہ بائبل سے بحوالہ باب اور آیت کے نقل کی ہیں مگر جس عمدگی کے ساتھ خطبات میں ان کا بیان ہوا ہے ویسا کسی نے بیان نہیں کیا۔)

اس کے بعد انہوں نے جس طریقہ سے بائبل میں پیشین گوئیاں آنے والے پیغمبر کی نسبت بیان ہوئی ہیں بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا بیان بالکل ایسا ہی ہے جیسے پہیلی یا معمے کا بیان ہوتا ہے جب تک کہ ان کی تشریح نہ کی جائے اور ان کا حل نہ بتایا جائے ان کا مطلب ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ سکتا اس لئے اس سے کہ آنحضرت ﷺ کی بشاریں بیان کریں' انہوں نے اول بطور مثال کے عہد عتیق کی وہ بشارتیں لکھی ہیں جن کو حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں بتایا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بائبل میں پیشین گوئی کس طریقہ سے بیان کی جاتی ہے اور نیز حضرت عیسیٰؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتوں کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہو جائے کہ کونسی بشاتیں زیادہ روشن اور صاف ہیں اور کونسی مبہم اور دھندلی۔

اس کے بعد انہوں نے چھ بشارتیں عہد عتیق سے اور تین بشارتیں عہد جدید سے آنحضرت ﷺ کی نسبت بیان کی ہے۔ از اں جملہ عہد عتیق کی تین بشارتیں جن میں سے ایک کتاب استثنا باب (۱۸) میں اور دوسری کتاب استثنا باب (۳۳) وکتاب حبقوق نبی باب (۳) میں اور تیسری کتاب تسبیحات (۵) میں مندرج ہے اور انجیل یوحنا باب (۱۴) میں سے ایک بشارت یہ چار بشارتیں نہایت معرکۃ الآراہیں جن کی یہودیوں اور عیسائیوں کو عجیب عجیب تاویلیں کرنی پڑی ہیں اور عیسائیوں نے ان کے ترجموں میں عجیب عجیب کارستانیاں کی ہیں سرسید نے ان چاروں بشارتوں کی جیسے کہ چاہے اس سے بھی کچھ بڑھ کر تحقیقات کی۔ بڑے بڑے

عیسائی محققوں کے اقوال اور بائبل کے حوالوں سے اپنے استدلالات کو تقویت دی ہے اور اپنے بیان کو فی الواقع اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ کسی عیسائی کو باوجود ماننے عیسیٰؑ مسیح کی پیشین گوئیوں کے آنحضرتؐ کی پیشین گوئیوں سے انکار کرنے کے محل باقی نہیں رہا۔

گیارھواں خطبہ

گیارھویں خطبہ میں معراج اور شق صدر کی حقیقت محققانہ طور سے بیان کی ہے اور اس باب میں جس قدر مختلف اور متناقض **روایتیں** حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں ان کا اختلاف اور تناقض دکھایا اور اس لئے جس قدر کہ قرآن مجید میں معراج کی نسبت بیان **ہوا ہے** صرف اسی پر معراج کے واقعہ کا انحصار رکھا ہے اور معراج کو رویا پر محمول کیا ہے جس کا ایک جزو شق صدر بھی تھا اور عیسائیوں کے طعن کا جواب الزامی اور تحقیقی دونوں طرح کا دیا ہے۔

یہ دونوں بحثیں یعنی معراج اور شق صدر کی سرسید نے خطبات لکھنے کے بہت بعد اپنی تفسیر میں بہت زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کی ہیں جیسی کہ ان سے پہلے شاید کسی نے نہیں بیان کیں اس لئے ان دونوں بحثوں کو تفسیر میں دیکھنا چاہیے۔

بارھواں خطبہ

بارھویں خطبہ میں آنحضرتؐ خطبہ آنحضرت ﷺ کی ولادت سے بارہ برس کی عمر تک کا حال جس قدر معتبر اور صحیح روایتوں سے ثابت ہوتا ہے بیان کیا ہے اور جو بیشمار رطب ویابس روایتیں اہل سیر نے اپنے کتابوں میں بھر دی ہیں اور جن کی رو سے سرولیم میور نے اپنی کتاب میں جابجا تعریفیں کی ہیں ان کی تضعیف کی ہے اور اکثر جگہ بر تقدیر ان کی صحت کے نہایت لطیف جواب سرولیم میور کی تحریرات کے دیئے ہیں مثلاً سرولیم میور نے جو بارہ برس تک کے بعض واقعات تعریضاً بیان کئے ہیں جیسے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ آنحضرتؐ کے کھیل کود میں مصروف رہنا اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا اپنی رضاعی بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا اس پر سرسید لکھتے ہیں کہ ''اگر چہ ان باتوں کی کوئی معتبر سند نہیں ہے لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لیں جائیں تو یہ ایسی باتیں ہیں جو ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ آنحضرتؐ نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے انہوں نے آپ کو صرف یہ کہا تھا کہ ''**انما انا بشر مثلکم یوحی الی**'' پس ایسی باتیں اگر ہوئیں بھی تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔''

یا مثلاً سرولیم میور بارہ برس کی عمر میں آنحضرت ﷺ کے سفر شام کا حال ابوطالب کے ہمراہ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''زمانہ سابق کے منہدم اور اجڑے ہوئے مقاموں نے جن کو خیالی قصوں اور عجیب اور غریب بیانوں اور دل انگیز روایتوں نے اور بھی پر اثر کر دیا تھا اور گرجاؤں کی صلیبوں اور مورتوں اور دینی علامتوں سے آراستہ ہونے اور گھنٹوں کے بجنے کی قومی رسموں نے محمد ﷺ کے خوض کنندہ دل دماغ پر ایک گہرا نقش اور پائیدار اثر کر دیا تھا۔''

سرسید اول تو سفر شام میں چچا کے ساتھ آنحضرتؐ کے جانے کی روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے اور اس کے بعد بر تقدیر تسلیم لکھتے ہیں کہ ''ہم نہایت ادب سے سرولیم میور سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص (جیسا کہ سرولیم میور نے آنحضرتؐ کی نسبت لکھا ہے) کا دل ودماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے اور کیا ایک مصروع شخص خوض کنندہ دل ودماغ رکھتا ہے؟ اگر چہ یہ بیان سرولیم میور کا نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے' کیونکہ اسی لڑکے نے جس کے دماغ صلیبوں اور مورتوں اور

علامات دین عیسوی سے اس قدر اثر پذیر ہوا تھا بعد کو انہیں چیزوں کی مخالفت اختیار کی' صلیب کو توڑا' مورتوں کو پھوڑا ان کی پرستش سے منع کیا اور بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا' خدا کو وحدہ لاشریک بتایا اور اسی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دنیا میں اسی کو رواج دیا۔''

لیکن اس بات کو تسلیم کر کے کہ درحقیقت مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر اثر کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں گزرے تھے اور پھر آٹھ برس ایک صحرا میں گزرے تھے اور پھر آٹھ برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گھر ارہا صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گزرتی تھی پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے' گرجاؤں' صلیبوں' مورتوں اور علامات دین عیسوی کے دیکھنے سے ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل وفہم وزکاء سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں سے ان کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود غیر حاضر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں ایسے ایسے عالی خیالات مستنبط کر سکا وہ بلاشبہ مادرزاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت خود اس کی معلم تھی اور وہ وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہہ کر بشارت دی ہے کہ سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لئے ضروری ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط یعنی احمد مجتبیٰ تمہارے پاس نہیں آوے گا اور اگر میں چلا جاؤں تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔

اس خطبہ میں بمقابلہ سر ولیم میور کی تعریضات کے اور بہت سے لطیف سے مباحث ہیں جن کو خطبات احمدیہ میں دیکھنا چاہیے۔

یہ جو کچھ ہم نے خطبات احمدیہ میں سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے اس کو ایک بہت بڑے حوض یا تالاب میں چلو دو چلو پانی سمجھنا چاہیے اس کتاب کی خوبی اور جو کچھ کہ اس میں لکھا ہے اس کی حقیقت جب تک اصل کتاب کو نہ دیکھا جائے ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی خصوصاً اردو خطبات جو سر سید نے ولایت سے آ کر بہت مدت کے بعد لکھی ہے اور جس میں بہ نسبت انگریزی ترجمہ کے ہر ایک بات زیادہ وسعت کے ساتھ لکھی ہے۔ اس سے مصنف کی محنت لیاقت اور اسلام کی محبت کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے مگر افسوس ہے کہ یہ کتاب زیادہ تر مالی مشکلات کے سبب سر سید کے ارادہ کے موافق پوری نہ ہو سکی۔ ان کا ارادہ سر ولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس میں سے صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھہرنا ممکن ہو گیا اور ہندوستان میں پہنچ کر کچھ تو اس وجہ سے کہ یہاں آ کر وہ کالج کی فکر میں مصروف ہو گئے اور زیادہ تر اس سبب سے کہ جو کتابیں لندن میں میسر آ سکتی تھیں ان کا ہندوستان میں کہیں وجود نہ تھا' وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا مگر جو مباحث سر ولیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم تھے ان میں سے چند کے سوا سب کا تفصیلی یا اجمالی جواب اسی ایک جلد میں آ گیا ہے۔

کیونکہ جس اصول پر سر ولیم میور نے اپنے تمام اعتراضات کی بنیاد قائم کی ہے خطاب احمدیہ میں اس کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور نہایت واضح طور پر جتا دیا گیا ہے کہ اسلام پر مخالفین کا کوئی اعتراض اس وقت تک وارد نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ قرآن یا ان حدیثوں کی سند پر جو اصول علم حدیث کے موافق واجب التسلیم قرار پائیں مبنی نہ ہوں اور اس قاعدہ سے وہ اعتراضات یک قلم ساقط ہو جاتے ہیں جو عام تاریخ وسیر کی کتابوں یا اجتہاد فقہا یا اقوال علما و آرائے مفسرین کی رو سے مذہب اسلام پر ایراد کئے جاتے ہیں۔

جس وقت سر سید نے خطبات احمدیہ لکھی ہے اس وقت تک مذہبی تحقیقات کے متعلق ان میں وہ آزادی پیدا نہیں ہوئی تھی جیسی

تفسیر القرآن میں دیکھی جاتی ہے اور اس لئے خطاب احمدیہ میں کوئی بات ایسی نہیں پائی جاتی جس کو اسلام کے اصول متعارفہ کے خلاف سمجھا جائے البتہ دو ایک جگہ کسی قدر انہوں نے جمہور کے خلاف لکھا ہے جیسا کہ علماء محققین نے صدہا مسائل میں جمہور سے اختلاف کیا ہے مثلاً معراج کے مضمون کو جیسا کہ بعض صحابہ کا مذہب ہے رویا پر محمول کیا ہے اور شق صدر اور براق کی سواری کو اس رویا میں داخل کیا ہے اور ایک آدھ بات اسی قبیل کی جمہور کے خلاف بیان کی ہے لیکن اس سے اصول کی مخالفت لازم نہیں آتی۔ تعجب ہے کہ سر ولیم میور، جیسا کہ سرسید کی زبانی سنا گیا ہے جس وقت خطبات احمدیہ کو پہلی مرتبہ دیکھا تو یہ کہا کہ ''میں نے سید احمد کے اسلام پر اعتراض نہیں کئے بلکہ اس اسلام پر اعتراض کئے ہیں جس کو تمام دنیا کے مسلمان مانتے چلے آتے ہیں'' یہ بعینہ ایسی ہی بات ہے کہ ایک تیرانداز کسی گروہ کو نہتا سمجھ کر اس پر تیر برسانے شروع کرے اور جب ادھر سے بھی خلاف توقع تیر آنے لگیں تو یہ کہے کہ میرا مقابلہ نہتوں سے ہے تیراندازوں سے نہیں ہے۔ سر ولیم میور نے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ایک نئے طریقہ سے نکتہ چینی کی تھی اور چونکہ مسلمانوں نے اس قسم کے اعتراض پہلے عیسائیوں سے بہت کم سنے تھے اس لئے سر ولیم میور کو یقین تھا کہ کوئی مسلمان میرے اعتراضوں کا جواب نہیں دے سکے گا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ جس قسم کے آلات انہوں نے اسلام کے برخلاف استعمال کئے تھے اسی قسم کے آلات اسلام کی حمایت میں ایسے طور پر استعمال کئے گئے ہیں جس کی ان کو بالکل توقع نہ تھی تو مذکورہ بالا الفاظ ان کی زبان سے نکلے جن کے یہ معنی ہیں کہ میں نے تو اسلام کو نہتا سمجھ کر اس پر حملہ کیا تھا۔

الطاف حسین حالی

(ماخوذ از حیات جاوید تصنیف مولانا الطاف حسین حالی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

عجائبات دنیا میں سے زیادہ عجیب وہ خیال ہے جس کو لوگ مذہب کہتے ہیں۔ مذہب اس امتیاز کا نام ہے جو انسانوں کے افعال سے علاقہ رکھتا ہے اور جس کے سبب انسانوں کے افعال اچھے یا برے یا نہ اچھے نہ برے خیال کئے جاتے ہیں کیونکہ اگر انسان کے افعال میں یہ تمیز نہ ٹھہرائی جائے تو کسی مذہب کا وجود باقی نہیں رہتا۔

تمام خیالات جو انسان پیدا ہوتے ہیں اور تمام یقین جو انسان کسی چیز پر رکھتا ہے اس کا منشاء ان خیالات اور یقین کے سوا کچھ اور چیزیں ہوتی ہیں۔ جو ان خیالات اور یقین کے اسباب سمجھی جاتی ہیں۔ مگر تعجب یہ ہے کہ وہ خیال جس کو مذہب کہتے ہیں بغیر کسی خارجی اسباب کے اور بغیر تجربہ اور امتحان کے اور بدوں کسی معقول ثبوت کے یکا یک دل سے اٹھتا ہے اور اس لئے وہی اس کا مخرج سمجھا جاتا ہے اور پھر اس پر ایسا یقین ہوتا ہے کہ کسی آنکھ دیکھی چیز پر بھی نہیں۔

اس تعجب پر اور تعجب یہ ہے کہ اس بن دیکھی چیز اور ان سمجھی بات اور بے دلیل خیال کا لوگوں کی طبیعت پر ایسا سخت اثر ہوتا ہے کہ وہ اثر انسان کے تمام افعال پر اور قدرتی جذبات پر جو انسان میں خدا نے پیدا کئے ہیں غالب ہو جاتا ہے اور جو جوش اور ولولہ اس ازخود پیدا ہوئے خیال سے انسانوں کی طبیعتوں پر ہوتا ہے کسی دوسری چیز سے نہیں ہوتا گو کہ اس دوسری چیز کے صحیح اور یقینی ہونے کے لئے کیسی ہی عمدہ عمدہ دلیلیں اور کیسے ہی قطعی ثبوت موجود ہوں۔

اگر وہ خیال تمام انسانوں میں مختلف نہ ہوتا تو شاید یہ کہا جا سکتا کہ تمام عالم کا اس پر یقین رکھنا ہی اس کی سچائی کا ثبوت ہے مگر تعجب تو یہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر قوم اور ہر ملک اور ہر فرقہ بلکہ ہر فرد وبشر میں خیال ایسا مختلف رہا ہے کہ کسی ایک پر بھی یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں اور اس پر تعجب یہ ہے کہ ہر شخص کا یہی یقین ہے کہ میرا ہی خیال اور سب کے خیالوں سے بالکل صحیح اور بالکل سچا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح یونانی اپنے خدا اور دیوتا پر اور مسلمان و یہودی اپنے ایک خدا پر اعتقاد اور یقین کامل رکھتے ہیں اسی طرح ہندو اور مصری اپنے تینتیس کروڑ دیوتاؤں پر اعتقاد اور یقین کامل رکھتے ہیں۔

کیا یہ مسئلہ کہ تمام چیزیں ایک ہی کل کے جزو یا اس کی عین یا وہ بمنزلہ جان اور یہ بمنزلہ جسم کے ہیں صحیح ہے کیا یہ سب مختلف چیزیں جو ہم کو دکھائی دیتی ہیں سب ایک ہیں کیا نور وظلمت اور کالا سفید دونوں یکساں ہیں جیسا کہ ایک عارف باللہ کہتا ہے ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

یا یہ مسئلہ صحیح ہے کہ تمام چیزوں کا اسی سے ظہور ہے وہی ظلمت کا باعث اور وہی نور کے ظہور کا سبب ہے۔ وہی آسمانوں پر کڑکاتا ہے اور وہی زمینوں پر برساتا ہے وہی ستاروں کو چمکاتا ہے اور وہی پھولوں کی کلیوں کو کھلاتا ہے۔ اسی کا جلوہ بہشتوں کی کہاوت اور اس کا پردہ دوزخوں کی آفت ہے غمگین دل کا غم شاداں دل کی شادی اسی سے ہے وہ کسی جگہ نہیں اور سب جگہ ہے وہ کسی میں نہیں اور سب میں ہے عابد کے نورانی سینے اور فاسق کے بریاں دل اور معشوق کے عاشق کش ابرو اور عاشق کی گریاں چشم سب میں اس کی یکساں جگہ ہے۔ جس طرح کہ وہ اور زمینوں میں ہے۔ اسی طرح سے وہ باریک سے بال میں بھی ہے وہ سب کو دیکھتا ہے اور ہر چیز

کو جانتا ہے مگر اس کا جاننا یا علم ہم سے دو درجہ کم ہے کیونکہ وہاں ماضی اور استقبال نہیں ہے بہر حال اس بن دیکھی جناب اور ان سمجھی ذات کو جو کہو سو کہو مگر ان تمام مشکلوں پر ہم کو یہ مسلمانی مسئلہ کہ "انا عند ظن عبدی بی" اور بھی مشکل میں ڈالتا ہے۔

ربی انت عند ظنی رحیم فارحم علی

پھر ہمیں اور زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ یہ تمام مختلف خیالات جو لوگوں کے دلوں میں ہیں اور جو مذہب کہلاتے ہیں ایک ہی مخرج سے یعنی دل سے نکلے ہیں اور دل کے اس فعل کا جس سے یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں اعتقاد نام رکھا جاتا ہے پس اگر مدار مذہب کا اعتقاد ہو تو ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط ٹھہرانے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

کیا وجہ تمیز کی ہے اس سچی دلی پرستش میں جو ابراہیم کے باپ نے ایک بت کی کی اور اس سچے دل کے خیال میں جس سے ابراہیم نے اپنے باپ کے اس بت کو توڑا۔

ایک ہی واقعہ حضرت مسیح کے قتل کا ہے جو کالوری کی پہاڑی میں بیت المقدس کے پاس گزرا ان بے رحم قاتلوں نے اپنی دانست میں جو کچھ کیا مذہبی نہایت سچے اور مستحکم اعتقاد اور دل کے کپ کپا دینے والے ایمانی جوش سے کیا پس ان دو گروہوں نے میں سے جو نہایت ہی نیک کام سمجھتے ہیں اور جو نہایت پاک دلی سے اس کو نہایت ہی بدکام جانتے ہیں کونسی چیز تفرقہ کرنے والی ہے۔

کیا وجہ تمیز کی ہے سینٹ پال کی اس حالت میں جبکہ وہ دلی اعتقاد اور ابن کے جوش سے ان لوگوں کا ساتھی تھا جنہوں نے سینٹ اسٹیفن شہید کو سنگسار کیا اور اس حالت میں جب کہ اس نے اپنے سچے دل اعتقاد سے حضرت مسیح کو مانا۔

کیا چیز ہے جس سے ہم عمر رضی اللہ عنہ کی اس حالت میں تمیز کریں جبکہ اس نے لات ومنات پر سچا دلی اعتقاد رکھ کر امین عرب کے قتل پر کمر باندھی اور اس حالت میں جبکہ اس نے نہایت سچی دلی تصدیق سے کہا کہ **اشھد ان محمدا رسول اللہ**

یہ وہی عجیب خیال ہے جو دونوں طرف برابر نسبت رکھتا ہے اور جس کو لوگ مذہب کہتے ہیں پس ایسی ذوجہتین چیز کی جو ضدین میں برابر نسبت رکھتی ہو کسی جہت پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں البتہ ان تمام خیالوں میں سچا خیال یا تمام مذہبوں میں سچا وہی ہو سکتا ہے جو ضدین میں برابر نسبت رکھنے کے نقص سے پاک ہو۔

مذہب کیا چیز ہے؟ وہ ایک ایسا سچا اصول ہے کہ جب تک انسان اپنے قوائے جسمانی اور عقلی پر قادر ہے اس کے تمام افعال ارادی، جوارح، نفسانی، روحانی کا اسی اصول کے مطابق ہونا چاہیے پھر اگر وہ اصول ایسے ہیں کہ صرف کسی قسم کے اعتقاد پر مبنی ہیں تو اگر متعدد لوگوں کا متضاد اصولوں پر کسی وجہ سے اعتقاد ہے تو ایک کو سچا یا صحیح اور دوسرے کو جھوٹا یا غلط کہنے کی بجز تحکم کے اور کوئی وجہ نہیں سچا مذہب وہی ہو سکتا ہے، جس کی سچائی نہ کسی اعتقاد پر بلکہ حقیقی سچائی پر مبنی ہو کیونکہ مذہب اعتقاد کی فرع نہیں ہے بلکہ سچائی مذہب کی اصل یعنی عین مذہب ہے اور اعتقاد اس کی فرع ہے پس جبکہ ہم مختلف مذہبوں میں سچے مذہب کو پرکھنا چاہیں تو دیکھیں کہ وہ سچے اصول کے مطابق ہے یا نہیں۔

سچا اصول کیا ہے؟ جہاں تک کہ انسان اپنے قوائے عقلی سے جان سکتا ہے وہ بجز قدرت یا قانون قدرت کے اور کچھ نہیں جس کی نسبت اسلام کے بانی نے یہ فرمایا "**ما تری فی خلق الرحمن من تفاوت فارجع البصر هل تری من فتور فارجع البصر هل تری من فتور ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وهو حسیر۔**"

قدرت یا قانون قدرت کیا ہے؟ وہ وہ ہے جس کے بموجب ان تمام چیزوں مادی یا غیر مادی کا جو ہمارے اردگرد ہیں۔ ایک عجیب سلسلہ انتظام سے وجود ہے اور ہمیشہ انہی کی ذات میں پایا جاتا ہے اور کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا قدرت نے جس طرح پر جس کا ہونا بنا دیا ہے بغیر خطا کے اسی طرح پر ہوتا ہے اور اسی طرح پر ہوگا۔ پس وہی سچ ہے اور جو اصول کے مطابق ہیں وہی سچے اصول ہیں نہ وہ جن کی بنا ایک فانی قابل سہو وخطا وجود یعنی انسان کے اعتقاد پر منحصر ہو۔

قدرت ہم کو صرف وجود اور اپنے سلسلہ انتظام اور اپنے تعلقات ہی کے جو بے انتہا مخلوق میں پایا جاتا ہے سچائی نہیں دکھلاتی بلکہ اس سے ایسے بھی اصول پائے جاتے ہیں جس سے ہم اپنے افعال ارادی جسمانی اور روحانی کی بھلائی اور برائی بھی جان سکتے ہیں اور جو کہ قدرت سچی اور کامل ہے تو ضرور کہ وہ اصول بھی سچا اور کامل ہو اور یہی سچا اور کامل اصول یا یوں کہو کہ وہ مذہب جس کے اصول اس کے مطابق ہیں وہی سچا مذہب ہونے کے مستحق ہے۔

یہ مت سمجھو کہ ہم قدرت یا قانون قدرت ہی کو مسبب یا اخیر سبب اس تمام کارخانہ کا سمجھتے ہیں۔ جس کا کوئی خالق نہ ہو جیسے کہ دہریوں کا مذہب ہے **نعوذ باللہ منہا** بلکہ قدرت کو تو ہم ایک قانون کہتے ہیں جس کا کوئی بنانے والا ہے اور اسی لئے ہم یقین کرتے ہیں کہ یہ تمام سلسلہ ایک ہی مسبب اور ایک ہی اخیر سبب پر ختم ہوتا ہے جس پر تمام چیزوں کی ہستی منحصر ہے۔ وہ جس کی الز پہچان ذات کو ہزاروں لاکھوں کروڑوں ناموں سے لوگ پکارتے ہیں اور میرے پیارے خدا تم پردہ میں تو ہو پر سب پر ظاہر ہو۔ ایسے جھوٹ موٹ کے پردہ سے کیا فائدہ۔

رشک آیدم دگرنے نقابت کشود ے
دست ترا گرفتہ بعالم نمود ے

معاذ اللہ توبہ توبہ میں نے کیا کہا کہیں کافر تو نہیں ہوگیا۔ "**الٰھی انت عبادی وانا ربک استغفر اللہ ربی انا عبدک**" پس آدمی کو چاہیے کہ اس کارخانہ قدرت سے اس کے بنانے والے کو اور اس کی راہ کو یا اس کی راہ بتانے والے کو تلاش کرے کہ یہی سیدھی سڑک سیدھا راستہ چلنے کا ہے۔

مذہب کی تمثیل میں علماء اسلام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے کیسی کیسی غلطیاں کی ہیں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائی ہیں بعضوں نے مالک اور غلام کی تمثیل دی ہے اور فرمایا ہے کہ مذہب اور شریعت کو مصالح قدرت اور اعمال کو اس کے بدلے یعنی جزا اور سزا سے کچھ مناسب نہیں اور اس کے اوامر ونواہی میں بجز اس کے کہ مالک کا حکم بجالانا ہے اور کچھ فائدہ نہیں شاید ان لوگوں کا خدا ایسا ہو جو لغو کام کرنے کو کہے میرا تو خدا ایسا نہیں وہ تو نہایت دانا اور سب سے بڑا حکیم مطلق ہے۔ اس کی تو کوئی بات بھی حکمت اور منفعت سے خالی نہیں۔

اس رائے کو تو شاہ ولی اللہ صاحب نے غلط ٹھہرایا ہے چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ **قد یظن ان احکام الشریعۃ غیر متضمنۃ لشی من المصالح وانہ لیس بین الاعمال وبین ما جعل اللہ جزاء لھا منا سبۃ وان مثل التکلیف بالشرائع کمثل سید اراد ان یختبر طاعۃ عبدہ فامرہ یرفع حجر او لمس شجر مما لا فائدۃ فیہ غیر الاختیار فلما اطاع اوعصی جوزی بعلمہ وھذا ظن فاسد تکذبہ السنۃ واجماع القرون المشھودلھا بالخیر۔**

بعض عالموں نے مالک اور بیمار غلام سے مذہب کی تمثیل دی ہے جس پر مالک نے اس کے علاج کے لیے اپنا مصاحب مقرر کیا ہو اور اس مصاحب کے حکم کو ماننا باعث نجات اور نہ ماننا باعث درکات ٹھہرایا ہو۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی حجۃ اللہ البالغہ میں اسی رائے کو صحیح قرار دیتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "**وظهر مما ذكرنا ان الحق في التكليف بالشرائع ان مثل كمثل سيد مرض عبيده فسلط عليهم رجلا من خاصة ليستقيم دواء فان اطاعوا اله اطاعوا السيد ورضي عنهم سيدهم واثابهم خيرا ونحوا من المرض وان عصوه عصوا السيد واحاط بهم غضبه وجازهم سوء الجزء وهلكو من المرض.**

مگر میں اس کو نہیں مانتا اور پوچھتا ہوں کہ دوا کا کرنا باعث نجات کا تھا یا مصاحب کے حکم کا ماننا تھا؟ اگر بے حکم مصاحب کے بھی وہ دوا کرتا تو نجات پاتا یا نہیں۔ ضرور پاتا اس لئے کہ اس دوا سے نجات پانا قدرت کا قانون تھا جو کسی طرح بدل نہیں سکتا۔

بعض عالموں نے مذہب کی تمثیل ایسے طبیب سے دی ہے جو نہ تو خود کسی چیز کو امرت بناتا ہو اور نہ کسی کو ہلاہل ٹھہراتا ہو بلکہ ہر چیز میں قدرت نے جو اثر رکھا ہے اسی کو بتاتا ہو تاکہ جو لوگ صحیح ہیں اپنے حفظ صحت کے اصول جانیں اور جو بیمار ہیں وہ حصول صحت کی دوا کو پہچانیں اور مذہب بہ نسبت اس کے کہ صرف بیمار غلاموں ہی کے لئے ہو سب کے لئے عام ہو جائے۔

افسوس کہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں اس رائے کو نہیں مانتے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "**وانه ليس الا مر على ما ظن من احسن الا عمال وقبحها بمعنى استحقاق العامل الثواب و العقاب عقليان من كل وجهه وان الشرع وظيفة الاخبار عن خواص الاعمال على ما هي عليه دون انشاء الا يجاب والتحريم بمنزلة طبيب يصف خواص الا دوية انواع المرض فانه ظن فاسد تجه السنة بادي الراى.**

مگر میں اسی کو مانتا ہوں اور اسی کو سچا اصول سمجھتا ہوں جو قانون قدرت کے بالکل مطابق ہے اور کتاب وسنت دونوں کو اسی کا موید پاتا ہوں جو علم مذہب اسلام کی بنیاد ہیں پس جہاں تک کہ سچے مذہب کی میں تحقیق کر سکا میں نے اسلام ہی کو سچا مذہب پایا اور امید ہے کہ جو لوگ سچائی کو دوست رکھتے ہیں وہ ہمیشہ صفائی اور سچائی سے اسلام کی سچائی کی تحقیقات کریں گے۔

مگر ایک مشکل یہ پیش ہے کہ جب اسلام کا نام لیا جاتا ہے۔ تو لوگ مجموعہ احکام کو جو اب احکام مذہبی سمجھے جاتے ہیں مذہب اسلام خیال کرتے ہیں ہاں مجازاً تو ان پر مذہب اسلام کا اطلاق ہو سکتا ہے مگر حقیقتاً وہ مجموع من حیث المجموع بمعنی حقیقی مذہب اسلام کہلانے کا مستحق نہیں ہے موجودہ مسائل مذہب اسلام میں دو قسم کے اصول واحکام شامل ہیں۔ ایک وہ جن کو خود شارع نے صاف صاف بیان کیا ہے جو احکام منصوصہ کہلاتے ہیں اور ایک وہ جن کو عالموں اور مجتہدوں نے اپنے ذہن کی خوبی اور اپنے علم کی روشنی سے باستدلال دلالت النص یا اشارۃ النص یا قیاس کے قائم کیا ہے جو اجتہادیات کہلاتے ہیں اور جو بجز ایک قابل سہو وخطا وجود کی رائے کے اور کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتے پس ان دونوں قسم کے مسائل میں تمیز نہ کرنے سے آدمی طرح طرح کی سخت غلطیوں میں پڑ جاتے ہیں اور یہ وہی ترک امتیاز ہے کہ جب مسلمان اس کو اختیار کرتے ہیں تو اس کا نام تقلید رکھتے ہیں اور جب غیر مذہب کے لوگ اس کو اختیار کرتے ہیں تو اس کو ایک حقیر نام تعصب یا جہل مرکب یا ضلالت سے موسوم کرتے ہیں۔ **فاعتبروا يا اولى الابصار**

پہلی قسم کے احکام بھی جن کا نام احکام منصوصہ ہے۔ دو قسم کے احکام ہیں ایک وہ جو اصلی احکام ہیں اور بلاشبہ وہ بالکل قانون قدرت کے مطابق بلکہ اس کی جان ہیں اور دوسرے وہ جو ان اصلی احکام کی حفاظت اور ان کے بقاء اور قیام کے لئے ہیں۔ پس جو

کوئی مذہب کی سچائی ان سچے قدرتی اصولوں سے پرکھنی چاہے تو اس کو ان دونوں قسم کے احکام کی اور ان میں سے ہر ایک کے درجہ اور رتبہ کی تمیز کرنی لازمی ہے۔

علاوہ مذکورہ بالا دو قسموں کے ایک تیسری قسم بھی احکام مذہب اسلام میں ہے جو ذو معنیین عبارتوں یا ناکامل سند یا مشتبہ سندوں سے قائم ہوئے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم تو اجتہادات میں داخل ہے اور دوسری قسم مذہب اسلام میں کچھ وقعت اور اعتبار نہیں رکھتی۔ گو اس پر اس وجہ سے کہ اس میں کچھ نقصان نہیں ہے عمل ہوتا ہو۔

پس یہ سچا مذہب اور وہ شخص جس کی معرفت ہم کو اس کی تعلیم ہوئی۔ ہمارے بے انتہا ادب اور نامحدود ثناء صفت کا مستحق ہے اور بلاشبہ اسی خطاب کے لائق ہے کہ "**انت احب الی یا رسول اللہ من نفسی التی بین جنبی**"چنانچہ ہم کو بہت بری خوشی اور مبارکی اس بات کی ہے کہ ہم نے اس کو نہ خدا سمجھا اور نہ خدا کا بیٹا۔ نہ کوئی فرشتہ بلکہ ایک وحی بھیجا ہوا انسان جانا مگر اپنی جانوں سے زیادہ عزیز جانا۔ **بابی انت و امی یا رسول اللہ.**

دل وجانم فدایت یا محمدؐ   سر من خاک پایت یا محمدؐ

یا ایھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما.

آنحضرت ﷺ کی زندگی کے حالات میں جن کو مسلمان سیر اور انگریز لائف کہتے ہیں صرف دیندار مسلمان عالموں ہی نے نہیں لکھے بلکہ غیر مذہب کے علماء اور مورخین نے بھی بہت کچھ لکھا ہے مگر نہایت افسوس ہے کہ وہ دونوں افراط تفریط میں پڑ گئے پہلوں کی آنکھوں میں تو کمال روشنی کے سبب چکاچوند آ گئی اور پچھلوں کی آنکھیں بجلی کی چمک سے بند ہو گئیں پہلے تو شراب محبت کی سرشاری میں بات سے بھٹک گئے اور پچھلے اس رستہ کی ناواقفی سے منزل تک نہ پہنچے پہلے تو یہ بھولے کہ وہ کس کا بیان کرتے ہیں اور پچھلوں نے اسی کو نہ جانا جس کا وہ ذکر کرتے ہیں۔

کسی مشہور محدث نے بجز ایک کے جس کا ہم ابھی ذکر کریں گے کوئی خاص کتاب آنحضرت ﷺ کی زندگی کے حالات میں نہیں لکھی لیکن تمام محدثین نے جن کی سعی اور کوشش کا دنیا پر بہت بڑا احسان ہے اپنی اپنی کتابوں میں ان حدیثوں کو بھی بیان کیا ہے جو آنحضرت ﷺ کی زندگی کے حالات سے متعلق ہیں۔ پس وہی حدیث کی کتابیں ہیں جن سے کم و بیش آنحضرت ﷺ کی زندگی کے حالات صحیح صحیح دریافت ہو سکتے ہیں اور جن کو معقول طرح پر ترتیب دینے سے اور صحیح کو غلط سے تمیز کرنے سے ایک معتبر تذکرہ آپ کی زندگی کا جمع ہو سکتا ہے۔

ابوعیسیٰ ترمذی نے جو ۲۰۹ ہجری مطابق ۸۲۴ء میں پیدا ہوئے اور ۲۷۹ ہجری مطابق ۸۹۲ء میں انتقال کیا اپنی مشہور کتاب جامع ترمذی کے سوا ایک اور کتاب بھی آنحضرت ﷺ کے حالات میں لکھی ہے جو ''شمائل ترمذی'' کے نام سے مشہور ہے مگر اس میں آپ کی زندگی کے تمام حالات مندرج نہیں ہیں بلکہ بلکہ وہ خاص خاص باتیں اور عادتیں جو بالتخصیص نفس نفیس آنحضرت ﷺ سے متعلق تھیں مذکور ہیں۔ بااین ہمہ جس قدر حدیثیں آنحضرت ﷺ کے حالات سے متعلق ان مشہور حدیث کی کتابوں میں مندرج ہیں وہ اس قابل نہیں ہیں کہ جن کو ہم مثل کتاب اللہ کے بے غور اور بلاتحقیقات اندھا دھند مان لیں بلکہ ہم پر واجب ہے کہ ان تمام حدیثوں کو خواہ وہ بخاری کی ہوں یا مسلم کی اور جامع ترمذی کی ہوں یا شمائل ترمذی کی قبل ان کے سچا قبول کرنے کے ان کی سچائی اور صحت کی تحقیقات ان اصول وقواعد کے ساتھ کریں جو اس کے لئے مقرر ہیں اور جن کو ہم۔ نے ایک جداگانہ خطبہ میں بیان

کیا ہے اور اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو سخت غلطیوں میں پڑیں گے کیونکہ بے سند حدیث مسلمانوں کے مذہب میں کوئی وقت اور اعتبار نہیں رکھتی' شاہ عبدالعزیز صاحب اپنی کتاب تحفہ میں ایک مقام پر لکھتے ہیں ''حدیث بے سند گوز شتر است'' مگر افسوس ہے کہ بہت ہی کم مصنف ہیں جنہوں نے اس ضروری اور نہایت ضروری اصول کی پیروی کی ہو۔

ان حدیث کی کتابوں کے سوا جن کا بھی ذکر ہوا اور بہت سی کتابیں ہیں جو خاص آنحضرت ﷺ کے حالات کیلئے لکھی گئی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن میں ان کے سوا اور بھی حالات ہیں اور یہ تمام کتابیں عموماً کتب سیر کے نام سے موسوم ہیں اور جن میں سے کتب مفصلہ ذیل زیادہ مشہور ہیں:

ابن اسحٰق' ابن ہشام' طبقات کبیر المشہور بواقدی' طبری' سیرت ہشامی' ابوالفداء' مسعودی' مواہب لدنیہ ان کے سوا عربی اور فارسی زبان میں اور بھی کتابیں ہیں جو انہی سے بنائی گئی ہیں ان کتابوں میں سے پہلی چار کتابیں بہت قدیم ہیں اور باقی بہت پچھلی۔

یہ سب کتابیں تمام سچی اور جھوٹی روایتوں اور صحیح و موضوع حدیثوں کا مخلوط مجموعہ ہے جس میں صحیح اور غلط مشتبہ اور درست اور جھوٹی اور سچی کسی کا کچھ امتیاز نہیں اور جو کتابیں زیادہ قدیم ہیں ان میں اس قسم کا اختلاط اور زیادہ ہے قدیم مصنفوں اور اگلے زمانہ کے مورخوں کو تصنیفات سے زیادہ غرض یہ تھی کہ ہر ایک قسم کی روایتوں اور افواہوں کو جو ان کے زمانہ میں پھیل رہی تھیں ایک جگہ جمع کر لیں اور اس بات کی تحقیقات اور تصحیح کہ کون سی ان میں کی بالکل صحیح ہے اور کون سی غلط اور کس میں زیادتی یا کمی ہوئی ہے اور کس میں مضمون کے سمجھنے اور واقعہ کے بیان میں غلط فہمی ہوئی ہے آئندہ وقت یا آئندہ نسلوں پر منحصر رکھیں مگر افسوس یہ ہے کہ پچھلی نسلوں نے بعوض اس کے کہ تحقیقات مطلوبہ کرنے سے اپنے بزرگوں کو مقاصد کی تکمیل کرتے انہی کتابوں کو اپنی تصنیفات جدید کا ماخذ ٹھہرایا اور اس لئے ان پچھلے مصنفوں کی تصنیفوں میں بھی وہی نقص پیدا ہوا جو ان قدیم مصنفوں کی تصنیفوں میں تھا غرض کہ اب فن سیر[1] کی تمام کتابیں کیا قدیم کیا جدید مثل ایسے غلہ کے انبار کے ہیں جس میں سے کنکر' پتھر' کوڑا کرکٹ کچھ چنا نہیں گیا اور ان میں تمام صحیح و موضوع جھوٹی اور سچی سند اور بے سند ضعیف وقوی' مشکوک و مشتبہ روایتیں مخلوط اور گڈمڈ ہیں۔

سر ولیم[2] میور صاحب ارقام فرماتے ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی کی تین کتابیں ہشامی واقدی' طبری' ایسی ہیں کہ جو شخص دانشمندی سے آنحضرت ﷺ کے حالات دیکھے گا تو اپنی تحریر کے لئے انہی کتابوں کو سند گرانے گا'' مگر صاحب ممدوح نے اس بات کو بیان نہیں فرمایا کہ ان کتابوں میں کس قدر ایسی روایتیں ہیں' جن سے آنحضرت ﷺ کو کچھ بھی علاقہ نہیں اور کس قدر ایسی ہیں جن کے راویوں کا سلسلہ ٹوٹا ہوا ہے اور کس قدر ایسی ہیں جن کے راویوں کی خصلت نہ کسی مذہبی مسئلہ کے سبب بلکہ اخلاقی نقصان کے سبب مشتبہ اور ان کی راست بیانی مشکوک یا مطعون ہے اور کس قدر ایسی ہیں جن کے بیان کرنے والے بالکل لامعلوم شخص ہیں اور کس قدر ایسی ہیں جن کی تحقیق یا تصدیق نہیں ہے۔

ڈاکٹر سپرنگر صاحب نے نہایت گرم جوشی سے واقدی کی قدر و منزلت کو اس کی اصلی حقیقت سے بہت بڑھا دیا ہے۔ جس کی نسبت سر ولیم میور صاحب یہ ارقام فرماتے ہیں کہ ''ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کتاب کی تعریف اس کی حد سے زیادہ کی ہے۔'' مگر افسوس

---

[1] سیر۔ سیرت (عادت۔ خو) واحد ہے۔ احمد مخدومی۔

[2] کچھ عرصہ گزرا ہے کہ یہ صاحب صوبہ الہ آباد کے لیفٹیننٹ گورنر تھے۔ عربی زبان سے بھی آگاہ تھے۔ (مخدومی)۔

ہے کہ باوجود اس کے صاحب ممدوح نے بھی واقدی کی کم قدر نہیں کی اور اوروں پر ترجیح دینے میں کچھ کوتاہی نہیں کی۔ اس لئے کہ انہوں نے بھی آنحضرت ﷺ زندگی کے تمام حالات کو اسی کتاب سے لکھا ہے اور اسی کی سند پر مذہب اسلام کے برخلاف تمام رایوں کو قائم کیا ہے۔

واقدی کچھ بڑا معتبر شخص نہیں ہے۔ وہ تو حاطب اللیل یعنی اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا ہے اس کی غلط روایتوں اور جھوٹے قصہ کہانیوں اور بے سند باتوں کے تمام علماء نے اس کو نامعتبر ٹھہرایا ہے۔ محمد بن عبدالباقی الزرقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں میزان سے واقدی کی نسبت یہ جملہ نقل کیا ہے۔ "**الواقدی محمد بن عمر بن الواقدی الاسلمی المدنی الذی استقر الاجماع علی وھنہ رکذافی المیزان**"

کسی کے کہنے اور سننے پر کیا موقوف ہے خود اس کی کتابیں موجود ہیں جو کچھ بھی قدر و قیمت کے لائق نہیں بجز اس کے کہ جو افواہاً اس نے سنا اور جو آواز چڑیا کی خواہ کوے کی اس کے کان میں آئی وہ اس نے لکھ دی کوئی طریقہ تحقیق کا اور کوئی رستہ تنقیح کا اس نے اختیار نہیں کیا پس کیا وہ کتابیں ایسی ہیں جو مذہب اسلام کی بنیاد سمجھی جاسکتی ہیں اور کیا کوئی مخاطب مذہب اسلام کا ان کتابوں کی سند پر مذہب اسلام یا اس کے واعظ میں عیب نکال کر اور اپنے آپ کو فتح مند سمجھ کر خوش ہو سکے گا۔ **ان ھذا لشئی عجاب.**

البتہ ابوالفداء کسی قدر اچھی ہے اور جہاں تک ہو سکے اعتبار کے لائق ہے اس نے اپنی کتاب احتیاط سے لکھی ہے اگرچہ تحقیق و تنقیح کے رستہ کو اس نے اختیار نہیں کیا۔ الا اس بات پر کوشش کی ہے کہ کوئی موضوع یا مشتبہ یا لغو روایت اس میں نہ داخل ہونے پائے مگر بایں ہمہ یہ کہنا کہ اس کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور اس میں کوئی روایت موضوع یا مشتبہ نہیں ہے حد اعتدال سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

مسلمان مؤرخوں کے سوا جن کا اوپر ذکر ہوا عیسائی مؤرخوں نے بھی مذہب اسلام اور اس کے واعظ کی نسبت بہت سی کتابیں لکھیں مگر افسوس ہے کہ ابتدائے زمانہ کی تصنیف شدہ کتابیں مثل کتب مصنفہ وبیلیل' لوتھر' ملانک تھن' سیپال ہیم' دی ہربی لاٹ' مجھ کو دستیاب نہیں ہوئیں مگر جو کچھ اور کتابوں سے ان کا حال معلوم ہوا وہ اسی قدر ہے کہ ان کتابوں میں بجز سخت کلامی اور بدزبانی اور کچھ نہیں ہے۔

ان مصنفوں کے سوا مراکشی صاحب کا ذکر نہایت حیرت انگیز ہے۔ وہ ایک ایسا سخت متعصب مصنف ہے کہ اس کا دل اپنے بغض و کینہ کے اظہار اور نفرت انگیز جھوٹے طعن و تشنیع اور بدزبانی سے کبھی نہیں بھرا۔ مگر مجھ کو جو حیرت ہوئی وہ اس بات سے ہوئی کہ "کوارٹرلے ریویو" کے ایک آرٹیکل کے مصنف نے اس کی نسبت یہ لکھا ہے کہ "مراکشی پر جو یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ باطن میں اسلام کا معتقد ہو گیا تھا وہ الزام کچھ بے وجہ نہ تھا۔" کیا مراکشی باوصف اس قدر تعصب کے مثل' برہرخورد صاحب کے آخر کو مسلمان ہو گیا تھا۔ مگر ایسا ہوا ہو تو میں ذمہ دار ہوں کہ اس سے پہلے جو کچھ اس نے اسلام اور واعظ اسلام کی نسبت کہا سنا سب نسیاً منسیاً ہو گیا۔ **لان الاسلام یھدم ما کان قبلہ من معصیۃ اللہ.**

ڈین پریڈی صاحب بھی انہی مؤرخوں میں سے ہیں جن پر مذہب اسلام نہایت شاق گزرتا تھا جب کوئی مسلمان اتفاقاً ان صاحب کی کتاب کو پڑھتا ہے تو مذہب اسلام سے ان کی ناواقفیت پر جو ان کی کتاب کے ہر ورق سے ٹپکتی ہے بن ہنسے رہ نہیں سکتا۔ ان مؤرخوں کے سوا میجر گیمبیری لنڈاوکلی صاحب نے بھی مذہب سلام اور آنحضرت کے حالات میں کتابیں لکھیں مگر افسوس

ہے کہ میں ان کی محنتوں سے مستفید نہ ہوسکا۔

گوتھ صاحب اور اماری صاحب اور نالڈانک صاحب اور دواری صاحب نے جو کتابیں اس مضمون پر لکھی ہیں ان کی نسبت مذہب اسلام کے آرٹیکل کا مصنف جو کواٹرلے ریویو میں چھپا ہے یہ لکھتا ہے کہ "ان مؤرخوں نے بہت ہی دنیا کو یہ بات سکھلا دی کہ مذہب اسلام ایک شگفتہ اور تروتازہ چیز ہے اور ہزاروں ثمر در جوہروں سے بھرپور ہے اور محمد (ﷺ) نے گو ان کی خصلت کو کیسا ہی سمجھا جائے انسانیت کی سنہری کتاب میں اپنے لئے جگہ حاصل کی ہے۔

نہایت مشہور عیسائی مؤرخوں میں جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے حالات لکھے ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر صاحب ہیں ان کی کتاب انگریزی زبان میں بمقام الہ آباد ۱۸۵۱ء میں چھپی ہے مگر وہ کتاب بسبب غلطیوں کے جو اس کے مضمون کی صحت میں ہیں کچھ اعتبار کے لائق نہیں ہے علاوہ اس کے ایک اور خرابی انہوں نے اس کتاب میں یہ کی ہے کہ اس کا طرز بیان نہایت مبالغہ آمیز اختیار کیا ہے ان کی طبیعت پہلے ہی سے ایسے تعصبات اور یک طرفہ رائے سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے جو کسی قسم کی مصنف کو اور بالتخصیص ایک مؤرخ کو کسی طرح زیبا نہیں ہے۔ اپنے اس کلام کی تصدیق کے لئے ان کی کتاب میں سے ایک فقرہ نقل کرتا ہوں جس سے ان کے تعصب کے علاوہ یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جس فن میں انہوں نے کتاب لکھی ہے اس سے بھی ماشاء اللہ وہ بہت ہی خوب واقف تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اسلام محمد (ﷺ) کا ایجاد نہیں ہے وہ ایسے مکار کا نکالا ہوا مذہب نہیں ہوسکتا۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس مکار نے اپنی بداخلاقی اور طبیعت کی برائی سے اس کو بگاڑا اور جو بہت سے مسائل اس میں قابل اعتراض ہیں وہ اسی کے ایجاد ہیں"

نعوذ باللہ من ھذہ الا تاویل کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا.

ڈاکٹر اسپرنگر صاحب نے ایک اور کتاب جرمنی زبان میں آنحضرت ﷺ کے حالات میں لکھی ہے جو چھ جلدوں میں ہے مگر افسوس ہے کہ جرمنی زبان نہ جاننے کے سبب اس کتاب سے جس قدر قدرے قلیل فائدہ حاصل کرسکتا اس سے بھی محروم رہا۔ صرف اس قدر ہوا کہ میرے ایک جرمن دوست نے مجھ کو اطلاع دی کہ اس کے مصنف نے ابن اسحٰق اور واقدی سے زیادہ تر مطالب اخذ کئے ہیں اور جو کہ میں ان مصنفوں کی کتابوں سے واقف ہوں جن سے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں مطالب اخذ کئے اس لئے مجھے یقین ہے کہ وہ کتاب بھی مثل اور کتابوں کے جن کو عیسائی مؤرخوں نے تصنیف کیا ہے اس تحقیق اور تلاش سے معرا ہوگی جو صفائی دل سے کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب انہی کتابوں سے لکھی ہے جن میں صحیح اور غلط اور مشتبہ اور لغو روایتیں سب گڈمڈ ہیں۔

مگر کوارٹرلے ریویو[1] کے آرٹیکل کا مصنف جو غالباً جرمن ہے اس کتاب کی نسبت یہ رائے لکھتا ہے کہ "جن لوگوں نے اسلام کی نسبت لکھا ہے ان میں سے ڈاکٹر اسپرنگر کی کتاب کو جو مصنفوں میں اول درجہ رکھتا ہے ہم نے اس لئے سب سے افضل قرار دیا ہے کہ وہ بہ نسبت اور سب کے نہایت جامع ہے اور بڑی جامع ہے اور بڑی قابلیت سے لکھی گئی ہے اس لئے کہ اس کتاب میں وہ تمام مطالب ناظرین کے سامنے موجود کر دیئے گئے ہیں جن سے پڑھنے والا اپنی رائے آپ قائم کر سکے۔"

عیسائی مصنفوں کی کتابوں میں سب سے زیادہ عمدہ وہ کتاب ہے جو سر ولیم میور صاحب نے نہایت لیاقت اور قابلیت اور کمال

---

[1] یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے جو لندن میں چھپتا ہے اس میں نہایت اعلیٰ درجہ کے عالم مضمون لکھتے ہیں۔

خوبی کے ساتھ لکھی ہے یہ کتاب چار موٹی موٹی جلدوں میں ہے اور بہت خوبصورت ٹیپ اور خوش وضع تقطیع میں چھپی ہے۔ اس لائق اور فائق مصنف کو مثل مغربی علوم کے مشرقی علموں میں بھی بڑی واقفیت حاصل ہے اور اس لئے ان کی یہ کتاب تمام تربیت یافتہ یورپ کے ملکوں میں بڑی قدر منزل کی ہے جو اسی قدر و منزلت کے لائق ہے اور یورپ کے عالموں اور عالموں کی مجلسوں نے بھی اس کتاب کے سبب ان کی ایسی قدر کی ہے جس کے درحقیقت وہ مستحق تھے مگر قطع نظر اس نقص کے جو اس کتاب میں ہے کہ اس کی بنیاد گویا بالکل واقدی پر ہے۔ جو مسلمانوں میں درجہ اعتبار نہیں رکھتا اور اس کی روایتیں زیادہ معتبر اور ایسی محقق نہیں ہیں کہ مسلمان ان پر یقین لائیں جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں ایک اور بڑا نقص یہ ہے کہ جس منشاء اور مطلب سے سر ولیم میور صاحب نے یہ کتاب لکھی وہ اس لئے پسندیدہ نہیں ہے کہ وہ منشاء اس کتاب میں نقصان رہ جانے کا اور واقعات کا اصلی تحقیقات تک نہ پہنچنے کا بہت بڑا سبب ہوا ہے چنانچہ سر ولیم میور صاحب خود ارقام فرماتے ہیں کہ ''اس کتاب کا لکھنا اور مسلمانی مذہب سند کی کتابوں کی تحصیل اول اس غرض سے اختیار کی گئی کہ پادری پی فنڈر صاحب نے جو اس بات میں مشہور ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں سے مباحثہ میں عیسائی مذہب کی بہت حمایت کی اس بات پر اصرار کیا کہ اسلام کے پیغمبر کے حالات میں ایک کتاب جو اس کے پیروؤں کے پڑھنے کے لئے مناسب ہو ایسے قدیم ماخذوں سے ہندوستانی زبان میں تالیف کی جائے جس کو خود مسلمان صحیح اور معتبر مانتے ہیں چنانچہ اسی منشاء سے مسلمانی مذہب کی سند کی کتابوں کو پڑھا اور اس کتاب کو لکھا''۔

لیکن میں نہایت افسوس سے یہ بات کہتا ہوں کہ باوجود یہ کہ سر ولیم میور صاحب نہایت نیک طبیعت ہیں اور بڑی قابل توصیف لیاقتیں رکھتے ہیں اس پر بھی ان کی طبیعت پر اس غرض اور منشاء کا جس سے وہ کتاب لکھنی شروع کی ایسا اثر پیدا ہوا جیسا کہ ایسی حالت میں اوروں کی طبیعت پر پیدا ہونا قیاس کا مقتضا ہے اور اسی سبب سے اسلام کی دلچسپ اور سیدھی سادھی عمدہ باتیں بھی ان کو بری اور اور بھونڈی اور نفرت انگیز معلوم ہوئیں اور یہ اثر ان کی طبیعت کا ایسا تھا کہ اس کے سبب سے ان کی کتاب پڑھنے والے اپنے ذہن میں ان کی تحریر کو ایک زیادتی سمجھتے تھے لیکن جیسا اکثر ہوتا ہے ویسا ہی اس میں بھی ہوا کہ اس حد اعتدال سے متجاوز تحریر نے خود اپنے مقصود کو کھو دیا اور وہ مطلب حاصل نہ ہوا جس کے لئے پادری پی فنڈر صاحب نے سر ولیم میور صاحب سے اس کتاب کے لکھنے کی خواہش کی تھی بلکہ برعکس اس کے یہ نتیجہ ہوا کہ جس شخص کو پادری پی فنڈر صاحب نے تاریکی کا فرشتہ بنانا چاہا تھا وہ روشنی کا فرشتہ نکل آیا۔

جب یہ کتاب چھپی اور ہندوستان میں پہنچی تو لوگوں نے اس کو نہایت شوق و ذوق سے پڑھا مگر جب ان کو یہ بات دریافت ہوئی کہ اسلام کی اور آنحضرت ﷺ کے حالات کی نہایت سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی توڑ مروڑ کر اس وضع پر ڈھالا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ پہلے ہی سے اس کتاب کا اس طرح لکھنا مقصود اور مرکوز خاطر تھا تو ان کا وہ شوق بالکل ٹھنڈا ہو گیا مگر نوجوان مسلمان طالب علم انگریزی علم کی تحصیل کرتے تھے اور اپنے دینیات اور الٰہیات سے محض ناواقف تھے ان میں اس بات کا چرچا پیدا ہوا کہ اگر سر ولیم میور صاحب نے سیدھی سادی اور صاف باتوں کو بھی برے پہلو پر لے جا کر لکھا ہے تو فی الواقع ان کی اصلیت کیا ہے۔

میرے دل پر جو اس کتاب سے اثر پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اسی زمانہ میں نے ارادہ کیا کہ آنحضرت ﷺ کے متعلق حالات میں ایک کتاب اس طرح پر لکھی جائے کہ جو جو باتیں صحیح اور اصلی اور واقعی اور منقح ہیں اور معتبر روایتوں اور صحیح سندوں سے بخوبی ثابت

ہیں ان کو بخوبی چھان بین کر اور امتحان کر کے ترتیب سے لکھا جائے اور جو حالات مشتبہ اور مشکوک ہیں اور ان کا ثبوت معتبر یا کافی نہیں ہے ان کو جداگانہ اسی ترتیب سے جمع کیا جائے اور جو محض جھوٹ اور افترا و بہتان یا خود غرض یا احمق واعظوں اور حمقاء کو دام تزویر میں پھنسانے والے لوگوں یا احمق خدا پرست اور جھوٹی نیکی پھیلانے والوں کی بتائی ہوئی باتیں ہیں ان کو علیحدہ ترتیب لکھا جائے اور انہی کے ساتھ ان کے غلط اور ان کے نامعتبر ہونے کا ثبوت اور ان کے موضوع ہونے کی وجوہات بھی بیان کی جائیں مگر میں اپنے اس ارادہ کو بہت سے موانعات کے سبب سے جن میں سب سے بڑا اپنی فکر معاش میں مبتلا رہنا اور اس سے بھی بڑا کسی کا میرے ارادہ کے ممد و معاون نہ ہونا تھا پورا نہ کر سکا اور علاوہ اس کے اس کام کے لئے بہت ہی پرانی کتابیں جن کو قدیم مصنفوں نے تصنیف کیا ہے درکار تھیں جو مجھ کو بہ سبب برباد ہو جانے قدیم کتب خانوں کے دستیاب نہ ہو سکیں اور یہ بھی ایک قومی سبب اس ارادہ کے پورا نہ ہونے کا ہوا مگر اس پر بھی مختلف اوقات میں مختصر طور سے مختلف مضامین اور مسائل مذہب اسلام اور آنحضرت ﷺ کے حالات پر کچھ کچھ لکھتا رہا چنانچہ انہی تحریروں میں یہ بارہ مضمون ہیں جو بعنوان بارہ خطبوں کے لکھے گئے ہیں اور جن کو اس ایک جلد میں جمع کر دیا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ باقی مضامین اور جلدوں میں جمع کئے جائیں گے۔

اگرچہ میں نے اس دیباچہ میں عیسائی ایسے مؤرخوں کا ذکر کیا ہے جنہوں نے آنحضرت ﷺ حالات اور اصول مذہب اسلام کا انصاف سے فیصلہ نہیں کیا مگر ان لائق اور قابل اور عالم واجب التعظیم عیسائی مؤرخوں کا ذکر کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جنہوں نے نہایت انصاف سے اور بالکل بغیر تعصب کے آنحضرت ﷺ کے حالات اور مذہب اسلام کی نسبت ٹھیک ٹھیک اپنی رائے لکھی ہے بلکہ متعصب اور تنگ حوصلہ مخالفوں کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی حمایت کی ہے اگرچہ بعض مقامات میں انہوں نے بھی کچھ کچھ سقم اور نقصان بیان کئے ہیں لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کا بیان کسی تعصب پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس مسئلہ کی حقیقت وہ نہیں سمجھے یا غلط سمجھ گئے پس یہ ایک غلطی سمجھ کی تو ہے الا وہ عیب جو تعصب اور تنگ حوصلہ ہونے کے سبب سے ہوتا ہے وہ نہیں ہے بہرحال یہ قابل ادب شخص ایڈورڈ گبن قدیم روم کی سلطنت کا مشہور مؤرخ اور گاڈفری ہیگنز اور ٹامس کارلیل اور جان ڈیون پورٹ ہیں جن کے علم اور لیاقتوں کی تعظیم و قدر ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ اب میں ان صاحبوں میں سے تین صاحبوں کی رائے جو انہوں نے آنحضرت ﷺ اور مذہب اسلام کی نسبت لکھی ہے اپنے اس دیباچہ میں لکھتا ہوں اور گاڈفری ہیگنز کی رائے خطبات میں متعدد جگہ لکھی گئی ہے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ لکھتے ہیں ''کیا یہ بات خیال میں آ سکتی ہے کہ جس شخص نے اس نہایت ناپسند اور حقیر بت پرستی کے بدلہ جس میں اس کے ہموطن (یعنی اہل عرب) مدت سے ڈوبے ہوئے تھے خدائے برحق کی پرستش قائم کرنے سے بڑی بڑی دائم الاثر اصلاحیں کہیں مثلاً اولاد کشی کو موقوف کیا نشے کی چیزوں کے استعمال کو اور قمار بازی کو جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچتا ہے منع کیا۔ بہتات سے کثرت ازدواج کا اس وقت میں رواج تھا اس کو بہت کچھ گھٹا کر محدود کیا غرضیکہ ایسے بڑے اور سرگرم مصلح کو ہم فریبی ٹھہرا سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی تمام کارروائی مکر پر مبنی تھی۔ نہیں ایسا نہیں کر سکتے بے شک محمد (ﷺ) بجز دلی نیک نیتی اور ایمانداری کے اور کسی سبب سے ایسے استقلال کے ساتھ اپنی کارروائی پر ابتداء نزول وحی سے جو خدیجہ سے بیان کی اخیر دم تک جبکہ عائشہ کے گود میں شدت مرض میں وفات پائی مستعد نہیں رہ سکتے تھے جو لوگ ہر وقت ان کے پاس رہتے تھے اور جو ان سے بہت ربط و ضبط رکھتے تھے ان کو بھی کبھی ان کی ریاکاری میں شبہ نہیں ہوا اور کبھی انہوں نے اپنے نیک برتاؤ سے تجاوز نہیں کیا۔

بے شک ایک نیک اور صادق طبیعت شخص جس کو اپنے خالق پر بھروسہ ہوا اور جو ایمان اور جو رسم و رواج میں بہت بڑی اصلاح

کرے حقیقت میں صاف صاف خدا کا ایک آلہ ہوتا ہے۔ اس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کا پیغمبر ہے۔ جس طرح خدا تعالیٰ کے اور وفادار خادم گزرے ہیں اگرچہ ان کی خدمتیں کامل نہ تھیں اسی طرح محمدؐ کو بھی ہم خدا کا ایسا سچا خادم کیوں نہ سمجھیں جس نے اللہ تعالیٰ کی خدمت ایسی ہی وفاداری سے کی جیسی اوروں نے جو مثل اوروں کی خدمت کے پوری اور کامل نہ تھی۔ اس بات پر کیوں یقین نہ کیا جائے کہ اس کو زمانہ اور اپنے ملک میں اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت اور تعظیم سکھلانے کے لئے اور ان کی حالت کے مناسب ان کو ملکی اور اخلاقی امور میں نصیحت کرنے کے لئے خدا نے بھیجا تھا اور وہ راست بازی اور نیک کرداری کا واعظ تھا۔

ایڈورڈ گبن صاحب لکھتے ہیں کہ ''محمد کا مذہب شکوک اور شبہات سے پاک صاف ہے۔ قرآن خدا کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہے۔ مکہ کے پیغمبر نے بتوں کی انسانوں کی، ستاروں اور سیاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا کہ جو شئے طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے اور جو حادث ہے وہ فانی ہوتی ہے اور جو قابل زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنی معقول سر گرمی سے کائنات کے بانی کو ایک ایسا وجود تسلیم کیا جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا نہ وہ کسی شکل میں محدود نہ کسی مکان میں اور نہ کوئی اس کا ثانی موجود ہے جس سے اس کو تشبیہ دے سکیں وہ ہمارے نہایت خفیہ ارادوں پر بھی آگاہ رہتا ہے بغیر کسی اسباب کے موجود ہے اخلاق اور عقل کا کمال جو اس کو حاصل ہے وہ اس کو اپنی ہی ذات سے حاصل ہے۔ ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا اور اس کے پیرووں نے ان کو نہایت مستحکم طور سے قبول کیا اور قرآن کے مفسروں نے معقولات کے ذریعہ سے بہت درستی کے ساتھ ان کی تشریح اور تصریح کی ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مسلمان کے مذکورہ بالا عقیدہ کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے جو ہمارے موجودہ ادراک اور قوائے عقلی سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ جب ہم نے اس نامعلوم چیز (یعنی خدا) کو زمان اور مکان اور حرکت مادہ اور حس اور تفکر کے اوصاف سے مبرا کر دیا تو پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لئے کیا چیز باقی رہی وہ اصل اول (یعنی ذات باری تعالیٰ) جس کی بنا عقل اور وحی پر ہے محمد کی شہادت سے استحکام کو پہنچی چنانچہ اس کے معتقد ہندوستان سے لے کر مراکو تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں اور بتوں کو ممنوع سمجھنے سے بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا ہے۔

مسٹر ٹامس کارلیل صاحب لکھتے ہیں کہ ''ہم لوگوں (یعنی عیسائیوں) میں جو یہ بات مشہور ہے کہ محمد ایک پرفن اور فطرتی شخص اور گویا جھوٹ کے اوتار تھے اور ان کا مذہب دیوانگی اور خام خیالی کا ایک تودہ ہے اب یہ سب باتیں لوگوں کے نزدیک غلط ٹھہرائی جاتی ہیں۔ جو جو جھوٹی باتیں دور اندیش اور مذہبی سرگرمی رکھنے والے آدمیوں (یعنی عیسائیوں) نے اس انسان (یعنی محمدؐ) کی نسبت قائم کی تھیں اب وہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کے باعث ہیں چنانچہ ایک یہ بات مشہور ہے کہ پاکرک صاحب نے جب گروٹیس صاحب سے پوچھا کہ یہ قصہ جو تم نے لکھا ہے کہ محمد ﷺ نے ایک کبوتر کو تعلیم کیا تھا کہ وہ ان کے کان میں سے میل نکالا کرتا تھا اور مشہور کیا تھا کہ وہ فرشتہ ہے جو ان کے پاس وحی لایا کرتا ہے تو اس قصہ کی کیا سند ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ''اس قصہ کی کوئی سند اور کچھ ثبوت نہیں'' حقیقت یہ ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ایسے ایسے قصوں کو بالکل چھوڑ دیا جائے جو باتیں اس انسان (یعنی محمدؐ) نے اپنی زبان سے نکالیں بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ آدمیوں کے لئے بمنزلہ ہدایت کے قائم ہیں ان اٹھارہ کروڑ آدمیوں کو بھی اسی طرح خدا نے پیدا کیا ہے جس طرح ہم کو پیدا کیا۔ اس وقت جتنے آدمی محمد کے کلام پر اعتقاد رکھتے ہیں اس سے بڑھ کر اور کسی کے کلام پر اس زمانہ کے لوگ یقین نہیں رکھتے۔ پھر کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جس کلام پر خدائے قادر مطلق کی اس

قدر مخلوق زندگی بسر کرگئی اور اسی پر مرگئی کیا وہ ایسا جھوٹا کھیل ہے جیسا ایک بازی گر کا ہوتا ہے۔[1] میں اپنے نزدیک ہرگز ایسا خیالی نہیں کرسکتا بلکہ میں بہ نسبت اور چیزوں کے اس پر جلد یقین کرتا ہوں اگر جھوٹی اور فریب کی باتیں دنیا میں اس قدر زور آور ہوں اور رواج پکڑ جائیں اور مسلم ٹھہر جائیں تو پھر اس دنیا کی نسبت کوئی کیا سمجھے گا۔ اس قسم کے خیالات جو بہت پھیلے ہوئے ہیں بہت ہی افسوس کے قابل ہیں اگر ہم کو خدا کی سچی مخلوقات کا علم کچھ حاصل کرنا منظور ہو تو ہم کو ایسی باتوں پر یقین کرنا ہرگز نہیں چاہیے۔ وہ باتیں ایسے زمانہ میں پھیلی تھیں جب کہ توہمات کو بہت دخل تھا اور انہیں توہمات کے سبب خیال تھا کہ آدمی کی روحیں غمگین خرابی میں پڑی ہوئی ہیں جو ان کی ہلاکت کا سبب ہے میرے نزدیک اس خیال سے کہ ایک جھوٹے نے ایک مذہب قائم کیا اور کوئی اس سے زیادہ بد اور ناخدا پرست خیال دنیا میں نہیں پھیلا۔ بھلا یہ کب ہوسکتا ہے کہ ایک جھوٹا آدمی جو چونہ اور اینٹ اور مسالہ کی حقیقت کو سچ نہ جانے اور پختہ مکان بنالے وہ پختہ مکان کا ہے کو ہوگا بلکہ خاک کا ایک ڈھیر ہوگا۔ بارہ سو برس تک اس کو کب قیام ہوسکتا ہے اور اٹھارہ کروڑ آدمی اس میں کب رہ سکتے ہیں۔ بلکہ اب تک وہ مکان کب کا سر کے بل گر پڑا ہوتا۔ ضرور ہے کہ ایک آدمی اپنے طریقوں کو قانون قدرت کے مطابق کرے اور قدرت کے سامانوں کی حقیقت کو سمجھے اور اس پر عمل کرے ورنہ قدرت سے اس کو یہ جواب ملے گا کہ نہیں یہ ہرگز نہیں ہوسکتا جو جو قانون اور قاعدے خاص ہیں وہ خاص ہی رہتے ہیں عام نہیں ہوجاتے افسوس ہے کہ کوئی شخص مثل کاگ لسٹرو یا اور ایسے ہی بہت سے دنیا کے سربراہ آوردہ لوگوں کے چندروز کے لیے اپنے فند فطرت سے کامیاب ہو جاتے ہیں مگر ان کی کامیابی ایک جعلی ہنڈوی کی مانند ہوتی ہے جس کو وہ اپنے نالائق ہاتھوں سے جاری کرتے ہیں اور خود الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اوروں کو اس کے سبب سے نقصان پہنچاتے ہیں مگر قدرت آگ کے شعلوں اور فرانسیسی ہنگاموں اور اسی قسم کے اور غضبناک ظہور سے ظاہر ہو کر یہ بات بہت غضب اور قہر سے دنیا پر ظاہر کردیتی ہے کہ جعلی ہنڈویاں جعلی ہیں۔

راقم

سید احمد

بمقام لنڈن محلہ میکلن برگ اسکوئیر مکان نمبر ۲۱

۱۸۷۰ء

[1] میں اس قدر اور زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ کروڑوں آدمی اس وقت بھی اسی پر نہایت مستحکم اعتقاد سے زندگی بسر کررہے ہیں اور جن ملکوں میں اسلامی سلطنت کبھی نہیں گئی ان ملکوں کے لوگوں نے بھی ان کی باتیں سن کر ان کو قبول کیا اور اب بھی کہ اس کے بانی کو دنیا سے گئے ہوئے بارہ سو برس ہوگئے۔ ہر سال ملک میں اور ان ملکوں میں بھی جہاں اسلامی سلطنت نہیں ہے ہزاروں نئے لوگ اس پر بغیر کسی لالچ اور دھوکے کے اور بغیر کسی تدبیر کرنے والوں کی تدبیر وحکمت کے ایمان لاتے جاتے ہیں اور اسلام کو قبول کرتے ہیں تو کیا وہ ایسا جھوٹا کھیل ہے جیسا کہ ایک بازی گر کا ہوتا ہے۔ نہیں بلکہ اس کے سچ ہونے کا ہر ایک کے دل پر یقین ہوتا ہے۔ سید احمد

الخطبة الاولٰی

فی

جغرافیة جزیرة العربه وامم العرب العاربه والمستعربه

رب اجعل هذا البلد امنا واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام

عرب یا وہ جزیرہ نما جو جزیرۃ العرب کہلاتا ہے بحراحمر کے مشرق کی طرف واقع ہے اور یہاں سے خلیج فارس تک منتہی ہوتا ہے۔ اس بات کا ٹھیک ٹھیک محقق ہونا کہ اس ملک کا نام عرب کیونکر اور کس زمانہ میں رکھا گیا نہایت مشکل ہے لیکن کتاب اول ملک و باب (۱۰) آیت ۱۵ میں جہاں ملکہ سبا اور حضرت سلیمان کی ملاقات کا ذکر ہے اس کو ملک کو عرب کے نام سے بیان کیا گیا ہے یہ واقعہ ۳۰۰۰ دنیوی یا ۱۰۰۵ قبل حضرت مسیح کے گزرا تھا مگر ہماری رائے میں یہ جزیرہ حضرت سلیمان کے زمانہ کے بہت پہلے سے عرب کے نام سے کہلایا جاتا تھا کیونکہ اس کا ذکر کتاب ملوک میں اس طرح پر کیا کہ گویا ایک بہت معروف اور مشہور ملک کا نام ہے۔ کتاب توریہ ثنیٰ باب (۱) آیت (۷) و باب (۲) آیت (۸) میں لفظ عربہ پایا جاتا ہے مگر جو باتیں [1] کہ اس جزیرہ نما کی وجہ تسمیہ میں بیان کی گئی ہیں ان میں سے وہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے جو خود اس لفظ سے نکلتی ہے اور جو اس ملک کی طبعی بناوٹ کی طرف اشارہ کرتی ہے لفظ عربہ کے معنی وادی یا بیابان کے ہیں اور جو کہ ایک بڑا حصہ جزیرہ عرب کا بالکل بیابان ہے اور وادی کے نام سے مشہور ہے اسی وجہ سے کل جزیرہ کا نام عرب ہو گیا۔ لفظ عربہ کا ہر قصبہ کے نام کے پہلے بطور ایک عام صفت کے لگایا جاتا تھا اور اسی طرح عربات [2] جو اس کی جمع ہے اس جزیرہ کے ایک حصہ پر بولا جاتا تھا جیسا کہ کتاب توریہ ثنیٰ باب (۳۴) آیت (۱۸) میں ایا ہے بعض مورخ از راہ جرأت یہ رائے دیتے ہیں کہ ایک گاؤں [3] موسوم کی وجہ سے جو تہامہ کے نزدیک واقع ہے اس تمام جزیرہ کا یہ نام پڑ گیا مگر یہ رائے ٹھیک نہیں معلوم ہوتی ممکن ہے کہ لفظ عربہ جو کسی گاؤں کے نام سے پہلے محض بحیثیت ایک جز و ممیزہ کے استعمال کیا جاتا ہو اور رفتہ رفتہ اس کے اصلی نام کے قائم مقام ہو گیا ہو۔

---

[1] بعض لوگ عرب کے نام کو لفظ عرب کی طرف جس کے معنی ہموار بیابان کے ہیں اور جو صوبہ تہامہ کا ایک ضلع ہے منسوب کرتے ہیں اور بعض لوگ لفظ عربہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جس کے معنی خانہ بدوش کے ہیں کیونکہ زمانہ سابق میں عرب خانہ بدوش تھے۔ اس صورت میں اس کا اشتیاق لفظ عبرانی سے جس کی یہی وجہ تسمیہ ہے ثابت ہوتا ہے بعض لوگوں کے نزدیک یہ لفظ عبری مصدر عرب سے نکلا ہے جس کے معنی نیچے جانے کے ہیں اور اس سے وہ ملک مراد ہے جس میں سمک یعنی اولاد سام بن نوح کو جو دریائے فرات کے کنارہ پر رہتی تھی آفات غروب ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بوکارٹ صاحب کے نزدیک لفظ عرب ایک فنی شین لفظ سے جس کے معنی اناج کے بالوں کے ہیں مشتق ہوا ہے۔ لفظ عرب یہ ایک عبری لفظ بھی ہے جس کے معنی بنجر زمین کے ہیں اور توریت میں شام اور عرب کی حد فاصل کے طور پر بار ہا بولا گیا ہے (چمبرز انسائیکلو پیڈیا صفحہ ۳۴۴)

[2] عربات بالتحریک جمع عربة وهی بلاد العرب (مراصد الاطلاع جلد ۲ صفحہ ۲۴۵)۔

[3] عربة قریة فی اول وادی نخلة من جهة مكة (مراصد الاطلاع جلد ۲ صفحہ ۲۴۶)۔

عرب کی حدود اربعہ یہ ہیں مغرب میں، بحر احمر' مشرق میں خلیج فارس عمان' جنوب میں بحر ہند شمالی کی جانب اس کی سرحد بابل اور شام سے ملی ہوئی ہے اور اس کو آبنائے سویز مصر سے علیحدہ کرتی ہے یہ جزیرہ نما شمال اور مغرب کی جانب کنعان سے ملا ہوا ہے۔ جو بنی اسرائیل کا وطن ہے اور جس کو متقدمین یونانی فنشیا اور متوسط زمانہ کے لوگ فلسطین یا ارض مقدس کہتے تھے اور بالفعل سیریا یعنی شام شام کے نام سے مشہور ہے۔ اسی زمین کی نسبت خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد سے عطا کرنے کا وعدہ فرمایا تھا لیکن جو کہ ''ان دونوں ملکوں کی اس سمت میں بیابان حائل ہیں اس لئے قبل اس کے کہ عرب کی شمالی اور مغربی حد معین کرنے کی کوشش کی جائے ''ارض موعود'' کی جنوبی اور مشرقی حد کو محقق کرنا چاہیے جبکہ خدا تعالیٰ نے ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہاری اولاد کو ایک ملک عطا کروں گا اس وقت حضرت ابراہیم اس مقام پر رہتے تھے جو درمیان (بیت-ایل-اور-عی) کے واقع ہے جیسا کہ سفر تکوین باب (۱۳) آیت ۳ میں مذکور ہے اگرچہ خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے حضرت ابراہیم کو وہ ملک جس کے دینے کا وعدہ کیا تھا دکھلایا تھا لیکن اس کی ٹھیک ٹھیک حدیں نہیں بتائی تھیں جیسا کہ سفر تکوین باب (۱۳) آیت (۱۴'۱۵) سے ظاہر ہوتا ہے مگر جب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ اپنے وعدے کی تجدید کی اس وقت حضرت ابراہیم کو صرف اس کی دو حدیں بتلائیں جیسا کہ سفر تکوین باب (۱۵) آیت (۱۸) میں لکھا ہے کہ خدا نے ابراہیم سے کہا کہ اس زمین کو نہر مصر سے نہر بزرگ تک جو نہر فرات ہے تیری ذریت کو دوں گا۔

مگر تعجب ہے کہ اس کے بعد کتاب ہائے مقدس کے کسی لکھنے والے نے دریائے مصر کو ''ارض موعود'' کی سرحد نہیں قرار دیا جس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی بلکہ برخلاف اس بیر شبع [1] ہر جگہ اس کی حد جنوبی قرار دیا ہے اور جب کہ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو بیابان مواب میں ''ارض موعود'' دکھلائی تو انہوں نے دیکھا کہ صوعر [2] اس کی جنوبی سرحد ہے۔ صوعر اور بیر شبع قریب قریب ایک ہی خط میں واقع ہیں اس واسطے ان دونوں میں سے کوئی جگہ بلاتفرقہ ''ارض موعود'' کی جنوبی سرحد قرار پا سکتی ہے۔

مگر یہ بات بالتخصیص جاننی چاہیے کہ بیر شبع [3] دو تھے ایک کا نام صرف بیر شبع [4] تھا اور دوسرے کا نام قریہ بیر شبع یا شبعہ [5] کہا جاتا تھا یعنی وہ جگہ جہاں بیابان جرار میں حضرت اسحٰق کے نوکروں نے اس وقت جب کہ حضرت اسحٰق اور ابی ملک کے باہم عہد و پیمان اور حلف ہوا تھا ایک کنواں کھودا تھا چنانچہ سفر تکوین باب ۲۶ درس ۳۲'۳۳ میں لکھا ہے ''اور ایسا ہوا کہ اسی دن اسحٰق کے نوکر آئے اور اس کنویں کا حال جو انہوں نے کھودا تھا بیان کیا اور ان سے کہا کہ ہم کو پانی مل گیا اور انہوں نے اس کا نام شبع رکھا' اسی واسطے اس شہر کا نام آج تک بیر شبع ہے۔'' اور یہ وہی [6] جگہ ہے جہاں سے کہ حضرت یعقوب حاران کو روانہ ہوئے تھے اور

[1] کتاب قضاۃ باب ۲۰ شموئیل اول باب ۳ درس ۲۰ شموئیل دوم باب ۳ آیت ۱۰ و باب ۱۷ آیت ۱۱ باب ۲۴ آیت ۲ و ۱۵ ملوک اول باب ۴ آیت ۲۵ ملوک دوم باب ۲۳ آیت ۸ تواریخ اول باب ۲۱ آیت ۲ تواریخ دوم باب ۳۰ آیت ۵۔

[2] توریہ مثنی باب ۳۴ آیت ۳۔

[3] ہم کو صاف اور صریح خبر ملی ہے (شموئیل دوم باب ۲۴ آیت ۷ و ۱۵) سے کہ بیر شبع یہودیہ کے جنوب میں ادومیہ کی جانب واقع تھا اور اس واسطے اس کو وہ بیر شبع نہ سمجھ لینا چاہیے جو گلیلی کے اوپر کے حصہ میں واقع ہے اور جس کا ذکر جوسیفس نے اور ڈاکٹر رچرڈسن نے کیا ہے (بائبل انسائیکلوپیڈیا مولفہ جے۔ بی۔ لاسن ایم۔ اے جلد ا صفحہ ۳۰۷)

[4] سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۳۱ و ۳۲۔ [5] یوشع باب ۱۹ آیت ۲۔ [6] سفر تکوین باب ۲۸ آیت ۱۰۔

اسی [1] جگہ حضرت یعقوب کے بیٹے جبکہ وہ مصر کو غلہ لینے جاتے تھے ٹھہرے تھے اور ایک زمانہ میں یہ شہر گردنواح کے ملک کا پایہ تخت تھا اور شموئیل کے لڑکے وہاں [2] حاکم تھے۔ عاموص [3] نبی نے بھی اس مقام کا ذکر کیا ہے کہ یہاں بت پرستی بہت شائع تھی اور صبیاہ [4] مادر میہو یہواش اسی جگہ پیدا ہوئی تھی اور ایلیاء [5] ملکہ ایزبل کے خوف سے یہاں بھاگ آئی تھی۔ یہ شہر [6] بابل والوں کی گرفتاری تک ویران نہیں ہوا تھا۔

بعض لوگوں کی یہ رائے ہے کہ وہ اب ایک نہایت چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے اور ایک وسیع ریگستان کے قرب وجوار میں واقع ہے جہاں کہ بجز اطراف سمندر کے آبادی کا نام ونشان نہیں ہے۔ بیر شبع جران سے بیس پچیس میل کے فاصلہ پر تھا اور جو سیفس کے زمانہ میں جو چوتھی صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس میں ایک رومی فوج رہتی تھی۔ یہ بیر شبع اکتیس درجہ سترہ دقیقہ عرض شمالی پر واقع تھا اور طول شرقی اس کا چونتیس درجہ اور چون دقیقہ کا تھا پہلا بیر شبع قادیش اور شور کے بیابانوں کے بیچ میں تھا اور حضرت ابراہیم نے اس کو بنایا تھا حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کلدانیوں کے شہر کو جس کا نام ''اور کلدانیاں'' [7] تھا چھوڑ کر حاران کو چلے گئے اور وہاں چندروز ٹھہر کر مصر کی طرف چلے گئے اور جب مصر سے واپس ہوئے تو اسی [8] جگہ پر ٹھہرے جہاں کہ پہلے ٹھہرے تھے اور وہاں سے حضرت لوط ان کے ساتھ سے جدا ہو کر وادی [9] اردن کو روانہ ہو گئے اور حضرت ابراہیم نے قدلیش اور شور [10] کے بیابانوں میں سکونت اختیار کی اور وہاں ایک [11] کنواں کھودا حضرت ابراہیم [12] مدت تک یہاں رہے اور ایک باغ [13] لگایا اور جب حضرت [14] حاجرہ حضرت ابراہیم کی پہلی بیوی حضرت سارہ سے ناراض ہو کر نکل گئی تھیں تو اسی جگہ پر آئی تھیں اور اسی کنوئیں کے پاس ان کو خدا کا فرشتہ دکھائی دیا تھا اور اس لئے انہوں نے اس کنوئیں کا نام بیرلحی روئی یعنی ''بیر للحی المرئی'' رکھا تھا۔ اس کے بعد ایک قحط سالی کے ایام میں حضرت اسحٰق نے اس مقام کی سکونت چھوڑ دی اور جرار [15] کو چلے گئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ قادیش ایک اور جگہ ہے اور جرار اس سے بہت دور ہے۔ وہاں کے باشندے حضرت اسحٰق سے واقف نہ تھے اور غالباً بدطینت اور بدخصلت آدمی تھے۔ اس لئے حضرت اسحٰق نے جیسا کہ توریت میں لکھا ہے ان لوگوں سے اپنی بی بی کی نسبت کہا کہ یہ میری بہن [16] ہے مگر جب ابی ملک نے حضرت اسحٰق کو جرار سے نکال دیا تب انہوں نے بیابان جرار میں بودوباش اختیار کی اور وہاں ایک کنواں کھودا جس کا نام شبع رکھا اور جس مقام پر سکونت اختیار کی تھی۔ اس کا نام قریہ [17] بیر شبع رکھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ جگہ وہ جگہ ہرگز نہیں ہو سکتی جہاں حضرت ابراہیم نے کنواں کھودا تھا۔

ان باتوں کی اس قدر تفصیل کرنے سے ہمارا انشاء دو چیزوں کے ثابت کرنے کا ہے اول یہ کہ عرب کی شمالی حد ملک شام یا

---

[1] سفر تکوین باب ۲۶ ورس ۱' ۵
[2] شموئیل اول باب ۸ آیت ۲۔
[3] کتاب عاموص باب ۵ آیت ۵ باب ۸ آیت ۱۴ باب ۷ ورس ۹۔
[4] ملوک دوم باب ۱۲ آیت ۱ تواریخ دوم باب ۲۴ ورس ۱۔
[5] ملوک اول باب ۱۹ ورس ۳۔
[6] نحمیاہ باب ۱۱ آیت ۲۷ و ۳۰۔
[7] سفر تکوین باب ۱۱ آیت ۳۱۔
[8] سفر تکوین باب ۱۳ ورس ۳۔
[9] سفر تکوین باب ۱۳ آیت ۱۰' ۱۱۔
[10] سفر تکوین باب ۲۰ آیت ۱
[11] سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۱۴ و ۱۵ و ۳۰۔
[12] سفر تکوین باب ۲۲ آیت ۱۹۔
[13] سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۳۳۔
[14] سفر تکوین باب ۱۶ آیت ۸ لغایت ۱۴۔
[15] سفر تکوین باب ۲۶ ورس ۶۔
[16] سفر تکوین باب ۲۶ ورس ۷۔
[17] سفر تکوین باب ۲۶ آیت ۳۳۔

''ارض موعود'' سے ملحق ہوتی ہے اور ''ارض عود'' کی جنوبی حد حضرت اسحٰق والا بیر شبع یا صوعر جس کو بلع [1] بھی کہتے ہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیم والا بیر شبع قادیش میں ہے جو ملک عرب میں واقع ہے۔

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم والا بیر شبع اور حضرت اسحٰق والا بیر شبع دونوں ایک ہی ہیں ان واقعات پر مبنی ہے جن کو کہ میں ابھی ثابت کروں گا کہ ان پر کسی طرح اعتبار نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلا واقعہ جو ان کی رائے کا مؤید ہے یہ ہے کہ جب حضرت اسحاق قادیش سے چلے گئے تو فلسطین والوں نے حضرت ابراہیم کے کھودے ہوئے کنویں کو مٹی سے بھر کر بند کر دیا اور جب کہ ابی ملک نے حضرت ابراہیم کے کھودے ہوئے کنوئیں کو مٹی سے بھر کر بند کر دیا اور جب کہ ابی ملک نے حضرت اسحٰق علیہ السلام کو جرار سے نکال دیا تو حضرت اسحٰق علیہ السلام نے کنوؤں کو از سر نو کھودا جو ان کے والد حضرت ابراہیم کے زمانہ میں کھودے گئے تھے اور جن کو فلسطین والوں نے روک دیا تھا اور انہوں نے ان کنوؤں کے وہی نام رکھے جو ان کے والد نے رکھے تھے۔ مفسرین توریت کا یہ استدلال ابتدائی یا سرسری نظر میں ٹھیک معلوم ہوتا ہے اور خیال میں آتا ہے کہ بیر شبع ایک ہی ہوگا ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ خیال ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا۔ سفر تکوین کے چھبیسویں باب کی اٹھارہویں آیت تک توریت میں حضرت ابراہیم کے صرف انہیں کنوؤں کا بیان ہے جن کو حضرت اسحٰق نے پھر کھدوایا تھا مگر اسی باب کی انیسویں آیت سے لے کر آخر باب تک ان قدیم کنوؤں کا مطلق ذکر نہیں ہے بلکہ نئے کنوؤں کا ذکر ہے۔ ان نئے کنوؤں کے نام بھی حضرت اسحٰق نے نئے رکھے تھے۔ اول کا نام بیر عسق دوسرے کا نام سطنہ تیسرے کا نام رجوبوث اور چوتھے کا نام بیر عسق رکھا تھا۔ اس سے صریح واضح ہے کہ یہ کنوئیں حضرت ابراہیم کے کنوؤں میں سے نہیں تھے پھر اسی بات کی سترویں آیت کا صاف صاف مضمون یہ ہے کہ حضرت اسحٰق نے جرار کی وادی میں اپنا خیمہ نصب کیا اور وہاں آباد ہوئے۔ اور انیسویں اور بیسویں آیت میں بیان ہے کہ حضرت اسحٰق کے آدمیوں نے وادی میں کنواں کھودا اور وہاں ایک کنواں جاری پانی کا برآمد ہوا اور جرار کے چرواہوں نے حضرت اسحٰق کے چرواہوں سے تکرار کی اور پانی پر اپنا دعویٰ کیا پس جب کہ ان سب آیتوں کا ایک دوسری سے مقابلہ کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کنویں وادی جرار میں کھودے گئے تھے نہ وادی قادیش میں۔ ایک اور امر جو مذکورہ بالا لوگوں کی رائے کی تائید کرتا ہے تیسویں آیت کا یہ مضمون ہے کہ حضرت اسحٰق ابی ملک کو چھوڑ کر بیر شبع کو چلے گئے جس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس بیر شبع سے مراد حضرت ابراہیم والا بیر شبع ہے کیونکہ اس وقت تک حضرت اسحٰق والے بیر شبع کا وجود بھی نہ تھا لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ جس بیر شبع کا اس آیت میں ذکر ہے وہ حضرت ابراہیم والا بیر شبع نہیں ہے بلکہ حضرت اسحٰق والا بیر شبع ہے۔ کتب مقدسہ لکھنے والوں کا یہ قاعدہ ہے کہ پچھلے زمانہ کے حالات لکھنے میں جب کسی مقام کا ذکر آتا ہے تو وہ اس مقام کا وہی نام لکھ دیتے ہیں جو زمانہ تحریر میں اس کا نام ہوتا ہے گو کہ اس زمانہ میں جس کا وہ حال لکھتے ہیں اس مقام کا وہ نام نہ تھا بلکہ وجود بھی نہ تھا چنانچہ اکثر مقامات میں انہوں نے بہت سے شہروں اور قصبوں کا جو اس زمانہ کے عرصہ دراز کے بعد وجود میں آئے تھے نام لے کر ذکر کیا ہے اکیسویں باب کی چودھویں آیت میں حضرت ابراہیم والے بیر شبع کا نام مذکور ہے۔ اگرچہ اس وقت تک اس کنویں نے وہ لقب حاصل نہیں کیا تھا۔

عرب علی العموم ایک وسیع مسطح اور ویران ملک ہے مگر جا بجا چند بے انتہا سرسبز و شاداب قطعات بھی واقع ہیں اور بعض عظیم الشان

---

1 سفر تکوین باب ۱۴ ورس۔

پہاڑ بھی ہیں جن کی گھاٹیاں تازگی اور خوشنمائی کے لئے مشہور ہیں۔ اس میں جو سب سے بڑے نقصانات ہیں وہ کثرت سے وادیوں کا ہونا اور پانی کا نہ ہونا ہے۔ میوے مختلف اقسام کے ہوتے ہیں جن میں کھجور نہایت عمدہ اور خوش ذائقہ ہوتی ہے جو عرب کے ملک سے مخصوص ہے اور درحقیقت عرب کے لوگوں کی زندگی کا بہت بڑا ذریعہ ہے عرب کے گھوڑے تمام دنیا کے گھوڑوں سے عمدہ اور خوبصورت ہوتے ہیں لیکن عرب کے لئے سب سے زیادہ مفید جانور اونٹ ہے جس کو ریگستان کا جہاز لکھنا بے جا نہیں ہے۔

عرب ٹھیک طور سے دو حصوں میں منقسم ہو سکتا ہے ایک عرب الحجر یعنی کوہستانی عرب جو خاکنائے سویز سے لے کر بحر احمر اور بحر عرب تک پھیل رہا ہے دوسرا عرب الوادی یعنی عرب کا مشرقی حصہ مگر بطلیموس[1] پرانے جغرافیہ دان نے عرب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ عرب الحجر یعنی پتھریلا عرب' عرب المعمور یعنی عرب آباداں' عرب الوادی یعنی ریگستانی عرب۔ آج کل کے نقشوں میں عرب الحجر میں صرف وہ حصہ ملک کا شامل رکھا گیا ہے جو خلیج سویز اور خلیج عقبہ کے درمیان واقع ہے مگر اس تقسیم کے لئے کوئی معتبر سند نہیں۔ بطلیموس کے جغرافیہ کے مطابق عرب الحجر کو خلیج سویز سے لے کر یمن یا عرب المعمور کی حد تک شمار کرنا چاہیے۔ وہ لوگ جن کے نزدیک بطلیموس نے عرب المعمور لفظ یمن کا ترجمہ کیا ہے بلاشک غلطی پر ہیں کیونکہ اس پرانے جغرافیہ دان کے زمانہ میں عرب الحجر کا جنوبی حصہ گنجان آباد تھا اور تجارت کے لئے مشہور تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے تمام جزیرہ کے اس حصہ عرب المعمور نام رکھ دیا عربی جغرافیہ دانوں نے جزیرہ عرب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ تہامہ' حجاز' نجد' عروض' یمن' غیر ملکوں کے مورخ اور جغرافیہ دان جو یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اس ملک کو حجاز اس سب سے کہتے ہیں کہ حاجی اور زائروں کا مرجع ہے وہ بڑی غلطی پر ہیں کیونکہ لفظی معنی حجاز کے اس چیز کے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان میں واقع ہو۔ تمام ملک کا یہ نام اس پہاڑ کی وجہ سے پڑ گیا ہے جو شام اور یمن کے درمیان بطور حجاب کے واقع ہے۔ عرب بلحاظ ان مختلف قوموں کے جو اس زمانہ میں آباد ہیں اور ان آبادیوں کے ناموں کے اور ان آبادیوں کے ملکی حالات کے اور ان کے باشندوں کے اعتبار سے بیشمار حصوں میں منقسم ہو گیا ہے مگر اس بات کا کہنا کہ یہ حصے ٹھیک ٹھیک کس طرح پر ہیں بغیر اس بات کے اول جان لینے کے کہ یہ قومیں جو ان میں آباد ہیں کون ہیں اور کہاں سے آئی ہیں اور کہاں کہاں آباد ہوئیں اگر محال نہیں تو غیر ممکن تو ضرور ہے اس لئے ہم حتی الامکان ان امور کی تنقیح کی کوشش کریں گے ان امور کی نسبت کتب مقدسہ یا عرب کے قرب و جوار کی قوموں کی کتابوں میں بہت کم تذکرہ پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کتب مقدسہ کے لکھنے والے صرف ''ارض موعود'' کے حالات لکھنے اور تلاش کرنے میں مصروف رہے اور ان کی تمام ہمت صرف بنی اسرائیل کے حالات لکھنے پر منحصر تھی اور غیر قوموں نے اس ویران اور بے ثمر ملک کی طرف کچھ توجہ نہیں کی۔

اس کتاب کے لکھنے میں جہاں تک کہ ہو سکے گا ہم ان دونوں ذریعوں سے گو کہ ان سے بہت ہی کم حالات معلوم ہوتے ہیں فائدہ حاصل کریں گے اور اس کی تائید میں عرب کی ملکی روایتوں سے جو قابل اعتبار معلوم ہوتی ہے غفلت نہ کریں گے۔

جو ملکی روایتیں عرب کی مختلف قوموں کی تقسیم کے باب میں ہیں وہ نہایت معتبر ہیں کیونکہ عرب کے لوگ اپنی آبائی رسوم اور

---

[1] جزیرہ عرب کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا موجد بطلیموس خیال کیا جاتا ہے اور وہ تین حصے یہ ہیں۔ عرب الحجر' عرب المعمور' عرب الوادی۔ عرب الحجر میں تمام شمالی۔ غربی حصہ شامل تھا۔ عرب المعمور میں غربی اور جنوبی کنارہ عرب الوادی میں تمام اندرونی حصہ جو اچھی طرح معلوم نہ تھا مگر اس تقسیم کو عرب کے لوگ تسلیم نہیں کرتے اور حال کی تحقیقات کی رو سے بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی چیمبرز انسائیکلو پیڈیا صفحہ ۴۴۴ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بطلیموس نے ملک کو اس کی طبعی حالت کے لحاظ سے تقسیم کیا تھا نہ کہ حد بندی کے لحاظ سے۔

اوضاع اور اطوار کے بدرجہ غایت پابند تھے اور ان کو کبھی ترک کرنا یا تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے اور اسی وجہ سے وہ لوگ اپنے نسب ناموں کو یاد رکھنا قریباً قریباً اپنا فرض سمجھتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہر ایک قوم نہیں بلکہ ہر ایک قبیلہ اپنا اپنا جدا جدا نام رکھتا تھا اور اس ذریعہ سے ہر ایک شخص اپنی قوم اور قبیلہ کو بخوبی جانتا تھا اور اپنے حسب نسب پر بے انتہا فخر کرتا تھا اور جس طرح کہ پرانی قوموں ''سکنڈ نیوین'' اور ''سلفک'' کے ہاں کر کیت ہوتی تھی۔ اسی طرح عرب کی قوموں میں بھی ہوتی تھی جن کا لڑائیوں میں مردانہ اشعار پڑھنا اور لڑنے والوں کو ان کے حسب نسب کا جتلانا جنگی باجے کا کام دیتا تھا۔ [1]

جو کچھ کہ میں نے عرب کی ملکی روایتوں کی نسبت بیان کیا ہے اس کی تائید ریورنڈ مسٹر فارسٹر کے بیان سے ہوتی ہے۔ انہوں نے عرب کا ایک جغرافیہ لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''عربوں کی قدیمی اوضاع اور رسوم اور یادگاروں کی پابندی کو جو ہمیشہ سے زباں زد خاص و عام ہے تمام دلائل میں سب سے اول رکھنا مناسب ہے کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان کے قوی خاصوں میں سے یہ خاصہ سب سے مقدم ہے۔ ایک اور تعجب انگیز مثال عرب کی اس پابندی کی قدامت اور رفاقت کی کرنیل چسنی نے اس طرح بیان کی ہے کہ عجل عربوں کا ایک گروہ بغداد کے قریب خیمہ زن ہوا۔ میں ان کے خیمہ گاہ کی سیر کے واسطے گیا۔ ان خیموں کے بیچ میں شاہی نشان اسپین کا لہراتا ہوا دیکھ کر مجھ کو کمال حیرت ہوئی اور ایک عربی خیمہ میں تین دھاریوں کی علامتوں کو دیکھ کر میں نے ان کا حال دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ایک نہایت بوڑھے آدمی نے مجھ سے کہا کہ جب کہ ان کے آباؤ اجداد بربر کے ملک میں گئے تھے اور وہاں سے اسپین کی فتح کے واسطے روانہ ہوئے اس وقت خلیفہ نے ان کی خدمات کے عوض میں قبیلہ عجل کو شاہی نشان اسپین کا بطور جھنڈے کے عطا فرمایا تھا۔ ڈین پریڈو نے عرب کی رسم و رواج کی نسبت اس طرح پر لکھا ہے کہ قوم عرب دنیا میں سب سے زیادہ قدیم قوم ہے جو اپنے مورث اعلیٰ کے زمانہ سے آج تک نسلاً بعد نسل اپنے ملک میں رہتی چلی آئی ہے اور جس قدر کہ عرب اپنی رسوم رواج میں تغیر و تبدل کو ناپسند کرتے ہیں اسی قدر ملک کے ناموں کے بدلنے کو ناپسند کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر مقاموں کے وہی نام بدستور چلے آتے ہیں جو ابتداء میں رکھے گئے تھے۔ اسی وجہ سے ملک مصر کے قدیمی دارالسلطنت کے رہنے والے جو مصری کہلاتے تھے اور بعد کو زمانہ دراز تک بنام ممفس مشہور رہے۔ عربوں کے تسلط کے زمانہ سے پھر مصری کہلانے لگے اور جب سے برابر یہ نام چلا آتا ہے۔ یہ مثالیں منجملہ ان بیشمار مثالوں کے ہیں جو علامہ ڈین نے بیان کی ہیں۔ پروفیسر النسن کا بیان ہے کہ فلسطین میں ایک اور قسم کی قدیمی روایت ہے۔ جس سے کہ کینسوں کو کچھ علاقہ نہیں ہے یعنی عوام الناس میں مقاموں کے قدیمی ناموں کا بجنسہ چلا آنا فی الحقیقت یہ قومی اور دیسی روایت ہے جو کسی طرح پر اجنبی کنیسوں اور اجنبی حکام کے اثر سے پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ انہوں نے اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ اس کو پیا ہے اور سمٹک زبانوں کی طبیعت میں استحکام کے ساتھ گھر پکڑ گئے ہیں مقامات کے عبرانی نام انجیل کے زمانہ کے بہت عرصہ بعد تک اپنی آرامی شکل میں مروج رہے اور باوجود اس کے کہ یونانی اور رومیوں نے اپنی اپنی زبانوں کے ناموں کے ترویج کے لئے کوششیں کیں مگر عوام الناس کی زبان پر وہی پرانے نام جاری رہے۔

---

[1] ہمارے ملک میں جو ہندو قومیں آباد ہیں ان کے حالات پر غور کرنے سے اور اس بات کے دیکھنے سے کہ باوجود اس کے کہ ہزارہا برس اور مختلف حکومتیں ان پر گزر گئیں ہیں مگر ان کی جدا جدا قومیں آج تک ممکن طرح پر محفوظ ہیں اور ہر ایک شخص اپنی قوم اور اپنی گوت یعنی قبیلہ سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے اور آج تک ان کے معزز لوگوں کے ہاں بھاٹ اور کر کیت موجود ہیں۔ عرب کی قدیم قوموں کے حالات کا نقشہ بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے اور ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ اسی طرح انہوں نے اپنی قوم اور قبیلہ کو علیحدہ علیحدہ محفوظ رکھا تھا۔

غرضیکہ ملک عرب کی ملکی روایتیں نہایت عمدہ اور صحیح ذریعہ ملک عرب کے حالات دریافت کرنے کا ہے۔ ان کی رسوم کا علم مندرجہ ذیل امور سے معلوم ہوسکتا ہے۔ میدان جنگ میں کوئی جنگ آور بدوں اس کے کہ حریف سے اپنا حسب ونسب بآواز بلند بیان کرے تنہا لڑائی میں مشغول نہیں ہوتا تھا۔

کسی عام مہم میں ہر شخص اپنے ہی قوم کے سردار یا رئیس کے جھنڈے کے نیچے قیام کرتا تھا بعض اوقات جبکہ کسی قوم کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا تو اس کی پاداش میں اس ساری قوم کے لوگوں کو جرمانہ دینا پڑتا تھا جو اب شرع میں بلفظ الدیت علی العائلہ مستعمل ہے۔

اس قسم کی رسوم کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے لوگوں کو اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسری قوم میں جاملنا غیر ممکن ہو گیا تھا اور اسی بناء پر جزیرہ عرب کے مختلف اقطاع پر تقسیم ہونے کی روایتوں پر کما حقہ اعتبار قائم ہوا اور برقرار رہا۔ اب ہم عربوں کی اس مشہور ومعروف پابندی کو جو اپنی قومی اطوار اور عادات اور اپنے بزرگوں کی رسوم کے ساتھ رکھتے ہیں بیان کر کے سوال کرتے ہیں کہ اس بات کا یقین کرنا کس طرح سے ممکن ہے کہ ایسی قوم پر جو تغیر وتبدیل کے اس قدر برخلاف ہو اور مزید براں قبیلوں کے سخت اختلافات کی نسبت اس قدر محتاط ہوں مندرجہ ذیل شبہات کرنے کے لئے کافی وجوہ ہیں یعنی ایسے شبہات کے لئے جن کی تائید کے واسطے کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ ایک طرف دار مصنف کے خیالی شوشے ہیں مثلاً یہ کہنا کہ بنی عملیق اور بنی نبات میں ہم کو عیسو اور اسماعیل کی اولاد صاف صاف نظر آتی ہے اور اس بات کا فرض کر لینا کچھ ضرور نہیں ہے کہ ان کے انساب کا علم یا روایت خود ان قوموں میں بجنسہ چلی آتی ہے بلکہ فتح کے انقلابات اور دوسری قوموں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے یہ بات بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ ایسی وحشی قوم کے پاس جن کے پاس کوئی تحریری یادداشت نہیں ہے ان کو اپنے نسب کی واقفیت اتنی صدیوں تک محفوظ اور برا قرار رہی ہو مگر اس معترض کو ہمارے اوپر کے بیان سے ثابت ہو گیا ہوگا کہ یہ امر نا ممکن نہ تھا بلکہ درحقیقت اسی طرح پر واقع ہوا جیسا کہ بیان ہوا ہے۔

اب یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ کی سکونت کے باب میں ملکی اور قومی دونوں طرح کی روایتیں نہایت معتبر ذریعہ سے ہمارے زمانہ تک پہنچی ہیں اور وہ ایسی روایتیں ہیں کہ جن کو تمام قوم نے بلا تامل صحیح مان لیا ہے پھر ہم کس طرح کسی عیسائی طرف دار مصنف (سرولیم میور) کے محض بے دلیل بیانات کو صحیح اور معتبر کر سکتے ہیں جس کا یہ بیان ہے کہ ''یہ روایت ایک کہانی ہے یا توریت سے اخذ کر کے تحریر کر دی گئی ہے'' مگر جس وقت کہ اس عالی رتبہ مصنف نے یہ بیان کیا ان کو معلوم نہ ہوگا کہ خود توریت ہی سے حضرت ابراہیم کی نسب کی بابت اس روایت کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے بعد مصنف موصوف نے کم سن اسماعیل اور ان کی بے کس ماں کی سکونت کی اصلیت کی نسبت اس طرح پر قیاس دوڑایا ہے کہ ''بنی اسماعیل اور عمالیق کی قومیں جزیرہ عرب کے شمال اور وسط میں پھیلی ہوئی تھیں۔ غالباً یہی لوگ مکہ کے اصلی متوطن ہوں گے یا زمانہ سابق میں یمن کے لوگوں کے شمول میں وہاں آبسے ہوں گے۔ اس کے بعد ایک فرقہ بنی اسماعیل خواہ نباتی خواہ کسی ہم نسل خاندان کا وہاں کے کنوؤں اور کاروانی تجارت کے دل پسند موقع کے لالچ میں وہاں چلا گیا ہوگا اور بہت ذی اختیار ہو گیا ہوگا۔ یہ فرقہ اپنی ابراہیمی نسب کی پرانی روایتوں کو اپنے ساتھ لے گیا ہوگا اور مقامی اوہام اور اعتقادات پر خواہ وہ اسی ملک کے ہوں یا یمن سے لائے گئے ہوں۔ ان کو منقش کر دیا ہوگا۔

ان قیاسی باتوں کی غلطی اس طرح پر ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت اسماعیل کی عمر جب کہ ان کے باپ نے ان کو گھر سے نکالا تھا

توریت کے مطابق سولہ[1] برس کی تھی اور یہ عمر ایسی تھی کہ جو روایتیں انہوں نے اپنے والد سے سنی تھیں ان کے سمجھنے اور تمیز کرنے اور یاد رکھنے کے قابل تھے۔ اس کے سوا وہ ہمیشہ اور متواتر اپنے والد سے ملاقات کرتے رہے اور حضرت ابراہیم بھی اکثر ان کے پاس آتے جاتے تھے۔ انجام کار سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ حضرت اسماعیل جن کی عمر اس وقت نواسی برس کی تھی بر وقت وفات حضرت ابراہیم اپنے والد کے ان کے پاس موجود تھے۔ یہ سب باتیں ہر ذی فہم اور غیر متعصب شخص کے ذہن نشین کرنے کو کافی ہوں گی کہ یہ تمام روایتیں جو مختلف اقوام عرب میں اس قدر شائع ہیں۔ لوگوں کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل سے پہنچی ہیں اور یہ امور ایسے بدیہی اور ذہن نشین ہونے کے لائق ہیں کہ اگر پھر کوئی شخص براہ جرأت یہ کہے کہ یہ روایتیں یہودیوں کی وساطت سے پہنچی ہیں تو اس کو سن کر کچھ کم تعجب نہ ہوگا مگر تعجب اس بات پر آتا ہے کہ مصنف موصوف نے اپنے قیاسی خیال کے ثابت کرنے کا ادعا کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ ''مگر ان بنی اسرائیل کو جو توریت پڑھتے ہیں صرف نام اور مقام ہی سے اس نسب کا احتمال عائد ہوتا ہے اور یہودی مصنفوں میں الہامی ہوں خواہ غیر الہامی ہم کافی اظہار اس امر کا پاتے ہیں کہ ایسا خیال درحقیقت کیا گیا تھا۔ یہ قدرتی استنباط خود ان قوموں میں جن سے وہ علاقہ رکھتا تھا قرب وجوار کے یہودیوں کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً شائع ہو گیا ہوگا اور ان بے جوڑ روایتوں کے غیر مکمل آثار کو جو ہنوز ان کے تخیلات اور ان کی عادات اور ان کی زبان میں موجود تھے تقویت دے دی ہوگی۔''

اگر چہ اس رائے کی غلطی اوپر کے بیان سے بخوبی ظاہر ہوگئی ہے مگر عرب کی قوموں کی عادت پر خیال کرنے سے اس رائے کی اور زیادہ غلطی ظاہر ہوتی ہے۔ عرب کے قدیم رہنے والوں نے اپنی جبلی عادت کے موافق اپنی اصل روایتوں میں کوئی نئی روایت اضافہ نہیں کی تھی اور تمام غیر قوموں سے بالکل علیحدہ رہتے رہے یہاں تک کہ جب حضرت اسماعیل اور ان کے ہمراہی وہاں آ کر آباد ہوئے تو قدیمی عرب ان کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور ذلیل لقب ''مستعربہ'' سے ان کو ملقب کیا تھا آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے بنی اسرائیل اور خصوصاً اہل عرب بنی اسماعیل کو ہمیشہ دو مختلف قومیں سمجھتے رہے اور قدیم عرب نے اپنی قدیمی روایتوں کا ان سے مبادلہ نہیں کیا اور بنی اسرائیل کے پاس عرب کی قوموں اور عرب کے انبیاء کی نسبت زبانی خواہ تحریری کوئی روایت نہ تھی۔

آنحضرت ﷺ نے جب یہ بات فرمائی کہ جمیع انبیاء بنی اسرائیل برحق نبی تھے اور ان پر ایمان لانا چاہیے۔ اس وقت بنی اسرائیل کی اور ان کے نبیوں کی روایتیں اور قصے عرب کی روایتوں اور قصوں میں مخلوط ہو گئے لیکن جو کہ بنی اسرائیل کے ہاں عرب کی کچھ روایتیں نہ تھیں اس وجہ سے عرب کی روایتیں بجائے خود بجنسہ برقرار ہیں۔

تمام نئے آباد ہونے والے جو وقتاً فوقتاً عرب میں آباد ہوئے اور قدیم متوطنان عرب نے تین نام حاصل کئے تھے اول عرب البائدہ یعنی صحرائی عرب دوم عرب العاربہ یعنی قدیمی عرب سوم عرب المستعربہ یعنی عرب میں نئے آباد ہونے والے جو بہ سبب زمانہ دراز کی سکونت کے عرب بن گئے تھے تین بڑی تقسیمیں قریب قریب کے تمام باشندگان عرب پر حاوی ہیں خانہ بدوش بدوؤں سے

---

[1] جب حضرت اسماعیل پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم کی عمر چھیاسی برس کی تھی (سفر تکوین باب ۱۶ آیت ۱۶) اور جب حضرت اسحٰق پیدا ہوئے تو حضرت ابراہیم کی عمر سو برس کی تھی (سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۵) اور حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو حضرت اسحٰق کے دودھ چھٹنے کے زمانہ میں گھر سے نکال دیا تھا۔ اس حساب سے حضرت اسماعیل جب کہ جلاوطن ہوئے تھے سولہ برس کے تھے حضرت ابراہیم کا ایک سو پچھترویں برس کی عمر میں انتقال ہوا تھا اور حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق دونوں نے مل کر کھپیلاد کے غار میں دفن کیا (سفر تکوین باب ۲۵ آیت ۹) اس لئے حضرت اسماعیل کی عمر اس وقت نواسی برس کی تھی۔

لے کران قدرے شائستہ قوموں تک جو کنارہ کے برابر برابر آباد ہیں اور معہذا قدیم باشندگان عرب اور جدید باشندگان عرب کے درمیان تمیز بھی قائم رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ عرب کے باشندوں کا ان مذکورہ بالا تین عام قسموں کے مطابق علیحدہ علیحدہ بیان کریں۔

اول

عرب البائدہ یا خانہ بدوش صحرائی عرب کی قومیں

عرب البائدہ میں سات شخصوں کی اولاد کی سات مختلف گروہیں شامل ہیں۔ (۱) کوش پسر حام پسر نوح کی اولاد (۲) عیلام پسر سام پسر نوح کی اولاد (۳) لود پسر سام پسر نوح کی اولاد (۴) عوص پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد (۵) حول پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد (۶) جدیس پسر گثر پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد (۷) ثمود پسر گثر پسر ارم پسر سام پسر نوح کی اولاد۔

کوش کی اولاد خلیج فارس کے کنارہ پر اور اس کے قرب وجوار کے میدانوں میں آباد ہوئی۔

جرہم پسر عیلام بھی اسی طرف جا کر رود فرات کے جنوبی کناروں پر سکونت پذیر ہوا۔

لود کے جوان میں سے تیسرا امورث اعلیٰ ہے تین بیٹے مسمیان طسم، عملیق امیم تھے جنوح نے اپنے آپ کو تمام مشرقی حصہ عرب میں یا یہ سے لے کر بحرین اور اس کے گرد نواح تک پھیلا دیا۔

عوص پسر عاد اور حول دونوں نے ایک ہی سمت اختیار کی اور جنوب میں بہت دور جا کر حضرت موت اور اس کے قرب وجوار کے میدانوں میں اقامت اختیار کی۔

جدیس پسر گثر پسر ارم پسر سام عرب الوادی میں آباد ہوا۔

ثمود پسر گثر پسر ارم پسر سام نے عرب الحجر میں اور اس میدان میں جو وادی القریٰ کے نام سے مشہور ہے اور ملک شام کی جنوبی اور ملک عرب کی شمالی حد پہ رہنا اور قبضہ کرنا پسند کیا۔

عربی جغرافیہ دانوں نے جو کچھ اپنی تصنیفات میں نسبت عرب البائدہ اور ان کے مقامات سکونت کے لکھا ہے اس کا انتخاب ذیل میں لکھتے ہیں۔ جن سے ان امور کی جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں تصدیق ہوتی ہیں۔

قال القاضی صاعد ابن احمد الاندلسی صاحب قضاء مدینة طلیطلة--- ان العرب البائده فکانت امما ضخمة کعاد و ثمود وطسم وجدیس ولتقادم انقراضهم ذهبت ان حقائق اخبارهم وانقطعت عنا اسباب العلم بآثا رهم.

اما جر هم و هم صنفان جرهم الاولی وکانوا علی عهد عاد فبا دوا و درست اخبارهم وهم من عرب البائده--- ابو الفدا.

سکنت بنو طسم الیمامة الی البحرین— ابو الفدا

سکنت بنو عاد الرمل الی حضر موت— ابو الفدا

وبلاد عاد يقال لها الا حقاف وهي بلاد متصله باليمن وبلاد عمان– ابو الفدا.

والى عاد اخاهم هود او هو عاد بن عوص بن ارام بن سام وهم عاد الاولى كانت منازل قوم عادبالا حقاف وهى رمال بين عمان وحضر موت– معالم التنزيل.

سكنت ثمودا الحجر بين الحجاز و الشام– ابو الفداء

كانت مساكنهم بالهجر بين الحجاز والشام الى وادى القرى– معالم التنزيل.

الحجر بالكسرثم السكون و الراء اسم ديار ثمود بوادى القرى بين المدينة والشام كانت مساكن ثمود هى بيوت سخوتة في الجبال مثل الغاير تسمى تلك الجبال الاثالب كل منقطع عن الاخر يطاف حوله وقد نقرفيه. بيوت ونقر على قدر الجبال التى تنقرفيها وهى بيوت فى غاية الحسن فيها نقوش وطيقان لحكمه الصنعة وفى وسطها بير التى كانت تردها الناقة مراصد الاطلاع على اسماء الامكنة والبقاع.

الحجر بكسر الحاء وسكون الجيم والراء دیار ثمود بواد القرى بين المدينة والشام مشترک یا قوت الحموی.

قال ابن حوقل والحجر بين جبال على يوم من وادى القرى اقول لم يحصل ذلک فان بينهما اكثر من خمسة ايام قال و كانت ديار ثمود الذين قال الله عنهم وثمود الذين جابو الصخر بالواد قال رايت تلک الجبال وما نحت منها كما اخبر الله تعالىٰ و تنحتون من الجبال بيوتا فارهين وتسمى تلک الجبال الا ثاليب القول وهى التى ينزلها حجاج الشام وهى عن العلى على نحو نصف مرحلة من جهة الشام– تقويم البلدان.

و وادى القرى فهو بادية الجزيرة وما كان من بالس الى ايله موا جها للحجاز معارضا لارض تبوک فهو بادية الشام– تقويم البلدان.

اب کہ ہم نے اس مقام پر ایک کامل فہرست سات مختلف اقوام عرب البائدہ کے مورثان اعلیٰ کی لکھ دی ہے اور اُن مقامات کو بھی بیان کر دیا ہے جہاں جہاں یہ مختلف قومیں آباد ہوئیں۔ تو اب ہم حتی المقدور ان شعبوں اور شاخوں کی تفصیل بیان کریں گے جو ان قوموں سے پیدا ہوئی ہیں۔

او لا بنی کوش کسی عرب کے مورخ نے بنی کوش کا کچھ حال نہیں بیان کیا۔ سب کے سب خاموش ہیں اور اس سبب سے ان کے حالات کچھ دریافت نہیں ہوا ہے اسی بناء پر جارج سیل اور انہیں کی مانند اور انگریزی مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ'' کوش کی اولاد عرب میں آباد نہیں ہوئی تھی۔'' نویری نے اپنے جغرافیہ میں ایک یہ فقرہ لکھا ہے وملک شرحبيل على قيس وتميم''اس فقرہ میں نویری نے بنی کوشش کا ذکر بشمول بنی تمیم کے کیا ہے جس سے وہ حصہ سلطنت کا مراد ہے جو الحارث نے اپنے دوسرے بیٹے شرحبیل کو بخشا تھا۔ نویری کے اس فقرہ پر رورنڈ یہ استدلال کرتے ہیں کہ مشرقی مورخ بنی کوش کو عرب کے رہنے والوں میں شمار کرنے سے خاموش نہیں ہیں مگر مسٹر رونڈر فارسٹر کو اس میں کسی قدر دھوکا ہوا ہے کیونکہ نویری کے فقرہ سے کسی طرح یہ بات ثابت نہیں ہوتی

کہ بنی قیس اور بنی کوش ایک ہی خاندان میں یعنی حام کی اولاد میں ہیں مشرقی مورخوں نے جو بنی کوش کا کچھ ذکر نہیں کیا اس کی وجہ ظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ خود مشرقی مورخ دھوکے میں پڑ گئے ہیں کیونکہ کوش کی اولاد جو مشرق میں آباد ہوئی تھی اور یقطان کی اولاد جو جنوب کی طرف یمن اور اس کے گرد و نواح میں آباد ہوئے تھے۔ان دونوں کے ناموں میں ایک طرح کی مشابہت پائی جاتی ہے اور اس سبب سے مشرقی مورخوں نے دھوکے کھا کر تمام واقعات وحوادث کو جو بنی کوش سے متعلق تھے بنی یقطان سے متعلق سمجھ لیا اور ان تمام واقعات اور حوادث کو بنی یقطان کی طرف منسوب کر دیا۔

مگر مسٹر ورنڈر فاسٹر[1] نے بڑی کوشش اور تلاش سے اور بڑی صحت اور قابلیت سے نہایت معتبر اور مستند حوالوں سے اس امر کو بیان کیا ہے کہ بنی کوش در حقیقت عرب میں خلیج فارس کے کنارہ کے برابر برابر آباد ہوئے تھے اور مشرقی کنارہ کے مختلف شہروں کے ناموں کا ان ناموں سے مقابلہ کر کے جو بطلیموس نے لکھے ہیں اپنے دعویٰ میں قطعی کامیابی حاصل کی ہے لیکن مصنف موصوف نے جبکہ بنی کوش کو تمام جزیرہ عرب میں اور خصوصاً یمن اور خلیج عرب کے کناروں پر پھیلا دینے کی کوشش کی ہے تو اس کی دلیلوں میں ضعف آ جاتا ہے اور اسی دھوکے میں پڑ جاتا ہے جس میں مشرقی مورخ پڑ گئے تھے اور اسی سبب سے یمن تک پہنچنے پر اس کی بحث بدرجہ غایت مہمل اور بے معنی ہوگئی ہے اور صرف ایک ناکارہ سلسلہ خیالی اور وہم استنباطوں کا خیال کی جاسکتی ہے۔اس لئے ہم کہتے ہیں کہ ''نمرود'' کے سوا جس کا ذکر تنہا کتاب مقدس میں کیا گیا ہے اور اس سبب سے ہم کو یہ مستنبط کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ آباد نہ ہوا تھا باقی اولاد کوش کی جن کے نام سبا' حویلاہ' سبتاہ' رعماہ' سبحکا تھے اور عما کے بیٹے یعنی شبا اور ددان سب خلیج فارس کے کنارہ کنارہ آباد ہوئے تھے۔ہم اس امر سے انکار کرنا نہیں چاہتے کہ کوش کی اولاد میں سے کوئی جزیرہ عرب کے اور اقطاع کی جانب بھی چلے گئے ہوں اور وہاں سکونت اختیار کی ہو۔مگر ہم نے مسٹر ورنڈر فاسٹر کی جن دلیلوں کو لغو اور مہمل اور وہمی اور خیالی بیان کیا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ مصنف موصوف کو بنی کوش کے مقامات سکونت کی تحقیق میں کوئی ایسا مقام مل جاتا ہے جس میں ذرا سی بھی مشابہت کوشی ناموں سے ہجوں میں یا صرف ایک صرف ہی کی مطابقت پائی جاتی ہے تو وہ اس مقام کو کوش کی اولاد کے متعلق کر دینے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتا حالانکہ بنی کوش کے اکثر نام ایسے ہیں جو بنی یقطان کے ناموں سے جو یمن میں رہتے تھے مشابہت تامہ رکھتے تھے۔

---

[1] یہ ایک عام اور مسلم رائے ہے کہ سبا پسر کلاں کوش نے پہلے وہ حصہ وادی القری کا آباد کیا جو دریائے فرات کے ملحق ہے اور یہ رائے بظاہر وجوہات ذیل پر مبنی ہے ضلع مذکور کا ''خوزستان'' یعنی کوش کے اصل وطن کے قریب واقع ہونا۔زمانہ مابعد میں شہر ''سبی'' اور قوم سبا کا سرحد ''خالدیہ'' پر موجود ہونا کوشی ناموں اور خاندانوں حویلاہ سبتاہ رعماہ ددوان کا خلیج فارس کے کنارہ پر مسلسل سلسلہ میں واقع ہونا اور سب سے اخیر یہ کہ اشعیاء نبی کی کتاب کے دو مقاموں میں کوشش اور ''سبا'' کا ساتھ ساتھ بیان ہونا جس سے پایا جاتا ہے کہ ''سبا'' ''خوزستان'' سے ملحق ہے ''راس مسنڈم'' کے قریب جس کو بطلیموس نے ''راس اسابی'' کر کے لکھا ہے ہم مسٹر سیل کے نقشہ میں شہر ''کشکان'' جو توریت کے ''کشام'' کے مترادف ہے پاتے ہیں۔بحر عمان کے اسی کنارہ پر ''سمنان'' یا ''عمان'' اور ''تامر'' یا ''سیب'' اور ''سوباؤ'' شہروں کے درمیان میں ہم ایک ساحل پاتے ہیں جس کو ''پلینی'' نے ''سواحل'' حام جو بالفعل ''ماحام'' کہلاتا ہے اس خاکنائے کے مقابل کی اطرف پر جو ''راس مسنڈم'' میں ختم ہوتی ہے اور ''خلیج فارس'' کے دہانہ کے اندر شہر اور ضلع ''رعماہ'' جس کو یونانی ترجمہ توریت میں ''رغمہ'' اور بطلیموس نے ''رغامہ'' لکھا ہے پایا جاتا ہے۔خلیج کے باہر شہر اور ضلع ''ددان'' یا ددانہ کا پتہ ملتا ہے اور توریت میں ''ددان'' چھوٹے بیٹے ''رعماہ'' کا ذکر ہے اس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

کتب مقدسہ کے لکھنے والوں نے بنی کوش کی وجہ سے تمام ملک عرب کو بنام ارض کوش یا اتھوپیا کے موسوم کیا ہے اور اس امر کے ثابت کرنے کو مسٹر رونڈ فاسٹر نے نہایت مضبوط اور قابلانہ دلیلیں پیش کی ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ''توریت اور انجیل کے تاریخی جغرافیہ کے انگریزی ترجمہ میں الفاظ ''اتھوپیا'' اور ''باشندگان اتھوپیا'' اکثر مستعمل ہوئے ہیں اور جگہ عبرانی توریت میں اسم معرفہ کوشش واقع ہوا ہے اور یہ لفظ کوش جبکہ کتاب مقدس میں اس طرح مستعمل ہوا ہے تو اس سے ہمیشہ ایشیائی اتھوپیا یعنی عرب مراد لیا گیا ہے نہ کہ افریقی اتھوپیا چند مصرح درسوں کے مقابلہ کرنے سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے چنانچہ کتاب اعداد باب ۱۲ آیت ۱ میں لکھا ہے کہ مریم اور ہارون نے حضرت موسیٰ سے اس اتھوپین (عبرانی میں ہے کوشی) عورت کی وجہ سے جس کے ساتھ انہوں نے شادی کی تھی گفتگو کی اس لئے کہ انہوں نے ایک اتھوپین (عبرانی میں ہے کوشی) عورت سے شادی کی تھی اور کتاب خروج باب ۲ آیت ۱۵ اور ۲۱ سے یہ امر محقق ہے (اور ہم حضرت موسیٰ کے دوسرے نکاح کے فرض کرنے کے واسطے کوئی دلیل نہیں پاتے) کہ ایک مدیانی عورت تھی یعنی حضرت ابراہیم کی اولاد میں بنی قطورہ کے سلسلہ میں تھی اور یہ امر بھی متحقق ہے کہ ''مدیان'' یا ''مادیان'' عرب میں بحر احمر کے کنارہ پر ایک شہر یا ملک تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی بی بی ایک عرب عورت تھی اور اسی وجہ سے عبرانی لفظ کوشی کا ترجمہ لفظ اتھوپین کے ساتھ ٹھیک نہیں ہوا تاوقتیکہ اس سے ایشیائی اتھوپیا یا عرب مراد نہ لیا جائے کیونکہ افریقی اتھوپیا اس سے کسی طرح مراد نہیں لیا جا سکتا'' **(فارسٹر صاحب کا تاریخی جغرافیہ عرب صفحہ ۱۲)**

ان دلیلوں سے کسی طرح شک اور شبہ نہیں رہتا کہ کتاب مقدس کے انگریزی ترجمہ میں جو لفظ کوش کا اتھوپیا ترجمہ کیا گیا ہے وہ دو مختلف مقاموں پر مستعمل ہوا ہے افریقی اتھوپیا پر اور ایشیائی اتھوپیا یعنی عرب کے ایک حصہ پر یا خود ملک عرب پر اور یہ ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کیونکہ اس سے کتب مقدسہ کے بہت سے مشکل مقامات کے حل ہونے میں مدد ملے گی۔

ثانیاً۔ عیلام یا جرہم اولاولی جو کہ یہ قوم بنی کوش کے مقابلہ میں کچھ نام آور نہیں ہوئی اس لئے اس کی نسبت بجز اس کے کہ بنی کوش سے قرابت رکھتی تھی اور انہی کے ساتھ رہتی تھی اور کچھ زیادہ حال معلوم نہیں ہوا۔

ثالثاً۔ لود و اس کے تین بیٹے تھے طسم، عملیق، امیم۔ یہ لوگ بھی عیلام کی اولاد کی مانند کچھ اولوالعزم اور نام ور نہ تھے اس لئے ان کا حال بھی بہت کم معلوم ہے مگر ان کے آثار ساحل خلیج فارس کے بعض مقاموں کے ناموں میں پائے جاتے ہیں مثلاً دریائے عمنان (جس کو پلینی نے عمان لکھا ہے) اور ''ہمائیم'' جو امیم کے نام سے جو لود کا تیسرا بیٹا تھا ماخوذ گیا ہوا معلوم ہوتا ہے یہ قاعدہ ہے کہ الف ہائے ہوز سے بدل جاتا ہے جیسے ادد سے ہدد اور اجر سے ہاجرہ ہو گیا ہو جو حضرت اسماعیل کی ماں کا نام تھا۔ رونڈ مسٹر فارسٹر نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش میں عمان یا ہمنان زمانہ حال کے عمان سے علاقہ رکھنا غلطی کی ہے کیونکہ سفر تکوین باب ۱۹ آیت ۳۸ سے پایا جاتا ہے کہ حضرت لوط کی چھوٹی بیٹی نے (ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جن پر بیٹیوں کا لفظ اطلاق کیا گیا ہے وہ حضرت لوط کی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ لونڈیاں تھی) بیٹا جنا اور اس کا نام ''بن عمی'' رکھا گیا جس سے بنی عمون کی قوم مشہور ہوئی حال کا عمان ہمارے نزدیک اسی نام سے علاقہ رکھتا ہے۔

رابعاً۔ عوص اور خامساً حول ارم کے بیٹے تھے۔ ہم دونوں کا بیان بلا اشتراک کریں گے ان کے آثار بھی آج تک ان مقامات کے ناموں میں پائے جاتے ہیں جو خلیج فارس کے کنارہ پر یا قرب وجوار کے میدانوں میں واقع ہیں مثلاً عول اور حول ایک ہی نام ہیں مسٹر رورنڈ رفاسٹر نے عول کے اشتقاق میں بھی مغالطہ کیا ہے کیونکہ ان کا بیان ہے کہ یہ لفظ حویلاہ نام کی ایک مختلف شکل ہے۔

عاد اولیٰ ''پسر عوص'' نے بہت شہرت حاصل کی اور اس کی اولاد ایک نامی قوم ہوگئی اور تمام شرقی اور جنوبی عرب کی مالک بن گئی۔ انہوں نے عالیشان مکان بھی بنائے اور ان قوموں پر تحکم بھی حاصل کیا۔ اس قوم کے آدمی اپنی جسامت اور قوم اور شان میں اور قوموں پر فوق لے گئے تھے جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔

عرب کے جنوب اور مشرق کے باشندے بہ نسبت اور لوگوں کے تنومند اور اور ہوتے تھے۔ ان نسبت مسٹر رورنڈ فارسٹر نے ولسٹڈ صاحب کے سفرنامہ ملک عرب سے یہ بیان نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے حجاز کے عربوں اور ان عربوں کی وضع جسمانی میں جو خلیج فارس کے کنارہ جانب غرب پر آباد ہیں ایک بڑا فرق مشاہدہ کیا۔ اعراب سکنائے ساحل خلیج کا حلیہ یہ ہے کہ ان کے چہرے قریب قریب بیضوی کے ہیں سر کے بال عموماً سیاہ بالکل منڈے ہوئے ہوتے ہیں بھنویں بھی سیاہ ہیں اور کھال چمکتی ہوئی ہے اور ہندوستان کے باشندوں کی نسبت ان کا رنگ کسی قدر کھلا ہوا ہے سواحل بحر احمر کے قریب کے باشندے لاغر اندام اور پستہ قد ہوتے ہیں مگر قوی ہیں۔ چہرہ کسی قدر لمبا رخسارے بے گوشت کے اور سر کے بالوں کو دو لمبی زلفوں کے سوا جو دونوں طرف ہوتی ہیں اور جن کی وہ نہایت درجہ خبرداری کرتے ہیں اس قدر بڑھاتے جاتے ہیں کہ کمر تک آ جاتی ہیں ان کا رنگ کسی قدر کھلا ہوا ہوتا ہے۔

''تیمی'' سے چار پانچ منزل جنوب اور مشرق کی جانب سرما کے موسم میں اعراب ''دواسر'' رہتے ہیں اور گرمیوں کے موسم میں نجد کی سرسبز چراگاہوں میں چلے جاتے ہیں جس کے سبب سے قریب سرحد صرف آٹھ منزل ہے یہ لوگ گھوڑے نہیں رکھتے مگر لڑائی میں وہابیوں کی کمک کے لئے تین ہزار شتر سوار بھیجتے ہیں اعراب ''دواسر'' طویل القامت اور قریب قریب سیہ فام ہوتے ہیں (سفر نامہ ملک عرب ضمیمہ جلد ۲ صفحہ ۳۸۵) مگر یہ عجیب اختلاف درازی اور رنگ میں گرد و نواح کی قوموں سے کچھ اعراب ''دواسر'' ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے خلیج فارس کے عربوں میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے اور ان اطراف میں بھی جہاں کہ علماء کے نزدیک شہر سبا آباد تھا۔ کرنیل چسنی کا بیان ہے کہ خلیج فارس کے عرب خوش ہیئت ہوتے ہیں اور طویل القامت اور سیہ فام ہونے میں مشہور ہیں اور ان دونوں باتوں میں اقوام خلیج عرب سے بدرجہا اختلاف رکھتے ہیں (فارسٹر صاحب کا تاریخی جغرافیہ عرب صفحہ ۳۱) مگر مسٹر رورنڈ فاسٹر نے اس بات کے خیال کرنے میں کہ صرف بنی کوش ہی طویل القامت تھے غلطی کی ہے کیونکہ تمام قومیں جو خلیج فارس کے کنارہ پر رہتی تھیں اور جن کو ہم نے عرب البایدہ کے ذیل میں بیان کیا ہے نہایت بلند قامت تھیں۔ زمانہ حال تک بھی خلیج فارس پر ہم دو قسم کے آدمی پاتے ہیں جو درازی قد میں برابر ہیں مگر رنگ میں مختلف ہیں ایک تو سیاہ رنگ کے ہیں اور دوسرے ذرا اجلے رنگ کے ہیں۔

مسٹر رورنڈ فاسٹر کتاب اشعیاہ نبی کی باب ۴۵ آیت ۱۴ کی عبارت کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس میں لکھا کہ ''خداوند چنیں می فرماید کہ معمول مصر و تجارت حبش و اہل سبا کہ مردمان بلند قد اند بتو عبور نمودہ از آن تو خواہند بود'' اور اس بات کو کہ بنی کوش سب دراز قد تھے۔ اسی آیت پر مبنی کرتے ہیں۔ مگر صاحب موصوف نے اس میں دو وجہ سے غلطی کی ہے۔ اول اس وجہ سے کہ جملہ ''مردمان بلند قد'' سے خواہ نخواہ یہ مراد یعنی کہ وہ لوگ طویل القامت تھے محض غلط ہے بلکہ ان لفظوں سے یہ مراد ہے کہ وہ لوگ معزز اور اشراف تھے چنانچہ عربی ترجمہ جو اشعیاہ نبی کی کتاب کا ہے اس میں یہی معنی لئے گئے ہیں اور اس کی عبارت یہ ہے ''**ھذا یقولھا الرب تعب مصر وتجارت الحبش وسابیم رجال اشراف یبرون الیک**'' دوم اس وجہ سے کہ باشندگان سبا متذکرہ عبارت مذکور کا کوش کی اولاد میں ہونا ضرور نہیں ہے کیونکہ کتب مقدسہ میں بنی سبا کا اطلاق اور قوموں پر بھی ہوا ہے مثلاً بنی سبا جن کا ذکر کتاب

ایوب باب ا آیت ۱۵ میں آیا ہے اور جو دریائے فرات کے بنی سبا سے ہر طرح مشابہت رکھتے ہیں اور بلحاظ اپنے آبائی نام کے ہجوں کے قاعدہ کے موافق سبا پسر کلاں کوش کی اولاد نہیں ہے بلکہ ان تین سباؤں میں سے کسی نہ کسی کی اولاد بیان کئے گئے ہیں جن کو حضرت موسیٰ نے منجملہ ان سوخیلوں کے بیان کیا ہے جنہوں نے ملک عرب کو یکے بعد دیگرے آباد کیا تھا۔"

اس قوم کی ہدایت کے لئے خدا تعالیٰ نے ایک نبی جن کا نام ہود تھا اور جن کا لقب سفر تکوین باب ۱۱ آیت ۱۴ میں عیبر آیا ہے مبعوث کیا تا کہ خدا برحق کی عبادت کی ترویج اور بتوں کی پرستش کا استیصال کریں لیکن جب کہ ان لوگوں نے ان کے احکام اور ہدایت سے سرتابی کی تو خدا تعالیٰ کا قہر جوش میں ایا اور تین برس کا قحط ان پر پڑا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس بات سے آگاہ ہو گئے کہ خدا کے پیغمبر کے احکام سے سرتابی کی یہ سزا ہے۔ اس پریشانی کی حالت میں حضرت ہود پھر تشریف لائے اور بت پرستی ترک کرنے اور خدا سے واحد کی عبادت کرنے کی از سر نو ہدایت کی اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو خدائے رحیم باران رحمت نازل کرے گا مگر وہ اپنی گمراہی پر ثابت قدم رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت طوفان آندھی کا جو اس کی نشانی تھی نازل کیا یہ طوفان آندھی کا سات رات اور آٹھ دن تک تمام اس ملک میں ایسے زور شور سے جاری رہا کہ ہزار ہا آدمی ہلاک ہو گئے اور تمام قوم کا باستثنائے ان چند اشخاص کے جنہوں نے حضرت ہود کا کہنا مان لیا تھا قریبا استیصال کلی ہو گیا اور جو لوگ بچے آخر کو حضرت ہود پر ایمان لے آئے یہ واقعہ سنہ دنیوی کی اٹھارھویں صدی میں یا بائیسویں صدی قبل حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے واقعہ ہوا تھا۔

جھوٹی روایتیں جو قوم عاد کی نسبت مشہور ہیں

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ قوم عاد کے ہر شخص کا قد بارہ گز لمبا تھا یعنی اس زمانہ کے جو لوگ ہیں اگر اپنے دونوں ہاتھوں کو سیدھا پھیلا دیں تو ان کی لمبائی سے بارہ گنا زیادہ لمبا قد قوم عاد کا تھا بعض کتابوں میں ان کے قد کے لمبائی کا اس سے بھی زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی قوت کا یہ حال تھا کہ چلنے میں ان کے پاؤں زانو تک زمین میں دھس جاتے تھے۔

انہوں نے جو اس ریگستان میں کوئی محل بنایا تھا اس کی نسبت بھی بہت زیادہ مبالغہ کیا گیا ہے اور عاد ثانی کی اولاد کے قصہ کو اس قوم کے ساتھ جو عاد اولیٰ کی قوم ہے خلط ملط کر کے اس خیالی باغ کو جس کا نام ایشیائی مورخوں نے ''ارم'' قرار دیا ہے اس قوم کی طرف منسوب کیا ہے اور کہا ہے کہ اس محل اور باغ کی زمین میں لعل اور یاقوت چھپے ہوئے تھے اور اس کی دیواریں سونے اور چاندی کی تھیں اور درخت زمرد اور یاقوت اور نیلم اور ہر قسم کے بیش بہا جواہروں سے بنائے گئے تھے اور زعفران بجائے گھاس اور عنبر بجائے مٹی کے تھا۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ کے زمانہ خلافت میں ایک شخص اپنا اونٹ ڈھونڈھتا ہوا وہاں چلا گیا اور بیشمار جواہرات وہاں سے رول کر اپنی جھولی میں بھر لایا اور جب حضرت معاویہ ابن ابی سفیانؓ نے اس جگہ دوبارہ جانے کا اور اس جگہ کے تلاش کرنے کا حکم دیا تو بہت سی تلاش کرنے کے بعد بھی وہ جگہ پھر نہ ملی خلیفہ نے کہا خدا تعالیٰ نے اس کو انسان کی آنکھوں سے پوشیدہ کر لیا ہے۔

بعض کتابوں میں حضرت علی مرتضیٰ کی نسبت اور بعض معتبر اشخاص کی نسبت ایک جھوٹا اتہام کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے یہ بات کہی کہ اللہ تعالیٰ نے اس باغ اور محل کو جو قوم عاد نے تعمیر کیا تھا دنیا سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے اور قیامت کے دن وہ بھی منجملہ

اور آسمانی بہشتوں کے ایک بہشت ہوگی۔

عاد اولیٰ کی قوم کی بنائی ہوئی عمارات کے باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس قوم نے کوئی عمارت قابل شہرت نہیں بنائی تھی۔ان کی عمارتیں مثل اور معمولی عمارتوں کے بڑی اور چھوٹی ہر قسم کی تھیں۔

بہت سے مصنفوں اور مورخوں نے جو تمام عاد اولیٰ کی طرف عمارات عالیشان بنانا منسوب کرنے میں غلطی کی ہے اس کی وجہ ظاہراً یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کی اس آیت کے جو ذیل میں مندرج ہے معنی سمجھنے میں غلطی کی ہے اور وہ آیت یہ ہے:

الم تر کیف فعل ربک بعاد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلها فی البلاد.

''یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا کہ کس طرح پر کیا تیرے پروردگار نے قوم عاد کے ساتھ جو''ارم'' کی اولاد تھے اور ایسے قدر آور تھے کہ ان کی مانند شہروں میں پیدا نہیں کئے گئے تھے۔

لفظ **"ذات عماد"** سے جوان کا قد آور ہونا مراد لیا گیا ہے اس کا ثبوت اور دوسری آیت سے ہوتا ہے جو ذیل میں لکھی جاتی ہے اور جس میں ان کے مردہ پڑے ہوئے جسموں کو درختوں کے اکھڑے ہوئے تنوں سے مشابہت دی ہے اور وہ آیت یہ ہے:

ولما عاد فاهلکوا بریح صرصر عاتیة سخر ها علیهم سبع لیال وثمانیة ایام حسوما فتری القوم فیها صرعیٰ کا نهم اعجاز نخل خاویة.

تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے دو امر بخوبی ثابت ہوتے ہیں۔ایک یہ کہ''ارم'' سے مراد''بنی ارم'' ہے ''ارم'' عاد کا دادا تھا جس طرح کہ بنی ہاشم اپنے دادا ہاشم کے نام سے مشہور ہیں اسی طرح قوم عاد اپنے دادا ارم کے نام سے مشہور تھی اور عادم ارم کہلاتی تھی دوسرے یہ کہ لفظ **"ذات العماد"** سے ان کا دراز قد اور قوی ہونا مراد ہے جس طرح کے بعض ملکوں کے لوگ دراز قد اور قوی ہوتے ہیں۔کوئی خاص عجیب بات ان میں نہیں تھی چنانچہ تفسیر جلالین اور تفسیر بیضاوی میں اس طرح پر لکھا ہے۔

"الم تر" تعلم یا محمد "کیف فعل ربک بعاد ارم" هی عاد الاولی فارم عطف بیان او بدل منع الصرف للعلمیة ولتانیث "ذات العماد" ای الطوال...... "التی لم یخلق مثلها فی البلاد" فی بطشهم وقوتهم "جلالین"

"الم تر کیف فعل ربک بعاد "یعنی اولاد عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح قوم هود سموا باسم ابیهم کما سمی بنو هاشم باسمه "ارم" عطف بیان لعاد علی تقدیر مضاف ای سبط ارم...... "ذات العماد" ای ذات البناء الرفیع القدر الطوال والرفعة والثبات "بیضاوی".

زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا یہ دستور ہے کہ اس قسم کے پرانے قصوں کو ایک مذہبی قصہ بنا لیتے ہیں اور اس میں عجیب وغریب باتیں ملا کر اس کو تعجب انگیز اور حیرت خیز کر لیتے ہیں جس طرح کہ ملٹن شاعر نے اپنی کتاب''پیریڈائز لاسٹ'' کو ایک عجیب قسم کا مذہبی قصہ بنالیا ہے اس طرح زمانہ جاہلیت کے عربوں نے بھی قوم عاد کا ایک قصہ گڑھ لیا ہے۔جس میں بیان کیا ہے کہ قحط کے دنوں

میں قوم عاد نے تین شخص مکہ میں اس غرض سے بھیجے تھے کہ خدا سے مینہ برسنے کی دعا مانگیں۔ان تینوں میں سے ایک کا نام لقمان تھا وہ تو مسلمان تھا اور باقی دو کافر تھے لقمان کی عمر سات گدوں کی عمروں کے مجموعہ کے برابر تھی۔اسی قسم کے اور بہت سے لغو اور بیہودہ قصے عاد کی قوم کی نسبت جاہلوں نے بنا لئے ہیں۔جن پر اہل علم کو متوجہ ہونا یا مذہبی اعتراضات کی بنا ان قصوں کو قرار دینا نہایت لغو اور بیہودہ بات ہے۔

سادساً جدیس سابعاً ثمود جس کو عاد ثانی کہتے ہیں یہ دونوں گو پسر ''ارم'' بن سام بن نوح کی اولاد تھے جن کا بیان ہم ایک ساتھ کرتے ہیں۔

جدیس کا حال بجز اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوا کہ بیابان میں آباد ہوا تھا اور اس کی اولاد بعد انقضائے عرصہ دراز کے مثل دیگر اقوام صحرائی کے معدوم ہوگئی۔

اولاد ثمود نے بہت بڑا نام پیدا کیا اور جلد ایک زبردست قوم ہوگئی اور اس حصہ ملک پر جو ''الحجر'' کے نام سے مشہور ہے اور اس میدان پر جو وادی القریٰ کہلاتا ہے اور جو ملک شام کی جنوبی اور عرب کی شمالی حد بناتا ہے قبضہ کر لیا ہے۔قرآن مجید میں اس قوم کا بھی چند جگہ ذکر آیا ہے۔انہوں نے پہاڑیوں کو کھود کر ان کے اندر اپنے گھر بنائے تھے اور نقش ونگار سے مرتب کئے تھے جو اثالیب کے نام سے مشہور ہیں۔عرب کے لوگ اور چند غیر قوم کے لوگ جنہوں نے عرب میں سفر کیا ہے ان پہاڑی گھروں کی جو پرانے زمانہ کی باتوں کی تلاش کرنے والوں کو تشفی دیتے ہیں اور ان قوموں کے حالات جنہوں نے ان کو بنایا ہے بتلانے کو موجود ہیں شہادت دے سکتے ہیں اسی طرح ان پہاڑی گھروں سے قوم ثمود کی تاریخ کے اس حصہ کی جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے بخوبی صداقت پائی جاتی ہے کچھ زمانہ کے بعد بھی یہ قوم بھی بت پرستی کی طرف مائل ہوئی اس واسطے ان کی فہمائش وہدایت کے واسطے خدا تعالیٰ نے حضرت صالح بن عبید بن اسف بن ماشج بن عبید بن جادر بن ثمود کو مبعوث کیا بعض لوگ ان پر ایمان لائے اور بہتوں نے ان کا یقین نہیں کیا ان لوگوں نے حضرت صالح سے کہا اگر تو سچا ہے تو کوئی نشانی بتلا حضرت صالح نے جواب دیا کہ اے میری قوم یہ خدا کی اونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے اس کو چھوٹا پھرنے دو تا کہ خدا کی زمین پر چرتی پھرے اور اس کو کچھ ایذا مت پہنچاؤ مبادا تم پر اس کے عوض عذاب نازل ہو۔اس فہمائش کے سبب کچھ عرصہ تک ان لوگوں نے اونٹنی کو پھرنے دیا اور کچھ ایذا انہیں پہنچائی۔

کچھ عرصہ کے بعد وہاں قحط ہوا اور اس خشک سالی میں پانی کا بھی قحط ہو گیا پانی نہیں ملتا تھا اور جہاں کہیں تھوڑا سا بھی پانی ہوتا تھا تو اونٹنی اپنی طبعی خاصیت سے جو خدا نے اونٹ میں پیدا کی ہے پانی کی تلاش کر لیتی تھی اور پی لیتی تھی یا خراب کر دیتی تھی اور لوگ اس کو روک نہ سکتے تھے۔حضرت صالح نے کہا کہ ایک دن اونٹنی کو پانی پی لینے دیا کرو اور کوئی اس کا مزاحم نہ ہو اور دوسرے دن تم لوگ پانی لیا کرو اور اونٹنی کو وہاں نہ جانے دیا کرو قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد مختلف نو فرقوں کے سرداروں نے جو اس زمانہ کے کافروں کے فرقے تھے حضرت صالح کو مار ڈالنے کا منصوبہ کیا مگر جب وہ اپنے اس بد منصوبہ میں کامیاب نہ ہوئے تو انہوں نے غصہ میں آ کر اس اونٹنی کو مار ڈالا۔اس وقت حضرت صالح نے ان سے کہا کہ تین دن تک تم اپنے مکانوں میں چین کر لو۔بعد اس کے تم ہلاک ہو گے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ جب ہمارے حکم کی تعمیل ہونے کو ہوئی تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لائے تھے بہ سبب اپنے رحم کے اس روز کی ذلت سے بچا لیا۔آفت جو ان پر آئی تھی وہ یہ تھی کہ آسمان سے ایک

خوفناک آواز آئی جو غالباً رعد اور زلزلوں کی اور اس قسم کی آفت ارضی وسماوی کی آواز تھی صبح کو وہ لوگ اپنے مکانوں میں مردہ اور سرنگوں پڑے ہوئے ملے گویا کہ ان مکانوں میں رہتے ہی نہ تھے۔ یہ واقعہ اسی زمانہ میں واقع ہوا تھا جبکہ سدوم اور گمارہ اور اوماب اور زبائین شہر آسمانی آگ سے جلائے گئے تھے یعنی ۲۱۰۷ دنیوی یا ۱۸۹۷ قبل حضرت مسیح کے۔

جھوٹی روایتیں جو قوم ثمود کی نسبت مشہور ہیں

مفسرین اور مورخین کا بیان ہے کہ کفار نے حضرت صالح سے ان کی رسالت کے ثبوت میں اس معجزہ کی درخواست کی تھی کہ اگر اس پہاڑی میں اس سے ایک اونٹنی پیدا ہو اور بجرد پیدا ہونے کے ایک سرخ بالوں کا بچہ جنے اور وہ بچہ اسی وقت ہمارے سامنے بڑی اونٹنی کے برابر ہو کر چرتا پھرے اور ہم اس اونٹنی کا دودھ پئیں تب ہم ایمان لائیں گے۔

یہ روایت محض ساختہ اور مصنوعی ہے۔ اس روایت کے موضوع کہنے سے اس وقت ہمارا یہ منشا نہیں ہے کہ ہم امکان معجزہ سے انکار کریں اور اس پر بحث شروع کریں بلکہ ہم اس وقت صرف سادہ طرح سے اس روایت کو اس لئے موضوع کہتے ہیں کہ اس کی صحت پر کوئی سند نہیں ہے اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو ایسے عجیب واقعہ کا ذکر قرآن مجید میں ضرور ہوتا یا کسی مستند حدیث سے اس کا ثبوت پایا جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی مصنوعی بات ہے کہ اس اونٹنی سے انسان اور حیوان دونوں ڈرتے تھے اور وہ اونٹنی قوم ثمود کے تمام چشموں اور حوضوں کا پانی ایک گھونٹ میں پی کر سب کو سکھا دیتی تھی کیونکہ وہ ملک ایسا تھا جہاں کثرت سے پانی میسر نہیں ہو سکتا تھا۔

اسی طرح یہ ایک لغو روایت ہے کہ اگر چہ قوم ثمود کو بتلا دیا گیا تھا کہ اونٹنی کا قتل کرنا ان کی ہلاکت کا باعث ہو گا لیکن حضرت صالح نے ان سے یہ بھی پیشینگوئی کی تھی کہ تمہاری قوم کا ایک لڑکا جس کا حلیہ ایسا ایسا ہو گا اس اونٹنی کو مار ڈالے گا اور اس طرح پر تمہاری ساری قوم پر تباہی اور بربادی آئے گی۔ اس تباہی سے بچنے کے لئے جس کی پیشین گوئی حضرت صالح نے کی تھی لڑکوں کو مار ڈالنا شروع کیا جو لڑکا پیدا ہوتا تھا اور اس میں سے اس نشانی کا شبہ ہوتا تھا جو حضرت صالح نے بتلائی تھی تو اس لڑکے کو مار ڈالتے تھے مگر وہ لڑکا جس کے ہاتھ سے اس قوم کا برباد ہونا مقدر میں تھا کسی نہ کسی طور سے بچ گیا اور مارا نہیں گیا۔ جب کہ وہ جوان ہوا تو آخر کار اس نے اس اونٹنی کو مار ڈالا۔

اسی طرح حضرت صالح کے مخالفوں کے مارے جانے کی نسبت ایک بیہودہ روایت آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت صالح کے مخالفوں نے جب ان کے قتل کا ارادہ کیا تو وہ ان پہاڑوں کی گھاٹیوں میں گئے جہاں حضرت صالح آیا جایا کرتے تھے اس غرض سے کہ کوئی عمدہ کمین گاہ تلاش کر کے اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ایک پہاڑ کو زمین پر سے بہت اونچا اٹھالیا اور جہاں سے وہ غار اٹھا تھا وہاں ایک غار ہو گیا حضرت صالح کے مخالفوں نے اس غار کو اپنی کمین گاہ کے لئے پسند کیا اور جب کہ وہ اس غار کے اندر جا کر چھپے تو اللہ تعالیٰ نے اوپر سے ان کے سروں پر اس پہاڑ کو چھوڑ دیا اور سب کے سب ایک لمحہ میں کچل کر مر گئے۔

اگر چہ ہم نے اس مقام پر عرب البائدہ کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے مگر ان کا ایک شجرہ بھی اس مقام پر لکھتے ہیں جس سے تمام بیانات کے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

دوم

عرب العاربہ یعنی ٹھیٹ عرب

عرب العاربہ یقطان بن عیبر بن شالح بن افخشد بن شام بن نوح کی اولاد میں ہیں۔ بعض مورخوں کا یہ قول ہے کہ عرب البائدہ اور عرب العاربہ دونوں یقطان کی اولاد میں ہیں اور اس لئے عربوں کو بجائے تین قوموں کے صرف دو قوموں پر منقسم کرتے ہیں یعنی عرب العاربہ اور عرب المستعربہ۔

قریباً تمام مورخین کی رائے ہے کہ کتب خمسہ موسیٰ میں جو یقطان نام آیا ہے وہی ایک نام ہے جس کو عرب قحطان کہتے ہیں اور یونانی انجیلوں میں اس کو ''جوقطان'' کر کے لکھا ہے اور اسی شخص کی اولاد عرب میں آباد ہوئی ہے۔

مسٹر رورنڈ فارسٹر نے نہایت عجیب اور مستحکم دلیلوں سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ان تینوں مذکورہ بالا ناموں سے ایک شخص مراد ہے اور یہی شخص یقطان عرب میں آباد ہوا تھا چنانچہ وہ اپنی کتاب جغرافیہ عرب میں ایک لکھتے ہیں کہ ''کتاب بطلیموس میں بھی ہم یقطان کا نام علانیہ قوم بنی یقطان کو پاتے ہیں جو عربوں کے قحطان اور انجیل کے جوقطان کے بالکل مشابہ ہے'' (صفحہ ۸۰)

ایک اور مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ ''اس قومی روایت کا قدیم اور عام ہونا جو عربوں کے قحطان کو انجیل کے جوقطان سے مشابہ کرتے ہیں ہر ایک پڑھنے والے پر روشن ہے'' (صفحہ ۸۸)

ایک اور مقام پر انہوں نے لکھا ہے کہ ''یہ امر کہ قحطان ایک خاندانی نام کی صرف مختلف شکلیں ہیں خود عرب ہی ہمیشہ سے بیان کرتے آئے ہیں اور ان کی عادت سے بھی جس سے وہ حرفوں کو تبدیل کر لینے میں (معرب کر لینے میں) نہایت درجہ میلان رکھتے ہیں یہ نتیجہ قرار واقعی نکل سکتا ہے۔ (صفحہ ۸۸)

ایک اور مقام پر یہ لکھا ہے کہ ''قدیمی قوم سبا کی دارالسلطنت مشہور بہ مآرب میں اعراب یقطان سے جس کی مشابہت توریت کے یقطان کے ساتھ ہی یقطانی نام جو یلاہ کے وقوع سے از سر نو ثابت اور مسلم ہوگئی ہے'' (صفحہ ۹۰)

رورنڈ فارسٹر نے مسعودی کے اس قول پر کہ بنی سعد اور بنی قحطان بہت قدیم زمانہ سے عرب کی قوموں میں مشہور چلے آتے ہیں یہ لکھا ہے کہ ''تاریخ عرب قوم عظیم قحطان کی قدامت کے باب میں آواز دے رہی ہے اور یہ ایک ایسی آواز ہے کہ ایک طرف قدیمی عام قومی روایت اس کی تائید کرتی ہے اور دوسری طرف شاید اس سے بھی زیادہ مضبوط شہادت متوسط اور جنوبی عرب کے موجودہ مقاموں اور آبادیوں کے ناموں سے اس کی حامی ہے'' (صفحہ ۷۹)

بہر حال امر مذکورہ سے نہ تو مشہور اور معروف سیاح مسٹر برق ہروط[1] رضی اللہ عنہ جن کا بیان ہے کہ اسی یقطان کی اولاد عرب میں آباد ہوئی تھی اور نہ سر ولیم میور انکار کرتے ہیں۔

---

[1] اس کتاب کے پڑھنے والے الفاظ ''رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' کو دیکھ کر جو مسٹر برق ہروط کے نام کے بعد لائے گئے ہیں بلاشک متحیر ہوں گے اور اس حیرت کے رفع کرنے کے واسطے میری دانست میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کہ نہایت ذی فہم و ذی علم گاڈ فری ہیگنس صاحب کی کتاب کی کسی قدر عبارت کا ترجمہ اس جگہ لکھ دیا جائے'' مشہور و معروف سیاح برق ہروط جس نے دارالعلوم کیمرج میں تعلیم پائی تھی ایک نہایت پر غور تحقیق کے بعد اور خوب

یقطان کی اولاد کے آباد ہونے کی جگہ کی نسبت توریت میں لکھا ہے کہ ''ان کی آبادی میشا سے لے کر جہاں تک کہ تو سفار تک جو مشرق میں ایک پہاڑی ہے چلا جائے تو وہاں تک تھی۔'' مسٹر برق ہروط کے نزدیک میشا اور ''موزہ'' جو یقطانی قوم سبا کا خلیج عرب کے دہانہ کے نزدیک ایک بندرگاہ تھا ایک ہی مقام ہے اور سفار سے جبلی یعنی پہاڑی حصہ یمن کا حالانکہ بقول بطلیموس شہر سفار اور قوم سفاریہ آباد بھی مراد ہے۔ لیکن رورنڈ فاسٹر اس مقام کو جس کو مسٹر برق ہروط صاحب نے بیان کیا ہے اور جو وسعت میں قریب ڈیڑھ سو میل کے ہے ایک نہایت کثیر قدیمی خاندان کی حدود کے ایک نہایت معتدلانہ معقول اندازہ کے واسطے محض غیر مکتفی خیال کرتے ہیں اور نہایت ضعیف دلائل سے ان کو نجد کے پہاڑوں تک پھیلا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ مقدس کاتب توریت نے یقطان کی اولاد کی آبادی کی کچھ حد مقرر نہیں کی ہے بلکہ وہ سمت بتلائی ہے جہاں وہ جا کر آباد ہوئی تھی۔

یقطان کے تیرہ بیٹے پیدا ہوئے۔ الموداد' شلف' حصر ماؤث' یرح' بدورام' اوزال' دقلاہ' عوبال' ابیمائیل' شبا' اوفر' حویلاہ' یوباب' تمام قوم عرب العاربہ کی مع اپنی مختلف شاخوں اور شعبوں کے اشخاص مذکورہ بالا کی اولاد میں ہیں جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

سوچ کر مسلمان ہو گیا اور اپنے عیسائی دوستوں کے مجمع میں بحالت اسلام انتقال کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مسائل دین اسلام کی تلقین بمقام حلب ایک آفندی نے کی تھی اور اسی نے اس کو مسلمان کیا اور اس نے وہاں علانیہ اسلام کا اقرار کیا اور جب کہ بہ نیت حج روانہ ہوا تو مکہ کے قریب اپنے مذہب اور مسائل اسلام کی واقفیت میں اس کو سخت امتحان دینا پڑا جس کے باعث وہ ہمیشہ حاجی کے لقب کا دعوے کرتا رہا' اس کی نو مسلمی سچی اور صاف باطن معلوم ہوتی ہے اگر چہ میں خیال کرتا ہوں کہ اس کے عیسائی دوستوں سے علی العموم پوشیدہ تھی۔

میں اس بات کے بیان کرنے سے نہایت خوش ہوں کہ میں ایک شریف آدمی سے جو بالفعل مئی ۱۸۲۹ء سے برٹش گورنمنٹ میں ایک معزز عہدہ پر مامور ہے واقفیت رکھتا ہوں مگر اس کا نام ظاہر کرنے کا میں مجاز نہیں ہوں ان صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ مسٹر برق ہروط کے انتقال سے تھوڑے عرصہ پہلے میں وہاں موجود تھا اور مسٹر برق ہروط نے مجھے نہایت سنجیدگی کے ساتھ یقین دلایا کہ میں درحقیقت مسلمان ہوں اور اسی حالت میں مرنے کی آرزو ہے۔ اس کا گمنام سوانح عمری لکھنے والا اپنی کتاب میں جو بعد اس کے مشتہر ہوئی اس کی موت کا حال بیان کرتا ہے مگر اس کے مذہب کے بارے میں کوئی لفظ منہ سے نکالنے سے احتیاطاً پرہیز کرتا ہے۔ غالباً اس کو معلوم ہوگا کہ اگر حق بات زبان سے نکلی تو پادریوں کے بدنام اور رسوا کرنے کی وجہ سے میری کتابوں کے فروخت میں ہرج واقع ہوگا لیکن ایک فقرہ جو میرے بیان کی تائید کے واسطے کافی ہے اس کی زبان سے نکل گیا ہے۔ وہ اسی شب کو پونے بارہ بجے بغیر افسوس و واویلا کرنے کے مر گیا۔ تجہیز و تکفین اس کی وصیت کے موافق بر طریق اسلام کی گئی اور اس معزز رتبہ کا جو وہ دیدی لوگوں کی آنکھوں میں رکھتا تھا کما حقہ لحاظ کیا گیا اگر وہ فی الحقیقت مسلمان تھا تو ضرور اس نے مسلمانوں کی شرع کے موافق تجہیز و تکفین کی استدعا کی ہوگی اور یقیناً اگر عیسائی اس کی وصیت پر لحاظ نہ کرتے تو حکام بجبوری ان سے کراتے یہ بعید از قیاس ہے کہ وہ عیسائیوں کا مسلمانوں کو ایک ایسے نو مسلم کے شرف سے محروم رکھنا گوارا کرتے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ انہوں نے اس کو بلا تکلف قونصل انگریزی میں اور اس کے ہم وطنوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جن کو کہ پورا پورا موقع اس کی تجدید مذہب کے واسطے اپنی لیاقتیں صرف کرنے کا ملا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کی بلا وجہ تقلید و تائید کرنے میں اس کو کوئی غرض مضمون نہ تھی۔ بلکہ برخلاف اس کے ان عیسائیوں سے جن کی طرف سے وہ مامور تھا اور جن کی وجہ سے اس کا گذارہ ہوتا تھا اس کو مخفی رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔

اگر اس کی سوانح عمری لکھنے کا اعتبار کیا جاوے تو وہ اعلیٰ اصول اور بہترین چال چلن کا آدمی معلوم ہوتا ہے منجملہ اور پسندیدہ کیفیتوں کے جو اس مرتد کافر کی بابت جس طرح کہ اس کو عیسائی لوگ کہیں گے مرقوم ہوئی ہیں ایک یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی موروثی جائیداد قیمتی دس ہزار روپیہ کو اپنی ماں کے نان و نفقہ کے واسطے دے کر اپنے آپ کو محض مفلس و قلاش بنا دیا تھا (میکنس اپالوجی صفحہ ۱۰۶ مطبوعہ لندن ۱۸۲۹)

المودا: اس شخص کا خاندان یمن یا عرب المعمور میں اور اس ضلع میں جو بحرین تک چلا گیا ہے آباد ہوا اور اس المودائی سے مطابقت رکھتا ہے جس کو بطلیموس نے یمن کی درمیانی قوم لکھا ہے۔

شلف: یہ شخص کوہ ذامس کے مغربی حصہ میں یا اس وسیع میدان میں جو کاظم اور مدینہ کے مابین واقعہ ہے آباد ہوا۔ یہ قوم بطلیموس کی بیان کی ہوئی سالفنی قوموں سے مطابقت رکھتی ہے عربوں میں یہ قوم بنام بنی سالف مشہور ہے جو عبرانی نام شلف کی یونانی شکل ہے۔

حضر ماوت: اس قوم نے اپنی سکونت کے واسطے وہ زرخیز قطع جو خلیج عرب کے برابر برابر پھیلا ہوا ہے اور جو اس قوم کے نام (حضر موت) سے آج تک مشہور ہے اختیار کیا۔ اس قوم کے لوگ یونانی اور رومیوں کے ہاں اپنی وسیع تجارت اور فن جہاز رانی اور لڑائی میں جرأت اور بہادری کے لئے مشہور تھے۔

ہدورام: یرح کا حال یہاں چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ہم اس کو اخیر پر ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ ہدورام کی اولاد نے مشرق کی سمت اختیار کی اور اسی نواح میں آباد ہوئی قصبہ ہدرمہ اس قوم کی بہت سی یادگاروں میں سے موجود ہے۔ ابوالفدا کا بیان ہے کہ صوبہ وار قرامطاب کی بنا اسی قوم سے ہوئی ہے۔

اوزال: یہ خاندان اوزال میں جس کو اب صنعا کہتے ہیں اور جو سرسبز اور شاداب صوبہ یمن میں واقع ہے آباد ہوا۔
(حزقیل باب ۲۷ آیت ۱۹)

وقلاہ: یہ قوم بھی یمن میں آباد ہوئی اور ذوالخلاعہ جو یمن کی ایک قوم ہے اور جس کا ذکر پوکاک صاحب نے کیا ہے اسی کی اولاد میں سے ہے۔

عوبال: اس کا نشان عرب میں نہیں پایا جاتا مگر رورنڈ فارسٹر صاحب کا بیان ہے کہ یہ قوم افریقہ کو چلی گئی۔

ابیمائیل: بہت سے آثار جو مختلف اشخاص نے بیان کئے ہیں اس قوم کے بنی سالف اور حجاز کے قرب وجوار میں متوطن ہونے کے شاہد ہیں۔

شبا: اگرچہ یہ بھی جنوب کی جانب گیا اور یمن میں سکونت پذیر ہوا مگر یہ وہ شبا نہیں ہے جس نے یمن میں خاندان شبا کی سلطنت قائم کی تھی اور شہر مارب اور شہر سبا کو بنایا تھا۔ اکثر مؤرخ عرصہ دراز تک اس غلطی میں پڑے رہے کیونکہ وہ دوسرا شبا عرف عبدالشمس تھا کہ جس نے سلطنت خاندان شبا قائم کی تھی اور شہرہائے مارب اور سبا کو بنایا تھا اور جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

اوفر: یہ قوم صوبہ عمان میں سبا کے مشرق میں آباد ہوئی جہاں کہ شہر اوفر میں ان کے نشانات اب تک پائے جاتے ہیں۔
(ملوک اول باب ۹ آیت ۲۸)

حویلاہ: یہ شخص مارب کے ٹھیک شمال میں بسا تھا۔

یوباب: یہ بھی مارب کی جانب روانہ ہو کر اسی نواح میں آباد ہوا۔ قوم جو بارٹی جس کا بطلیموس نے ذکر کیا ہے اور جس کو عرب بنی

جو بار کہتے ہیں اسی کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ان قوموں کے مختلف شعبوں اور شاخوں نے جو عرب میں ایک ہی اصل سے پیدا ہوئی تھیں صرف دو وجہ سے علیحدہ علیحدہ نام حاصل کئے تھے یا تو بہ ہیئت مجموعی اپنی بڑی قوت اور تعداد کی وجہ سے یا قوم کے کسی شخص کی شہرت اور کارہائے نمایاں کے باعث سے پس ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اشخاص میں سے کسی نے کوئی کارنمایاں جس سے وہ اپنے لئے کوئی مخصوص نام اختیار کرنے کے مستحق ہوتے نہیں کیا اور اسی سبب سے شعبوں میں منقسم نہیں ہوئے۔ مگر یرح کا حال ایسا نہیں ہے جس کا بیان ہم اب کسی قدر طوالت کے ساتھ کرتے ہیں۔

عرب کے جغرافیہ دان یقطان کے بیشمار لڑکوں میں سے صرف دو شخص کا ذکر کرتے یعنی یعرب اور جرہم کا۔ چند مورخوں کی یہ رائے ہے کہ یعرب اور یرح سے ایک ہی شخص مراد ہے اور اگرچہ یہ قاعدہ ہے کہ (ج) اور (ی) کا باہم تبادلہ ہو جاتا ہے مگر جرہم کے باب میں رائیں مختلف ہیں بعض کچھ کہتے ہیں اور بعض کچھ مگر جمہور کی یہ رائے ہے کہ یعرب اور جرہم دونوں یرح کے بیٹے تھے اور اسٹر یبو اور جارج سیل کی بھی یہی رائے ہے لیکن ابوالفدا اپنی کتاب کے ایک مقام میں یعرب اور جرہم کو دو مختلف اشخاص بیان کرتا ہے اور دوسرے مقام پر جہاں کہ وہ مختلف اقوام عرب کے متفرق شعبوں کا ذکر کرتا ہے تو جرہم کو تنہا مورث اعلیٰ تمام فرقوں کا بتلاتا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یعرب اور جرہم سے ایک ہی شخص مراد ہے اور اولاد یعرب کی مختلف شاخیں بنی جرہم میں شامل ہیں۔

مشرقی مورخوں نے اس اختلاف کو غیر منفصل چھوڑ دیا ہے مگر رورنڈ فارسٹر صاحب نے نہایت لیاقت سے ثابت کیا ہے کہ جرہم اور یعرب ایک ہی شخص تھے اور جس جگہ کہ انہوں نے اس نام کی چند قدیم و جدید مسلم شکلیں بیان کی ہیں اس جگہ بیان کیا ہے کہ ستر مترجموں نے اس نام کو جرح لکھا ہے اور سینٹ جروم نے جیرا اور حال کے عربوں نے جرح اور سرح اور شرح اور زہران لکھا ہے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ ان فرضی مختلف ناموں کی مطابقت حسب قواعد ہجی بیان کر کے صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ "علی العموم جو شہادت کہ خود عرب بھی اپنے جرہم کو جرہہ پسر یقطان کے ساتھ مطابقت کرنے میں زمانہ دراز سے دیتے آئے ہیں۔ اس کی تصحیح و تصدیق کتاب بطلیموس میں غیر مبدل توریتی نام کے واقع ہونے سے ہوگئی ہے اور یہ ایک ایسی مثال ہے جس کا ہم کو بارہا حوالہ دینا پڑا ہے یعنی بطلیموس کے اس جملہ کا "انسیولا جراچیوری" جس کا ترجمہ ہے جزیرہ بنی جرہہ جو اسی حصہ حجاز کے کنارہ کے پرے ایک جزیرہ ہے۔"

جرہہ یا جرہم کی مطابقت تسلیم کر لینے میں ہمیں کچھ بھی کلام نہیں ہے اور عرب العاربہ کے شجرۂ انساب میں ہم ان کو ایک شخص قرار دے کر یعنی یرح یا یعرب یا جرہہ یا جرہم ان کا شجرہ لکھیں گے۔

تاریخ عرب العاربہ میں اس شخص کی اولاد کا حال بہت مذکور ہے یہ اسی کی اولاد تھی جس نے مختلف فرقوں میں منقسم ہو کر بڑے بڑے کام کئے اور زبردست سلطنتوں کے بانی ہوئے مگر عرب العاربہ کی تاریخ لکھتے وقت ان کے کاموں اور ان سلطنتوں کے قائم ہونے کے زمانہ کا متعین کرنا سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ زبانی روایتوں میں جو زمانہ بیان ہوتا ہے وہ کبھی غلطیوں سے خالی نہیں ہوتا اور اس کو معتبر نہیں مانا جا سکتا۔ دوسرے اس سبب سے کہ مورخان عرب نے ان واقعات کی تاریخیں سپٹو ایجنٹ یعنی یونانی ترجمہ توریت سے اخذ کی ہیں۔ توریت کے یونانی ترجمہ میں اور اصل عبرانی توریت میں جواب موجود ہے زمانوں کا بہت سا اختلاف ہے مگر قریباً قریباً تمام عیسائی ملکوں میں عبرانی توریت کے زمانے تسلیم کئے جاتے ہیں گو اس کے مندرجہ

زمانے بھی نہایت مشتبہ اور نا قابل اعتبار ہیں۔ تیسرے اس باعث سے کہ عرب کے مؤرخوں نے دو قسم کی تاریخوں کو یعنی اس کو جو زبانی روایتوں سے عرب میں چلی آتی تھی اور اس کو جسے یونانی توریت سے اخذ کیا تھا خلط ملط کر دیا ہے۔ اور اس سبب سے بڑی ابتری ان کی تاریخ میں پڑ گئی ہے بعض واقعات کا زمانہ تو زبانی روایتوں کے بموجب متعین کرتے ہیں اور بعض کا یونانی توریت کے موافق۔ بس ان مشکلات پر غالب آنا جن سے تواریخ عرب بھری پڑی ہے کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اس پیچیدہ اور مشکل کام کے حل کرنے کے لئے ہم نے تین ذریعے اختیار کئے ہیں۔

اول: اصل عربی توریت جس کو اس زمانہ میں قریباً قریباً ہر ایک ذی علم قوم نے تسلیم کرلیا ہے اور علم تواریخ کو اسی کی مندرجہ تاریخ پر مبنی کیا ہے۔ انہوں نے عبری توریت کو اصل اصول فرض کر کے اور اس کے مندرجہ تاریخ پر مبنی کیا ہے۔ انہوں نے عبری توریت کو اصل اصول فرض کر کے اور اس کے مندرجہ زمانوں کو تسلیم کر کے بہت سی کتابیں تاریخ کی تصنیف کی ہیں اور ہر قسم کے مباحثوں میں خواہ مذہب سے متعلق ہو خواہ علم تواریخ سے خواہ علم الارض سے خواہ علم حیوانات سے خواہ کسی اور علم سے اسی کے مندرجہ زمانوں پر استدلال کرتے ہیں۔ اس واسطے ہم نے بھی اپنی اس کتاب میں انہیں کی تقلید کو قرین مصلحت سمجھا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم نے متعدد واقعات کو جو عرب میں واقع ہوئے وہ ایسے ہیں کہ اور ملکوں مثلاً فارس، اطالیہ اور مصر کے واقعات سے علاقہ رکھتے ہیں اور یہ ایسے ملک ہیں جن کی تواریخ اور ان واقعات کا زمانہ جو وہاں واقع ہوئے دنیا میں بخوبی مشہور ہے۔ علاوہ اس کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جو عرب میں واقع ہوئے ہیں اور ان کے وقوع کا زمانہ قریب بہ صحت معلوم ہے اس لئے ہم نے اپنی تحقیقات میں ان دونوں تاریخوں کو بطور رہنما کے اختیار کیا ہے۔

"اول من نزل الیمن قحطان بن عابر بن شالح و قحطان المذکور اول من ملک ارض الیمن ولبس التاج— ابو الفدا"

قحطان اول شخص تھا جو عرب میں بادشاہ ہوا اور اپنی دارالسلطنت زرخیز اور شاداب صوبہ یمن میں مقرر کی جو کہ قحطان فالخ کا بھائی تھا اس واسطے اس کی تاریخ ولادت فالخ کی تاریخ ولادت سے بہت بعید نہ ہوگی اور اس لئے وہ تاریخ قریب ۱۷۵۷ء دنیوی یا ۲۲۰۰ قبل حضرت مسیح کے قرار پاتی ہے۔ زبانوں کے اختلاف کے بعد جو بابل میں مینار کی تعمیر کی وجہ سے عارض ہوگئیں نمرود پسر کوش ملک بابل یا اشور کا بادشاہ ہوا اور حام پسر مصریم مصر کا۔ اسی زمانہ میں قحطان بھی یمن کا بادشاہ ہوا یعنی ۱۷۷۱ء دنیوی یا ۲۲۳۴ قبل مسیح میں۔

ثم مات قحطان و ملک بعدہ ابنہ یعرب بن قحطان (ابو الفداء)

اس کے مرنے پر یعرب یا ترہم اپنے باپ کا جانشین ہوا اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اس کے قبضہ میں یمن اور حجاز کے صوبے تھے جو اس وقت میں بنی جرہم کے نام سے مشہور تھے۔ رورنڈ فارسٹر صاحب اور مؤرخ اس باب میں متفق الرائے ہیں اور اتفاق کی صحت اکثر مقامات کے ناموں کے مطابقت سے جو ان صوبہ جات میں پائے جاتے ہیں ہوتی ہے۔ جرہم کے یمن میں آباد ہونے کے باب میں مصنف موصوف نے ایک بہت معقول وجہ ثبوت پیش کی ہے یعنی یہ کہ جرہم ابو یمن کے نام سے ملقب ہوا تھا۔"

ثم ملک بعدہ ابنہ یشحب بن یعرب ثم ملک بعدہ ابنہ عبد شمس بن یشحب ..... وسمی سبا وھوالذی بنا السد بارض مارب ... وبنی مدینۃ مارب وعرفت مدینۃ سبا...... وخلف سبا

المذکور عدة اولادمنهم حمیر وعمرو وکهلان واشعر وغیر هم... ولمامات سبا ملک الیمن بعده ابنه حمیر ابن سبا (ابو الفداء)

جرہم کی وفات کے بعد اس کا بیٹا یشجب تخت پر بیٹھا اور اس کے بعد اس کا بیٹا عبدالشمس ملقب بہ سبا اکبر تخت نشین ہوا۔ یہ شہزادہ یمن میں مشہور سلطنت سبا کا بانی ہوا اور اسی نے شہر سبا اور شہر مارب بنایا اور اس کے بعد اس کے بیٹے حمیر نے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ اب چونکہ حمیر یقطان سے چوتھی پشت میں تھا اور ترح بھی فالغ سے چوتھی پشت میں تھا اس لئے ہم یہ نتیجہ نکالنے کے مجاز ہیں کہ حمیر کی ولادت ترح کی پیدائش سے بہت دور نہیں ہوگی یعنی ۱۸۷۸ دنیوی یا ۲۱۲۶ قبل حضرت مسیح میں اس کی ولادت ہوئی ہوگی۔

ترح کے تین بیٹے تھے ابرام' ناحور' حاران اور حمیر کے بیٹے بھی تین تھے۔ وائل' عوف' مالک' اس لئے ترح اور حمیر کی اولاد کو بھی ہمعصر خیال کرنا چاہیے یعنی یہ کہ وہ ۱۹۴۸ دنیوی یا ۲۰۵۶ قبل حضرت مسیح کے تھے۔

وائل کا بیٹا سکسک اور عوف کا بیٹا فاران ہوا۔ اب اول اس مدت پر جو ایک پشت کے واسطے عموماً دی گئی ہے لحاظ کر کے اور بعد ازاں تاریخ پیدائش لوط پسر حاران پر غور کر کے سکسک اور فاران کی ولادت کی تاریخ قرار دینی چاہیے جو ۱۸۷۷ دنیوی یا ۲۱۲۶ قبل حضرت مسیح میں یعنی تیس برس قبل ولادت حضرت ابراہیم کے قرار پاتی ہے۔

ثم مالک بعده (ای بعد حمیر) ابنه وائل ابن حمیر ثم ملک بعده ابنه السکسک بن وائل ثم ملک بعده یعفر بن السکسک ثم وثب علی ملک الیمن ذوریاش وهو عامر بن ماران (فاران) (پاران) (باران) بن عوف بن حمیر (ابو الفدا)"

عوف بفتح اوله وسکون ثانیه واخرفاء جبل بنجد ....وعوق بالفتح ارض فی دیار غطفان بین نجد وخیبر (مراصد الا طلاع علی اسماء الا مکنة والبقاع"

وائل اپنے باپ کا جانشین ہوا اور عوف کسی جگہ حجاز اور نجد کے مابین آباد ہوا۔ یہ امر اس بات سے ثابت ہے کہ پہاڑ جو نجد کی جانب مغرب واقع ہے آج تک جبل عرف کے نام سے مشہور ہے۔ فاران ابن عوف اپنے باپ کے پڑوس میں آباد ہوا۔ یعنی اس وادی غیر ذی زرع میں جہاں بالفعل مکہ معظمہ موجود ہے۔ فاران کا اطلاق صرف اسی وسیع شمالی بیابان پر نہیں ہوا جو قادیش تک چلا گیا ہے بلکہ ان پہاڑوں پر ہوتا ہے جو اس میں واقعہ ہیں اور ان پہاڑوں ہی کے نام کی وجہ سے اس وسیع میدان کو فاران کا میدان کہہ سکتے ہیں۔ تمام مشرقی مورخ اور نیز وہ لوگ جو قدیم روایتوں کے معتقد ہیں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور توریت مقدس میں بھی صاف صاف مذکور ہے کہ یہی نواح بنام فاران موسوم تھا۔ جو کہ ہم اس مضمون کو زیادہ تر تفصیل سے عرب المستعربہ کے ذکر میں بیان کریں گے اس لئے حال فاران بن عوف کا بیان کرتے ہیں۔

ابوالفدا اپنی تاریخ عرب میں بیان کرتا ہے کہ فاران عوف کا بیٹا تھا۔ یہ تاریخ مع اپنے لاطینی ترجمہ کے ۱۸۳۱ء میں از سر نو چھاپی گئی تھی اور اس کا لاطینی زبان میں یہ نام ہے (ابوالفدا ہسٹوریا انٹی اسلام کاربیس) یعنی تاریخ ابوالفدا اور باب عرب ایام جاہلیت اور اس کا ایڈیٹر "ہنریکس آرتھوبیس فلیچر" تھا۔ لفظ فاران اصل کتاب کے صفحہ ۱۱۴ میں اس شکل سے چھپا ہے (ماراں) یعنی حرف اول پر کوئی نقطہ نہیں ہے۔ اب ہم یہ سوچتے ہیں کہ وہ پہلا حرف کیا ہے ف ہے یا ب ہے یا پ ہے اور اس موقع پر یہی تین صورتیں ہونی ممکن ہیں۔ مگر باوجود اس نقطہ کی غلطی کے یہ محقق ہے کہ یہ لفظ بجز فاران کے اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

عربی مصنفوں کا دستور ہے کہ جب کسی لفظ کا تلفظ ف سے ہوتا ہے تو اس کو ف کے حرف سے لکھتے ہیں۔ بعض یہودی حرف ف کا تلفظ مثل حرف پ کے کرتے ہیں مگر عربی مصنف پ کی جگہ ب کا تلفظ کرتے ہیں اور ب ہی سے اس لفظ کو لکھتے ہیں کیونکہ ان کی الف بے میں پ کا حرف نہیں ہے۔ اس وجہ سے ابوالفدا نے لفظ فاران کو جس کا یہودی تلفظ پاران سے تھا باران ب کے ساتھ لکھا ہے جس کا نقطہ چھپنے میں رہ گیا ہے اور اس کا ثبوت لاطینی ترجمہ سے ہوتا ہے کہ اس میں اس کا ترجمہ "بارانی" ب سے کیا گیا ہے۔ پس اب اس بات میں کہ عوف کا بیٹا فاران تھا کچھ شک باقی نہیں رہا۔

جس مقام پر کہ عوف نے سکونت اختیار کی تھی وہاں کوئی ایسا ربانی کرشمہ واقعہ نہیں ہوا جس سے اس کی شہرت کو جو اس نے عوف کے نام سے حاصل کی تھی گھٹا دیتی یا مٹا دیتی اور اس لئے وہ مقام اور وہ پہاڑ عوف ہی کے نام سے مشہور رہا مگر جس جگہ کہ فاران آباد ہوا تھا اس کا حال ایسا نہیں ہوا کیونکہ وہاں ایک ربانی کرشمہ کے واقع ہونے کا وعدہ کیا گیا تھا اور جب وہ ربانی کرشمہ واقع ہوا جو تمام چیزوں پر جن کی عرب تعظیم اور حرمت کرتے تھے سبقت لے گیا اور ان کی شہرت کے چاند کو گہن لگا دیا۔ فاران کی شہرت مدھم پڑ گئی اور اس کی جگہ خدائے مقدس کے نام کی شہرت قائم ہوئی۔ فاران کا نام نسیاً منسیاً ہو گیا اور بیت اللہ الحرام کے نام سے اس مقام نے شہرت پائی جو امید ہے کہ قیامت تک اسی طرح مشہور اور معزز رہے گا۔

"ثم نحض من بنی وائل النعمان بن یعفر بن السکسک بن وائل بن حمیر و اجتمع علیه الناس و طرد عامر بن باران عن الملک واستقل النعمان المذکو ربملک الیمن ولقب نعمان المذکور بالمعافر."

ثم ملک بعده ابنه اشمح بن المعافر المذکور ثم ملک بعده شداد بن عاد بن الماطا بن سبا واجتمع له المک وغزا البلاد ان بلغ اقصی المغرب وبنی المدائن والمصانع وابقی الاثار العظیم (ابو الفدا)

وائل کے بعد اس کا بیٹا سکسک اور اس کے بعد اس کا بیٹا یعفر جانشین ہوا۔ اس کا چچازاد بھائی عامر ذوریاش پسر فاران پسر عوف نے جو حجاز میں آباد ہوا تھا یعفر کی سلطنت پر حملہ کیا اور فتح کر لیا لیکن نعمان بن یعفر نے اس کو نکال دیا اور وہ حجاز کی طرف چلا گیا اور نعمان نے اپنی سلطنت واپس لے لی۔ اس کارنمایاں کی وجہ سے اس کا لقب المعافر ہو گیا۔ اسی قاعدہ کے موجب جس سے کہ ہم نے اس قدر اشخاص کی ولادت کی تاریخیں معین کی ہیں ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یعفر بن سکسک اور عامر بن فاران اور حضرت ابراہیم کے تولد کی تاریخ قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہے۔ یعنی ۲۰۰۸ دنیوی میں یا ۱۹۹۶ قبل حضرت مسیح میں۔ اب جو قدرتی قاعدہ پشتوں کے توالد و تناسل کا ہے اس کے مطابق ہم نعمان کے زمانہ پیدائش کو دریافت کر سکتے ہیں جس کا وقوع ۲۰۳۸ دنیوی میں یا ۱۹۶۶ قبل حضرت مسیح میں واقع ہوتا ہے۔

اس پچھلے زمانہ کے پینتالیس برس بعد حضرت ابراہیم مقام "اور" سے جو قوم کالدی سے متعلق تھا حاران کو جو عراق عرب میں واقع ہے بلائے گئے تھے اور یہ ایک ایسا زمانہ ہے جس کے متعلق جمیع واقعات ہم کو اس نتیجہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ عامر اور نعمان کی جنگ اسی زمانہ میں ہوئی ہو گی۔ اس لئے یہ مستنبط ہو سکتا ہے کہ یہی وقت تھا جب کہ نعمان نے عامر کو بھگا کر اپنے آبائی تخت کو حاصل کیا تھا یعنی ۲۰۸۳ دنیوی یا ۱۹۲۱ قبل حضرت مسیح میں۔ نعمان کے بعد اس کا بیٹا اشمح تخت پر بیٹھا اس کی سلطنت پر شداد

نے حملہ کیا اور راشم کو شکست دے کر جلاوطن کر دیا۔ شداد نے بڑی عظمت اور شہرت حاصل کی اور اپنی حکومت استحکام کے ساتھ قائم کرنے میں کامیاب ہوا اس نے بہت سی عالیشان عمارتیں بنائیں[1] جن کے نام ونشان اب بھی پائے جاتے ہیں۔

شداد کا نام ایسا مشہور ہے کہ قریب قریب ہر مشرقی باشندہ اس سے واقف ہے اور اس کی عظمت وشوکت کی نسبت بہت سے عجیب وغریب قصے اور روایتیں مشہور ہیں یہ شخص ماطاط بن عبدالشمس عرف سبا اکبر کی اولاد میں تھا اس کے باپ کا نام عاد ہے۔ مورخوں نے اس عاد کو پہلے عاد کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے اور اس طرح پر مختلف روایتیں جو درحقیقت پہلے عاد سے متعلق تھیں اس کی طرف منسوب کی ہیں اور اس عاد کی روایتیں پہلے عاد کی طرف۔

ان دونوں عادوں کے باہم تمیز کرنے کے..لئے ہم نے اس پچھلے عاد کو جس کا ابھی ذکر ہوا بنام عاد ثالث موسوم کیا ہے کیونکہ اس نام کا یہ تیسرا شخص ہے۔

مشرقی تاریخوں میں ہم شداد اور سبا اکبر کے مابین صرف دو نام ایک عاد اور دوسرا ماطاط پاتے ہیں حالانکہ ان کے مابین کم سے کم پانچ نام ہونے چاہئیں۔ مشرقی تاریخوں میں جو سلسلہ انساب میں اس طرح ناموں کی کمی پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرقی مورخوں نے سلسلہ انساب کو پرانے عربی شعراء کے اشعار اور تحریروں سے اخذ کیا ہے ان شاعروں کا قاعدہ تھا کہ اپنے اشعار میں انہیں لوگوں کا ذکر کیا کرتے تھے جنہوں نے کسی بڑے بڑے کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل کی ہو اور جن لوگوں نے ایسی شہرت نہیں حاصل کی ان کے نام ان اشعار میں نہیں پائے جاتے تھے اور یہی سبب ہے کہ مشرقی مورخوں نے جو سلسلہ انساب قائم کیا ہے اس میں سے وہ نام چھوٹ گئے ہیں۔

عرب العاربہ کا شجرہ انساب ہم اپنے اس مضمون کے آخر میں شامل کریں گے اس شجرہ میں جہاں ہم کہیں ہم کو اس طرح پر ناموں کے رہ جانے کا شبہ ہوا ہے یا جہاں کہیں خود مشرقی مورخوں نے ناموں کے رہ جانے کا اقرار کیا ہے وہاں ہم نے ایک نشانی ستارہ کی بنادی ہے۔ جس سے ظاہر ہوگا کہ کس قدر نام ہماری دانست میں اس سلسلہ سے چھوٹ گئے ہیں۔

جس زمانہ میں کہ شداد نے یمن والوں پر غلبہ حاصل کیا اور سلطنت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی اس کا صحت کے ساتھ متعین کرنا کسی قدر غیر ممکن ہے بااین ہمہ کہہ سکتے ہیں کہ نعمان کی تخت نشینی سے چند سال بعد یا اس کی وفات سے بہت ہی تھوڑے عرصہ میں شام کے پانچ بادشاہوں کے باہم لڑائی شروع ہوئی توریت مقدس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لڑائی کا اثر عرب میں بھی پہنچا تھا۔ کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ "پس درسال چہاردہم کدارلاعومر وملوکے کہ بہمراہش بودند آمدہ رفائیاں' در عشتروث قرنیم وزوزیان' رادر ہام وایمیاں رادر شاوہ قریاثایم شکست دادند ونیز حوریاں رادر کوہ خودشاں سعیر تاایل پاران کہ درنزدیک صحراست وبرگشتہ بعین

---

[1] مسٹر ورنڈ فارسٹر صاحب بوقت بیان کتبات قوم عاد کے جو مختلف اقطاع عرب میں ظاہر ہوئے ہیں لقب الحجر کے قدیمی آثار کا جو حضر موت میں ہیں ذکر کرتے ہیں۔ حصن غراب کے آثار بھی کچھ کم مشہور نہیں ہیں۔ عدن میں بعض عمارتوں کے آثار بڑی قدامت کا دعویٰ کرتے ہیں اور لوگوں کو بہت شوق دلاتے ہیں اور قوم عاد سے منسوب ہیں۔ بعض نشانات حوضوں کے جو عموماً تالاب کہلاتے ہیں عدن میں اب تک پائے جاتے ہیں اور جن کی قدامت کی وجہ سے ہر سیاح کی توجہ واشتیاق کو کشش ہوتی ہے ان کا بانی شداد کو کہتے ہیں۔ علاوہ ان آثار کے جن کا ذکر ہو چکا ہے بہت سے اور بھی دریافت ہوئے ہیں جو خود ان عمارات اور نیز ان کے بانی کی قدامت کے شاہد ہیں۔

مشباط کہ قادلیش است آمدند وتمامی مرز و بوم عمالیقیان واہم اموریانی کہ در حصصون تامار ساکن بودند شکست دادند۔"

(سفر تکوین باب ۱۴ آیت ۵۔۶۔۷)

ظاہر ہے کہ یہ حملہ آور قادیش۔ کے شمال سے آئے ہوں گے کیونکہ سعیر کے پہاڑ اس جگہ سے شمال میں واقع ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قادلیش کے جنوب میں دور جا کر فاران میں چلے گئے جس سے آج تک حجاز مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اس بیان کے کہ حملہ آور پاران سے قادیش کو لوٹ گئے کچھ بھی معنی نہ ہوتے۔ اگر یہ کہیں کہ یہ لوگ مغرب کی جانب گئے ہوں گے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرف بنی عملیق رہتے تھے جن سے کہ ان حملہ آوروں نے اپنی پہلی مہم سے قادیش کو واپس آنے کے بعد جنگ کی تھی۔

اس وقت اشح کی حکومت اور عملداری صوبہ یمن اور حجاز پر پھیل گئی جو کہ یہ زمانہ اس کے عہد حکومت کی ابتدا کا تھا اس لئے خیال ہوسکتا ہے کہ مذکورہ بالا حملہ کی وجہ سے اس کی طاقت میں کسی قدر ضعف آ گیا ہو جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ سلطنت یمن کی اس ضعف اور شکستہ حالت کو شداد نے جو ہمیشہ ایسے موقع کا منتظر رہتا تھا اشح پر حملہ کیا ہو اور اس کو حکومت سے بے دخل کر کے تخت چھین لیا ہو۔ ان وجوہ کی بناء پر ہم کو اس بات کے یقین کرنے کی ترغیب ہوتی ہے کہ اشح ۲۰۹۱ دنیوی یا ۱۹۱۳ قبل حضرت مسیح میں تخت پر بیٹھا تھا اور شداد نے ۲۰۹۲ دنیوی یا ۱۹۱۲ قبل حضرت مسیح میں اس کی سلطنت کو چھین لیا تھا اور یہ زمانہ اس عام قاعدہ سے جو علم انساب میں پشتوں کے پیدا ہونے کے لئے قرار دیا گیا ہے بالکل مطابق ہوتا ہے۔

ثم ملک بعده اخواه لقمان بن عاد ثم ملک بعده اخوه ذوشدد بن عاد ثم ملک بعده ابنه الحرث بن ذی شددو یقال له الحارث الرایش (ابو الفدا)

شداد کے بعد اس کے دو بھائی لقمان اور ذوشدد یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور ذوشدد کے بعد اس کا بیٹا الحارث بادشاہ ہوا۔ اس زمانہ تک اور اس کے بہت عرصہ بعد تک وہاں دو خود مختار سلطنتیں رہیں ایک یمن اور دوسری حضر موت کی آخر کو ایک دوسرا شخص مسمی الحارث جس کا لقب رائش ہوا تخت پر بیٹھا اس نے ان دونوں سلطنتوں کو ملا کر ایک کر دیا۔ اس لئے بعض مورخوں نے غلطی سے پہلے الحارث اور دوسرے الحارث کو ایک ہی شخص سمجھا اور اسی کی طرف دونوں سلطنتوں کا ملانا منسوب کیا۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان بادشاہوں کے نام جو ان دونوں الحارثوں کے مابین فرماں روا ہوئے تھے ہر ایک مورخ نے چھوڑ دیئے اور ان کے نام معدوم ہو گئے۔ اس غلطی کا ثبوت اس طرح پر ہوتا ہے کہ جو زمانہ ان بادشاہوں کا گزرا ہے اور جو تعداد بادشاہوں کی لکھی ہے وہ بلحاظ امتداد زمانہ کے نہایت کم ہے۔

الحارث الرائش هوالحارث بن قیس بن صیفی بن سبا الاصغر الحمیری وکان الرائش اول غزامنهم فاصاب الغنائم وادخلها ارض الیمن فارتاشت حمیر فی ایامه وکان هو الذی راشهم فبذالک سمی الرایش وبین الرایش وبین حمیر خمسة عشراباً (تاریخ سنی ملوک الارض والانبیاء لحمزة اصفهانی)

"حمزہ اصفہانی اپنی تاریخ میں بیان کرتا ہے کہ الحارث الرائش ذوشدد کا بیٹا اور جانشین نہ تھا بلکہ حضر موت کے خاندان میں سے تھا۔ افسوس کی بات ہے کہ یہ مصنف ان بادشاہوں کی تعداد بھی نہیں بتلاتا جن کے نام معدوم ہو گئے ہیں لیکن اس کا یہ بیان کہ حمیر اور

الحارث الرائش کے مابین پندرہ پشتیں گزری تھیں۔ہم کو کسی قدر ٹھیک ٹھیک وقت کے معین کرنے پر قادر کرتا ہے۔"
اگر ہم بیان صدر پر اعتماد کریں تو ہم کو یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ الحارث ابن شدد کے اور الحارث الرئش کے مابین ساتھ یا آٹھ اور بادشاہ ہوئے ہوں۔"

"ثم ملک بعده ابنه ذوالقرنين الصعب بن الرايش ثم ملک بعده ابنه ذوالمناوا برهه بن ذوالقرنين ثم ملک بعده ابنه افريقش بن ابرهه ثم ملک بعده ذوالا ذعار عمر و بن ذوالمنار ثم ملک بعده شرجيل بن عمرو بن غالب بن المنتات بن زيد بن يعفر بن السكسک بن واثل بن حمير .... ثم ملک بعده ابنه الهد مادبن شرجيل ثم ملک بعده بنته بلقيس بنت الهد هادو بقيت فى ملک اليمن عشرين سنة ولتزوجها سليمان بن داؤد .(ابو الفدا)

الحارث الرائش قیس بن صیفی بن سبا الاصغر کا جو حمیر کی اولاد میں سے بیٹا تھا اور جیسا کہ اوپر مذکور ہوا کہ وہ یمن اور حضرموت دونوں سلطنتوں کو ملانے میں کامیاب ہوا اور اسی سبب سے رائش یا تبع الاول کا لقب پایا۔"
اس کے بعد صعب ملقب بہ ذوالقرنین اور ابرہہ ملقب بہ ذوالمنار اور افریقش اور عمرو ملقب بہ ذوالا ذعار یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔"
عمرو ذوالا ذعار کے عہد حکومت میں شرجیل نے اس پر حملہ کیا اور بے شمار خونریز لڑائیوں کے بعد عمرو ذوالا ذعار کو شکست دی اور اس کی سلطنت پر قابض ہو گیا۔شرجیل کے بعد اس کا بیٹا الہد ہاد جانشین ہوا اور اس کے بعد ملکہ بلقیس تخت پر بیٹھی جس نے بیس برس سلطنت کر کے حضرت سلیمان بادشاہ یہود سے نکاح کر لیا۔اس ملکہ کی حکومت کا اختتام توریت مقدس سے ۳۰۰ ونیوی یا ۵۰۰ قبل حضرت مسیح میں پایا جاتا ہے۔اس لئے نسلوں کے پیدا ہونے کے معینہ قاعدہ کے مطابق الحارث الرائش اور صعب ذوالقرنین یا تو اٹھائیسویں صدی دنیا کے آخر میں یا انیسویں صدی کے شروع میں ہوئے ہوں گے یعنی ۱۲۰۰ قبل حضرت مسیح کے۔"

وقد نقل ابن سعيد المغربى ان عباس سئل عن ذى القرنين الذى ذكره الله تعالىٰ فى كتابه العزيز فقال هومن حمير وهو الصعب المذكور فيكون ذوالقرنين المذكور فى الكتاب العزيز هو الصعب (بن) الرايش المذكوره الا سكندو الرومى (ابو الفدا)

ابن سعید مغربی کا بیان ہے کہ جب حضرت ابن عباس سے اس ذوالقرنین کی نسبت جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ صعب حمیری تھا۔اس دلیل پر ابوالفدا نے بیان کیا ہے کہ اسی ذوالقرنین کا ذکر قرآن مجید میں ہے نہ کہ سکندر اعظم کا۔"

وكان اول من اسس السدسبا الا كبرو اسمه عامر وقيل عبد شمس بن يشحب بن يعرب بن قحطان ثم بناه حمير ابن سبا بعد موت ابيه ثم اتمه بعد ذلک ذوالقرنين الحميرى وهوالصعب بن ابى مرايد وكان السد من جبل ماوب الى جبل الا بلق وهما جبلان منيفان على الجبال الشافحة الممتد من يمين السدو شماله (العقودا للولويه فى اخبار دولة الرسوليه يمنى")

ایک مشہور معروف کام سد کی تعمیر کا اسی ذوالقرنین کے عہد میں اختتام کو پہنچا۔شاہان یمن کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سد

کی بنا سبا اکبر نے شروع کی تھی۔اس کے بیٹے اور جانشین حمیر نے اس کا جاری رکھا اور ذوالقرنین نے اسے اختتام کو پہنچایا۔وہ سددو پہاڑوں کے درمیان تھی ایک پہاڑ کا نام مارب اور دوسرے کا نام ابلق تھا۔

ثم ملک بعدها عمهانا شرالنعم بن شرجیل .... ثم ملک بعده شمر برعش بن ناشر النعم . . . . ثم ملک بعده ابنه ابن مالک بن شمر ثم ملک بعده عمران بن عامر الازدی ... ثم ملک بعده اخوه مزیقیا (ابو الفدا)

بلقیس کے بعد اس کا چچازاد بھائی مالک ملقب بہ ناشر النعم تخت نشین ہوا اور اس کے بعد اس کا بیٹا شمر برعش اور اس کے بعد اس کا بیٹا ابو مالک تخت پر بیٹھا۔اس بادشاہ کی سلطنت میں عمران نے جو خاندان ازد سے تھا اس پر حملہ کیا اور شکست دے کر تخت چھین لیا اور سلطنت بنی حمیر کے خاندان سے بنی کہلان کے خاندان میں منتقل ہوگئی۔عمران کے بعد اس کا بھائی عمر مزیقیا تخت نشین ہوا۔"

اس کے زمانہ میں الاقرن بن ابو مالک نے اپنے باپ کی سلطنت کا دعویٰ کیا اور مزیقیا سے لڑ کر اس کو شکست دی اور سلطنت چھین لی اور حیر کے خاندان میں دوبارہ سلطنت لوٹ آئی۔"

مالک الاقرن بن ابی مالک ثم ملک بعده ذوحبشان بن الاقرن ... ثم ملک بعد اخواه تبع بن الاقرن ثم ملک بعده ابنه کلیکرب بن تبع ثم ملک بعده ابو کرب اسعد وهو تبع اوسط وقتل ثم ملک بعده ابنه حسان بن تبع... ثم قتله اخوه عمرو من تبع وملک ... فسمی ذالا هواد ثم ملک بعده عبد کلال ابن ذوی الا عواد ثم ملک بعده تبع بن حسان ابن کلیکرب وهو تبع الاصغر ثم ملک بعده ابن اخته الحارث بن عمرو و تهود الحارث المذکور ثم ملک بعده مرثدابن کلال... ثم ملک بعده وکیعه ابن مرثد (ابو الفدا)

اس کے بعد اس کا بیٹا ذوحبشان مالک تاج وتخت ہوا اس کے بعد اس کا بھائی تبع اکبر اس کے بعد اس کا بیٹا کلیکرب اور اس کے بعد اس کا بیٹا ابوکرب اسعد تبع اوسط اس کے بعد اس کا بیٹا حسان' اس کے بعد اس کا بھائی عمر ذوالاعواد اس کے بعد اس کا بیٹا عبد کلال تخت نشین ہوا۔تبع اصغر پسر حسان نے اس بادشاہ سے سلطنت چھین لی اور خود بادشاہ ہوگیا۔اس کے بعد اس کا بھتیجا حارث بن حمر تخت پر بیٹھا۔تمام مؤرخوں کا اتفاق ہے کہ حارث نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔اس کے بعد مرثد بن کلال اور اس کے بعد وکیعہ ابن مرثد تخت نشین ہوئے۔"

ثم ملک ابرهه بن اصلباح ثم ملک صهبان بن محرث ثم ملک عمر بن تبع ثم مالک بعده ذوالواس وکان من لا یتهود القاه فی اخدود مضطرمناراً فقیل له صاحب الاخدود ثم ملک بعد ذوجدن هوا خر ملوک الحمیر. (ابو الفدا)

من کتاب ابن سعید المغربی ان الحبشة استولوا علی الیمن بعد ذی جدن الحمیری المذکور وکان اول ملک الیمن من الحبشه ارباط ثم ملک بعده ابرهة الاشر صاحب الفیل الذی قصد مکة ثم ملک بعده یکسوم ثم ملک بعده مسروق بن ابرهه وهوا خرمن ملک الیمن من الحبشة ثم عاد ملک الیمن الی حمیر و ملکها سیف بن ذی یزن الحمیری (ابو الفدا)

ان بادشاہوں کی حکومت کا زمانہ حارث بن عمر کے یہودی مذہب اختیار کرنے کی وجہ سے کسی قدر صحت کے ساتھ معلوم ہوسکتا ہے۔ جب کہ بخت نصر فلسطین کو فتح کر کے اور بیت المقدس کو مسمار کر کے حضرت دانیال اور ان کے دوستوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا اس وقت کچھ یہودی بچ کر یمن کو بھاگ گئے تھے۔ اس زمانہ میں حضرت یرمیاہ اور دانیال پیغمبر تھے۔ اس لئے یہ بات نہایت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ان مغرور یہودیوں کی وجہ سے الحارث نے خدائے واحد کا اقرار کیا ہوگا اور یہودی مذہب کو قبول کیا ہو گا اور یہ امر واقعی ہے کہ الحارث اور وکیعہ اس زمانہ میں حکمران تھے یعنی ۳۴۰۰ دنیوی میں یا ۶۰۴ قبل حضرت مسیح میں۔ اس امر کا واقعی ہونا زیادہ تر اس لئے قابل اعتبار ہے کہ نسلوں کے پیدا ہونے کے قدرتی قاعدہ کے مطابق بھی یہ زمانہ ٹھیک صحیح آتا ہے کیونکہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ مالک ناشر النعم ۳۰۰۱ دنیوی میں تخت پر بیٹھا تھا۔ مالک اور وکیعہ کے درمیان گیارہ اور بادشاہ گزرے ہیں جن کا زمانہ مجموعاً چار سو برس خیال کرنا قرین عقل ہے۔ وکیعہ کے بعد چھ اور بادشاہ خاندان حمیر میں سے تخت نشین ہوئے یعنی ابرہہ بن الصباح۔ صہبان بن محرث' عمر ابن تبع' ذوشناتر' ذونواس ملقب یہ ذو داخد ددذوجدن۔ چونکہ اس بادشاہوں کا خاندانی سلسلہ صاف صاف تحقیق نہیں ہوا اس لئے ہم نے ان کے ناموں کو شجرۂ انساب عرب العاربہ میں شامل کر دینے کی جرأت نہیں کی بلکہ ان کے ناموں کو شجرۂ کے حاشیہ پر لکھ دیا ہے۔ ان لوگوں کو سلطنت کا ٹھیک زمانہ بھی تحقیق نہیں ہوا ہے۔

ذونواس ایک متعصب یہودی تھا اور یہودی مذہب والوں کے سوا ہر مذہب کے معتقدوں اور پیروں کو آگ میں زندہ جلوا دیا کرتا تھا۔ اس بات کے خیال کرنے کے واسطے ایک عمدہ وجہ یہ ہے کہ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ آرٹازرکسیز اوکس نے چند یہودیوں کو جو مصر میں قید ہوئے تھے کیونکہ ان کا ملک مصر سے ملا ہوا تھا۔ ہرقانیہ (مازندراں) کو بھیج دیا۔ اور چونکہ یہ بادشاہ بھی یہودی تھا اس کی سلطنت کو بھی سخت صدمہ پہنچا اور حبشیوں نے اس پر غلبہ کر لیا اور اس کو سلطنت سے خارج کر دیا۔ پس یہ زمانہ اس خاندان کا آخری زمانہ معلوم ہوتا ہے اور ۳۶۵۰ دنیوی یا ۳۵۴ قبل حضرت مسیح کے مطابق ہوتا ہے۔

اس زمانہ سے ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت تک نوسو بیس برس ہوتے ہیں۔ اس درمیان میں افریقہ کے لوگوں کی جو ارباط حبشہ کہلاتے تھے اور نیز بعض عرب المستعربہ اور ابرہوں کی حکومت رہی۔

مشرقی مؤرخوں نے اس بات کے غلط خیال سے کہ ارباط حبشہ ابرہہ دو شخص تھے بیان کیا ہے کہ اس زمانہ میں صرف دو ہی بادشاہ ہوئے حالانکہ ارباط حبشہ اور ابرہہ خاندانی لقب ہیں اور ان خاندانوں کے بادشاہ اپنے اصلی نام کے ساتھ خاندانی نام کو شامل کر لیتے تھے۔

اس خاندان ابرہہ میں ایک بادشاہ کا نام اشرم تھا جو ابرہہ اشرم صاحب الفیل کہلاتا ہے اور جس نے مکہ معظمہ پر ۴۵۷۰ دنیوی یا ۵۸۰ عیسوی میں چڑھائی کی تھی وہ اپنے ساتھ بہت سے ہاتھی اس نیت سے لے گیا تھا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کر دے اور اس کے بعد اس کا بیٹا ابرہہ مسرو‌ق تخت نشین ہوا۔ مگر سیف بن ذی یزن حمیری نے اس کو سلطنت سے بے دخل کر دیا جس کو کسریٰ نوشیرواں والی ایران نے بہت مدد دی تھی جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ اس کے بعد سے خاندان ابرہہ کی حکومت منقطع ہوگئی۔

سیف بن ذی یزن جو حمیر کے شاہی خاندان سے تھا اپنے آپ کو سلطنت یمن کا وارث تھا اور حق دار سمجھتا تھا اس نے روم کے بادشاہ وقت سے مدد چاہی اور شہر روم میں اسی غرض سے دس برس تک پڑا رہا۔ مگر جب کہ اس کی امید منقطع ہوگئی تو وہاں سے کسریٰ نوشیرواں کے پاس چلا اور اس سے کمک کی استدعا کی۔

اس بادشاہ نے اس کی درخواست کو منظور کیا اور بہت بڑا لشکر اس کی کمک کو دیا اور اس نے اس لشکر کی مدد سے اپنے دشمن کو شکست دی اور خاندان ابرہہ کا خاتمہ ہو گیا اور سیف بن ذی یزن از سر نو تخت پر بیٹھا۔
اس نے اپنی سکونت شاہی محل غمدان میں اختیار کی اور عیش وعشرت میں محو ہو گیا۔ اس بادشاہ کے عہد کے شعراء نے اس کی بہت تعریف وتوصیف کی ہے اور جو کہ ان اشعار میں بعض تاریخی واقعات ملتے ہیں اس لئے ہم چند شعر اس جگہ نقل کرتے ہیں۔

لا تقصد الناس الا کابن ذی یزن ... ازخیم البحر للاعداء احوالا
وانی ھرقل واقد شالت نعماته ... فلم یجد عنده النصر الذی مالا
ثم انتحی نحو کسریٰ بعد عاشرة ... من السنین یھین النفس والمالا
حتی الی ببنی الاحرار یقدمھم ... تخالھم فوق متن الارض جبالا
للہ درھم من فتیه صبر ... ما ان رایت لھم فی الناس امثالا
بیض مرازبة غلب اساورة ... اسد تربت فی الغیضات اشبالا
فاشرب ھنیا علیک التاج مرتفقا ... براس غمدان داراً منک محلالا
تلک المکارم لاقعان من لبن ... شعیا بماء فعاد ابعد ابوالا

وکان سیف بن ذی یزن المذکور قد اصطفٰی جماعة من جشان و جعلھم من خاصة غتالوہ وقتلوہ فارسل کسریٰ عاملا علی الیمن واستمرت عمال کسریٰ علی الیمن ان کان اخرھم باذان الذی کان علی عھد النبی صلی اللہ علیه وسلم واسلم (ابو الفدا)

سیف بن ذی یزن کو ایک اس کے درباری حبشی مصاحب نے قتل کیا۔ اس کے بعد اس صوبہ کو نوشیرواں نے اپنے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا اور اپنی جانب سے وہاں عامل مقرر کرتا رہا۔ ان عاملوں میں سے اخیر عامل باذان تھا۔ اس کا زمانہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ متحد تھا چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا اور مسلمان ہو گیا۔

اول من ملک علی العرب بارض الحیرہ مالک بن فھم .. ثم مالک بعدہ اخوہ عمرو بن فھم ثم ملک بعدہ ابن اخیه جذیمه بن مالک بن فھم... وکانت له اخت تسمی رقاشؓ (ابوالفدا)

عرب العاربہ میں خاندان قحطان نے بڑی طاقت اور شہرت حاصل کی اور صوبہ حیرہ میں ایک بڑی زبردست سلطنت قائم کی۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ مالک بن فہم تھا اس کے بعد اس کے بھائی عمرو کو تخت ملا۔

لما قتل جذیمه ملک بعدہ ابن اخته عمرو بن عدی بن نصر بن ربیعه... ثم مات وملک بعدہ ابنه امرؤالقیس... وکان یقال لامر القیس البدا ے الاول ثم ملک بعد امرؤ القیس ابنه عمرو بن امرؤ القیس .. .ثم ملک بعدہ اوس بن قلام العملیقی ثم ملک اخرمن العمالیق ثم رجع الملک الی بنی عمر بن عدی بن نصر بن وبیه اللخمیین المذکورین وملک منھما امرؤ القیس من ولد عمرو بن امرو القیس المذکور و یعرف ھذا امرؤ القیس الثانی بالمحرق لانه اول من عاقب النار ثم ملک بعدہ ابنه النعمان الا عور بن امرؤ القیس .ثم تزھد و خرج من الملک...

ملک بعدہ ابنہ المنذر بن نعمان.... ثم ملک بعدہ ابنہ الا سود بن المنذر (ابو الفدا)

ثم ملک بعدہ اخوہ المنذر بن المنذر بن الا عور ثم ملک بعدہ علقمة الذمیلی ذومیل بطن من لخم ثم ملک بعدہ امرو القیس بن النعمان بن امرو القیس المحرق... ثم ملک بعدہ ابنہ المنذر بن امروا لقیس... لقب بماء السماء... وطرد کسری قباد المنذر المذکور عن ملک الحیرة وملک مرضعہ الحرث بن عمر بن حجر الکندی... ثم لا تمکن کسری نوشیروان بن قباد المذکور فی الملک طرد الحارث وعاد المنذر بن باء السماء الی ملک الحیرة (ابو الفدا)

اس کے بعد جذیمہ بن مالک تخت پر بیٹھا۔ یہ جری مگر طامع بادشاہ تھا۔اس نے اپنی سلطنت کو بہت قوی اور مستحکم کرلیا تھاایک طرف تو دریائے فرات اس کی سلطنت کی حد تھی اور دوسری طرف حد شام تک پھیلی گئی تھی۔شام تک سلطنت پھیلانے میں اس کو عملیق سے لڑنا پڑا۔اور ایک سخت اور خونریز لڑائی کے بعد ان کو شکست دی۔اس بادشاہ کی بہن نے جس کا نام رقاش تھاایک شخص مسمے عدی سے جو بنی لخم میں سے تھا شادی کی تھی۔

جذیمہ کے بعد اس کا بھانجا عمرو بن عدی تخت نشین ہوااس کے بعد اس کا بیٹاامروالقیس اور اس کے بعد اس کا بیٹا عمرو بادشاہ ہوا مگر اس کو"اوس" بن قلام عملیقی نے تخت سے اتار دیا۔اس کے بعد ایک یادو اور بادشاہ اسی خاندان کے فرمانروا ہوئے جن کے نام معلوم نہیں۔لیکن اس قدر محقق ہے کہ امروالقیس ثانی بن عمرو نے بہت جلد اپنے بھائی کی کھوئی ہوئی سلطنت کو لے لیا اور دوبارہ سلطنت کو اپنے خاندان میں منتقل کرلیا۔یہ اول شخص تھا جس نے کہ انسانوں کو زندہ جلانے کی وحشیانہ رسم کو رواج دیا تھااور اس سبب سے اس نے المحرق کا لقب حاصل کیا تھا اس کے بعد نعمان جانشین ہوا۔مگر دنیا کے ترددات اور جھگڑوں سے کبیدہ خاطر ہوکر تیس برس تک سلطنت کرنے کے بعد بادشاہت کو چھوڑ دیا اور عبادت میں مصروف ہوا۔اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر الاول تخت پر بیٹھا اس کے بعد اس کا بیٹا اسود تخت نشین ہوا جس کو غسانی بادشاہوں سے چند لڑائیاں لڑنی پڑیں اس کے بعد اس کا بھائی المنذر الثانی تاج وتخت کا مالک ہوا۔اس کے بعد علقمہ ذہیلی اور اس کے کے بعد امروالقیس ثالث بن نعمان نے زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر الثالث ملقب بہ ماءالسماء جانشین ہوا۔مگر اس بادشاہ کو کسریٰ قباد نے سلطنت سے خارج کر کے الحرث کو جو "کندی" خاندان میں سے تھااور جس نے ایران کے بادشاہ کا مذہب اختیار کرلیا تھا مقرر کیا۔جبکہ کسریٰ نوشیروان تخت پر بیٹھا اس نے الحرث کو حکومت سے علیحدہ کردیااور المنذر الثالث کو پھر حکومت دی۔

ثم ملک بعد المنذر عمرو مفرط الحجارہ... ثم ملک بعدہ اخوہ قابوس... ثم ملک بعدہ اخوهما المنذر بن المنذر ثم ملک بعدہ ابنہ النعمان بن المنذر بن المنذر بن ماء السماء وکنیتہ ابو قابوس وهو الذی تنصر... ثم انتقل الی ایاس ابن قبیضة الطائی... ثم ملک بعد ایاس زاویہ بن ماهان الهمد انی ثم عاد الملک الی الخمیین فهلک بعد زاویہ المنذر بن النعمان بن المنذر بن المنذر بن ماء السماء سمعتہ العرب المغرور واستمر مالکاً للحیرة الی ان قدم لها خالد بن الولید واستولی علی الحیرة (ابو الفدا)

اس کے بعد اس کا بیٹا عمرو اور اس کے بعد اس کا بھائی قابوس اور اس کے بعد اس کا بھائی المنذر الرابع اور اس کے بعد اس کا بیٹا نعمان ابوقابوس تخت پر بیٹھا۔ اس نعمان نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا اور خسرو پرویز کے زمانہ میں ایک مشہور لڑائی میں جو ایرانیوں کے ساتھ ہوئی تھی مارا گیا۔ اس کے بعد ایاس ابن قبیصۃ الطائی اور اس کے بعد زادویہ اور اس کے بعد المنذر الخامس بن نعمان ابوقابوس بادشاہ ہوا اس بادشاہ کو خالد بن ولید سردار لشکر اسلام نے شکست دے کر سلطنت کو چھین لیا۔

اول من ملک غسان جفنة بن عمرو بن ثعلبة بن عمر بن مزیقیا... ثم هلک وملک بعده ابنه عمر بن جفنه... ثم ملک بعده ابنه ثعلبة بن عمرو... ثم ملک بعده ابنه الحارث بن ثعلبه ثم ملک ابنه جبلة بن الحارث ثم ملک إبنه الحرث... ثم ملک بعد ابنه المنذر الا کبر (ابوالفدا) ثم هلک المنذر الاکبر المذکور وملک بعد اخوه النعمان ابن الحرث ثم ملک بعده اخوه جبلة بن الحارث ثم ملک بعده اخوهم عمرو بن الحارث ثم ملک جفنة الا صغر... ثم ملک بعده اخوه النعمان الا صغرثم ملک نعمان بن عمرو بن المنذر.... ثم ملک بعده النعمان المذکور ابنه جبلة بن النعمان... ثم ملک بعده النعمان بن الایهم... ثم ملک بعده ابنه المنذر بن النعمان ثم ملک اخوه عمرو بن النعمان ثم ملک اخوهما حجرا بن النعمان ثم ملک ابنه الحارث بن حجر ثم ملک ابنه جبلة بن الحرث ثم ملک ابنه الحارث ابن جبلة ثم ملک ابنه الحارث جبلة ثم ملک ابنه النعمان بن الحرث وکنیة ابوکرب ولقبه قطام ثم ملک بعده الایهم بن جبلة... ثم ملک بعده اخوه المنذر بن جبله ثم ملک اخوهماء سراحیل بن حیلة ثم ملک اخوهم عمرو بن جبلة ثم ملک بعده ابن اخیه جبلة بن الحرث بن جبلة ثم ملک بعده جبله بن الایهم بن جبلة وهواخر ملوک الغسان وهو الذی اسلم فی خلافة عمرثم عاد الی الروم وتنصر (ابو الفدا)

جس زمانہ میں یہ سب بادشاہ حکمراں ہوئے اس زمانہ کا ٹھیک ٹھیک معین کرنا اگر غیر ممکن نہیں تو مشکل تو بیشک ہے مگر اخیر بادشاہوں میں سے کم سے کم دو بادشاہوں کی فرمانروائی کا زمانہ ٹھیک ٹھیک بدرجہ یقین معلوم ہے اور اگر نسلوں کے ہونے کے معمولی قاعدہ پر غور کیا جائے تو بعض اور بادشاہوں کے عہد سلطنت کے زمانہ کے محقق ہونے کے لئے کافی پتہ لگ جائے گا۔

عمرو بن المنذر رباء السماء کی حکومت کے آٹھویں سال میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزمان پیدا ہوئے تھے اس واسطے یہ بادشاہ ۵۶۲ء دنیوی یا ۵۶۲ عیسوی میں تخت پر بیٹھا ہوگا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے پہل وحی ایاس کی حکومت کے چھٹے مہینے میں نازل ہوئی تھی اس واسطے ایاس ۶۱۰ء دنیوی یا ۶۱۰ عیسوی میں تخت نشین ہوا ہوگا۔ عمرو کی تخت نشینی سے پہلے انیس بادشاہ ہو چکے تھے اور ان کی سلطنتوں کے زمانوں کے مجموعہ کا بطرز معقول پانچ سو پچاس برس خیال کیا جا سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پہلا بادشاہ مالک بن فہم اکتالیسویں صدی دنیوی کے آغاز میں یا حضرت مسیح کے زمانہ ولادت کے قریب تخت پر بیٹھا ہوگا۔

عرب العاربہ نے ایک اور سلطنت صوبہ غسان میں قائم کی تھی اور اس سلطنت کے حاکم عرب الشام کے نام سے مشہور تھے۔

اگر صحیح طور پر غور کیا جائے تو یہ حاکم قیصر روم کی طرف سے بطور عمال کے تھے مگر شاہی لقب اختیار کرنے کی وجہ سے تاریخ عرب میں بادشاہوں کے ذیل میں بیان ہوتے ہیں جو کہ بعض امور ان لوگوں سے ایسے متعلق ہیں جن سے ہم کو بعض امور کی تحقیقات اور تجسس میں آسانی ہوگی۔ اس لئے ان سلطنتوں کا ایک مختصر حال اس مقام پر لکھتے ہیں۔

اس سلطنت کی بنا چار سو برس قبل ظہور اسلام کے ہوئی اور یہ زمانہ تینتالیسویں صدی دنیوی یا تیسری صدی عیسوی سے مطابقت رکھتا ہے۔

ھفنہ بن عمرآس اس خاندان کا پہلا شخص تھا جس نے لقب شاہی اختیار کیا۔ یہ شخص ''ازد'' کی اولاد میں سے تھا جو خاندان کہلان سے علاقہ رکھتا تھا وہ عرب جو اس سے پیشتر غسان میں رہتے تھے ضجاعمۃ کہلاتے تھے ان لوگوں نے عرصہ دراز تک مستعدی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا مگر آخرکار ھفنہ نے ان پر فتح پائی اور ان کو مطیع کر لیا۔

اس کے بعد اس کا بیٹا عمرو تخت پر بیٹھا اور اس کے بعد اس کا بیٹا ثعلبہ تخت نشین ہوا۔ ایک عرصہ تک اختیارات شاہی یکے بعد دیگرے الحارث' جبلہ' الحرث' المنذر الاکبر کے ہاتھوں میں رہے۔ اس اخیر بادشاہ کا جانشین اس کا بھائی نعمان ہوا اس کے بعد اس کا بھائی جبلہ اور اس کے بعد اس کا بھائی ایہم اور اس کے بعد اس کا بھائی عمرو تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد جفنۃ الاصغر بن المنذر الاکبر کی باری آئی اس کے بعد نعمان الاصغر اور اس کے بعد اس کا بھتیجا نعمان ثالث بن عمرو بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد جبلہ بن نعمان ثالث کے ہاتھ لگی۔ یہ بادشاہ خاندان حیرہ کے بادشاہ المنذر ماء السماء کا ہمعصر تھا اور اس سے چند لڑائیاں بھی لڑا تھا۔ اس کے بعد نعمان رابع بن الایہم اور اس کے بعد الحرث الثانی اور اس کے بعد اس کا بیٹا نعمان الخامس اور اس کے بعد اس کا بیٹا المنذر تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد عمرو برادر المنذر اور حجر برادر عمرو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ اس کے بعد الحارث بن حجر اور جبلہ بن الحارث بن جبلہ باری باری سے بادشاہ ہوئے۔ پھر نعمان ابوکرب بن الحارث اور ایہم عم نعمان تخت پر بیٹھے۔ الایہم کے بعد اس کے تین بھائی المنذر۔ سراحیل۔ عمرو یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ عمرو کے بعد اس کے بھتیجے جبلہ بن الایہم بن جبلہ کو سلطنت نصیب ہوئی۔ یہ بادشاہ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ تک زندہ تھا پہلے مسلمان ہو گیا اور اس کے بعد روم بھاگ کر عیسائی ہو گیا۔ اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ قریب ۴۶۳۰ دنیوی یا ۶۳۰ عیسوی میں ہو گیا۔

فلما ملک حجر سدد امورھم وساسھم احسن سیاسۃ وانتزع من المخمیین ما کان بایدیھم من اوض بکر ابن وایل.... وملک بعد الحجر المذکور ابنہ عمرو بن حجر.... ثم ملک بعدہ ابنہ الحرث بن عمرو (ابو الفدا)

وملک اخوہ (ای خایعرب)جرھم الحجاز ثم ملک بعد جرھم ابنہ عبد یالیل بن جرھم ثم ابنہ جرھم بن عبد یا لیل ثم ابنہ عبد المدان بن جوشم ثم ابنہ ثعلبۃ بن عبد المدان ثم ابنہ عبدالمسیح بن ثعلبہ ثم ابنہ مضاض بن عبد المسیح ثم ابنہ عمرو بن مضاض ثم اخوہ الحرث بن مضاض ثم ابنہ عمرو بن الحارث ثم اخوہ بشر بن الحارث ثم مضاض بن عمرو بن مضاض (ابو الفدا)

من ملوک العرب زھیرابن حباب بن جبل.... وکان زھیر المذکور قد اجتمع بابرھۃ الا شرم صاحب الفیل (ابو الفدا)

عرب العاربہ کی ایک اور چھوٹی اور چند روزہ سلطنت کی بنیاد ''کندہ'' کی اولاد نے جو خاندان کہلان سے تھا ڈالی تھی۔ اس خاندان کا پہلا بادشاہ حجر بن عمرو ہوا۔ جس نے کہ مملکت کے حیرہ کے ایک حصہ کو دبا کر ایک نئی سلطنت قائم کی تھی اس کے بعد اس کا بیٹا عمرو اور اس کے بعد اس کا بیٹا الحرث تخت پر بیٹھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے کسریٰ قباد کا مذہب اختیار کر کے اس کی اعانت سے سلطنت حیرہ کو فتح کیا تھا مگر جب نوشیروان نے اس سے المنذر کو سلطنت واپس دلا دی تب الحارث دیار کلب کو بھاگ گیا۔ مگر اس کے بیٹے چند روز تک چند مقامات پر حکومت کرتے رہے۔ حجر بنی اسد پر حکمران رہا۔ سراحیل بکر ابن وائل پر' معدی کرب قیس عیلان پر' سلمہ تغلب اور نمر پر حاکم رہا۔

حجر کے بعد جو مارا گیا تھا اس کے بیٹے امرو القیس نے از سر نو بنی اسد کو مطیع کر لیا۔ یہ امرو القیس وہی بہت بڑا مشہور شاعر عرب کا ہے۔ جبکہ منذر ماء السماء از سر نو تخت سلطنت پر بیٹھا تو امرو القیس اس کے خوف سے بھاگا اور کہیں روپوش ہو گیا۔ ان سب بادشاہوں نے پینتالیسویں یا چھیالیسویں صدی دنیوی یا پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں حکومت کی تھی۔

ایک اور سلطنت حجاز میں قائم ہوئی تھی جس زمانہ میں یمن اور حیرہ کی سلطنتیں اندرونی جھگڑوں سے ضعیف ہو گئی تھیں اس زمانہ میں اولاد یعرب یا جرہم نے ایک نئی اور خود مختار سلطنت حجاز میں قائم کی تھی۔ ابوالفدا کے نزدیک اس سلطنت کا پہلا بادشاہ جرہم تھا جس کا بھائی یعرب یمن میں حکمران تھا۔ مگر یہ غلطی ہے اور اس وجہ سے عارض ہوئی ہے کہ ابوالفدا نے غلطی سے یعرب اور جرہم کو دو شخص خیال کیا تھا حالانکہ یہ دونوں نام ایک شخص کے ہیں اور یہی ایک شخص یمن اور حجاز دونوں پر حاکم تھا۔ ابوالفدا نے مندرجہ ذیل نام بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ لوگ بھی یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے تھے اور وہ نام یہ ہیں۔ یالیل' جرشم بن یالیل' عبد المدان بن جرشم' ثعلبہ بن عبد المدان' عبد المسیح بن ثعلبہ' مضاض بن عبد المسیح' عمرو بن مضاض' الحرث برادر مضاض' عمرو بن الحرث' بشر بن الحرث' مضاض بن عمرو بن مضاض۔

اگر ابوالفدا کے نزدیک یہ بادشاہ حضرت اسمٰعیل بن حضرت ابراہیمؑ سے پیشتر گزرے ہیں تو وہ بڑی غلطی پر ہے کیونکہ عبد المسیح کے نام سے بلا ریب ثابت ہوتا ہے کہ وہ عیسائی تھا اور اس لئے ممکن نہیں کہ وہ حضرت اسمٰعیل سے پیشتر گزرا ہو یا ان کا ہمعصر ہو۔ کچھ شک نہیں کہ یہ سلطنت اس وقت قائم ہوئی تھی جب کہ یمن اور حیرہ اور کندہ کی سلطنتیں زوال کی حالت میں تھیں اور اس لئے ہم کو یقین ہے کہ اس سلطنت کے بادشاہ پینتالیسویں اور چھیالیسویں صدی دنیوی یا پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں گزرے ہیں۔

یہ بھی واضح ہو کر عمرو بن لحی ۴۲۱۰ دنیوی یا تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں اسی سلطنت پر حکمراں تھا۔ ابوالفدا کا بیان ہے کہ اسی شخص نے بت پرستی کو عرب حجاز میں رواج دیا تھا۔ اور کعبہ میں تین بت' ھبل کعبہ کی چھت پر اور اساف اور نائلہ اور مقاموں پر رکھے تھے۔

مثل دیگر عرب العاربہ کے جو حجاز میں متوطن ہوئے اور پھر وہیں کے بادشاہ ہوئے۔ زہیر ابن حباب نے بھی لقب شاہی اختیار کیا۔ یہ بات اس وقت کی ہے جب کہ ابرہہ اشرم نے مکہ معظمہ پر حملہ کیا تھا۔ کیونکہ یہ بات مشہور ہے کہ زہیر بھی ابرہہ اشرم کے ساتھ اس مہم میں شریک تھا اس لئے بآسانی محقق ہو سکتا ہے کہ اس کا عہد حکومت چھیالیسویں صدی دنیوی یا چھٹی صدی عیسوی کے آخری حصہ میں ہو گا۔ سب سے مشہور واقعہ اس کے عہد حکومت کا یہ تھا کہ اس نے بنی غطفان کے اس مقدس معبد کو جو انہوں نے کعبہ کے مقابلہ کے لئے بنایا تھا بالکل برباد کر دیا تھا۔

اب ہم اس مقام پر عرب العاربہ کے انساب کا شجرہ لکھتے ہیں۔تمام قوم کا شجرہ لکھنا تو محالات سے ہے مگر یہ شجرہ انہیں لوگوں کا ہے جن کا ذکر ہم نے اس مقام پر کیا ہے۔اس شجرہ سے ان مطالب کے سمجھنے میں جو اس جگہ بیان ہوئے ہیں آسانی ہوگی۔

تمام عرب العاربہ کا جب کا ہم نے اوپر مفصل ذکر کیا ہے۔بنی جرہم کے خاندان سے علاقہ رکھتے ہیں مگر وقتاً فوقتاً بلحاظ اپنے مورثوں کے متعدد قبیلوں میں منقسم ہوتے گئے ہیں۔ان قبیلوں میں سے جو نامی قبیلے گزرے ہیں اور جن کا ذکر اکثر کتابوں میں آتا ہے۔ان کا بیان ہم اس مقام پر کرتے ہیں ان قبیلوں کی تقسیم کرنے میں ہم نے ابوالفدا اور معارف ابن قتیبہ سے استفادہ کیا ہے۔

١۔ یعرب یا جرہم سے بنو جرہم
٢۔ عبدالشمس بن یشجب سے بنو سبا
٣۔ حمیر ابن سبا سے بنو حمیر
٤۔ کہلان ابن سبا سے بنو کہلان
٥۔ اشعر ابن سبا سے اشعری
٦۔ انمار ابن سبا سے بنو انمار
٧۔ عاملہ بن سبا سے عاملی
٨۔ عدی بن انمار بن سبا سے بنو جذام
٩۔ لخم بن عدی سے لخمی
١٠۔ جذام ابن عدی سے بنو جذام
١١۔ حدس ابن لخم سے بنو حدس
١٢۔ غنم ابن لخم سے بنو غنم
١٣۔ بنو الدار بن ہانی بن لخم سے داری
١٤۔ غطفان ابن حیرام ابن جذام سے بنو غطفان

قبائل ذیل بنو غطفان کی نسل میں ہیں

١٥۔ بنو ھلہ
١٦۔ بنو احنف
١٧۔ بنو الھیب
١٨۔ بنو ہدالہ
١٩۔ بنو نفاشہ
٢٠۔ بنو ضلیع
٢١۔ بنو اعایزہ
٢٢۔ بنو شبرہ
٢٣۔ بنو عبداللہ
٢٤۔ بنو الحضرہ
٢٥۔ بنو سلیم
٢٦۔ بنو بحالہ
٢٧۔ بنو غنم
٢٨۔ بنو النفالہ
٢٩۔ سعد بن مالک بن حیرام سے بنو اسد
٣٠۔ وائل بن مالک سے بنو وائل

قبائل ذیل بنو سعد کی نسل میں ہیں

٣١۔ بنو عوف
٣٢۔ بنو عایزہ
٣٣۔ بنو فہیرہ
٣٤۔ بنو صبجہ
٣٥۔ بنو الاخنس
٣٦۔ بنو حی
٣٧۔ حشم بن جذام سے حشمی
٣٨۔ حطمہ بن جذام سے بنو حطمہ

قبائل ذیل بنوانمار کی نسل میں ہیں

۳۹۔ خثعمی
۴۰۔ بجیلی
۴۱۔ قسری
۴۲۔ بنواحمس
۴۳۔ دہمان بن عامر بن حمیر سے دہمانی
۴۴۔ تحصب بن دہمان سے تحصبی
۴۵۔ اسلف بن سعد بن حمیر سے سلفی
۴۶۔ اسلم بن سعد سے اسلمی
۴۷۔ رعین بن حرث بن عمرو بن حمیر سے آل ذی رعین
۴۸۔ قضاعہ بن مالک بن حمیر سے بنوقضاعہ

قبائل ذیل قضاعہ کی نسل میں ہیں

۴۹۔ کلب ابن دبرہ سے بنوکلب
۵۰۔ عدی ابن حیاب سے بنوعدی
۵۱۔ علیم ابن حیاب سے بنوعلیم
۵۲۔ بنوالعبید
۵۳۔ بنورفیدہ
۵۴۔ بنومصر
۵۵۔ بنوالقین
۵۶۔ بنوسلیح
۵۷۔ بنوتنوخ
۵۸۔ جرم ابن ربان سے بنوجرم
۵۹۔ راسب ابن جرم سے راسبی
۶۰۔ بنوبہراء
۶۱۔ بنوبلی
۶۲۔ بنومہرہ
۶۳۔ بنوعذرہ
۶۴۔ بنوسعد
۶۵۔ بنوہذیم عبدحبشی
۶۶۔ خنہ ابن سعد سے خنی
۶۷۔ سلامان ابن سعد سے سلامانی
۶۸۔ بنوجہینہ
۶۹۔ بنونہد
۷۰۔ التبابعہ

قبائل ذیل التبابعہ کی نسل میں ہیں

۷۱۔ ذوقلاع
۷۲۔ ذونواس
۷۳۔ دواصبح
۷۴۔ ذوجدن
۷۵۔ ذوقایش
۷۶۔ ذویزن
۷۷۔ ذوجوش
۷۸۔ بنواشحول
۷۹۔ وائلہ ابن حمیر سے بنووائل
۸۰۔ سکاسک بن وایلہ سے بنوسکاسک
۸۱۔ عوف بن حمیر سے بنوعوف
۸۲۔ فاران ابن عوف سے بنوفاران
۸۳۔ طے بن ادو کہلانی سے طائی
۸۴۔ غوث بن ادو سے غوثی

قبائل ذیل طائی کی نسل میں ہیں

۸۵۔ بنو نبہان
۸۶۔ بنو ثعل
۸۷۔ حاتمی
۸۸۔ بنو الغس
۸۹۔ بنو تیم
۹۰۔ ثور بن مالک بن مرتہ کہلانی سے ثوری
۹۱۔ کندہ بن ثور سے کندی
۹۲۔ سکون بن کندہ سے سکونی
۹۳۔ اوسلہ بن بیعہ بن خیار بن مالک کہلانی سے اوسلی
۹۴۔ ہمدانی
۹۵۔ سبعی
۹۶۔ وداعہ
۹۷۔ مذحج بن یہابر بن مالک کہلانی سے مذحج
۹۸۔ مراد بن مذحج سے مرادی
۹۹۔ سعد بن مذحج سے سعدی یا سعد العشیرہ
۱۰۰۔ خالد بن مذحج سے بنو خالد
۱۰۱۔ عنس بن مذحج سے عنسی
۱۰۲۔ جعفی بن سعد سے جعفی
۱۰۳۔ جب بن سعد سے جنبی
۱۰۴۔ حکم بن سعد سے حکمی
۱۰۵۔ عایذ اللہ بن سعد سے عایذی
۱۰۶۔ جمل بن سعد سے جملی
۱۰۷۔ مران بن جعفی سے مرانی
۱۰۸۔ حریم بن جعفی سے حریمی
۱۰۹۔ زبید بن سعد سے زبیدی
۱۱۰۔ جدیلہ بن حارجہ بن سعد سے جدیلی
۱۱۱۔ ابوخولان بن عمرو بن سعد سے خولانی
۱۱۲۔ انعم بن مراد بن مذحج سے انعمی
۱۱۳۔ نخع بن جسر بن اولہ بن خالد بن مرحج سے نخعی
۱۱۴۔ کعب بن عمرو سے بنو النار
۱۱۵۔ کعب بن عمرو سے بنو لحماس
۱۱۶۔ بنو قتان
۱۱۷۔ الازد بن غوث کہلانی سے ازدی
۱۱۸۔ مازدن ازد سے مازنی یا غسانی
۱۱۹۔ دوس بن ازد سے دوسی
۱۲۰۔ ہنو بن ازد سے ہنوئی
۱۲۱۔ جفنہ بن ازد مازنی سے جفنی
۱۲۲۔ آل عنقا
۱۲۳۔ آل محرق
۱۲۴۔ جبلی
۱۲۵۔ سلامان ابن میدعن بن ازد سے سلامانی
۱۲۶۔ دوس بن عدثان بن زہران الازدی سے دوس عدثی
۱۲۷۔ جذیمہ بن مالک بن فہم بن غنم بن دوس سے جذیمی
۱۲۸۔ جہاضم بن مالک سے جہاضمی
۱۲۹۔ سلیمہ بن مالک سے سلیمی
۱۳۰۔ ہنابہ مالک سے بنو ہنابہ
۱۳۱۔ معین بن مالک سے معینی
۱۳۲۔ یحمد بن معین سے بنو یحمد

قبائل ذیل ازد کی نسل میں ہیں

۱۳۳۔ المغطریف
۱۳۴۔ بنو یشکر

۱۳۵۔ بنوالجدرہ
۱۳۶۔ لہب بن عامر سے بنولہب
۱۳۷۔ غامد بن عامر سے غامدی

قبائل ذیل عبداللہ بن ازد کی نسل میں ہیں

۱۳۸۔ قسامی
۱۳۹۔ بنوعتیک
۱۴۰۔ بنوبارق
۱۴۱۔ بنوعیف
۱۴۲۔ شہران بن عوف سے بنوشہران
۱۴۳۔ طاحیہ بن سود سے بنوطاحیہ
۱۴۴۔ بنوہداد
۱۴۵۔ خزاعی
۱۴۶۔ قمیری
۱۴۷۔ بنوحلیل
۱۴۸۔ بنوالمصطلق
۱۴۹۔ بنوالکعب
۱۵۰۔ بنوالملیح
۱۵۱۔ بنوعدی
۱۵۲۔ بنوسعد
۱۵۳۔ اسلمی
۱۵۴۔ جشمی
۱۵۵۔ خزرج بن سالبۃ العنقا سے خزرجی

قبائل ذیل خزرج کی نسل میں ہیں

۱۵۶۔ جشمی
۱۵۷۔ بنوتزید
۱۵۸۔ سلمی
۱۵۹۔ بنوبیاضہ
۱۶۰۔ بنوسالم
۱۶۱۔ بنوالجبلی
۱۶۲۔ القرافل
۱۶۳۔ بنوالنجار
۱۶۴۔ بنوساعدہ

قبائل ذیل اوس کی نسل میں ہیں

۱۶۵۔ اشہلی
۱۶۶۔ بنوظفر
۱۶۷۔ بنوالحارثہ
۱۶۸۔ اہل قبا
۱۶۹۔ جحجبی
۱۷۰۔ بعادرہ
۱۷۱۔ بنوواقف
۱۷۲۔ سلمی
۱۷۳۔ بنوخطمہ

ہم اس مقام پر عرب العاربہ کے قبائل کا ایک شجرہ لکھتے ہیں جس سے مذکورہ بالا بیان کے سمجھنے میں آسانی ہوگی اور ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ کون سا قبیلہ کس قبیلے سے نکلا ہے۔

سوم
عرب المستعربہ یعنی پردیسی عرب

عرب المستعربہ کے تمام قبیلے ایک ہی اصل سے نکلے ہیں ان کا نسب ترح بن ناحور بن ساروغ بن راعو بن فالغ بن عبیر بن شالح بن ارفخشد بن سام تک پہنچتا ہے۔ ترح کی اولاد جو عرب میں آباد ہوئی پانچ شاخوں میں منقسم تھی اور اسی وجہ سے عرب المستعربہ بھی پانچ شاخوں میں منقسم ہیں۔

اول: اسمٰعیلی یا بنی اسمٰعیل بن ابراہیم بن ترح۔ (سفر تکوین باب آیت ۲۸' باب ۲۶ آیت ۱۵)

دوم: ابراہیمی یا بنی قطورہ یعنی ابراہیم بن ترح کی اولاد قطورہ کے سلسلہ سے (سفر تکوین باب ۱۱ آیت ۲۸ و باب ۲۵ آیت ۱)

سوم: ادومی یا بنی عیسو یعنی اولاد ادوم بن اسحاق بن ابراہیم بن ترح۔ (سفر تکوین باب ۱۱ آیت ۲۸'۲۹)

چہارم: ناحوری یا بنی ناحور یعنی اولاد ناحور برادر ابراہیم بن ترح۔ (سفر تکوین باب ۱۱ آیت ۲۸'۲۹' باب ۱۹ آیت ۳۰'۲۸)

اب ہم اس مقام پر ہر ایک مذکورہ بالا قبیلہ کا علیحدہ علیحدہ بیان کریں گے اور اسی درمیان میں یہ بھی ثابت کریں گے کہ "فاران" جہاں سے ربانی ہدایت کے چمکنے کی توریت مقدس میں پیشین گوئی کی گئی تھی وہ جگہ حجاز اور بالخصوص مکہ کے متصل کے پہاڑ ہیں اور اس خطبہ میں اسی امر کا ثابت کرنا مقصود اصلی ہے۔

اول اسمٰعیلی یا بنی اسمٰعیل

تمام مؤرخ مسلمان اور غیر مسلمان سب کے سب اس امر پر متفق ہیں کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد عرب میں آباد ہوئی اور ملک عرب کا ایک بڑا حصہ حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں کی نسل سے معمور ہو گیا۔ ان میں جو کچھ اختلاف ہے وہ ان کے مقام سکونت میں ہے اس لئے ہم ان کے مقام سکونت کو اس مقام پر تحقیقات کریں گے۔

توریت مقدس میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کے نکالے جانے کے واقعہ کو اس طرح پر بیان کیا ہے "وسارہ پسر ہاجرہ مصری راکہ بجہت ابراہیم زائیدہ شدہ بود دید کہ استہزا می نماید۔ وبا ابراہیم گفت کہ ایں کنیزک و پسر اورا اخراج نما زیرا کہ پسر ایں کنیزک با پسر من اسحٰق وارث نخواہد شد۔ وایں سخن در نظر ابراہیم بسیار ناخوش آمد بہ سبب پسرش۔ وخدا با ابراہیم گفت بجہت ایں جوان وکنیزکت در نظرت ناخوش نیاید ہر چہ کہ سارہ با تو گفتہ باشد قولش را استماع نما زیرا کہ ذریعہ تو از اسحٰق خواندہ میشود واز پسر کنیزک نیز امتے خواہم گردانید زیرا کہ از نسل تست' وابراہیم در صبحدم سحر خیزی نمودہ نان ومطہرہ آب را گرفتہ بہاجرہ دادہ بدوشش گذاشت وہم پسرش را (بادادہ) واورا روانہ نمود پس راہی شدہ در بیابان بیر شبع سرگرداں شد' وآبے کہ در مطہرہ بود تمام شد و پسر را در زیر بوتہ از بوتہا گذاشت۔ وروانہ شدہ در برابرش بمسافت یک تیر پرتاب نشست وگفت کہ مرگ پسر را نہ بینم و در برابرش نشستہ آواز خود را بلند کردہ گریست۔ وخدا آواز پسر را شنید وملک خدا ہاجر را از آسمان آواز دادہ باو گفت کہ اے ہاجر ترا چہ واقع شد مترس زیرا کہ خدا آواز پسر را در جائے بودنش شنیدہ است۔ برخیز و پسر را بردار و بدستت اورا نگیر زیرا کہ اورا امت عظیم خواہم کرد۔ وخدا چشمان اورا کشادہ کرد و چاہ آبے دید وروانہ شدہ مطہرہ را از آب پر کرد و بہ پسر نوشانید' وخدا با پسر بود کہ نشو ونما نمود و در بیابان ساکن شدہ تیر انداز گردید۔ و

در بیابان پاران ساکن شدو مادرش از برایش از دیار مصر زنے گرفت'' (سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۹ لغایت ۲۱)

اس عبرانی لفظ کا انگریزی میں بوتل ترجمہ کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ قدیم عربی ترجمہ میں ''سقاء'' ترجمہ کیا گیا ہے اور فارسی ترجمہ میں ''مطہرہ'' اردو میں اس کا ترجمہ ''مشکیزہ'' یا ''چھاگل'' صحیح ترجمہ ہے جو مشرقی ملکوں میں مروج ہے اور جس میں چندروز کے پینے کے لائق پانی سماسکتا ہے۔

اس واقعہ کی نسبت مسلمانوں کی متبرک کتابوں میں بھی چند روایتیں آئی ہیں اور جو کہ صحیح بخاری مسلمانوں میں سب سے معتبر کتاب ہے اس میں دو روایتیں اس واقعہ کی نسبت آئی ہیں۔ اس لئے ان دونوں کو اس مقام پر نقل کیا جاتا ہے۔

ان دونوں روایتوں میں اختلاف ہے۔ ایک میں ایک مضمون ہے اور ایک میں نہیں۔ ایک میں کچھ بیان ہوا ہے اور ایک میں کچھ۔ اس لئے ہم دونوں روایتوں کو دو مقابل کے کالموں میں اس طرح پر لکھیں گے کہ جو اختلاف ان دونوں میں ہے وہ بجز د دیکھنے کے معلوم ہو جائے۔

یہ بات کہنی کہ یہ حدیثیں بخاری میں ہیں اور ضرور ہے کہ ان کو صحیح مانا جائے صرف ایک فرضی بات ہے ورنہ جو اصول کہ حدیث کے ثبوت کے لئے قرار پائے ہیں ان کے مطابق اس روایت کا پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا جانا ثابت نہیں ہے یہ دونوں روایتیں ابن عباس نے بیان کی ہیں اور یہ نہیں بیان کیا کہ انہوں نے کس سے سنیں اور اس لئے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ درحقیقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فرمایا تھا بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں یہودیوں میں مشہور تھیں انہیں کو ابن عباس نے بیان کیا ہے پس وہ روایتیں ایک مقامی روایتوں سے زیادہ معتبر ہونے کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ بخاری میں اس طرح پر روایتیں مندرج ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ درحقیقت وہ پیغمبر کی حدیث ہے بلکہ صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ بخاری نے جس شخص سے اس کو سنا اس نے اسی طرح بیان کیا تھا۔

پہلی روایت	دوسری روایت
۱۔ عن ابن عباس قال لما كان بين ابراهيم وبين اهله ما كان خرج باسمٰعيل وام اسمٰعيل	۱۔ قال ابن عباس ما اتخذ النساء المنطق من قبل ام اسمٰعيل اتخذ ت منطقا لتعفى اثرها على سارة ثم جاء بها ابراهيم وبابنها اسمٰعيل"
۲۔ ومعهم شنة ويها ماء	۲۔ ....
۳۔ فجعلت ام اسمٰعيل تشرب من الشنة فيد لبنها على صبيها	۳۔ وهي ترضعه
۴۔ حتى قدم مكة فوضعها تحت دوحة	۴۔ حتى وضعهما عند البيت عند دوحة
۵۔	۵۔ فوق زمزم في على المسجد وليس بمكة يومئذ احد وليس بها ماء فوضعهما هناك
۶۔	۶۔ ووضع عند هما جراباً فيه تمر

٧-	. . . .	٧-	وسقاء فيه ماء
٨-	ثم رجع ابراهيم الى هله فاتبعته	٨-	ثم رجع ابراهيم منطقا فتبعته ام اسمعيل.
٩-	حتى لما بلغوا كداء	٩-	. . . .
١٠-	نادته من ورائه يا ابراهيم الى من تتركنا	١٠-	فقالت يا ابراهيم اين تذهب وتتركنا
١١-	. . . .	١١-	في هذا الوادى الذى ليس فيه انيس ولا شى فقالت له ذلك اوجعل لا يلتفت اليها فقالت الله امرك بهذا.
١٢-	قال الى الله	١٢-	قال نعم
١٣-	قالت رضيت بالله	١٣-	قالت اذن لا يضيعنا
١٤-	قال فرجعت	١٤-	ثم رجعت
١٥-	. . . .	١٥-	فانطلق ابراهيم حتىٰ اذا كان عند الشنيعة حيث لا يرونه استقبل بوجهه البيت ثم دعا بهولاء الدعوات ورفع يديه فقال رب انى اسكنت من ذريتى بوادغير ذى زرع عند بيتك المحرم حتى بلغ يشكرون.
١٦-	فجعلت تشرب من الشنة ويدر لبنها على صبيها حتى لما فنى الماء	١٦-	وجعلت ام اسمعيل ترضعه اسمعيل وتشرب من ذلك الماء حتى اذا نفد ما فى السقاء
١٧-	. . . .	١٧-	عطشت وعطش ابنها وجعلت تنظر اليه يتلوى اوقال يتلبط فانطلقت كراهية ان تنظر اليه.
١٨-	قالت لوذهبت فنظرت لعلى احس احدا قال فذهبت.	١٨-	. . . .
١٩-	فصعدت اصلفا فنظرت و نظرت هل تحس احدا.	١٩-	فوجدت الصفا اقرب جبل فى الارض يليها فقامت عليه ثم استقبلت الوادى تنظر هل ترى احد الملم نزاحدا فهبطت من الصفا.
٢٠-	فلما بلغت الوادى سعت اتت المروة وفعلت ذلك اشراطاً	٢٠-	حتى اذا بلغت الوادى رفعت طرف درعها ثم سعت سعى الانسان المجهود حتى جاوزت الوادى ثم اتت المروة فقامت عليها.
٢١-	. . . .	٢١-	فنظرت هل ترى احد الملم ترا حداً.

۲۲۔	ثم قالت لوذهبت فنظرت ما فعل تعنی الصبی فذهبت فنظرت فاذا هو علیٰ حاله کانه یشنغ للموت فلم تقرها نفسها فقالت لوذهبت فنظرت لعلی احس احدا فذهبت فصعدت الصفا فنظرت ونظرت فلم تحس احدا.	۲۲۔	. . . .
۲۳۔	حتی اتممت سبعاً.	۲۳۔	فعلت ذلک سبع مرات.
۲۴۔	. . . .	۲۴۔	قال ابن عباس قال النبی صلی الله علیه وسلم فذالک سعی الناس بینهما.
۲۵۔	ثم قالت لوذهبت فنظرت ما فعل فاذا هی بصوت.	۲۵۔	فلما اشرفت علی المروة سمعت صوتا.
۲۶۔	. . . .	۲۶۔	فقالت صه ترید نفسها ثم تسمعت ایضا فقالت قد اسمعت.
۲۷۔	فقالت اغث ان کان عندک خیر	۲۷۔	ان کان عندک غواث
۲۸۔	فاذا هو جبریل.	۲۸۔	فاذا هی بالملک عند موضع زمزم.
۲۹۔	قال فقال بعقبه هکذا وغمر عقبه علی الارض قال فانبثق الماء فدهشت ام اسمٰعیل فجعلت تحفر.	۲۹۔	فبث بعقبه اوقال بجناحه حتی ظهر الماء فجعلت تحوضه وتقول بیدها هکذا.
۳۰۔	. . . .	۳۰۔	وجعلت تغرف من الماء فی سقائها وهو یفور بعد ما تغرف.
۳۱۔	قال فقال ابو القاسم صلی الله علیه وسلم لوترکته کان الماء ظاهرا.	۳۱۔	قال ابن عباس قال النبی صلی الله علیه وسلم یرحم الله ام اسمٰعیل لو ترکت زمزم اوقال لولم تغرف من الماء لکانت زمزم عیناً معیناً.
۳۲۔	قال فجعلت تشرب من الماء ویدر لبنها علی صبیها الیٰ اخر الحدیث. (بخاری کتاب الانبیاء)	۳۲۔	قال فشربت وارضعت الیٰ اخر الحدیث. (بخاری کتاب الانبیاء)

مذکورہ بالا روایتوں سے ظاہر ہے کہ وہ مستند نہیں ہیں یعنی حضرت ابن عباس نے اس کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مستند نہیں کیا۔ پس معلوم نہیں کہ ابن عباس نے وہ روایت کس سے سنی اور کس بنیاد پر انہوں نے اس کو بیان کیا۔ بخاری کا ادب صرف اس

بات کا مقتضی ہے کہ ہم تسلیم کر لیں کہ ابن عباس نے سعید ابن جبیر سے یہ روایت بیان کی اور سعید ابن جبیر نے اور لوگوں سے جن سے بخاری تک یہ روایت پہنچی۔ مگر اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ابن عباس نے درحقیقت اس کو پیغمبر خدا ﷺ سے سنا تھا۔

ان روایتوں میں دو فقرے (۴۴، ۳۱) ایسے ہیں جن سے کہ بادی النظر میں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابن عباس نے یہ روایتیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوں گی لیکن یہ بات نہیں ہے کیونکہ ان دونوں فقروں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں فقرے ان روایتوں کے نہیں ہیں اور کسی مقام کے ہیں کیونکہ خود راوی نے ان دونوں فقروں کو سلسلہ بیان روایت سے علیحدہ کر کے اور بالتخصیص انہیں دونوں فقروں کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر کے بیان کیا ہے اور یہ ثبوت اس بات کا ہے کہ راوی نے باقی مضمون کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب نہیں سمجھا ہے۔

ایک اور امر جو ان روایتوں کی صحت پر شبہ ڈالتا ہے یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا " **رب انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی ذرع عند بیتک المحرم**" بیان ہوئی ہے۔ اور راوی نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسمٰعیل کو نکالا تھا اسی زمانہ میں وہ خود مکہ میں ان کے بسانے کو آئے تھے حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے نہ اس زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ ان کو یہاں بسانے کے لئے آئے اور نہ اس زمانہ میں بیت اللہ الحرام بنایا گیا تھا۔ راوی نے دو مختلف زمانوں کے واقعات کو ملا دیا ہے ایک اس زمانہ کے واقعہ کو جبکہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو بیابان بیرشبع میں بے سہارے چھوڑ دیا تھا اور دوسرے اس زمانہ کے واقعہ کو جب کہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل نے زمزم کے پاس سکونت اختیار کر لی تھی اور دوبارہ حضرت ابراہیمؑ ان کے پاس آئے تھے اور بیت اللہ الحرام بنایا تھا اور جاتے وقت یہ دعا مانگی تھی کہ "**رب انی اسکنت من ذریتی بود غیر ذی زرع عند بیتک المحرم**"۔

قرآن مجید میں حضرت اسمٰعیل کی عمر کا جب کہ ان کو حضرت ابراہیمؑ نے نکال دیا کچھ ذکر نہیں۔ بخاری کی ان روایتوں سے جن کا مشتبہ ہونا بخوبی ثابت ہو گیا ہے اگر حضرت اسمٰعیل کی عمر کا کچھ اندازہ ظاہر بھی ہوتا ہو تو بھی مذہب اسلام پر کوئی الزام عاید نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ روایتیں اگر مشتبہ ثابت نہ ہوتیں تو بھی بمنزلہ وحی کے متصور نہیں ہو سکتیں۔

اصل یہ ہے کہ خود توریت مقدس میں حضرت اسمٰعیل کی عمر کی نسبت جب کہ وہ نکالے گئے نہایت اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض درسوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہایت بچے تھے اور بعض سے پایا جاتا ہے کہ وہ سولہ سترہ برس کے تھے۔ اس اختلاف کی بنا پر عرب کے یہودیوں میں ان کا بچہ ہونا مشہور تھا اسی یہودی روایت کو ابن عباس نے بیان کیا ہوگا اور اسی وجہ سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کو منسوب نہیں کیا۔

توریت مقدس میں جو حضرت اسمٰعیل کی عمر کے باب میں اختلاف ہے وہ اس طرح پایا جاتا ہے۔ سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۱۴ کا فارسی ترجمہ جو ہم نے اوپر لکھا ہے وہ یہ ہے " وابراہیم در صبح دم سحر خیزی نمودہ نان و مطہرہ آب را گرفتہ و بہ ہاجرہ دادہ بہ دوشش گذاشت وہم پسرش را (با ودادہ) او را روانہ نمود پس راہی شدہ در بیابان بیرشبع سرگردان شد" اس ترجمہ میں لفظ "باودادہ" دو ہلالی خطوط میں لکھا ہے جس کا یہ اشارہ ہے کہ یہ لفظ اصل عبرانی توریت میں نہیں ہے درحقیقت یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح ترجمہ عبرانی لفظوں کا یہ ہے کہ "پانی کے مشکیزے اور اس کے بیٹے کو ہاجرہ کے کندھے پر رکھ کر اس کو روانہ کر دیا۔" اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ ان کی عمر بہت چھوٹی تھی۔ اور اسی وجہ سے لوگوں نے دودھ پیتا ہوا خیال کیا تھا۔ حالانکہ اسی باب کی چودھویں آیت اس کے برخلاف ہے۔

عیسائی عالموں نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اس چودھویں آیت سے بلاشبہ حضرت اسمٰعیل کی اس زمانہ میں بہت چھوٹی عمر ہونا پایا جاتا ہے جو توریت کی بہت سی آیتوں کے برخلاف ہے۔ اس لئے انہوں نے اس کی نسبت بہت کچھ بحث کی ہے۔

مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ ''اگر ہم حضرت اسمٰعیل کی عمر پر غور کریں تو رنج آگین شوق اور بھی دوبالا ہوتا ہے۔ یہ لڑکا اب کچھ بچہ نہیں تھا بلکہ کم از کم پندرھویں برس میں تھا مگر تکلیف کی وجہ سے بچہ کی طرح مضغہ سا ہو رہا تھا معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں اس کی بچاری ماں جب تک کہ اس کو طاقت رہی ہوگی۔ اس کو ہاتھوں میں اٹھائے رہی ہوگی اور جب وہ تھک گئی ہوگی تو اس کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ہوگا (مگر ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ تاویل کیسی لغو اور بیہودہ ہے) اس کے بعد مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ ٹھیک ٹھیک عمر حضرت اسمٰعیل کی باآسانی معلوم ہو سکتی ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کا ختنہ ہوا تھا حضرت اسحٰقؑ اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ اس کے اگلے سال پیدا ہوئے ہیں اور حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے بیابان میں بھیجے جانے سے پیشتر ان کا یعنی حضرت اسحٰقؑ کا دودھ چھوٹ چکا تھا'' (فارسٹر صاحب کا تاریخی جغرافیہ عرب صفحہ ۱۷۶)۔

توریت اور انجیل کے اکثر محققین اور علی الخصوص ''جیروم لی کلوک'' اور ''روزن ملر'' خیال کرتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل کی عمر اس وقت سترہ برس کی تھی۔ اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت ہاجرہ نے ان کو اپنے کندھے پر رکھ لیا ہو۔

جیسی بیہودہ تاویل مسٹر فارسٹر نے کی ہے اس سے زیادہ عجیب تاویل ''بشپ ہارسلی'' نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''عبرانی توریت کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کو اس کی ماں نے مع روٹی اور پانی کے کندھے پر رکھ لیا۔ یہی معنی یونانی ترجمہ میں بھی سمجھے گئے ہیں اور یہ جملہ بھی کہ بچہ کو جھاڑی میں ڈال دیا جو پندرھویں آیت میں ہے اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔ حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کے وقت حضرت اسمٰعیلؑ کی عمر چودہ برس سے کم نہ تھی اس واسطے ان کی ولادت کے وقت کم سے کم وہ پندرہ سال کے ہوں گے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حیات انسانی گو اس زمانہ میں بہت مختصر رہ گئی ہے تاہم زمانہ حال کی مدت عمر سے زیادہ دراز ہوتی ہوگی اور چونکہ طفولیت اور ہر ایک درمیانی زمانہ عمر کی حالت تمام عمر کے مجموعہ کے ساتھ جب کہ آدمی ڈیڑھ سو برس یا زیادہ عمر کے ہوتے تھے ہمیشہ کوئی معین مناسبت رکھتی ہوگی اس لئے قرین قیاس ہے کہ اس زمانہ میں چودہ یا سولہ برس کی عمر تک ضعیف اور ناتواں رہتے ہوں گے اور میرے نزدیک اس قصہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بیٹوں کے زمانہ میں یہی صورت ہوگی۔ جو شخص کے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی کیونکہ اس کا صریح بیان ہے کہ حضرت اسمٰعیل اس وقت تنہا نہیں جا سکتے تھے' مگر یہ دلیل کیسی بیہودہ ہے کیونکہ تین ہی پشتوں کے بعد یہ سب باتیں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اس لئے کہ حضرت یوسف حضرت ابراہیمؑ کے پوتے کے بیٹے سترہ برس کی عمر میں اپنے بھائیوں کے ساتھ باپ کے مویشی چرایا کرتے تھے اور تیس برس کی عمر میں عزیز مصر کے خواب کی تعبیر بیان کی تھی اور اس کے وزیر ہو گئے تھے۔

اسی مضمون پر ایک اور مصنف یہ لکھتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل گو بچہ کہلاتے تھے مگر سولہ سترہ برس کے ہوں گے اور اس لئے اپنی والدہ کی اعانت اور مدد کرنے کے قابل ہوں گے جس طرح کہ انہوں نے بعد کو کی۔

ایک اور مصنف کہتا ہے کہ اس جملہ کو ''کندھے پر رکھ دیا'' خطوط ہلالی کے اندر رکھ دیا جاتا جیسا کہ ''بشپ کڈریہ'' اور ''اسٹیک ہوس'' اور بائبل نے کیا ہے (جس سے اشارہ ہوتا کہ یہ لفظ توریت میں نہیں ہیں) تو یہ آیت مشتبہ نہ ہوتی۔

اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی پہلی بیوی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بیوی ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسمٰعیلؑ

کو جو ہوشیار اور بڑے ہو گئے تھے گھر سے نکال دیا۔ اور وہ دونوں بیابان بیرشبع میں چلے گئے۔ چلتے چلتے اور منزلیں طے کرتے ہوئے وہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں اب مکہ معظمہ ہے۔ پیاس کی شدت سے حضرت اسمٰعیل کی حالت خراب ہوگئی اور مرنے کی نوبت پہنچ گئی۔ حضرت ہاجرہ جوان کو ایک درخت کے سایہ میں بٹھا کر پانی کی تلاش کو ادھر ادھر دوڑتی پھریں اور بمشکل پانی ملا اور جہاں پانی ملا تھا اسی جگہ انہوں نے سکونت اختیار کر لی کیونکہ عرب میں اسی جگہ لوگ سکونت اختیار کرتے تھے جہاں پانی دستیاب ہوتا تھا۔

قرآن مجید سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے اس میں یہ آیت ہے "ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم" اس سے ظاہر ہے کہ حضرت اسماعیل اس مقام کے پاس سکونت پذیر ہوئے تھے جہاں کہ بالفعل خانہ کعبہ واقع ہے اور جہاں اب شہر مکہ آباد ہے۔ عبرانی لفظ مدبر اور عربی لفظ وادی اور الفاظ "غیر ذی زرع" جو قرآن مجید میں آئے ہیں ایک ہی معنی رکھتے ہیں لفظ فاران اور لفظ ایل فاران جو سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۲۱ اور باب ۱۴ آیت ۶ میں آیا ہے ان دونوں سے ایک ہی مقام مراد ہے اور لفظ ایل پاران سے بالتخصیص وہ پہاڑ مراد ہیں جو کعبہ کے گرد واقع ہیں اور صفا اور مروہ اور ابوقبیس اور حرا وغیرہ کے نام سے مشہور ہیں۔ عبرانی زبان میں "ایل" کے معنی خدا کے ہیں فاران کے پہلے "ایل" لفظ لگانے سے انسان کا دل اس کی وجہ سے اس کی تفتیش پر متوجہ ہوتا ہے اور اس پر قرار پاتا ہے کہ اس جگہ ضرور کوئی ربانی کرشمہ ظاہر ہوا ہے یا ظاہر ہونے والا ہے۔ خانہ کعبہ کے گرد جو پہاڑ ہیں اور جہاں کہ مسلمان حج ادا کرتے ہیں علی العموم بنام "الال" مشہور ہیں بعض صرف ونحو کے عالموں نے "الال" کو واحد لکھا ہے اور بعضوں کے نزدیک جمع کا صیغہ ہے۔ اس لفظ کے صحیح اشتقاق کی نسبت بہت بحث ہے بعض کچھ کہتے ہیں اور بعض کچھ مگر کوئی بات اطمینان کے قابل نہیں ہے ہماری رائے میں کچھ شک نہیں ہے کہ یہ اسی لفظ "ایل" سے مشتق ہوا ہے ابتدا میں پہاڑ کے نام کے ساتھ اس کا استعمال تھا بمعنی کوہ خدا پھر جو کہ ایل فاران خاص حجاز میں تھا عربوں نے اس نواح کے تمام پہاڑوں کے لئے "ایل" کی جمع "الال" بنالی اور مکہ کے پہاڑوں پر اس کا اطلاق کرنے لگے۔

اگر چہ واقعات مندرجہ توریت مقدس اور قرآن مجید جن کا ہم نے اوپر بیان کیا آپس میں مطابقت رکھتے ہیں تاہم تین بڑے بڑے سوالات ہیں جو حضرت اسماعیل کی سکونت سے علاقہ رکھتے ہیں۔

اول یہ کہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ کو گھر سے نکال دینے کے بعد کہاں چھوڑا تھا۔

دوم یہ کہ حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ نے بیابان میں آوارگی کے بعد کس جگہ سکونت اختیار کی۔

سوم یہ کہ آیا وہ اسی جگہ متوطن ہوئیں جہاں کہ پہلے پہل ٹھہری تھیں یا کسی اور جگہ

قرآن مجید میں ان امور کی بابت کچھ تذکرہ نہیں ہے لیکن بعض ملکی روایتوں اور چند حدیثوں میں اس کا بیان ہے۔ وہ حدیثیں غیر مستند ہیں اور اس وجہ سے راویوں کا سلسلہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک نہیں پہنچتا اور جو کہ مقامی روایتوں میں ان واقعات کو جو مختلف موقعوں پر واقع ہوئے تھے خلط ملط کر دیا ہے اس لئے ان پر اعتبار نہیں ہو سکتا۔ پس ہمارے نزدیک اول سوال کی نسبت جو کچھ توریت مقدس میں لکھا ہے اس سے زیادہ بحث کرنی فضول ہے۔ توریت میں لکھا ہے کہ "اس نے ابراہیم نے کو یعنی ہاجرہ کو روانہ کر دیا اور چلی گئی اور بیابان بیرشبع میں پھرتی رہی" (سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۱۴)۔

دو باقی ماندہ سوالوں کے باب میں توریت مقدس کی عبارت اس طرح پر ہے کہ ایک جگہ لکھا ہے "اور وہ یعنی اسماعیل بڑا ہوا اور بیابان میں سکونت پذیر ہوا اور ایک تیرانداز ہو گیا" (سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۲۰) اور دوسری جگہ لکھا ہے کہ "اس نے یعنی اسماعیل

نے بیابان فاران میں سکونت اختیار کی'' (سفرتکوین باب ۱۲ آیت ۲۱) توریت کا کوئی مفسر نہیں بیان کرتا اور نہ ملکی روایت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت اسماعیل پہلی کسی ملک میں آباد ہوئے ہوں اور پھر کسی اور ملک میں چلے گئے ہوں اس لئے یہ بات تسلیم کرنی ضرور ہے کہ حضرت اسماعیل اوران کی والدہ جس حصہ ملک میں آباد ہوئی تھیں اسی میں آباد رہیں پس توریت میں جہاں صرف بیابان میں آباد ہونے کا ذکر ہے سے بیابان فاران ہی مراد ہے جس کی تصریح دوسرے آیت میں کی گئی ہے۔ پس ان سوالوں کا حل کرنا اس بات کی تحقیق پر منحصر ہے کہ بیابان فاران جہاں کہ حضرت اسماعیل کا سکونت پذیر ہونا بیان کیا گیا ہے کون سی جگہ ہے

مشرقی جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ تین مقام بنام فاران موسوم ہیں اول وہ مقام اوراس کے گردونواح کے پہاڑ جہاں اب شہر مکہ واقع ہے کیونکہ اس زمانہ میں وہ بیابان تھا۔ دوم وہ پہاڑ اور گاؤں جو مشرقی حصہ مصر یا عرب الحجر میں واقع ہے۔ سوم ایک ضلع جو سمرقند کی نواح میں واقع ہے۔

مشرقی جغرافیہ دانوں نے جو کچھ فاران کی نسبت لکھا ہے اس کو ذیل میں مندرج کرتے ہیں۔

فاران المذكور في التوراة في قوله جاء الله من سينا واشرف من ساعير و استعلن من فاران فساعير جبال فلسطين وهو انزاله الانجيل على عيسى وفاران مكة او جبالها على ما تشهد به التوراة استعلائه منها انزاله القران على رسوله محمد صلى الله عليه وسلم وفاران قرية من نواحي سغد من اعمال سمر قند وقيل فاران والطور كورتان من كور مصر قبله. مواصد الاطلاع الى اسماء الامكنة والبقاع ـــ معجم البلدان ياقوت حموى.

والطو رجبل بارض مصر عند كورة تشمل على عدة قرى تبليها وبالقرب منها جبل فاران ـــ مراصد الا طلاع ومعجم البلدان.

فاران ثلثة مواضع فاران اسم جبال مكة وقيل لها اسم جبال الحجاز ولها ذكر في التوراة يجي في اعلان نبوة النبي صلى الله عليه وسلم قال الا مير ابو نصر ابن ماكو لا ابو بكر نصر بن القاسم بن قضاعة القضاعي الفاراني الاسكندري سمعت ان ذلک نسبة الى جبال فاران وهي الحجاز و فاران قال ابو عبدالله القضاعي في كتاب خطط مصر فاران والطور كورتان من كور مصر القبلية وفاران من قرى سمر قند ـــ مشترک يا قوت الحموى.

الطور سبعة مواضع والطور ايضا علم لجبل بعينه عند كورة تشتمل على عدة قرى بارض مصر من جهته القبلية بينها و بين جبل الفاران مشترک.

وطريق اخر على ساحل البحر القلزمي...... من مصرا لى عين شمس...... ثم الى بطن مغيرة...... ثم الى جرن فاران...... وبالقرب من فاران موضع صعب اذا سلک والريح ايضا مغربا والدبرر مشرقا ويسمى جبلان من جبلان الى جبل الطور الى ايله الخ. نزهة المشتان شريف الادريسي.

مجھے معلوم نہیں کہ کسی غیر ملک اور مذہب کے مؤرخ نے فاران اور حجاز کو جہاں اب مکہ معظمہ واقع ہے ایک ہی قرار دیا ہو لیکن

عربی ترجمہ رویت سامری میں جس کو آرکوئی ٹن صاحب نے ۱۸۵۱ء میں بمقام لگدنی بناورم چھپوایا ہے اس میں فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لی ہے اور فاران کے لفظ کے آگے خطوط ہلالی میں حجاز کا لفظ لکھ دیا ہے اور وہ عبارت یہ ہے:

اوسکن فی یریة فران (الحجاز) واخذت له امه امراة من ارض مصر (عربی ترجمه توراة سامری)

عموماً عیسائی مورخ اس بات کو کہ فاران اور حجاز ایک ہی جگہ سے مراد ہے تسلیم نہیں کرتے اس تسلیم نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو تسلیم کر لیں تو اس بات کی تسلیم بھی لازم آتی ہے کہ جو پیشینگوئی توریت میں فاران کی نسبت بیان ہوئی ہے بلاشبہ اس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا مراد ہے۔

بہر حال ان مصنفوں کا فاران کی نسبت مختلف طرح کا بیان ہے۔

اول: یہ کہ بعض کہتے ہیں کہ فاران وہ وسیع قطعہ زمین ہے جو بیر شبع کی شمالی حد سے لے کر کوہ سینا تک چلا گیا ہے اور فاران کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی حدود اربعہ عموماً یہ بتلاتے ہیں شمال میں کنعان جنوب میں کوہ سینا، مغرب میں مصر اور مشرق میں کوہ سعیر۔ اس میں بیشمار چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں جن کو ملا کر کل بیابان بنتا ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے بیابان علیحدہ علیحدہ ناموں سے معروف ہیں مثلاً شور، بیر شبع، ایثام، سین، زین، عیدام وغیرہ۔

دوم: بعض مصنفوں کا گمان ہے کہ قادیش جہاں کہ حضرت ابراہیم نے ایک کنواں موسوم بہ بیر شبع کھودا تھا اور فاران ایک ہی مقام ہے۔

سوم: بعضوں کی یہ رائے ہے کہ فاران اس بیابان کا نام ہے جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے۔[1] بیشمار عمارتوں اور پرانی

---

[1] یہ ایک ایسا نام ہے جس کا اطلاق توریت میں اس سارے صحرا پر معلوم ہوتا ہے جو یہودیہ کی سرحد سے لے کر حوالی سینا تک پھیلتا ہے۔ جو کہ ہم فاران کو حوالی سینا کے جنوب کے قطع میں (سفر اعداد باب ۱ آیت ۱۲) اور شمالی جانب قادیش سے (سفر اعداد باب ۱۳ آیت ۲۶) ملحق اور اور جگہ بھی پاتے ہیں اس لئے اس بات کا فرض کر لینا کہ فاران اس تمام قطعہ کا نام تھا جو ان حدود سے محدود ہے آسان معلوم ہوتا ہے بہ نسبت اس کے کہ مقابل کے دو قطعوں کا ایک ہی نام قرار دیں۔ اس لحاظ سے وہ وقت جو اس نام کی صحیح صحیح تطبیق میں عارض ہوتی تھی ظاہر ہو گئی ہے جبکہ یہ دیکھا جائے کہ سب جداگانہ مقامات جو مختلف مصنفوں نے اس کے واسطے قرار دیئے ہیں۔ اس قدر ے وسیع قطع میں مجتمع ہوتے ہیں جو کہ ہمارے نزدیک اس کا مصداق ہے یہ نام وادی فاران میں بھی بخوبی موجود ہے جو سینائے اسفل کی ایک وادی ہے۔ اور جس میں ہو کر بنی اسرائیل ہنگام کوچ بجانب ممالک اعلیٰ گزرتے تھے (کیتوز سائیکلو پیڈیا آف بائبل)

ایک بیابان فلسطین کے جنوب کی جانب جہاں کہ حضرت اسمٰعیل سکونت پذیر ہوئے تھے (سفر تکوین بات ۲۱ آیت ۲۱) جس کے مغرب میں ہلال اور بلق شمال میں یہودیہ کے جنوبی پہاڑ اور مشرق میں قادیش کا بیابان اور اس کے پہاڑ یہ ایل پاران یا بیابان پاران ہے (سفر تکوین باب ۱۴ آیت ۶) نیز وہ ملک جس کے بعض اقطاع میں موسم برشکال میں گھاس اور سبزہ بہت ہوتا ہے جہاں حضرت ابراہیم نے بود و باش اختیار کی تھی قادیش اور شور کے مابین اور جہاں کہ بنی اسرائیل کا قادیش کو جاتے وقت گزر ہوا تھا۔ (سفر اعداد باب ۲۱ آیت ۱۶، باب ۱۳ آیت ۲۸) بیابان فاران سے مراد ان پہاڑوں سے بھی ہو سکتی ہے جو اس میدان کے مشرق کی جانب اور بیابان قادیش کے جنوب کی طرف واقع ہیں۔ یا بیابان قادیش یا بیابان فاران بھی میدان ملحق کی وجہ سے کہلاتا تھا۔ جس طرح وہ بھی قادیش کے نام سے بوجہ چشمہ قادیش کے مشہور تھا۔ (پیپلز بائبل ڈکشنری)

قبروں اور میناروں وغیرہ کے آثار وہاں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ مسٹر روپر کا بیان ہے کہ میں نے ایک کلیسا کے نشانات جو پانچویں صدی عیسوی میں بنایا گیا ہوگا۔ دریافت کئے اور ان کا یہ بھی بیان ہے کہ چوتھی صدی میں اس

مقام پر عیسائی آباد تھے اور ایک بطریق بھی وہاں رہتا تھا۔ان بیانات کی تصدیق کرنے میں اس بات کے خیال میں کہ یہ شہر اس شہر سے مطابقت رکھتا ہے جس کا مشرقی مورخوں نے مشرقی کنارہ مصر پر موجود ہونا بیان کیا ہے ہمیں کچھ بھی کلام نہیں ہے۔

مگر یہ سب بیانات درست نہیں ہیں جن کی غلطی ہم ثابت کریں گے۔اگر چہ پہلے دو بیانات کی تائید میں کسی قسم کی شہادت موجود نہیں ہے اور اس لئے ان کی نسبت صرف یہ کہہ دینا کہ وہ ثابت نہیں ہیں کافی تھا لیکن ہم اس غرض سے کہ ان کے غلط ہونے میں کچھ شبہ باقی نہیں ہے ہم ان کی تردید کرتے ہیں۔

اول بیان کی تردید کے لئے یعنی اس بیان کی تردید کے لئے جس میں فاران کو ایک وسیع بیابان قرار دیا ہے اور اس میں اور چھوٹے چھوٹے بیابان مثل شور اور سینا وغیرہ کے شامل کئے ہیں اس سے بہتر کوئی بات نہیں ہے کہ اس کی تردید میں توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کردیں کیونکہ ان سے صاف منکشف ہوتا ہے کہ فاران خود ایک جداگانہ بیابان ہے اور گرد و نواح کے بیابان اس میں شامل نہیں۔

(الف) ''و بنی اسرائیل از بیابان سینی کوچ نمودند و ابر در بیابان پاران ساکن شد'' (سفر اعداد باب ۱۰ آیت ۱۲)۔اس عبارت سے جس کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بیابان سینا سے کوچ کیا اور بیابان فاران میں مقام کیا اور قرار واقعی ثابت ہوتا ہے کہ وہ دونوں بیابان ایک دوسرے سے علیحدہ اور جدگانہ بیابان تھے۔

(ب) ''پس در سال چہار دہم کدر لاعومر و ملوکے کہ ہمراہش بودند آمدہ رفائیاں را کہ در عشتروت قرنیم و زوزیاں را در ہام و ایمیاں را در شاوہ قریاشایم شکست دادند۔ و نیز حوریاں را در کوہ خود شاں سعیر تا ایل پاران کہ در نزدیک صحرا است'' (سفر تکوین باب ۱۴ آیت ۵'۶)

(ج) ''و خداوند موسیٰ را خطاب کردہ گفت کہ مردمانے بہ سفراست تا آنکہ زمین کنعان را کہ بنی اسرائیل میدہم تجسس نمایند از ہر سبط آبائے ایشاں یک نفرے کہ درمیان ایشاں سرور باشد بفرستید پس موسیٰ ایشاں را بہ فرمان خداوند از بیابان پاران فرستاد و آں مردمان ہمگی روسائے بنی اسرائیل بودند'' (سفر اعداد باب ۱۳ آیت ۱'۲'۳)

(د) ''و روانہ شدہ پیش موسیٰ در ہارون و تمامی جماعت بنی اسرائیل در بیابان پاران بہ قادیش رسیدند و بہ ایشاں و ہم بہ تمامی جماعت خبر رسانند ہم ایشاں میوۂ زمین را نمودند'' (سفر اعداد باب ۱۳ آیت ۲۶)

(ہ) ''کہ گفت خداوندانہ از سینی برآمد و از سعیر برایشاں تجلی کرد و از کوہ پاران درخشندہ شد و با ہزار ہزاراں مقدساں در ورود نمود و از دست راستش بایشاں شریعتے آتشیں رسید'' (سفر توریہ مثنی باب ۳۳ آیت ۲)

(و) ''خداوند از تیمان و قدوس از کوہ پاران آمد۔ سلاہ۔ جلالش آسماں ہارا مستور کرد و زمین از حمدش پر شد'' (کتاب حبقوق باب ۳ آیت ۳)۔''

(ڈ) ''و از مدیان برخاستند و بہ پاران آمدند و مردمان چندے از پاران بہ ہمراہ خود شاں گرفتند و بہ مصر بخدمت فرعون بادشاہ مصر آمدند'' (کتاب اول ملوک باب ۱۱ آیت ۱۸)

اور دوسرے بیان کی یعنی اس کی کہ قادیش اور فاران ایک ہی مقام ہے توریت مقدس کے مندرجہ ذیل درسوں سے تکذیب

ہوتی ہے۔

(الف) ''ونیز حوریاں را درکوہ خوشاں سعیر تا ایل پاراں کہ درنزد یک صحرا است۔ و برگشتہ بہ عین مشپاط کہ قادیش است آمدند و تمامی مرز و بوم عمالیقاں وہم اموریانی کہ در حصصوں تامار ساکن بودند شکست دادند'' (سفر تکوین باب ۱۴ آیت ۶٬ ۷)

یہ ظاہر ہے کہ جب تک قادیش اور فاران دو جداگانہ اور مختلف بیابان نہ قرار دیئے جائیں آیت مذکورہ بالا کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔

(ب) ''وروانہ شدہ پیش موسیٰ و ہارون و تمامی جماعت بنی اسرائیل در بیابان پاران بہ قادیش رسیدند و بہ ایشاں وہم تمامی جماعت خبر رسانند وہم بہ ایشاں میوۂ زمین رانمودند۔'' (سفر اعداد باب ۱۳ آیت ۲۶)

اس آیت میں جن لفظوں کے نیچے ہم نے لکیر کر دی ہے ان کے ترجمہ میں ہم کو شبہ ہے اس لئے ہم اصلی عبرانی عبارت اور اس کا ایک نہایت قدیم ترجمہ عربی کا جو ۱۶۷۱ء میں مع لیٹن ترجمہ کے چھپا ہے اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

وقدموا الی موسی و هارون و جماعة بنی اسرائیل الی بریة فاران الی قادس. (سفر العدد الاصحاح ۱۳٬ ۲۶)

اصل عبرانی عبارت میں صرف یہ لفظ ہیں "ال مدبر فاران قادیش" عربی زبان میں جو قاعدہ بدل اور متبدل منہ کا ہے وہ عبرانی زبان میں نہیں ہے اور اس لئے فاران اور قادیش بدل اور مبدل منہ نہیں ہو سکتے اور ضرور ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی لفظ مقدر مانا جائے فارسی مترجم نے حرف ب کو مقدر مانا ہے اور ''الی قادیس'' ترجمہ کیا ہے۔ اور لیٹن کے مترجم نے جو لفظ مقدر مانا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے ''جو کہ ہے بیچ قادیش کے'' مگر عربی قدیم ترجمہ صحیح معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ فاران کے ماقبل بھی ال یعنی ''الی'' کا لفظ آیا ہے اور وہی لفظ قادیش پر محذوف کر دیا ہے پس اس ترجمہ کے مطابق معنی یہ ہوتے ہیں کہ ''آئے بیابان فاران کی طرف قادیش کی طرف سے یعنی قادیش کے رستہ سے'' اس صورت میں صریح ظاہر ہوتا ہے کہ فاران اور قادیش دو مختلف مقاموں کے نام ہیں اور اسی کی تائید سفر تکوین کے درسوں سے ہوتی ہے جو اوپر مذکور ہوئے ہیں۔

اب ہم کو تیسرے فاران پر غور کرنا چاہیے جس کو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہونا بیان ہوا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہاں ایک مقام ہے جو فاران کے نام سے مشہور ہے مگر سوال یہ ہے کہ آیا وہ وہی بیابان ہے جس کا ذکر سفر تکوین میں آیا ہے کہ حضرت اسمٰعیل صحرائے بیر شبع میں سرگردانی کے بعد وہاں آ کر ٹھہرے تھے اور کیا وہ وہی مقام ہے جہاں حضرت اسمٰعیل فی الحقیقت متوطن ہوئے تھے۔ اس لئے کہ اگر از روئے تجسس اور تفتیش کے یہ ثابت ہو جائے کہ حضرت اسمٰعیل وہاں متوطن نہیں ہوئے تھے تو اس سے لازم آئے گا کہ یہ فاران وہ فاران نہیں ہے جس کا ذکر سفر تکوین میں آیا ہے۔

کوئی ملکی روایت ایسی موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ حضرت اسمٰعیل نے اس جگہ سکونت اختیار کی تھی۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر جو اسی مقام کو حضرت اسمٰعیل کی سکونت کی جگہ خیال کرتے ہیں اور جس قدر دلائل اس کی تائید میں لاتے ہیں وہ کسی قسم کی شہادت پر مبنی نہیں ہیں۔ مگر ہم اس غرض سے کہ ان کے غلط ہونے کچھ شبہ باقی نہ رہے ان دلیلوں کی غلطی بیان کرتے ہیں۔

مصنف موصوف نے سفر تکوین باب ۲۵ آیت ۱۸ پر جس کی یہ عبارت ہے۔ وایشاں از حویلاہ تا شور کہ ہنگام رفتن تو بہ اشور در برابر مصر ست ساکن بودند و مسکن او در حضور تمامی برادرانش افتاد'' استدلال کر کے بیان کیا ہے کہ ''خدائے تعالیٰ کے وعدے اسی

میں ایفا ہو گئے تھے جب کہ اسماعیلیوں کی آبادی شور سے حویلاہ تک انتہائے عرب میں یعنی سرحد مصر سے لے کر دہانہائے فرات تک پھیل گئی تھی۔

اول غلطی صاحب موصوف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دہانہائے [1] فرات پر قرار دیا ہے۔ دراصل حویلاہ جس کے بانی کا نام سفر تکوین باب ۱۰ آیت ۲۹ میں مذکور ہے نواح یمن میں عرض بلد شمالی ۱۷ درجہ ۳۰ دقیقہ اور طول بلد شرقی ۴۲ درجہ ۳۶ دقیقہ پر واقعہ ہے اور اس کی کامل تصدیق عرب کے اس نقشہ کے معائنہ ہو سکتی ہے جو عرب کے جغرافیہ کی شکل کے مطابق ہے۔ واکر صاحب کے نقشہ کلاں سے چھوٹا کر کے بنایا گیا ہے اور اسی کے ساتھ شام اور مصر کے ان اقطاع کو بھی زیر نظر رکھنا چاہیے جن کا نقشہ رورنڈ کارٹرٹ پی کیرے۔ ایم۔ اے نے مرتب کیا ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ مصنف موصوف نے اور عیسائی مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں کی تقلید اختیار کر کے ''شور'' کو عرب الحجر کے مغرب میں قرار دیا ہے جہاں کہ صحرائے ایام واقع ہے اور یہ قطعی غلطی ہے کیونکہ صحرائے ''شور'' سے توریت مقدس میں مراد تمام اس وسیع میدان سے ہے جو شام سے لے کر جانب جنوب ملک مصر تک منتہی ہوتا ہے۔

اصل عبرانی توریت میں صرف دو نام ہیں۔ شور اور اشورہ بغیر الحاق لفظ صحرا کے موجود ہیں۔ ان دونوں ناموں میں سے شور سے مراد شام اور اشورہ سے مراد اسریا ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ بنی اسمٰعیل اس وسیع قطعہ میں آباد ہوئے تھے جو شمالی حدود یمن سے جنوبی سرحد شام تک منتہی ہوتا ہے۔ یہ جگہ اب بنام حجاز معروف ہے اور فاران سے مطابقت رکھتی ہے۔ ہمارے اس نتیجہ کی اس امر سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ یہی سرزمین ٹھیک مصر کے سامنے واقع ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص وہاں سے اسریا کی جانب عزیمت کرے اور توریت مقدس کی اس آیت کی کماحقہ تصدیق ہوتی ہے جہاں لکھا ہے ''جو سامنے مصر کے ہے اگر تو اسریا کی طرف روانہ ہو'' یعنی مصر کے سامنے ہے اگر تم ایک خط مستقیم وہاں سے اسریا تک کھینچو۔

فاران کی حدود دار بعہ جو رورنڈ مسٹر فارسٹر نے بہ حوالہ ڈاکٹر ولز کے قرار دی ہیں کہ اس کے مغرب میں بیابان شور ہے اور مشرق میں کوہ سعیر اور شمال میں ارض کنعان اور جنوب میں بحر احمر ہے یہ حدود بھی بالکل غلط ہیں۔

سینٹ پال حواری نے جو خط گلتیوں کے نام لکھا ہے اس کے چوتھے باب میں بائیسویں آیت سے چھبیسویں آیت تک یہ عبارت مندرج ہے ''یہ لکھا ہے کہ ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ ایک لونڈی سے دوسرا آزاد سے۔ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا

---

[1] رورنڈ مسٹر فارسٹر صاحب حویلاہ کی سکونت کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''ارض حویلاہ سے جو حضرت موسیٰ کے پہلے صحیفہ میں مذکور ہے وہ حصہ عرب کا مراد ہے جو دہانہائے فرات سے ملحق ہے اور جنوب کی جانب ساحل خلیج فارس کے برابر برابر چلا گیا ہے۔ یہ بیان اس بناء پر ہے (اگرچہ ہمارے نزدیک قابل وقعت نہیں ہے) کہ جزیرۂ بحرین میں سب سے مشہور جزیرے ''اوال'' کے نام میں اصلی نام حویلاہ کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس دلیل کے استحکام میں صاحب موصوف یہ بیان کرتے ہیں کہ ''آگے آنے والی مثالوں سے عربی زبان کے استعمال میں جو مختلف تصرفات اس نام میں ہوئے ہیں معلوم ہوں گے جیسے اوال' او آل' حویل' حویلاہ' خر' خط' خولان' چال' چولان' ان لفظوں میں سے بعض لفظ ایک ہی جگہ یا ضلع کے مختلف نام ہیں۔ ایسے عظیم سوالات کا اس طرح پر حل کرنا کامل اور ناطرفدارانہ تحقیقات کے قواعد معینہ کے مطابق صحیح نہیں ہے اور اسی لئے وہ قابل وقعت نہیں ہیں اور اسی باعث ہم نے کہا ہے کہ رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بیان میں غلطی کی ہے علی الخصوص اس وجہ سے کہ یہی نام پورا پورا عرب کے دوسرے حصہ میں موجود ہے۔

اور جو آزاد تھا سو وعدے کے طور پر پیدا ہوا۔ اس کے یہ معنی ظاہر ہیں کہ یہ عورتیں دو عہد نامے ہیں ایک تو کوہ سینی کی جو صرف غلام جنتی ہے ہاجرہ ہے کہ وہ ہاجرہ عرب کوہ سینی ہے اور یہاں کے یروشلم کی ہم جنس ہے اور اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے۔ پر اوپر کی یروشلم آزاد ہے سو ہم سبھوں کی ماں ہے'' اس پر رورنڈ مسٹر فارسٹر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوہ سینا اور ہاجرہ ایک ہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قول خود مصنف موصوف ہی کا قول ہے کیونکہ جہاں تک ہم کو واقفیت ہے ہم کسی عیسائی مصنف کا قول اس کے مطابق نہیں پاتے ہیں۔ کوئی مشرقی مؤرخ یا جغرافیہ دان ایسا نہیں معلوم ہوتا جس نے کوہ سینا اور ہاجرہ کو ایک ہی سمجھا ہو اور نہ انجیل مقدس کی کسی آیت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ کوہ سینا اور ہاجرہ کو ایک ہی سمجھا ہو اور نہ انجیل مقدس کی کسی آیت سے یہ مترشح ہوتا ہے کوہ سینا اور ہاجرہ سے ایک شے مراد ہے۔ سینٹ پال حواری کا اصلی منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کوہ سینا پر دو معاہدے کئے گئے تھے ایک حضرت اسحٰقؑ کے ساتھ اور دوسرا حضرت اسمٰعیلؑ پھر ہاجرہ کے ساتھ سینٹ پال حواری نے کنایتاً فرمایا کہ ''یہ ہاجرہ کوہ سینا ملک عرب میں ہے'' یعنی یہ ہاجرہ یعنی بنی ہاجرہ وہ معاہدہ ہے جو کوہ سینا پر بھی کیا گیا تھا اور یروشلم کا ہم پایہ ہے جو بالفعل موجود ہے اور اس کی اولاد کے ساتھ غلامی میں ہے۔ عبارت مذکورہ بالا کو اس طرح پھیرنا کہ اس کے معنی سے ہاجرہ اور سینا کا مقام واحد ہونا ثابت ہو جائے بالکل غیر ممکن ہے۔

کتاب اول تواریخ ایام باب ۵ آیت ۹ اور ۱۰ میں بعض اقوام بنی اسرائیل کے آباد ہونے کے ذکر کے ساتھ یہ عبارت مندرج ہے ''و بہ طرف مشرقی تا مدخل بیابان کہ بہ کنارہ نہر فرات باشد ساکن می شدند زیرا کہ درزمین گلعاد گلہ ہائے ایشاں زیادمی شدند۔ ودر زمان شاول ایشاں با ہگریاں دعویٰ کردند کہ آنہا بدست ایشاں افتادند و در چادر ہائے ایشاں درتمامی مرزو بومے کہ بہ طرف گلعاد باشد ساکن شدند۔'' ان آیات پر استدلال کر کے رورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ گلعاد کے شرقی نواح جو رود فرات اور خلیج فارس کی سمت میں ہے حضرت اسمٰعیل کے ابتدائی مقام سکونت سے مطابق ہوتا ہے ایک عرصہ کے بعد حضرت اسمٰعیل کی اولاد قریب قریب سارے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی اور انہیں سے بعض لوگ مقام متذکرہ بالا کو قدیمی باشندوں سے چھین کر وہاں جا بسے۔

مگر ان آیات سے جو مقصد رورنڈ مسٹر فارسٹر کا ہے وہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ان سے صرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بنی ہاجرہ نے سواحل خلیج فارس پر شکست کھائی اور یہ شکست آٹھ سو برس بعد حضرت اسمٰعیل کے واقعہ ہوئی تھی۔ ان آیات سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں خود حضرت اسمٰعیلؑ متوطن ہوئے تھے۔

رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد نے خلیج فارس کے شمالی سمت سے لے کر یمن تک تمام ملک پر قبضہ کر لیا تھا مختلف مقامات کے ناموں کی بنی ہاجرہ کے ناموں کے ساتھ مطابقت کرنے میں از حد کوشش کی ہے بعض مطابقتیں اس طرح پر کی ہیں جن پر اعتبار نہیں ہو سکتا اور بعض میں اپنے معمولی قاعدہ کے مطابق صرف ایک حرف کے مطابق ہو جانے کو کافی سمجھا ہے اور بعض ناموں کے مطابق کرنے میں ان کو کامیابی بھی ہوئی ہے۔ لیکن جس امر کے قائم کرنے میں رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس قدر جاں فشانی سے ناکام کوشش کی ہے دو وجہ سے قابل التفات اور لائق توجہ نہیں ہے۔

اول اس لئے کہ ہمارے نزدیک بھی حضرت اسمٰعیل کی اولاد یعنی ان کے بارہ نامور بیٹے اور ان بیٹوں کی اولاد صرف اس تنگ قطعہ زمین میں محصور نہیں رہی جو مکہ معظمہ کے گرداگرد ہے۔ بلکہ امتداد زمانہ میں ان کی اولاد قریب قریب تمام جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی تھی۔ مشرقی مؤرخ بھی اس کے قائل ہیں جیسا کہ عبارت مندرجہ ذیل سے ثابت ہوتا ہے۔ پس یہ امر متنازعہ فیہ نہیں

ہے۔

"ولما کثر ولد اسمٰعیل صلی اللہ علیہ وسلم ضاقت علیہم مکة فانتشروا فی البلاد فکانوا لا یدخلون بلداً الا ظهر هم اللہ علی اهله وهم نفوا العمالیق معارف ابن قتیبة"

دوم اس لئے کہ اس مقام پر یہ امر بحث طلب نہیں ہے کہ امتداد زمانہ کے بعد حضرت اسمٰعیل کی اولاد کہاں کہاں پھیل گئی تھی۔ بلکہ اس بات پر بحث ہے کہ حضرت اسمٰعیل اور ان کی اولاد ابتدا میں کس جگہ آباد ہوئی تھی۔ پس جو کچھ رورنڈ مسٹر فارسٹر نے لکھا ہے اس سے امر بحث طلب کو کچھ علاقہ نہیں ہے۔

اب ہم اس امر کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کتب خمسہ حضرت موسیٰ میں اس فاران کا جو مشرقی مصر میں کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے کچھ بھی ذکر نہیں ہے اور یہ امر اس وقت بخوبی واضح ہو جاتا ہے جب کہ حضرت موسیٰ اور ان کے ہمراہیان بنی اسرائیل کی صحرانوردیوں کے مقامات پر لحاظ کیا جائے۔ سفر خروج باب ۱۵ آیت ۲۲ میں لکھا ہے۔ ''پس موسیٰ اسرائیل را از دریائے احمر کوچانید دبہ بیابان شور رفتند وسہ روز در بیابان راہی شدہ آب نیافتند'' اور جب کہ انہوں نے بیابان سینا کو طے کیا تب عمالیق کی قوم آئی اور رفیدیم میں بنی اسرائیل سے لڑی۔ دیکھئے (سفر خروج باب ۱۷ آیت ۸)

بنی عملیق قدیم رہنے والے رفیدیم کے نہیں تھے بلکہ اس وادی کے رہنے والے تھے جس کا ذکر سفر اعداد باب ۱۴ آیت ۲۵ میں ہے اور اس آیت میں بھی جو لفظ ''آئے'' کا استعمال ہوا ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رفیدیم کے رہنے والے نہ تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رفیدیم سینا کے جانب مغرب یعنی مشرقی مصر میں واقع ہے اور یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت موسیٰ نے اپنے اعجاز سے ایک چٹان میں سے پانی کا چشمہ نکالا تھا۔ اور اس کا نام ''مساہ'' اور ''مریبا'' رکھا تھا۔ دیکھئے (سفر خروج باب ۱۷ آیت ۶' ۷) اور اسی جگہ حضرت موسیٰ ؑ نے ایک قربان گاہ بنائی تھی اور اس کا نام ''یہوانسی'' رکھا تھا۔ دیکھئے (سفر خروج باب ۱۷ آیت ۱۵)

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اب آگے کو مشرق کی طرف بڑھے اور صحرائے سینا میں پہنچ کر کوہ خدا کے پاس ڈیرے ڈالے اور اسی مقام پر ان کے خسر مسمی یثرو کاہن ان سے ملنے کو آئے۔ دیکھو (سفر خروج باب ۱۸ آیت ۵' باب ۱۹ آیت ۲)

اس میں کچھ شک نہیں کہ یثرو کاہن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے خسر کوہ سینا کے مشرق کی جانب سے آئے تھے۔ کیونکہ مدیان جہاں کہ وہ کاہن تھے اس کے مشرق کی سمت میں واقع ہے۔ اس تمام سفر میں جو حضرت موسیٰ نے مصر سے سینا تک کیا فاران کا کچھ ذکر نہیں آیا۔

سینا سے بنی اسرائیل کا کوچ شمالی مشرق کی سمت میں تھا۔ اس سفر کے باب میں سفر اعداد باب ۱۰ آیت ۱۲ میں یہ لکھا ہے ''وبنی اسرائیل از بیابان سینی کوچ نمودند وابر در بیابان باران ساکن شد۔'' حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اس سفر میں پہلی منزل اس مقام پر کی تھی جس کا نام ''تبعیراہ'' تھا۔ دیکھو (سفر اعداد باب ۱۱ آیت ۳)۔ پھر وہاں سے ''قبروث ہتاواہ'' کو روانہ ہوئے اور وہاں سے ''حصیروث'' کو کوچ کیا۔ دیکھو (سفر اعداد باب ۱۱ آیت ۳۴' ۳۵) اور اس آخری مقام سے کوچ کر کے بیابان پاران میں داخل ہوئے۔ دیکھو (سفر اعداد باب ۱۲ درس ۱۶) چونکہ یہ پاران وہی جگہ ہے جہاں ابر کا ٹھہرنا بیان کیا گیا ہے اس لئے کچھ شک نہیں کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا کوچ شمالی اور مشرقی سمت میں تھا یعنی قادیش کی طرف (دیکھو (سفر اعداد باب ۱۳ آیت ۲۶) اور اس

لئے وہ فاران جس کا ذکر حضرت موسیٰ نے کیا ہے سینا کے مغرب کی جانب نہیں ہوسکتا۔

پس بآسانی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ شہر فاران جس کو روپر صاحب نے بیان کیا ہے اور جس کے آثار انہوں نے پائے ہیں اور جو مشرقی مؤرخوں کی نظر سے چھپا ہوا نہ تھا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے میں موجود نہ تھا اور یہ کب خیال میں آسکتا ہے کہ ایسے بیابان میں جس کی نسبت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے بیان کیا ہے کہ "بیابان وسیع وہولناک کہ وراں مار سوزندہ وعقرب وزمین خشک بے آب بود" اس زمانہ میں کوئی شہر موجود ہو۔ دیکھو (سفر توریہ ثنی باب ۸ آیت ۱۵)۔"

عیسائی مصنفوں نے بیابان فاران کا جو مقام قرار دیا ہے اس پر اعتبار کرنا حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی صحرائے نوردی کے بیان کی صحت پر منحصر ہے اور اس امر کی نسبت کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل صحرا نوردی کی حالت میں کن کن مقاموں پر ہوکر گزرے تھے خود عیسائی علماء اور فضلاء میں اس قدر اختلاف ہے کہ اس قدر اختلاف شاید ہی کسی اور امر کی نسبت ہو۔ ہم اس مقام پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل کی صحرا نوردی کا ایک نقشہ شامل کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوگا کہ خود علماء عیسائی نے پانچ مختلف رستے صحرا نوردی کے بیان کئے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کی نسبت بطور یقین کے بیان کیا جاسکے کہ درحقیقت ان پانچوں میں سے صحرا نوردی کا کونسا صحیح رستہ ہے۔

فاران پسر عوف کی اولاد بنی فاران کے نام سے مشہور تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بعد کسی وقت میں کچھ لوگ اس قبیلہ کے یمن والوں اور قرب وجوار کی قوموں کے ساتھ دائمی جھگڑوں اور قصوں کے سبب سے شمال اور مشرقی سمت کو چلے گئے ہوں گے اور کوہ سینا کی مغرب کی جانب مشرقی مصر میں قیام کیا ہوگا جہاں رفتہ رفتہ ایک گاؤں یا قصبہ اسی قوم فاران کے نام سے آباد ہوگیا ہوگا۔ جس کا ذکر روپر صاحب اور اور مشرقی مورخوں نے کیا ہے مگر حضرت موسیٰ کے وقت میں اس کا کچھ وجود نہ تھا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے ہم نام بیابان یا پہاڑ سے جس کا ذکر توریت میں ہے بالکل علیحدہ ہے۔

اگر بیابان فاران سے وہ سارا وسیع میدان مراد لیا جائے جو شام سے یمن تک چلا گیا ہے جیسا کہ خود کتاب مقدس میں مذکور ہے اور صرف ملکی روایتیں ہی اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ مشرقی مورخ بھی اس کے موید ہیں تب حضرت موسیٰ کے کوچ کے تمام بیان کی تطبیق ہو جاتی ہے اور اس کی صحت کی تصدیق ہوتی ہے جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

اس تمام وسیع میدان پر جو شام کے جنوب میں واقع ہے کاتبین مقدس عموماً ارض شور کا اطلاق کرتے ہیں مگر بعض مقام میں اس کو صرف "بیابان" سے تعبیر کیا ہے (دیکھو سفر خروج باب ۱۳ آیت ۱۸) اور بعض جگہ "بیابان عظیم" سے (دیکھو سفر توریہ ثنی باب ۸ آیت ۱۸) اور اس بیابان میں ایثام۔ سین۔ سینا۔ سن۔ قادیش۔ عیدام جو چھوٹے چھوٹے بیابان ہیں اور نیز ایک حصہ فاران کا شامل ہے۔

جو کچھ کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے شور اور شام کو ایک ہی ملک قرار دیا ہے۔ سفر تکوین باب ۲۵ آیت ۱۸ میں دو نام آئے ہیں ایک شور اور دوسرا اشورہ۔ تمام عیسائی مصنف اشورہ کو "اسریا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ شور سے شام مراد ہے۔ اگر کوئی اس سے انکار کرے تو اس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اس تطبیق کا تسلیم کرنا اسلام کے مفید مطلب ہے کیونکہ سفر توریہ ثنی باب ۳۳ آیت ۲ اور کتاب حبقوق باب ۳ آیت ۳ میں جو پیشین گوئی ہے وہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت صادق آتی ہے۔

ہمارے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فاران کی شمالی حد پر قادیش اور مغربی حد پر صحرائے "سینا" اور خلیج عرب واقع ہے۔

جبکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سینا سے روانہ ہوئے تو ابر قادیش کے نزدیک فاران میں ٹھہرے۔ دیکھو (سفر اعداد باب ۱۰ آیت ۱۲) اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) "تبعیراہ" "قبروث ہتاواہ" اور "حصیروث" ہو کر فاران میں آئے جو قادیش کے نواح میں ہے۔ اس جگہ سے انہوں نے ایلچی روانہ کئے جو واپس آتے وقت اول قادیش میں پہنچے اور اس کے بعد فاران میں۔ یہ ایک سیدھا اور صاف بیان ہے جس سے حضرت موسیٰ کے فاران میں سفر کرنے کا معما بخوبی حل ہو جاتا ہے۔"

اب ہم توریت مقدس کی ان آیات پر غور کریں گے جو حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے نکال دیئے کے باب میں ہیں۔ سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۱۴، ۱۵ میں لکھا ہے کہ "ابراہیم در صبحدم سحر خیزی نمودہ نان و مطہرہ آب را گرفتہ و بہ ہاجرہ دادہ بہ دوشش گزاشت و ہم پسرش را (باو دادہ) اور ارروانہ نمود پس راہی شدہ در بیابان بیر شبع سرگرداں شدہ۔ و آبے کہ در مطہرہ بود تمام شد۔ و پسر را در زیر بوتہ از بوتہا گذاشت" جس عبارت کے نیچے ہم نے خط کھینچ دیا ہے اس کے خواہ مخواہ یہ معنی نہیں ہیں کہ حضرت ہاجرہ بیابان بیر شبع ہی میں پھرتی رہیں اور اسی مقام پر صرف وہی پانی جو حضرت ابراہیمؑ نے ان کو دیا تھا ان کے پاس تھا اور وہی ختم ہو گیا تھا۔ بلکہ دو وجہ سے اس آیت کے ایسے معنی لینے صحیح نہیں ہیں۔ اول اس وجہ سے کہ بیر شبع جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے قادیش کے نزدیک کھودا تھا اور جس کے نواح میں وہ خود ایک عرصہ دراز تک رہے تھے ایک ایسا مقام تھا جس کے حالات اور جس کے قریب پانی کے کنوؤں کا ہونا حضرت ہاجرہ سے پوشیدہ نہ تھا۔ دوم اس وجہ سے کہ بیابان بیر شبع میں پانی کا اس قدر نایاب ہونا ناممکن تھا۔ کیونکہ وہاں صرف حضرت ابراہیم ہی کے بنائے ہوئے کنوئیں نہیں تھے بلکہ قوم فلسطین کے تعمیر کئے ہوئے بھی موجود تھے۔ دیکھو (سفر تکوین باب ۲۶ آیت ۱۸ الغایت ۲۲) ہمارے نزدیک اس عبارت کے معنی جو عیسائی مصنفوں نے قرار دیئے ہیں اس سے زیادہ ترجیح اور صاف یہ ہیں کہ مکان سے نکلنے کے بعد حضرت ہاجرہ بیابان بیر شبع میں پھرتی رہیں مگر ملک کا وہ حصہ سکونت کے قابل نہ تھا کیونکہ بیر شبع کے ارد گرد ایسی قومیں رہتی تھیں جو لڑاکا اور جھگڑالو تھیں اور ذرا سا رحم بھی ان کے دل میں نہ تھا۔ اس لئے حضرت ہاجرہ نے ایسے مقام پر جانے کا خیال کیا ہوگا جہاں ان کو امن ملے اور آسائش سے رہ سکیں اور ایسا مقام بلاشبہ وہ تھا جہاں عرب العاربہ کی قومیں رہتی تھیں۔ اور اس لئے کچھ شک نہیں رہتا کہ حضرت ہاجرہ نے اس نواح میں جانے کا قصد کیا۔

جو ایک چھاگل پانی حضرت ابراہیمؑ نے ان کے ساتھ کر دیا تھا وہ ختم ہو گیا ہوگا اور راستہ میں متعدد جگہ سے جہاں کہیں پانی دستیاب ہوا ہوگا حضرت ہاجرہ نے بھر لیا ہوگا لیکن جب وہ بیابان فاران میں پہنچی ہوں گی تو پانی ملنے کی مشکل پیش آئی ہوگی۔ کیونکہ اس بیابان میں پانی نہایت کمیاب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت ہاجرہ اس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ معظمہ ہے تو ان کے پاس باقی پانی نہیں رہا تھا اور حضرت اسمٰعیل تشنگی کے سبب سے ضعیف اور قریب مرگ ہو گئے ہوں گے اور حضرت ہاجرہ نہایت تشویش اور اضطراب کی حالت میں ادھر ادھر پانی تلاش کرنے کو دوڑتی پھرتی ہوں گی۔ یہ بیان ایسا صاف ہے جس میں کوئی امر خلاف قیاس یا خلاف فطرت انسانی نہیں ہے۔

خانہ بدوش عرب پانی کے چشمہ کو جو ان کو جنگل میں ملتا تھا جھانکڑ وغیرہ ڈال کر مٹی سے چھپا دیتے تھے تاکہ ان کے سوا اور کسی کو اس کا پتہ نہ ملے اور یہ رسم پانی کے کمیاب ہونے سے ان میں جاری تھی اور اب تک جاری ہے۔

یہ بات نہایت قرین قیاس ہے کہ اسی طرح عربوں نے اس چشمہ کو جو اس مقام پر تھا جہاں اب چاہ زمزم واقع ہے چھپا دیا ہو گا۔ کیونکہ لفظ "بیر" عبرانی میں چشمہ آب کے معنی میں بھی آیا ہے۔

ان تمام حالت سے ظاہر ہوتا کہ جس وقت حضرت ہاجرہ مضطرابانہ ادھرادھر دوڑ رہی تھیں تو ان کو وہ چشمہ مل گیا۔ توریت مقدس کی عبارت سے بھی اسی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے ''وخدا چشمان اوراکشادہ کرد وچاہ آبے دید ورفتہ شد ومطہرہ را از آب پر کردہ وبہ پسر نوشانید'' (سفر تکوین باب ۲۱ آیت ۱۹) عربی روایتوں میں اس واقعہ کو اس طرح پر تعبیر کیا ہے کہ ایک فرشتے نے اس مقام پر اپنے بازو یا پاؤں سے ایک گڑھا کر دیا جس میں سے پانی نکل آیا۔ یہ بیان اسی قسم کا ہے جیسا کہ مذہبی روایتوں کو عظمت دینے کے لئے ہوتا ہے مگر جو اصلی واقعہ ہے وہ اس سے صاف پایا جاتا ہے۔

بخاری کی حدیث ہم نے اوپر نقل کی ہے اور اس کو بجائے پیغمبر کی حدیث ہونے کے ایک قومی اور ملکی روایت کا درجہ دیا ہے اس سے بھی اتنی بات کہ حضرت ہاجرہ جب اس مقام پر پہنچیں جہاں اب مکہ ہے تو پانی ختم ہو چکا اور حضرت اسمٰعیل تشنگی سے قریب المرگ ہوگئے تو وہاں ان کو چشمہ مل گیا بخوبی ثابت ہوتی ہے پس یہ ایک ایسی روایت ہے جس کو ایام جاہلیت کے عربوں نے ہمیشہ مستند تسلیم کیا ہے اور باوجود یہ کہ وہ لوگ بیشمار قوموں اور فرقوں میں جو ایک دسرے کے مخالف تھے اور ہر ایک کا مذہب اور اعتقاد بھی جدا گانہ تھا منقسم ہو گئے تھے۔ اس پر بھی مذکورہ بالا امر میں سب متفق تھے۔ اس لئے ہم اس روایت کو جھوٹی اور موضوع خیال نہیں کرتے خصوصاً اس صورت میں کہ توریت مقدس کے متعدد مقامات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

بہرحال حضرت ہاجرہ نے اس مقام پر جہاں پر ان کو پانی کا چشمہ ملا تھا رہنا شروع کیا جب اور لوگوں کو اس چشمہ کی خبر ہوئی تو بنی جرہم کے بہت سے لوگ اس کے قرب وجوار میں آ کر آباد ہو گئے۔

بخاری نے حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے نکاح کرنے کی بابت ایک روایت لکھی ہے جس کو ہم بجنسہ ذیل میں لکھتے ہیں:

"(قال ابے ابن عباس) فمر ناس من جرهم ببطن الوادی فاذاهم بطير كانهم انكروا ذلک وقالوا ما يكون الطيرالا على ماء فبعثوا رسولهم فنظر فاذا هوبالماء فاخبر هم فاتوا اليها فقالوا يام اسمٰعيل اتاذنين لنا ان نكون معک اونسكن معک فبلغ ابنها فنكح فيهم امراة قال ثم انه بدالابراهيم فقال لا هله انی مطلع تركتی قال فجاء فسلم فقال اين اسمٰعيل فقالت امرته ذهب يصيد قال قولی له اذجاء غير عتبة بيتک فلما جاء اخبرته فقال انت ذلک فاذهبی الی اهلک قال ثم انه بد الا براهيم فقال لا هله انی مطلع تركتی فجاء فقال اين اسمعيل فقالت امرته ذهب يصيد فقالت الا تنزل فتطعم وتشرب فقال وما طعامكم وما شرابكم قالت طعامنا اللحم وشرابنا الماء قال اللهم بارک لهم فی طعامهم وشرابهم قال فقال ابو القاسم بركة يدعوه ابراهيم (ﷺ) قال ثم انه بدالابراهيم فقال لا هله انی مطلع تركتی فجاء فوافق اسمٰعيل من وراء زمزم يصلح نبلا له فقال يا اسمعيل ان ربک امرنی ان ابنی له بيتاً قال اطع ربک قال امرنی ان تعيننی عليه قال اذا فعل اوكما قال فقاما فجعل ابراهيم يبنی و اسمٰعيل ينا وله الحجارة ويقولا ن ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم قال حتی ارتفع البناء وضعف الشيخ عن نقل الحجارة فقام علی حجر المقام فجعل وله الحجارة ويقولان ربنا تقبل منا انک انت السميع العليم" (بخاری كتاب الانبياء)

یہ روایت بھی انہیں وجوہات سے جو ہم نے بخاری کی پہلی حدیث کی نسبت بیان کی ہیں ایک ملکی روایت کی مانند ہے نہ کہ پیغمبر صاحب کی فرمائی ہوئی حدیث کی مانند۔ اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل نے ایک عورت سے نکاح کر لیا اور اس کے بعد جب حضرت ابراہیمؑ حضرت اسمٰعیلؑ سے ملنے کو آئے تو اس عورت سے نکاح کرنے کو ناپسند کیا اور طلاق دے دینے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) نے اس کو طلاق دیدی اور وہاں کے نو آباد لوگوں میں سے ایک اور عورت سے نکاح کر لیا۔ اس کے بعد جب دوسری دفعہ حضرت ابراہیمؑ سے ان سے ملنے کو آئے تو اس عورت سے نکاح کرنے کو پسند کیا۔

مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی دونوں بیویاں بنی جرہم کی قوم سے تھیں مگر توریت مقدس سے پایا جاتا ہے کہ انہوں نے پہلی دفعہ ایک مصری عورت سے نکاح کیا تھا۔

ہم کو اس بات کے یقین کرنے کی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں جو پہلی بیوی کا بنی جرہم سے ہونا بیان کیا گیا ہے صحیح نہیں ہے۔ غالباً پہلی بیوی ایک مصری عورت تھی اور یہی وجہ ہوگی کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اس عورت سے نکاح کرنا ناپسند کیا ہو گا۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ بنی جرہم نے بتداء میں اپنی قوم کی بیٹی کو حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے نکاح میں دینے سے تامل کیا ہوگا کیونکہ وہ حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کو غیر قوم اور غیر جنس خیال کرتے ہوں گے۔ مگر باہم سکونت پذیر ہونے سے وہ خیال جاتا رہا ہوگا اس لئے یقین ہوتا ہے کہ ان کی دوسری بیوی بنی جرہم کی قوم سے تھیں۔

قرآن مجید میں نسبت تعمیر خانہ کعبہ کے یہ آیت موجود ہے۔

"اذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم" (سورۃ البقرۃ: ۱۲۱)

اور اس سے ثابت ہوتا ہے اور تمام قومی روایتوں سے یقیناً محقق ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے خانہ کعبہ کو بنایا تھا۔

قرآن مجید کی رو سے بغیر کسی شک کے ہم مسلمان اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل پیغمبر تھے اور خدا نے ان کو مثل حضرت ابراہیم ان کے باپ کے وحی بھیجنے اور اپنی مرضی ظاہر کرنے کیلئے مبعوث کیا تھا تاکہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور وحدانیت کی طرف ہدایت کریں۔ توریت مقدس میں جو وعدہ کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی نسبت کیا تھا وہ اس طرح پر مندرج ہے "ودرحق اسمٰعیل تراشنیدم اینک اورا برکت دادہ ام وادرا بارگردانیدہ بغایت زیاد خواہم نمود ودوازدہ سرور تولید خواہد نمود اورا امت عظمٰی خواہم نمود" (سفر تکوین باب ۱۷ آیت ۲۰) یہ وعدہ پورا ہوا اور آخر تک پورا ہوتا چلا آیا۔

عیسائی مصنف اس وعدہ کے ہونے کی نسبت تو کچھ کلام نہیں کر سکتے مگر از راہ مکابرہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ جسمانی یعنی دنیوی طرز کا وعدہ تھا نہ روحانی طرز کا۔ اگرچہ ان کا کہنا صریح غلط ہے مگر اس مقام پر ہم اس مسئلہ پر بحث نہیں کرنے کے بلکہ آئندہ خطبہ میں جس میں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی بشارات کا توریت اور انجیل میں موجود ہونا بیان کریں گے اسی خطبہ میں اس امر پر بھی بحث کریں گے۔

ایک اور روایت عموماً لوگوں میں مشہور ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کی قربانی کر ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے زیادہ تر تقویت اس روایت کو ہوتی ہے جس میں حضرت اسحٰق

(علیہ السلام) کی قربانی کرنے کے حکم ہونے کا ذکر ہے اور اس اختلاف کا جو سبب ہے وہ ہم آگے بیان کریں گے۔

حضرت ابراہیم نے جو اپنے بیٹے کی قربانی کرنے کا ارادہ کیا اس کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح آیا ہے:

"قال یا بنی انی اری فی المنام انی اذبحک فانظر ما ذا تری قال یا ابت افعل ما تومر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرینo فلما اسلما وتلہ للجبین ونادیناہ ان یا ابراھیم ط قد صدقت الرویا انا کذالک نجزی المحسنینo ان ھذا لھو البلاء المبینo وفدیناہ بذبح عظیمo

(سورۃ الصافات آیت ۱۰۱ 'لغایت ۱۰۷)

قرآن مجید میں اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ حضرت اسحٰق (علیہ السلام) کی نسبت قربانی کا حکم تھا یا حضرت اسمٰعیلؑ کی نسبت اور نہ کسی معتبر اور مستند حدیث سے اس کی تفصیل پائی جاتی ہے۔

بعض مسلمان مؤرخوں کا قول ہے کہ حضرت اسحٰق کی نسبت قربانی کا حکم تھا اور بعض کا قول ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی نسبت تھا۔ یہ اختلاف توریت مقدس کی اس آیت کے مبہم اور غیر مصرح ہونے کی وجہ سے ہے جس میں اس مقام کا ذکر ہے جہاں مذکورہ بالا قربانی کا عمل میں آنا تجویز ہوا تھا اور وہ آیت یہ ہے "خدا ابراہیم امتحان نمود و باد گفت اے ابراہیم واو گفت اینک حاضرم و خداوند گفت کہ حال پسر یگانہ خود اسحٰق را کہ دوست ی داری بگیر و بزمین موریا[1] برو (عربی ترجمہ میں بجائے لفظ "وریاہ" کے "ارض الرویا" لکھا ہے اور توریت سامری کے عربی ترجمہ میں "**ارض المختارہ المرشدہ**" لکھا ہے۔ دوراں جا او را دریکے از کوہ ہائے کہ بہ تو ی گویم از برائے قربانی وسوختنی تقریب نما" (سفر تکوین باب ۲۲ آیت ۱ '۲) بعض مسلمان مصنفوں نے اس گمنام جگہ کو بیت المقدس اور اس کے پہاڑ قرار دیئے ہیں اور بعض نے مکہ معظمہ کے قریب کے پہاڑ۔ جو لوگ اس مقام کو مکہ معظمہ کے قرار دیتے ہیں وہ اپنی رائے کی تائید میں بیان کرتے ہیں کہ عبرانی لفظ "ہریم" جس کے معنی جبال کے ہیں تثنیہ اور جمع دونوں صیغوں میں استعمال ہوتا ہے اور اس لئے وہ استدلال کرتے ہیں کہ اس نے مکہ معظمہ کے مشہور دو پہاڑوں صفا اور مروہ میں سے ایک مراد ہے۔

توریت مقدس میں اسی باب کی چودھویں آیت میں یہ لکھا ہے "وابراہیم اسم آں مکان را یہواہ گذاشت کہ تا امروزش چنیں ہم

---

[1] موریا کے معنی تلخی خدا یا حکم خدا یا خوف خدا اور نیز یروشلم کے اس پہاڑ کا نام ہے جس پر بیت المقدس تعمیر ہوا تھا اور جس پر بالفعل حضرت عمر کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے۔ اسی مقام کو عموماً وہ مقام خیال کرتے ہیں جہاں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسحٰق (علیہ السلام) کی قربانی کرنے کا حکم ہوا تھا گو کہ اس بات کے فرض کرنے میں بعض مشکلات پیش آتی ہیں۔ توریت سامری سفر تکوین باب ۲۲ آیت ۲ میں بجائے موریا کے سرزمین مرہ لکھا ہے جیسا کہ انگریزی ترجمہ میں ہے اور مرہ کی نسبت لوگوں کو اطمینان ہو گیا تھا کہ یہ وہی مرہ ہے جو "شکم" کے قریب تھا اور جہاں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پہلے رہا کرتے تھے (سفر تکوین باب ۱۲ آیت ٦) اور وہ پہاڑ جس پر ان کا معبد بنا تھا "جبوریم" تھا اور یہ آخری رائے کسی قدر لحاظ کے قابل ہے۔ اگر یہ تحقیق ہو جائے کہ قوم سامری نے اس مقام کو اپنی حدود کے اندر لانے کے لئے اس آیت میں کچھ تحریف نہیں کی ہے۔ بیر شبع سے اس مقام کا فاصلہ ترجمہ سامری کا کسی قدر موید ہے کیونکہ بیر شبع مرہ تک پورا تین روز کا رستہ ہے مگر بیر شبع اور بیت المقدس کے درمیان فاصلہ بہت قلیل ہے بشرطیکہ راستہ میں کوئی امر حارج نہ ہو گیا ہو۔ مسلمان راوی ہیں کہ اس واقع کا موقع وہ ہے جہاں کہ زمانہ مابعد میں ان کا مشہور و معروف معبد بمقام مکہ بنایا گیا تھا اور اس معاملہ میں اور نیز دیگر معاملات میں وہ حضرت اسحٰق (علیہ السلام) کی جگہ حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کو بتاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہودی' سامری' مسلمان سب اپنے اپنے معبدوں کے موقعوں کو حضرت ابراہیم کے ایمان کی آزمائش یا امتحان کے مقام ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ (بائبل انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ صفحہ ۲۴۰)

میخانند ورد کوہ خداوند نمایاں است'' مسلمان مورخوں کے نزدیک یہ مقام وہ ہے جو مکہ معظمہ کے پاس واقع ہے اور آج تک عرفات کے نام سے مشہور ہے پس جو لوگ اس قربان گاہ کو مکہ معظمہ میں قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ قربانی کا حکم حضرت اسمٰعیل کی نسبت ہوا تھا اور جو لوگ اس قربان گاہ کو بیت المقدس میں قرار دیتے ہیں وہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسبت قربانی کا حکم ہونا کہتے ہیں جیسے کہ مسعودی نے لکھا ہے جس کی عبارت یہ ہے۔

"وقد تنازع الناس فی الذبح فمنهم من ذهب الی انه اسحق ومنهم من رای انه اسمعیل فان کان الامر بالذبح وقع بمنی فالذبیح امعیل لان اسحق لم ید خل الحجازو ان کان الا مربالذبح وقع بالشام فالذبیح اسحق لان اسمعیل لم ید خل الشام بعد ان حمل منه-- مروج الذهب مسعودی"

مگر ذی علم مسلمان عالموں کا صاف بیان ہے کہ حضرت اسحٰق کی نسبت قربانی کا حکم ہوا تھا نہ کہ حضرت اسمٰعیل کی نسبت اور یہی امر مندرجہ ذیل حدیث سے بھی پایا جاتا ہے۔

"عن محمد ابن المنتشر قال ان رجلا نذران بنحر نفسه ... (فقال له مسروق) لا تنحر .... واشعر کبشا فاذبحه للمساکین فان اسحق خیر منک وفدی بکبش ... (رواه ابن رزین مشکوة)

اس حدیث میں مسروق کا صاف قول ہے کہ حضرت اسحٰق قربان ہونے والے تھے۔

حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹے تھے۔ نبایوث' قیدار' اوبئیل' بیسام' مشماع' دوماہ' مسا' حدر' تیما' میطور' نافیش اور قیدماہ۔

نبایوث: یہ شخص شمالی مغربی حصہ عرب میں آباد ہوا۔ ٹھیک مقام اس قوم کے آباد ہونے کا نقشہ مرتبہ رورنڈ کاٹری پی کیری ایم۔اے میں مابین ۲۸ '۳۰ درجات عرض بلد شمالی' ۳۶ '۳۸ درجات طول بلد شرقی میں واقع ہے۔ رورنڈ فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ یہ قوم عرب الحجر کے وسط سے لے کر مشرق کی جانب اور وادی القریٰ کے اندر تک اور جنوب کی طرف کم از کم منتہائے خلیج عیلام اور حدود حجاز تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسطرابو اس سے بھی زیادہ وسیع قطعہ ان کی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ وہ دو مقاموں کا ذکر کرتا ہے جو خلیج عرب پر واقع ہیں اور جن سے صریح ظاہر ہے کہ ان کی مملکت کی وسعت جنوبی اور غربی سمت میں مدینہ کی عرض بلد پر منتہی ہوتی تھی اور یہ دو مقام شہرو بندرگاہ تھیں۔ بندرگاہ سفید جو ینبوع کی شمال میں ہے اور خود بندرگاہ ینبوع ہیں رورنڈ فارسٹر کہتے ہیں کہ اس مختصر بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قوم صرف پتھریلے بیابان عرب ہی میں نہیں بلکہ صوبہ جات عظیم حجاز اور نجد کے اندر تک پھیلی ہوئی تھی۔

ممکن ہے کہ یہ قوم وقتاً فوقتاً اس وسیع ملک میں پھیل گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔ کتاب اشعیاہ نبی کی مندرجہ ذیل آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک نامی زبردست قوم تھی اور آیت یہ ہے'' تمامی گوسفنداں قیدار نزدتو گرد آمدہ قوچہائے نبایوث بکارت خواہند آمد وبرمذبحم برضامندی برخواہند آمد وخانہ جلال خود جلیل خواہم کرد'' (کتاب اشعیاہ باب ۶۰ آیت ۷)

قیدار: یہ شخص بنی بنت کی جنوب کی طرف گیا اور حجاز میں آباد ہوا۔ زبور داؤد' کتاب اشعیاہ' ارمیا' حزقیل وغیرہ میں اس قوم کی عظمت وشوکت کی بیشمار شہادتیں ہیں اسی قوم میں سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ ان کی بعثت سے خدا تعالیٰ کی رحمت اپنے بندوں پر ظاہر ہوئی۔ ان کی ذات پاک کے سودمند اثروں سے رفتہ رفتہ دنیا کے بڑے حصہ پر خدا کی برکت اور

خدائے واحد کی عبادت پھیل گئی اور اب تک پھیلتی جاتی ہے۔ عربوں اور مشرقی اقوام کے ہاں بیشمار روایتیں اس قوم کے باب میں موجود ہیں مگر ہم اس مقام پر اس روایت کا بیان کرنا چاہتے ہیں جس کو رورنڈ مسٹر فارسٹر نے مستند تسلیم کیا ہے۔

مصنف موصوف نے لکھا ہے کہ "اشعیاہ نبی کے کلام سے (جو اوپر مذکور ہے) جو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قیدار کی خیمہ گاہ اس آخر حصہ ملک میں تلاش کرنی چاہیے۔ اس کی کماحقہ تصدیق اسی نبی کے کلام کے ایک اور مقام سے بھی ہوتی ہے یعنی ارض قیدار کے بیان سے جس کو ہر شخص جو جغرافیہ عرب سے واقف ہو گیا پہچان لے گا کہ اس قطعہ حجاز کا نہایت صحیح بیان ہے جس میں نامی شہر مکہ اور مدینہ واقع ہیں۔ جس شخص کو زیادہ ثبوت اس مشابہت کا درکار ہو تو اس کو حجاز کا جغرافیہ جدیدہ معائنہ کرنا چاہیے جاں کہ ینبوع کے قریب شہرہائے الخضیر اور بنت جو اسمائے معرفہ قیدار اور نبایوث کی باقاعدہ عربی شکلیں ہیں خط حد کنندہ آج تک چلا آتا ہے اور کسی قدر معنی رکھتا ہے۔

اس کے بعد رورنڈ مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ یہاں تک تو ہم نے قیدار کے آثار جغرافیہ قدیمہ کی استعانت سے دریافت کیے ہیں اب یہ دیکھنا رہا ہے کہ یونانی اور رومی بیانات کا عربی روایتوں سے مقابلہ کرنے میں کس قدر ثبوت کی زیادتی حاصل ہوتی ہے کیونکہ محققین یورپ کی رائے میں عربی روایتوں کی غیر مویدہ شہادت کیسی ہی قابل اعتراض اور مشکوک کیوں نہ ہو مگر منصفانہ بحث کے مسلمہ قواعد کی رو سے ان کا قطعی اتفاق تواریخ دینی اور دنیوی سے انکار کرنا صریح غیر ممکن ہے۔ خود عربوں کے ہاں زمانہ نامعلوم سے یہ ایک روایت چلی آتی ہے کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتدا حجاز میں آباد ہوئے تھے اس شخص کی اولاد میں ہونے کا بالتخصیص قوم قریش جو مکہ کے والی اور کعبہ کے محافظ تھے ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن میں اپنی قوم کی ریاست اور اعزاز کے دعووں کی اسی بناء پر تائید کی ہے کہ اسمٰعیل کی اولاد میں قیدار کے سلسلے سے تھے۔ ایسی قومی روایت کا اعتبار جیسے کہ یہ ہے تاریخی روایت کے پایہ کو پہنچ جاتا ہے جب کہ اس کی تائید ایک طرف تو کتب مقدسہ کے ان بیانات سے ہوتی ہے جن سے قیدار کا اسی حصہ جزیرہ نما میں ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف اریانوس، بطلیموس، پلینی اکبر کے زمانوں میں ملک حجاز میں قوم کیدڑی، درائی کدرون تائی یا کدیتی کی موجودگی کی غیر مشتبہ اور ناقابل اشتباہ امر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ (جغرافیہ تاریخی جلد اول صفحہ ۲۴۸)

اوبائیل: مشرقی مورخوں نے اس شخص کی نسبت کچھ نہیں لکھا۔ رورنڈ مسٹر فارسٹر کا بیان ہے کہ کتب مقدس میں صرف ایک مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے اور انہوں نے جوسفس کی سند پر بیان کیا ہے کہ اوبئیل کا ابتدائی مقام سکونت اس کے بھائیوں کے قرب و جوار میں تھا۔ اس قدر بیان کے صحیح ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا لیکن جب وہ اس کے آثار دریافت کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں اور مقاموں کے ناموں میں صرف چند حرف کی مشابہت ہونے سے اس کے آثار قرار دیتے ہیں تو اس پر اعتماد نہیں ہوسکتا۔

مبسام: حال کے جغرافیہ اور عرب کی تاریخ میں اس شخص کا کچھ پتہ نہیں لگتا۔ رورنڈ مسٹر فارسٹر کا بھی بیان ہے کہ اس اسمٰعیلی کے نام و نسل کے آثار بہ نسبت اس کے اور بھائیوں کے کمتر اور ضعیف تر ہیں۔ پورا نام نہ قدیم جغرافیہ عرب میں پایا جاتا ہے اور نہ جدید جغرافیہ میں۔

مشماع: مشرقی تاریخوں میں اس شخص کا کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن اگر رورنڈ مسٹر فارسٹر کی یہ بات تسلیم کی جائے کہ سفر تکوین اور تواریخ

الایام کامشماع اور یونانی توریت کا مسما اور جوسفس نے جس کو مساوس اور بطلیموس نے مسی مانیس اور عربوں نے بنی مسما لکھا ہے اس سے ایک ہی شخص مشماع مراد ہے تو یہ کسی قدر آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اس شخص کا ابتدائی مقام سکونت نواح نجد میں تھا۔

دوماہ: اس شخص کی اولاد اول تہامہ کے جنوب میں مدینے کے قرب وجوار میں آباد ہوئی مگر جب کہ اس کی اولاد بڑھ گئی تو نقل مکان کرنے کے لئے مجبور ہوئی۔ اور اس مقام پر آباد ہوئی جہانکہ بالفعل دومۃ الجندل واقع ہے۔ شام اور مدینہ کے درمیان اور بہت سے مقامات ہیں جن کے نام اس شخص کے نام پر ہیں۔ رورنڈ مسٹر فارسٹر بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور مشرقی مؤرخوں کا بھی یہی قول ہے جس کی سند ذیل میں درج ہے:

دومة الجندل... وقد جاء في حديث الواقدي دو ماه الجندل وعدها ابن السقفيه من اعمال المدينة سميت بدوم ابن اسمعيل بن ابراهيم وقال الزجاجي دو مان ابن اسمعيل وقيل كان لاسمعيل ولد اسمه دما لعله مغيره منه وقال ابن الكلبي دو ماه بن اسمعيل قال ولما كثر ولد اسمعيل عم بالتهامة خرج دوماه بن اسمعيل حتى نزل موضع وبنى له حصناه فقيل دوماه و نسب الحصن اليه—وقال ابوعبيد السكوني دومة جندل حصن وقرى بين الشام والمدينه قرب جبلي طي .... و دومة من القريات من وادي القرى. (معجم البلدان)

مسا: رورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بات کے کہنے میں کہ اس شخص کی اولاد عراق عرب (الجزیرہ) میں آباد ہوئی تھی بلاشبہ غلطی کی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ قوم یمن میں آباد ہوئی اور اس امر کی تائید "موسا" کے نام سے ہوتی ہے جو اب تک یمن میں موجود ہے۔ یہ مقام پی کیری صاحب کے نقشہ کے بموجب ۱۳ درجہ ۳۰ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۴۳ درجہ ۳۰ دقیقہ عرض بلد شرقی میں واقع ہے۔

حدر: تواریخ الایام میں اس کو "حدد" لکھا ہے۔ اس شخص نے جنوبی سمت اختیار کی اور حجاز میں آبسا۔ اس امر کی تصدیق بیشمار بیرونی اور اندرونی شہادتوں سے ہوتی ہے۔ ایک مسلمان مؤرخ "الزہیری" "حدد" کو منجملہ ان بیشمار قوموں کے جن میں عرب کے باشندے منقسم تھے بالتصریح بیان کرتا ہے۔ یمن میں شہر حدیدہ اور بنی حدد کا موجود ہونا صریح ہمارے بیان کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔

تیما: حضرت اسمٰعیل کے پہلے دو بیٹوں کے بعد باعتبار شہرت کے تیما کا درجہ ہے۔ اس شخص کا ابتدائی مقام سکونت صوبہ حجاز تھا لیکن کسی نہ کسی زمانہ میں اس کی اولاد تمام وسط نجد میں پھیل گئی اور بعض ان میں سے خلیج فارس کے ساحل کے برابر برابر منتشر ہو گئے مگر ہم کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے کلام کی تصدیق جس سے حضرت اسمٰعیل کے بیٹوں کی ابتدائی آبادی کی جگہ پائی جاتی ہے منظور ہے تو ہم کو اسی مقام کی تحقیق اور تدقیق پر جہاں کہ ان میں سے ہر ایک شخص نے ابتدا سکونت اختیار کی تھی زیادہ تر توجہ مبذول کرنی چاہیے نہ اس جگہ کی نسبت جہاں کہ ان کی اولاد بعد کو جا بسی۔

یطور: رورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ اس بات پر یقین کرنے کے واسطے کامل دلیل ہے کہ اس قوم کا ابتدائی مقام سکونت ضلع "جدور" تھا۔ جبل قاسیوں کے جنوب اور جبل الشیخ کے مشرق اور شاہراہ راہ حجاج کے مغرب میں۔

نافیش: مشرقی مؤرخ کچھ نہیں بیان کرتے کہ اس شخص نے کہاں سکونت اختیار کی تھی مگر روورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ اس کی اولاد سے ایک قوم عرب کا وادی القرے میں موجود ہونا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور مصنف تواریخ الایام جوسفس کی سہ گانہ شہادت سے بلاشک واشتباہ محقق ہے۔

قید ماہ: معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ملک یمن کی نواح میں آباد ہوا۔ کیونکہ مسعودی کا قول ہے کہ ایک قوم موسوم بہ ''قدمان'' یمن میں تھی۔ چنانچہ اس نے لکھا ہے:

''اصحاب الرس کا نوامن ولد اسمعیل وهم قبیلتان یقال لاحداهما قدمان و لا خری یا مین وقیل رعویل و ذلک بالیمن'' (مروج الذهب مسعودی)

روورنڈ مسٹر فارسٹر نے اس بات کے خیال کرنے میں عجیب غلطی کی ہے کہ ''کاظمہ'' جو خلیج فارس پر واقع ہے جس کا ذکر ابوالفدا نے کیا ہے اسی قید ماہ سے مطابقت رکھتا ہے۔

تمام تلاش اور تفتیش کے بعد جو ہم نے حضرت اسمٰعیل کی اولاد کے بتدائی مقام سکونت کے باب میں کی اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوا کہ ان کے آثار یمن (حویلاہ) سے لے کر شام (شور) تک پائے جاتے ہیں اور اس طرح پر حضرت موسیٰ کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے جو سفر تکوین باب ۲۵ آیت ۱۸ میں مندرج ہے کہ ''وہ حویلاہ سے شور تک آباد ہوئے جو سامنے مصر کے ہے جب کہ تو اسریا کو روانہ ہو''۔

حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) ۲۰۹۴ دنیوی مطابق ۱۹۱۰ قبل حضرت مسیح کے پیدا ہوئے تھے اور گھر سے نکال بہانے کے وقت ان کی عمر سولہ برس کی تھی۔ اگر اس مدت عمر پر بیس برس اور اضافہ کیا جائے تو ہمارے نزدیک حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں کی ولادت کے واسطے کافی مدت ہوگی۔ پس ہم اس بات کو کہہ سکتے ہیں کہ ۲۱۳۰ دنیوی یا ۱۸۷۴ قبل حضرت مسیح تک ان کا کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا تھا۔

ان بارہ بیٹوں نے کوئی اور بڑی شہرت حاصل نہیں کی بجز اس کے کہ عرب کی بارہ مختلف قوموں کے موارث ہوئے اور اسی باعث سے یہ قومیں مختلف شعبوں اور فرقوں میں منقسم نہیں ہوئیں بلکہ یکساں حالت میں رہیں۔ مگر ایک مدت مدید کے بعد عدنان کی اولاد جو قیدار ابن اسمٰعیل کی نسل میں تھا مختلف شعبوں میں متفرق ہوگئی اور کارہائے نمایاں سے شہرت حاصل کی۔

مشرقی مورخ متفق الرائے ہیں کہ عدنان کے دو بیٹے تھے ''معد'' اور ''عک''۔ عک کی نسبت ان کا صرف اس قدر بیان ہے کہ وہ یمن کو چلا گیا۔ مگر ان کتبوں سے جن کو روورنڈ مسٹر فارسٹر نے عاد کی قوم کے کتبوں سے موسوم کیا ہے اور جو حضر موت میں بمقام ''حصن غراب'' دریافت ہوئے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اس نے کچھ عرصہ تک اس ملک میں بادشاہی کی تھی۔ یہ کتبے مذکورۃ الصدر مقام میں ۱۸۳۴ء میں آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز مسمی ''پالی نورس'' کے افسروں نے دریافت کئے تھے۔ ان کتبوں کا پورا پورا بیان مع کتبوں کی نقل کے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل کی تیسری جلد میں ملے گا۔ روورنڈ مسٹر فارسٹر نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں ''عک'' وہاں کا فرماں روا تھا۔

اس شاعرانہ کتبہ کی ٹھیک ٹھیک تاریخ قائم کرنے کی غرض سے روورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ ''عک'' عدنان کا بیٹا تھا اور بموجب حدیث حضرت ام سلمہ کے جو آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے تھیں عدنان حضرت اسمٰعیل سے چوتھی پشت میں

تھا جس کا نتیجہ ہے کہ وہ کتبہ مصر کے قحط سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے لکھا گیا ہوگا۔ لیکن رورنڈ مسٹر فاسٹر نے اس میں بڑی غلطی کی ہے کیونکہ انہوں نے اس بات کے ثبوت میں کوئی کافی سند پیش نہیں کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عدنان کا حضرت اسمٰعیل کی چوتھی پشت میں ہونا کبھی بیان کیا تھا۔ انساب کی معتبر روایتوں کے بموجب عدنان آنحضرت ﷺ سے بائیس پشت پہلے تھا۔ اب ایک پشت کی قدرتی میعاد پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عک انتالیسویں صدی دنیوی میں یا دوسری صدی قبل حضرت مسیح میں ہوگا۔

وائلہ ملقب بہ کلیب ابن ربیعہ بھی جو عدنان کی اولاد میں تھا بادشاہ ہوا تھا اور یمن والوں سے چند لڑائیاں بھی لڑا تھا۔

زہیر ابن جذیمہ اور نیز قیس ابن زہیر بھی باری باری سے حجاز کے بادشاہ ہوئے تھے مگر ان لوگوں کی تاریخیں معین کرنے کے واسطے ہمارے ہمارے پاس کوئی معتبر سند نہیں ہے اس لئے ہم کسی قدر یقین کے ساتھ تاریخیں قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن خیال کرتے ہیں کہ یہ وہی زمانہ ہوگا جبکہ سلطنت یمن اور دوسری سلطنتیں حالت زوال میں تھیں۔

عدنان کی نسل میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۴۵۷۰ دنیوی یا ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے اور تمام جزیرہ نمائے عرب پر دینی اور دنیوی حکومت حاصل کی۔ عیسائی مصنفوں نے آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ کی نسبت بہت کچھ لکھا ہے اور اس کو غیر مثبت قرار دینے کے لئے سعی بے حاصل کی ہے اور یہ مناسب موقع تھا کہ ہم بھی اس بحث میں شامل ہوتے اور عیسائی مصنفوں کے ہر ایک اعتراض کی تردید کرتے، لیکن چونکہ ہمارا ارادہ ہے کہ اس مضمون پر ایک جداگانہ خطبہ لکھیں گے اس لئے بالفعل اس بحث کا ملتوی کردینا مناسب ہے۔

دوم۔ ابراہیمی یا بنی قطورہ

توریت مقدس میں لکھا ہے ''ودیگر ابراہیم زنے گرفت کہ اسمش قطوراہ بود و برایش زمران و یقشان و مدان و مدیان و یشباق و شرح رازائید و یقشان شبا و دوان را تولید نمود و پسران ودان اشوریم ولطوشیم ولومیم بودند و پسران مدیان عیفاہ و عیفر وحنوک وابیداع والداعاہ بودند تمامی ایشاں پسران قطوراہ بودند۔ پاس ابراہیم تمامی یملک خود را بہ اسحٰق داد۔'' (سفر تکوین باب ۲۵ آیت الغایت ۵)

یہ سب لوگ عرب کو چلے گئے اور اس قطعہ میں آباد ہوئے جو حدود حجاز سے خلیج فارس تک منتہی ہوتا ہے اور ان کے نشانات اب تک جو اس ملک میں واقع ہیں پائے جاتے ہیں۔

انہی ابراہیمیوں میں سے حضرت شعیب نبی کو خدا تعالیٰ نے اقوام ایکہ اور مدیان کو اپنی خالص عبادت کی تلقین اور ہدایت کرنے کے واسطے مبعوث کیا تھا۔

مگر ہم ٹھیک نہیں کہہ سکتے کہ یہ نبی کس زمانہ میں ہوئے تھے لیکن اگر ہم یثرو کاہن مدیان جن کا ذکر سفر خروج باب ۱۸ آیت ۱، ۲ میں ہے اور شعیب کو ایک ہی شخص خیال کریں جیسا کہ عرصہ دراز سے لوگوں کو گمان ہے تو البتہ یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ یہ نبی اس وقت میں تھے جبکہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لائے تھے۔

سوم۔ ادومی یا بنی عیسو

عیسو یعنی ادوم کی تین بیویاں تھیں۔ عادہ، اہلیبا ماہ، باسمت دختر حضرت اسمٰعیل وخواہر نبایوث۔ پہلی بیوی سے ''الی فز'' پیدا ہوا۔

دوسری بیوی سے یعوش اور یعلام اور قورح پیدا ہوئے۔ تیسری سے رعوئیل پیدا ہوا۔ الی فز کے بیٹے تیمان، اوسر، سفو، گعتم، قنز، عمالیق تھے۔ رعوئیل کے بیٹے نحث، زرح، شماۃ، مزاہ پیدا ہوئے۔ (سفر تکوین باب ۳۶)
عیسو کی تمام اولاد قریباً قریباً کوہ سعیر کے قرب و جوار میں آباد ہوئی تھی۔ بعض نے ان میں سے اپنی سکونت عرب الحجر میں اور حجاز کی شمالی سرحد پر اختیار کی تھی۔ مگر ان لوگوں کی تعداد اس قدر کم تھی کہ اسی وجہ سے بعض مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ عیسو کی اولاد کبھی عرب میں آباد نہیں ہوئی۔

چہارم۔ بنی ناحور

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ ''عوص'' اور ''بوز'' (دیکھو سفر تکوین باب ۲۲ آیت ۲۱) پسران ناحور برادر ابراہیم شمالی عرب کی بیشمار قوموں کے مورث تھے اور اس کی سند میں کتاب ایوب باب ا آیت اور نیاحات یرمیاہ باب ۴ آیت ۲۱ یرمیاہ باب ۲۵ آیت ۲۰ کا حوالہ دیتے ہیں۔

پنجم۔ بنی ہاران

سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ ''یہ قوم بہ نسبت دیگر اقوام متذکرہ بالا کے سب سے زیادہ شمال کی جانب رہتی تھی۔ ان کے نہایت جنوبی مقامات بحر لوط (ڈیڈسی) کے مشرق میں واقع تھے اور ان میں عمدہ سبزہ زار ''بلکاز'' اور کرک'' کے شامل تھے۔
ہاران کے بیٹے حضرت لوط تھے۔ حضرت لوط کے بیٹے مواب اور بن عمی تھے۔ توریت مقدس میں ان کے پیدا ہونے کا نہایت ناپاک واقعہ اس طرح پر لکھا ہے۔ ''ولوط از صوعر برآمد و در کوہ ساکن شد و دو دختر انش بہ ہمراہش زیرا کہ از سکون در صوعر ترسید واو دو دختر انش در مغارہ ساکن شدند۔ و دختر بزرگ بہ دختر کوچک گفت کہ پدر ما پیر شد و کسے در زمین نیست کہ موافق عادت کل زمین بما در آید۔ بیا پدر خود را شراب بنوشانیم و با او بخوابیم و از پدر خود نسلے را زندہ نگاہ داریم۔ پس دراں شب پدر خویشتن را شراب نوشانیدند و دختر بزرگ داخل شدہ با پدر خود خوابید و اند بوقت خوابیدنش و نہ بوقت برخاستنش اطلاع نام رسانید۔ و روز دیگر واقع شد کہ دختر بزرگ بہ دختر کوچک گفت کہ اینک دی شب با پدر خود خوابیدم امشب نیز او را شراب نوشانید و تو داخل شدہ با او بخوابی وا پدر خود نسلے را زندہ نگاہ داریم' و آں شب نیز پدر خود را شراب نوشانیدند و دختر کوچک برخاستہ با او خوابید کہ او بوقت خوابیدنش و نہ برخاستنش اطلاع بہم رسانید۔ و دو دختر لوط از پدر خود شان حاملہ شدند۔ و دختر بزرگ پسرے را زائید و اسمش را مواب نامید کہ بحال پدر موابیاں اوست۔ و دختر کوچک او نیز پسرے را زائید و اسمش را بن عمی نامید کہ تا بحال پدر بنی عموں اوست'' (سفر تکوین باب ۱۹ آیت ۳۰ لغایت ۳۸)

حضرت لوط اور ان کی بیٹیوں کی نسبت جو کچھ اس مقام میں لکھا ہے عیسائی اس سب کو قبول کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ حضرت لوط نے اپنی صلبی بیٹیوں سے مقاربت کی تھی مگر ایسا یقین کرنا درحقیقت تضحیک کے قابل ہے اگر ایسا ہوا ہوتا تو کیا یہ ایک مقدس شخص کی تہذیب اور متانت کے متناقض نہیں ہے؟ اور کیا حضرت لوط جیسے پاک شخص کے خلاف شان نہیں ہے؟
مسلمان اس بات کو تسلیم نہیں کرتے اور قرآن مجید میں اگرچہ لوط کا قصہ ہے مگر اس میں یہ بات کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں سے

مقاربت کی تھی مذکور نہیں ہے۔

توریت مقدس میں جو کچھ بیان ہے اس کی نسبت ہم خیال کرتے ہیں کہ جو معنی عیسائی مصنفوں نے لئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ آٹھویں آیت میں لوط کا قول لکھا ہے کہ "مرا دو دختریست کہ مردے را ندنستہ اند تمنا اینکہ ایشاں را بہ شما بیروں آدرم و با ایشاں آنچہ درنظر شما پسند است بکنید"۔

قرآن مجید میں اس جگہ تثنیہ کا لفظ نہیں ہے بلکہ جمع کا ہے جیسا کہ سورۂ ہود میں ہے "هٰؤلاء بناتی هن اطهر لکم" اور سورۂ حجر میں ہے "قال هٰؤلاء بناتی ان کنتم فاعلین" مسلمان عالموں کا قول مختار یہ ہے کہ لفظ "بنات" سے حضرت لوط کی صلبی بیٹیاں مراد نہیں ہیں بلکہ قوم کی عورتیں مراد ہیں اور یہ بات حضرت لوط نے اس مراد سے کہی تھی جیسے کہ وہ ہمیشہ ان کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ تم اپنی خراب عادت فعل خلاف فطرت انسانی کو چھوڑو اور عورتوں سے نکاح کرو اور ان کے ساتھ رہو کہ وہ تمہارے لئے پاکیزہ زندگی ہیں۔

توریت مقدس میں اس مقام پر لفظ بنوث آیا ہے جو بمعنی بنت کے ہے۔ مگر جس طرح عربی زبان میں بنت کا استعمال سوائے اصلی بیٹیوں کے اور عورتوں پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح عبرانی زبان میں بھی عام عورتوں پر بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ولیم سمتھ کی عبرانی ڈکشنری میں لفظ "بث" اور "بنوث" کی نسبت لکھا ہے کہ وہ عام عورتوں پر بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ کتاب امثال سلیمان باب ۳۱ آیت ۲۹ میں استعمال ہوا ہے۔ پس اس مقام میں بھی اس لفظ سے اصلی بیٹیاں مراد نہیں ہیں عورتیں مراد ہیں بلکہ غالباً لونڈیاں۔ کیونکہ حضرت لوط کی جو بیٹیاں تھیں جیسے کہ سفر تکوین باب ۱۹ آیت ۱۲ میں لکھا ہے ان کی شادیاں ہو چکی تھیں اور ان کے شوہر موجود تھے۔

جب حضرت لوط سدوم سے فرار ہوئے تو ان کے داماد اور ان کی بیٹیاں ان کے ساتھ نہیں گئے صرف حضرت لوط کی بیوی اور وہی دو عورتیں جن کا اوپر ذکر ہوا اور جن کو بیٹیاں کر کے تعبیر کیا ہے اور جو غالباً لونڈیاں تھیں ساتھ گئی تھیں۔ راستہ میں ان کی بیوی زندہ نہیں رہی صرف دو چھوکریاں ان کے ساتھ تھیں۔

قرآن مجید میں اگرچہ اس مقاربت کا جو مغائرہ کوہ میں ان دونوں چھوکریوں نے حضرت لوط کے ساتھ کیا کچھ ذکر نہیں ہے لیکن جو کچھ کہ توریت مقدس میں لکھا ہے اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی ان دونوں چھوکریوں کا حضرت لوط کی اصلی بیٹیاں ہونا اسی وجہ سے جو ہم نے اوپر بیان کی قابل یقین نہیں ہے اور جب کہ وہ لونڈیاں تھیں تو ان کے ساتھ مقاربت گو کہ وہ دھوکے ہی سے ہو بموجب اس زمانے کی شریعت کے ناجائز نہ تھی۔

سفر تکوین باب ۱۹ آیت ۳۲، ۳۴ میں لکھا ہے کہ ان دونوں چھوکریوں نے حضرت لوط کو باپ کہہ کر تعبیر کیا ہے اس کہنے سے بھی ان چھوکریوں کا اصلی بیٹیاں ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ باپ کا لفظ بہت زیادہ عام ہے اور اس کا اطلاق مالک اور بزرگ شخص پر عموماً ہوتا ہے۔

سر ولیم میور کے اس بیان کو کہ بنی عمان عرب کے کسی حصہ میں آباد نہیں ہوئے۔ بلکہ شمال ہی میں رہے ہم تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے نزدیک بنی عمان خلیج فارس کے برابر برابر بستے تھے اور ان کا نام اب تک اس حصہ عمان میں پایا جاتا ہے جو تمام قطعہ کے درمیان موجود ہے۔ اگر بنی عمان عرب میں آباد نہیں ہوئے تھے جیسے کہ سر ولیم میور کی رائے ہے تو ان کو اقوام عرب میں شمار کرنا

مناسب نہ تھا۔

تمام عرب المستعربہ میں جو تارح کی نسل سے ہیں صرف بنی اسمٰعیل ہی کی کثرت ہوئی اور کچھ عرصہ کے بعد مختلف قوموں اور شعبوں میں منقسم ہو گئے مگر ان کے مقابل کی قومیں ایک سکون اور غیر مبدل حالت میں رہیں۔

جبکہ ہم ان قوموں کے شعبوں کا شمار اور حال بیان کریں گے تو یہ بات ظاہر ہو گی کہ ایک قوم کے کسی شخص کو اپنی قوم چھوڑ کر دوسری قوم میں جا ملنا اگر بالکل ناممکن نہ تھا تو حد سے زیادہ دشوار تو ضرور تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ اس زمانہ میں تمدنی حالت نہایت محدود تھی اور لوگ اپنے مورثوں کے کارہائے نمایاں کی بڑی عظمت کرتے تھے اور ان کو فخریہ یاد رکھتے تھے اور ہر ایک شریف قوم کا آدمی خود سرائی کا بندہ تھا اور بالتخصیص عرب کی مختلف قومیں اپنی قوم کی امتیاز موجودہ کو قائم اور برقرار رکھنے اور اپنی قوم کو اور قوموں کی ملاوٹ سے علیحدہ رکھنے میں نہایت درجہ محتاط تھیں۔

مندرجہ ذیل فہرست ان قوموں کی ہے جو سکون اور غیر مبدل حالت میں رہیں۔

۱۔ بنی ناحور بن تارح سے بنو ناحور
۲۔ ہاران ابن تارح سے بنو ہاران
۳۔ مواب ابن لوط ابن ہاران ابن تارح سے بنو موآب
۴۔ عمان ابن لوط سے بنو عمان
۵۔ اولاد ابراہیم سوائے اولاد اسمٰعیل سے بنو ابراہیم
۶۔ اولاد ابراہیم بطن قطورہ سے بنو قطورہ
۷۔ عیسو عرف ادوم ابن اسحٰق ابن ابراہیم سے بنو ادوم
۸۔ اسمٰعیل ابن ابراہیم سے بنو اسمٰعیل، مگر اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں کے نام علیحدہ علیحدہ بارہ قومیں چلیں۔

مندرجہ ذیل قومیں اسمٰعیل کی اولاد میں ہیں جو بمقابل اور قوموں کے بہت جلد بڑھ گئیں اور عرب کے تمام ملک میں پھیل گئیں۔

۹۔ نبایوث سے نبایوث
۱۰۔ قیدار سے بنو قیدار
۱۱۔ ادبئیل سے بنو ادبئیل
۱۲۔ مبسام سے بنو مبسام
۱۳۔ مشماع سے بنو مشماع
۱۴۔ حدر سے بنو حدر
۱۵۔ مسا سے بنو مسا
۱۶۔ حدر سے بنو حدر
۱۷۔ تیما سے بنو تیما
۱۸۔ یطور سے بنو یطور
۱۹۔ نافش سے بنو نافش
۲۰۔ قیدماہ سے بنو قیدماہ

حضرت اسمٰعیل کے بارہ بیٹوں میں سے قیدار کی اولاد نے ایک عرصہ کے بعد شہرت حاصل کی اور مختلف شاخوں میں متفرع ہو گئی۔ مگر بہت صدیوں تک یہ بھی اپنی اصلی حالت پر رہی اور مدت تک ان میں ایسے لائق اور نامی اشخاص جنہوں نے اپنی لیاقتوں اور عجیب وغریب قابلیتوں کی وجہ سے نامور ہونے کا استحقاق حاصل کیا ہو یا سلطنتوں اور قوموں کے بانی ہوئے ہیں پیدا نہیں ہوئے۔ اور اسی وجہ سے قیدار کی اولاد کی تاریخ کے سلسلہ کو مرتب کرنے میں بہت سی صدیوں کا فصل واقع ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا امر ہے جس سے عرب کی قومی اور ملکی روایت جو حضرت اسمٰعیل کی نسبت چلی آتی ہے کما حقہٗ تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک جلا وطن ماں اور بیٹے کی اولاد کی کثرت اور ترقی کے واسطے جو ایسی بے کس اور مصیبت زدہ حالت میں خانہ بدر کی گئی تھی ضرور بلکہ یقیناً ایک

عرصہ درکار ہوا ہوگا۔ خصوصاً ایسی ترقی کے واسطے جس نے انجام کاران کو دنیا کی تاریخ میں ایک نہایت نامور اور ممتاز جگہ پر پہنچایا اور ان کی اولاد نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں کیے جن کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

مگر باوجود ان تمام باتوں کے ہم عرب کی تاریخ میں قیدار کی اولاد میں اس قوم کی ابتدا سے اس وقت تک کہ اس کو شہرت ہوئی آٹھ نام پاتے ہیں یعنی حمل، نابت، سلامان، الھمیسع، الیسع، اوو، اعد، عدنان۔

یہ وہی عدنان ہے جس کا بیٹا عک یمن کا بادشاہ ہوا تھا اور جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

مندرجہ ذیل قبائل عدنان کی اولاد میں ہیں:

۲۱۔ ایاد ابن معد ابن عدنان سے ایادی
۲۲۔ قنص ابن معد سے قنصی
۲۳۔ مضر ابن نضر ابن معد سے بنو مضر
۲۴۔ ربیع ابن نضر ابن معد سے بنو ربیعہ
۲۵۔ اسد ابن ربیع سے بنو اسد
۲۶۔ صبیعہ ابن ربیعہ سے بنو صبیعہ

قبائل ذیل بیعہ کی اولاد میں ہیں:

۲۷۔ بنو ابوالکلب
۲۸۔ بنو شحنہ
۲۹۔ جدیلہ ابن اسد ابن ربیع سے بنو جدیلہ
۳۰۔ عنزہ ابن اسد سے بنو عنزہ
۳۱۔ عمیر ابن اسد سے بنو عمیر
۳۲۔ عبدالقیس ابن اقصیٰ ابن دومی ابن جدیلہ سے عبدالقیس
۳۳۔ الدیل ابن شن ابن اقصیٰ ابن عبدالقیس سے بنو الدیل شنی

قبائل ذیل الدیل کی اولاد میں ہیں:

۳۴۔ بنو بحشہ
۳۵۔ ضوحان ابن وادیہ ابن نکیر ابن اقصیٰ ابن عبدالقیس وائلہ سے بنو وائلہ
۳۶۔ انمار ابن عمرو ابن وادیہ سے بنو انمار
۳۷۔ عجل ابن عمرو سے بنو عجل قیسی
۳۸۔ محارب ابن عمرو سے بنو المحارب
۳۹۔ الدیل ابن عمرو سے بنو الدیل

قبائل ذیل الدیل کی شاخ ہیں:

۴۰۔ بنو صوحان
۴۱۔ العوق ابن عمرو ابن وادیہ سے بنو العوق یا عوقی
۴۲۔ اولاد بکر ابن ہیبت ابن عمرو ابن غنم ابن تغلب ابن وائل ابن قاست ابن حسب ابن اقصیٰ ابن دومی ابن جدیلہ سے الاراقم
۴۳۔ بکر ابن وائل ابن قاست سے بنو بکر
۴۴۔ ثعلب ابن وائل ابن قاست سے بنو ثعلب

قبائل ذیل ثعلب کی اولاد میں ہیں:

۴۵۔ بنو عکب
۴۶۔ بنو عدی

۴۷۔ بنوکنانہ یا قریش ثعلب
۴۸۔ بنوزہیر
۴۹۔ بنوعتاب
۵۰۔ غنم ابن حبیب ابن کعب ابن یشکر ابن دایل
۵۱۔ لجیم ابن صعب ابن علی ابن بکر سے بنو لجیم
قبائل ذیل لجیم کی اولاد میں ہیں:
۵۲۔ بنوہفان
۵۳۔ بنوعجل
۵۴۔ اولاد مالک ابن صعب سے بن ازمان
۵۵۔ ذہل ابن ثعلبہ ابن عقبہ ابن صعب سے بنوذہل
۵۶۔ شیبان ابن ثعلبہ سے بنوشیبان
قبائل ذیل شیبان کی اولاد میں ہیں:
۵۷۔ بنوالورشہ
۵۸۔ بنوالجدرہ
۵۹۔ بنوالشقیقہ
۶۰۔ اولاد تیم اللات ابن ثعلبہ سے اللھازم
۶۱۔ سدوس ابن شیبان اہل ذہل سے سدوی
۶۲۔ قمہ عرف قیس عیلان ابن الیاس ابن مضر سے قیس عیلانی یا بنوقیس
۶۳۔ عمروابن قیس عیلان سے بنوعمرو
قبائل ذیل عمرو کی اولاد میں ہیں:
۶۴۔ بنوخارجہ
۶۵۔ بنواوابش
۶۶۔ بنویشکر
۶۷۔ بنوعوف
۶۸۔ بنورہم
۶۹۔ بنورباح
۷۰۔ سعدابن قیس عیلان سے بنوسعدہ
۷۱۔ غطفان ابن سعد سے بنوغطفان
۷۲۔ معن ابن عسرا بن سعد سے بنومعن
۷۳۔ غنی ابن عسر سے بنوغنی
قبائل ذیل غنی کی اولاد میں ہیں:
۷۴۔ بنوضبینہ
۷۵۔ بنوبحثہ
۷۶۔ بنوعبید
۷۷۔ منبہ ابن عسر سے بنومنبہ
قبائل ذیل منبہ کی اولاد میں ہیں:
۷۸۔ بنوحسر
۷۹۔ بنوسنان
۸۰۔ اشجع ابن غطفان ابن صعب سے بنواشجع
قبائل ذیل اشجع کی شاخ ہیں:
۸۱۔ بنودہمان
۸۲۔ دیبان ابن بغیض ابن رائس ابن غطفان سے بنو سعد

۸۳۔ بنوفزارہ
۸۴۔ بنوالعشراء
۸۵۔ عبس ابن بغیض سے بنوعبس
۸۶۔ سعد ابن ذبیان ابن بغیض سے بنوسعد

قبائل ذیل سعد کی اولاد میں ہیں:

۸۷۔ بنوحجاش
۸۸۔ بنوشمیخ
۸۹۔ بنوحشور
۹۰۔ خصفہ ابن قیس عیلان سے بنوخصفہ

قبائل ذیل خصفہ کی شاخ ہیں:

۹۱۔ بنوجسر
۹۲۔ ابو مالک بن عکرمہ ابن خصفہ سے بنوابو مالک
۹۳۔ منصور ابن عکرمہ سے بنوسلیم

قبائل ذیل منصور کی اولاد میں ہیں:

۹۴۔ بنوحرام
۹۵۔ بنوخفاف
۹۶ بنوذکوان
۹۷۔ بنورعل
۹۸۔ بنوذکوان
۹۹۔ بنومطرود
۱۰۰۔ بنوبہز
۱۰۱۔ بنوقنفذ
۱۰۲۔ بنورفاعہ
۱۰۳۔ بنوشرید
۱۰۴۔ بنوقبتہ
۱۰۵۔ سلامان ابن عکرمہ سے سلامانی
۱۰۶۔ ہوازن ابن منصور سے بنوہوازن
۱۰۷۔ مازن ابن منصور سے ابو مازن
۱۰۸۔ سعد ابن بکر ابن ہوازن سے بنوسعد
۱۰۹۔ نصر ابن معاویہ ابن بکر سے بنونصر
۱۱۰۔ مرہ ابن صعصعہ ابن معاویہ سے بنومرہ یا بنواسلول
۱۱۱۔ نمیر ابن عامر ابن صعصعہ سے نمیری
۱۱۲۔ ہلال ابن عامر سے بنوہلال
۱۱۳۔ ربیعہ ابن عامر سے بنومجد
۱۱۴۔ اولاد عمرو ابن عامر سے بنوالبکا
۱۱۵۔ معاویہ ابن کلاب سے بنودران
۱۱۶۔ جعفر ابن کلاب سے بنوجعفر
۱۱۷۔ اولاد عمرو ابن کلب سے بنودران
۱۱۸۔ اولاد عبداللہ ابن کعب ابن ربیعہ سے بنوالعجلان
۱۱۹۔ اولاد قشیر ابن کعب سے بنوضمرہ
۱۲۰۔ اولاد منبہ ابن ہوازن سے ابوثقیف

قبائل ذیل ابوثقیف کی اولاد میں ہیں:

۱۲۱۔ بنومالک
۱۲۱۔ بنواحلاف
۱۲۳۔ طانجہ ابن الیاس ابن مضر سے بنوطانجہ
۱۲۴۔ تیم ابن عبدمنات ابن عدا بن طانجہ
۱۲۵۔ عدی ابن عبدمنات سے بنوعدی
۱۲۶۔ ثور ابن عبدمنات سے ثوری

قبائل ذیل عبدمنات کی اولاد میں ہیں:

۱۲۷۔ الرباب
۱۲۸۔ بنونصر
۱۲۹۔ بنومازن
۱۳۰۔ بنوالیسل
۱۳۱۔ بنوعایذہ
۱۳۲۔ بنوتیم اللات
۱۳۳۔ بنوزبان
۱۳۴۔ بنوعوف
۱۳۵۔ بنوشیم
۱۳۶۔ بنوالزحل
۱۳۷۔ بنوبجالہ
۱۳۸۔ مزینہ ابن عدا ابن طانجہ سے مزنی
۱۳۹۔ مرابن عد سے بنوظاعنہ

قبائل ذیل ظاعنہ کی شاخ ہیں:

۱۴۰۔ بنوصوفہ
۱۴۱۔ تمیم ابن مر سے بنوتمیم

قبائل ذیل تمیم کی اولاد میں ہیں:

۱۴۲۔ جسطات
۱۴۳۔ بنوعصیہ
۱۴۴۔ البراجم
۱۴۵۔ بنوکلیب
۱۴۶۔ بنوریاح
۱۴۷۔ بنومرہ
۱۴۸۔ بنومقرہ
۱۴۹۔ بنوحمان
۱۵۰۔ بنوحنظلہ
۱۵۱۔ بنودارم
۱۵۲۔ بنوعدویہ
۱۵۳۔ بنولطہیہ
۱۵۴۔ آل صفوان
۱۵۵۔ آل عطارد
۱۵۶۔ بنوعوف
۱۵۷۔ مدرکہ ابن الیاس ابن مضر سے بنومدرکہ یا بنوخندف
۱۵۸۔ خدیل ابن مدرکہ سے بنوہذیل یا ہذیلی
۱۵۹۔ تمیم ابن سعد ابن ہذیل سے بنوتمیم
۱۶۰۔ حریب ابن سعد سے بنوحریب
۱۶۱۔ مناعہ ابن سعد سے بنومناعہ
۱۶۲۔ خناعہ ابن سعد سے بنوخناعہ
۱۶۳۔ جہم ابن سعد سے جہم
۱۶۴۔ غنم ابن سعد سے غنمی
۱۶۵۔ حرث ابن سعد سے حرثی
۱۶۶۔ خزیمہ ابن مدرکہ سے بنوخزیمہ
۱۶۷۔ الہون ابن خزیمہ سے بنوالہون

قبائل ذیل الہون کی اولاد میں ہیں:

۱۶۸۔ بنوالقارہ
۱۶۹۔ عضلی
۱۷۰۔ الدیشی
۱۷۱۔ اسد ابن خزیمہ سے بنواسد
۱۷۲۔ دودان ابن اسد سے دودانی
۱۷۳۔ کاہل ابن اسد سے کاہلی
۱۷۴۔ حملہ ابن اسد سے حملی
۱۷۵۔ عمرو ابن اسد سے عمروی

قبائل ذیل عمرو کی اولاد میں ہیں:

۱۷۶۔ بنوقنعس
۱۷۷۔ بنوالصیدا
۱۷۸۔ بنونصر
۱۷۹۔ بنوالزنیہ
۱۸۰۔ بنوعاضرہ
۱۸۱۔ بنوغعالہ
۱۸۲۔ کنانہ ابن خزیمہ سے بنوکنانہ
۱۸۳۔ مالک ابن کنانہ سے ابو مالک

قبائل ذیل مالک کی اولاد میں ہیں:

۱۸۴۔ بنوفقین
۱۸۵۔ بنوفراس
۱۸۶۔ بنوبجر
۱۸۷۔ ملکان ابن کنانہ سے بنوملکان
۱۸۸۔ عبدمنات ابن کنانہ سے بنوعبدمنات

قبائل ذیل عبدمنات کی اولاد میں ہیں:

۱۸۹۔ بنومدلج
۱۹۰۔ بنوجذیمہ
۱۹۱۔ بنولیث
۱۹۲۔ بنوالدیل
۱۹۳۔ بنوضمرہ
۱۹۴۔ بنوغفار
۱۹۵۔ بنوعریج
۱۹۶۔ عمروابن کنانہ سے بنومالک
۱۹۷۔ عامرابن کنانہ سے عامریوں

قبائل ذیل کنانہ کی اولاد میں ہیں:

۱۹۸۔ الاحابیش
۱۹۹۔ نضرابن کنانہ سے بنوالنضر
۲۰۰۔ مالک ابن نضر سے بنومالک
۲۰۱۔ الحرث ابن مالک سے مطیبین

قبائل ذیل الحرث کی شاخ ہیں:

۲۰۲۔ بنوالخلج
۲۰۳۔ فہرابن مالک سے بنوفہر یا قریش
۲۰۴۔ محارب ابن فہر سے بنومحارب
۲۰۵۔ غالب ابن فہر سے بنوغالب
۲۰۶۔ تیم ابن غالب سے بنوتیم یا بنوالادرم
۲۰۷۔ لوی ابن غالب سے بنولوی
۲۰۸۔ عامرابن لوی سے بنوعامر

قبائل ذیل عامر کی اولاد میں ہیں:

۲۰۹۔ حسل
۲۱۰۔ معیص
۲۱۱۔ سامہ ابن لوی سے بنوسامہ
۲۱۲۔ سعدابن لوی سے بنوسعد

قبائل ذیل سعد کی شاخ ہیں:

۲۱۳۔ بنانہ
۲۱۴۔ خزیمہ ابن لوی سے بنوخزیمہ

قبائل ذیل خزیمہ کی شاخ ہیں:

۲۱۵۔ بنوعایذہ
۲۱۶۔ حرث ابن لوی سے بنوالحرث
۲۱۷۔ عوف ابن لوی سے بنوالعوف
۲۱۸۔ کعب ابن لوی سے بنوکعب
۲۱۹۔ عدی ابن کعب سے بنوعدی
۲۲۰۔ ھصیص ابن کعب سے بنوھصیص

قبائل ذیل ھصیص کی اولاد میں ہیں:

۲۲۱۔ بنوسہم
۲۲۲۔ بنوجمح
۲۲۳۔ مرہ ابن کعب سے بنومرہ
۲۲۴۔ تیم ابن مرہ سے بنومرہ
۲۲۵۔ مخزوم ابن مرہ سے بنومخزوم
۲۲۶۔ کلاب ابن مرہ سے بنوکلاب
۲۲۷۔ زہرہ ابن کلاب سے بنوزہرہ
۲۲۸۔ قصی ابن کالب سے بنوقصی یا مجمع

قبائل ذیل کلاب کی اولاد میں ہیں:

۲۲۹۔ نوفلیون
۲۳۰۔ عبدالدار ابن قصیٰ سے داری

قبائل ذیل عبدالدار کی اولاد میں ہیں:

۲۳۱۔ شیبی
۲۳۲۔ امیہ ابن عبدالشمس ابن عبدمناف ابن قصیٰ سے بنوامیہ
۲۳۳۔ ہاشم ابن عبدمناف سے بنوہاشم
۲۳۴۔ عبدالمطلب ابن ہاشم سے بنومطلب
۲۳۵۔ عباس ابن عبدالمطلب سے عباسی
۲۳۶۔ علی ابن ابوطالب ابن عبدالمطلب سے علوی
۲۳۷۔ فاطمہ بنت محمد ﷺ سے سادات بنی فاطمہ

اس مطلب سے کہ اقوام مذکورہ بالا کا سلسلہ بخوبی ذہن نشین ہو جائے اور آسانی سے سمجھ میں آ جائے اس مقام پر ایک شجرہ عرب مستعربہ کی قوموں کا شامل کیا جاتا ہے۔

عرب کی قوموں کے بیان کو ختم کرتے وقت اس بات کا بیان کرنا مناسب ہے کہ عرب میں ایک دستور تھا کہ ایک ضعیف قوم یا وہ قوم جو زوال کی حالت میں پڑ جاتی تھی اکثر اپنے آپ کو کسی زبردست قوم میں ملا دیتی تھی۔ اس اختلاط کے مقصد کو نہ سمجھنے سے غیر ملک کے مؤرخ بڑی غلطی میں پڑے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعضوں نے یہ خیال کیا ہے اور بعض مؤرخ اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ ایسا اختلاط نسب کے اختلاط سے علاقہ رکھتا ہے اور اس کے بعد وہ دونوں قومیں ایک ہی لقب یعنی زبردست قوم کے لقب نسبی سے ملقب ہو جاتی تھیں اور اسی بناء پر ان کا مقولہ ہے کہ عرب کی قومیں انقلابات اجتماع کے ہمیشہ زیر مشق رہی ہیں۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ وہ دونوں قومیں اس طرح پر مخلوط نہیں ہوتی تھیں کہ ایک ہی مورث اعلیٰ کی نسل سے خیال کی جاتی ہوں بلکہ اس اختلاط کے یہ معنی تھے کہ زیر دست قوم زبردست قوم کے تابع اور اس قوم کے قوانین اور رسم و رواج کی پابند ہو جاتی تھیں اور ضرورت کے وقت ہر ایک امر میں اس قوم کی ساتھی اور مددگار ہوتی تھیں۔ دونوں قوموں کے آدمی ایک ہی نامی سردار کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے تھے اور اگر ان دونوں قوموں کے کسی آدمی سے کوئی جرم سرزد ہوتا تھا جس کے عوض تمام قوم سے تاوان لئے جانے کا دستور تھا تو وہ تاوان برابر دونوں قوموں پر عاید ہوتا تھا۔

لفظ سراسین کی تحقیق

اس خطبہ کے ختم کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ لفظ ''سراسین'' کی بابت جو یونانیوں نے زمانہ جاہلیت کے بعض عربوں کی نسبت استعمال کیا ہے اور جس کا اطلاق انجام کار تمام جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں پر قبل ظہور اسلام اور نیز بعد ظہور اسلام ہو گیا ہے کچھ گفتگو کی جائے۔ متعدد مؤرخوں نے اپنی ذہانت کو اس لفظ کے ماخذ کے بیان کرنے کی کوشش میں صرف کیا ہے ہر ایک نے ایک نیا ڈھنگ اس کے ماخذ تلاش کرنے کا اختیار کیا ہے جس نے بار ہا پرانے تعصبات کو ظاہر کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ بات کافی ہے کہ رورنڈ پوکاک صاحب نے اپنی کتاب تاریخ عرب میں جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے بعینہ اس کو اس مقام پر ترجمہ کر دیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ اس مضمون پر ہمارے مصنفوں نے اب تک جو کچھ چھاپا ہے اس میں کسی جگہ میں اس امر کی قابل اطمینان دلیل نہیں پاتا ہوں کہ وہ لوگ جو پہلے عرب کہلاتے تھے آخر میں ''سراسین'' کے نام سے کیوں موسوم ہوئے۔ جن لوگوں نے کہ اس نام کو ''سرح'' سے مشتق کیا ہے ان کی رائے کی کماحقہ تردید ہو گئی ہے۔ اب عموماً یہ گمان ہے کہ یہ نام ''سرق'' (چوری) سے نکلا ہے جس سے ایک وحشی اور لٹیری قوم سے صریح مراد ہے۔ مگر یہ نام ان کو کہاں سے ملا؟ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہ نام خود انہیں کے ہاں سے نہیں شروع ہوا ہو گا بلکہ کسی اور قوم کی زبان سے یہ لفظ لیا گیا ہے۔ کیونکہ عرب ایسے نام کو جو موجب رسوائی اور ذلت کا ہے اپنے لئے کب گوارا کرتے۔ اب عالموں کو یہ تحقیق کرنا باقی ہے کہ آیا ان لوگوں کے نام کو جو عام طور پر اور علانیہ قزاقی اور رہزنی کے لئے مشہور ہیں لفظ ''سرق'' سے مشتق کرنا جائز ہو سکتا ہے جس کے معنی خفیہ چوری کرنے کے ہیں یا نہیں۔ اب اگر کوئی 'سراسین' کی تحقیق میں میری تبعیت کرنا چاہے تو اس کو اپنی آنکھیں شرق کی طرف کھولنی چاہئیں کس واسطے کہ ''سراسینس'' اور ''سراسی نائے'' کی آواز میں ''شرقی'' اور اس کی جمع ''شرقیوں'' اور ''شرقین'' کی نسبت کیا فرق ہو گا جس کے معنی اہل الشرق یعنی باشندگان شرق کے ہیں۔ جس طرح کہ سابق میں عربوں کو علی الخصوص یہودی خیال کرتے تھے کیونکہ اس کی سرزمین کا شرقی حصہ (حسب قول طاسیطوس) عرب سے محدود ہے۔ اسی طرح توریت مقدس (سفر تکوین باب ۱۰ آیت ۳۰) یقطان کی اولاد کو جو عرب تھی مشرق میں بیان کرتی ہے یعنی ساحل کے اس حصہ پر جو مابین ''بشام'' اور ''سفا'' کے مشرق میں ایک پہاڑ واقع ہے۔ یعنی اگر ''آرساڈیاس'' قابل اعتبار ہو ''**من مكة الى تجئى مدينة الجبل الشرقي**'' یعنی مکہ سے وہاں تک کہ تم اس مشرقی پہاڑ کے شہر تک آؤ۔

یا جیسا کہ مسودہ ''کوڈیکس'' میں مرقوم ہے۔ ''**اى المدينة الشرقي**'' یعنی مشرقی شہر تک (جس سے میری دانست میں مدینہ منورہ مراد ہے) جو جانب مشرق واقع ہے۔ حضرت سلیمان کی عقل تمام اہل الشرق کی عقل سے بڑھ کر خیال کی گئی ہے یعنی (حسب بیان اس یہودی کے گو وہ کوئی ہو جس نے کہ صحف ملوک کا عربی میں ترجمہ کیا ہے) ''سراسین'' یا عربوں کی عقل سے اس طرح یرمیاہ نبی (باب ۴۹ آیت ۲۸) میں اعراب بنی قیدار کو ''اہل الشرق'' کہا ہے۔ علامہ ہیو ''گوگر دشیس'' بیان کرتا ہے کہ عیسائیان سابق کی یہ رائے تھی کہ وہ عقلاء جو حسب بیان متی حواری (باب ۲۱) پرستش کو آئے تھے ملک عرب سے آئے تھے اور اس کا خود بھی یہی عقیدہ تھا۔ نناسوس (فولیس مین) لکھتا ہے کہ میں نے اپنی سفارت کی جو بجانب بنی عشو فیہ بنی حمیر اور سراسین اور دیگر اقوام پرتش کنندہ کی تھی تعمیل کر دی۔ اس لئے ''سراسینس'' کا اور مشرقی اقوام کے زمرہ میں شامل ہونا صرف اسی وجہ سے تھا کہ وہ

مشرق میں آباد تھے۔محمد فیروز آبادیؒ صفی الدین اور دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ مشرق کے چند اور مقامات بھی بدیں وجہ کہ وہ مشرق کے اور حصوں میں واقع تھے بنام ''شرقہ'' و''شرقیہ'' موسوم تھے اور ان کا یہ بھی بیان ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ ایسے مقامات کے باشندے اہل الشرق کہلاتے ہیں۔ایسی ہی دلیل سے ان لوگوں کو بھی جو ایسے ملک میں بستے ہوں کہ بلحاظ اور ملکوں کے ''الشرق'' یعنی پورب کہلاتا ہو اسی نام سے ملقب کیوں نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ اپنے اور ان لوگوں کے درمیان جو اپنی ہی بولی میں اپنے آپ کو مغربی یعنی باشدہ ہائے ملک مغرب ''المغاربہ'' کہلاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو عرب میں متوطن ہیں ''مشارقہ'' یا ''سراسینس'' کیے جا سکتے ہیں اور یہ نام ان کی عادات واوضاع کے لحاظ سے نہیں رکھا گیا ہے بلکہ باعتبار ان کی جائے سکونت کے رکھا گیا ہے۔اسی طرح سے تم اس مشہور ومعروف حکیم بوعلی سینا کی اس نامی کتاب کا نام ''سراسینک فلاسفی'' یعنی ''الفلسفہ المشرقیہ'' کچھ اس کی جاہلیت کی وجہ سے نہیں کہتے ہو بلکہ اس کے مشرقی ہونے کے سبب سے۔رہی یہ بات کہ عربی حرف ش کا یونانی Σ کے مانند تلفظ ہوا ہے اس سے کوئی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ وہ عبرانی حرف کا بھی اسی طرح تلفظ کرتے تھے۔لفظ ''سراسینس'' کا ایک اور مادہ بھی ہو سکتا ہے یعنی ''شرک'' اس واسطے کہ وہ خدائے واحد کے شریک قرار دیتے تھے لیکن یہ نام جو قدیمی عربوں کی نسبت اس قدر موزوں ہے مسلمان لوگ ان کا اطلاق ازراہ بے انصافی وناحق اندیشی عیسائیوں پر کرتے ہیں اور عیسائی اس سے استغفار بھیجتے ہیں مگر یہ امر ہمارے مضمون سے علاقہ نہیں رکھتا۔

ہمارے اس خطبہ کے ساتھ ملک عرب کا ایک نقشہ بھی ہوگا جس سے امید ہے کہ اکثر متنازعہ فیہ مقامات مختلف قوموں کی سکونت گزینی کا ٹھیک مقام، بہت سے بیانوں کا صحیح صحیح موقع، پہاڑوں شہروں وغیرہ کی کیفیت واصلیت دریافت ہو جائے گی۔

شاید اس کے پڑھنے والے کو توقع ہو کہ نامی گرامی شہر مکہ معظمہ کا مفصل حال، اس کی بناء کی کیفیت، سنگ اسود کی اصلیت اور ان رسوم کی ابتدا اور ان کی حقیقت جو بیت اللہ میں کی جاتی ہیں، یہ سب باتیں اس خطبہ میں دریافت ہوں گی لیکن چونکہ ایسے عظیم الشان اور دلچسپ مضامین کی کامل تشریح کی اس خطبہ میں گنجائش نہ ہوتی اس لئے ہم ان کا بیان ایک اور خطبہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ کریں گے۔

نقشہ متذکرہ بالا میں ہم نے ان مقامات کو بھی درج کیا ہے جن کا حوالہ توریت مقدس سے دیا ہے اور ان کے ساتھ اس پاک کتاب کے مخصوص بابوں اور آیتوں کا بھی حوالہ دے دیا ہے۔

ان مقامات کی ٹھیک ٹھیک جگہوں کے متعین کرنے میں ہم نے اس بے بہا نقشہ عرب سے فائدہ اٹھایا ہے جس کو رورنڈ کارٹرٹ پی۔کیری۔ایم۔اے نے مرتب کیا ہے۔

النصوص الباهره فی حریة الهاجرة علی اما یستفاد من کتب الیهود افادها

المولوی عنایت رسول جڑیا کوٹی سلمه الله تعالیٰ

ام حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا نام عبرانی زبان میں (ہاغاں اور عربی میں ہاجر) یہ بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں۔

سفر الیشار میں جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے لکھا ہے کہ ''شہر بابل دار السلطنت نمرود میں جہاں تارح یعنی آزر اور ابراہیم

علیہ السلام اور ان کے تمام خاندان کے لوگ رہتے تھے ایک شخص حکیم ہنر مند ذکی الطبع فطین جو اکثر علوم وصنائع میں کمال رکھتا تھا رہتا تھا اس کا نام رقیون تھا مگر وہ بہت مفلس محتاج ومفلوک تھا۔ تنگدستی وسختی سے وطن میں رہنا نامناسب سمجھ کر مصر کی راہ لی۔ جب وہاں پہنچا اور اس کی لیاقت ودانشمندی باشندگان مصر پر ظاہر ہوگئی تو بادشاہِ مصر نے اس کو براہ قدر دانی اعیان سلطنت میں داخل کیا رفتہ رفتہ بالکل حاوی ہوا بالآخر وہاں کا بادشاہ ہوگیا۔ یہ پہلا شخص ہے جس کا لقب فرعون ہوا۔ اسی فرعون کے زمانہ بادشاہت میں بوجہ قحط سالی کے حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین سے مع اپنے اہل بیت کے مصر میں تشریف لے گئے۔

''رقیون'' اور ''ہاغار'' دونوں عبرانی لفظ ہیں اور اس سے استدلال ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں عبرانی یعنی بنی عیبر تھے اور کیا عجب ہے کہ اسی قبیلہ کے ہوں جس قبیلہ کے حضرت ابراہیم تھے اور ظاہراً اسی خیال سے کہ بادشاہ مصر ان کا ہم وطن یا ہم قبیلہ ہے اس قحط و مصیبت میں حضرت ابراہیمؑ نے مصر میں جانے کا قصد کیا ہو جیسا کہ ہر ایک انسان کو ایسے موقع پر اس قسم کا خیال ہوسکتا ہے۔

جب حضرت ابراہیمؑ مصر میں پہنچے اور انہوں نے حضرت سارہ کا اپنی بیوی ہونا ظاہر نہ کیا بلکہ بہن ہونے کو جو رشتہ تھا وہ ظاہر کیا تو فرعون نے حضرت سارہ سے شادی کرنی چاہی اور حضرت ابراہیم کو بہت کچھ دے کر حضرت سارہ کو بقصد شادی اپنے گھر لے گیا۔

اس واقعہ سے بھی استدلال ہوسکتا ہے کہ فرعون بادشاہ مصر کو بسبب ہم قوم ہونے کے زیادہ تر حضرت سارہ سے شادی کرنے کی رغبت ہوئی تھی۔

غرض کہ ہنوز شادی نہ ہونے پائی تھی کہ مختلف قسم کے صدمات فرعون پر واقع ہوئے اور ان کے سبب سے فرعون نے حضرت سارہ کے حال کی زیادہ تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ وہ حضرت ابراہیم کی بیوی بھی ہیں۔ اسی وقت فرعون نے ان کو حضرت ابراہیمؑ کے پاس بھیج دیا اور ہاجرہ اپنی بیٹی کو بھی ان کے سپرد کردیا۔

فرعون نے جو اپنی بیٹی ہاجرہ کو حضرت سارہ کے ساتھ کردیا ظاہراً اس کے کئی سبب معلوم ہوتے ہیں۔ ابراہیم اور سارہ کی نیکی اور بزرگی اور ان کا فرعون وہاجرہ کا ہم قوم ہونا اس بات کے لئے بڑی رغبت ہوئی ہوگی کہ فرعون اپنی بیٹی کو ان کی تعلیم اور تربیت اور صحبت میں سپرد کرے کیونکہ مصری اس کی قوم وقبیلہ سے نہ تھے۔ علاوہ اس کے اس زمانہ میں اور اس خاندان میں شادی وبیاہ میں ہم کفو ہونے کا بہت خیال تھا مصر میں رقیون فرعون مصر کے خاندان کا کوئی شخص نہ تھا اور یہ بہت بڑی ترغیب اس بات کی تھی کہ ہاجرہ سارہ کے سپرد کی جائے تاکہ ان کی تربیت میں رہے اور کہیں کفو میں اس کی شادی ہوجائے۔ رخصت کے وقت فرعون نے اپنی بیٹی ہاجرہ کو سمجھایا کہ تیرا رہنا انکے ساتھ تیرے لئے میرے پاس رہنے سے بہتر ہے۔ اس سمجھانے سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کس خیال سے فرعون نے اپنی بیٹی ان کے سپرد کی تھی۔

بعد اس جب حضرت ابراہیم معہ ہاجرہ فرعون کی بیٹی کے وہاں سے چلے تو فرعون نے ان کے ساتھ پیادے مامور کئے تاکہ بحفاظت پہنچ جائیں۔ چنانچہ یہ سب لوگ بآرام تمام معہ احمال واثقال ولونڈی وغلام وغیرہ کے جو بادشاہ مصر نے ان کو دیئے تھے اپنے ملک میں جہاں انہوں نے سکونت اختیار کی تھی بخیر وخوبی پہنچ گئے اس وقت ابراہیم ہاجرہ کی بدولت بہت دولتمند اور مالدار ہو گئے چنانچہ توریت میں لکھا ہے:

''فصعد ابرام من مصرهو و زوجته و كل ماله ولوط معه الى القبلة وابرام عظيم جدابا بالماشية والفضة والذهب''

ترجمہ اردو: ''اور کوچ کیا ابراہیم نے مصر سے اس نے اور اس کی بیوی نے معہ اپنے کل مال کے اور لوط کے شمال طرف کو۔
(کتاب پیدائش باب ۱۳ آیت ۱'۲)

غرض اس مورخ کے بیان سے ظاہر ہے کہ ہاجرہ بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں تعلیم وتہذیب کے لئے سارہ کے سپرد کی گئی تھیں اور ان کا ہم وطن ہونا بلکہ ادنیٰ تامل سے اہل خاندان سے ہونا پایا جاتا ہے۔

مفسرین توریت بھی حضرت ہاجرہ کو مصر کی بیٹی لکھتے ہیں چنانچہ (ربی شلومو اسحاق) نے کتاب پیدائش کے سولھویں باب کی پہلی آیت کی تفسیر میں جو لکھا ہے اس کو بعینہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

ھی كانت بنت فرعون لمارا الا يات التي اخرجت بساره قال ما اطيب ان تكون بنتي خادمة في بيت ذاو لا ان تكون سيدة في بيت اخر"

ترجمہ اردو: ''وہ فرعون کی بیٹی تھی جب دیکھا ان کرامات کو جو بوجہ سارہ واقع ہوئیں تو کہا بہتر ہے کہ رہے میری بیٹی اس کے گھر میں خادمہ ہو کر اس سے کہ ہو دوسرے کے گھر میں ملکہ۔''

اس عبارت کا ترجمہ اس طرح پر بھی ہوسکتا ہے کہ ''میری بیٹی کا رہنا اس کے خاندان میں خادمہ ہو کر بہتر ہے دوسرے خاندان میں ملکہ ہو کر رہنے سے۔

۱۸۵۰ء میں بمقام کلکتہ اسی بات کا مباحثہ ہوا تھا اور اکثر یہودیوں نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ حضرت ہاجرہ لونڈی نہیں تھیں بادشاہ مصر کی بیٹی تھیں۔

توریت مقدس سے کسی طرح حضرت ہاجرہ کا لونڈی ہونا ثابت نہیں ہے نہایت صاف اور روشن بات ہے کہ اس وقت کے حالات پر ہم جو نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں لونڈی و غلام ہوتے تھے جو لڑائی میں اسیر ہو کر آتے تھے اور وہ (**شیبوث حرب**) کہلاتے تھے یعنی غنیمت جنگ صیف یا وہ لونڈی اور غلام کہلاتے تھے جو خریدے جاتے تھے اور ان کو (**مقنث کسف**) کہتے تھے یا ان کی اولاد لونڈی و غلام ہوتے تھے۔ **یلید بایث ولید البیت** یعنی خانہ زاد مگر حضرت ہاجرہ ان باتوں سے پاک تھیں پھر وہ کیونکر لونڈی ہو سکتی تھیں ان کو لونڈی کہنا محض بہتان ہے۔

اب رہی یہ بات کہ یہودی ان کو کیوں لونڈی کہتے تھے اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہودی بنی اسمٰعیل کی ہمیشہ حقارت کرتے ہیں اور ضد وعداوت سے ایسی باتیں جن سے بنی اسمٰعیل بہ نسبت بنی اسرائیل کے حقیر سمجھے جائیں منسوب کرتے ہیں اور اسی خیال سے ان لوگوں نے غلط طور پر توریت مقدس سے بھی حضرت ہاجرہ کے لونڈی ہونے پر استدلال کیا ہے مگر وہ استدلال سرتاپا غلط اور بالکل تحریف ہے جس کو بالتفصیل ہم بیان کرتے ہیں۔

حضرت سارہ ادھیڑ ہوگئی تھیں اور ان کی اولاد نہ ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے حضرت ہاجرہ کو زوجہ بنانے کی اجازت دی کہ انہیں سے کچھ اولاد پیدا ہو چنانچہ ہاجرہ سے حضرت اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ اس کے چند روز بعد حضرت سارہ بھی حاملہ ہوگئیں اور حضرت اسحٰق پیدا ہوئے۔ حضرت اسحٰق کئی برس کے ہوگئے تھے ان کا دودھ بھی چھوٹ چکا تھا اور حضرت اسمٰعیل ان سے عمر میں کچھ بڑے تھے۔ دونوں میں آپس میں کچھ تکرار ہوگئی۔ جیسا کہ دو بچوں میں ہو جاتا ہے۔ حضرت سارہ کو یہ بات بری معلوم ہوئی اور اس لڑائی جھگڑے میں حضرت ابراہیم سے کہا کہ اس لونڈی کو اور اس کے لڑکے کو نکال دو۔ اس مقام پر جو حضرت سارہ نے حضرت ہاجرہ

کولونڈی کہا اس سے یہ استدلال نہیں ہوسکتا کہ وہ حقیقت میں لونڈی تھیں۔ بلکہ جس طرح عورتیں لڑائی غصہ میں خصوصاً جب کہ دو عورتوں بلکہ سوکنوں میں بچوں پر تکرار ہو جائے ایک دوسری کو تہتک اور حقارت کے کلمے کہہ اٹھتی ہیں۔ اسی طرح حضرت سارہ نے بھی یہ لفظ امہ یعنی لونڈی کا حضرت ہاجرہ کی نسبت کیا۔ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ وہ درحقیقت لونڈی تھیں مگر یہودیوں کو اور جو لوگ یہودیوں کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کو ایک موقع حضرت ہاجرہ کو لونڈی کہنے کا مل گیا۔

حضرت سارہ کی اس بات سے حضرت ابراہیم نہایت ناراض ہوئے مگر خدا نے ان کی تسلی کی اور کہا کہ اس لونڈی اور بچہ کی طرف سے رنج مت کر کہ تو ان کو نکال دے میں اس لونڈی کے بچے سے ایک قوم پیدا کروں گا۔

اس مقام پر جو خدا نے لونڈی کہا وہ بعینہ نقل سارہ کے قول کی ہے یعنی سارہ نے جس کو حقارت سے لونڈی اور لونڈی کا بچہ کہا ہے اسی سے میں ایک قوم پیدا کروں گا۔ یہ ایسی بات ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی لائق آدمی کو کہے کہ یہ نالائق گیا کام کرتا ہے پس اس دوسرے شخص کا بھی اس کو نالائق کہنا اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ درحقیقت وہ شخص نالائق ہے' اور جب کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت ہاجرہ بیٹی رقیون بادشاہ مصر کی بلکہ ہم قوم و ہم وطن ابراہیم کی تھیں۔ اور جو وجوہ رقیت کی اس زمانہ میں تھیں ان سے بھی حضرت ہاجرہ بری تھیں تو ان الفاظ سے جو لڑائی اور جھگڑے وغصہ میں بولے گئے ہیں کسی طرح ان کا واقعی لونڈی ہونا مراد نہیں ہو سکتا۔

علاوہ اس کے لفظ امہ مجازاً محاورہ میں زوجہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ یہودیوں میں دستور تھا کہ دختر کا باپ بروقت شادی کے بعوض دختر کے پسر کے باپ سے کچھ روپیہ لیتے تھے تب بیٹی دیتے تھے جیسے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی بعض قوموں میں دستور ہے اور اس دستور کو بیٹی کا بیچنا کہتے تھے مگر وہ لونڈی نہ ہوتی تھی بلکہ زوجہ شرعی ہوتی تھی۔ اور تمام حقوق زوجیت کے اس کو حاصل ہوتے تھے ایسی زوجہ پر بھی لونڈی کا مجازاً اطلاق ہوا ہے۔ چنانچہ توریت مقدس کی دوسری کتاب باب ۲۱ آیت ساتویں میں لکھا ہے کہ ''خدا نے کہا کہ اگر کوئی شخص اپنی لڑکی کو بیچے (امہ) ہونے کے لئے تو وہ لونڈیوں کی طرح نکل نہ جائے گی اگر وہ اپنے مالک کی نظر میں ناپسند ہو جس سے اس نے زفاف نہیں کیا تو فدیہ دے گا بوجہ ناپسند ہونے کے اجنبی قوم کے پاس بیچ نہیں سکتا' اور اگر اپنے پسر کی خلوت میں دیا تو لڑکیوں کے دستور کے موافق برتاؤ ہوگا اور اگر اس کے اوپر دوسری کر لی تو حقوق زوجیت یعنی کھانا کپڑا خلوت کم نہ کرے گا اور اگر یہ تینوں امر اس کے ساتھ نہ کئے جائیں تو بلا زر دو چھوٹ جائے گی۔

چونکہ ان آیتوں سے مسائل فقہ مستنبط ہوتے ہیں اس لئے علمائے یہود نے اس میں بہت غور کیا ہے۔ کل مباحثہ لکھنا طول ہے مگر جس قدر کہ اس مقام کے مناسب ہے مختصراً لکھا جاتا ہے۔

ان تینوں آیتوں میں لفظ امہ سے لونڈی مراد نہیں ہوسکتی۔ اول تو انہی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لونڈی سے بیوی یعنی زوجہ شرعی مراد ہے دوسرے یہ کہ یہ سب آیتیں بنی اسرائیل کی شان میں ہیں جیسا کہ سیاق دلالت کرتا ہے اور بموجب توریت مقدس کے لونڈیوں کی طرح بنی اسرائیل کی بیع وشرا جائز نہیں ہے چنانچہ اس کی تفصیل توریت مقدس کی تیسری کتاب باب ۲۵ آیت ۴۲ اور دوسری کتاب باب ۲۲ آیت ۳ میں درج ہے۔ بنی اسرائیل چوری کے جرم میں یا دشمن کی قید میں سے چھڑانے کے لئے خریدے جا سکتے تھے اور صرف سات برس تک مالک کی بطور غلام کے خدمت کرتے تھے حضرت یوسف کے بھائی بھی چوری کے جرم میں بطور غلام رکھ لئے گئے تھے مگر وہ غلام نہ تھے۔

اوراگرفرض کریں کہ اس آیت میں جواحکام ہیں وہ غیر بنی اسرائیل کی لئے ہیں تو بھی آیت کے معنی درست نہ ہوں گے کیونکہ بنی اسرائیل لونڈی وغلام بچاسویں برس از خود آزاد ہو جاتے تھے اور آیت میں حکم ہے کہ وہ آزاد نہ ہوگی اس مقام پر تفسیر رشی کی عبارت نقل کی جاتی ہے جس سے مطلب مذکور ثابت ہوتا ہے۔

"وان قبحة بعين بعلها: لا نه لخوتها ما هوى الذى لم يزفها: وكان له ان يزفها ويتخلى بها للتزويج و ثمن شرايها هو ثمن نكاحها وفى الا ية كناية بامر النكاح وبانه لا يجوزمع الغير عرسها"

اردو ترجمہ: "(توریت) اگر بری ہے اپنے خاوند کی نظروں میں (تفسیر) کہ اسے رغبت نہ ہوئی اس کے ساتھ خلوت کی (توریت) جس نے زفاف نہ کیا (تفسیر) کہ اس کو مناسب تھا اس سے زفاف اس کے ساتھ خلوت کرنا جورو کرنے کے لئے اور قیمت اس خرید کی قیمت ہے اس کی شادی کی اور یہاں کنایہ ہے کہ آیت میں حکم شادی کا ہے اور کنایہ ہے کہ وہ دوسرے سے شادی کرنے کی مجاز نہیں۔"

اسی موقع پر اس بات کا بھی خیال کرنا چاہیے کہ جس طرح ایسی جورو پر جس کی بابت بعوض شادی روپیہ دیا گیا ہو مجازاً لونڈی کا اطلاق ہوا۔ اسی طرح ایسی جورو پر بھی جو بطور ڈولہ کے آئی ہو مجازاً لونڈی کا اطلاق ہوا ہے۔ جیسے کہ ابی غایل حضرت داؤد کی بیوی پر لونڈی اور خادمہ کا اطلاق ہوا ہے۔ جس کا ذکر عنقریب آتا ہے اور چونکہ یہ امر حضرت ہاجرہ کے حال سے بھی نہایت مناسب تھا اس لئے مجازاً ان کی نسبت بھی امہ یعنی لونڈی بولا گیا۔ مگر جب کہ رقیت کسی طرح ثابت نہیں ہے تو اس لفظ سے حقیقی لونڈی مراد ہو نہیں سکتی۔

اگر یہ کہا جائے کہ ان مقاموں میں بھی امہ سے جورو مراد ہے، **مگر سریہ کا یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا** اس لئے کہ جب بنی اسرائیل کی لڑکیاں لونڈیاں ہو ہی نہیں سکتی تھیں تو سریہ کیونکر ہو سکتی ہیں۔

اوراگر یہ شبہ کیا جائے کہ جن مقاموں کا بیان ہوا وہاں قرینہ ہے جس سے لونڈی مراد نہیں ہو سکتی مگر جہاں حضرت ہاجرہ کی نسبت امہ کا اطلاق ہوا ہے وہاں کیا قرینہ ہے جس سے حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی لئے جائیں اس شبہ کے رفع کرنے کو ناظرین کو ذرا توجہ کی تکلیف دی جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں بلکہ اس کے بعد بھی یہ دستور تھا کہ لونڈی میراث نہیں پاتی تھی چنانچہ اسی وجہ سے لیا اور راحیل یعقوب علیہ السلام کی بیویوں نے ان سے کہا کہ "کیا اب ہمارے لئے اپنے باپ کے گھر میں کچھ حق میراث ہے کیا ہم اجنبیہ نہیں شمار کی گئیں کیونکہ بیچ ڈالا ہم کو اور قیمت بھی کھا گیا۔ (پیدائش باب ۳۱ آیت ۱۴، ۱۵)

اورلونڈی کی اولاد جو دوسری سے ہو وہ بھی لونڈی اور غلام ہوتی تھی ان کے لئے میراث نہ تھی چنانچہ یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کو بھی دیا گیا اور لونڈی کی اولاد جو مالک سے ہو وہ بیوی کی اولاد کے ساتھ میراث نہیں پاتی تھی۔ جو کچھ ان کو باپ اپنی زندگی میں دے وہی ان کو ملتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام نے قطورہ کی اولاد کو اپنی زندگی میں کچھ دے کر الگ کر دیا تھا جیسا کہ کتاب پیدائش باب ۲۵ میں مندرج ہے۔ جب کہ یہ قاعدہ شرعی معلوم ہو گیا تو اب اصل مطلب کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جب سارہ نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ اس لونڈی اور اس کے لڑکے کو نکال تو اس کی وجہ یہ بیان کی کہ میراث نہ پائے لونڈی بچہ میرے بیٹے اسحاق

کے ساتھ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سارہ کو اندیشہ یہی تھا کہ اسمٰعیل اسحاق کے ساتھ میراث پائیں گے۔ پس اگر ہاجرہ لونڈی ہوتیں یا اسمٰعیل لونڈی بچہ ہوتے تو میراث پانے کا خیال کیونکر ہوتا۔ بلکہ اس وقت کی شریعت میں یہ حکم تھا کہ زوجہ مطلقہ میراث نہیں پاتی تھی اور جس لڑکے کو باپ عاق یعنی ساقط المیراث کر دیتا تھا وہ بھی میراث سے محروم ہو جاتا تھا۔ اس لئے حضرت سارہ نے حضرت ابراہیم سے درخواست کی تھی کہ ہاجرہ کو اور اس کے لڑکے کو نکال دے یعنی ایک کو طلاق دے اور ایک کو عاق کرے تا کہ دونوں مستحق میراث نہ رہیں۔ یہ قرینہ ہے کہ ان آیتوں میں امہ کا لفظ جو خلاف محل واقع ہوا ہے اس سے اس کے مجازی معنی مراد ہیں اور حقیقی مراد نہیں ہو سکتے علاوہ اس کے اور بھی قرینے قویہ ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

ان مقامات کے سوا کسی مقام میں حضرت ہاجرہ کی نسبت لونڈی کا لفظ توریت میں نہیں آیا ہے بلکہ **شفحه** کا لفظ آیا ہے اور **شفحة** کے معنی لونڈی کے نہیں ہیں۔ نقلوس یہودی نے جس نے توریت کا ترجمہ کالدی زبان میں کیا ہے **شفحه** کا ترجمہ امتا جو بمعنی امتہ لکھا ہے اور اس سبب سے اکثر مترجموں نے توریت کے ترجموں میں جو اور زبانوں میں کیے اس لفظ کا لونڈی ترجمہ کیا حالانکہ لونڈی کو عبری زبان میں (**امه**) کہتے ہیں جو عربی لفظ **امة** کا مراد (ف) ہے اور شفحہ کے معنی خادمہ کے ہیں۔ ہم تفرقہ بتانے کے لئے سموئیل باب ۲۵ کی ۴۱ آیت نقل کرتے ہیں اس سے امہ اور شفحہ کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

اس عبارت کو عربی حرفوں میں لکھا جاتا ہے:

"وقالت نعم انه امة له خادمة تغسل رجل عبيد سيدى"

ترجمہ اردو: اور کہا ہاں اس کی لونڈی خادمہ ہے اپنے سردار کے خادموں کے پاؤں دھونے کے لئے۔"

یہ قول ابی غایل حضرت داؤد کی بیوی کا ہے جب کہ حضرت داؤد نے اس کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا تھا اور وہ بطور ڈولہ کے حضرت داؤد کے ہاں آئی تھیں۔

شفحه کے اصلی معنی جیسا کہ اہل لغت لکھتے ہیں قبیلہ کی عورت کے ہیں مادہ اس لفظ کا اور (**مشاحه**) کا جس کے معنی قبیلہ کے ہیں ایک ہے لیکن عرف میں اس کے معنی خادمہ کے ہیں پھر اس لفظ سے لونڈی سمجھنا یا غلطی ہے یا تعصب ہے۔

تیسرا مقام جہاں سے ان کے لونڈی ہونے پر استدلال کرتے ہیں پیدائش باب ۲۵ پہلی آیت سے ٦ آیت تک۔ جس کا ترجمہ یہ ہے اور ابراہیم نے پھر عورت کی جس کا نام قطورہ تھا اور اس سے زمران' یقشان' مدان' مدیان' یشباق' شوحہ پیدا ہوئے اور یقشان کے شبا اور دوان پیدا ہوئے: دوان کی اولاد اشوریم لطوشیم لامیم۔ مدیان کی اولاد عیفا عیفر حنوخ ابی درع اور الداعا یہ سب قطورہ کی اولاد ہیں: اور دیا ابراہیم نے جو کچھ ان کے تھا اسحٰق کو: اور سریہ کی اولاد کو ابراہیم نے اپنی حیات میں کچھ دے کر اسحٰق کے پاس سے نکال دیا پورب کی طرف شرقی عرب میں: یہاں چھٹی آیت میں واقع ہے **"لِبْنِی هَپِّیلَغْشِمْ"** جس سے استدلال کرتے ہیں **پیلغش** 'پلغش جسے کالدی میں **پیلقتا** یا **پلقتا** کہتے ہیں یا **لحینا** بولتے ہیں اس کے معنی بے شبہ سریہ ہیں اور اس کی جمع موافق قاعدہ کے **پیلغشیم** آتی ہے۔ ربی سلیمان ابن اسحٰق نے لکھا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کے لئے کتبہ صداق یعنی کابین نامہ ہوا سے ناشیم کہتے ہیں اور جس کے لئے کابین نامہ نہ ہوا سے پیلغشم کہتے ہیں۔ بہر نوع یہ امر ثابت ہے کہ **پیغلش** سریہ ہے استدلال یہ ہے کہ آیت میں **پیلغشم** بلفظ جمع ہے اور اس سے مراد قطورہ اور ہاجرہ ہیں کیونکہ سارہ کے سوا یہی دو بیویاں ابراہیم کی ثابت ہیں اس لئے یہ سریہ ہوں گی فقط یہ شبہ **پیلغشم** کے لفظ سے پیدا ہوا۔ حال یہ ہے کہ عبرانی میں جمع ی اور میم سے آتی ہے۔ لہٰذا جمع

پیلغشیم ہونا چاہیے لیکن توریت میں اس مقام میں پیلغشم بدون پے کے وارد ہے پیلغشم نہیں ہے اس لفظ پر مفسرین نے بحث کی ہے بعض نے اس کو جمع مانا ہے اور یے کے نہ ہونے کی یہ توجیہ کی ہے کہ ابراہیم کے ایک ہی سریہ تھی اور اس واسطے یہ کو گرا دیا۔ رشی: مقصور لکھا گیا کیونکہ ایک ہی سریہ تھی۔ ساتھ ہی اس کے اس مفسر نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ سریہ ہاجرہ تھیں اور وہی قطورہ ہیں۔ یعنی ہاجرہ اور قطورا ایک ہی کا نام ہے یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی جس کا بیان ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ اور اسی طرح اکثر مفسرین نے تسلیم کیا ہے کہ سریہ ابراہیم کی ایک ہی تھی لہٰذا پیلغشم سے جمع مقصود نہیں اور نہ بصورت جمع ہے تو اسی وجہ سے اونقلوس نے جو قدیم ترجم ہے اس لفظ کے ترجمہ میں لحیناثا لفظ واحد اختیار کیا ہے ایسی حالت میں اس سے استدلال کیونکر ہو سکتا ہے کیونکہ مدار حجت جمعیت تھی اور وہ غیر مسلم ہے باقی رہی یہ بات کہ وہ سریہ جس کی شان میں یہ آیت وارد ہے ہاجرہ ہیں۔ اس بیان سے کہ ہاجرہ ہی کا نام قطورہ ہے دعویٰ بلا دلیل ہے سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ اس باب میں قطورہ اور ان کی اولاد کا ذکر ہے اور انہیں آیت میں جہاں سب کے نسب نامے لکھے ہیں جو اہل کتب میں معتبر لکھا ہے۔

ترجمہ: ''اور بنی قطورہ سریہ ابراہیم فلاں اور فلاں یہ وہی اشخاص ہیں جنہیں پیدائش کے باب ۲۵ میں قطورہ کی اولاد گنایا ہے اور فلسطین کے پورب سکونت کی اجازت دی ہے۔ یہاں سے قطورہ کا سریہ ہونا بخوبی ثابت ہے اور اسی مقام پر ۳۳ آیت کے آخر میں لکھا ہے: ''یہی سب قطورہ کی اولاد ہیں۔'' اس سے ثابت ہے کہ قطورہ ہاجرہ نہ تھیں ورنہ اسمٰعیل کو بھی ان میں شمار کرتا بلکہ اس باب کی ۲۶ آیت میں گنایا ہے ابراہیم کے بیٹے اسحاق اور اسمٰعیل اس وقت یہ دستور تھا یعنی اکثر یہ محاورہ تھا کہ بیان نسب میں سریہ کی اولاد کو ماں کی طرف نسبت کرتے تھے اور بیوی کی اولاد کو باپ کی طرف۔ اسی لئے نسب نامہ اسمٰعیل کو ابراہیم کی طرف منسوب کیا اور قطورہ کی اولاد کی نسبت ابراہیم کی طرف نہیں بلکہ قطورہ کی طرف کی۔ علاوہ اس کے ہاجرہ کی اولاد پاران میں بسی اور قطورہ کی اولاد فلسطین کے پورب جیسا توریت میں بیان ہوا ہے باوجود ان سب تباین اور تغایر کے دونوں کو ایک کہنا بناوٹ ہے۔ علاوہ اس کے ابراہیم نے ہاجرہ کو طلاق دی تھی اور آئمہ کو زن مطلقہ سے نکاح جائز نہیں چنانچہ موسیٰ (علیہ السلام) کی شریعت میں یہ حکم منصوص ہے تو اگر یہ شریعت ابراہیم کے وقت میں بھی تھی جیسا کہ یہود دعوے کرتے ہیں تو یہ کہنا کہ قطورہ ہاجرہ ایک ہیں بالکل خلاف ہے۔ اور اگر ابراہیم کے وقت میں یہ شریعت نہ بھی رہی تو خلاف دستور انبیاء کے ہے کسی نبی کا سوائے پیغمبر آخر الزمان کے زن مطلقہ سے نکاح کرنا ثابت نہیں۔

اب ہم رجوع کرتے ہیں پیلغشم کے لفظ اور اس آیت کے معنی کی طرف۔ اگر تسلیم کیا جائے کہ یہ لفظ جمع ہے جیسا اب جو نسخے موجودہ مطبوعہ لندن وامسٹردام وغیرہ دیکھے گئے ان میں پیلغشیم اور میم کے ساتھ لکھا ہوا خلاف بیان مفسرین کے پایا جاتا ہے تو بھی مدعا مستدل کا ثابت نہ ہوگا کیونکہ جائز ہے کہ یہ جمع پیلغشی اسم منسوب کی ہو جیسا اسم منسوب کی جمع اس وزن پر متعارف ہے۔ امثلہ ذیل سے واضح ہوگا۔ پیلغشی کے معنی سریہ زا ہیں جسے اس ملک میں پرستار زادہ کہتے ہیں معنی آیت کے یہ ہیں کہ ابراہیم نے سریہ زا لڑکوں کو کچھ دے کر وہاں سے رخصت کر دیا اور فلسطین کے پورب بسنے کی اجازت دی۔ لیکن ان میں اسمٰعیل نہ تھے بلکہ اسی باب کی نویں آیت میں لکھا ہے کہ دفن کیا ابراہیم کو اسمٰعیل اور اسحاق ان کے لڑکوں نے۔ توریت اور اس کی تفسیر دیکھنے والوں پر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ ہاجرہ کا لونڈی ہونا کتب مقدسہ سے ثابت نہیں۔

الخطبہ الثانیۃ

فی

مراسم العرب وعاداتھم قبل الاسلام

افحکم الجاھلیۃ یبغون ومن احسن من اللہ حکما القوم یوقنون

ایام جاہلیت کے عرب بلکہ بالعموم سب عرب بغیر کسی استثناء کے (کیونکہ زمانہ حال کے بدوعرب بھی اپنے مورثوں سے بہت کم اختلاف رکھتے ہیں) ایک نہایت سادہ مزاج قوم تھی ان کی معاشرت کا سادہ اور بے تکلف طریقہ قوانین قدرت کے قریب قریب تھا یا اس سے بالکل مطابق رکھتا تھا۔ وجود انسانی کا سلسلہ ابتدائی اور ادنیٰ درجہ کی حالت سے رفتہ رفتہ ترقی حاصل کرتا گیا اور آخر کار گلہ بانی کے رتبہ پر پہنچ گیا جو بمقابلہ اس کی پہلی حالت کے نہایت عمدہ اور افضل تھا۔ اس حالت کے تبدیل ہونے سے انسانوں کو آپس میں امن اور صلح سے رہنے اور اپنی معدود اور سادہ احتیاجوں کے رفع کرنے کو بہت سا سرمایہ مل گیا۔ بھیڑوں کی اون سے ایک قسم کا موٹا ٹاٹ بنانا سیکھ لیا جس کو بذریعہ میخوں کے زمین پر خیمہ کی طرح کھڑا کر کے اس کے اندر رہا کرتے تھے اور جب ان کو اپنے گلہ کو کسی دوسری عمدہ چراگاہ پر لے جانے کی ضرورت ہوتی تھی تو اپنے ڈیروں کو اس جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لے جا کھڑا کرتے تھے اور وہیں رہنے لگتے تھے۔ ان کی پوشاک صرف ایک لمبی بن سی ہوئی چادری ہوتی تھی جس کو بطور تہمد کے اپنے کمر سے لپیٹ لیتے تھے۔ ان کا کھانا نیم برشت گوشت اور اونٹ کا دودھ اور کھجوریں ہوتا تھا ان کی تمام ملکیت اور جائداد مویشی گھوڑے اور وہ عرب کا بیش بہا جانور یعنی اونٹ اور لونڈی اور غلام ہوتی تھی اور تمام ملکیت میں لونڈی اور غلام سب سے گراں بہا خیال کئے جاتے تھے۔

بدوعرب کی معاشرت جس کو خانہ بدوش عرب کا نمونہ خیال کرنا چاہیے ایک چرواہے کے طریقہ معاشرت سے کچھ زیادہ نہ تھی۔ خیمہ میں رہا کرتا تھا پانی اور چراگاہ کی جستجو میں پھرا کرتا تھا مگر بعض جو زیادہ تمدن پسند تھے باہم مجتمع ہو کر اپنے خیموں کی باقاعدہ ترتیب اور انتظام سے دیہات بنا لیتے تھے اور اگر ان کی تعداد اور بھی بڑھ جاتی تھی تو قصبے اور شہر پیدا ہو جاتے تھے اور وہاں کے باشندے کسی قدر مہذب زندگانی کے فوائد سے جلد متمتع ہوتے تھے۔ ان کا وقت کاشتکاری میں کھجوروں اور درختوں کے بونے میں جن کے پھلوں سے اوقات بسری ہو اور مختلف انواع کی دستکاری اور ہر قسم کی تجارت اور سوداگری میں صرف ہوتا تھا۔ وہ ان اشیاء کی سوداگری کیا کرتے تھے گرم مصالح، بلستان، مرلوبان، دارچینی، سنا، لیڈنن، سونا، جواہرات، موتی، ہاتھی دانت، آبنوس اور لونڈی اور غلام۔

بہت پرانے زمانہ سے یہ لوگ مصر اور شام اور قرب وجوار کے ملکوں سے بذریعہ کارواں کے تجارت کرتے تھے۔ توریت سے بھی پایا جاتا ہے کہ یہ لوگ حضرت یعقوب علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام کے وقت بھی یہی پیشہ رکھتے تھے مگر ان دونوں قوموں یعنی خانہ بدوش اور تجارت پیشہ کا قومی چال چلن ایک ہی سا تھا۔ کھانے پینے میں کم خرچ اور کفایت شعار ہونا اور اس پر راضی اور قانع رہنا ایک عمدہ اور بیش بہا وصف خیال کیا جاتا تھا۔ باہلی ایک نامی شاعر اپنی بھائی کے ایک مرثیہ میں جس میں اس نے اس کی موت کا حال لکھا تھا اس طرح پر اپنے بھائی کی تعریف کرتا ہے

تکفیه فلذة لحم ان الم بها من الشواء ویکفی شربه الغمر

معتدل نیند کی بھی بہت تعریف کی جاتی تھی۔ ہذلی ایک نامی شاعر اس عادت کی یوں تعریف کرتا ہے۔

قلیس غرار النوم اکبرهمه دم الثار اویلقی کمیا مسقعا

علی الصباح اٹھنا بھی ایک عمدہ صفت شمار ہوتی تھی اور اس آدمی کی قوت اور مستعدی پر دلالت سمجھی جاتی تھی۔ امرالقیس خود اپنی تعریف اس طرح کرتا ہے:

وقد اغتدی والیرفی دکناتها

نہایت فیاضی سے مہماں نوازی ان کا قومی خاصہ تھا اور اس کو جملہ حسنات اور اوصاف میں اعلیٰ اور افضل سمجھتے تھے۔ مسافروں اور مہمانوں کی خاطر داری بے انتہا فیاضی سے کرنا اور مہربانی اور اخلاق و تعظیم کے ساتھ پیش آنا ایک پاک فرض خیال کیا جاتا تھا اور اگر کوئی اس کو ترک کر دیتا تھا یا غفلت کرتا تو تمام لوگ اس کو دل سے برا جانتے تھے اور اس کی حقارت کرتے تھے ہذلی شاعر خود اپنے پر اس شعر میں بددعا کرتا ہے اگر وہ مہمان نوازی کے طریقہ میں کچھ قصور کرے۔

لا دردری ان اطعمت نازلکم قشر الحتی وعندی البر مکنوز

ہمسایہ کے حال پر مہربانی اور اس کی خبر گیری کرنا اور اس کے مکان اور خاندان اور مال کی نگرانی اور حفاظت کرنا نیک آدمیوں کے اوصاف میں سے تھا اور اگر کوئی اس باب میں ذرا بھی بے پرواہی یا سستی کرتا تھا تو اس کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور اس کا کوئی معیوب لقب دیتے تھے بکری شاعر علقمہ کی اس طرح پر ہجو کرتا ہے:

تبیتون فی المشتا ملاء بطونکم وجار اتکم غرثی یبتن خماصا

اور ایک اور شاعر زبیدی اس صفت میں ایک شخص کی اس طرح پر تعریف کرتا ہے۔

قیدیوں کو چھڑانا اور بے کسوں کی مدد کرنا تمام نیکیوں میں افضل اور جمیع اوصاف میں سب سے زیادہ قابل ستائش خیال کیا جاتا تھا ایک شاعری اپنی تعریف اس طرح پر کرتا ہے:

وفککنا غل امرء القیس منه بعد ما طال حبسه والعناء

ایک اور شاعر طرفہ اس صفت کا بیان اس طرح پر کرتا ہے:

ولکن متی یسترفد القوم ارفد

ہذلی شاعر ایک صفت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

واحمی المصاب اذا ما دعی

ایک شریف عرب کو اپنی عزت کا لحاظ اور اپنے وعدہ کا خیال ایسا ضروری سمجھا جاتا تھا جیسے کہ مذکورہ بالا اوصاف ضروری سمجھے جاتے تھے۔ عمرو ایک مشہور شاعر اس طرح پر کہتا ہے:

ونوجد نحن امنعهم ذمارا وا وفاهم اذا عقد وایمینا

صاف اور ستھری پوشاک اور خوشبودار چیزیں عمدہ اور پسندیدہ اشیاء میں سمجھی جاتی تھیں۔ عدوانی کی بیٹی اپنے شوہر کی تعریف میں اس طرح پر کہتی ہے:

حدیث الشباب طیب الثوب و العطر

بالوں کومشک سے معطر کرنا اور خوشبودار چمڑے کی جوتیاں پہننی امارت کی نشانیاں تھیں ایک شاعر اپنی ممدوحہ کی اس طرح پر مدح کرتا ہے:

اذا الناجر الداری جاء بضارة من المسک اراحت فی مفارقة تجری

پرہیز گاری بھی اوصاف حسنہ میں شمار کی جاتی تھی۔حاتم طائی اس طرح پر لکھتا ہے:

واغفر عوراء الکریم ادخاره واعرض عن شتم اللئیم تکرما

فصاحت و بلاغت لطافت وظرافت بھی فضیلت کے دائرہ کی تکمیل کے لئے ضروری تھیں عمرو شاعر اپنے بیٹے غراء کی تعریف میں کہتا ہے:

وان غرارا ان یکن غیر واضح فانی احب الجون ذا اللمنطق الدمم

نابغہ شاعر کند زبان ہونے سے اس طرح خدا سے پناہ مانگتا ہے۔

اعذنی رب من حصر دعی

گھوڑے کی سواری کی اگر بچپن ہی سے مشق کی جاتی تھی تو نہایت تعریف اور توصیف ہوتی تھی اور اگر کوئی بڑا ہو کر گھوڑی کی سواری سیکھتا تھا تو ہجو اور طعنہ کا نشانہ بنتا تھا ایک شاعر نے ایک قوم کی ہجو اس طرح پر کی ہے:

لم یرکبوا الا بعد ما کبروا فیهم ثقال علی اکنافهم میل

بھیڑیا کا شکار کرنا بہادر ہونے کا عمدہ ترین ثبوت تھا۔شاخ شاعر اس پر کہتا ہے:

وما قد دفعت الذئب عنه

ریگستان کے طول وعرض کا اندازہ اس کی ریت کی ایک مٹھی بھر کر سونگھنے سے دریافت کرتے تھے۔امراء القیس شاعر اس طرح پر بیان کرتا ہے۔

اذا لناقة لعوذ الدیا فی غر غرا

زمانہ جاہلیت کے عرب میں شعر وشاعری نہایت اعلیٰ درجہ پر پہنچ گئی تھی۔

جہاں یہ خوبیاں ان میں تھیں اسی کے ساتھ نہایت بداخلاقی اور فحش عرب جاہلیت میں پھیلا ہوا تھا۔قصائد کے شروع میں جو تشبیب کے اشعار ہوتے تھے ان میں دولت مند اور امیروں کی لڑکیوں اور عورتوں اور بہنوں کا نام لے لے کر بیان کرتے تھے اور ہر طرح کے عیبوں کو علانیہ ان کی طرف منسوب کرتے تھے ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ہر شاعر کے اختیار میں ایک جن رہتا ہے اور جس قدر بڑا شاعر ہوتا ہے اسی قدر زبردست جن اس کے زیر حکم رہتا ہے۔حسن نامی شاعر اپنی تعلی میں اس طرح کہتا ہے:

وما نفرت جنی وما فل مبردی

بدکاری اور زنا کاری سے نادم نہیں ہوتے تھے اور ہر طرح کی غیر مہذب نظم میں از راہ بے شرمی اس کو مشتہر کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔

سب لوگ شراب اور نہایت قوی نشی عرقوں کے پینے سے بدرجہ غایت انس رکھتے تھے اور مدہوشی کی حالت میں تمام لوگوں سے

نہایت خراب اور معیوب باتیں سرزد ہوتی تھیں۔

قمار بازی سب لوگوں کا بلا استثناء ایک ہر دلعزیز کھیل تھا اور اگر کوئی خاص مقام قمار بازی کا مشہور ہوتا تھا تو لوگ دور دراز مسافت سے وہاں جوا کھیلنے کو جایا کرتے تھے سود خواری بھی عام طور سے نہایت درجہ مروج تھی۔

لونڈیوں کو جو قینات کہلاتی تھیں گانا بجانا اور ناچنا سکھایا جاتا تھا اور وہ حرام کاری کرنے کی مجاز تھیں اور اس حرام کاری کی آمدنی ان کے آقا اپنے تصرف میں لاتے تھے۔

رہزنی اور غارت گری اور قتل روزمرہ کی باتیں تھیں۔ انسانوں کا خون بلا خوف اور بغیر تاسف کے ہر روز ہوا کرتا تھا۔ لڑائی میں جو عورتیں قید ہوتی تھیں ان کو فتح مند لونڈیاں بنا لیتے تھے حارث شاعر اس طرح پر کہتا ہے:

ثم ملنا علی تمیم فاحرمنا دنینا بنات مراماء

ٹوٹکوں اور شگون لینے میں ان کو نہایت مضبوط اعتقاد تھا۔ جب کوئی مصیبت یا تباہی ان پر نازل ہوتی تھی تو پتھر کی چھوٹی کنکریوں پر کچھ پڑھ کر پھونکتے تھے اور ان کو پھینکتے تھے اور ایسا کرنے سے اس مصیبت کے دور ہونے کی توقع رکھتے تھے۔ جانوروں کے اڑنے اور بولنے سے بھی نیک اور بدشگون لیا کرتے تھے مثلاً اگر کوئی جانور کسی شخص کی بائیں طرف سے دائیں طرف رستہ کاٹ گیا تو اس کو نیک شگون سمجھتے تھے اور ''سانح'' کہتے تھے لیکن اگر دائیں جانب سے بائیں طرف رستہ کاٹ گیا تو اس کی بدشگونی سمجھتے تھے اور ''جارح'' کہتے تھے۔ اس قسم کی تفاول کا عام نام ''طیرہ'' تھا۔

لبید ابن ربیعہ نے اسلام قبول کرنے سے پہلے اس موقع پر جب کہ اس کا بھائی بجلی کے صدمہ سے مارا گیا یہ شعر کہا تھا:

لعمرک ما تدری الضوا رب بالحصی ولا زاجرات الطیر ما اللہ صانع

جاہلیت کے عرب کسی کام کے ہو جانے پر بھیڑ کی قربانی کرنے کی منت مانتے تھے اور جب وہ کام ہو جاتا تو بھیڑ کے بدلے ہرن کو مار دیتے تھے اور اس ہرن کو عتیرہ کہتے تھے مگر بھیڑ کے بدلے ہرن کو مار دینا ایک معیوب کام خیال کیا جاتا تھا۔ کعب شاعر اپنے خاندان کی تعریف میں کہتا ہے:

وما عتر الظباء بحی کعب

اگر کوئی کسی کو مار ڈالتا تھا تو خون کے عوض خون ہی معزز بدلا گنا جاتا تھا۔ جو لوگ خون کے بدلے دیت لے لیتے تھے ان کو ان کے ہم جنس اور ہم وطن حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ عمرو ابن معدیکرب کی بہن اپنے بھائی کے خون کا کسی شرط پر تصفیہ کرنے سے منع کرتی ہے:

ولا تاخذوا منهم وقالا وابکرا

ان کا اعتقاد تھا کہ اگر کسی آدمی کے خون کا عوض خون سے نہ لیا جائے تو ایک چھوٹا پردار کیڑا مقتول کے سر میں سے نکل کر آسمان میں چیختا پھرتا ہے اس عجیب کیڑے کو ''ہامہ'' اور ''صدیٰ'' کہتے تھے لبید شاعر ایک نوحہ میں اس طرح کہتا ہے:

فلیس الناس بعدک فی نفیر وما هم غیر اصداء وهام

ہر شخص کے مرنے کے بعد یہ دستور تھا کہ اس کے اونٹ کو اس کی قبر سے باندھ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ بھوک اور پیاس کے مارے وہ مر جاتا تھا اور اس اونٹ کو ''بلیہ'' کہتے تھے لبید شاعر اپنے ممدوح کی سخاوت کی اس طرح تعریف کرتا ہے:

تاوی الی الاطناب کل ذریۃ　　مثل البلیۃ　قالص　اھدامھا

جب کوئی مر جاتا تھا تو برس روز تک اس کا سوگ رکھتے تھے اور اس کو رویا کرتے تھے۔لبید شاعر اپنے وارثوں کو یوں وصیت کرتا ہے:

الی الحول ثم اسم السلام علیکما　　ومن یبک حولا کاملا فقدم اعتذر

لڑائی میں عورتیں مردوں کے ہمراہ ہوتی تھیں اور ہر طرح ان کی مدد کرتی تھیں جب کہ ان کے شوہر لڑائی میں مصروف ہوتے **تھے تو وہ پکار پکار** کر کہتی تھیں "آگے بڑھو آگے بڑھو اے ہماری جری اور بہادر خاوندو اگر تم کوتاہی کرو گے تو ہم کو دشمن سے نہ بچاؤ گے تو **ہم تمہاری** بیویاں نہ ہوں گی۔

قحط اور گرانی کے زمانہ میں اپنے اونٹوں کو مجروح کر کے ان کا خون پیا کرتے تھے۔خشک سالی میں مینہ برسنے کا ٹوٹکا اس طرح پر کرتے تھے کہ پہاڑوں میں ایک گائے کو لے جاتے تھے اور اس کی دم میں سوکھی ہوئی گھاس اور کانٹے اور جھاڑیاں باندھ کر اس میں آگ لگا دیتے تھے اور گائے کو پہاڑوں میں چھوڑ دیتے تھے۔

گھوڑ دوڑ اور اس پر بازی لگانا جس کو وہ "رہان" کہتے تھے ان میں مروج تھی۔دو قوموں اور فریقوں کے باہم جنگ وجدل ایک تھوڑی سی غلط فہمی کی وجہ سے قائم ہو جاتی تھی۔بعض اوقات یہ لڑائیاں ایک مدت مدید تک جاری رہتی تھیں جیسے کہ عبس اور ذبیان کے باہم پورے سو برس تک لڑائی جاری رہی۔

باوجودیکہ کوئی شخص اپنے غلاموں کو آزاد کر دیتا تھا تو بھی اس کی ملکیت کا استحقاق اس کو باقی رہتا تھا اور اس استحقاق کو فروخت کر دینے کا بھی مجاز تھا اور مشتری ان غلاموں پر اپنی ملکیت قائم کرتا تھا اور اس طرح سے یہ بد بخت ہمیشہ کی آزادی سے بالکل محروم تھے۔

عورتیں کسی جانور کا دودھ نہیں دھوتی تھیں اور اگر کسی خاندان کی عورتوں کو دودھ دھوتے دیکھ پاتے تھے تو اس خاندان کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور وہ خاندان لوگوں کی آنکھوں میں دفعتاً حقیر ہو جاتا تھا۔

مجرم کو فوجداری کی سزا میں جلتی ہوئی ریت پر بٹھا دیتے تھے۔مردہ جانور کا گوشت کھاتے تھے اور اس کو بہت لذیذ غذا سمجھتے تھے جو اونٹنی یا بھیڑ یا بکری دس دفعہ بچہ جن لیتی تھی اس کو چھوڑ دیتے تھے اور وہ چھوٹی پھرا کرتی تھی اور جب وہ مر جاتی تھی تو اس کا گوشت مرد کھاتے تھے اور عورتوں کو اس کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی اگر اونٹنی یا بھیڑ یا بکری پانچویں دفعہ مادہ بچہ جنتی تھی تو اس کے کان کاٹ کر اس کو چھوڑ دیتے تھے اور اس کو "بحیرہ" کہتے تھے اور اس کا گوشت کھانا اور دودھ پینا منع تھا۔

کسی کام کے ہو جانے پر اونٹوں کو بطور سانڈ کے چھوڑ دینے کی منت مانتے تھے اور جب وہ کام ہو جاتا تھا تو اونٹ کو بطور سانڈ کے چھوڑ دیتے تھے اور وہ جہاں چاہتا تھا پھرا کرتا تھا۔

اگر کوئی اونٹنی دس بچے دے چکتی تھی اور بکری سات بچے تو عورتوں کو اس کا گوشت کھانے کی ممانعت تھی اور صرف مرد ہی اس کا گوشت کھا سکتے تھے۔

اگر کسی بکری کے مادہ بچہ ہوتا تھا تو مالک اس کو اپنے لئے رہنے دیتا تھا اور اگر نر پیدا ہوتا تھا تو بتوں پر بطور نذر کے چڑھایا جاتا تھا اور اگر وہ بچے ایک نر اور ایک مادہ پیدا ہوتے تھے تو مالک دونوں کو اپنے لئے رکھتا تھا وہ "وصیلہ" کہلاتی تھی۔

جو اونٹ کہ دس بچوں کا باپ ہو چکتا تھا وہ چھوڑ دیا جاتا تھا اور جہاں وہ چاہتا تھا پھرا کرتا تھا اور بنام ''حامی'' موسوم ہوتا تھا۔
قسم لینے کا نہایت سنجیدہ قاعدہ یہ تھا کہ آگ جلا کر اس میں نمک اور گندھک پیس کر ڈالتے تھے یہ آگ ''ہولہ'' کہلاتی تھی اور اس کا جلانے والا ''مہول'' کہلاتا تھا۔ عوص شاعر اس طرح پر کہتا ہے:

اذا استقبلته الشمس صد بوجهه کما صد عن نار المهول محالف

قسم کے مستحکم کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ تھا کہ میزاب خانہ کعبہ کے نیچے چابک کمان اور جوتی رکھ دیتے تھے اور اس طرح کرنے سے قسم پختہ ہو جاتی تھی۔
اقرار اور وعدہ کے مستحکم کرنے کو اپنے بزرگوں کی اور بتوں کی قسم کھایا کرتے تھے۔
بالغ مرد اپنے والدین کی وراثت پانے کے مستحق ہوتے تھے نابالغ لڑکے اور عورتیں حصہ نہیں پاتے تھیں۔
قرضہ پر سود لیتے تھے۔ ایک قاعدہ یہ تھا کہ اگر قرضہ وقت معینہ پر ادا نہ ہوتا تھا تو اس کی تعداد کو دو چند کر دیتے تھے اور میعاد ادا کو بڑھا دیتے تھے۔
عرب جاہلیت انتقام لینا واجب سمجھتے تھے لیکن مختلف قوموں میں باہم حقوق کی برابری کو نہیں مانتے تھے۔
اگر کسی شخص کے قاتل کا سراغ نہ لگتا تھا تو جس قوم کے شخص پر قتل کا شبہ ہوتا تھا پچاس معزز شخص فرداً فرداً اپنی بے گناہی کی قسم کھاتے تھے۔
ہر شخص گو وہ اجنبی ہی ہو دوسرے شخص کے گھر میں درانہ چلے آنے کا مجاز تھا اور اندر آنے سے پہلے اندر آنے کی اجازت طلب نہیں کرتے تھے۔
کسی رشتہ دار کے گھر کھانا کھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔
دس آدمی بشراکت ایک جانور کو خریدتے تھے اور ہر ایک شخص کے حصہ کو متعین کرنے کے واسطے دس پانسے (جس میں ایک سادہ ہوتا تھا اور باقی نو پر حصوں کے اندازہ کا نشان بنا ہوتا تھا) پھینکے جاتے تھے اور جو پانسا جس کے نام پڑتا تھا وہی اس کا حصہ ہوتا تھا۔
خانہ کعبہ میں سات تیر رکھے ہوئے تھے اور ہر تیر پر ایک علامت بنی ہوئی تھی۔ بعضوں پر کام کرنے کے حکم دینے کی اور بعضوں پر اس کام کرنے سے منع کرنے کی علامت تھی ہر شخص پیشتر اس سے کہ کوئی کام شروع کرے ان تیروں سے استخارہ کرتا تھا اور اسی کے بموجب کام کرتا تھا ان تیروں کو ''ازلام'' کہتے تھے۔
تمام عرب جاہلیت کا شیوہ بت پرستی تھا اور جن بتوں کی وہ پرستش کیا کرتے تھے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ہبل: ایک بہت بڑا بت تھا جو خانہ کعبہ کے اوپر رکھا ہوا تھا۔
۲۔ ود: قبیلہ بنی کلب کا یہ بت تھا اور وہ قبیلہ اس کی پرستش کرتا تھا۔
۳۔ سواع: قبیلہ بنی مذحج کا یہ بت تھا اور وہ اس کی پرستش کرتے تھے۔
۴۔ یغوث: قبیلہ بنی مراد کا یہ بت تھا اور وہ اس کی عبادت کرتے تھے۔
۵۔ یعوق: بنی ہمدان کے قبیلہ کا یہ بت تھا اور وہ اس کو معبود سمجھتے تھے اور عبادت کرتے تھے۔
۶۔ نسر: بنی ہمدان کے قبیلہ کا یہ بت تھا اور یمن کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے۔

۷۔عزیٰ: قبیلہ بنی غطفان کا یہ بت تھا اور اس کی پرستش وہ قبیلہ کیا کرتا تھا۔

۸۔لات'۹۔منات: یہ بت کسی خاص قبیلہ سے علاقہ نہیں رکھتے تھے بلکہ عرب کی تمام قومیں ان کی پرستش کیا کرتی تھیں۔

۱۰۔دوار: یہ بت نوجوان عورتوں کی پرستش کرنے کا تھا وہ چند دفعہ اس کے گرد طواف کرتی تھیں اور پھر اس کو پوجتی تھیں۔

۱۱۔اساف: جو کوہ صفا پر تھا۔

۱۲۔نائلہ: جو کوہ مردہ پر تھا۔ان دونوں بتوں پر ہر قسم کی قربانی ہوتی تھی اور سفر کو جانے اور سفر سے واپس آنے کے وقت ان کو بوسہ دیا کرتے تھے۔

۱۳۔عبعب: ایک بڑا پتھر تھا جس پر اونٹوں کی قربانی کرتے تھے اور ذبیحہ کے خون کا اس پر بہنا نہایت ناموری کی بات خیال کی جاتی تھی۔

کعبہ کے اندر حضرت ابراہیم کی مورت بنی ہوئی تھی اور ان کے ہاتھ میں وہی استخارہ کے تیر تھے جو ''ازلام'' کہلاتے تھے اور ایک بھیڑ کا بچہ ان کے قریب کھڑا تھا اور حضرت ابراہیم کی مورت خانہ کعبہ میں رکھی ہوئی تھی اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی تصویریں خانہ کعبہ کی دیواروں پر کھینچی ہوئی تھیں۔

حضرت مریم کی بھی ایک مورت تھی اس طرح پر کہ حضرت عیسیٰ ان کی گود میں ہیں یا ان کی تصویر اس طرح خانہ کعبہ کی دیواروں پر کھینچی ہوئی تھی۔

عرب کی دیسی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''ود'' اور ''یغوث'' اور ''یعوق'' اور ''نسر'' مشہور لوگوں کے جو ایام جاہلیت میں گزرے ہیں نام ہیں ان کی تصویریں پتھروں پر منقش کر کے بطور یادگار کے خانہ کعبہ کے اندر رکھ دی تھیں۔ایک مدت مدید کے بعد ان کو رتبہ معبودیت دے کر پرستش کرنے لگے۔اس میں کچھ شک نہیں کہ عرب کے نیم وحشی باشندے ان مورتوں پر خدا ہونے کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور نہ ان لوگوں کو جن کی یہ مورتیں تھیں معبود سمجھتے تھے بلکہ ان کو مقدس سمجھنے کی مندرجہ ذیل وجوہات تھیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔عرب جاہلیت ان مورتوں کو ان شخصوں اور ان کی ارواح کی یادگار سمجھتے تھے اور ان کی تعظیم اور تکریم اس سبب سے نہیں کرتے تھے کہ وہ ان مشہور اور نامور اشخاص کی یادگار ہے جن میں بموجب ان کے اعتقاد کے جملہ صفات الوہیت یا کسی قسم کی شان الوہیت موجود ہے۔ان کے نزدیک ان مورتوں کی پرستش سے ان لوگوں کی ارواح خوش ہوتی تھیں جن کی وہ یادگاریں تھیں۔

ان کا یہ اعتقاد بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی جملہ قدرتیں بیماروں کو شفا بخشنا' بیٹا بیٹی عطا کرنا قحط و وبا دیگر آفات ارضی وسماوی کا دور کرنا ان کے مشہور ومعروف لوگوں کے اختیار میں بھی تھا جن کی طرف انہوں نے صفات الوہیت منسوب کی تھیں اور وہ خیال کرتے تھے کہ اگر مورتوں کی تعظیم اور پرستش کی جائے گی تو ان کی دعائیں اور منتیں قبول ہوں گی۔

ان کا یہ بھی مستحکم عقیدہ تھا کہ یہ اشخاص خدا تعالیٰ کے محبوب تھے اور اپنی مورتوں کی پرستش سے خوش ہو کر پرستش کرنے والوں کو خدا تعالیٰ کے قرب حاصل کرانے کا ذریعہ ہوں گے اور ان کو تمام روحانی خوشی عطا کریں گے اور ان کی مغفرت کی شفاعت کریں گے۔

ان کا قاعدہ بتوں کی پرستش کا یہ تھا کہ بتوں کو سجدہ کرتے تھے ان کے گرد طواف کرتے تھے اور نہایت ادب اور تعظیم سے بوسہ

دیتے تھے۔اونٹوں کی قربانی ان پر کرتے تھے مویشیوں کا پہلا بچہ بتوں پر بطور نذر کے چڑھایا جاتا تھا۔اپنے کھیتوں کی سالانہ پیداوار اور مویشی کے انتفاع میں سے ایک معین حصہ خدا کے واسطے اور دوسرا حصہ بتوں کے واسطے اٹھار کھتے تھے اور اگر بتوں کا حصہ کسی طرح ضائع ہو جاتا تو خدا کے حصہ میں سے اس کو پورا کر دیتے تھے اور اگر خدا کا حصہ کسی طرح ضائع ہوتا تو بتوں کے حصہ میں سے اس کو پورا نہیں کرتے تھے۔

حجراسود اور خانہ کعبہ کی تعظیم تاریخ عرب کے ابتدائی زمانہ سے ہوتی چلی آئی ہے اس کی بناء کو خود حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی طرف منسوب کرتے تھے۔مگر برخلاف ان مقدس چیزوں کے جن کا ذکر اوپر ہوا خانہ کعبہ کو کسی شخص کی یادگار نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ تمام عمارت ہی بہ لقب بیت اللہ ممیز اور ممتاز تھی اور اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کے واسطے مخصوص تھی در حقیقت اس کو ایسا سمجھتے تھے جیسے کہ یہودی بیت المقدس کو اور عیسائی گرجا کو اور مسلمان مسجد کو اللہ کی عبادت کرنے کے لئے اس زمانہ میں سمجھتے ہیں۔قرآن میں خانہ کعبہ کو متعدد جگہ مسجد کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

حجراسود کو بھی مثل ایک بت کے یا کسی مشہور معروف شخص کی یادگار کے نہیں سمجھتے تھے۔عام خیال یہ تھا کہ یہ ایک بہشت کا پتھر ہے مگر تحقیق نہیں ہے کہ شروع زمانہ سے یہ خیال تھا یا بعد کو پیدا ہوا۔جو بات کہ محقق ہے وہ یہ ہے کہ خانہ کعبہ کی بناء ہونے سے پہلے یہ حجراسود ایک میدان میں اکیلا پڑا ہوا تھا۔کوئی عرب کی روایت ایسی نہیں ملی جس سے یہ بات تحقیق ہو کا یہ پتھر اس میدان میں کیوں پڑا ہوا تھا اور جس زمانہ میں کہ وہ وہاں پڑا ہوا تھا اس کے ساتھ کیا رسمیں متعلق تھیں مگر یہودیوں کی تاریخ سے ہم کسی قدر صحت کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں کہ اگر حجراسود کے ساتھ کچھ رسمیں ادا ہوتی ہوں گی تو وہ انہیں کے مشابہ ہوں گی جن کا برتاؤ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب اس قسم کے پتھروں کے ساتھ کیا کرتے تھے دیکھو کتاب پیدائش باب ۱۲ آیت ۷، ۸ باب ۱۳ آیت ۱۸ و باب ۲۶ آیت ۲۵ و باب ۲۸ آیت ۱۸ و کتاب خروج باب ۲۰ آیت ۲۵۔

خانہ کعبہ کی تعمیر اور حجراسود کے ایک کونہ میں نصب ہونے کے بعد بھی کسی رسم کا اس کے ساتھ بالتحقیق ہونا پایا نہیں جاتا جو رسم کہ اب تسلیم کی جاتی ہے اور جو حجراسود کے ساتھ مخصوص خیال ہوتی ہے وہ بوسہ دینا ہے مگر یہ رسم بھی کچھ اس کے واسطے مخصوص نہ تھی خانہ کعبہ کے اور حصہ بھی اسی طرح چومے جاتے تھے۔خانہ کعبہ کا حال یہ تھا کہ سب لوگ اس کے اندر بیٹھا کرتے تھے اور خدا تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے اور اس کے گرد طواف بھی کرتے تھے لیکن عجیب ترین رسم یہ تھی کہ یہ عبادت و پرستش مطلق برہنگی کی حالت میں ہوتی تھی۔عرب جاہلیت اس بات کو برا سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کپڑے پہن کر کریں جو ہر قسم کے گناہوں سے ملوث ہوتے ہیں۔

خانہ کعبہ کی ہمسری کے واسطے دو معبد اور یکے بعد دیگرے بنائے گئے تھے ایک تو قبیلہ غطفان نے اور دوسرا یمن میں قبائل خثعم اور بجیلہ نے باشتراک بنایا تھا۔ان دونوں معبدوں میں بت رکھے ہوئے تھے جن کو ان قبیلوں کے لوگ بطور معبود کے پوجتے تھے ان نقلی کعبوں میں سے اول کو تو زہیر بادشاہ حجاز نے چھٹی صدی عیسوی میں بالکل غارت کر دیا تھا اور دوسرے کو جریر نے آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یعنی ان کے پیدا ہونے کے بعد منہدم کر دیا تھا۔

حج کی رسم کو عرب کے باشندے زمانہ دراز سے مانتے چلے آتے تھے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے زمانہ تک اس کا پتہ چلتا ہے۔

صفا اور مروہ کے پہاڑوں کے درمیان دوڑنے کی رسم بھی زمانہ جاہلیت سے عرب میں رائج تھی جیسے کہ اب بھی مروج ہے۔

جو لوگ حج کرنے کو آتے تھے اس مقدس میدان میں جمع ہوتے تھے جو عرفات کے نام سے مشہور ہے لیکن قوم قریش جملہ اقوام عرب میں ذی اختیار تھی اس لئے قریش مع اپنے دوستوں کے مقام مزدلفہ پر جو گردنواح کی زمین کی نسبت زیادہ بلند اور مرتفع ہے ٹھہرتے تھے اور باقی گروہ عرفات میں مقیم ہوتے تھے جہاں کہ حج کی رسم ادا کی جاتی ہے۔

حج کی رسم ختم ہونے کے بعد یہ مجمع ایک مقام کو جو منیٰ کہلاتا ہے چلا جاتا تھا اور وہاں اپنے بزرگوں کے نام آور بہادرانہ کاموں کا فخر کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے اور ان بہادری کے حالات کو اشعار میں پڑھنے سے اور بھی جلا دیتے تھے۔

سال کے چار مہینے متبرک سمجھے جاتے تھے اور حج کی رسم جیسا کہ بالفعل دستور ہے انہیں مہینوں میں سے ایک مہینہ یعنی ذی الحجہ میں ادا کی جاتی تھی مگر ان مہینوں کی حرمت بعض اوقات مبدل اور ملتوی ہو جاتی تھی۔ کس واسطے کہ اگر کوئی لڑائی ان مہینوں میں سے کسی میں واقع ہوئی تھی تو لوگ ان کی قدرتی ترتیب کو بدل دینے سے گناہ سے بری الذمہ ہو جاتے تھے یعنی موجودہ مہینے کو غیر حرام فرض کر لیتے تھے اور ماہ آئندہ کو حرام کا مہینہ سمجھ لیتے تھے۔

عرب جاہلیت ایک میعاد معین تک لڑائی کے موقوف رکھنے کا عہد کر لیتے تھے اور اس رسم کو حج کا ہم پایہ سمجھتے تھے۔

باشندگان عرب کی ایک تعداد کثیر بت پرست تھی مگر وہاں ایک فرقہ موسوم بہ "صابی" بھی تھا جو ثوابت اور سیاروں کی پرستش کرتا تھا۔ انہوں نے بیشمار ہیاکل یعنی ستاروں کی پرستش کے معبد تمام ملک میں تعمیر کئے تھے اور ان کو ان مقدس ستاروں کی پرستش کے واسطے مخصوص ان کا یہ اعتقاد تھا کہ مینہ کا برسنا یا امساک باراں کا ہونا انہیں اجرام فلکی کی نیک یا بد تاثیر پر بالکل منحصر ہے۔ اس کے علاوہ اور مذاہب بھی عرب میں شائع تھے لیکن ہم اس جگہ ان کی بحث نہیں کرنے کے کیونکہ یہ مضمون ہمارے اس خطبہ سے جو اس کے بعد آئے گا علاقہ رکھتا ہے۔

عورتیں حقیقت میں نہایت خراب اور ذلیل حالت میں تھیں۔ مردوں کو بالکل اختیار تھا کہ جتنی چاہیں اتنی عورتیں کریں اگرچہ اس بات کے تعین کرنے کے لئے کافی قانون منضبط نہ تھا کہ مرد کو کونسی قرابت مند عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے اور کونسی سے ناجائز مگر بااین ہمہ یہ رسم شائع تھی کہ اس عورت سے جو قریب تر رشتہ رکھتی تھی ہو ازدواج نہیں کرتے تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ایسی عورت کی اولاد عموماً ضعیف اور کمزور ہوتی ہے۔

ازدواج کی رسم ادا کرتے تھے اور مہر بھی باندھتے تھے۔ طلاق بھی دیتے تھے ہر شخص اپنی زوجہ کو جس طرح ایک مرتبہ طلاق دینے کے بعد پھر اپنی زوجیت میں لے سکتا تھا اسی طرح ہزار بار طلاق دینے کے بعد بھی پھر اپنی زوجیت میں لے لیتا تھا کیونکہ تعداد طلاق کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔

طلاق کے بعد ایک میعاد مقرر تھی جس کے اندر عورت کو کسی اور مرد کے ساتھ ازدواج کرنے کی ممانعت تھی اور اس میعاد کے اندر اگر فریقین میں آشتی ہو جاتی تو پھر اپنی زوجیت میں لے لیتے تھے مرد اس رسم سے بہت ظالمانہ اور وحشیانہ طور سے مستفید ہوتے تھے۔ وہ اپنی جورو کو کسی بہانہ سے طلاق دے دیتے تھے بے چاری عورت میعاد معینہ تک منتظر رہتی تھی اور اس میعاد میں کسی دوسرے سے ازدواج نہ کر سکتی تھی لیکن جب میعاد قریب الانقضا ہوتی تھی تو اس کا شوہر پھر اپنی زوجیت میں لے لیتا تھا اور تھوڑے عرصہ بعد پھر اس کو طلاق دے دیتا تھا اور معینہ کے اختتام کے قریب پھر اپنے ازدواج میں لے لیتا تھا اور اسی طرح بار بار کیا کرتا

تھا۔عربوں میں ایک یہ بے رحم رسم رائج تھی کہ ہر شخص اس بات کو ایک قسم کی ذلت خیال کرتا تھا کہ وہ عورت جو ایک مرتبہ اس کی زوجہ تھی دوسرے شخص کے ازدواج میں آئے۔

ایک اور قسم کی طلاق بھی زمانہ جاہلیت کے عربوں میں جاری تھی جو ''ظہار'' کہلاتی تھی اور وہ اس طرح پر ہوتی تھی کہ مرد اپنی زوجہ کے چھونے سے باز رہتا تھا یہ کہہ کر مجھ کو اپنی زوجہ کے جسم کے فلاں عضو کا چھونا ایسا حرام ہے جیسا کہ اپنی ماں یا کسی اور قریب رشتہ والی عورت کے جس کے ساتھ ازدواج ناجائز ہے۔عضو کا چھونا اس کہنے سے طلاق ہو جاتی تھی۔

عرب جاہلیت کی رسموں میں سب سے زیادہ خراب رسم اور سب سے زیادہ بے رحم لڑکیوں کا مار ڈالنا یا ان کو زندہ دفن کر دینا تھا۔

تبنیت کی رسم بھی ان میں شائع تھی اور پسر متبنٰی اپنے والدین کی جائداد کا حق دار اور وارث خیال کیا جاتا تھا۔

لڑکے اپنی سوتیلی ماؤں کے ساتھ ازدواج کرنے کے مجاز تھے مگر باپ اپنے بیٹے یا متبنٰی کی زوجہ کے ساتھ شادی کرنے کا مجاز نہ تھا اور اس کے خلاف عمل کرنا نہایت معیوب اور گناہ سمجھا جاتا تھا۔

شوہر کے مرنے کے بعد اس کا سوتیلا بیٹا اگر وہ نہ ہو تو کوئی قریب کا رشتہ دار بیوہ کے سر پر ایک چادر ڈال دیا کرتا تھا اور وہ شخص جو اس طرح پر چادر ڈالتا تھا اس سے شادی کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔

عورتیں متوفی شوہروں کا ماتم ایک سال کامل تک کیا کرتی تھیں اور میعاد معینہ کے بعد بیوہ اونٹ کی چند خشک مینگنیں یا تو کسی کتے پر یا کندھے پر سے خود اپنے ہی پیٹھ پر پھینک دیتی تھی جس سے یہ مراد تھی کہ اب بیوہ کو اپنے متوفی شوہر کا کچھ بھی خیال نہیں رہا۔

عورتوں میں اپنے گھر سے نکلنے اور عام مجمع میں بدون پردہ اور حجاب کے آنے کا دستور تھا اور اپنے جسم کے کسی حصہ کو کھلا رکھنے اور عوام الناس کو دکھلانے میں کوئی بے حیائی اور بے شرمی کی بات خیال نہیں کرتی تھیں۔

عورتیں مصنوعی بال سر پر لگایا کرتی تھیں اور اپنے جسم کو نیل سے گودا کرتی تھیں۔

خاندان کے تمام اشخاص قسم ذکور تمام قسم کی عورتوں کو چھونے سے جب کہ وہ اپنے معمولی ایام میں ہوں پرہیز کرتے تھے اور ان عورتوں کو باقی اشخاص خاندان کے ساتھ ملنے جلنے کی ممانعت تھی۔

مردوں کو قبر میں دفن کرنے کا اعراب جاہلیت میں رواج تھا اور جس کسی جنازہ کو دفن کرنے کے لئے لے جاتے ہوئے دیکھتے تھے تو اور آدمی مردہ کی تعظیم اور اس پر افسوس ظاہر کرنے کے لئے سروقد اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ انسان کا خون بجز انسان کی سانس کے اور کچھ نہیں ہے اور روح محض ایک ہوا انسان کے جسم کے اندر ہے مگر بعض لوگ جو کہ بہ نسبت ان کے زیادہ تعلیم یافتہ تھے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ روح ایک نہایت چھوٹا سا جانور ہے جو انسان کے پیدا ہونے کے وقت اس کے جسم میں گھس جاتا ہے اور ہمیشہ اپنے آپ کو بڑھاتا رہتا ہے۔انسان کے مرنے کے بعد وہ جانور جسم کو چھوڑ کر قبر کے گرد چیختا پھرتا ہے۔یہاں تک کہ ایک الو کے برابر ہو جاتا ہے۔

زمانہ جاہلیت کے عرب دیوں اور خبیث ارواح کو مانتے تھے۔تمام خیالی اور وہمی اور فرضی صورتیں جو بیابانوں یا پرانی مسمار اور منہدم عمارتوں میں ان کو نظر آتیں اور جن کی کہ تنہا آدمی کے خیال میں اکثر صورت بن جاتی ہے ان سب کو مختلف قسم کی خبیث ارواح تصور کرتے تھے۔

بعض لوگ ان مغالطات نظری کو مختلف بروج کی تاثیر کی طرف منسوب کرتے تھے اور ان کی رائے اوروں کی رائے کے مقابلہ

میں افضل تر معلوم ہوتی تھی۔

زمانہ جاہلیت کے عرب نیک اور بد جنات میں عقیدہ رکھتے تھے کہ ان کی مختلف صورتیں اور شکلیں مقرر کی تھیں اور مختلف نام رکھے تھے۔ ان کے نزدیک بعض جنات نصف جسم انسان کا سا اور نصف جسم روحانی رکھتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے عرب اور قوتوں اور وجودوں میں بھی اعتقاد رکھتے تھے جو انسان کی نظر سے غائب تھے مگر آئندہ کی خبروں کو بآواز بلند ظاہر کر دیتے تھے اور خود ہمیشہ پوشیدہ رہتے تھے۔ وہ فرشتوں کی اور اور ارواح کو بھی جو دکھائی نہیں دیتیں مانتے تھے اور مختلف شکلیں ان کی طرف منسوب کرتے تھے۔

عرب کے زمانہ جاہلیت کی رسم رواج کو اس مقام پر ہم نے نہایت سرسری طور پر بیان کیا ہے مگر ہم کو امید ہے کہ ان نیم وحشی لیکن عالی دماغ اور آزاد منش باشندگان عرب کے خانگی اور سوشل عام حالات معلوم ہونے سے ایک منصف مزاج شخص اگر ایسا شخص دنیا میں پایا جاتا ہے اس بات کا فیصلہ کر سکے گا کہ اسلام کے قبل عربوں کا کیا حال تھا اور بعد اسلام کے ان کا کیا حال ہو گیا اور بالعموم ان کے اخلاق کس طرح پر تبدیل ہو گئے۔ ان کی اگلی اور پچھلی حالت کے مقابلہ کرنے میں ہمارا یہ سرسری بیان منصف مزاج شخص کو کافی مدد دے گا اور ایسے نتائج مستنبط کرنے کے قابل کرے گا جن کی جانب اس کی انصاف پسندی اس کو ہدایت کرے گی۔

☆☆☆

الخطبة الثالثة

فی

الادیان المختلفة التی کانت فی العرب قبل الاسلام

ومن یتبع غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وھو فی الاخرة من الخاسرین.

اس خطبہ میں ہم اس امر کی تحقیقات بھی کریں گے کہ ان ادیان میں سے جو زمانہ جاہلیت میں مروج تھے اسلام کون سے دین سے مشابہ تر ہے اور آیا اس مشابہت اور مماثلت کی وجہ سے اسلام ایک دین حق ثابت ہوتا ہے یا ایک عیارانہ بنایا ہوا قصہ۔

توریت مقدس میں جو بیان انسان کے پیدا ہونے کا اور اس کے بعد بابل میں زبانوں کے مختلف ہو جانے اور روئے زمین پر پراگندہ ہونے کا ذکر ہے اسی کو ہم اپنی اس بحث کا جو اس خطبہ میں ہے ابتدائی مقام فرض کرتے ہیں اور اسی بناء پر یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچہ عبادت اور پرستش کی سادگی اور یک رنگی خود بخود اس وقت تک جاری رہی ہوگی جب کہ انسان تعداد میں کم اور ایک محدود مقام میں تھے مگر جب کہ وہ زیادہ وسیع ملکوں میں پھیل گئے جن کی آب وہوا اور ملک کی بناوٹ مختلف تھی تو اس وقت ان کے دلوں کو نئے اور عجیب خیالات نے قریباً ہر ایک بات کی نسبت گھیر لیا خصوصاً اس وجود کی ماہیت کی نسبت جس کی عظمت کے جلوے نیک یا بدخوف وہراس سے ان کو تسلیم کرنے پڑے۔

وہ لوگ ان قدرتی ظہور کے طبعی اسباب سے جن کے دیکھنے سے ایک تربیت یافتہ آدمی کے دل میں بھی خوف وہراس پیدا ہوتا ہے جیسے کہ بھونچالوں کا آنا زمین کا دھنس جانا اور پھٹ جانا دریاؤں کا جوش، سمندروں کا تلاطم، پہاڑوں کے عجائبات درختوں کی کرامات، بادلوں کی گڑگڑاہٹ بجلی کی کڑک اور چمک اور اس کے گرنے سے بربادی اور خوفناک طوفانوں کی تباہی کے اسباب سے محض ناواقف تھے۔ اس لئے انہوں نے ان سب کاموں کو کسی ایسے وجود کے کام تصور کئے ہوں گے جس کو وہ اپنے آپ سے بدرجہا اعلیٰ اور زبردست اور بوجہ غیر ظاہر ہونے اس وجود کے اور بھی زیادہ خوفناک تصور کرتے ہوں گے۔ یہی اسباب ہیں جن کے سبب ابتداء میں انسان کے دل میں عبادت کرنے اور قربانیاں چڑھانے اور پوجا کرنے کا خیال پیدا ہوا مگر ان دیوتاؤں کو ان تین طریقوں سے خوش کرنے یا ان کا غصہ مٹانے میں بوجہ ملک کی خاصیت اور ملک کی آب وہوا کے اور اس کے باشندوں کے عام مزاج اور چال چلن کے ہر ایک ملک کے باشندوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہم کو امید ہے کہ جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے اس کتاب کے پڑھنے والے سمجھ جائیں گے کہ عرب میں عموماً مذہبوں کی ابتدا کس طرح پر شروع ہوئی۔

عرب میں جو قومیں قبل اسلام کے موجود تھیں ان کے حالات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں باعتبار مذہب کے چار مختلف فرقوں میں منقسم تھیں۔ بت پرست، خدا پرست، لامذہب اور معتقدین مذہب الہامی۔

بت پرستی

انسان کی جبلت میں جو ہر ایک چیز کے سمجھنے کی طاقت ہے اور جس کو ہم عقل یا سمجھ سے تعبیر کر سکتے ہیں اس کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ اپنے وجود کی نہایت ابتدائی منزل میں اولاً بتوں کی پرستش کا اپنے ذہن میں خیال پیدا کرے اسی سبب سے اولاً اس کے ذہن میں بتوں کی پرستش کا خیال پیدا ہوا اور پھر رفتہ رفتہ قائم و مستحکم ہو گیا۔

ایک مصنف کا قول ہے کہ ''آدمی از روئے خلقت اور جبلت کے مذہب کو ماننے والا پیدا ہوا ہے'' اگر وہ معبود حقیقی سے ناواقف ہوگا تو مجازی معبود اپنے لئے بنائے گا۔ وہ خطروں اور مشکلوں سے گھرا ہوا ہے وہ قدرت کی عظیم الشان طاقتوں کو ہر طرف اپنے اپنے کام میں مشغول دیکھتا ہے جن کے سبب سے اس کو خوف ورجا پیدا ہوتی ہے اور باوصف اس کے ان کے کام اس کے حیز ادراک اور قبضہ قدرت سے باہر ہیں۔ اس واسطے اس کے دل میں اپنے سے کسی زیادہ طاقتور شے سے ایک تعلق پیدا کرنے کا جس پر وہ تکیہ اور بھروسہ کر سکے خیال پیدا ہوتا ہے۔

قدرت کے ان کاموں کو ذہن نشین کرنے اور ان کے سمجھ میں آنے کے لئے اب اس کے واسطے صرف ایک طریقہ ہے۔ طبعی اسباب کا تصور تو بہت تھوڑے عرصہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابتدائی انسان صرف ایک قسم کی علت کا گمان کر سکتا ہے یعنی مثل اپنے ایک بارادہ طبیعت کا۔ اس لئے وہ تمام چیزوں کو جنہیں متحرک اور عمل کنندہ پاتا ہے ذی روح اور ذی فہم وجود ٹھہرا لیتا ہے اور ان کی طرف مثل انسانوں کے خیالات اور طبائع منسوب کرتا ہے اور اس سے زیادہ کیا قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ بذریعہ نذروں اور التجاؤں کے ان کے مہربان کرنے یا ان کی بدمزاجی یا غصہ کے دور کرنے کے واسطے کوشش کرے۔

جب کہ انسان ہنوز وحشیانہ حالت میں تھا اس نے قدرت کی بڑی بڑی اشیاء کو اپنی فرحت یا مصیبت کے اسباب کی نظر سے دیکھا اور اسی واسطے ان کو بہ نسبت اپنے زیادہ طاقت ور سمجھا اور اس نیت سے کہ اپنی دعائیں اور التجائیں ان سے ایک ظاہر شکل میں کرے اس کو اپنی خیالی چیزوں کے مجسم کرنے کے واسطے جو اب اس کے معبود ہو گئے نقاشی یا مصوری گو کیسی ہی ناقص ہو عمل میں لانی پڑی۔ بت پرستی کی ایک اور بنا کسی قوم کے کسی شخص کی خدمات کو جو اپنے کارہائے نمایاں کی وجہ سے مشہور معروف ہوا ممنونیت کی خواہش تھی۔ یعنی ایسے کارہائے نمایاں جو شاعروں کے وحشیانہ گیتوں اور نظموں میں مشہور ہوئے اور مرنے کے بعد اس شخص کو معبود ہونے کے رتبہ کا صلہ دلایا۔ یہی امر عرب پر بھی صادق آتا ہے۔ آفتاب' ماہتاب' سیارے اور بروج ملائک اور ارواح جو بقول ان کے انسانوں کی زندگانی کے واقعات پر حاوی اور قادر تھے۔ ان سب کو رتبہ الوہیت دے رکھا تھا اور ان کی پرستش کرتے تھے۔ اسی طرح ان آدمیوں کی بھی پرستش کرتے تھے جنہوں نے اپنے شکر گزار ملک کی خدمتیں بجالا کر نام حاصل کیا تھا۔

اس طریقہ پرستش کے اختیار کرنے میں انسانوں کا منشاء محض معلل بہ دنیا تھا۔ ان بتوں یا ان اشیاء اور اشخاص کی پرستش کا باعث جن کے وہ قائم مقام ہیں یہ اعتقاد تھا کہ اپنے پرستش کنندہ کو ہر قسم کی دنیوی خوشی اور آسائش عطا کرنا اور ان مصیبتوں اور خرابیوں کو جو اس پر نازل ہونے والی ہوں رد کر دینا ان کے اختیار میں ہے اور ان کی پرستش کو ترک کر دینے کی سزا ان کے اعتقاد میں افلاس' بیماری' لاولدی اور عبرت انگیز موت ہوتی تھی۔

جوں جوں زمانہ بڑھتا گیا تہذیب اور شائستگی کو ترقی ہوتی گئی باہمی راہ و رسم کے ذریعے زیادہ شائع اور پر امن ہوتے گئے جب

کہ آدمیوں کو ایک دوسرے سے ملاقی ہونے کا زیادہ اتفاق ہوتا گیا یہاں تک کہ اپنے خیالات اور اپنی رایوں اور اپنے عقائد کا تبادلہ کرنے کے قابل ہوئے ان کے دماغ عالی ہوتے گئے اور ان کی خوشیاں زیادہ شائستہ اور پاک ہوتی گئیں۔

یہی غیر محسوس خیالات کی ترقی عرب میں بھی واقع ہوئی اور اس ملک کے باشندوں نے اپنے معبودوں کو ہر جسمانی آسائش اور روحانی خوشی کے عطا کرنے کا اس شخص کی نسبت جس سے وہ راضی ہوں اختیار کلی دے دیا۔

قدیمی باشندگان عرب کی نسبت یعنی قوم عاد ثمود جدیس جرہم الاولیٰ اور عملیق الاول وغیرہ کی اس قدر محقق ہے کہ یہ لوگ بت پرست تھے مگر ہمارے پاس کوئی ایسی مقامی روایت عرب کی نہیں ہے جو ہم کو ان کی پرستش اصنام کے طریقوں کی تعیین اور جو قدرتیں کہ وہ اپنے معبودوں کی طرف منسوب کرتے تھے ان کی تصریح اور جن اغراض اور ارادوں سے کہ وہ مورتوں کو پوجتے تھے ان کے بیان کرنے میں مطمئن کرے قریب قریب تمام حال جو ہم کو عرب کے بتوں کی نسبت معلوم ہوتا ہے صرف یقطان اور اسماعیل کی اولاد کے بتوں کی نسبت معلوم ہے جو عرب العاربہ اور عرب المستعربہ کے نام سے مشہور ہیں۔ان کے بت دو قسم کے تھے۔ایک قسم تو وہ تھی جو ملائک اور ارواح اور غیر محسوس طاقتوں سے جن پر کہ وہ اعتقاد رکھتے تھے اور جن کو مونث خیال کرتے تھے نسبت رکھتے تھے اور دوسری قسم کے وہ تھے جو نامی اشخاص کی طرف جنہوں نے اپنے عمدہ کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل کی تھی منسوب تھے۔

وہ قدرتی سادگی اور بے تکلفی جو ابتدائی درجہ تمدن میں آدمیوں کی نشانیاں ہیں ان کی پرستش کے طریقوں میں قابل تمیز نہیں رہتی تھیں۔علاوہ اس کے انہوں نے بہت سے خیالات غیر ملکوں کے اور نیز اپنے ہی وطن اصلی کے الہامی مذہبوں سے اخذ کر لئے تھے اور ان سب کو اپنے توہمات سے خلط ملط کر کے اپنے معبودوں کو دنیا اور عقبیٰ دونوں کے اختیارات دے دیئے تھے لیکن اتنا فرق تھا کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ دنیوی اختیارات بالکل ان کے معبودوں کے ہاتھ میں ہیں اور عقبیٰ کے اختیارات کی نسبت ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ان کے بت یعنی وہ جن کی پرستش کے لئے وہ بت بنائے گئے ہیں ان کے گناہوں کی معافی کی اللہ تعالیٰ سے شفاعت کریں گے ان کی طرز معاشرت اور ان کی خانگی سوشل اور مذہبی اطوار اور رسوم نے بھی اسی طرح سے گرد و نواح کے ملکوں سے جن کے باشندے الہامی مذہب رکھتے تھے اثر حاصل کیا تھا غرض کہ قبل ظہور اسلام کے ملک عرب میں بت پرستی کی یہ کیفیت تھی۔

لا مذہبی

زمانہ جاہلیت میں ملک عرب میں ایک فرقہ تھا جو کسی چیز کو نہیں مانتا تھا نہ تو بت پرستی کو اور نہ کسی الہامی مذہب کو۔ان کو اللہ کے وجود سے انکار تھا اور حشر کے بھی منکر تھے اور چونکہ وہ گناہ کے وجود کے قائل نہ تھے اسی لئے عقبیٰ میں بھی روح کی جزا یا سزا کے قائل نہ تھے۔وہ اپنے آپ کو جملہ قیود قانونی خواہ رہی سے مبرا تصور کرتے تھے اور اپنی ہی آزاد مرضی کے موافق کاربند ہوتے تھے۔ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کا جود اس دنیا میں ایک درخت یا جانور کی مانند ہے۔وہ پیدا ہوتا ہے اور پختگی پر پہنچ کر تنزل پکڑتا ہے اور مر جاتا ہے جس طرح کہ کوئی ادنےٰ جانور مر جاتا ہے اور جانوروں ہی کی مانند بالکل نیست و نابود ہو جاتا ہے۔

خدا پرستی

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں بھی خدا پرست عرب تھے اور وہ دو قسم کے تھے ایک تو ایک غیر معلوم اور پوشیدہ قدرت کو جس کو وہ اپنے وجود کا خالق قرار دیتے تھے مانتے تھے لیکن باقی امور میں ان کا عقیدہ لا مذہبوں کے عقیدہ کی مانند تھا۔دوسری قسم کے فرقہ کے

لوگ خدا کو برحق مانتے تھے اور قیامت اور نجات اور حشر اور بقائے روح اور اس کی جزا اور سزا کے جوحسب اعمال انسانوں کو ملے گی قائل تھے مگر انبیاء اور وحی پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔

اس اخیر فرقہ کا عقیدہ تھا کہ غیر فانی روح کی جزا اور سزا دوسرے جہان میں محض آدمیوں کے نیک اور بد اعمال پر جو اس دنیا میں کئے ہوں منحصر ہے۔اس لئے ضرور ہوا کہ وہ ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے ان کو دائمی خوشی حاصل ہو اور ان کو ابدی تکلیف اور خرابی سے محفوظ رکھے۔لیکن خود ان کے پاس کوئی ایسا اصول جس پر وہ کاربند ہوں موجود نہ تھا اس لئے انہوں نے ان قواعد کی طرف توجہ کی جن کو ان کے گردنواح کی قومیں مانتی تھیں اور اپنی سمجھ کے موافق ہر قوم سے کچھ کچھ باتیں اخذ کر کے اختیار کیں۔یہی اسباب تھے جن کے سبب سے عرب کے کچھ لوگ بت پرست ہو گئے اور بعض نے کسی مذہب معینہ کی پابندی نہیں کی بلکہ اپنی ہی عقل اور سمجھ کے بموجب کاربند ہوئے۔

الہامی مذہب

اسلام سے پہلے چار الہامی مذہب عرب میں وقتاً فوقتاً جاری ہوئے۔(۱) مذہب صابئی۔(۲) مذہب ابراہیمی اور دیگر انبیا عرب کا۔(۳) مذہب یہود۔(۴) مذہب عیسوی۔

مذہب صابئی۔

اس مذہب کو عرب میں قوم سامری نے رواج دیا تھا جو اپنے آپ کو قدیم مذہب کے پیرو سمجھتے تھے۔وہ حضرت شیث اور حضرت اخنوخ یعنی ادریس کو اپنے نبی کہتے تھے اور اپنے مذہب کو ان کی طرف منسوب کرتے تھے۔ان کے ہاں ایک کتاب بھی تھی جس کو وہ صحیفہ شیث کہتے تھے۔ہماری رائے میں کوئی یہودی یا عیسائی یا مسلمان صابئیوں کے اس عقیدہ پر جو وہ حضرت ادریس کے ساتھ رکھتے تھے کسی قسم کا اعتراض نہیں کر سکتا ہے۔توریت میں حضرت ادریس کو ایک مقدس اور باخدا شخص لکھا ہے اور وہ آیت یہ ہے ''واخنوخ باخدا سلوک نمودہ بعد از اں ناپدید شد چہ خدا اورا گرفتہ بود (کتاب پیدائش باب ۵ آیت ۲۴) وہ شخص جس کو مسلمان ادریس یا الیاس کہتے ہیں اور توریت کا اخنوخ ایک شخص ہیں۔صابئیوں کے ہاں سات وقت کی نمازیں تھیں اور وہ ان کو اسی طرح ادا کرتے تھے جس طرح کہ مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔سردہ کی بھی وہ نماز پڑھا کرتے تھے۔مسلمانوں کی طرح وہ بھی ایک قمری مہینہ کا روزہ رکھا کرتے تھے مگر جو برائی کہ آہستہ آہستہ ان کے مذہب میں پھیل گئی تھی وہ یہ تھی کہ ستاروں کی پرستش کرنے لگے تھے۔انہوں نے سات ہیاکل یعنی معبد سبع سیاروں کے لئے بنائے تھے اور جس ستارہ کا جو معبد تھا اس معبد میں اس ستارہ کی پرستش کرتے تھے۔حران کے معبد میں سب لوگ بہ نیت حج جمع ہوا کرتے تھے۔خانہ کعبہ کی بھی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ان کا سب سے بڑا مذہبی تیوہار اس روز ہوا کرتا تھا جب کہ آفتاب برج حمل میں جو موسم بہار کا اول برج ہے داخل ہوتا تھا اور چھوٹے چھوٹے تیوہار اس وقت ہوتے تھے جب کہ پانچ سیارے یعنی زحل مشتری مریخ زہرہ عطارد بعض برجوں میں یکے بعد دیگرے داخل ہوا کرتے تھے۔ان کا اعتقاد تھا کہ ان سیاروں کا سعد اور نحس اثر انسان کی قسمتوں پر اور دنیا کے اور امور پر ہوتا ہے۔وہ یقین کرتے تھے کہ بارش یا مینہ کی کشش انہیں ستاروں کی تاثیر پر منحصر ہے یہ خیال اور اسی قسم کے اور خیالات اور عقائد صابئیوں کے سوا عرب کے اور لوگوں میں بھی رائج ہو گئے تھے۔ان میں اعتکاف کرنے کا بھی رواج تھا اور غاروں یا پہاڑوں میں چند روز مراقبہ اور سکوت بسر کرتے تھے۔

ابراہیم یا دیگر انبیاء عرب کا مذہب

اسلام سے پہلے پانچ انبیاء عرب میں مبعوث ہوئے تھے۔(۱) ہودؑ (۲) صالحؑ (۳) ابراہیمؑ (۴) اسماعیلؑ (۵) شعیب۔ یہ سب نبی حضرت موسیٰ سے اور بنی اسرائیل کو احکام عشرہ کے عطا ہونے سے پیشتر گزرے ہیں۔

اصل اصول ان جمیع انبیاء کے مذاہب کا خدائے واحد کی عبادت تھا اور دیگر احکام و مسائل جن کو انبیاء مذکورہ نے بتایا تھا باستثناء احکام و مسائل حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے سب فراموش ہو گئے تھے اور کوئی مقامی روایت ایسی موجود نہیں ہے جو ہم کو اس بات سے واقف کرے کہ وہ احکام کیا تھے اور کتنے تھے۔

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے مذہب کے احکام و مسائل کے لئے بھی اسی طرح کوئی ایسی کافی سند نہیں ہے جس سے کہ ہم ان کو تفصیل وار بیان کر سکیں اور ایسے بہت کم مسائل ہیں جنہوں نے باستعانت روایت مذہبی اور روایت مقامی کے ایسا تاریخی رتبہ حاصل کیا ہو کہ ہم اس کے حوالہ دینے کے لائق ہوں۔

حضرت ابراہیم کے تقویٰ اور پرہیزگاری کا سب سے پہلا کام بت پرستی کا ترک کرنا اپنے باپ کے بتوں کا توڑنا اور خدائے برحق پر یقین کر کے صدق دل سے اس کی پرستش کرنا تھا۔

ختنہ اور داڑھی کا رکھنا رسوم مذہبی ہیں جن کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ یہ رسمیں حضرت ابراہیم نے مروج اور معین کی تھیں۔ خدائے پاک کی پرستش کے واسطے قربان گاہوں کے بنانے کی رسم بھی حضرت ابراہیم نے جاری کی تھی اور منجملہ بیشمار قربان گاہوں کے جو حضرت ابراہیم نے بنائیں ایک قربان گاہ اس مقام پر بھی بنائی تھی جہاں کہ حجر اسود قبل اس کے کہ دیوار کعبہ میں اور پتھروں کے ساتھ نصب ہو کھڑا ہوا تھا۔

خدائے تعالیٰ کی عبادت کے واسطے خانہ کعبہ کی تعمیر کی نسبت عرب کی تمام مقامی روایتیں اور تمام مورخ اس امر پر متفق ہیں کہ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے بنایا تھا۔

سینٹ پال حواری نے جو گلیشیا والوں کے نام خط لکھا ہے ہماری رائے میں اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کو جو 'بیت المقدس کا ہم پایہ ہے' حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے بنایا تھا۔

خانہ کعبہ میں اول خدا کی عبادت اس کے اندر اور باہر کیا کرتے تھے اور اس کے بعد اس کے گرد طواف کیا کرتے تھے اور طواف کے وقت ساری جماعت پکار پکار کر خدا کا نام لیتی تھی اور خانہ کعبہ کو بوسہ دیتی جاتی تھی۔

اس مقام پر خود بخود ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا فرق ہے خانہ کبہ کے گرد طواف کرنے اور اس کو اور حجر اسود کو بوسہ دینے اور قربان گاہوں کے بنانے اور ان کی تعظیم کرنے اور حضرت یعقوب کے پتھر کھڑا کرنے اور اس پر تیل ڈالنے اور نماز میں بیت المقدس یا کعبہ کی طرف سجدہ کرنے غرض کہ اشیائے مجسم کی تعظیم اور حرمت کرنے میں اور بت پرستوں کی ان رسوم میں جو کہ وہ اپنے بتوں کی نسبت عمل میں لاتے ہیں اور جس کی وجہ سے ان کو ہر شخص حقارت اور غصہ کی نظر سے دیکھتا تھا اور اب بھی دیکھتا ہے۔

بلاشبہ ان دونوں کاموں میں بڑا فرق ہے مگر جو امر کہ لوگوں کو ان دونوں کاموں میں صاف صاف تمیز کرنے سے روکتا ہے وہ لفظ ''بت پرستی'' ہے جس سے یہ مراد سمجھی جاتی ہے کہ آدمی کسی مجسم اور مصنوعی شئے کی تعظیم اور پرستش کرنے میں گنہگار ہوتے ہیں۔

مگر یہ غلطی ہے۔ بت پرستوں کے مشرک اور گنہگار ہونے کی صرف یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ مجسم اور مصنوعی اشیاء کی تعظیم اور پرستش کرتے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ چند روحانی یا ذی جسم وجودوں یا طاقتوں یا عظیم الشان قدرتی اشیاء کو ان سب قدرتوں کا مالک سمجھتے ہیں جو درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات سے علاقہ رکھتے ہیں اور ان اشیاء وغیرہ کی اس طرح بندگی بجالاتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے۔ ان کے بت ان وجودوں کے جو غیر خدا ہیں قائم مقام اور یادگار ہوتے ہیں نہ کہ خدا تعالیٰ کے۔ اس اعتقاد کی وجہ سے وہ مشرک اور گنہگار ہو جاتے ہیں۔ خواہ وہ ان روحانی یا ذی جسم وجودوں یا طاقتوں یا عظیم الشان قدرت اشیاء کے ناموں پر کوئی مورت یا بت قائم کر کے پوجتے ہوں خواہ صرف اپنے دل ہی میں یہ اعتقاد رکھ کر ان کی پرستش کرتے ہوں اور ظاہر میں ان کا کوئی بت نہ بناتے ہوں۔ ان کو بت پرست اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اکثر ان روحانی یا ذی جسم وجودوں یا طاقتوں یا عظیم الشان قدرتی اشیاء کی جن کو وہ صفات الٰہی کا مخزن اور معدن سمجھتے تھے اپنے خیال کے موافق بت اور مورتیں بنا کر ان کے توسل سے ان کو پوجتے تھے اگر وہ ان ظاہری وسائل پرستش کو اختیار نہ کرتے لیکن باطن میں یہی اعتقاد رکھتے تب بھی ان کو بت پرست کہنا ناموزوں نہ ہوتا۔

حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی قربان گاہیں جن میں حجر اسود بھی شامل ہے اور حضرت یعقوب کا کھڑا کیا ہوا پتھر اور خانہ کعبہ اور بیت المقدس یہ سب چیزیں کسی مشہور اشخاص کی یادگار کے طور پر نہیں بنائی گئی تھیں اور نہ وہ کسی فرشتہ یا عظیم الشان قدرتی شئے کے نام پر قائم کی گئی تھیں بلکہ بالتخصیص قادر مطلق کے نام پر جو چیزوں کا خالق ہے اور اسی کی پرستش کی غرض سے بنائی گئی تھیں جملہ رسوم اور تعلقات جو ان مقاموں پر برتے جاتے تھے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور پرستش کے مختلف طریقے تھے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کو کسی طور پر بجالائی جائے جس کو اللہ تعالیٰ نے منظور اور مقبول کر لیا ہو۔ ہرگز گناہ یا شرک یا بت پرستی نہیں ہو سکتی۔

تمام آدمیوں کا میدان عرفات میں جمع ہونا جہاں کہ نہ حضرت ابراہیم کا حجر اسود ہے نہ حضرت یعقوب کا سنگ قربان گاہ اور نہ حضرت اسماعیل کا معبد بلکہ محض ایک وسیع میدان ہے۔ ان لوگوں کا ایک ساتھ شامل ہو کر خدا کا نام لے کر پکارنا اور اپنے گناہوں کی معافی چاہنا خاص خدا کی عبادت ہے۔ جس کا نام مسلمانوں نے حج رکھا ہے اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اس طرح پر عبادت کرنے کے بانی ہوئے تھے۔ پس کون شبہ کر سکتا ہے کہ حج اس واجب الوجود لاشریک لہ کی خاص الخاص عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ رفتہ رفتہ ملک عرب میں بت پرستی کا عام رواج ہو گیا تھا مگر بایں ہمہ ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے اشخاص ایسے بھی تھے جو ان مذاہب الہامی میں سے کسی نہ کسی مذہب کے متبع تھے اور خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے۔ انہیں لوگوں میں سے متعدد نے مجدد مذہب ہونے کا دعویٰ کیا اور اللہ تعالیٰ کے معبود حقیقی ہونے کا مجمع عام میں وعظ کہا اور لوگوں کو بت پرستی چھوڑنے پر ترغیب دی۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنی نسبت مجدد ہونے کی شہرت دی تھی ان کے نام یہ ہیں حنظلہ ابن صفوان' خالد ابن سنان' اسد ابو کرب' قیس ابن صیدا وغیرہ اور بعضوں نے عبدالمطلب کو بھی ایک مجدد مذہب قرار دیا ہے۔

لیکن یہ کیسا ہی حیرت انگیز امر کیوں نہ معلوم ہو کہ اس شخص کی اولاد جس نے اپنے باپ کے بتوں کو توڑا اور ان کی پرستش سے منہ موڑا اور خدائے برحق کی پرستش کیلئے متوجہ ہوا اور کہا "**انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین**"، رفتہ رفتہ اس بت پرستی کی حالت میں ڈوب جائے۔ مگر اس سے زیادہ تعجب انگیز اور حیرت آمیز یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کی اولاد میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے پھر اپنے مورثوں کے بتوں کو بلکہ تمام عرب کے بتوں کو غارت کر دیا اور

جس نے خدائے اعظم اور علام الغیوب کی عبادت کو جو تمام چیزوں کا مبداء اور مرجع ہے رواج دیا اور اعلیٰ ترین درجہ پر پہنچا دیا۔ اور جس نے کہ جہالت اور کفر کی اس گہری تاریکی کو جس میں کہ اس کے ہم وطن مبتلا تھے دین حق کے پاک اور شفاف نور سے منور کر دیا۔

یہودی مذہب

یہودی مذہب کو شام کے یہودیوں نے عرب کے ملک میں شائع کیا تھا جو اس ملک میں جا کر آباد ہوئے تھے۔ بعض مصنف ناواجب جرأت کر کے یہ رائے دیتے ہیں کہ ایک قوم بنی اسرائیل کی اپنے جتھے سے علیحدہ ہو کر ملک عرب میں جا بسی تھی اور وہاں اکثر قوموں کو اپنا مذہب تلقین کیا مگر یہ رائے صحت سے بالکل معرا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہودی مذہب عرب ان یہودیوں کے ساتھ آیا تھا جو پینتیسویں صدی دنیوی میں یا پانچویں صدی قبل حضرت مسیح کے بخت نصر کے ظلم کے جوان کے ملک اور قوم کی تخریب کے درپے ہوا تھا بھاگ گئے تھے اور شمالی عرب میں بمقام خیبر آباد ہوئے تھے۔ تھوڑے عرصہ بعد جب کہ ان کی مضطرب حالت نے کسی قدر سکون اور قرار پکڑا۔ انہوں نے اپنے مذہب کو پھیلانا شروع کیا اور قبیلہ کنانہ اور حارث ابن کعب اور کندہ کے بعض لوگوں کو اپنے مذہب میں لائے۔ جب کہ ۳۶۵۰ دنیوی میں ۳۵۴ قبل مسیح کے یمن کے بادشاہ ذونواس حمیری نے مذہب یہود اختیار کیا۔ تب اس نے اور لوگوں کو بھی بالجبر اس مذہب میں داخل کر کے اس کو بہت ترقی دی۔ اس زمانہ میں یہودیوں کو عرب میں بڑا اقتدار حاصل تھا اور اکثر شہر اور قلعے ان کے قبضے میں تھے۔

اس بات کے یقین کرنے کا قوی قرینہ یہ ہے کہ یہودی بت پرستی کو غصہ اور حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں گے مگر عرب کی کوئی مقامی روایت اس مضمون کی نہیں پائی جاتی کہ خانہ کعبہ کی نسبت ان یہودیوں کی رائے عربوں کی رائے سے برخلاف تھی مگر یہ امر تسلیم کیا گیا ہے کہ ایک تصویر یا مورت حضرت ابراہیم کی جن کے پاس ایک مینڈھا قربانی کے واسطے موجود کھڑا تھا یہودیوں کے ذریعہ سے خانہ کعبہ میں اس بیان کے مطابق جو توریت میں ہے کھینچی گئی ہوگی یا رکھی گئی ہوگی کیونکہ یہودی اس قسم کی تصویروں یا مورتوں کے بنانے اور رکھنے کو گناہ نہیں سمجھتے تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہودیوں کے ذریعہ سے ملک عرب میں خدا تعالیٰ کی معرفت کا علم جیسا کہ قبائل عرب میں بالعموم پیشتر تھا اس سے بھی دو چند ہو گیا۔ وہ عرب جنہوں نے عرب یہودی مذہب قبول کر لیا تھا اور وہ لوگ بھی جو ان سے راہ و رسم رکھتے تھے اس سے فائدہ مند ہوئے تھے کیونکہ یہودیوں کے پاس ایک عمدہ قانون شریعت اور سوشل اور پولیٹیکل کا موجود تھا اور اس زمانہ کے عرب اس قسم کی چیزیں سے بالکل بے بہرہ تھے اس سے ایک معقول طور پر استنباط ہوتا ہے کہ بہت سے خانگی اور سوشل آئین اور رسوم کو جو اس قانون میں مذکور ہیں عربوں نے اختیار کر لیا ہوگا۔ خصوصاً یمن کے رہنے والوں نے جہاں کہ ان کے بادشاہ ذونواس نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا اور اس نے یہودی مذہب کی ترویج کوشش کی ہوگی۔

ہم کو اس مقام پر مذہب یہود کے مسائل اور عقائد اور ان کی رسموں اور طریقوں پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کیونکہ یہ سب باتیں توریت میں موجود ہیں اور ہر شخص ان سے کسی نہ کسی قدر واقف ہے اور وہ امور جن کا بیان کرنا ہم کو بالتخصیص مدنظر ہے اس مقام پر بیان ہوں گے جہاں ہم مذہب یہود اور اسلام کے تعلق باہمی پر بحث کریں گے۔

عیسوی مذہب

یہ بات محقق ہے کہ عیسوی مذہب نے تیسری صدی میں ملک عرب میں دخل پایا تھا۔ جب کہ ان خرابیوں اور بدعتوں کی وجہ سے جو آہستہ آہستہ مشرقی کلیسا میں شائع ہوگئی تھیں قدیم عیسائیوں کی تباہی ہوئی تھی اور وہ لوگ ترک وطن پر مجبور ہوئے تھے تاکہ اور کسی جگہ جا کر پناہ لیں اکثر مشرقی اور نیز یورپین مورخ جنہوں نے اس مضمون کو مشرقی مصنفوں سے اخذ کیا ہے اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ وہ زمانہ ذوانواس کی سلطنت کا زمانہ تھا مگر ہم اس رائے سے کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے حساب کے موافق جس کا بیان ہم نے خطبہ اول میں کیا ہے ذونواس کا زمانہ قریباً چھ سو برس پیشتر اس واقع کے گزر چکا تھا اور اسی وجہ سے ہم ان مصنفوں کی اس رائے کو بھی تسلیم نہیں کرتے جن کا بیان ہے کہ ذونواس نے عیسائیوں کی تخریب کی تھی۔

اول مقام جہاں کہ یہ بھاگے ہوئے عیسائی آباد ہوئے تھے نجران تھا اور اس سے پایا جاتا ہے کہ وہاں کے متعدد بہ لوگوں نے عیسوی مذہب قبول کرلیا تھا۔ یہ عیسائی فرقہ جیکو بائٹ یعنی یعقوبی فرقہ تھا اور اس لقب سے مشرقی فرقہ ''مانوفیزئیٹز'' کا موسوم کیا جاتا تھا اگرچہ صحیح طور پر یہ لقب شام اور عراق اور بابل کے ''مانوفیزئیٹز'' پر اطلاق ہوسکتا ہے جب کہ بائٹ کا لقب ایک شام کے راہب کے سبب سے جس کا نام جیکوبس براڈیس تھا اس فرقہ کا پڑ گیا تھا اور جس نے کہ یونان کے بادشاہ جسٹی نین کے عہد میں اپنے ملک سے نکلے ہوئے ''مانوفیزئیٹز'' کا ایک علیحدہ فرقہ قائم کرلیا تھا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ صرف ایک صفت رکھتے ہیں یعنی ایک انسانی صفت نے ان میں تقدیس کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔

عیسائی مصنفوں نے بیان کیا ہے کہ عیسوی مذہب نے اہل عرب میں بہت ترقی حاصل کی تھی مگر ہم اس باب میں ان سے اتفاق نہیں کرتے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ باستثنائے صوبہ نجران کے جس کے اکثر باشندوں نے عیسوی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ قبائل حمیر' غسان' ربیعہ' تغلب' بحرؑ تونخ' طے' قودیہ اور حیرہ میں معدودا شخاص نے ان کی تقلید کی تھی اور کوئی جماعت کثیر یا قوم کی قوم عیسوی مذہب میں نہیں آتی تھی جس طرح کہ یہودی مذہب میں آ گئی تھی۔ اغلب ہے کہ ان متفرق اعراب متنصرہ کی وساطت سے حضرت مریم کی تصویر خواہ مورت حضرت عیسیٰ کو گود میں لئے ہوئے خانہ کعبہ کی اندرونی دیواروں پر کھینچی گئی ہو یا اس کے اندر رکھی گئی ہو۔

خانہ کعبہ میں متعدد قوموں کے معبودوں کی یا بزرگوں کی تصویریں یا مورتیں رکھی ہوئی تھیں اور جس فرقہ سے وہ تصویر یا مورت علاقہ رکھتی تھیں وہی فرقہ اس کی پرستش کرتا تھا جب کہ عرب کے لوگوں نے یہودی اور عیسائی مذہب اختیار کرلیا تو اسی مذہب کے لوگوں نے حضرت ابراہیم اور حضرت مریم کی تصویر یا مورت خانہ کعبہ میں رکھی یا کھینچی ہوگی۔ کیونکہ جس طرح عرب کے اور فرقوں کو اپنے معبودوں اور بزرگوں کی مورتیں رکھنے یا کھینچنے کا کعبہ میں حق تھا اس طرح ان عربوں کو بھی حق تھا جو یہودی یا عیسائی ہوگئے تھے اور کسی کو اس کی ممانعت کا حق نہ تھا۔

اسلام سے پیشتر ملک عرب کی یہ مذہبی حالت تھی اور ایسے مختلف مذہب جو زمانہ واحد میں وہاں مروج ہوگئے تھے اس کا ضروری نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ ان مذہبوں کے احکام اور مسائل اور رسوم باہم خلط ملط اور اہل عرب میں بالعموم مروج ہوگئے ہوں گے کیونکہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ان نیم وحشی اور جاہل لوگوں کو اس قدر شعور ہو کہ اتنے مذاہب مختلفہ کے باہمی تفرق کو جانچ سکتے ہوں اور ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرکے دقیق تفاوت کی تمیز کرتے ہوں۔

ان مذاہب کے بھاری بوجھ کے نیچے ملک عرب ایک مذبوحی حرکت کر رہا تھا کہ دفعتہً اسلام نمودار ہوا اور اس کو حیرت آمیز سرور میں ڈال کر اس کا غیر متحمل بوجھ دور کر دیا اور دفعتہً جزیرہ عرب کے چاروں کونوکوں صدق کے نور سے بھرپور کر دیا اس لئے اگر یہ کہنا جائز ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ دین اسلام عرب کے حق میں رحمت ایزدی سے کچھ زیادہ تھا۔ اسلام از روئے اصول کے بت پرستی کے بالکل متناقض تھا کیونکہ وہ حقائق قدرتی اور ابدی کو تعلیم و تلقین کر کے انسان کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانا چاہتا تھا اور بت پرستی انسان کو جہالت کی حالت میں رکھ کر از روئے تمدن اور اخلاق کے دونوں طرح سے غلام بنانا چاہتی تھی۔ اسلام لامذہبی سے بھی کچھ موافقت نہ رکھتا تھا کیونکہ اس کا ابتدائی اور خاص اصول یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی واحدانیت پر اور اس کے وجود پر بے چون و چرا اعتقاد رکھنا چاہیے جس کے وجود سے لامذہبوں کو انکار تھا۔ مذہب اسلام میں اور عرب کے خدا پرستوں کے مذہب کے دونوں فرقوں میں سے دوسرے فرقہ سے کوئی سخت مخالفت نہ تھی کیونکہ اگر اس فرقہ کے عقائد میں وحی کے عقیدہ کو اضافہ کیا جائے تو مذہب اسلام کے اصلی اصول کے بہت قریب قریب ہو جاتا ہے مذہب صابئ کے عقائد الہام سے اسلام بالکل مماثل تھا لیکن اس مذہب میں اجرام فلکی کی پرستش کو رد کرتا تھا اور سیاروں کے نام پر مورتیں بنانے اور معابد قائم کرنے کو بھی جو ایک قسم کی بت پرستی ہے اور جس میں قوم صابئی بوجہ امتداد زمانہ کے آہستہ آہستہ آ پڑی تھی ناروا ٹھہراتا تھا۔

ابراہیم مذہب اور عرب کے اور نبیوں کے مذہب اور یہودی مذہب کے اصول اور احکام اور عقائد اسلام کے اصول اور احکام اور عقائد کے کچھ بھی متناقض نہ تھے بلکہ درحقیقت اسلام کے اصول اور احکام ابراہیمی مذہب اور دیگر انبیائے عرب کے مذہب اور یہود کے مذہب کے اصول اور احکام کو مکمل کرتے تھے۔ اسلام میں اور یہودی مذہب میں صرف یہ فرق تھا کہ اسلام حضرت یحییٰ کو تسلیم کرتا تھا مگر یہودیوں اور عیسائیوں کی بعض غلط تفاسیر کو جو وہ توریت اور انجیل کی آیتوں کی کرتے تھے نہیں مانتا تھا۔ اصول اسلام ان عمدہ اصول سے جن کی درحقیقت حضرت عیسیٰ نے تلقین کی تھی مطابقت تامہ رکھتا تھا لیکن زمانہ اسلام میں جو عیسائی تھے ان کے اصول اور عقائد اور مسائل اور رسوم مذہبی اور ان برتاؤ سے بالکل مخالف تھا اور بجز چند متفرق اور متعدد مسائل اخلاق کے کسی اور چیز میں ان دونوں مذہبوں میں مشابہت نہ تھی۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب اسلام کیا ہے۔ ہم جواب دیتے ہیں کہ مذہب اسلام صابئی مذہب کے الہامی اصول اور احکام اور مسائل کی تکمیل اور ابراہیمی مذہب اور عرب کے دیگر الہامی مذہبوں کے اصول اور احکام اور مسائل کی تکمیل اور ترتیب اور یہودی مذہب کے الہامی اصول اور احکام اور مسائل کی قرار واقعی تکمیل اور اللہ جل شانہ کی وحدانیت کی ایسے اعلیٰ درجہ پر توضیح جو کسی اور مذہب میں اس تکمیل سے نہیں تھی اور جس کو ہم **وحدت فی الذات** اور **وحدت فی الصفات** اور **وحدت فی العباد** سے تعبیر کرتے ہیں اور اخلاق کے ان اصولوں کی جن کی حضرت عیسیٰ نے دراصل تلقین کی تھی تکمیل ہے اور ان تمام مذاہب کے الہامی اصول اور احکام اور مسائل کی تکمیل اور اجتماع کا نام اسلام ہے۔ ہم اپنے اس جواب کو بعض مثالوں کے حوالے سے مشرح کرتے ہیں۔

مذہب اسلام میں دوسرے معبود کی پرستش کا امتناع اور بت پرستی کا استیصال یہودیوں کے مذہب کے اصول کے بالکل مماثل ہے۔ توراۃ میں لکھا ہے کہ ”در حضور من ترا از خدایان غیر نہ باشد“ (سفر خروج باب ۲۰ آیت ۳) بہر چہ شمارا امور داشتم رعایت نماید و اسم خدایان غیر را ذکر نہ نمودہ از دہانت شنیدہ نہ شود“ (سفر خروج باب ۲۳ آیت ۱۳) ”بجہت خود صورت تراشیدہ و ہیچ شکل از چیزہ

ہائیکہ در آسمان است در بالا و یا در زمین است در پائین و یا د آب ہائے کہ در زیر زمین است مساز' آنہا را سجدہ نہ نمودہ ایشاں را عبادت منما زیرا کہ من خداوند خدائے تو ام (سفر خروج باب ۲۷ آیت ۴ و ۵) ''بہ بتہا توجہ منمائید و خدایان ریختہ شدہ از برائے خود مسازید خداوند خدائے شمامنم'' (سفر لویان باب ۱۹ درس ۴) ''از برائے خود تاں بتان اصنام تراشیدہ شدہ مسازید و نصب شدہا و برائے خود تاں بر پائے منمائید و در زمین خود تاں تصویر ہائے سنگے جہت سجدہ نمودنش مگذارید زیرا کہ خداوند خدائے شمامنم'' (سفر لویان باب ۲۶ درس ۱) ''خدایان را سجدہ نہ نمودہ آنہا عبادت مکن و موافق اعمال ایشاں عمل منما بلکہ ایشاں را بالکل منہدم ساختہ و بت ہائے ایشاں بالتمام بشکن'' (سفر خروج باب ۲۳ آیت ۲۴)۔

سب سے بہتر اور اعلیٰ احکام یہودی مذہب میں یہ ہیں جو ذیل میں لکھے جاتے ہیں اسلام میں یہی احکام بجنسہ موجود ہیں ''پدر و مادر خود را احترام نما۔ قتل مکن' زنا منما' دزدی مکن' بر ہمسایہ ات شہادت دروغ مدہ' بخانہ ہمسایہ ات طمع مورز''۔

(سفر خروج باب ۲۰ آیت ۱۲۔۷)

اوقات نماز جو اسلام میں مقرر ہیں اور جن کی تعداد [1] سات یا پانچ یا تین ہیں مذہب صابی اور مذہب یہود کی اوقات نماز سے بہت مشابہ ہیں۔

اسلام میں نماز پڑھنے کا جو طریقہ ہے وہ صابی مذہب اور یہود کے مذہب کے طریقہ سے نہایت مماثل ہے۔ نماز دل کی صفائی کے لئے تھی اور یہی اصلی منشاء نماز کے مقرر کرنے کا تھا اور جسم اور پوشاک وغیرہ کی صفائی جس کے واسطے شرع اسلام میں حکم ہے صابیوں اور یہودیوں کی اس قسم کی رسومات سے بہت کچھ مشابہت رکھتے ہیں۔ تورات میں خدا تعالیٰ نے موسیٰ سے کہا کہ ''نزد قوم روانہ شدہ ایشاں را امروز و فردا تقدیس نمائے تا کہ جامہ ہائے خود را شست شونمایند'' (سفر خروج باب ۱۹ درس ۱۰) ''پس موسیٰ ہارون و پسرانش را نزدیک آوردہ ایشاں را بہ آب شست و شوداد'' (سفر لویان باب ۸ آیت ۶)

مذہبی امور میں صرف ایک یہی بات اسلام میں نئی ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ یعنی نماز کے بلانے کے لئے یہودیوں کی قرنائے بجانے اور عیسائیوں کے گھنٹے بجانے کے بدلے اذاں مقرر کی گئی ہے اس نرالے پن کی نسبت ایک عیسائی مصنف اس طرح پر لکھتا ہے کہ ''مختلف اوقات نماز کی اطلاع موذن مسجدوں کی میناروں یا ماذنوں پر کھڑے ہو کر اذاں دینے سے کرتے ہیں۔ ان کا لحن جو ایک بہت سادہ مگر سنجیدہ لہجہ میں بلند ہوتا ہے۔ شہروں کی دوپہر کی دوند پکار میں مسجد کی بلندی سے دلچسپ اور خوش آواز معلوم ہوتا ہے لیکن سنسان رات میں اس کا اثر اور بھی عجیب طور سے شاعرانہ معلوم ہوتا ہے یہاں تک کہ اکثر فرنگیوں کی زبان سے بھی پیغمبر صاحب کی تعریف نکل گئی ہے کہ یہودیوں کے معبد کی قرنائے اور کلیسائے نصاریٰ کے گھنٹوں کی آواز کے مقابلہ میں انسانی آواز کو پسند کیا۔

تمام قربانیاں جو مذہب اسلام میں جائز ہیں مذہب یہود کی قربانیوں کے مشابہ ہیں گویا یہ قربانیاں شارع اسلام نے مذہب یہود کی بیشمار قربانیوں سے منتخب کر لی ہیں اور جو تاکیدی حکم مذہب یہود میں ان قربانیوں کے کرنے کی نسبت تھا اس کو نہایت خفیف

---

[1] یعنی فجر' ضحیٰ یعنی چاشت' ظہر' عصر' مغرب' عشاء' تہجد۔ دوسری اور ساتویں نماز مسلمانوں میں فرض نہیں ہے اور باقی پانچ نمازیں فرض ہیں۔ دوسری اور تیسری کو اور چوتھی اور پانچوں کو ایک وقت میں پڑھ لینے کا اختیار ہے اس صورت میں پانچ نمازیں اور تین وقت رہ گئے۔

بلکہ اختیاری کر دیا ہے۔

مذہب اسلام میں جو روزے مقرر ہیں وہ بھی مذہب یہود اور مذہب صابئی کے روزوں سے مشابہ ہیں بلکہ صابئی مذہب کے روزوں سے بہ نسبت یہودی مذہب کے روزوں کے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔

ہفتہ کے ایک معینہ دن میں نماز اور دیگر رسوم مذہبی کے مقررہ وقت پر لوگوں کو کارہائے دنیوی سے منع کرنا یہودیوں کی اسی قسم کی رسم سے مطابقت رکھتا ہے لیکن حضرت ابراہیم کے زمانہ سے اہل عرب جمعہ کو متبرک دن سمجھتے ہیں۔

ختنہ بھی وہی ہے جس کا یہود اور پیروان حضرت ابراہیم کے ہاں دستور تھا۔ نکاح اور طلاق بھی قریب قریب ویسا ہی قاعدہ ہے جیسا کہ اور مذاہب الہامی میں تھا توریت میں لکھا ہے کہ "اگر کسے زنے را گرفتہ بہ نکاح خود در آورد واقع شود کہ بہ سبب چیزے کہ دریافت شد نظرش التفات نہ یابد آنگاہ طلاق نامہ نوشتہ بدستش بدہد اور از خانہ اش رخصت دہد" (سفر توریہ مثنیٰ باب ۲۴ آیت ۱)۔

بعض عورتوں سے نکاح کرنے کے جواز یا عدم جواز میں جو احکام مذہب اسلام میں ہیں وہ اکثر باتوں میں یہودیوں کے مذہب کے احکام سے مشابہ ہیں۔

جنبی مرد اور عورت کو مسجد میں جانے یا قرآن مجید کے چھونے کا امتناع انہیں دستوروں سے مشابہت رکھتا ہے جو مذہب یہود میں جاری ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ مذہب اسلام میں بہ نسبت مذہب یہود کے یہ امتناع کم سختی سے ہے۔

سؤر کے گوشت کے کھانے کی ممانعت مذہب اسلام میں ویسی ہی ہے جیسی کہ بنی اسرائیل کے مذہب میں تھی۔ تورات میں لکھا ہے "دخوک باوجودیکہ ذی سم چاک وتمام شگاف است امانوش خوارنمی کند آں برائے شما ناپاک است" (سفر لویاں باب ۱۱ درس ۷)۔

جانوروں کے حلال یا حرام ہونے اور مرے ہوئے جانور کا گوشت نہ کھانے کی نسبت جو احکام مذہب اسلام میں ہیں وہ موسوی شریعت کے نہایت ہی مشابہ ہیں بلکہ علمائے اسلام نے وہ تمام مسائل موسوی شریعت سے مستنبط کئے ہیں۔

شراب خواری اور دیگر مسکرات کا امتناع بھی موسوی شریعت کے مشابہ ہے تورات میں ہے کہ "ہنگام در آمدن شما بہ خیمہ شراب ومسکرات رانخورید" (سفر لویان باب ۱۰ درس ۹) مگر مذہب اسلام نے اس خرابی کی جو شراب سے ہوتی ہے پوری بندش کر دی ہے یعنی شراب کو بالکل حرام کر دیا ہے اور کسی وقت پینے کی اجازت نہیں ہے۔

مذہب اسلام میں مختلف جرائم اور تقصیرات کی نسبت جو سزائیں مقرر ہیں وہ بھی ان سزاؤں سے جو موسوی شریعت میں ہیں نہایت درجہ مشابہت رکھتی ہیں۔ زنا کی سزا سو کوڑے مارنا مذہب اسلام میں ہے۔ یہ سزا یہودیوں کے قانون سے مختلف ہے لیکن جو علمائے اسلام یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب اسلام میں بھی زنا کی سزا سنگسار کرنا ہے تو یہ سزا یہودیوں کے مذہب سے بالکل مماثلت رکھتی ہے۔

مسلمان فقہا نے ارتداد کی سزا قتل قرار دی ہے اگر درحقیقت مذہب اسلام میں ارتداد کی یہی سزا ہو وہ بھی موسوی شریعت سے بالکل مماثل ہے۔ تورات میں لکھا ہے "وہر کسے کہ اسم خداوند را کفر بگوید البتہ باید کشتہ شود تمامی جماعت باید اور ابے تامل سنگسار نمایند خواہ غریب خواہ متوطن چونکہ اسم خداوند را کفر گفتہ است کشتہ شود" (سفر لویاں باب ۲۴ درس ۱۶)۔

بعض عیسائی مورخوں نے کہا ہے کہ اسلام میں ملائک کا تصور اور اعتقاد یہودیوں کی کتاب تالمود سے اور جنات اور شیاطین کا

اعتقاد یہودیوں کی کتاب مدراش اور تالمد دونوں سے اور مرنے کے بعد جسم اور روح کی حالت کا بیان یہودیوں سے اور بہشت اور دوزخ کی کیفیت یہودیوں اور عیسائیوں سے روز قیامت اور روز حشر کے حالات کا یہودیوں کی کتاب مدراش اور تالمود سے اخذ کیا ہے مگر ہماری رائے یہ ہے کہ اول تو وہ حالات جس طرح پر کہ لوگ خیال کرتے ہیں اس طرح پر مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔ دوسرے یہ کہ ان امور میں سے جس قدر کہ مذہب اسلام سے علاقہ رکھتے ہیں وہ ان ذریعوں سے اخذ نہیں کئے گئے کیونکہ بجز اتحاد نام کے اور جو کچھ اسلام میں بیان کیا گیا ہے وہ کتب مذکورہ بالا کے بیان سے بالکل اختلاف رکھتا ہے۔

اس خطبہ میں اس قدر گنجائش نہیں ہے کہ ہم ان امور پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں اور ان امور میں سے جو امور کہ متعلق اسلام ہیں اور جو امور کہ متعلق اسلام نہیں ہیں ان میں تمیز کریں اور امور متعلقہ اسلام کی کامل تشریح کریں اس لئے ہم اس مضمون کو یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں کہ اگر بالفرض امور مذکورہ بالا مذہب اسلام سے علاقہ رکھتے ہیں جیسے کہ بالعموم مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر کا اعتقاد ہے تو وہ امور بھی مذہب اسلام میں اسی قسم کے تصور کئے جائیں گے جیسے کہ مذہب اسلام کے اور احکام یہودی مذہب سے مشابہ ہیں۔

اسلام نے عیسائی مذہب سے بجز مندرجہ ذیل دو عقیدوں کے اور کوئی عقیدہ اخذ نہیں کیا ہے۔ ایک یہ کہ ''اللہ کو جو تیرا خدا ہے اپنے سارے دل سے اور اپنی ساری جان سے اور اپنی ساری عقل سے پیار کر'' (انجیل متی باب ۲۲ آیت ۳۷) دوسرا یہ کہ ''اور جیسا تم چاہتے ہو کہ لوگ تم سے کریں تم بھی ان سے ویسا ہی کرو'' (انجیل لوقا باب ۶ آیت ۳۱)۔

اس مقام پر اگر کسی محقق اور صداقت کے متلاشی مزاج آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اگر یہی حال ہے تو اسلام اصول اور عقائد متفرقہ اور منتشرہ مذاہب سابق کی محض ایک ترتیب اور اجتماع کا نام ہے جو ادھر ادھر سے جمع کر لئے ہیں اور اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسلام کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہو لیکن ہر ذی فہم شخص پر یہ بات ظاہر ہوگئی ہے کہ یہ مشابہت اور مماثلت اصول اور عقائد مذہب اسلام کی دیگر مذاہب الہامی کے اصول وعقائد سے مذہب اسلام کے پاک اور الہامی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے تمام چیزیں جن کا مبدا ایک ہے غیر منتہی اور کامل ذات ہو ضرور ہے کہ ایک ہی قسم کی اور ایک ہی کامل اصول پر ہوں گی جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے مثل پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔ جس طرح کہ اس کی ذات سے کسی پیدا کی ہوئی چیز کو اپنی مرضی اور اپنی حکومت کے احاطہ سے خارج کر دینا محال ہے اسی طرح سے یہ بھی ناممکن ہے کہ ایک ہی غرض کے انجام دینے کے لئے دو دو متناقض اصول اور احکام اس کی ذات سے صادر ہوں۔ مسلمانوں کو بلکہ تمام دنیا کو حضرت محمد ﷺ کا ہمیشہ ممنون رہنا چاہیے جنہوں نے ابتدائے دنیا سے اپنے زمانہ تک کے تمام نبیوں کی رسالت کو برحق ٹھہرایا۔ جنہوں نے دنیا کے تمام الہامی مذہبوں کی تکمیل کی اور جنہوں نے اپنے باایمان متبعین کے لئے بے بہا اور لازوال نور کے دروازے کھول دیئے۔

☆☆☆

الخطبة الرابعة

فی

ان الاسلام رحمة للانسان وحبة الادیان الانبیاء باوضح البرهان

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

مذہب اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور موسوی اور عیسوی مذہب کو اس سے نہایت فائدے پہنچے ہیں۔

یہ مضمون جس کو اب ہم لکھنا چاہتے ہیں ایک ایسا مضمون ہے کہ ہم کو اس کا لکھنا یا پڑھنا شروع کرنے سے پہلے نہایت بے تعصب دل پیدا کرنا چاہیے کیونکہ طرف دار دل سچے اور صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچا اس الزام کے رفع کرنے سے تو ہم مجبور ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور مسلمان مذہب میں جو فی الواقع خوبی ہے اس کو ظاہر کرتے ہیں مگر جہاں تک ہم سے ہوسکا ہے ہم نے نہایت ٹھنڈی طبیعت اور ناطرفداری دل اور سیدھی سادی سچی نیت سے یہ مضمون لکھا ہے اور اسی لئے ہم کو یقین ہے کہ اگر ہم اپنی اس رائے پر دوسرے کو یقین نہ دلائیں گے تو اس کو رنجیدہ بھی نہیں کریں گے ہمارا یہ مضمون چار حصوں پر منقسم ہے۔

پہلے حصہ میں ان فائدوں کا بیان ہے جو مذہب اسلام سے عموماً انسان کی معاشرت کو پہنچے ہیں۔

گو ہم کیسے ہی سچے دل اور نیک نیت سے ناطرف دارانہ اس مضمون کو لکھیں مگر ہم کو نہایت افسوس ہے کہ جو بات مذہب اسلام کے متعلق ہوتی ہے اس کو عیسائی مصنف ہمیشہ بدظنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نیکی کو چھوڑ کر بدی پر عمل کرتے ہیں اس لئے ہم کو توقع نہیں ہوتی کہ جو خاص ہماری رائے اس باب میں ہو وہ اسی بدگمانی اور بدظنی کی نگاہ سے نہ دیکھی جائے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر ہم انہیں راؤں کا بیان کریں جن کو خود بعض عیسائی مصنفوں نے انسان کے حق میں مذہب اسلام کے مفید ہونے کی نسبت پر لکھی ہیں۔

سر ولیم میور جو ایک نہایت دیندار عیسائی ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور نہایت روشن بات نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں جس کے لئے ہم مسلمانوں کو ان کا شکر کرنا چاہیے ارقام فرماتے ہیں کہ "ہم بلا تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے (یعنی مذہب اسلام نے) ہمیشہ کے واسطے اکثر توہمات باطلہ کو جن کی تاریکی مدتوں سے عرب کے ملک جزیرہ نما پر چھا رہی تھی کالعدم کر دیا۔ اسلام کی صدائے جنگ کے روبرو بت پرستی موقوف ہوگئی اور خدا کی وحدانیت اور غیر محدود کمالات اور ایک خاص اور ہر ایک جگہ احاطہ کی ہوئی قدرت کا مسئلہ حضرت محمدؐ کے دل میں تھا مذہب اسلام میں سب سے پہلی بات جو خاص اسلام کے معنی ہیں یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر توکل مطلق کرنا چاہیے۔ بلحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں چنانچہ مذہب اسلام میں یہ ہدایت ہے کہ سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ محبت رکھیں۔ یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیے۔ غلاموں کے ساتھ نہایت شفقت برتنی چاہیے۔ نشہ کی چیزوں کی ممانعت ہے۔ مذہب اسلام اس بات پر فخر کرسکتا ہے کہ اس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔

سرولیم کی اس تحریر میں کچھ حاشیہ لکھنا چاہتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا بلکہ اس سچے مسئلہ واحدانیت کے وعظ نے بت پرستی کو معدوم کیا ہے۔ جس کا اثر قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پرتاثیر فقروں سے لوگوں کے دلوں پر ہوتا تھا اور نہ صرف عرب سے بت پرستی کو نیست و نابود کیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اس وقت دنیا میں رائج ہوتے تھے اور وہاں تک وعظوں کی آواز پہنچتی تھی اس خیال کو پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ خصلت اور ایک سخت گناہ ہے۔

برادرانہ دینی محبت کا برتاؤ آپس میں مسلمانوں کے ایک خدا کے ماننے والے ہونے کی وجہ سے بتایا جو ایک قدرتی رشتہ دینی بھائی ہونے کا ہے مگر انسانی محبت کا برتاؤ تمام انسانوں سے بلکہ ہر ایک سے جو جگر رکھتا ہو برتنے کو فرمایا۔

غلاموں کی نسبت اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو اسلام نے غلامی کو بالکل نیست و نابود کر دیا ہے اسیران جنگ کے سوا کوئی غلام نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھی زمانہ جاہلیت کی رسم کے موافق مگر قرآن ''اما منا بعد و اما فداء'' کہہ کر اس کو بھی نابود کر دیا۔ جو لوگ اسیران جنگ کو احسانا چھوڑ دیتے ہیں نہایت اعلیٰ درجہ پاتے ہیں اور جو کچھ لے کر چھوڑتے ہیں وہ ان سے کمتر گنے جاتے ہیں۔ اس حکم کے پہلے سے جو لوگ غلام رکھتے تھے ان کی پرورش کا اسی طرح ان کو حکم دیا جس طرح کہ وہ آپ اپنی جان کی پرورش کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کی نسبت سرولیم میور نے مذکورہ بالا فقرہ میں اشارہ کیا ہے مگر اتنی بات اور زیادہ کرنی چاہیے تھی کہ مذہب اسلام نے قمار بازی کو منع کرنے اور ناشائستہ کلمات کے منہ سے نکالنے کی ممانعت سے والدین کے ساتھ محبت اور تعظیم سے پیش آنے کی تاکید سے ایک مناسب اندازہ سے خیرات دینے کی رغبت دلانے سے لوگوں کو ان کی حاجت میں قرض حسنہ دینے سے وعدہ کی وفا کرنے کی تاکید سے جانوروں کے ساتھ رحم اور مہربانی برتنے کے حکم سے انسانوں کے اخلاق اور ان کے حسن معاشرت میں بہت کچھ ترقی دی ہے۔

مشہور اور نہایت لائق اور قابل مورخ گبن اپنی کتاب میں جہاں یہ بحث کرتا ہے کہ حضرت محمدؐ اپنے ملک کی نسبت کیسے تھے اس طرح پر لکھتا ہے کہ ''حضرت محمد ﷺ کی سیرت میں سب سے اخیر جو بات غور کرنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ان کا عظم وشان لوگوں کی بھلائی اور بہودی کے حق میں مفید ہوا یا مضر۔ جو لوگ کہ آنحضرت ﷺ کے سخت دشمن ہیں وہ بھی اور نہایت متعصب عیسائی اور یہودی بھی باوجود پیغمبر برحق نہ ماننے کے اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے کہ آنحضرت ﷺ نے دعوے رسالت ایک نہایت مفید مسئلہ کی تلقین کے لئے اختیار کیا۔ گو وہ یہ کہیں کہ صرف ہمارے ہی مذہب کا مسئلہ اس سے اچھا ہے (گویا وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سوائے ہمارے مذہب کے اور تمام دنیا کے مذہبوں سے مذہب اسلام اچھا ہے) آنحضرت یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب سماویہ قدیمہ کی سچائی اور پاکیزگی اور ان کے بانیوں یعنی اگلے پیغمبروں اور معجزوں اور ایمانداری کو مذہب اسلام کی بنیاد خیال کرتے تھے۔ عرب کے بت خدا کے تخت کے روبرو توڑ دیئے گئے اور انسان کے خون کے کفارہ کو نماز روزہ خیرات سے بدل دیا جو ایک پسندیدہ اور سیدھے سادھے طریقہ کی عبادت ہے (یعنی جو انسان کی قربانی بتوں پر ہوتی تھی اس کو معدوم کیا اور اس کے بعوض نماز و روزہ خیرات کو بطور کفارہ قرار دیا) ان کے عقبیٰ کی جزا اور سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور ہوا پرست قوم کی طبیعت کے نہایت موافق تھیں شاید وہ اپنے ملک کا اخلاقی اور ملکی انتظام خانگی جھگڑوں میں جو بہادری بیہودہ طور سے صرف ہوتی تھی نہایت مستعدی سے ایک غیر ملک کے دشمن کے مقابلہ پر مائل ہوگئی۔''

مسٹر گبن کی یہ رائے بھی کسی قدر حاشیہ لکھنے کے لائق ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مسٹر گبن ایک نہایت غیر متعصب مورخ

ہے اور مسلمانوں کی تاریخ بھی اس نے نہایت سچائی اور دیانت داری سے لکھی ہے مگر بعض مذہبی مسائل جو اس کو تحقیق نہیں ہوئے یا غلط طور سے اس تک پہنچے یا جہاں اصلی مسئلہ اور علماء کی رائے اور اجتہاد میں اس نے تمیز نہیں کی۔ ان مقاموں میں اس نے نسبت آنحضرت ﷺ کے یا مذہب اسلام کے غلط رائے قائم کی ہے اور ہم کو اس نامی مورخ کے نہایت بے تعصب ہونے کی وجہ سے یقین ہے کہ اگر صحیح مسئلہ اس تک پہنچتا تو کبھی وہ رائے قائم نہ کرتا جو اس نے دی۔

انہوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ عقبیٰ کی سزا اور جزا کا بیان غیر ممکن ہے ان دیکھی ان چکھی ان بجھی چیز کیونکر سمجھ میں آ سکتی ہے۔ جس چیز کے لئے لفظ ہی انسان کی زبان میں نہ ہوں وہ کیونکر بیان ہوسکتی ہے کیفیت جو ایک ذاتی وجدانی چیز ہے وہ دوسرے کو کیونکر بتائی جاسکتی ہے یہ تمام امور محالات سے ہیں پس وحی یا الہام ان کو کیوں کر بیان کرسکتا ہے۔ سچا اور صحیح مسلمانی مسئلہ سزا و جزا کا یہ ہے کہ "**لا عین رات ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر**" پس کوئی بیان کرنے والا گو کہ وہ الہام ہی کی زبان ہو جزا کو بجز اس کے کہ نہایت ہی محبوب چیز ہے اور موذی چیزوں پر قیاس ہوسکتا ہے نہ عقبیٰ کی واقعی محبوب وموذی چیز پر اس لئے تمام انبیاء نے دنیا ہی کی محبوب وموذی چیزوں کی تمثیل میں عقبیٰ کی سزو جزا کا بیان کیا ہے۔ موسیٰ یہی فرمایا گئے کہ نیک کام کرو گے تو مینہ برسے گا غلہ پیدا ہوگا وبا نہ ہوگی گناہ کرو گے تو قحط پڑے گا وبا پھیلے گی۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی میں عقبیٰ کا نام ہی نہیں لیا کیونکہ اس زمانہ کے لوگ بجز اس کے اور کسی چیز پر سزا اور جزا کا قیاس کر ہی نہیں سکتے تھے۔

آنحضرت ﷺ نے سزو جزا کا ان دنیاوی تمثیل میں بیان کیا جس پر اس ملک کے لوگ سزا و جزا کے محبوب وموذی ہونے کا قیاس کر سکتے تھے نہ یہ کہ اس سے وہی حقیقت مراد تھی جو ان لفظوں کے لغوی معنی تھے اگر آنحضرت ﷺ یورپ کے کسی ٹھنڈے ملک میں پیدا ہوتے تو ضروری بجائے ٹھنڈی نہروں کے گرم پانی کی نہریں اور بجائے موتی کے محلوں کے آتش خانہ والے محل بیان فرماتے اور نہ اس سے حقیقت مراد ہوتی نہ اس سے بلکہ صرف ایک تمثیل قیاس کرنے کو تھی وہ بھی اسی بات کے قائل ہیں قل اعوذیے ملانے بلکہ کٹ ملا ہمیشہ ان کے برخلاف رہے مگر جو حقیقت ہے وہ کسی کے مخالف یا موافق ہونے سے تبدیل نہیں ہوتی۔

اخلاقی اور ملکی انتظام کی نسبت بھی جو کچھ مسٹر گبن صاحب نے لکھا حاشیہ چڑھانے کے قابل ہے۔ اخلاق کا لفظ جو انہوں نے استعمال کیا وہ اسپریچوئل اور سوشل یعنی روحانی اور تمدنی دونوں برتاؤں کو شامل ہے روحانی برتاؤ کی نیکی تمدنی برتاؤ کی خوبی کو لازم ہے الا تمدنی برتاؤ کو روحانی نیکی یا بدی سے تعلق ہونا کچھ ضرور نہیں ہے۔ آنحضرت ﷺ کا کام صرف اسپریچوئل ور چو یعنی روحانی نیکی کا بتانا تھا اور جہاں تک اس کو تمدن سے تعلق تھا بطور لزوم کے تھا نہ بطور مقصود بالذات کے کیونکہ وہ از خود انسان کی حالت ترقی کے ساتھ ترقی پائی جاتی ہے پس یہ بات آنحضرت ﷺ نے روحانی اخلاق کو کافی ترقی دی کو دمسٹر گبن نے تسلیم کیا ہے۔ باقی رہی تمدنی حالت وہ ان کے اصلی کام کی جس پر وہ کھڑے ہوئے جزو نہ تھی گو اس میں بھی بہت کچھ ترقی ہوئی۔

ملکی انتظام محض ایک دنیاوی کام تھا جہاں تک جان ومال کے امن سے متعلق تھا وہ اس زمانہ کی حالت کے مطابق بطور ایک دنیاوی کام کے نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہنچا تھا اور آئندہ کے لئے وہ یہ انتظام فرما کر کہ "**انتم اعلم بامور دنیاکم**" ان لوگوں کے ہاتھوں چھوڑا تھا جو آئندہ زمانہ میں ہوں یہ ایک نہایت غلطی ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیاوی امور اور انتظام ملکی بھی ایک جزو پیغمبری کا تھا۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب مسمیٰ ''اپالوجی فار دی محمد اینڈ قرآن'' میں یہ رائے لکھی ہے کہ ''اس بات کا خیال کرنا

جیسا کہ بعضوں نے کیا ہے، بہت بڑی غلطی ہے کہ قرآن میں جس عقیدہ کی تلقین کی گئی ہے اس کی اشاعت صرف بزور شمشیر ہوئی تھی کیونکہ جن لوگوں کی طبیعتیں تعصب سے مبرا ہیں وہ سب بلا تامل اس بات کو تسلیم کریں گے کہ حضرت محمد کا دین (جس کے ذریعہ سے انسانوں کے خون یعنی قربانی کے بدلے نماز اور خیرات جاری ہوئی اور جس نے عداوت اور دائمی جھگڑوں کی جگہ فیاضی اور حسن معاشرت کی ایک روح لوگوں میں پھونک دی اور جس کا اسی وجہ سے بہت بڑا اثر شائستگی پر ہوا ہوگا) مشرقی دنیا کے لئے ایک حقیقی برکت تھا اور اس وجہ سے خاص کر اس کو ان خونریز تدبیروں کی حاجت نہ پڑی ہوگی جن کا استعمال بلا استثنا اور بلا امتیاز کے حضرت موسیٰ نے بنی نوع انسان کے خیالات اور مسائل پر مدت دراز تک اثر ڈالنے کو پیدا کیا ہے گستاخانہ پیش آنا اور جاہلانہ مذمت کرنا کیسی لغو اور بے ہودہ بات ہے جب ان معاملات پر خواہ اس مذہب کے بانی کے لحاظ سے خواہ اس مذہب کے عجیب وغریب عروج اور ترقی کے لحاظ سے نظر کی جائے۔ تو بجز اس کے اور کچھ چارہ نہیں ہے کہ اس پر نہایت دل سے توجہ کی جائے۔ اس امر میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا کہ جن لوگوں نے مذہب اسلام اور مذہب عیسائی کی خوبیوں کو بمقابلہ ایک دوسرے کے تحقیق کیا ہے اور ان پر غور کیا ہے ان میں سے بہت ہی کم ایسے ہیں جو اس تحقیقات میں اکثر اوقات تردد اور صرف اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہوں کہ مذہب اسلام کے احکام بہت ہی عمدہ اور مفید مقاصد ہیں بلکہ اس بات کا اعتقاد کرنے پر بھی مجبور ہوئے ہیں کہ آخر کار مذہب اسلام سے انسان کو فائدہ کثیر پیدا ہوگا۔

جان ڈیون پورٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "ہر ایک طرح کی شہادت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن شخصوں نے فلسفہ اور علوم وفنون کو سب سے پہلے زندہ کیا جو قدیمی اور زمانہ حال کے علم ادب کے درمیان میں بطور ایک سلسلہ کے بیان کئے گئے ہیں بلاشبہ وہ ایشیا کے مسلمان اور اندلس کے مور تھے جو خلفائے عباسیہ اور بنی امیہ کے عہد میں وہاں رہتے تھے علم جو ابتداء ایشیا سے یورپ میں آیا تھا اس کا وہاں دوبارہ رواج مذہب اسلام کی دانشمندی سے ہوا۔ یہ بات مشہور معروف ہے کہ اہل عرب میں چھ سو برس کے قریب سے علوم وفنون جاری تھے اور یورپ میں جہالت اور وحشیانہ پن پھیلا ہوا تھا اور علم ادب قریباً نیست ونابود ہو گیا تھا۔ علاوہ اس کے یہ بات بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ تمام علوم طبیعات ہیئت' فلسفہ' ریاضی جو دوسری صدی میں یورپ میں جاری تھے ابتداءً عرب کے علماء سے حاصل ہوئے تھے اور خصوصاً اندلس کے مسلمان یورپ کے فلسفہ کے موجد خیال کئے جاتے ہیں۔"

جان ڈیون یورپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ "یورپ مذہب اسلام کا اور بھی زیادہ ممنون ہے کیونکہ اگر ان جھگڑوں سے جو سلطان صلاح الدین کے وقت میں بیت المقدس کی لڑائیوں میں ہوئے۔ جس کو فریقین جہاد کہتے تھے قطع نظر کی جائے تو بالتخصیص مسلمان کے باقی ماندہ اثروں پر ہمارے ملک یورپ کی آزادیوں کی نہایت بڑی عالیشان عمارت کی بنیاد قائم ہوئی۔ اہل یورپ کو یہ بات بھی یاد دلانی چاہیے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کے پیروؤں کے (جو قدیمی اور زمانہ حال کے علم وادب کے درمیان میں بطور سلسلہ کے ذریعہ ہیں) اس لحاظ سے بھی ممنون ہیں کہ مغربی تاریکی کی مدت دراز میں یونانی حکما کی بہت سی کتابیں انہیں کی کوششوں سے فنون اور علم ریاضی طب وغیرہ کے بعض نہایت بڑے بڑے شعبوں کی اشاعت ہوئیں۔

چیمبرز انسائیکلوپیڈیا میں آرٹیکل لکھنے والے نے مذہب اسلام کی نسبت یہ رائے لکھی ہے کہ "مذہب اسلام کا وہ حصہ بھی جس میں بہت کم تغیر تبدیلی ہوئی ہے اور جس سے اس کے بانی کی طبیعت نہایت صاف صاف معلوم ہوتی ہے اس مذہب کا نہایت کامل اور روشن حصہ ہے۔ استہزا' طمع' اسراف' عیاشی' بے اعتباری' بدگمانی' نہایت قابل ملامت کی گئی ہیں۔ نیک نیتی' فیاضی حیا' تحمل صبر برد

باری کفایت شعاری، راست بازی ادب صلح، سچی محبت اور سب سے پہلے خدا پر ایمان لانا اور اس کی مرضی پر توکل کرنا۔ سچی ایمانداری کارکن اور سچے مسلمان کی نشانی خیال کی گئی ہے۔

اس مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''ہم اس بات پر غور نہیں کر سکتے ہیں کہ اسلام نے تمام انسانوں کی بھلائی کے لئے کیا کیا۔ لیکن اگر نہایت ٹھیک ٹھیک کیا جائے تو یورپ میں علوم وفنون کی ترقی میں اسی کا حصہ تھا۔ مسلمان علی العموم نویں صدی سے تیرھویں صدی تک وحشی یورپ کے لئے روشن ضمیر معلم کہے جاسکتے ہیں۔ خاندان عباسیہ کے خلفاء کے نہایت عمدہ زمانہ سے یونانی خیالات اور یونانی تہذیب کا از سر نو سر سبز ہونا شمار کیا جاسکتا ہے قدیم علم ادب ہمیشہ کے واسطے بغیر کسی علاج کے مفقود ہو جاتا اگر مسلمانوں کے مدرسوں میں اس کو پناہ نہ ملتی۔ عربی خلیفہ قدرتی چیزوں کی تواریخ، جغرافیہ، علم تاریخ صرف ونحو، علم کلام اور فن شاعری کی (جس کی تعلیم پرانے استاد دیتے تھے) بہت سی کتابیں پیدا ہوگئیں۔ جن میں سے اکثر اس وقت جاری رہیں گی اور تعلیم بھی دی جائے گی جب تک نسلیں تعلیم ہونے کے واسطے پیدا ہوتی رہیں گی۔

ایک جواب مضمون لکھنے والے نے جس نے یہ مضمون اختیار کیا تھا کہ ''اسلام ایک ملکی انتظام ہے جو مشرق ومغرب میں جاری ہے'' اسلام کی نسبت یہ لکھا ہے کہ ''اسلام نے بچہ کشی کا انسداد کر دیا جو اس زمانہ میں قرب وجوار کے ملکوں میں جاری تھی۔ گو عیسائی مذہب نے بھی اس کو روکا تھا مگر اسلام کے برابر اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اسلام نے غلامی کو موقوف کر دیا جو اس ملک کی پرانی جاہلیت کی رسم تھی۔ اسلام نے ملکی حقوق کو برابر کر دیا اور صرف انہی لوگوں کے حق میں انصاف نہیں کیا جو اس مذہب کے معتقد تھے بلکہ ان شخصوں کے ساتھ بھی برابر انصاف کیا جن کو اس کے ہتھیاروں نے فتح کیا تھا۔ اسلام نے اس محصول کو جو سلطنت کو دیا جاتا تھا گھٹا کر صرف دسواں حصہ کر دیا۔ اسلام نے تجارت کو تمام محصولات اور مزاحمتوں سے آزاد کر دیا اسلام نے مذہب کے معتقدوں کو اس بات سے کہ اپنے مذہبی سرگروہ کو مذہبی کام کو جبراً روپیہ دیں اور تمام لوگوں کو اس بات سے کہ غالب مذہب کو ہر ایک قسم کا مذہبی چندہ دیں بالکل بری کر دیا۔ اسلام نے فرقہ فتح مند کے تمام حقوق مفتوحہ لوگوں میں سے ان شخصوں کو دیئے جو اس مذہب کے پابند تھے۔ ان کو ہر ایک قسم کی پناہ دی۔ اسلام نے مال کی حفاظت کی سود لینے کو اور خون کا بدلہ بغیر حکم عدالت کے لینے کو موقوف کیا۔ صفائی اور پرہیز گاری کی حفاظت کی اور ان باتوں کی صرف ہدایت ہی نہیں بلکہ ان کو پیدا کیا اور قائم کر دیا۔ حرام کاری کو موقوف کر دیا۔ غریبوں کو خیرات دینے اور ہر ایک شخص کی تعظیم کرنے کی ہدایت کی۔

وہی مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ ''جو نتیجے اسلام سے ہوئے وہ اس قدر وسیع اور دقیق اور مستحکم ہیں کہ ان کی تکمیل کر لینا تو درکنار ہم یقین نہیں کر سکتے کہ وہ انسان کے خیال میں بھی آسکیں۔ اسی سبب سے بعوض اس کے کہ اس کی نسبت اس طرح پر دلیلیں کی جائیں جس طرح کہ سولن کے قانون یا نپولین کے فتوحات کے نتیجوں کے اندازہ کرنے میں کی جاتی ہیں۔ یا تو ان کی نسبت یہ کہا جائے کہ اتفاقیہ ہوگئے ہیں یا مجبوری ربانی مرضی کی طرف منسوب کیا جائے۔ باایں ہمہ یہ نظم ایک شخص واحد نے کیا تھا جس نے اپنے ملک کے تمام باشندوں میں اپنی روح پھونک دی اور تمام قوم کے دل پر نہایت تعظیم وتکریم کا خیال جو کسی انسان کے واسطے کبھی ظاہر نہیں کیا گیا نقش کر دیا گیا جو سلسلہ قوانین واخلاق کا انہوں نے بنایا وہ اعلیٰ درجہ کی ترقی سے بھی اسی طرح موافق تھا جیسا کہ ادنیٰ ترین لوگوں سے اور اس سلسلہ نے ایک قوم سے دوسری قوم میں گزر کر ہر ایک قوم کو جس نے اس کو قبول کیا ان قوموں اور سلطنتوں سے فائق کر دیا جن سے ان کا میل ہوا۔

تھامس کارلیل نے جو اس زمانہ کی دنیا میں نہایت نامور عالم ہیں اپنی کتاب میں جس کا نام ''لیکچرز آن ہیروز'' ہے اس مضمون کی نسبت جس پر ہم بحث کر رہے ہیں یہ رائے لکھی ہے کہ ''اسلام کا عرب کی قوم کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔عرب کا ملک پہلے ہی پہل اس کے ذریعہ سے زندہ ہوا۔اہل عرب گلہ بانوں کی ایک غریب قوم تھی اور جب سے دنیا بنی تھی عرب کے چٹیل میدانوں میں پھرا کرتی تھی اور کسی شخص کو ان کا کچھ خیال بھی نہیں تھا۔اس قوم میں ایک الوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے ساتھ جس پر وہ یقین کرتے تھے بھیجا گیا۔اب دیکھو کہ جس چیز سے کوئی واقف ہی نہ تھا وہ تمام دنیا میں شہور و معروف ہوگئی اور چھوٹی چیز نہایت ہی بڑی چیز بن گئی اس کے بعد ایک صدی کے اندر عرب کے ایک طرف غرناطہ اور ایک طرف دہلی ہوگئی۔عرب کی بہادری اور عظمت کی تجلی اور عقل کی روشنی زمانہائے دراز تک دنیا کے ایک بڑے حصہ پر چمکتی رہی۔اعتقاد ایک بڑی چیز اور جان ڈالنے والا ہے جس وقت کوئی قوم کسی بات پر اعتقاد لاتی ہے کہ اس کے خیالات بار آور اور روح کو عظمت دینے والے اور رفیع الشان ہو جاتے ہیں۔ یہی عرب اور یہی حضرت محمدؐ اور یہی ایک صدی کا زمانہ گویا ایک چنگاری ایسے ملک میں پڑی جو ظلمت میں کس مپرس ایک ریگستان تھا۔مگر دیکھو کہ ریگستان زور وشور سے اڑ جانے بارود نے نیلے آسمان تک اٹھتے ہوئے شعلوں سے دہلی سے غرناطہ تک روشن کر دیا۔ یہ رائیں ہیں عیسائی مصنفوں کی جو انہوں نے اسلام کی نسبت لکھی ہیں۔اب ہم اپنے خطبہ کے اس حصہ کو انہی رایوں پر ختم کرتے ہیں اور دوسرے حصہ پر متوجہ ہوتے ہیں۔

دوسرے حصہ میں عیسائی مصنفوں کی اس رائے کی کہ اسلام انسان کی حالت معاشرت کے حق میں مضر ہوا ہے تردید کی جاتی ہے۔

آنریبل سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں فرماتے ہیں کہ ''اگر چھوٹی چھوٹی باتوں سے قطع نظر کی جائے تو بھی مذہب اسلام سے تین بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوئی ہیں۔اول یہ کہ اس میں ایک سے زیادہ جوروؤں کا ہونا طلاق دے دینا اور غلام بنالینا مستحکم کیا گیا ہے اور رائج ہو رہا ہے اور یہ باتیں علم اخلاق کی بیخ کنی کرتی ہیں۔عام زندگی کو آلودہ اور ناپاک کرتی ہے اور حسن معاشرت اور انسان کے گروہوں کی حالت کو درہم برہم کر دیتی ہیں۔دوم یہ کہ مذہبی آزادی یعنی یہ بات کہ لوگ جونسا مذہب چاہیں اختیار کریں اور اس کے لوازم مذہبی آزادی سے ادا کریں بالکل روک دی گئی ہے بلکہ معدوم کر دی گئی ہے۔تحمل کا تو نام ونشان بھی نہیں دکھائی دیتا۔سوم یہ کہ مذہب عیسائی کی ترقی میں اس مذہب کے قبول کرنے میں ایک مزاحمت قائم کی گئی ہے۔'' پس اب ہم اپنے اس خطبہ میں ان تینوں خرابیوں میں سے جن کا ذکر سر ولیم نے کیا ہے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ غور کریں گے۔

اس بات کا خیال کرنا ایک بڑی غلطی ہے کہ مذہب اسلام میں ایک سے زیادہ بیویاں کرنی اسلام لانے والوں پر لازمی قرار دی گئی ہیں یا کچھ زیادہ ثواب کی بات ٹھہرائی ہے۔بلکہ برخلاف اس کے عموماً ایک سے زیادہ جورواں کرنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔صرف ان لوگوں کو اجازت دی ہے جن کی وجوہات طبیعی سے ایسا کرنے کی ضرورت ہو لیکن اگر یہ عذر نہ ہو تو ایک سے زیادہ جورواں کرنی ان نیکیوں اور اخلاق کے بالکل برخلاف ہے جن کی ہدایت اسلام نے فرمائی ہے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ جو مخالفت عیسائی مصنفوں اور مسلمانوں کے طور وطریق دستورات وخیالات میں ہے وہ اس امر کا مانع قوی ہے کہ اس معاملہ میں سنجیدگی اور نیک نیتی اور صفائی قلب سے غور کی کیا جائے۔مثلاً کثرت ازدواج کے لفظ سے بھی عیسائی مصنفوں کے دل میں ایسے خیالات گزرتے ہیں کہ وہ اس امر میں ہر ایک بات کی نسبت پہلے ہی سے مصمم ارادہ کر لیتے ہیں کہ اس

میں عیب نکالیں اور اس امر پر لحاظ نہیں کرتے کہ ملک کی آب وہوا اور مرد وعورت کی تعداد اور مختلف طبعی وجوہات اور معاشرت کے لحاظ سے کس حالت میں اور کس حد تک جائز ہوسکتی ہے۔

ہم اس معاملہ کی نسبت تین امر یعنی قانون قدرت اور باہمی معاشرت اور مذہب کے لحاظ سے بحث کریں گے۔ چنانچہ پہلے امر پر غور کرنے کے لئے ہم اس بات کا دریافت کرنا (بشرطیکہ ممکن ہو) ضروری سمجھتے ہیں کہ اس امر میں تمام ذی روح مخلوقات کے پیدا کرنے والے کی مرضی اور ارادہ کیا تھا یعنی اس نے انسان کثیر الازواج ذی روح بنایا ہے یا نہیں۔ خالق کائنات کا ارادہ جو کچھ کہ ہو صاف صاف بلا کسی حجت وتکرار کے قدرت کے تمام کاموں سے ظاہر ہوتا ہے کیونکہ یہ امر صریح ناممکن ہے کہ اس کی مرضی ان چیزوں کے برخلاف ہو جو اس کی مرضی سے پیدا ہوئی ہیں۔

پس ہم قانون قدرت کی بے خطا نشانیوں سے پاتے ہیں کہ جن ذی روح کی نسبت ان کے خالق کا یہ منشا تھا کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے جن میں سے ایک نر اور ایک مادہ پیدا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے جن ذی روح کی متعدد مائیں ہونی مقصود ہیں ان کے ایک سے زیادہ بچے ہوتے ہیں اور اس بات کا کچھ لحاظ نہیں ہوتا کہ نر و مادہ کی تعداد میں باہم ایک ہی نسبت ہو اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جاندار زمین پر رہنے والے اور چلنے والے ہیں وہ اکثر بلکہ قریبا کل کے کل اسی قسم کے ہیں۔ پس اس قانون قدرت کے بموجب انسان بھی اسی دوسری قسم میں داخل ہے مگر چونکہ رتبہ میں بوجہ اس بیش بہا و نادر و عجیب قوت کے جس کو عقل یا نطق بمعنی مدرک کلیات وجزئیات کہتے ہیں اور اس کے خالق نے اس میں ودیعت کی ہے اور تمام مخلوقات سے اشرف ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ جو قوتیں اور حقوق مثل اور ذی روحوں کے جو اس کے گرد پیش رہتے ہیں قدرت نے اس کو عطا کئے ہیں ان کو احتیاط سے اور موقع بموقع بلحاظ امورات طبعی اور حسن معاشرت اور انتظام خانہ داری یا نظم ملکی وقوانین حفظان صحت اور ملک کی تاثیرات آب وہوا کے کام میں لائے ورنہ اس میں اور دیگر حیوانات میں جو اس کے آس پر پھرتے ہیں کچھ فرق نہیں ہے اور ایک بکری یا مرغی سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا ہے۔ پس جیسے کہ کثرت ازدواج اکثر حالتوں میں قابل نفرت ہے ویسے ہی قطعی التزام ایک سے زیادہ ہونے کا خلاف فطرت ہے۔

دوسرے امر کی نسبت یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ انسان اپنی سرشت سے مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ اسی بات کو توریت میں یوں بیان کیا ہے کہ جب کہ خدا تعالیٰ کو یہ خیال آیا کہ انسان کا اکیلا ہونا انسان کے حق میں اچھا نہیں ہے تو اس نے اس کے واسطے ایک ساتھی پیدا کیا اور وہ عورت ہے جو اس واسطے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کی زندگی کے تفکرات وترددات' لطف وفرحت رنج وراحت میں شریک ہو۔ اپنی مجالست سے اس کی خوشی کو بڑھائے اور اپنی محبت اور الفت کی بھری ہوئی ہمدردی سے اس کی تکلیف کو کم کرے اور سب سے اخیر غرض جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے یہ ہے کہ انسان کے ساتھ شریک ہو کر خدا کے اس بڑے حکم کی تعمیل میں کہ ''بڑھو اور پھلو اور زمین کو آباد کرو'' مدد دے۔ مگر جب کبھی یہ مددگار کسی سبب سے اپنے ان قدرتی فرضوں کے ادا کرنے میں قاصر ہو تو اس دانشمند حکیم خالق زن ومرد نے اس نقصان کے رفع کرنے کی بالیقین کوئی تدبیر رکھی ہوگی اور وہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ یا ایسی حالتوں میں ایک سے زیادہ مگر کسی حد خاص تک ایک ہی وقت میں جورواں رکھنے کی اجازت ہو خواہ یہ ہو کہ پہلی زوجہ کے طلاق دینے کے بعد دوسری جورو کرے۔ پچھلا حق عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے چنانچہ مذہب اسلام کی رو سے اس کو حاصل ہے سیاست مدنی کے لحاظ سے صرف اتنا فرق ہے کہ مرد جب چاہے اس علاج کو کرسکتا ہے لیکن عورت کو اول جج (یعنی قاضی) کی اجازت حاصل

کرنی چاہیے۔ اگر اس تدارک کی انسان کو اجازت نہ ہوتی جس کی ضرورت ہم نے صاف صاف لفظوں میں ثابت کی ہے تو اس کے سبب سے حسن معاشرت میں نہایت نقصان پہنچتا کیونکہ ایسی سخت قطعی قید سے نہایت قبیح اور بدترین برائیوں اور گناہوں کی کی طرف انسان کو مائل ہونا پڑتا۔ اگر چہ اس نقصان کا تعلیم وتربیت کی ترقی سے کم ہونا ممکن ہے لیکن مٹنا محالات سے ہے پس جہاں اس کی ضرورت ہے وہاں اس کے عمل میں نہ لانے سے وہی تمام نقصان پیدا ہوتے ہیں جو حسن معاشرت کے لئے سم قاتل ہیں۔

مسٹر ہگنز صاحب نے جو اپنی رائے نسبت تعداد ازواج لکھی ہے اور جان ڈیون پورٹ نے جو مانٹسکیو کی رائے اس باب میں نقل کی ہے اس کا اس مقام پر بیان کرنا بے موقع نہیں ہے۔ اگر چہ یہ بات افسوس کی ہے کہ ان دونوں صاحبان نے تعداد ازواج پر صرف ایک نظر سے نگاہ کی ہے یعنی امورات طبعی کے لحاظ سے مگر مذہب اسلام میں یہ خاص اجازت حالات خاص میں صرف امورات طبعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی ہے بلکہ جیسا ہم نے اوپر بیان کیا۔ اس غرض سے دی گئی ہے کہ تزویج کی تلخیوں کے واسطے اور مقاصد تزوج کے فوت ہو جانے کی حالت میں ایک تدارک حاصل ہو جو عین مرضی آدم وحوا کے پیدا کرنیوالے کی اس کی قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ نے مانٹسکیو کی یہ رائے نقل کی ہے کہ ''گرم ملک میں عورتیں آٹھ نو یا دس برس کی عمر میں نکاح کے لائق ہو جاتی ہیں۔ پس ان ملکوں میں بچپن اور نکاح کے لائق جوانی گویا ساتھ ہوتی ہے۔ بیس برس کی عمر میں وہ بڑھیا ہو جاتی ہیں۔ پس اس لئے یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ان ملکوں میں جبکہ کوئی قانون مانع نہ ہو انسان جورو کو طلاق دے کر دوسری جورو کر لے اور تعداد ازواج کا قاعدہ جاری کیا جائے۔

مسٹر ہگنز صاحب لکھتے ہیں کہ ''علم قوائے انسانی اور علم طبیعات کے ماہرین نے بعض وجوہات ایسے دریافت کئے ہیں جو کثرت ازدواج کے واسطے بطور ایک عذر کے متوصر ہو سکتے ہیں اور ہم شمالی ملکوں کے سدخون والے مینڈک کے سے مزاج کے جانوروں سے متعلق نہیں ہو سکتے مگر بنی اسمٰعیل سے جو گرم ریگستان کے رہنے والے ہیں متعلق ہو سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہ بیانکرنے تھین کہ سر ڈبلیو اوسلی صاحب کے مشرقی مجموعہ صفحہ ۱۰۸ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے دونوں گروہ یعنی مرد وعورت میں ایک ایسا اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب وہوا میں نہیں ہے جہاں دونوں برابر برابر اور بتدریج عالم ضعیفی میں پہنچتے ہیں مگر ایشیا میں صرف مرد ہی کو یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ ضعیفی بھی قوی اور طاقتور رہتا ہے اگر یہ بات سچ ہے تو بانی مذہب اسلام کے لئے اس بات کی کہ انہوں نے متعدد جوروؤں کی اجازت دی ایک وجہ بڑی تھی اور یہ کافی سبب اس بات کا ہے کہ حضرت عیسٰی نے اس مضمون کی نسبت اپنی کوئی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کو ملکوں کی گورنمنٹوں کی آئین پر چھوڑ دیا کیونکہ جو بات ایشیا کے واسطے مناسب ہوگی وہ یورپ کے واسطے نامناسب ہوگی۔''

اب ہم اس مقام پر ان بد عادتوں اور خراب اور اخلاق کا جو آنحضرت ﷺ سے پہلے ایام جاہلیت میں عموماً جاری تھے اس ناطرف دارانہ بحث میں ذکر نہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ ملک ایران اپنے اخلاق کی خرابی ہیں سب سے بڑھا ہوا تھا وہاں قوانین طلاق بلائے طاق رکھ دیئے تھے اور رشتہ داری کا گو وہ کیسی ہی قریب ہو یا بعید مطلق پاس لحاظ نہیں تھا۔ بیٹے کو اس کی ماں ایسی ہی مباح تھی جیسے باپ کو اس کی بیٹی اور بھائی کو اس کی بہن غرض کہ اس معاملہ میں فی الواقع ایک جانور کے گلہ سے مشابہت رکھتے تھے جو کسی قسم کے قانون کے پابند نہیں ہوتے۔ ایران کے گوشہ شمال ومغرب میں یہودی بکثرت آباد تھے۔ ان کے ہاں اکثر ازدواج کی

رسم بلا قید اور حد کے بے روک ٹوک کے جاری تھی اور زمانہ عرب کے جاہلیت کے عرب کے حالات کو بہ نظر غور دیکھنے سے جہاں یہودیوں اور ایرانیوں کے دستورات خلط ملط ہو گئے تھے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں یہ دونوں رسمیں یکساں جاری تھیں۔تعدداز دواج کی کچھ انتہا نہ تھی۔لوگ جس عورت کو چاہتے تھے پسند کرتے تھے۔اپنی پسند میں کسی قسم کے قانون کے پابند نہ تھے۔تمام عورتیں بغیر کسی امتیاز ورتبہ یا عمر یا رشتہ داری کے مردوں کی وحشیانہ خواہشوں کے پورا کرنے کا کام دیتی تھیں۔عورتوں کی نسبت بدنیتی کے وحشیانہ خیالات اوران کے ساتھ وحشیانہ حرکات کا تقاضا صرف بے عیب ہی نہیں گنا جاتا تھا بلکہ شیخی اور عالی ہمتی اور بڑی بہادری کا کام سمجھا جاتا تھا۔اس زمانہ کے عیسائی مذہب پر (اگر وہ مذہب عیسوی کہا جاسکے) جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اس کے معتقدوں کو ایک ایسے طریقہ کا پیرو پاتے ہیں جو اوپر کے دستوروں کے بالکل برخلاف ہے یعنی ایک بھی جورو کرنی کچھ نیکی نہیں گنی جاتی تھی بلکہ رہبانیت و تجرد محض کی عام ہدایت تھی اور سرد عورت دونوں کے لئے وہی نیکی گنی جاتی تھی ایسے زمانہ میں جس میں عقل کی اور دل کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور رسم ورواج اور اخلاق اور طرز معاشرت اس درجہ خراب ہوگیا تھا۔بانی اسلام نے نہایت خوبی اور دانشمندی سے ایک ایسا عمدہ قانون بنایا جو بلحاظ اپنی اصلیت کے نہایت کامل اور عقل کامل کے بالکل مطابق اور انسان کی تندرستی اور بہبودی اور حسن معاشرت کی ترقی کا نہایت عمدہ ذریعہ اور زن و سرد کی حالت زوجیت کے حق میں اور دونوں کے لئے اس کے نتیجوں کو دور کرنے میں نہایت ہی مفید ہے۔

تیسرے جب کہ ہم اس معاملہ پر بلحاظ مذہب کے بحث کرنا چاہتے ہیں تو ہم پہلے یہ دیکھا چاہتے ہیں کہ دو اور الہامی مذہبوں نے یعنی یہودی مذہب نے اور خصوصاً عیسائی مذہب نے جس کے پیرو مذہب اسلام کے اس مسئلہ پر نہایت طعن کرتے ہیں اس باب میں کیا کیا ہے اور اس کے بعد ہم دکھائیں گے کہ مذہب اسلام نے یہ کیا اور پھر اہل انصاف سے پوچھیں گے کہ مذہب عیسوی نے تعدداز دواج کو رد کیا ہے یا مذہب اسلام نے۔

مذہب یہود تو ایک مخزن ہے جس میں بکثرت از دواج اور بلا تعین حد موجود ہے عیسائی مذہب بھی تعدداز دواج کی کہیں ممانعت نہیں کی چنانچہ ہم اپنے اس قول کی تائید میں چند مشہور و معروف عیسائی عالموں کی رائیں نقل کرتے ہیں جن سے تعدداز دواج کی تائید ہوتی ہے۔مسٹر ہکنز بیان کرتے ہے کہ ''حضرت محمد نے اس نہایت قدیم موسوی مذہب کے مقنن کی پیروی کر کے اپنی قوم کو جو اسماعیل کی اولاد ہے۔(جو مسلمانوں کے باپ کا بیٹا تھا) متعدد بیویوں کی اجازت دی اس واسطے عیسائی ہمیشہ اس پر عیب نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے پیرووں کی کمینہ خواہش کو پورا کیا لیکن میں نہیں جانتا کہ متعدد بیویوں کی اجازت کی نسبت ایسا سخت طعن کیوں کیا جاتا ہے حضرت سلیمان کی نظیر اور حضرت داؤد کی نظیر پر (جو خدا کی دلی مرضی کے مطابق چلتے تھے اور جن کو خدا نے خاص اپنی شریعت کے احکام کی تعمیل کے لئے بنایا تھا) یہ امر چنداں اعتراض کے لائق نہیں ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ عیسیٰ مسیح نے بھی ان بیس انجیلوں میں سے جن کو ان کے معتقدوں کے گروہ میں سے کسی نہ کسی نے ان کے احکام کے قلمبند کرنے کے واسطے تحریر کیا تھا کسی انجیل میں اس کی ممانعت نہیں ہے۔

مسٹر ڈیون پورٹ اپنی کتاب بائبل کی بہت سی آیتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''ان آیتوں سے پایا جاتا ہے کہ تعدداز دواج صرف پسندیدہ ہی نہیں ہے کہ خاص خدا نے اس میں برکت دی ہے۔'' نہایت مشہور و معروف عالم جان ملٹن تعدداز دواج کا ایک مشہور حامی ہے جس نے اس امر کی تائید میں بائبل میں سے بہت سے آیتیں نقل کرنے کے بعد یہ تحریر کیا ہے کہ ''علاوہ اس کے خدا

نے ایک تمثیلی صورت (حزقیل) میں مسماتان اہولا ہولیا سے اپنا نکاح کرنا ظاہر کیا ہے اور یہ ایک ایسا بیان ہے کہ اس کو خداوند تعالیٰ بالتخصیص اس طوالت کے ساتھ ایک تمثیل میں بھی ہرگز نہ اختیار کرتا اور نہ درحقیقت ایسی بات کا مرتکب ہوتا اگر وہ رسم جس کی دلالت اس سے ہوتی ہے فی نفسہٖ معیوب یا مذموم ہوتی۔ پس جس رسم کا امتناع انجیل میں بھی کسی کو نہیں ہے وہ کیونکر معیوب یا مذموم خیال کی جاسکتی ہے کیونکہ انجیل میں ان ملکی آئین میں سے کوئی بھی منسوخ نہیں کیا گیا ہے جو انجیل سے پیشتر جاری تھے۔

جان ملٹن یہ بھی کہتے ہیں کہ ''میں عبرانیوں کے خط کے باب ۱۳ درس ۴ سے اس طرز سے جواز تعدد ازدواج پر استدلال کرتا ہوں کہ تعدد ازدواج کی رسم یا تو نکاح جائز ہے یا فجور ہے یا زنا ہے۔ پس اس مقدس رسول نے کوئی چوتھی صورت تسلیم نہیں کی پس میں یقین کرتا ہوں کہ ان بہت سے بزرگوں کی تعظیم وتوقیر کے لحاظ سے جو کثیر الازواج تھے ہر ایک شخص اس کو فجور یا زنا خیال کرنے سے باز رہے گا کیونکہ خدا حرامکاروں اور زانیوں کو سزا دے گا حالانکہ ان بزرگوں پر خدا کی خاص نظر تھی جیسا کہ خود اس نے فرمایا ہے پس اگر متعدد نکاحوں کا کرنا ٹھیک نکاح ہو تو وہی جائز ہے اسی حواری کا قول ہے کہ ''سب میں نکاح کرنا بھلا ہے اور بستر ناپاک نہیں''۔

یہ حال تو تعدد ازدواج کی نسبت مذہب موسوی اور عیسوی میں تھا اب ہم کہتے ہیں کہ مذہب اسلام نے تمام مذہبوں سے بڑھ کر تعدد ازدواج کو نہایت خوبی سے روکا ہے اور صرف ایک ہی بیوی کو پسند کیا ہے تعدد کو صرف ایک نہایت محدود خاص حالت جائز رکھا ہے۔ ہم کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ سچا مسئلہ سچے مذہب کا جو اس کی مرضی کے موافق ہو جس نے مرد وعورت کو جوڑا پیدا کیا ضرور ایسا ہوگا جو قانون قدرت کے تو برخلاف نہ ہو اور حسن معاشرت میں کوئی نقصان نہ پیدا کرے اور وہ یہی ہوسکتا ہے کہ عموماً کثرت ازواج کی ممانعت اور صورت ہائے خاص اور حالات مستثنیٰ میں اجازت ہو اور ٹھیٹ یہی مسئلہ ٹھیٹ اسلام کا ہے قرآن نے اس نازک معاملہ اور دقیق اور پرپیچ مطلب کو نہایت فصیح وبلیغ دولفظوں میں بیان کردیا ہے جہاں فرمایا ہے کہ **''فان خفتم ان لا تعدلو فواحدة''** یعنی اگر تم کو خوف ہو کہ متعدد جوروں میں عدل نہ کرسکو گے تو صرف ایک ہی جورو رکھنی چاہیے ان لفظوں پر کافی غور نہ کیا جائے اور صف اوپرے اوپرے معنی لئے جائیں جیسے کہ اکثر علماء اور فقہاء نے لئے ہیں تو بھی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ لوگوں کو بے اعتدالی سے باز رکھنے کی غرض سے (جو ہمیشہ بدتر اور بعض دفعہ خطرناک ہوتی ہے) اور اس بات کا یقین ہونے کی نظر سے کہ جس شخص نے ایک سے زیادہ جورواں کیں وہ ایک واقعی ضرورت کے سبب سے مجبور تھا بہت سخت قیدیں اور شرطیں لگائی گئی ہیں مثلاً یہ کہ سب کو برابر حقوق دینے اور سب کے ساتھ برابر محبت رکھنی تاکہ عدل کے معنی متحقق ہوں۔ پس جو لوگ سچے دیندار اور درحقیقت مذہب کے تابع ہیں وہ از خود بجز ضرورت مجوزہ کے ایک سے زیادہ جورواں کرنے سے باز رہتے ہیں کیونکہ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ اس اجازت سے بغیر اس کی شرائط کے پورا کئے جن کا پورا کرنا نہایت مشکل ہے فائدہ اٹھانا اپنے مذہبی فرائض کو ٹھیک ادا کرنا نہیں ہے۔

لیکن اگر ان مختصر لفظوں پر بتعمق نظر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شارع نے ایک سے زیادہ جورو کرنے کی اجازت کو نہایت محدود اور خاص حالت میں مخصوص کردیا ہے کیونکہ اس نے فرمایا ہے کہ اگر تم کو خوف ہے کہ عدل نہ کرسکو گے تو صرف ایک ہی ہونی چاہیے لفظ خوف عدم ایک ایسا لفظ ہے کہ جب تک محل عدل ساقط نہ ہو خوف عدم زائل نہیں ہوسکتا گو اس وقت ہم کیسا ہی سچا ارادہ کرلیں کہ ہم دونوں جوروں میں عدل کریں گے۔ (جو درحقیقت بحالت قیام محل عدل ناممکن ہے) تب بھی خوف عدم عدل اگر محل عدل قائم ہے زائل نہیں ہوتا۔

دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کی بخوبی تفصیل ہے جہاں خدا نے ان لوگوں کی نسبت جن کے پاس متعدد جوروان تھیں صاف صاف فرمادیا ہے کہ

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولوحرصتم فلا تمیلوا کلالمیل فتذروھا کاالمعلقوان تصلحوا وتتقوا فان اللہ کان غفورا رحیما وان یتفرق یغن اللہ کلا من سعۃ وکان اللہ واسعا حکیما. (سورۃ نساء)

''تم ہرگز متعدد جوروؤں میں عدل نہ کرسکو گے گو تم عدل کرنے کی کتنی ہی حرص کرو پس مت جھک پڑو اندھادھندی سے جھک پڑنا تاکہ چھوڑ دو ان کو ادھر میں لٹکتی ہوئی کہ نہ وہ بیوہ یا مطلقہ ہے کہ دوسرا شوہر کرسکے اور نہ سہاگن ہے کہ خصم کے ساتھ خوشی سے زندگی بسر کرے پھر اگر تم صلح کرلو اور پرہیزگاری کرو تو بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے اور اگر تم دونوں جدا ہوجاؤ تو اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنی وسعت رزق سے بے پرواہ کرے گا۔'' اور اللہ بڑی وسعت والا حکیم ہے۔

اس آیت سے صاف ثابت ہوگیا کہ عدل غیر ممکن ہے اور اس لئے خوف عدم عدل کبھی ساقط نہیں ہوسکتا جب تک کہ محل عدل باقی ہے اور اس آیت میں طلاق کو مسقط محل عدل بتایا ہے اگرچہ اور بھی چند امور مثلاً امراض یا نقصان خلقت مسقط محل عدل ہوسکتے ہیں۔ پس اجازت تعدد ازواج کی عدم وجود محل عدم میں منحصر ہوگی اور عدم وجود محل عدل مستلزم عدم حسن مباشرت ہے پس کس دانائی اور احتیاط اور خوبی اور بے انتہا عمدگی سے شارع نے قانون قدرت اور حسن معاشرت دونوں کو قائم رکھ کر اس باب میں حکم دیا ہے اور ہر غیر متعصب شخص کا دل قبول کرے گا کہ بے شک یہ حکم اسی شخص کا ہے جس نے مرد وزن کا جوڑا پیدا کیا ہے۔

ہاں بلاشبہ اس اجازت سے اوباش اور شہوت پرست آدمیوں کو جن کی زندگی کا عین منشا ٹٹی کی اوجھل شکار کھیلنا ہے ایک حیلہ ہاتھ آگیا ہے مگر اس عمدہ اور مفید قاعدہ کے بے جا عمل درآمد کرنے سے وہ لوگ اس خدا کے سامنے جواب دے ہوں گے جو انسانوں کے دلوں کا محرم راز ہے اور وہ یقیناً ان کو اس قسم کی سزا دے گا جو ان کے گناہ کے لحاظ سے واجب ہوگی۔

ان تمام باتوں کے سمجھنے کے بعد ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے یقین کریں گے کہ یہ جو تعدد ازدواج اس زمانہ میں رائج ہے کہ جہاں ذرا دولت ہوئی اور دو دو اور تین تین اور چار چار جوروان کرنے لگے اور ایک بازار کی عورت کو داؤں پر چڑھایا اور نکاح کر مارا۔ جہاں مقدس مولوی ہوئے اللہ میاں کے سانڈ بنے اس مریدنی کو لے ڈالا وہاں وعظ کہنے گئے اور سنت نکاح ثانی کو جاری کیا۔ قرآن پڑھاتے پڑھاتے دوسرا سبق خطبۃ النکاح کا پڑھانے لگے اور ہمارے دوسرے بھائیوں نے ایک حیلہ متعہ کا جو جاہلیت میں تھا اسلام میں پیدا کرکے عورتوں کو کھنگالنا شروع کردیا۔ ان سب باتوں کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ یہ سب ایک قسم کی اوباشی کے ڈھنگ ہیں جن سے اسلام نفرت کرتا ہے اور وہ سب ہوا پرست اوباش ہیں جن سے اسلام کا نام بدنام ہوتا ہے پس ایسے شخصوں کے افعال پر اسلام کی خوبی وحقیقت سے چشم پوشی کرنا چگادڑوں کے لئے آفتاب کا سیاہ کرنا ہے۔

اب طلاق کی نسبت ہم کو گفتگو کرنی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس طرح ہم نے تعدد ازواج کی نسبت تین طرح پر یعنی قانون قدرت، حسن معاشرت اور مذہب کی رو سے بحث کی ہے اس طرح پر بحث نہیں ہوسکتی اور اس لئے ہم اس مسئلہ پر صرف بلحاظ حسن معاشرت اور مذہب کے بحث کریں گے۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ تمام قدیم وجدید قوموں ومذہبوں میں نکاح کو عام رواج ہے اور وہ علی العموم انسان کی ذاتی وتمدنی

بہبودی کی بنیاد ہے تو جو چیز اس کو معدوم کرنے والی ہے یعنی طلاق وہ نہایت ہی بد چیز فوائد ذاتی وتمدنی کو برباد کرنے والی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ روم کے گرجانے بہ نظر اس کی حفاظت کے نکاح کو اپنے ساتھ پاک رسموں میں قرار دے کر اس کو متبرک ٹھہرایا ہے اور انگلستان کے پروٹسٹنٹوں نے طلاق کا حکم صرف ایک حالت میں جائز رکھا ہے جب کہ ہاؤس آف لارڈز سے زر کثیر صرف کرنے کے بعد حاصل ہو۔ یہ انتظام ۱۸۵۶ء تک قائم تھا۔ یعنی اس وقت تک جب کہ طلاق کے تمام مقدمات کے سننے اور جیوری کی رائے سے اس کی نسبت تجویز ہونے کے لئے ایک نئی عدالت قائم کی گئی۔

عموماً یہ بات تسلیم کرنے کے قابل ہے کہ سب سے بڑا دشمن حسن معاشرت وتمدن کا طلاق ہے اس کے سبب سے نکاح کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور مرد کی محبت کا عورت کے ساتھ اور عورت کی وفاداری کا مرد کے ساتھ اعتبار نہیں رہتا۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اگر کسی سبب وحالت سے ایسی خرابیاں مرد وعورت میں پیدا ہوجائیں جو کسی طرح اصلاح کے قابل نہ ہوں تو ان کا بھی کچھ علاج ہونا چاہیے اور وہ علاج طلاق ہے پس کچھ شک نہیں ہے کہ ایسی حالت میں طلاق سے فائدہ ہے اس کے باعث سے مرد وعورت کو آزادی ہوجاتی ہے جن کے مزاج کی مخالفت یا سختی یا بے استقلالی سے دونوں کی زندگی تلخ ہوگئی تھی۔ بایں ہمہ اگرچہ طلاق ایک شخص واحد کے حق میں مفید ہو لیکن بلحاظ ان بد اخلاقیوں کے جو اکثر اوقات نہایت آشکارا طور پر وقوع میں آتی ہیں اور نیز اس معز بخش اثر کی وجہ سے جو طرفین کی اولاد پر اپنے والدین سے جدا ہونے سے ہوتا ہے تمدن کے حق میں کچھ کم مضرت پہنچانے والا نہیں ہے پس جب کہ طلاق کے ساتھ ایسی خرابیاں لگی ہوئی ہیں تو اس کو بطور ایک علاج سمجھ کر اسی حالت میں اس کی جانب رجوع کرنا جائز ہوسکتا ہے جب کہ اس پر عمل کرنے سے ایسی مصیبتیں جو طلاق کی مصیبتوں سے بھی زیادہ نا قابل برداشت ہوں اور ایسے ترددات اور تفکرات میں ڈالنے والی ہوں جو طلاق کے رنجوں سے بھی زیادہ رنج دینے والی اور روز افزوں رنجشیں پیدا کرنے والی اور باہمی حسن ومعاشرت کے بدلے دن رات کے لعن وطعن جوتی پیزار رکھنے والی ہوں دور ہوسکتی ہوں اگر ایسی حالت میں طلاق کو جائز رکھا جائے (جیسے کہ اسلام نے صرف اسی حالت میں اس کو بے گناہ ٹھہرایا ہے) تو وہ کسی طرح حسن معاشرت کے مخالف نہیں ہے بلکہ اس کی اصلاح کرنے والی اور ترقی دینے والی ہے۔

جب کہ ہم بلحاظ مذہب کے طلاق کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ مذہب اسلام ہی صرف ایک ایسا مذہب ہے جس نے طلاق کے مسئلہ پر سب سے زیادہ حسن معاشرت کی حفاظت اور اصلاح پر نظر رکھی ہے۔ یہودی مذہب میں طلاق دینا بغیر کسی قید وشرط وحالت کے مرد کے اختیار میں تھا کہ جب وہ چاہے طلاق نامہ لکھ کر جورو کے حوالہ کر دے اور ایسا کرنے سے کسی حالت میں وہ کسی گناہ کا گنہگار متصور نہیں ہوتا تھا حضرت عیسیٰ نے اس حکم کو منسوخ کیا اور جیسا کہ حال کے زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں (اگر وہ صحیح ہو) تو بجز ایک خاص وجہ کے اور کسی حالت میں طلاق کا دینا جائز نہیں رکھا اور فرمایا کہ "میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو سوائے زنا کے کسی سبب سے طلاق دے اور دوسری سے بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے اور جو کوئی اس چھوڑی ہوئی عورت سے بیاہ کرے وہ بھی زنا کرتا ہے" اگر اس فقرہ سے عدم جواز طلاق سمجھا جائے جیسا کہ حال کے زمانہ کے عیسائی سمجھتے ہیں (اور شاید وہ سمجھ صحیح نہیں ہے) تو یہ ایک ایسا سخت حکم تھا جس کی برداشت انسانوں سے قریب ناممکن کے تھی چنانچہ حضرت مسیح کے معتقدوں نے حضرت مسیح سے کہا کہ "اگر جورو سے مرد کا یہ طور ہے تو جورو کرنا خوب نہیں۔" پس اگر یہ حکم اسی طرح مانا جائے جس طرح کہ اس زمانہ کے عیسائی مانتے ہیں تو حسن معاشرت کے لئے نہایت ہی مضر ہے اور جو رنج دہ امور زن وشوہر میں واقع ہوجاتے ہیں جن سے تمام حسن

معاشرت اور اغراض تزوج برباد ہو جاتے ہیں اس کا کچھ بھی علاج نہیں ہے اور زن و مرد دونوں کے لئے اور بہت سی خرابیاں اور خوفناک حالتوں میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ بااین ہمہ بعض عیسائی عالموں کی یہ رائے ہے کہ اس کے حکم سے عدم جواز طلاق نہیں پایا جاتا اور اس لئے وہ عالم عیسائی مذہب کی رو سے بھی طلاق کا جائز ہونا سوائے زنا کے اور حالتوں میں بھی تسلیم کرتے ہیں چنانچہ جان ملٹن نے اپنی کتاب مسائل مذہب عیسوی یہ بحث لکھی ہے کہ ''نکاح کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی رو سے نکاح نہایت مرتبہ کا ایک اتحاد ہے مگر ناقابل انفکاک یا ناقابل تفریق نہیں ہے۔'' بعض لوگ اس کے ناقابل تفریق ہونے کی نسبت متی کی انجیل باب ۱۹ درس ۵ سے استدلال کرتے ہیں جس میں لکھا ہے کہ ''وہ دونوں ایک تن ہو جائیں گے'' اگر ان الفاظ پر مناسب طور سے غور کیا جائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نکاح قطعاً بالکل تفریق نہیں بلکہ ان سے صرف یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خفیف خفیف باتوں پر نکاح کو منقطع کرنا نہیں چاہیے کیونکہ جو کچھ نکاح ناقابل انفکاک ہونے کی نسبت کہا گیا ہے وہ خاص عقد نکاح اور اس کے تمام مقاصد ولوازمات کی پوری پوری تعمیل ہونے پر منحصر ہے خواہ وہ الفاظ بطور ایک حکم کے یا بطور ایک قدرت نتیجہ کے خیال کئے جائیں اور اسی وجہ سے متی کی انجیل میں ان لفظوں کے ساتھ یہ لفظ بیان کئے گئے ہیں کہ ''مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا۔

اور وہ دونوں ایک تن ہوں گے۔'' یعنی بشرطیکہ نکاح کی اصلی نوعیت کے مطابق (جن کا بیان کتاب پیدائش باب ۲ آیت ۱۸ لغایت ۲۰ میں ہے) عورت خاوند کے واسطے ایک مددگار ہو یا یہ کہ جانبین کے باہم خیر خواہی اور محبت اور آرام و وفاداری میں کچھ فرق نہ آئے کیونکہ عرف عام کے بموجب یہی اصلی وضع نکاح کی ہے لیکن اگر اصل منشاء نکاح کا منقطع ہو جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ نکاح بھی دراصل منقطع ہو گیا۔

دوسری آیت میں جو بیان ہوا ہے اور جس پر بڑا زور دیا گیا ہے یعنی ''جو کچھ خدا نے ملایا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے۔'' لحاظ کے قابل ہے مگر نکاح ہی کے عقد سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ خدا نے کس چیز کو ملایا ہے؟ خدا نے صرف اس چیز کو ملایا ہے جو ملاپ کے قابل ہے اور جو مناسب ہے بہتر ہے اور محترم ہے۔ اس نے انسان کی قدرتی طبیعت کے خلاف اور نامناسب حالت کے ملاپ کا حکم نہیں دیا جس میں صرف بے عزتی اور تکلیف اور عداوت و مصیبت بھری ہوئی ہو۔ خدا تعالیٰ کچھ اس قسم کے ملاپ نہیں کرتا ہے جو درحقیقت ملاپ نہیں ہوں بلکہ جبر یا ناعاقبت اندیشی یا غلطی یا بدسلیقگی کے اثر سے ہوئے ہوں۔ پس ایسی ناگوار خانہ داری کی برائی سے اپنے تئیں نجات دینا کس وجہ سے ناجائز ہے۔ علاوہ اس کے ہمارا مسئلہ ان شخصوں کو جدا نہیں کرتا جن کو خدا تعالیٰ نے اپنے مقدس آئین کی رو سے جدا کر دیا ہے اور یہ ایک ایسا حکم ہے جس کا اثر ہم پر ایسا ہونا چاہیے جیسا کہ سابق میں اس کی امت پر ہوتا تھا۔ مذہب عیسوی کے کمال کو جس کی ترقی بعض لوگ نکاح کے ناقابل انفکاک ہونے کی ایک دلیل بیان کرتے ہیں اس کی نسبت ہم کہتے ہیں کہ اس ترقی کو جبر اور قوانین تعزیری کے ذریعہ سے ہم میں زبردستی اس کا رواج نہیں دینا چاہیے بلکہ اگر ہو تو اس کو ترغیب اور عیسائی پند و نصائح کے ذریعہ سے جاری کرنا چاہیے۔ کسی شخص کی نسبت صرف اس حالت میں یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اس نے نکاح کو قطع کیا جو شرعاً منعقد ہوا تھا جب کہ وہ احکام الٰہی میں اس بات کو زیادہ کر کے جو خاص اس حکم میں شامل نہ ہو مذہب کے حیلہ سے اس شخص سے جدا ہو جائے جو اس کی منشاء کے موافق ہو کیونکہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ نے اپنے منصفانہ اور پاک اور مقدس قانون میں صرف مختلف وجھوں پر طلاق کی اجازت ہی نہیں دی ہے بلکہ بعض صورتوں میں اس کو جائز قرار دیا ہے اور بعض

صورتوں میں اس کی ہدایت کی ہے اور بحالت خلاف ورزی سخت سزائیں قرار دی ہیں دیکھو کتاب خروج باب ۲۱ آیت ۴، ۱۰، ۱۱ اور کتاب استثنا باب ۲۱ آیت ۱۴، باب ۲۴ درس او کتاب عزرا باب ۱۰ آیت ۳ نحمیا باب ۲۳ آیت ۲۰۔

توراۃ کتاب استثنا باب ۲۴ آیت ۱ میں لکھا ہے کہ جب کہ کوئی شخص ایک بیوی کرے اور اس سے نکاح ہو جائے اور ایسا اتفاق ہو کہ وہ اس کو پسند نہ ہو کیونکہ اس میں کچھ ناپاکی ہے تو اس کو چاہیے کہ ایک طلاق نامہ لکھ کر اس کے ہاتھ میں دے دے اور اس کو اپنے گھر سے نکال دے۔'' پس اگر فرض کیا جائے کہ جو سبب طلاق بتایا گیا ہے وہ سچا ہے اور مصنوعی نہیں تو اس مقام میں خداتعالیٰ نے ایک بیوی ابتدا ہی میں اس غرض سے دی کہ وہ اس کی مدد اور تسلی وخوشی کا باعث ہو جیسا کہ خود آئین نکاح سے ظاہر ہوتا ہے کہ تو اگر بعد کو جیسا کہ اکثر اتفاق ہوتا ہے وہ بیوی رنج ورسوائی اور تباہی اور اذیت اور مصیبت کی باعث ہو تو ہم کو کیونکر یہ خیال کرنا چاہیے کہ خدا ہم سے ایسی عورت کے طلاق دینے سے ناخوش ہوگا۔ میں دل کی سختی کو اس شخص سے منسوب کرتا ہو جو اس عورت کو اپنے پاس رہنے دے نہ کہ اس شخص سے جو اس کو ایسی صورتوں میں گھر سے نکال دے اور صرف میں ہی نہیں بلکہ خود حضرت سلیمان یا شاید خود خدا کی روح نے حضرت سلیمان کے منہ سے یہی بات کہی ہے چنانچہ توراۃ کتاب امثال سلیمان باب ۳۰ آیت ۲۱، ۲۳ میں لکھا ہے کہ ''تین چیزوں سے دنیا کو بے چینی حاصل ہوتی ہے بلکہ چار چیزیں ہیں جن کو وہ برداشت نہیں کر سکتی ہے۔

اور ایک مکروہ عورت سے جب کہ اس کا نکاح ہو جائے۔'' اس کے برخلاف کتاب واعظ باب ۹ آیت ۹ میں بیان ہوا ہے کہ ''تو اس عورت کے ساتھ ہنسی خوشی سے بسر کر جس کو اس نے (خدا) نے تجھے دیا ہے اور جس کو تو اپنی فانی زندگی کے تمام زمانہ میں پیار کرتا ہے'' پس جو عورت اس نے تجھ کو دی ہے وہ عورت ہے جس کو تو پیار کرتا ہے نہ کہ وہ جس سے تو نفرت کرتا ہے اور کتاب ملاکی باب ۲ آیت ۱۶ میں بیان ہوا ہے کہ ''جو شخص نفرت کرتا ہے (یا اس وجہ سے کہ وہ نفرت کرتی ہے) اس کو چاہیے کہ اس کو چھوڑ دے'' چنانچہ یونیوس سے پہلے سب نے اس فقرہ کا ایسا ہی ترجمہ کیا ہے۔[1] پس معلوم ہوتا ہے کہ خداتعالیٰ نے اس حکم کو حضرت موسیٰ کی معرفت اس غرض سے صادر نہیں فرمایا اور نہ اس نبی کی معرفت اس پر اس کو اس غرض سے دہرایا کہ شوہر کو اپنی سنگدلی کے برتاؤ کا موقع ملے بلکہ اس غرض سے صادر کیا ہے کہ جہاں ضرورت ہو اس بدنصیب عورت کو اس کے اثر سے بچائے کیونکہ اس میں کوئی سنگدلی نہیں ہے کہ اس عورت کو عزت سے اور بلا تکلف رخصت کر دے جس کا خود ہی یہ قصور ہے کہ وہ محبوب نہیں ہوئی۔ اس ایسی عورت کو جو نہ صرف یہی ہے کہ محبوب نہیں ہوئی بلکہ وہ معلق چھوڑ دی گئی ہو اور اس سے نفرت اور عداوت کی جاتی ہو غرض کہ جس عورت کا یہ حال ہو اس کو نہایت تکلیف دہ قانون کا اتباع کر کے اس کے شوہر کے نہایت بھاری غلامی کے جوئے میں رکھنا (کیونکہ نکاح بے محبت ایسا ہوتا ہے) جس کو نہ تو اس کے ساتھ الفت ہو اور نہ دوستی ہو یہی درحقیقت ایسی سختی ہے جس میں ہر ایک قسم کی طلاق سے زیادہ بے رحمی ہے۔ اسی وجہ سے خداوند تعالیٰ نے طلاق کی اجازت دے دی ہے جس کا اگر مناسب طور سے عمل درآمد کیا جائے تو وہ نہایت منصفانہ اور رحیمانہ ہے بلکہ اس نے اس کے فائدوں کو ان شخصوں تک بھی وسعت دی ہے جن کی نسبت وہ یہ جانتا ہے کہ یہ اپنی سنگدلی

---

[1] صحیفہ ملاکی باب ۲ کی آیتوں کے ترجمے اس طرح پر ہوتے ہیں

ترجمہ عربی ۱۸۱۱ء میں ہے ''وامارۃ شبابک لا تترک لکن ان ابغضتھا سرحا'' اور ترجمہ عربی مطبوعہ ۱۸۷۱ء میں ''وزوجۃ غلامک لا تزدلھا اذا بغضت فاطلق'' اور ایسا ہی رومن کیتھولک بائبل میں ہے اور انگریزی ترجمہ پروٹسٹنٹ کے حاشیہ پر بھی یہی عبارت ہے جس سے ملٹن نے استدلال کیا ہے۔

کی وجہ سے اس کا بے جا عمل درآمد کریں گے اور اسی نے بدکار آدمیوں کی سنگدلی گوارا کرنا اس سے بہتر تصور فرمایا کہ نیک آدمیوں کی تکلیف رفع کرنے سے باز رہے یا جس رسم کا ایک ربانی برکت سے ایک بدترین مصائب ہو جانے کا اندیشہ تھا خود اسی کو درہم برہم کر دے۔

خود حضرت عیسیٰ نے نویں آیت میں زنا کی وجہ سے طلاق کی اجازت دی ہے اور یہ بات نہ ہوتی اگر خدا تعالیٰ کو یہ بات منظور ہوتی کہ جن شخصوں کو خدا نے ایک مرتبہ عقد نکاح میں باندھ دیا ہے وہ ہرگز آئندہ جدا نہ ہوں مگر مشرقی زبانوں کے محاورہ کے بموجب اس لفظ سے جس کا ترجمہ زنا کیا گیا ہے صرف زنا ہی مراد نہیں ہوتا بلکہ اس سے یا تو وہ چیز مراد ہے جس کو ''ناپاک چیز'' کہا گیا ہے یا کسی ایسے امر کا نقصان مراد ہے جو جس امر کا ایک بیوی کی ذات میں ہونا واجبا ضروری ہے جو کتاب استثنا کے ۲۴ باب کی پہلی آیت میں مذکور ہے جیسا کہ سیلڈن نے سب سے پہلے اپنی کتاب اکزور ہیریا میں ایسے محاورہ کو بہت سی ربانیین یہود کی شہادت سے ثابت کیا ہے اور یا اس سے وہ شئے مراد ہے جو محبت' وفاداری' باہمی اعانت یا معاشرت یعنی اصلی آئین نکاح کے مقصد کے خلاف ہو کر ہرگز اس سے موافقت نہ ہو سکے جیسا کہ سیلڈن نے ثابت کیا ہے کیونکہ جس وقت فریسیوں نے یہ سوال کیا تھا کہ ایک بیوی کو ہر ایک وجہ سے طلاق دینا جائز ہے یا نہیں تو یہ جواب دینا لغو ہوتا کہ سوائے زنا کے اور کسی حالت میں جائز نہیں ہے کیونکہ یہ بات تو بخوبی مشہور معروف تھی کہ زنا کی حالت میں وہ جائز ہی نہیں تھی بلکہ ایک زانیہ کو نکال دینا ضروری تھا اور وہ بھی طلاق کے ذریعہ سے نہیں بلکہ قتل کر دینے سے پس اس مقام پر اس لفظ سے بہ نسبت محض زنا کے زیادہ تر وسیع معنی سمجھنے چاہئیں جیسا کہ کتاب اقدس کے اکثر مقامات سے خصوصاً قاضیوں کی کتاب باب ۱۹ آیت ۲ سے ظاہر ہے جہاں لکھا ہے کہ ''اس کی بیوی زنا کر کے چلی گئی'' یہاں زنا کے عرفی معنی نہیں ہو سکتے کیونکہ ایسی حالت میں اس کو جرات نہ ہوتی کہ وہ اپنے باپ کے گھر چلی جائے بلکہ یہ مراد ہے کہ وہ اپنے شوہر سے تمردانہ (نشوز) برتاؤ کر کے چلی گئی اور نہ ایسی صورت میں (یعنی جب کہ بجز زنا کے طلاق جائز نہ تھی) پولوس مقدس کسی کافر مرد یا عورت کے جدا ہو جانے کے سبب سے طلاق کی اجازت دیتے۔[1] اگر یہ بھی ایک قسم کا زنا نہ ہوتا۔ اس بحث سے یہ امر کچھ متعلق نہیں ہے کہ یہ مسئلہ کافر مرد یا عورت کے متعلق ہے کیونکہ جو شخص خاندان کو ترک کر دے وہ کافر سے بدتر ہے (پولوس کا پہلا خط تموتی کے نام باب ۵ آیت ۸) اور نہ نکاح کے اصلی منشاء کے حق میں کوئی بات اس سے زیادہ تر ضروری اور پسندیدہ ہو سکتی ہے کہ جو عقد محبت اور تمام عمر کی باہمی اعانت کی توقع اور نیک ارادوں سے کیا گیا ہو وہ کینہ اور سنگین عداوت اور طرفین کی جانب ناپسندیدہ برتاؤ کے سبب سے قطع کر دیا جائے پس خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے جب کہ وہ بہشت میں معصومیت کی حالت میں تھا۔ دنیا میں گناہ کے آنے سے پہلے یہ حکم دیا کہ نکاح نا قابل انفکاک ہونا چاہیے۔ گناہ کے بعد حالات کے تغیر کے موافق اور نیز اس نظر سے کہ معصوم آدمی بدکار آدمیوں کے ہاتھ سے ہمیشہ ضرر سے محفوظ رہے اس نے نکاح کے انفکاک کی اجازت دی اور یہ اجازت قانون قدرت اور موسوی شریعت کا ایک جزو ہے اور حضرت مسیح نے بھی اس کی ممانعت نہیں کی پس ہر ایک معاہدہ سے جب کہ ابتدا عمل میں آئے اس کا دوامی اور نا قابل انفکاک ہونا مقصود ہوتا ہے گو وہ کسی فریق کی بدعہدی کے سبب سے کیسی ہی جلد کیوں نہ ٹوٹ جائے اور نہ اب تک کوئی معقول وجہ اس بات کی بیان کی گئی ہے کہ نکاح کی نوعیت اس باب میں اور تمام معاہدوں سے مختلف ہونی

---

[1] اس مقام پر پولوس کے خط موسومہ قرنتیوں کے ساتویں باب کی ۱۵ آیت پر اشارہ ہے۔

چاہیے خصوصاً اس حالت میں جبکہ پولوس مقدس نے یہ بات بیان کی ہے کہ کوئی بھائی یا بہن ایسی باتوں میں مفید نہیں ہے۔ یہ نہ صرف چھوڑ دینے کی نسبت بلکہ تمام صورتوں میں جو ایک نالائق قید پیدا کرنے میں ہوتی ہے جیسا کہ قرنتیوں نے پہلے خط میں لکھا ہے (باب ۷ آیت ۱۵) کہ ''کوئی بھائی یا بہن ایسی باتوں میں مقید نہیں کہ خدا نے ملاپ کے لئے بلایا ہے۔'' پس خدا تعالیٰ نے ہم کو اس غرض سے نہیں بلایا کہ ہم دائمی نزاع اور ترددات کے باعث سے پریشان خاطر رہیں کیونکہ ہمارے بلانے کا مقصد امن اور آزادی ہے نہ کہ نکاح کے باعث سے پریشان خاطر رہیں کیونکہ ہمارے بلانے کا مقصد امن اور آزادی ہے نہ کہ نکاح چہ جا کہ دائمی نزاع اور ایک ناخوش ازدواج کی غلامانہ قید جس کو رسول نے تمام چیزوں سے زیادہ ایک آزاد آدمی اور عیسائی کے ناقابل بتلایا ہے۔

یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ حضرت مسیح نے موسوی شریعت سے کوئی ایسا کام خارج کر دیا جس سے مظلوم اور مصیبت زدہ شخصوں پر رحم کرنے کا موقع ملتا تھا اور نہ اس موقع پر حضرت مسیح کو یہ منظور تھا کہ ان کا یہ قول حکم عدالت سمجھا جائے یا اس معاملہ کی نسبت کوئی نیا اور سخت حکم دیا جائے بلکہ قانون کے بے جا عملدرآمدوں کے بیان کرنے کے بعد انہوں نے اپنے حسب معمول ایک زیادہ تر کامل دستور معاشرت کا بتلایا اور اس موقع پر مثل اور تمام موقعوں کے منصب قضا کا دعویٰ نہیں کیا اور امر حق کو محض نصیحت کے طور پر بیان فرمایا نہ کہ جبریہ احکام سے پس انجیل کی آیتیں قرار دینا اور احکام تعزیزی کے ذریعہ سے اس کو نافذ کرنا ایک سخت غلطی ہے۔

یہ تمام تقریر جان ملٹن کی تھی جو انہوں نے ایک محققانہ اور عالمانہ طور پر بائبل کے احکام سے استنباط کی ہے۔ ہماری رائے میں یہ مطلب نہایت مختصر تقریر سے ختم ہوتا ہے۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ سے پوچھا کہ جورو کو ہر ایک طرح پر طلاق دینی درست ہے یا نہیں۔ ان کا جواب یہ ہے کہ بجز افعال ذمیمہ کے اور ایسی کسی صورت میں جائز نہیں۔ جس لفظ کا ترجمہ حرام کاری یا زنا کیا گیا ہے وہ عام لفظ ہے اور سب قسم کی برائیاں اس میں داخل ہیں اور اس کا ٹھیک ترجمہ افعال ذمیمہ ہو سکتا ہے پس جو کچھ کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا اس سے امتناع طلاق نہیں نکلتا بلکہ بلاقصور صرف اپنی نفسانی بدخواہشوں کے لئے طلاق دینا ناجائز بتایا گیا ہے۔

اب دیکھنا چاہیے کہ مذہب اسلام نے نسبت طلاق کے کیا کیا؟ اس کو بطور علاج ایک مرض لا علاج کے جائز اور مباح بتایا مگر زن وشوہر کا معاملہ ایک ایسا نازک اور ایک عجیب قسم کے ارتباط واختلاط کا معاملہ ہے کہ اس میں جو بیماری پیدا ہو سوائے ان ہی دونوں کے اور کوئی تیسرا شخص اس بات کی تشخیص نہیں کر سکتا کہ آیا وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے جس کا علاج بجز طلاق کے اور کچھ نہیں۔ اس لئے بانی اسلام نے اس کی تشخیص نہ کسی (جج) کی یعنی قاضی کی رائے پر منحصر کی ہے نہ کسی مفتی کے فتویٰ پر بلکہ صرف اس کی رائے اور اخلاق پر جس کی تسلی اور موانست کے لئے ابتداء میں عورت بطور انیس دلنواز اور مونس غمگسار کے پیدا ہوئی تھی۔

اب اس بات کی بندش کہ وہ علاج بے محل اور بے موقع نہ استعمال کیا جائے صرف مرد کے حسن اخلاق اور دلی نیکی اور روحانی تربیت پر منحصر تھی جو نہایت اعلیٰ درجہ پر خاص اسی معاملہ میں مذہب اسلام نے اپنے سچے مریدوں اور ٹھیٹ مسلمانوں کو کی ہے۔

ما خلق الله شيئا على وجه الارض ابغض اليه من الطلاق. (رواه ابو داؤد)

''بانی اسلام نے اسلام کے سچے پیروؤں کو بتایا'' بجز طلاق کے اور کوئی چیز خدا تعالیٰ نے زمین کے پردہ پر پیدا نہیں کی جو خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب ہو''

ابغض الحلال الى الله الطلاق (رواه ابوداؤد)

پھر ایک دفعہ یوں فرمایا کہ ''مباح چیزوں میں سب سے زیادہ خدا کو غضب میں لانے والی چیز طلاق ہے۔''

یہ ہدایت تو مردوں کی نسبت تھی اور عورتوں کو جو طلاق لینا چاہتی ہیں یہ فرمایا ہے کہ

انما امراۃ سالت زوجھا طلاقا فی غیر ماباس فحرام رایحۃ الجنۃ (رواہ احمد والترمذی و ابو داؤد و ابن ماجہ والدارمی)

''جو عورت اپنے خاوند سے بغیر ضرورت شدید اور بغیر حالت سختی کے طلاق چاہے اس پر خوشبو جنت حرام ہے یعنی جنت میں نہ جائے گی۔''

ہمارے پیغمبر خدا ﷺ طلاق دینے والے سے ایسے ناراض ہوتے تھے جس سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوگیا کہ جو شخص اپنی جورو کو دفعتاً طلاق دے دے وہ قتل ہونے کے لائق ہے چنانچہ:

اخبر رسول اللہ ﷺ عن رجل طلق امرۃ ثلث تطلیقات جمیعا فقام غضبان ثم قال ایاحب بکتاب اللہ عزوجل وانا بین اظھر کم حتی قام رجل فقال یا رسول اللہ الا اقتلہ. (رواہ النسائی)

''ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی کہ ایک شخص نے اپنی جورو کو دفعتہً تین طلاقیں دے دی ہیں۔ یہ سن کر آنحضرت ﷺ غصہ کے مارے کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ کیا خدائے بزرگ کے حکم کو کھیل بنایا ہے ایسی حالت میں بھی کہ میں تم میں موجود ہوں۔ یہ سن کر ایک شخص کھڑا ہوا اور عرض کیا کہ اے رسول خدا کے کیا میں اس کو قتل کر ڈالوں یعنی وہ شخص آنحضرت ﷺ کے غصہ ہونے سے یہ سمجھا کہ اس شخص نے قتل کئے جانے کے لائق کام کیا ہے۔''

بانی اسلام نے انہی ہدایتوں اور تہدیدوں پر طلاق کے روکنے میں بس نہیں کیا بلکہ نکاح اور ملاپ کے قائم رکھنے کی اور بھی نہایت عمدہ تدبیر رکھی ہے یعنی پوری تفریق واقع ہونے کو تین دفعہ طلاق دینا معتبر رکھا ہے اور پھر اس کی ممانعت فرمائی ہے کہ دفعتہً تین طلاقیں نہ دی جائیں بلکہ سوچ سوچ اور سمجھ سمجھ کر مناسب فاصلہ سے طلاق دی جائے کہ ہر ایک میں قریباً پچیس روز کا فاصلہ ہو جاتا ہے اور پھر بھی اجازت دی کہ پہلی طلاق کے بعد اگر آپس میں صلح ہو جائے اور رنجش مٹ جائے اور دونوں کی محبت تازہ ہو جائے تو پھر بدستور جورو خصم رہیں دوسری طلاق کے بعد بھی اسی طرح وہ پھر آپس میں مل سکتے ہیں اور بدستور جورو خصم رہ سکتے ہیں لیکن اگر پھر تیسری دفعہ طلاق دی جائے تو ثابت ہوگیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں پھر بہتر ہے کہ پوری تفریق ہو جائے۔

ان ہدایتوں کے سوا ایک اور نہایت عمدہ ہدایت یہ فرمائی ہے کہ ایسی حالت میں جب کہ عورت کو مرد سے کنارہ کش رہنا پڑتا ہے طلاق نہ دی جائے۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ شاید زمانہ مقاربت میں محبت والفت کی ایسی تحریک ہو کہ خیال طلاق کا ان دونوں کے دل سے جاتا رہے۔

علاوہ ان ہدایتوں کے ہمیشہ عورتوں کے ساتھ محبت رکھنے اور ان کے ساتھ مہربانی اور خاطرداری سے پیش آنے اور ان کی سختی اور بدمزاجی کو تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی نہایت تاکید سے ہدایت فرمائی ہے اور یہ سب باتیں اسی مکروہ چیز یعنی طلاق کے روکنے کو ہیں۔

ان سب احکام سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ بانی اسلام نے صرف اسی حالت میں طلاق کی اجازت دی ہے جب کہ وہ ایک نہایت بیش بہا نعمت ثابت ہونے میں ذرا خطا نہ کرے اور جب کہ اس کے ذریعہ سے حالت زوجیت کے ترددات اور تکلیفیں اور تلخیاں یا تو بالکل رفع ہو جائیں یا بہرکیف کچھ کم ہو جائیں اور اگر طلاق کو کام میں نہ لایا جائے تو حالت معاشرت روز بروز زیادہ

تکلیف دہ ہوتی جائے۔ایسی صورت میں طلاق حسن معاشرت کے نقصان کا باعث نہیں ہوسکتی بلکہ برخلاف اس کے وہ دونوں کے حق میں ایک برکت اور حالت معاشرت کی ترقی کا کامل ذریعہ ہوتی ہے۔ ہاں میں اس بات کو قبول کروں گا کہ مسلمانوں نے اس عمدہ حکم کو نہایت قابل نفرت طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ پس ان کے افعال کی نفرین انہیں پر ہونی چاہیے نہ مذہب اسلام پر۔ ہم کو امید ہے کہ تمام منصف مزاج لوگ جب ٹھیٹ اسلام کے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو قبول کریں گے کہ جو عمدہ طریقہ اس باب میں اسلام نے اختیار کیا ہے وہ عقل انصاف معاشرت کی نظر سے ایسا عمدہ ہے کہ اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا اور صاف یقین دلاتا ہے کہ یہ مسئلہ اسی استاد کا بتایا ہوا ہے جس نے انسان کو پیدا کر کے اس کے لئے اس کا جوڑا پیدا کیا تا کہ اس کی تسلی اور دل کی خوشی کا باعث ہو اور غور کیا جائے تو یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ جان ملٹن نے اپنی بحث میں جو کچھ روشنی بائبل کی آیتوں پر ڈالی ہے وہ سب اسلام کی روشنی سے لی گئی ہے کیونکہ اسلام نے بارہ سو برس پیشتر بتا دیا تھا کہ طلاق نہ بطور معجون مفرح کے استعمال کرنے کو ہے بلکہ صرف ایک مرض لاعلاج کا علاج ہے۔

اب ہم غلامی کے الزام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ایک سب سے بڑا الزام اس کے جائز رکھنے کا مذہب اسلام کی نسبت لگایا گیا ہے اور بیان ہوا ہے کہ قوانین حسن معاشرت اور اخلاق کے بالکل برخلاف ہے قوانین حسن معاشرت کی قید ہم نے اس لئے لگائی ہے کہ اگر اس معاملہ پر مذہبی طور پر نظر کی جائے تو نہ یہودیوں کو اور نہ عیسائیوں کو اس قدر جرأت ہوسکتی ہے کہ وہ اس میں کچھ عیب نکالیں یا اس کی نسبت کچھ اعتراض کریں کیونکہ توریت کا ہر صفحہ ایسے مضامین سے بھرا ہوا ہے جس میں غلامی کا جواز تسلیم کیا گیا ہے (خواہ اس کو خدا کا حکم مانو یا حضرت موسیٰ کا اس زمانہ کے رسم و رواج کا قانون) اور انجیل میں کسی مقام پر ایک مضمون بھی نہیں پایا جاتا جس میں اس بے رحم دستور کی ممانعت ہو قبل اس کے کہ ہم اس معاملہ میں اپنی رائے بر بنائے مذہب اسلام ظاہر کریں گاڈفری ہگنز صاحب نے جو کچھ اس کی نسبت لکھا ہے اس کو بیان کرتے ہیں۔

گاڈفری ہگنز صاحب لکھتے ہیں کہ ''انسان کے حق میں یہ ایک بدقسمتی کی بات معلوم ہوتی ہے کہ نہ تو حضرت عیسیٰ نے اور نہ حضرت محمد ﷺ نے غلامی کا موقوف کرنا مناسب خیال کیا۔ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد ﷺ دونوں نے اپنے معتقدوں کو یہ ہدایت کی کہ ان کو اوروں کے ساتھ وہ کرنا چاہیے جیسا کہ اوروں سے اپنے ساتھ کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے درحقیقت غلامی موقوف کردی۔ یہ بات ظاہر میں تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے مگر افسوس ہے کہ عمل میں ایسا نہیں ہے مسلمانوں کی خانگی غلامی بلاشبہ نا قابل حمایت ہے لیکن افریقہ کی بردہ فروشی اور وسٹ انڈیز کے کارخانہ باغات میں غلاموں پر کی سختیوں اور بے رحمیوں کے مقابلہ میں (جو عیسائی ملکوں میں مروج تھیں) کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتیں ہم نہایت اعتقاد سے روم کے پوپ اور کنٹر برمی کے آرچ بشپ اور کونسلوں اور مجلسوں اور پوپ کے احکام اور عقائد اور مذہبی قوانین اور معاہدوں کا ذکر سنتے ہیں مگر ہم نے کب یہ بات سنی ہے کہ ان لوگوں نے کوئی عام تدبیر اس خوفناک تجارت کے انسداد کے لئے کی (واضح ہو کہ اس زمانہ میں تمام فرنگستان میں غلامی کی تجارت رائج تھی) ورنہ اس کی نسبت ہم کو پوپ کا کوئی حکم دکھاؤ یا کسی مجلس کا کوئی قانون بتاؤ' روم اور کنٹر برمی کے بشپ خود اس خطاب کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے معتقدوں کی خواہشوں کے پورا کرنے کے کام دیتے تھے جو خطاب کہ انہوں نے حضرت ﷺ کو اس وجہ سے دیا ہے جبکہ روم کے پوپوں کو اس تجارت کا فساد عظیم صاف صاف ثابت ہوگیا تھا تو انہوں نے ان شخصوں کو قوم سے خارج نہیں کیا جو اس تجارت میں مصروف تھے جیسا کہ کیوکارس یعنی پیروان جارج فاکس نے کیا تھا۔

میں اس بات سے واقف ہوں کہ وہ یہ ظاہری عذر کریں گے کہ وہ کسی شخص کو اس وجہ سے کہ غلاموں کا مالک ہے قوم سے خارج نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انجیل اور حواریوں کے ناموں کے ہر ایک صفحہ میں غلاموں کا جواز تسلیم کیا گیا ہے مثلاً جہاں کہیں لفظ ''سروس'' یا ''دولوس'' پایا جاتا ہے اس کا ترجمہ خدمت گار کیا گیا ہے وہاں اس کا ترجمہ غلام ہونا چاہیے۔ لفظ ''سروس'' کے لغوی معنی اس شخص کے ہیں جو بازار میں خریدا گیا ہو یا فروخت کیا گیا ہو اور ''فریدیمین'' ہمارے اجورہ دار اور خدمت گار کے نیم معنی ہیں لیکن اگر بدقسمتی سے عیسائیوں کو خانگی غلامی کی اجازت دی جائے تو اس سے کسی طرح پر یہ بات ثابت نہیں ہوتی ہے کہ افریقہ کی بردہ فروشی جائز ہے۔ جس کی زیادتی کا زمانہ اگلے لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا اور جو ہر طرح پر ان کی خانگی غلامی سے مختلف ہے۔

اگرچہ پیغمبر صاحب نے اس مکروہ دستور کو موقوف نہیں کیا جیسا کہ ان کو کرنا چاہیے تھا تاہم انہوں نے بالکل بغیر ذکر کیے ہوئے نہیں چھوڑا بلکہ اس بات کے فرمانے سے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور کسی شخص کو اپنے بھائی کو غلامی میں رکھنا نہیں چاہیے انہوں نے انسانوں کے ایک گروہ کثیر کو آزاد کر دیا۔ جس وقت کوئی یہ کہہ دے کہ میں ایمان لے آیا تو وہ فوراً آزاد ہے۔ اگر حضرت محمد ﷺ نے اس باب میں جیسا کہ چاہیے تھا ویسا نہیں کیا تو انہوں نے کچھ تو کیا جو بالکل نہ ہونے سے (جیسے کہ انجیل میں کچھ نہیں ہے) بہتر ہے اور اس سبب سے غالباً کچھ لوگ بلا تصدیق قلبی بھی مسلمان ہو گئے ہوں گے گو کہ اس امر کو کوئی پکا دیندار عیسائی جس کا گرم ایمان مذبح کے دھکتے ہوئے انگارے سے زیادہ تر گرما گرم ہے عیب لگا دے اور اس کو بدنیتی پر حمل کرے لیکن تاہم اس تدبیر نے لاکھوں آدمیوں کو مصیبت سے بچایا ہے۔ ایک اور تدبیر غلامی کی ترمیم یا اس کی قباحتوں کی تخفیف کرنے کی پیغمبر صاحب کے اس حکم سے ملتی ہے جہاں یہ فرمایا ہے کہ غلاموں کو فروخت کرنے میں ماں سے بچے جدا نہ کیے جائیں۔ ہمارے ویسٹ انڈیز والے ہر روز یہی جرم کرتے ہیں۔ مجھ کو کوئی ایسا حکم انجیل میں نہیں ملا اس لئے حضرت محمد ﷺ نے اس کو انجیل سے نہیں لیا ہے۔

گاڈفری ہگنز صاحب لکھتے ہیں کہ ''ہم عیسائی اکثر اوقات بے چارے حبشیوں کو عیسائی بنانے کی خواہش کرتے ہیں مگر میں انہی مشنری سوسائٹیوں کو یہ صلاح دیتا ہوں کہ وہ اپنی دولت کثیر کو اس باب میں صرف کریں کہ جس وقت حبشیوں کا مذہب تبدیل ہو جائے تو ان کو فوراً آزاد کر دیں اور ان کو اپنا بھائی قرار دیں جیسا کہ مسلمان کیا کرتے ہیں اور میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ ان کے تمام واعظوں سے اس قدر لوگ ان کے معتقد نہ ہوں گے جیسے کہ اس بات سے ہوں گے۔

گاڈفری ہگنز صاحب نے ویسٹ منسٹر ریویو کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ ان کا مسئلہ قانون غلامی کے باب میں یہ ہے کہ ''اگر غلام تمہارے پاس آئیں تو تم ان کو قید اور اس کے بعد ان کو سر بازار مت فروخت کرو گو کوئی دعوے دار ان کا موجود نہ ہو (جیسا کہ انیسویں صدی میں عیسائی انگلستان کا قانون اس کے صوبوں میں جاری ہے) بلکہ ان کو آزاد کر دو اور تم کو مناسب نہیں کہ ان کو نکال دو۔ مگر حضرت محمد ﷺ (جنہوں نے غلامی کے مٹانے کی نسبت نہایت عمدہ تدبیریں کیں) وہ تھے جو ساتویں صدی میں عرب کے بیابانوں میں کھڑے ہوئے تھے۔

حضرت محمد ﷺ تو فرماتے ہیں کہ ''ایسے غلاموں کو جو ہم سے اس مضمون کی ایک تحریری سند چاہیں کہ جس وقت وہ ایک رقم معین ادا کر دیں تو وہ اپنے تئیں آزاد کر لیں تو تم ہمیشہ یہ دستاویز ان کو لکھ دو اگر تم ان میں کوئی بھلائی جانو تو تم خدا کی دولت میں سے جو اس نے تم کو دی ہے ان کو دو'' گاڈفری ہگنز کہتے ہیں کہ مجھ کو انجیل میں ایسا کوئی حکم نہیں ملا۔

یہ جو کچھ لکھا گیا ہے گاڈفری ہگنز کا استدلال تھا مگر یہ استدلال کسی قدر حاشیہ لکھنے کا محتاج ہے ان کا یہ بیان ہے کہ ''حضرت محمد ﷺ نے غلامی کو موقوف کرنا مناسب خیال نہ کیا'' صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ تقلید کی تاریکی میں اندھے ہو رہے ہیں وہ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی مرضی اور خوشی غلاموں کے آزاد کرنے کی تھی اور ہمیشہ ہر حکم میں غلاموں کی آزادی پر رغبت دلاتے تھے اور جو لوگ خاص آنحضرت ﷺ کو اپنا ہادی اور پیشوا جانتے ہیں اور زید اور عمرو کی رائے اور اجتہاد کی کچھ پرواہ نہیں کرتے تو وہ صاف صاف قرآن مجید میں پاتے ہیں کہ بانی اسلام نے آئندہ کی غلامی کو بالکل قطعاً موقوف کر دیا ہے جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے پس یہ فخر صرف مذہب اسلام ہی کو ہے کہ اس نے غلامی کو معدوم کیا ہے اور ہر انسان کو آزاد قرار دیا ہے۔

اسلام لانے سے غلامی ساقط ہو جانے پر جو استدلال گاڈفری ہگنز نے کیا ہے ہم کو دل سے اس پر اتفاق ہے۔ خدا تعالیٰ نے سورۂ حجرات میں صاف فرمایا ہے کہ ''انما المومنون اخوۃ'' یعنی سب ایمان لانے والے آپس میں بھائی ہیں اور سورۂ آل عمران میں فرمایا ہے کہ

واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا واذكروا نعمت الله عليكم اذ كنتم اعداء فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمة اخوانا. (سورة ال عمران)

''سب لوگ اکٹھے ہو کر خدا کی رسی کو مضبوط پکڑو اور جدی جدی راہوں میں مت بھٹکو اور تم کو جو نعمت خدا دی ہے (یعنی اسلام) اس کا شکر کرو۔ ایک وقت تھا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر تمہارے دلوں میں خدا نے محبت ڈال دی پھر تم ہو گئے اللہ کی نعمت (یعنی اسلام) کے سبب آپس میں بھائی۔''

پس کون شخص اس سے انکار کر سکتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں اور اس لئے کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کا غلام نہیں ہو سکتا۔ یہی ''اخوت'' اس امر کا باعث ہے کہ جب کوئی مسلمان بغیر وارث قریب کے مر جاتا ہے تو اس کا مال بیت المال میں اس کے سب مسلمان بھائیوں کے لئے چلا جاتا ہے مگر جب ہمارے پیغمبر نے علانیہ صاف صاف لفظوں میں آئندہ کی غلامی کو عام طور پر معدوم کر دیا ہے تو ہم کو اس قسم کی خاص خاص باتوں پر استدلال کی حاجت نہیں ہے۔

کتاب کا جو ذکر گاڈفری ہگنز صاحب نے کیا ہے وہ حکم صرف ایسا ہی نہ تھا کہ اس کا کرنا یا نہ کرنا مالک کی مرضی پر موقوف ہو بلکہ اس کا کرنا واجب تھا اور انکار نا قابل سزا کے تھا چنانچہ بخاری کی ایک حدیث سے (اگر وہ صحیح ہو) معلوم ہوتا ہے کہ ابن سیرین نے جب حضرت انسؓ سے کتابت کی درخواست کی تو انہوں نے انکار کیا۔ ابن سیرین نے وہ مقدمہ حضرت کے عمر کے سامنے پیش کیا اور حضرت عمر نے حضرت انس کو اس انکار کرنے پر دروں سے پٹوا دیا اور کتابت یعنی خط آزادی بمعاوضہ روپیہ کے بجز حضرت انس سے لکھوا دیا گو یہ حدیث قابل شبہ ہو مگر خود قرآن مجید سے پایا جاتا ہے کہ کتابت کی درخواست کرنے پر خط آزادی بمعاوضہ روپیہ کے لکھ دینا لازم ہے۔

بہر حال جو حمایت اس عالم اور فاضل مصنف نے نہایت قابلیت اور بڑی سرگرمی سے مذہب اسلام کی ہے اس کا واجب شکریہ ادا کرنے کے بعد ہم یہ کہتے ہیں کہ اس مصنف نے غلامی کی ترمیم یا اس کی خرابیوں کی تخفیف میں جو بچوں کو ماں سے جدا نہ کرنے کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ چند ایسی قسم کے احکام زیادہ کرنے چاہئیں جو غلامی کی ترمیم اور اس کی خرابیوں کی تخفیف کے حق میں ویسی

ہی مفید ہیں چنانچہ آنحضرت ﷺ نے غلاموں [1] کے حق میں فرمایا ہے کہ

قال (ای النبی ﷺ فی حق العبید) ان اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل ویبہ مما یلبس و لا تکلفو ھم ما یغلبھم فان کلفتموھم ما یغلبھم فاعینو ھم (بخاری باب قول النبی ﷺ العبید اخوانکم صفحہ ۳۴۶)

''وہ تمہارے بھائی ہیں (بوجہ انسان ہونے کے) جو تمہاری خدمت کرتے ہیں تمہارے کاموں کو سنوارتے ہیں اللہ نے ان کو تمہارے تابع کر دیا ہے پس جو شخص کہ اس کا بھائی اس کے تابع ہو تو اس کو چاہیے کہ جو آپ کھاتا ہے اس میں اس سے کو کھلا دے اور جو آپ پہنتا ہے اس میں اس کو پہنا دے اور ان سے ایسی تکلیف کے کام جو ان کو تھکا دیں نہ لے اور اگر ایسی'' تکلیف کا کام ان کو دیا جائے جو ان کو تھکا دے گا تو خود ان کی مدد کرے''

اس حکم کا لوگوں کے دلوں پر اس قدر اثر ہوا کہ تمام شخص اس زمانہ میں اپنے غلاموں کو ویسا ہی کپڑا پہناتے تھے جیسا کہ خود پہنتے تھے اور ایک خوان میں اپنے ساتھ وہی کھانا ان کو کھلاتے تھے جو آپ کھاتے تھے اور جب سفر میں جاتے تھے تو غلام کو اپنے ساتھ اونٹ پر بٹھاتے تھے اور اگر ایک کو نکیل پکڑ کر چلنے کی ضرورت ہوتی تو باری باری سے سوار ہوتے تھے اور باری باری سے نکیل پکڑ کر پیادہ چلتے تھے۔

خلیفہ عمر عین اپنی خلافت کے عروج کے زمانہ میں (خواہ ان کے عالی مرتبہ کو پیغمبر کا جانشین ہونے کی وجہ سے خیال کرو خواہ ایک ایسی سلطنت کا بادشاہ تصور کرنے سے جو دنیا میں سب سے زیادہ وسیع اور باعظمت تھی) اپنی باری میں اس اونٹ کی مہار پکڑ کر جس پر ان کا غلام اپنی باری میں سوار ہوتا تھا عرب کے جلتے ہوئے ریگستان کو گھسیٹتے ہوئے چلنا کمال خوشی سمجھتے تھے۔ فاطمہ پیغمبر کی بیٹی اپنی لونڈی کے ساتھ بیٹھ کر چکی پیستی تھیں کبھی ان کا دست مبارک ہتے کو نیچے سے تھامتا تھا اور کبھی لونڈی کا تاکہ دونوں کو برابر محنت پڑے بس اگر یہی وہ غلامی ہے جس کو سر ولیم میور حسن معاشرت کو ابتر کرنے والی بتاتے ہیں تو ہم نہیں سمجھتے کہ برابری کے حقوق میں اور کیا ہوتا ہے۔ ایسی غلامی (اگر اس کو غلامی کہہ سکو) درحقیقت حسن معاشرت کی بے انتہا خوبی اور عام اخلاق کی زائد از حد ترقی متصور ہے پس مذہب اسلام کی غلامی کو ویسٹ انڈیز کی غلامی پر جو عیسائیوں میں مروج تھی قیاس کرنا محض غلطی ہے آنحضرت ﷺ نے صرف اسی بات پر بس نہیں کیا بلکہ ان کی نسبت لونڈی وغلام کے لفظ کے استعمال کو بھی جس سے ان کی رقیت اور حقارت نکلتی تھی منع فرمایا اور نہایت شائستہ ومہذب وشفقت آمیز الفاظ سے مخاطب کرنے کی ہدایت فرمائی یعنی یہ فرمایا کہ ''ان کو لڑکا'' اور ''لڑکی'' کہہ کر پکارا کرو جس کو بگاڑ ہندوستان کے ناخدا ترسوں نے ''چھوکرا'' اور ''چھوکری'' بمعنی لونڈی وغلام کہنا شروع کیا ہے۔ مسلم کی اس حدیث کے لفظوں کو دیکھو اور سمجھو کہ تمہارے پیشوا محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا فرمایا ہے کہ اس فرمانے کے بعد بھی ایک انسان دوسرے انسان کو اپنا غلام بنا سکتا ہے۔ پیارے پیغمبر رحمۃ للعالمین نے فرمایا:

ان رسول اللہ ﷺ قال لا یقولن احدکم عبدی وامتی کلکم عبید اللہ وکل نساء کم اماء اللہ

---

[1] اس حدیث میں بوجہ اسلام کے بھائی ہونے کا ذکر نہیں ہے اور آیت قرآن مجید میں جو اوپر مذکور ہوئی بوجہ اسلام بھائی ہونے کا ذکر ہے۔ اس لئے اسلام سے غلامی کے ساقط ہونے پر گاڈفری ہگنز صاحب نے استدلال کیا ہے۔

ولکن لیقل غلامی وجاریتی وفتائی وفتاتی۔ (مسلم کتاب الالفاظ من الادب)

''کوئی تم میں سے میرا غلام اور میری لونڈی ہرگز نہ کہے تم سب خدا کے غلام ہو اور سب تمہاری عورتیں خدا کی لونڈیاں ہیں مگر کہو کہ ''میرا بچہ اور میری بچی اور میری لڑکا'' علاوہ اس کے آنحضرت ﷺ نے غلاموں کے آزاد کرنے پر ہمیشہ رغبت دلائی ہے اور فرمایا ہے کہ کوئی کام خدا کے نزدیک غلاموں کے آزاد کرنے سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا نہیں ہے۔''

اب ہم ٹھیٹ مذہب اسلام کی رو سے غلامی کی نسبت کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اسلام نے آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ بموجب قدیم رسم جاہلیت کے غلام ہو چکے تھے ان کی آزادی کا احساناً بلا لینے زر معاوضہ کے حکم نہیں دیا وہ بدستور ان لوگوں کے ملک رہے جن کے وہ غلام ہو چکے تھے اگر کوئی ناسمجھ یہ الزام مذہب اسلام پر دے کہ ان کو بھی دفعتہً کیوں نہ آزاد کر دیا تو اس کی اس ناسمجھی کا ہمارے پاس کچھ علاج نہیں ہے مگر اس ناسمجھ کے دل کو ان تمام باتوں کے جاننے سے جو ہم نے اوپر بیان کیں اس قدر تو ضرور تسلی ہوگی کہ ان بدنصیبوں کی بھی حالت غلامی کی ترمیم اور تخفیف میں جو کچھ اسلام نے کیا وہ کچھ کم نہیں ہے اور ایسا رحم وشفقت جو اسلام نے ان کی نسبت کیا بے مثل و بے نظیر ہے اور متعدد تدبیریں اور تاکیدیں اور ہدایتیں ان کی آزادی کی نسبت کیں اور طرح طرح سے آزاد کرنے پر رغبتیں دلائیں ہاں بلاشبہ جو سمجھدار اور دانش لوگ ہیں وہ سمجھیں گے کہ آیت حریت کے نازل ہونے سے پہلے جس قدر لوگ غلام ہو چکے تھے ان کی آزادی کا دفعتہً حکم دے دینا محالات عملی سے تھا اور غلامی کے معدوم کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ تھی کہ آئندہ سے غلاموں کا ہونا بند کر دیا جائے اور پچھلے غلاموں کی آزادی اور غلامی کی حالت کی ترمیم کی تدبیر کی جائے پس یہی کام اسلام نے کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کا نہیں ہے بلکہ اسی کا ہے جس نے انسان میں حسن معاشرت کو پیدا کیا ہے۔

بقول مسٹر ہلگز کے گو حضرت مسیح نے غلامی کو موقوف نہ کیا ہو مگر ہم نہایت خوشی اور فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے پیارے حضرت محمد رحمۃ للعالمین نے غلامی کو بالکل موقوف کر دیا۔ تمام قواعد اور قوانین غلامی کے جن کی رو سے ایک شخص دوسرے کا مملوک ہو جاتا تھا اور جو قدیم زمانہ کے بت پرستوں اور اس وقت کی تمام دنیا میں بطور ملکی قانون کے اپنی مقدس کتاب میں داخل کیا تھا اور جن کو حضرت مسیح نے بھی نہیں توڑا تھا اور جن کو حضرت مسیح کے حواریوں نے بھی تسلیم کیا تھا دفعتہً منسوخ کر دیا اور تمام پرانی رسموں اور مطول قانونوں کو ایک دو لفظ کے فرمانے سے کہ ''اما منا بعد واما فداء'' مٹا دیا۔

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست کتب خانۂ چند ملت بشست

صلی اللہ علیہ وسلم۔ بابی انت وامی یا رسول اللہ۔

اس رسول مقبول ہادم الرقیۃ ناصر الانسان رحمۃ اللعالمین نے اپنے مبارک ہونٹوں سے فرمایا کہ خدا تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ

فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشد الوثاق فاما منا بعد واما فداء۔
(سورۃ محمد ایت: ۴)

''جب تم مقابل ہو کافروں کے تو گردنیں کاٹو جب کہ تم اس پر گھمسام کر چکو تو ان کو قید کر لو۔ پھر قید کرنے کے بعد یا تو ان پر احسان رکھ کر یا ان سے فدیہ یعنی چھڑائی لے کر چھوڑ دو۔''

اس آیت سے پایا جاتا ہے کہ کافروں کے مغلوب ہو جانے پر جو ان کے قید کرنے کا حکم ہے اس سے مقصد ان کی جان بچانا ہے

اور قید کرنے کے بعد جو حکم ان کی نسبت ہے وہ دو امر میں منحصر ہے۔ ایک تو احسان رکھ کر چھوڑنے میں اور دوسرے ان سے چھڑائی لے کر چھوڑنے میں جب وہ حکم دیے جاتے ہیں تو ان لوگوں کو جن کی نسبت وہ حکم ہیں اس قدر تو ضرور اختیار رہتا ہے کہ ان دونوں میں سے جون سے حکم کی چاہیں تعمیل کریں مگر دونوں میں سے ایک کا بجالانا واجب ہوتا ہے۔ ان کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی کو بھی نہ کریں بلکہ کوئی اور امر اختیار کریں پس قیدیوں کے ساتھ ان دونوں حکموں میں سے ایک کا عملدرآمد کرنا واجب ہے۔

ان احکام دوگانہ سے جو خدا نے دیئے رقیت یعنی قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا چاہیے تو جب تک فدیہ ادا نہ ہو اس وقت تک اس کو قید رکھے مگر وہ قید بدستور ایک قیدی ہوگا اور رقیت ومملوکیت کسی حالت میں اس پر طاری نہ ہوگی اور جب قیدی سے فدیہ کا ادا ہونا ناممکن ہوگا تو درحقیقت تعمیل ایک حکم کی ناممکن ہوگی اور اسی لئے اس پہلے حکم کی تعمیل واجب ہوگی۔

ہمارے ہاں کے عالموں کی رائے میں اس امر کی نسبت اختلاف ہے کہ کن صورتوں میں قیدیوں کو احسان رکھ کر چھوڑنا چاہیے بعض کی یہ رائے ہے کہ ان کو صرف اس حالت میں چھوڑنا چاہیے جب کہ وہ مسلمانوں کی رعایا ہو کر مسلمانوں کے ملک میں رہنا قبول کریں اور بعضوں کی یہ رائے ہے جو بظاہر معقول بھی معلوم ہوتی ہے کہ قیدیوں کو بغیر کسی شرط کے چھوڑ دینا چاہیے اور کوئی شرط ان پر نہ لگائی جائے اور چھوٹ جانے کے بعد ان کو اختیار ہے کہ چاہے مسلمانوں کے ملک میں رعیت ہو کر رہیں اور چاہے اپنے خاص ملک کو چلے جائیں۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت میں احسان رکھ کر چھوڑ دینے کی حالت میں کوئی قید وشرط نہیں لگائی ہے اور اسی لئے ہمارے نزدیک پچھلی رائے ان عالموں کی پہلی رائے سے زیادہ مستند ومعتبر وصحیح ہے۔

دیکھو کتابت یعنی بمعاوضہ روپیہ کے خط آزادی لکھ دینے اور فدیہ لے کر چھوڑنے میں چنداں فرق نہیں ہے اگلے غلاموں کی نسبت جو کتابت کا حکم ہے وہ اگلے غلاموں کی آزادی کی نہایت معتبر دستاویز ہے۔

جن نالائق اور خراب اور قابل افسوس حالت سے غلامی کا رواج مسلمان ریاستوں میں (بعض عیسائی ملکوں میں بھی) ہوتا ہے اس کو دیکھ کر ہم کو کچھ کم رنج نہیں ہوتا مگر ہم اس خطبہ کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جو شخص خود اس کا برتاؤ کرتا ہے یا اوروں کو کرنے دیتا ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے حکم اور اس کی عالی اصولوں کے برخلاف عمل کرتا ہے اور وہ ضرور ایک دن اس حقیقی شہنشاہ کی ہیبت ناک عدالت میں بطور ایک گنہگار کے حاضر ہوگا۔ خواہ مکہ میں جا کر یہ کام کرے یا مدینہ میں۔

سر ولیم میور اسلام میں ایک یہ نقص بتاتے ہیں کہ اسلام میں مذہب کے معاملہ میں رائے کی آزادی روک دی گئی ہے بلکہ بالکل معدوم کر دی ہے۔

مگر سر ولیم میور کی اس رائے کا جس سے وہ مذہب اسلام میں مذہبی رائے کی آزادی نہ ہونے کا نقص نکالتے ہیں ٹھیک ٹھیک مطلب سمجھنا نہایت مشکل ہے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اسلام میں ایسی کونسی چیز ہے جو مذہبی معاملات میں آزادی رائے کو روکتی اور معدوم کرتی ہے اور اور مذہبوں میں ایسی کون سی بات ہے جو اس آزادی کی اجازت دیتی ہے۔

یہودی جن کی کتب مقدسہ گویا مذہب اسلام کے اور مذہب عیسائی دونوں کی بنیاد ہیں یہ پکا عقیدہ رکھتے ہیں کہ توریت کا ہر ایک لفظ مع اس کے تاریخی مضمون کے باوجودیکہ ان کے مصنف بھی معلوم نہیں ہیں وحی آسمانی ہیں اور اس لئے سہو وخطا وغلطی سے بالکل مبرا ہیں اور ہر ایک انسان کو بغیر ذرا سے بھی تامل کے اور بغیر کسی حجت کے اور بغیر استعمال کرنے اپنے قوائے عقلیہ کے ان کے حق ہونے کا اعتقاد کرنا چاہیے۔

عیسائیوں کا یہ حال ہے کہ بلحاظ اعتقاد نسبت کتب مقدسہ کے وہ دو فرقے ہوگئے ہیں۔ ایک وہ جو یقین کرتے ہیں کہ کتاب مقدس تمام وکمال وحی من السماء ہے دوسرا وہ جو صرف اس کے ایک حصہ کو وحی سمجھتا ہے جو مسائل واحکام سے متعلق ہے اور دوسرے حصے یعنی تاریخی حالات کو وحی نہیں سمجھتا۔

مگر قطع نظر اس اختلاف سے جو عیسائیوں کو کتب مقدسہ کے اعتقاد اور ان کے وحی ہونے کی نسبت ہے ان کو دو بڑے بڑے مذہبی مسائل پر یقین کرنا فرض ہے جن کے سبب سے مذہبی معاملات میں آزادی رائے کامل طور سے بالکلیہ نیست ونابود ہو جاتی ہے اور اس لئے عیسائی خدا کی برگزیدہ قوم (یعنی یہود) سے بھی زیادہ خراب حالت میں ہیں اور وہ دو مسئلے یہ ہیں۔

ایک مسئلہ "توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید" یہ ایک نہایت عجیب طور کا مسئلہ ہے جس کی نسبت عقل کو کام میں لانا منع ہے۔ لفظ تثلیث کا خدا کے تین مقدس جسموں کے ظاہر کرنے کو حضرت عیسیٰ کی دوسری صدی تک یعنی اس وقت تک جب کہ تھیوفلس بشپ آف انٹیوک نے اس کو ایجاد کیا جاری نہیں ہوا تھا اور یہ تثلیث کا مسئلہ مذہبی کونسل یا نانسیا میں بھی جو ۳۲۵ برس بعد حضرت عیسیٰ کے ہوئی تھی اور جس میں ایریس کے مسائل کی نسبت اعتراض کیا گیا تھا طے نہیں ہوا تھا اور کچھ اسی پر موقوف نہیں ہے کیونکہ بارسن اور مشہور معروف یونانی عالموں کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ اصل عبارت متن انجیل کی جس پر خاص اس مسئلہ کا استدلال کیا جاتا ہے الحاقی ہے پس اگر اعتقاد کی خوبی نہایت عجیب ومشکل وخلاف عقل مسائل پر اعتقاد دلانے میں ہو تو بلاشبہ عیسائیوں کا اعتقاد بہت بڑا اعتقاد متصور ہوگا۔ قبل اس کے کہ کوئی شخص عیسائی کہلائے اور اس کو عیسائیوں کے حقوق خدا کی بارگاہ میں حاصل ہوں اس کو اس مسئلہ عجیب وغریب پر پکا اعتقاد لانا چاہیے۔ تمام عیسائی یہ بات کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ مسئلہ قانون قدرت اور آئین عقل کے برخلاف ہے تاہم آنکھ بند کر کے اور عقل کو محض بیکار ومعطل چھوڑ کر نہایت اصرار وتعصب سے اس پر اعتقاد کرنا چاہیے۔ دلیل وعقل کو اس میں دخل دینا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔

دوسرا مسئلہ فدیہ کا یعنی حضرت عیسیٰ کا تمام بنی نوع انسان کے پچھلے اور حال کے اور آئندہ کے گناہوں کے عوض صلیب پر چڑھنے اور جان دینے کا ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو قدرت اور عقل دونوں کے برخلاف ہے اور یہ مسئلہ بھی ایسا مسئلہ ہے جس سے معاملات مذہبی میں آزادی رائے بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مسئلہ فدیہ کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے سبب سے انسان اپنے اعمال کا جواب دہ نہیں رہتا اور بدی اور بداخلاقی کے دروازہ کو کھول دیتا ہے کیونکہ جس قدر کثرت سے کوئی گناہ کرے گا اسی قدر زیادہ نجات دینے والے کی نیکی کا ثبوت ہوگا بقول شخصے

گناہ من از نامدے درشمار

ترا نام کے بودے آمرز گار

پس جو کوئی زیادہ گناہ کرے گا وہی شخص زیادہ رحمت کا مستحق ہوگا جو حق ایک بڑے ولی کو ہونا چاہیے اس لئے سب سے بڑا گنہگار سب سے بڑا ولی ہوگا مگر ہم ایسی رائے کو پسند نہیں کرتے اور سچے ایمانداروں کو جو وہ کسی معبود حق یا باطل پر یقین رکھتے ہوں ان کا نیکوکار ہونا لازم سمجھتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ فدیہ کے بعد بھی دوزخ بالکل خالی نہ ہوگی کیونکہ عیسائی مذہب کے موافق بھی تمام کافر جو بے شمار گروہ ہیں اور جن کے بے شمار نام ہیں سب دوزخ میں جائیں گے اور اس کے تنگ وتاریک مکانوں میں قید رہیں گے۔

ایک مسئلہ مذہب عیسوی کا جو سرنوشت کے نام سے مشہور ہے حسن معاشرت کے حق میں ویسا ہی مضرت بخش ہے۔ اگر اس مسئلہ کا معتقد نیک طبیعت اور صاف دل ہوتو بآسانی اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ازل سے اس کا نام کتاب حیات میں لکھ رکھا ہے اور اسی وجہ سے وہ خیال کرتا ہے کہ اگر اس کی برائیاں اور اس کے گناہ سمندر کے کناروں کی ریت کے برابر بھی ہو جائیں تب بھی اس کا نام صفحہ کتاب حیات سے نہ مٹا سکیں گے اور اگر وہ کمبخت بے نصیب پیچ دار اور بدخصلت خشک طبیعت عبوس صورت ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کا نام صفحہ کتاب حیات میں مندرج نہیں ہے اور اس لئے وہ اپنے قدرتی مزاج کے خراب میلان کو روکنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتا اور نیکی کی طرف رجوع کرنے کو اسے کوئی ترغیب نہیں رہتی۔

مذہب اسلام کی نسبت یہ بات بڑے اطمینان اور بھروسہ سے کہی جا سکتی ہے کہ سر ولیم میور نے جو رائے اس کی نسبت لکھی ہے وہ ٹھیٹ اسلام کے بالکل برخلاف ہے بلکہ مذہبی عقیدہ اور مذہبی معاملات میں جو آزادی رائے اسلام نے دی ہے وہ بے نظیر ہے اور شاید دنیا میں کوئی مذہب اس معاملہ میں اس سے فائق نہیں ہے۔

ہم اس مقام پر ایک مشہور و معروف فرانسیسی عالم یعنی ایم ڈی سینٹ ہلیر کی رائے نقل کرتے ہیں جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنی اس تحریر کی تائید میں صرف اپنے ہم مذہبوں ہی کی شہادت کو پیش نہیں کرتے بلکہ اور مذہب اور خصوصاً عیسائی کے فیاض اور دانشمند بے تعصب معتقدوں کی بھی شہادت پیش کر سکتے ہیں۔

مصنف موصوف نے لکھا ہے کہ ''اسلام میں کوئی بات شبہ یا قدرت کی باتوں سے بڑھ کر بطور اعجوبہ کے نہیں ہے۔ مذہب اسلام خود اس بات کے مخالف ہے کہ وہ کسی پردہ میں پوشیدہ کیا جائے اور اگر اب تک اس میں چند شبہات موجود ہیں تو اس کا الزام مذہب اسلام پر نہیں ہے کیونکہ وہ ابتدا ہی سے ایسا صاف اور سچا ہے جتنا کہ ہونا ممکن ہے۔''

اب مذہب اسلام کی آزادی رائے کا حال معاملات کی نسبت غور کرو۔ دین محمد ﷺ کی رو سے تمام مذہبی روایتوں اور حدیثوں اور حدیثوں کی نسبت ہر ایک شخص آزادانہ رائے دے سکتا ہے راویوں کی نسبت روایت کے مضمون کی نسبت نہایت آزادانہ تحقیقات اور بے تعصب رائے میں تحقیق کے بعد نامعتبر ٹھہریں نامقبول کرنے کا ہر ایک شخص کو کلیتہً اختیار حاصل ہے جو روایتیں اور حدیثیں کہ غور وفکر اور تحمل سے تحقیقات کرنے کے بعد عقل اور قدرت کے برخلاف ثابت ہوں یا اور کسی طرح موضوع قرار پائیں یا جو روایتیں اور حدیثیں بے سند ہوں ان سب کو رد کر دینے کا کلیتاً مجاز ہے۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ ''حدیث بے سند گوز شتر است'' یہ قول ایک ایسے بڑے شخص کا ہے جس کو لوگوں نے نبی سے کچھ ہی کم مان رکھا ہے۔

قرآن مجید کی نسبت بھی جس کے ہر ایک لفظ کو مسلمان وحی سے مانتے ہیں مذہب اسلام میں جس قدر آزادی حاصل ہے کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ ہم قرآن مجید کے سچ ہونے کو بھی اس کے سچ ہونے سے مانا ہے۔ ٹھیٹ مذہب اسلام کی رو سے ہر ایک شخص کو آزادی ہے کہ خود قرآن مجید کے احکام پر غور کرے اور جو ہدایت اس میں پائے اس پر عمل کرے۔ کوئی شخص کسی دوسرے کی رائے اور اجتہاد اور سمجھ کا پابند نہیں ہے۔ مذہب اسلام میں ایسی قوت کسی کو نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو خواہ مخواہ برخلاف اس کی سمجھ کے اپنی اطاعت اور اپنے اجتہاد کی پیروی پر مجبور کرے۔ ہر شخص آپ اپنے لئے مجتہد ہے۔ صحابہ جن کو ہم بعد پیغمبر کے بزرگ سمجھتے ہیں ان کی نسبت بھی اکابر مذہب اسلام کا یہ قول ہے کہ ''نحن رجال وھم رجال'' پس اس سے زیادہ اور کیا مذہبی معاملات میں آزادی رائے ہو سکتی ہے۔

مگر ہم یہودی اور عیسائی میں اس قسم کی آزادی رائے معاملات مذہبی میں نہیں دیکھتے۔ مذہب اسلام میں یہ بھی ہدایت نہیں ہے کہ اس کا جو سب سے بڑا اصول ہے یعنی خدا کے وجود اور اس کی وحدانیت کا ماننا وہ بھی اندھا دھوندی کے اعتقاد اور بے مداخلت عقل اور بے سمجھے غلامانہ طور پر تسلیم کر لیا جائے کیونکہ خود قرآن مجید میں ہے کہ اس بڑے مسئلہ کو جبر وسختی و نا سمجھی سے تسلیم کرنے کو نہیں کہتا بلکہ دلیلوں اور قدرتی نشانیوں سے اس کو سکھاتا ہے۔ قرآن مجید میں سب سے پہلے خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کو تمام قدرتی چیزوں کے وجود سے ثابت کیا ہے اور اس کے بعد اس لازوال ہستی اور ہمہ راستی پر یقین کرنے کی ہدایت کی ہے چنانچہ اس پاک کتاب میں لکھا ہے کہ

ومن اياته ان خلقكم من تراب ثم اذا انتم بشر تنتشرون.

''خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر تم چلتے پھرتے آدمی ہو۔''

ومن اياته خلق السموات والارض واختلاف السنتكم والوانكم ان فى ذلك لا يات للعلمين.

''خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم کو پیدا کیا اور تمہی میں سے تمہارے لئے جوڑا بنایا کہ اس سے تم کو چین ہو اور آپس میں تمہاری محبت وشفقت پیدا کی اسی میں ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں۔ خدا کے ہونے پر بہت سی نشانیاں ہیں''۔

ومن اياته منا مكم بالليل والنهار وابتغاؤ كم من فضله ان فى ذلك لايات لقوم يسمعون.

''خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا رات میں اور دن میں سور ہنا اور اس کی مہربانی سے رزق کا تلاش کرنا اسی میں ان لوگوں کے لئے جو بات کو سنتے یعنی سمجھتے ہیں خدا کے ہونے پر بہت سی نشانیاں ہیں۔

ومن اياته يريكم البرق خوفا و طمعا وينزل من السما فاحيابه الارض بعد موتها ان فى ذلك لايات لقوم يعقلون.

''خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے بجلی کی چمک اور کڑک کا تم کو دکھلانا جس سے تم ڈر جاتے ہو اور مینہ برسنے کے لالچ کرتے ہو اور برساتا ہے آسمان سے مینہ پھر ہری ہوئی یعنی خشک زمین کو زندہ یعنی ہرا کر دیتا ہے اس میں ان لوگوں کے لئے جو سمجھدار ہیں نشانیاں ہیں۔''

ومن اياته ان تقوم السماء.

''خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے کہ اسی کے حکم سے آسمان وزمین کھڑے ہیں۔

ومن اياته ان يرسل الرياح مبشرات وليذ يقكم من رحمته ولتجرى الفلك بامرى.

''خدا کے ہونے کی نشانیوں میں سے ہے کہ مینہ کی خوشخبری لانیوالی ہوا کو چلاتا ہے تا کہ اس کی رحمت سے تم مزہ چکھو اور اس کے حکم سے پانی سے کشتیاں چلیں۔''

الله الذى يرسل الرياح فتثير سحابا فيبسطه فى السماء كيف يشاء ويجعله كسفا فترى الودق يخرج من خلاله.

''خدا وہ ہے کہ ہوا چلاتا ہے پھر وہ بادلوں کو ہانک لاتی ہے پھر جس طرح چاہتا ہے ان میں پھیلا دیتا ہے اور پھر بادلوں

کادل کر دیتا ہے پھران میں سے بوندیں ٹپکاتا ہے۔"

"الله الذی خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ضعف قوة ثم جعل من بعد قوة ضعفا وشیبة. (سورہ روم).

"خدا وہ ہے جس نے تم کو پہلے نہایت ہیچ ناتواں پیدا کیا پھر تم کو ناتوانی سے قوی کیا پھر قوی سے ضعیف کر دیا اور بڑھاپے سے تمہارے بال بھی سفید کر دیئے۔"

الم تر ان الله انزل من السماء ماء فاخرجنا به ثمرات مختلفا الوانها ومن الجبال جدد بیض وحمر مختلف الوانها وغرابیب سوده ومن الناس والدواب والانعام مختلف الوانه کذلک. (سورہ فاطر)

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے رنگ برنگ کے پھل پیدا کئے اور پہاڑوں میں سفید وسرخ اور سیاہ بھنگ نہیں نکالیں اور اسی طرح آدمیوں اور جانوروں اور چوپاؤں میں طرح بطرح کے رنگ بنائے۔"

ان فی السموات والارض لا یات للمومنین وفی خلقکم وما یبث من دابة ایات لقوم یوقنون واختلاف اللیل والنهار وما انزل الله من السماء من رزق فاحیا به الارض بعده موتها وتصریف الریاح ایات لقوم یعقلون. تلک ایات الله نتلوها علیک بالحق فبای حدیث بعد الله وایاته یومنون. (سورة جاثیه)

"آسمانوں میں اور زمین میں نشانیاں ہیں اور تمہارے پیدا کرنے میں اور جانوروں کو بہتایت سے پھیلانے میں یقین والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں اور رات کے جانے اور دن کے آنے اور ان کے بڑا ہونے اور چھوٹا ہونے اور آسمان سے مینہ کے برسنے پھر مردہ زمین کے زندہ کرنے اور ہوا کے ادل بدل کرنے میں سمجھ دار لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں یہ اللہ کی نشانیاں ہیں جو ٹھیک تجھ کو بتلائی ہیں پھر کون سی بات ہے جس پر اللہ کی اور اس کی نشانیوں کے بعد ایمان لائیں گے۔"

"هو الذی انزل من السماء ماء فاخرجنا به نبات کل شئی فاخرجنا منه خضرا نخرج منه حبا متراکبا ومن النخل من طلعها قنوان دانیة وجنات من اعناب والزیتون والرمان متشبها وغیر متشابه انظروا الی ثمره اذا ثمرو ینعه ان فی ذلکم لا یات لقوم یومنون. (سورة انعام)

"خدا وہ ہے جو برساتا ہے آسمان سے پانی پھر پانی کے سبب ہم نے تمام اگنے والی چیزیں پائیں۔ پھر ہم نے اس سے سبز پودے نکالے جس میں سے دانوں کے گچھے نکلتے ہیں اور کھجور کے درختوں میں ان کی پھننگ میں سے پھل کے بوجھ سے زمین کو جھکے ہوئے گابھے نکلتے اور انگور اور زیتونوں اور انار کے باغ ایک سے اور الگ طرح کے اگتے ہیں۔ دیکھو اس کے پھل کو جب کہ وہ پھلے اور پکے۔ اس میں بھی بلا شبہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہیں خدا کے ہونے کی نشانیاں ہیں۔"

هو الذی من الارض وجعل فیها رواسی وانهارا ومن کل الثمرات فیها جعل زوجین اثنین یغشی

الیل النہار ان فی ذلک لایات لقوم یتفکرون. (سورۂ رعد)

''اللہ وہ ہے جس نے زمین کو ایسا بڑا بنایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور اس میں تمام پھلوں کو دو دو بنایا۔ رات سے دن کو چھپایا اس میں بھی بے شک ان لوگوں کے لئے جو غور کرتے ہیں خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں۔''

''وفی الارض قطع متجاورات و جنات من اعناب وزرع ونخیل صنوان وغیر صنوان یسقی بماء واحد ونفضل بعضها علی بعض فی الا کل ان فی ذلک لایات لقوم یعقلون. (سورۂ رعد)

''اور زمین کے مختلف ٹکڑے آپس میں ملے ہوئے ہیں اور انگور کے باغ ہیں کھیت ہیں اور کھجور کے درخت ہیں۔ کسی کی بہت گھنی شاخیں ہیں اور کسی کی چھدری جو ایک سے پانی سے سیراب ہوتے ہیں اور کھانے میں ایک دوسرے سے مزیدار ہیں اس میں بھی بے شک ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں۔''

الذی جعل لکم الارض مهد او سلک لکم فیها سبلا وانزل من السماء ما ء فاخرجنا به ازواجا من نبات شتی کلوا وا ارعوا انعامکم ان فی ذلک لایات لاولی النهی. (سورة طه)

''وہ خدا ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو پنگوڑھا بنایا اور تمہارے لئے اس میں رستے جاری کئے اور آسمان سے مینہ برسایا پھر ہم نے پانی کے سبب مختلف اگنے والی چیزوں کے کے جوڑے نکالے۔ کھاؤ اور اپنے جانوروں کو چراؤ اس میں بھی عقل والوں کے لئے خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں۔''

والانعام خلقها لکم فیها دف و منافع ومنها تاکلون ولکم فیها جمال حین تریحون وحین تسرحون وتحمل اثالکم الی بلد لم تکونوا بالغیه الا بشق الا نفس. (سورة نحل)

''اور تمہارے لئے مویشی کو پیدا کیا ان میں گرم ہونے کا سامان اور بہت سے منافع ہیں اور ان ہی میں سے تم کھاتے ہو اور تم کو ان سے زیبائش ہے جبکہ شام کو چرا کر لاتے ہو اور چرانے کو لے جاتے ہو اور تمہارا بوجھ کسی شہر کو اٹھا لے جاتے ہیں جہاں تم بغیر ادھ موئے ہوئے نہ پہنچ سکتے تھے۔''

وان لکم فی الانعام لعبرة نسقیکم مما فی بطونها من بین فرث ودم لبنا خالصا سائغا للشاربین. (سوره نحل)

اور تمہارے لئے مویشی میں ایک بڑی نصیحت ہے۔ ہم تم کو وہ چیز پلاتے ہیں جو ان کے پیٹ میں گوبر و لہو کے سبب بنتی ہے یعنی اچھا خاصا دودھ جو پینے والوں کے حلق میں آسانی سے اتر جاتا ہے اور خدا کے ہونے کی نشانیوں میں ہیں۔

ومن ایة الجوار فی البحر کالا علام ان یشاء یسکن الریح فیظللن رواکد علی ظهره ان فی ذلک لا یات لکل صبار شکور. (سوره شوری)

''پہاڑوں کی مانند جہاز سمندر میں چلنے والے۔ اگر خدا چاہے ہوا بند کر دے وہ سمندر کی پیٹھ پر ٹھہر جائیں۔ اس میں بھی بے شک ان لوگوں کے لئے جو صابر و شاکر ہیں خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں۔''

والله اخرجکم من بطون امهاتکم لا تعلمون شیئا وجعل لکم السمع والابصار والافده لعلکم تشکرون الم یروالی الطیر مسخرات فی جو السماء ما یمسکهن الا الله ان فی ذلک لا یات

لقوم یومنون. (سورہ نحل)

''اوراللہ نے تم کوتمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔تم کچھ نہیں جانتے تھے بنایا تمہارے لئے سنتا تاکہ تم شکر کرو۔کیا تم پرندوں کو نہیں دیکھتے جوادھر آسمان کی وسعت میں ہیں کون ان کو تھامے ہوئے ہے بجز خدا کے۔اس میں بھی بے شک ان لوگوں کو جو ایمان والے ہیں خدا کے ہونے پر نشانیاں ہیں۔''

اگر چند آیتوں کے مضامین کو مختصراً ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس خوبی اور فصاحت وبلاغت سے خدا کے ہونے پر قدرتی چیزوں سے استدلال کیا گیا ہے۔دنیا کو دیکھو کہ وہ کیسی عجیب چیز ہے۔تاروں بھرا آسمان' اندھیرے کو اجالا کرنے والا سورج' گھٹنے بڑھنے والا' اندھیری رات میں چاندی کے پترے بچھا دینے والا چاند' دریا کی موجوں اور بے نشان رستوں میں رستہ بتانے والے ستارے' خدا کی طرح بہ طرح کی صنعتیں کھلی ہوئی آنکھوں والوں کے ہونے کی بڑی نشانیاں ہیں۔یہ زمین خدا نے تمہارے لئے بنائی۔اس میں ہر طرف کو جانے آنے کے رستہ رکھے۔تم اس پر رہتے ہو اور ادھر ادھر پھرتے ہو بادلوں کے بے انتہا دل اس نیلے گھیرے کے سینہ میں پیدا ہوتے ہیں۔کھڑے رہتے ہیں' ڈولتے پھرتے ہیں غائب ہو جاتے ہیں کہاں سے آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔یہ پہاڑوں کی صورت کے جگر بادل روئی کے پھوئے کی طرح ہوا کے جھوکے سے اڑنے پھرنے والے دل کے دل موسلا دھار مینہ برساتے ہیں پژمردہ زمین کو سرسبز کرتے ہیں۔گھاس اگتی ہے اونچے اونچے کھجور کے درخت پتوں کی خوشنما چھتریوں سمیت اگتے ہیں جن کے گرد کھجوروں کے گچھے لٹکتے ہیں کیا یہ اس کے پیدا کرنے والے کے ہونے کی نشانیاں نہیں ہیں۔ تمہارے مویشی بھی کیا عجیب نہیں ہے تمہارے لئے گھاس کو دودھ بنا دیتی ہے۔اس کے اون سے تم اپنی پوشاکیں بناتے ہو۔دن بھر جنگل میں چرتی ہیں شام کو صف باندھ کر تمہارے گھر آتی ہیں۔پھر ان بڑے بڑے پہاڑوں یعنی جہازوں کو دیکھو جو اپنے کپڑے کے پر پھیلائے سمندر کی لہروں پر دوڑتے اڑتے پڑے پھرتے ہیں۔پر پھیلاتے ہی جست کرتے ہوئے جاتے ہیں ہوا ان کو لئے پھرتی ہے مگر جب خدا نے ہوا بند کر لی تو وہ مردہ کی طرح پڑے ہیں پھر ہل تک نہیں سکتے کیا یہ ایک کرشمہ نہیں ہے۔تم کیا کرشمہ چاہتے ہو تم خود کیا کچھ کرشمہ نہیں ہو۔چند برس پہلے تمہارا وجود نہ تھا۔تم کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا۔چھوٹے سے بڑا کیا۔خوبصورت بنایا' طاقت تم کو دی' خیالات کی قوت تم میں رکھی' تم کو ایک دوسرے پر رحم آتا ہے اگر تم کو ایسا نہ بناتا تو تمہارا کیا حال ہوتا۔پھر تمہارے بال سفید ہوتے ہیں۔تمہاری طاقت گھٹ جاتی ہے۔ناتوان ہو جاتے ہو۔پھر تمہارا وجود نہیں رہتا۔یہ سب چیزیں اس کے بنانے والے ہونے کی نشانیاں ہیں۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتر یست معرفت کرو گار

تمام قرآن اسی قسم کے قدرتی مضامین سے بھرا ہوا ہے جن سے اس علۃ العلل یعنی خدا کے ہونے پر استدلال کیا ہے۔پھر خدا کی وحدانیت کی دلیلیں عام فہم طریقہ پر بیان کی ہیں اور یوں فرمایا ہے کہ

امن خلق السموات والارض و انزل لکم من السماء ماء فانبتنا به حدائق ذات بهجة ما کان لکم ان تنبتوا شجر هاء اله مع الله بل هم قوم یعدلون. امن جعل الارض قرارًا وجعل خلالها انهارا وجعل لها رواسی وجعل بین البحرین حا جزا اله مع الله بل اکثرهم لا یعلمون. (سورة نمل)

''کس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور کس نے تمہارے لئے آسمان پر سے مینہ برسایا۔پھر ہم نے اس سے فرحت

بخش باغ اگائے تم ان کے درخت نہیں اگا سکتے تھے۔کیا خدا کے ساتھ کوئی اور خدا ہے مگر کافر وہ لوگ ہیں جو سیدھی راہ سے پھر جاتے ہیں۔کس نے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا اور کس نے اس میں دریا بنائے اور کس نے زمین کے پہاڑ بنائے اور کس نے دو سمندروں میں جزیرہ بنایا۔کیا خدا کے ساتھ کوئی اور خدا ہے مگر بہت کافروں میں سے نہیں جانتے اگر آسمان و زمین میں دو خدا ہوتے تو دونوں برباد ہو جاتے۔"

ہر گیا ہے کہ از زمیں روید وحدہ لا شریک لہ گوید

پس امور مذہبی میں جیسی آزادی رائے اسلام میں ہے اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔

یہ کہنا کہ اسلام کے نہ قبول کرنے کی لازمی سزا تلوار ہے مذہب اسلام پر منجملہ ان سخت اور جھوٹے الزاموں کے ایک الزام ہے جو غیر مذہب والوں نے ناانصافی سے اس پر کئے ہیں یا وہ مذہب اسلام سے ناواقف ہیں یا دیدہ و دانستہ حق پوشی کی نظر سے باندھے ہیں۔اسلام صرف دلی یقین اور قلبی تصدیق پر منحصر ہے اور دلی یقین جبر و زبردستی سے پیدا ہو ہی نہیں ہوسکتا پس کیونکر یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ جس چیز سے وہ بات پیدا ہی نہیں ہوسکتی جس کی ضرورت اسلام کے لئے ہے اس کے کرنے کو خود اسلام ہی ہدایت کرے۔جو لوگ مذہب اسلام سے کچھ بھی واقفیت رکھتے ہیں اور خدا کے کلام کو ایک ادنیٰ توجہ سے دیکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خیال کہ اسلام زبردستی و تلوار کے زور سے قبول کروایا جاتا ہے قرآن مجید کے صاف اور روشن حکم کے بالکل برخلاف ہے جہاں خدا نے فرمایا ہے کہ

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لا انفصام لھا واللہ سمیع علیھم۔ (سورۃ البقرۃ: ۲۵۷)

"دین پر لانے میں کچھ دباؤ ڈالنا نہیں ہے کیونکہ سیدھی راہ یعنی اسلام گمراہی یعنی کفر سے علانیہ کھل گئی ہے پھر جو کوئی بتوں کا منکر ہو اور اللہ پر ایمان لائے تو بے شک اس نے نہایت مضبوط کنگورہ پکڑ لیا ہے جو لوٹنے کے قابل نہیں ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

ایک اور جگہ خدا نے فرمایا ہے کہ

ولو شاء ربک لا من من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین وما کان لنفس ان توس الا باذن اللہ ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون۔ (سورۃ یونس: ۹۹ — ۱۰۰)

"اگر چاہتا اللہ تیرا پروردگار تو سب جو زمین میں ہیں اکٹھے ایمان لے آتے پھر کیا تو دباؤ ڈال سکتا ہے لوگوں پر تاکہ مسلمان ہو جائیں (یعنی دباؤ سے کوئی مسلمان نہیں ہوتا) کسی شخص کو یہ بات ممکن نہیں ہے کہ بغیر حکم خدا کے ایمان لائے اور اللہ ان لوگوں پر ناپاکی ڈالتا ہے جو نہیں سمجھتے۔"

جس اصول پر کہ حضرت موسیٰ نے کافروں پر تلوار کھینچی تھی اور یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک خدا کے حکم سے وہ تلوار کھینچی گئی تھی کہ تمام کافروں اور بت پرستوں کو بغیر کسی استثنا کے قتل و غارت و نیست و نابود کر دیں۔اس اصول پر مذہب اسلام نے کبھی تلوار کو میان سے نہیں نکالا۔اس نے کبھی تمام کافروں اور بت پرستوں کے نیست و نابود کرنے کا یا کسی کو تلوار کی دھار سے مجبور کر کے اسلام قبول کروانے کا ارادہ نہیں کیا۔ہاں بلاشبہ اسلام نے بھی تلوار کو نکالا مگر دوسرے مقصد سے یعنی خدا پرستوں کے امن اور ان کی

جان و مال کی حفاظت اوران کوخدا پرستی کا موقع ملنے کواور یہ ایک ایسا منصفانہ اصول ہے جس پر کوئی شخص کسی قسم کا الزم نہیں لگا سکتا۔

اسلام میں سب سے بڑا مقصد جیسا اس لازوال ہستی پر خود یقین لانا ہے ویسا ہی اس کے وجود اور اس کی وحدانیت کا علی العموم مشتہر کرنا ہے شروع اسلام کے زمانہ کے مسلمانوں پر بہت بڑا فرض تھا اور حال کے زمانہ کے مسلمانوں پر بھی بقدر اس حاجت اور ضرورت کے جواب باقی ہے فرض ہے کہ کافروں میں اور کافروں کے ملک میں جائیں اور ایسے خدائے واحد کے وجود کا یقین جو دکھائی نہیں دیتا اپنے وعظ ونصیحت سے لوگوں کے دلوں میں بٹھلا دیں۔ جن ملکوں میں اس مقصد کے ادا کرنے میں کوئی مانع ومزاحم نہیں ہے اس ملک پر اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت نہیں دی مگر جب کافر خدا کے نام کی منادی کے مانع ہوں اور خدا پرستوں کو جان و مال کے امن سے نہ رہنے دیں جیسے کہ مکہ کے کافروں نے کیا اور پھر جہاں گئے وہ بھی تعاقب میں دوڑے اس وقت بلاشبہ اپنا بچاؤ کرنے کا اور خدا کے نام کو بلند کرنے کی غرض سے اسلام نے تلوار نکالنے کی اجازت دی ہے مگر اسی وقت تک جہاں تک کہ یہ مقصد حاصل ہو جائے تاکہ مسلمانوں کو جان و مال کی حفاظت ہو اور بذریعہ وعظ وتلقین و پند ونصائح کے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال لوگوں کے دل میں بٹھلا دیں تاکہ اسی واحد حقیقی کی پرستش دنیا میں جاری ہو۔ مسلمان کافروں میں بہ امن وامان رہیں اور اپنے چال چلن اور عادت وعبادت اور اخلاق محمدی سے خود اپنے تئیں مجسم اسلام بنائیں تاکہ کافر نور اسلام کو اس مجسم اسلام میں دیکھیں اور اسلام پر دل سے یقین لائیں۔

ہمارے اس قول کی تصدیق کہ وہ تلوار صرف اسی مقصد کے حاصل ہونے تک نکالی جاتی ہے نہ کافروں کے زبردستی مسلمان ہونے کے مقصد سے وہ اس بات سے ہوتی ہے کہ بمجرد حاصل ہونے اس مقصد کے تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے گوکہ ایک کافر مسلمان نہ ہوا ہو۔

یہ مقصد یعنی یہ کہ مسلمان امن سے رہیں اور خدائے واحد کی پرستش کیا کریں اور خدا کا نام لوگوں میں بلند کریں اور اپنے چال چلن اور عادت وعبادت واخلاق ومحبت وہمدردی سے اسلام کی مجسم صورت لوگوں کو دکھلا دیں تین طرح سے حاصل ہوتا ہے یا یہ کہ ایک مذہب ہو جائے اور وہاں کے لوگ مسلمان ہو جائیں جیسا کہ مدینہ میں ہوا۔

یا یہ کہ صلح رہے یعنی یہ کہ کفار ادائے فرائض مذہبی سے معترض نہ ہوں جیسے کہ ابتدا مکہ میں تھا یا جن مسلمانوں نے حبشہ میں ہجرت کی تھی ان کا حال تھا یا کافر لڑائی کی حالت میں مسلمانوں کو ملک میں رہنے اور آمد ورفت کرنے اور ان کی جان و مال کی حفاظت اور ادائے فرائض مذہبی سے معترض نہ ہونے پر صلح کر لیں۔ یا یہ کہ ملک فتح اور کفار مغلوب ہو جائیں تاکہ انکو طاقت تعرض کی مسلمانوں سے ادائے فرائض مذہبی اور اعلائے کلمۃ اللہ کی نہ رہے۔

ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت سے مقصد حاصل ہونے کے بعد فوراً تلوار میان میں رکھ لی جاتی ہے گوکہ ایک کافر بھی مسلمان نہ ہوا ہو اور اگر پچھلے دونوں طریقوں میں سے کسی ایک طریقہ میں امن قائم ہوا ہو تو کسی کو کسی کی مذہبی رسومات میں دست اندازی کا اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ہر شخص کو آزادی رہتی ہے کہ بغیر اس کے کوئی شخص اس کو ایذا پہنچائے اپنے مذہب کی تمام رسومات کو ادا کرے۔

اس بیان سے ان مصنفوں کی بھی سخت غلطی صاف صاف ظاہر ہوتی ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ ”اسلام میں دوسرے مذہب کو آزادی سے رہنے دینا مطلق نہیں ہے۔“ ہاں ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ مسلمان فتح مندوں میں سے بعضوں نے نہایت

بے رحمی کی اور دوسرے مذہب کی آزادی کو برباد کر دیا مگر مذہب اسلام کا اندازہ ان کے افعال سے نہ کرنا چاہیے بلکہ ہم کو یہ بات تحقیق کرنی چاہیے کہ آیا انہوں نے مذہب اسلام کے مطابق عمل کیا یا نہیں اور اس وقت ہم کو صاف یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ ان کے افعال مذہب اسلام کے بالکل برخلاف تھے مگر اسی کے ساتھ ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمان فتح مند جو اپنے مذہب کے بھی پابند تھے دوسرے مذہب کی آزادی میں خلل انداز نہ تھے اور اپنی تمام رعایا کو بلحاظ قوم مذہب کے ہر طرح کا امن اور آزادی بخشتے تھے تاریخ سے ہم کو بے شمار مثالیں مسلمان فتح مندوں کی دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھنے کی ملتی ہیں اور ہم اس مقام پر چند رایوں کو نقل کرتے ہیں جو اس باب میں عیسائی مصنفوں نے لکھی ہیں اور جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھنا اسلام کی خاصیت میں سے ہے۔

چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں ایک عیسائی مصنف نے جس کی ذات سے بہت کم توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اسلام کا طرفدار ہو اسپین کے علم تواریخ پر ایک آرٹیکل لکھا ہے اس نے اس معاملہ میں لکھا ہے کہ ''اسپین کے بنی امیہ خلفاء کی حکومت کی ایک مشہور و معروف بات قابل بیان کے ہے کیونکہ اس سے اسپین کے ہم عصر (یعنی عیسائی) اور پچھلے مسلمان بادشاہوں کے مقابلہ میں بلکہ اس انیسویں صدی کے زمانہ تک ان کے بادشاہوں کی بڑی عمدگی پائی جاتی ہے یعنی ان کا عام طور سے دوسرے مذہب کو مذہبی معاملات میں آزادی کا دینا۔''

گاڈ فری ہگنز صاحب نے اس معاملہ کی نسبت یہ لکھا ہے کہ ''کوئی بات ایسی عام نہیں ہے جیسا کہ عیسائی پادریوں کی زبانی مذہب اسلام کی مذمت اس وجہ سے سننے میں آتی ہے کہ اس میں تعصب زیادہ ہے اور اس میں دوسرے مذہب کو آزادی نہیں ہے۔ یہ عجیب زعم اور محض ریا کاری ہے۔ وہ کون تھا (عیسائی) جس نے مور مسلمان باشندگان اسپین کو اسپین سے بایں وجہ جلاوطن کر دیا تھا کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے اور وہ کون تھا (عیسائی) جس نے میکسیکو اور پیرو کے لاکھوں باشندوں کو قتل کیا تھا اور ان سب کو بطور غلام کے دے دیا تھا اس وجہ سے کہ وہ عیسائی نہ تھے۔ مسلمانوں نے بمقابلہ اس کے یونان میں کیا کیا۔ کئی صدیوں سے عیسائی امن و امان کے ساتھ اپنے ملکیت پر قابض چلے آتے ہیں اور ان کے مذہب' اس کے پادریوں ان کے بشپ' ان کے بزرگوں' ان کے گرجاؤں کی نسبت دست اندازی نہیں کی گئی ہے۔ جو لڑائی بالفعل (یعنی بزمانہ تحریر کتاب) یونانیوں اور ترکوں میں ہو رہی ہے وہ بہ نسبت اس لڑائی کے جو حال میں دیمرارا کے حبشیوں اور انگریزوں میں ہوئی تھی کچھ زیادہ مذہب کی وجہ سے نہیں ہے۔ یونانی اور حبشی اپنے فتح مندوں کی اطاعت سے آزاد ہوا چاہتے ہیں اور ان کا ایسا کرنا واجب ہے۔ جب کبھی خلیفہ فتح یاب ہوتے تھے اور وہاں کے باشندے مسلمان ہو جاتے تھے تو فوراً ان کا رتبہ بالکل فتح مندوں کے برابر ہو جاتا تھا۔ ایک نہایت دانشمند مگر غیر معتقد عالم نے سراسین یعنی مسلمانوں کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ ''وہ کسی شخص کو ایذا نہیں دیتے تھے اور یہودی اور عیسائی سب ان میں خوش و خرم تھے۔''

''لیکن اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ مور اس وجہ سے جلاوطن کئے گئے تھے کہ وہ عیسائی مذہب قبول نہیں کرتے تھے مگر مجھ کو گمان ہے کہ اس کا سبب اور ہی تھا یعنی میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اپنی دلیلوں سے عیسائیوں پر اس قدر غالب آ گئے تھے کہ نادان عیسائی ماننگ یعنی دیندار سمجھتے تھے کہ ان کی دلیلوں کا جواب صرف مذہبی عدالت سے سزا دینا اور تلوار سے ہو سکتا ہے اور مجھ کو کچھ شبہ نہیں ہے کہ جہاں تک ان کی ناقص قوت جواب دینے کے باب میں تھی وہاں تک ان کا یہ خیال صحیح تھا۔ جن ملکوں کو خلیفہ فتح کرتے تھے وہاں کے غریب باشندے خواہ یونانی' ایرانی' اسپین خواہ ہندو قتل نہیں کئے جاتے تھے جیسا کہ عیسائیوں نے بیان کیا ہے بلکہ فتح ہوتے ہی ...

سب بہ امن وامان اپنی ملکیت اوراپنے مذہب پر قابض چھوڑ دیئے جاتے تھے اوراس پچھلے حق کی بابت ایک محصول[1] دیتے ہیں جو اس قدر خفیف ہوتا ہے کہ کسی کو گراں نہیں معلوم ہوتا۔ خلفا کی تمام تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں مل سکتی جو ایسی رسوائی کا باعث ہو جیسے کہ (عیسائیوں میں) مذہبی عدالت سے سزا دینا تھا اور نہ ایک مثال بھی اس بات کی پائی جاتی ہے کہ کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑ نے کے سبب چلا گیا ہو۔ نہ مجھ کو یہ یقین ہے کہ زمانہ امن میں صرف اس وجہ سے قتل کیا گیا ہو کہ اس نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ پچھلے مسلمان فتح مندوں نے اپنی فتوحات میں بڑی بڑی بے رحمیاں کی ہیں جن کا الزام عیسائی مصنفوں نے بھی جدوجہد سے مذہب اسلام پر لگایا ہے مگر یہ واجب نہیں ہے درحقیقت مذہبی تعصب کے باعث لڑائی کی خرابیاں زیادہ ہو گئیں مگر اس باب میں مسلمان فتح مند کچھ عیسائیوں سے زیادہ بدتر نہ تھے۔

اس کے بعد مسٹر گاڈفری ہگنز صاحب نہایت شائستہ ملکوں میں بھی دوسرے مذہب کی آزادی کے باب میں شبہ کرتے ہیں اور ایک دلچسپ تقریر لکھتے ہیں کہ ''عیسائی پادریوں کی کوشش کو اگرچہ بہ حسب ظاہر بہت بڑی وسعت دی گئی ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔'' وہ لکھتے ہیں کہ ''مجھ کو اس امر کی نسبت کسی قدر شبہ ہے کہ اس شائستہ زمانہ میں بھی جیسا کہ وہ مشہور ہے اس وقت کیا ہوا گر سلطان روم (جس طرح کہ ہمارے پادریوں نے مسٹر ڈریمنڈ نامی کو اپنے خاص مذہب کی تلقین کے لئے جنیوا میں بھیجا تھا) اپنے ایک نہایت عالم مفتی کو لندن میں ایک مسجد بنانے اور قرآن کا وعظ کرنے کو بھیجے۔ مجھ کو اندیشہ ہے اور میرا یہ اندیشہ معقول وجہ پر مبنی ہے کہ اس کے سبب سے جو آگ ۸۰ء میں یا حال میں بمقام برمنگھم مشتعل ہوئی تھی وہ پھر پادریوں کی بدولت بھڑک اٹھے اور ہمارے وزیر اس کا جواب ایک ایڈمرل یعنی امیر البحر کے منہ سے دیں۔ جس کی یہ رائے ہوگی کہ قسطنطنیہ پر گولہ اندازی کرنا ممکن ہوگا۔''

مگر مجھ کو مسٹر ہگنز کی رائے کے ساتھ ایک بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ لندن کی شائستگی مسٹر ہگنز کے زمانہ سے اب ترقی پر ہے۔ جب میں لندن میں تھا تو ایک شخص مسمی ڈاکٹر پرفلٹ نے عین لندن میں ایک مکان لیا تھا اور ہر اتوار کو اس مکان میں برخلاف مذہب عیسائی کے لکچر دیا کرتا تھا اور جو لوگ چاہتے تھے وہاں جا کر اس کا لکچر سنتے تھے۔ میں بھی کئی دفعہ اس کا لکچر سننے گیا تھا اور ایک دفعہ اس نے قرآن اور اسلام پر بھی لکچر دیا تھا۔ اچھا لکچر تھا مگر جو عام غلطیاں قرآن اور اسلام کی نسبت انگریزوں میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اس کے لکچر میں بھی تھیں۔ میں نے سنا کہ پادریوں نے اس کا لکچر بند کرنے میں بڑی کوشش کی مگر پارلیمنٹ سے کچھ کامیابی نہ ہوئی۔

جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب مسمی اپالوجی میں لکھا ہے کہ ''نائیسا کی کونسل میں یہ امر واقع ہوا تھا کہ کانسٹنٹائین نے پادریوں کی جماعت کو وہ اختیار دیا تھا کہ جس نے نہایت ہیبت ناک نتیجے پیدا ہونے تھے جن کا خلاصہ ان چند سطروں میں موجود ہے

---

[1] مسٹر ہگنز نے یہاں غلطی کی ہے۔ کافروں سے جو مفتوح ہو جاتے ہیں اس معاوضہ میں کہ ان کو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا گیا ہے جزیہ نہیں لیا جاتا بلکہ اس وجہ سے کہ مثل مسلمانوں کے بلا مزد یا قلیل مزد پر فوجی خدمت پر مجبور نہیں کئے جاتے اور گورنمنٹ کی بغرض قائم رکھنے حکومت اسلامی اور بحال رہنے امن وامان کے کوئی خدمت بجا نہیں لاتے بلکہ گورنمنٹ ان کے حفظ وامن کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کے معاوضہ میں ان سے جزیہ لیا جاتا ہے اور یہ بھی لازمی نہیں ہے بلکہ خلیفہ کو بہ نظر مصلحت ملکی بالکل اختیار ہے چاہے لے چاہے نہ لے پس یہ امر سیاست مدن سے متعلق ہے نہ مذہب سے۔ مسلمانوں پر اس سے بہت زیادہ سخت محصول ہے یعنی ہر سال چالیسواں حصہ اپنے مال کا۔

خونریزی اور بربادی ان احمقانہ نو جہادوں کی جو عیسائیوں نے قریب دو سو برس کے عرصہ تک ترکوں پر کئے تھے اور جس میں کئی لاکھ آدمی ہلاک ہوئے قتل کرنا ان شخصوں کا جو اس عقیدہ کو نہیں مانتے تھے کہ انسان کا دوبارہ اصطباغ ہونا چاہیے لوتھر کے پیروؤں اور رومن کیتھولک مذہب والوں کا دریائے رائن سے لے کر انتہائے شمال تک قتل ہونا وہ قتل جس کا حکم ہنری ہشتم اور اس کی بیٹی میری نے دیا۔فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کا قتل ہونا۔ چالیس برس تک اور بہت ہی خونریزیوں کا ہونا' فرانسس اول کے عہد سے ہنری چہارم کے پیرس میں داخل ہونے تک ۔ عدالت مذہبی کے حکم سے قتل کا ہونا جو اب تک قابل نفرین ہے کیونکہ وہ عدالت کی رائے سے ہوا تھا۔علاوہ اس کے اور بے انتہا بدعتوں کا اور اس بیس برس کی خرابیوں کا تو کچھ ذکر ہی نہیں ہے جب کہ پوپ پوپ کے مقابلہ میں بشپ بشپ کے مقابلہ میں تھے ۔ زہر خورانی اور قتل کی وارداتوں کا ہونا اور تیرہ چودہ پوپ کی بے رحم لوٹ اور گستاخانہ دعویٰ جو ہر قسم کے گناہ اور عیب اور بدکاری میں جو ایک نیرو دیا ایک کیلیگیولا سے نہایت فوق لے گئے تھے آخر کار اس خوفناک فہرست کا خاتمہ ہونے کے لئے ایک کروڑ بیس لاکھ نئی دنیا کے باشندوں کا صلیب ہاتھ میں لئے قتل ہونا۔ یقیناً یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ ایک ایسا مکروہ اور قریباً ایک غیر منقطع سلسلہ مذہبی لڑائیوں کا چودہ سو برس تک سوائے عیسائیوں کے اور کہیں ہرگز جاری نہیں رہا اور جن قوموں کی نسبت بت پرست ہونے کا طعن کیا جاتا ہے ان میں سے کسی قوم نے ایک قطرہ خون کا بھی مذہبی دلائل کی بنا پر نہیں بہایا۔''

مشہور و معروف مورخ مسٹر گن جو زمانہ حال کے مورخوں میں سب سے بڑا مورخ ہے اور جس کی سند نہایت معتبر گنی جاتی ہے اس امر کی نسبت اپنی کتاب میں یہ لکھتا ہے کہ ''مسلمانوں کی لڑائیوں کو ان کے پیغمبر نے مقدس قرار دیا تھا مگر آنحضرتؐ نے جو اپنی حیات میں مختلف نصیحتیں کیں اور نظیریں قائم کیں ان سے خلیفاؤں نے دوسرں مذہب کو آزادی دینے کی نصیحت پائی جس سے اسلام کے غیر معتقدوں کی مخالفت رفع ہو جائے ۔ ملک عرب حضرت محمدؐ کے خدا کی عبادت گاہ اور اس کا مملوک تھا مگر وہ دنیا کی قوموں کی محبت سے اور بہت کم رشک سے دیکھتا تھا۔ بہت سے دیوتاؤں کو ماننے والے اور بت پرست جو ان کو نہ مانتے تھے شرعاً نیست و نابود گئے جا سکتے تھے مگر انصاف کے فرائض سے نہایت عاقلانہ تدبیر اختیار کی گئی۔ ہندوستان کے مسلمان فتح مندوں نے بعض کام دوسرے مذہب کی آزادی کے برخلاف کرنے کے بعد اس مرتاض اور آباد ملک کے مندروں کو چھوڑ دیا ہے۔حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے معتقدوں سے بہ متانت یہ استدعا کی گئی ہے کہ وہ حضرت محمدؐ کے الہام کو جو زیادہ تر کامل ہے قبول کریں لیکن اگر انہوں نے نہ مانا اور ایک معتدل خراج یعنی جزیہ دینا قبول کر لیا وہ اپنے عقیدہ میں اور مذہبی پرستش میں آزادی کے مستحق تھے۔

ایک مصنف نے اپنے ایک آرٹیکل میں جو ایسٹ اور ویسٹ اخبار میں چھپا تھا اور جس کا عنوان یہ تھا کہ'' اسلام بطور ایک ملکی نظام کے ہے۔'' اسمیں آزادی مذہب کی نسبت یہ لکھا ہے کہ'' صرف حضرت محمدؐ ہی ایسے بانی مذہب کے تھے جو ایک دنیوی بادشاہ بھی تھے اور سپاہی تھے اور یہ دونوں قوتیں خاص کر اس لئے تھیں کہ تشدد اور الوالعزی کو روکا جائے اور الوالعزی کی جانب وہ مائل تھے اور تلوار ان کے اختیار میں تھی اس لئے خیال ہوتا ہے کہ جب کہ انہوں نے مذہب کو دنیوی حکومت کا وسیلہ قرار دیا اور اپنے معتقدوں کی طبیعتوں پر وہ غلبہ حاصل کیا جس کے سبب سے وہ لوگ شرع اور حق اسی بات کو سمجھتے تھے جو آپ جاری کرنا چاہتے تھے تو چاہیے کہ ان کا مجموعہ احکام شرعی اور تمام مجموعوں سے مختلف ہو بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ ان احکام انصاف سے بھی مختلف ہو جو ہر ایک انسان کی طبیعت میں پڑے ہوئے ہیں اب اگر ہم یہ بات دیکھیں کہ آنحضرت کے احکام کا مجموعہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف یہ دیکھیں کہ حضرت محمد نے قومی معاملات میں حق رسانی اور فتح کرنے میں رحم اور حکمرانی کرنے میں اعتدال اور سب سے مقدم

دوسرے مذہب کی عدم مزاحمت کے احکام قرار دیئے ہیں تو ہم کو یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ آنحضرت ﷺ اپنے ہم جنسوں میں ایسی ہی تعظیم کا استحقاق رکھتے تھے۔''

پھر اسی مصنف نے اسی آرٹیکل میں دوسرے مقام پر لکھا ہے کہ ''اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی کسی کو ایذا نہیں پہنچائی کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو سزا دینے کے لئے قائم نہیں کی اور کبھی اسلام نے لوگوں کے مذہب کو بجبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا۔ ہاں اس نے اپنے مسائل کا جاری ہونا چاہا مگر اس کو جبراً جاری نہیں کیا۔ اسلام قبول کرنے سے لوگوں کو فتح مندوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے تھے اور مفتوحہ سلطنتیں ان شرائط سے بھی آزاد ہو جاتی تھیں جو ہر ایک فتح مند نے ابتدائے دنیا سے حضرت محمدؐ کے زمانہ تک ہمیشہ قرار دی تھیں۔''

اسی مصنف نے لکھا ہے کہ ''اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خاصیت پائی جاتی ہے جو دوسرے مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے۔'' اسلام کی تاریخ کے ہر ایک صفحہ میں اور ہر ایک ملک میں جہاں اس کو وسعت ہوئی دوسرے مذہب سے مزاحمت نہ کرنا پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ فلسطین میں ایک عیسائی شارلا مارٹین نے ان واقعات کا جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں بارہ سو برس بعد علانیہ یہ کہا تھا کہ ''صرف مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک قوم ہیں جو دوسرے مذہب کو آزادی سے رکھتے ہیں۔'' اور ایک انگریز سیاح سلیڈن نے مسلمانوں پر یہ طعنہ کیا ہے کہ ''وہ حد سے زیادہ دوسرے مذہب کو آزادی دیتے ہیں۔'' اب دیکھو کہ یہ رائیں بہت ہی بے طرفدار اور فیاض طبع عیسائی مصنفوں کی سرولیم میور کے اس بے سند دعویٰ کے کہ اسلام میں دوسرے مذہب کو آزاد رکھنے کا نام بھی نہیں ہے کیسی برخلاف ہیں۔

تیسرے حصہ میں ہم ان فائدوں کا بیان کرتے ہیں جو یہودی اور عیسائی مذہب کو اسلام کی بدولت حاصل ہوئی ہیں۔

مذہب یہود اور عیسائی مذہب کے شامل بیان کرنے کی یہ وجہ ہے کہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ نے شریعت موسوی کے کسی حکم یا مسئلہ کو تغیر و تبدل نہیں کیا بلکہ حضرت موسیٰ کی شریعت کو بدستور جاری رکھا۔ خود حضرت عیسیٰ کے اس قول سے جو متی کی انجیل باب ۵ آیت ۱۷ میں مندرج ہے کہ ''یہ مت خیال کرو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے کو آیا۔ میں منسوخ کرنے کو نہیں بلکہ پوری کرنے کو آیا ہوں۔'' ہمارے قول کی تصدیق ہوتی ہے پس اس وجہ سے ضرور بالضرور یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جو فائدے یہودی مذہب نے مذہب اسلام سے اٹھائے ہیں مذہب عیسوی سے بھی لزوماً وہ فائدے حاصل کئے ہیں۔ مذہب یہود، بلاشبہ ربانی مخرج سے پیدا ہوا تھا اس نے لازوال مسئلہ یعنی وحدانیت خدا کی تلقین اس حد تک کی جس قدر کہ نجات ابدی کے حاصل کرنے کو ضروری اور اس زمانہ کے لوگوں کی سمجھ کے لائق تھی مگر اس وحدانیت کو کاملیت سے اسلام نے شائع کیا جس سے مذہب یہود کا مسئلہ بھی کامل ہو گیا۔

تین چیزوں میں وحدت کے یقین کرنے سے خدا کی وحدانیت پر کامل طور سے یقین ہوسکتا ہے۔ ''وحدت فی الذات موحدت فی الصفات – وحدت فی العبادت – وحدت فی الذات'' کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے ساتھ کوئی دوسرا شخص یا کوئی شئے شریک نہیں ہے۔ وہ وحدہ لا شریک لہ ہے اور نہ کوئی شئے اس کے مشابہ ہے نہ آگ نہ پانی نہ ہوا۔ وحدت فی الصفات کے یہ معنی ہیں کہ جو صفتیں خدا کی ہیں وہ دوسرے میں نہیں اور نہ وہ دوسرے میں ہوسکتی ہیں اور نہ دوسرے سے متعلق ہوسکتی ہیں۔ وحدت فی العبادت کے یہ معنی ہیں کہ نہ کسی دوسرے کی عبادت کرنا نہ کسی دوسرے کو عبادت کے لائق سمجھنا اور نہ وہ افعال

جو خاص خدا کی عبادت کے لئے مخصوص ہوں کسی دوسرے کے لئے بجا لانا جیسے سجدہ کرنا روزہ رکھنا نماز پڑھنا وغیرہ ان تینوں وحدتوں میں سے پہلی دو وحدتوں کو اور تیسری وحدت کے پہلے حصہ کو اوسط طور پر (جو نہ ناقص تھا کیونکہ نجات کے لئے کافی تھا اور نہ کامل طور پر تھا کیونکہ وحدت کا پورا کمال اس زمانہ کے لوگوں کی سمجھ کے لائق نہ تھا) یہودی مذہب نے بیان کیا اور تیسری وحدیت کے اخیر حصوں کو جن سے درحقیقت اس وحدت کا کمال ہے مطلق ذکر نہیں کیا۔ اسلام نے پہلی دو وحدتوں کو بھی "**لیس کمثلہ شئی**" فرما کر کامل کیا پس نہ آگ جو موسیٰ نے دیکھی خدا تھا اور نہ وہ آواز "**انی انا اللہ**" کی جو موسیٰ نے سنی خدا تھا اور نہ وہ نیک اور برگزیدہ شخص جس کو یہودیوں نے صلیب پر چڑھایا خدا ہو سکتا تھا۔ اسلام نے تیسری وحدت کو ایسے کمال پر پہنچایا جس کے سبب ایمان والوں کے دلوں میں بجز خدا کے اور کچھ نہیں رہا جس کی تصدیق "**ایاک نعبد و ایاک نستعین**" سے ہوتی ہے۔ اسلام میں یہی کمال اور اسی کمالیت کی وجہ سے خدا نے فرمایا: "**الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا.**"

موسیٰ کی پانچوں کتابوں میں نہ قیامت کا ذکر ہے نہ مرنے کے بعد روح کی حالت کا کچھ بیان ہے نیکی کی جزا دشمن پر فتح پانا عمر کا بڑا ہونا مفلسی سے نجات پانا بیان ہوا ہے اور گناہ کی سزا مرنا قحط پڑنا وبا کا ہونا مفلسی کا ہونا اور اسی قسم کی اور مصیبتوں کا آنا موسیٰ کے بعد اور پیغمبروں اور نبیوں نے ان کا کچھ کچھ ذکر کیا مگر جس تفصیل اور کاملیت سے اسلام نے اس کو بتایا جس کے لئے خدا نے گویا عمداً یہ کام رکھ چھوڑا تھا کسی نے نہیں کیا تھا مگر جو کہ روحانی حالتوں کو یعنی گنہگاروں کی ارواح کی تکلیفوں کا اور نیک آدمیوں کی ارواح کی راحت اور خوشی کا بیان کرنا اور تصویر کھینچ دینا بجز اس کے اور کسی طرح ہو نہیں سکتا تھا کہ اس کو ایسی چیزوں اور حالتوں کے پیرایہ میں تشبیہاً بیان کیا جائے۔ جن کو انسان اپنی اس زندگی میں اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کا حال بہشت و دوزخ کے نام سے اور خوشی وایذا و تکلیف اٹھانے کے مختلف طریقوں اور سامانوں سے بیان کیا گیا ہے۔

اسلام سے پہلے یہودی اور عیسائی اکثر پیغمبروں اور پاک شخصوں سے نہایت بداخلاقی کے افعال قبیحہ سے منسوب کرتے تھے اگرچہ ہماری دانست میں ان تحریروں کو الہام ربانی سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تمام یہودی عیسائی ان تمام تحریروں کو الہام ربانی اور ان نبیوں اور مقدس لوگوں کو ان افعال قبیحہ کا مرتکب یقین کرتے ہیں۔

اسلام نے ان معصوم نبیوں اور خدا پرست شخصوں اور پاک خصلت بزرگوں کو ان تہمتوں سے بچایا اور جو اتہام یہودیوں اور عیسائیوں نے ان پر لگائے تھے ان کو فتح مندی سے دفع کیا اور تمام پیغمبروں اور نبیوں اور بہت سے بزرگوں کے معصوم اور بے گناہ ہونے کا دنیا کے بہت بڑے حصہ پر یقین کرا دیا۔ مسلمان عالموں نے اسلام کے اس مسئلہ پر یقین دلانے سے کہ انبیاء و پیغمبر سب پاک و معصوم ہیں تورات کو بڑی غور سے پڑھا اور عیسائیوں اور یہودیوں کی تمام غلطیوں کو ظاہر کر دیا اور انہوں دریافت کیا کہ یہ غلطیاں کچھ تو اس سبب سے پڑی ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے تورات کی عبارت اور الفاظ کی غلط طور پر تعبیر کی اور کچھ اس سبب سے وہ غلطیاں ہوئی کہ خود تورات کے قدیمی نسخوں میں جو کوڈیس کہلاتے تھے اور قلمی تھے متعدد وجوہ سے غلطیاں تھیں اور پھر جن لوگوں نے مقابلہ کر کے ان کو صحیح کیا ان کی تصحیح بھی غلطیوں سے خالی نہ تھی اور سب سے بڑا سبب ان غلطیوں کا یہ ہوا کہ تاریخی واقعات جو انسانوں نے بغرض تسلسل مطلب حضرت موسیٰ کے کلام کے ساتھ ملا کر لکھے تھے اور جن میں بلاشک بہت سی غلطیاں ہیں ان کو بھی یہودیوں اور عیسائیوں نے مقدس تحریر سمجھا تھا پس اگر اسلام نہ ہوتا تو ان پیغمبروں اور نبیوں اور خدا کے پاک بندوں یعنی حضرت

ابراہیم اور حضرت لوط اور ان کی بیٹیوں اور حضرت اسحٰق' حضرت یہودا' حضرت یعقوب کی بیویوں' بیٹوں' ہارون اور داؤد وسلیمان کی دنیا میں ایسی ہی مٹی خراب رہتی جیسی ایک بدکار آدمی کی خراب ہوتی ہے تمام دنیا کی نظروں میں ویسے ہی حقیر ہوتے ہیں جیسے کہ ایسے جرموں کے مجرم حقیر ہوتے ہیں جن کو دائم الحبس کر کے کالے پانی بھیجتے ہیں یا ان کے گناہوں کی سزا کے لئے ان کو سولی پر لٹکاتے ہیں۔ صرف یہ اسلام ہی کا احسان ہے جس نے ان تمام بزرگوں کی بزرگی دنیا میں اس حد تک پھیلائی جس کے وہ مستحق تھے۔

چوتھے حصہ میں ہم ان فائدوں کو بیان کرتے ہیں جو اسلام کی بدولت خاص عیسائی مذہب کو پہنچے ہیں۔

دنیا میں مذہب اسلام سے زیادہ کوئی مذہب عیسائی مذہب کا دوست نہیں ہے اور اسلام نے کس قدر فائدے نہیں پہنچائے ہیں۔ مذہب عیسائی کی بنیاد اس نیک اور حلیم شخص سے ہے (یعنی حضرت یحیٰی پیغمبر سے) جو خدا کا رستہ درست کرنے آیا تھا اور پھر بالکل دارومدار اس عجیب شخص پر ہے جس کو انہوں نے اتنا بزرگ ومقدس سمجھا کہ خدا یا خدا کا بیٹا مانا (یعنی حضرت عیسیٰ پر) مذہب اسلام ہی کا یہ احسان عیسائی مذہب پر ہے کہ وہ نہایت مستقل ارادے اور نڈر دل اور نہایت استوار ثابت قدی سے عیسائی مذہب کا طرف دار رہا اور یہودیوں سے مقابلہ کیا اور علانیہ اور دلیرانہ اس بات کا اعلان کیا کہ" جان دی باپٹسٹ' یعنی حضرت یحیٰی بلاشبہ سچے پیغمبر اور حضرت عیسیٰ بے شک عبداللہ اور کلمۃ اللہ وروح اللہ تھے پس کون سا مذہب اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ عیسائی مذہب کے حق میں اسلام سے زیادہ تر مفید ہے اور اس نے عیسائی مذہب کی حمایت میں اسلام سے زیادہ کوشش کی ہے جو سب سے بڑی خرابی حواریوں کے بعد عیسائی مذہب میں پیدا ہوگئی وہ تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث کا مسئلہ تھا اور یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جو اس کے لازوال سچ کے بھی متناقض تھا اور ان خاص نصیحتوں کے بھی برخلاف تھا جو حضرت عیسیٰ نے فرمائی تھیں اور حواریوں نے انجیل میں لکھی تھیں۔ یہ امر اسلام کی لازوال نعمت کا باعث ہے کہ اسی نے خدائے واحد ذوالجلال کی پرستش کو پھر جاری کیا اور اس خالص مذہب کو پھر سرسبز کیا جس کی خاص تلقین حضرت عیسیٰ نے کی تھی۔ اسلام ہمیشہ اس زمانہ کے عیسائیوں کو ان کی غلطی سے متنبہ کرتا رہا اور اب بھی کرتا رہتا ہے اسلام نے عیسائیوں سے اسی سچے مذہب کے قبول کرنے کی استدعا کی جس کا وعظ حضرت مسیح نے کیا تھا جیسا کہ قرآن میں آیا ہے "**قل یا اهل الكتاب تعالوا الی كلمة سواء بيننا وبينكم الا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا**" بہت سے عیسائیوں کی اسلام کی روشنی سے آنکھیں کھل گئیں اور اس ذلیل حالت سے خبردار ہوئے جس میں وہ مبتلا تھے اور انہوں نے پھر اسی رتبہ کے حاصل کرنے کی کوشش کی جو پہلے ان کو حاصل تھا یعنی انہوں نے صرف قرآن کی ہدایت سے تثلیث کے عقیدہ کو غلط سمجھا اور خدا کو وحدہ لاشریک لہ اور عیسیٰ کو خدا کا مقدس بندہ مانا جو عین مسئلہ مذہب اسلام کا ہے چنانچہ وہ فرقہ اب موجود ہے اور نہایت معزز لقب "یونیٹیرین" یعنی موحدین عیسائی سے معزز ہے۔

اگر یہ عقیدہ تھوڑی دیر کے لئے دنیا میں سے اٹھالیا جائے تو مسٹر گبن کی یہ رائے عیسائیوں کے حال پر بالکل مطابق ہو جائے گی کہ "اگر سینٹ پیٹر یا سینٹ پال ویٹیکن یعنی پوپ کے محل میں آ جائیں تو غالباً وہ اس دیوتا کا نام دریافت کریں گے جس کی پرستش ایسی پراسرار رسومات کے ساتھ اس عظیم الشان عبادت گاہ میں کی جاتی ہے اکسفورڈ یا جنیوا میں جا کر ان کو چنداں حیرت نہ ہوگی مگر گرجا میں کر سوال وجواب کا پڑھنا اور جو کچھ صادق القول مفسروں نے ان کی تحریرات اور ان کے مالک کے کلمات کی تفسیر کی ہے اس میں غور کرنا پڑے گا۔ جو فائدے اسلام نے عیسائی مذہب کو پہنچائے اس میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے عیسائیوں کو پوپ کے بے انتہا اختیارات ناجائز سے نجات دی اور عیسائیوں میں ایک زندگی کی روح پھونک دی۔ تمام عیسائی پوپ کو حضرت عیسیٰ کا پورا

اختیار نائب سمجھتے تھے اوراس کو معصوم جانتے تھے جیسا کہ اب بھی بہت سے فرقے عیسائیوں کے سمجھتے ہیں۔ان کا یقین تھا اور بہتوں کا اب بھی یقین ہے کہ دوزخ اور اعراف اور بہشت کے دروازوں کے کھولنے کا پوپ کو بالکل اختیار ہے۔ پوپ گنہگاروں کے گناہوں کے بخش دینے کا دعویٰ رکھتا ہے۔ پوپ کو اختیار تھا کہ جس ناجائز چیز کو چاہے جائز کر دے۔ درحقیقت پوپ بلحاظ ان اختیارات کے جو اس کو حاصل تھے اور جن اختیاروں کو وہ کام میں لاتا تھا کسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کم نہ تھا بلکہ دو چار قدم آگے بڑھا ہوا تھا۔قرآن ہی نے عیسائیوں کو اس خرابی سے مطلع کیا اور جو برائیاں اس سے پیدا ہوتی ہیں ان کو بتلایا اور جا بجا عیسائیوں کو اس غلامانہ اطاعت پر ملامت کی اور ان کو سمجھایا کہ اس رسوائی اور بے عقلی کی اطاعت کو چھوڑیں اور خود آپ اپنے لئے سچ کی جستجو کریں۔ چنانچہ خدا نے قرآن مجید میں فرمایا:

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیاء ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ. (ال عمران: ۵۷)

”اے کتاب والوں یعنی عیسائیوں آ وایک بات پر کہ ہم میں اور تم میں یکساں ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجیں اور نہ ہم کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک کریں نہ بنائیں ہم ایک دوسرے کو (یعنی پوپوں اور بڑے بڑے پادریوں کو) پروردگار خدا کے سوا۔“

اور پھر دوسری جگہ فرمایا:

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الھا واحدا لا الہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون. (سورة توبہ: ۳۱)

”عیسائیوں نے اپنے پادریوں اور درویشوں کو پروردگار بنا لیا خدا کے سوا اور مسیح ابن مریم کو بھی اور ان کو سوائے اس کے اور کچھ نہیں دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کی عبادت کریں کہ صرف وہی خدا ہے اور نہ اور کوئی۔خدا پاک ہے اس چیز سے کہ[1] شریک کرتے ہیں۔“

جب یہ آیت نازل ہوئی تو

روی عن عدی بن حاتمؓ قال اتیت رسول اللہ ﷺ وفی عنقی صلیب من ذھب فقال لی یا عدی اطرح ھذا الوثن من عنقک فطرحتہ فلما انتھیت الیہ وھو یقرأ اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ حتیٰ فرغ منھا قال فقلت لہ انا لسنا نعبد ھم قال الیس یحرمون ما احل اللہ فتحرمونہ ویحلون ما حرم اللہ فتستحلونہ قال فقلت بلی فتلک عبادتھم. (معالم التنزیل)

”عدی بن حاتم اس وقت عیسائی تھے آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور ان کے گلے میں سونے کی صلیب پڑی ہوئی تھی۔آنحضرت نے فرمایا کہ اے عدی اس بت کو اپنے گلے سے نکال پھینک چنانچہ انہوں نے نکال ڈالی۔ جب وہ

---

[1] جارج سیل نے قرآن کے ترجمہ (جلد ا صفحہ ۲۲) میں لکھا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں پر بت پرستی اور دیگر الزاموں کے سوا حضرت محمد نے یہ الزام لگایا ہے وہ اپنے قسیسوں اور رہبانوں کی حد سے زیادہ اطاعت کرتے ہیں جنہوں نے اس بات کا قرار دینا کہ کون سی چیز حلال اور کون سی حرام اور خدا کے احکام کی تعمیل کو ملتوی کر دینا اپنے اختیار میں لیا ہے۔

پاس آئے تو حضرت قرآن کی یہ آیت پڑھتے تھے کہ عیسائیوں نے اپنے پادریوں اور درویشوں کو پروردگار بنالیا خدا کے سوا جب آنحضرت پڑھ چکے تو عدی نے عرض کیا کہ ہم تو ان کی پرستش نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ نہیں ہے کہ وہ حرام کر دیتے ہیں اس چیز کو جسے خدا نے حلال کیا پھر اس کو حرام سمجھتے ہو عدی نے کہا ہاں یہ تو ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ بس یہی ان کا پوجنا ہے۔''

ایک مدت تک عیسائی اسلام کو عداوت سے دیکھا کئے اور اس کے ہر ایک مسئلہ سے بے سمجھے نفرت کرتے رہے مگر بعض نیک دل عیسائیوں نے کچھ تھوڑی بہت غور سے دیکھا اور کالون اور لوتھر مقدس کے دل پر اس کا کچھ کچھ اثر ہوا جب کہ ان دونوں نے قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں کو پڑھا جس میں پوپ کو اور پادریوں کو خدا کے سوا دوسرا خدا یا جھوٹا خدا ماننے کی مذمت تھی تو وہ سمجھے اور اس سچے مسئلہ نے ان کے دل پر اثر کیا اور جیسے کہ قرآن نے ہدایت کی تھی وہ سمجھے کہ ہر شخص فی الواقع آپ اپنا پوپ اور اپنا پادری ہے وہ چلا اٹھے کہ پالیا پالیا اور اسی وقت پوپ کی غلامی سے آزاد ہوئے اور غلامانہ اور ذلیل حالت سے جس میں وہ خود اور ان کے تمام ہم مذہب مبتلا تھے نکل آئے اور صاف صاف اس کے برخلاف وعظ کرنے کو کھڑے ہو گئے۔

جس کی بدولت ہم لاکھوں عیسائیوں کو پروٹسنٹ مذہب میں دیکھتے ہیں۔ اگر اسلام مذہب عیسائی کو یہ نعمت نہ بخشتا تو آج تمام دنیا کے عیسائی ایسے ہی بت پرست ہوتے جیسے کہ اب تک رومن کیتھولک فرقہ کے لوگ بت پرست ہیں اور حضرت مسیح کی مجسم صورت لٹکی ہوئی کے آگے سجدہ کرتے ہیں پس عیسائی مذہب پر یہ کتنا بڑا احسان اسلام کا ہے۔

جو کہ درحقیقت لوتھر مقدس نے مذہب اسلام سے یہ ہدایت پائی تھی اس لئے اس کے مخالف علانیہ اس پر یہ الزام لگاتے تھے کہ وہ دل سے [1] مسلمان تھا تاہم اس نے اپنی کوششوں کو نہیں چھوڑا اور آخرکار اس عظیم الشان اصلاح کرنے پر کامیاب ہوا۔ جو عموماً مذہب پروٹسنٹ یا فارمیشن کے نام سے مشہور ہے اور طبیعت انسانی کو تمام غلامیوں کی بدترین غلامی سے (جو ایک مرشدانہ غلامی تھی) آزاد کر دیا۔ ہم کو یقین ہے کہ اگر لوتھر مقدس اور زندہ رہتے تو ضرور مسئلہ تثلیث کے بھی مخالف ہوتے اور اسلام کی ہدایت سے خدا کی وحدانیت کے مسئلہ کو بھی جو درحقیقت حضرت عیسیٰ نے بھی یہی مسئلہ تلقین کیا تھا لوگوں میں پھیلاتے اور آخر اس نبی آخر الزمان پر یقین کرتے جس نے ایسی ایسی بڑی غلطیوں سے عیسائی مذہب کو بچایا تھا پس مذہب عیسوی کو ہمیشہ اسلام کا احسان مند رہنا چاہیے۔

---

[1] جینی بوارڈ نے یورپ کی طرف سے جرمنی کے رفارمروں کے اور خصوصاً لوتھر مقدس کے ذمہ یہ الزام لگایا تھا کہ وہ عیسائیوں میں مذہب اسلام کو جاری کرنے اور تمام پادریوں کو اس مذہب میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مراکسی کی یہ رائے ہے کہ مذہب اسلام میں اور لوتھر کے عقیدہ میں کچھ بہت فرق نہیں ہے چنانچہ دونوں کا جو میل بت پرستی کے برخلاف ہے اس پر غور کرو مارٹینس الفانسس اور والڈس کہتا کہ تیرہ نشانیاں اس بات کے ثابت کرنے کو موجود ہیں کہ اسلام میں اور لوتھر کے مذہب میں ایک رتی بھر کا بھی تفاوت نہیں ہے۔ حضرت محمدؐ نے بھی انہی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ مرتد (یعنی پیروان لوتھر) کرتے ہیں۔ انہوں نے (یعنی حضرت محمدؐ نے) روزوں کا وقت تبدیل کر دیا اور یہ لوگ (یعنی پیروان لوتھر) تمام روزوں سے نفرت کرتے ہیں (ایک شخص نے اس کی تائید میں یہ کہا تھا کہ قرآن میں بھی روزوں کی چنداں تاکید نہیں ہے بلکہ بعوض روزہ کے غریبوں کو کھانا کھلا دینا لکھا ہے۔ اسی کی پیروی سے لوتھر نے روزوں سے نفرت کی تھی پس لوتھر کا مذہب اور اسلام کا مسئلہ درحقیقت ایک ہی تھا) انہوں نے اتوار کی جگہ جمعہ کو سبت قرار دیا اور یہ کسی تہوار کو نہیں مانتے تھے (اسی شخص نے اس کی تائید میں کہا کہ اسلام نے بھی درحقیقت سبت کا کوئی دن نہیں ٹھہرایا وہ جمعہ کو بھی سب کام کرتے ہیں پس اسی کی پیروی لوتھر نے کی تھی) انہوں نے ولیوں کی پرستش کو رد کیا اور لوتھر کے فرقہ کے لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ حضرت محمدؐ کسی کو اصطباغ نہیں دیتے تھے اور کالون بھی اس کو ضروری نہیں سمجھتا ان دونوں نے طلاق کو جائز رکھا ہے وعلی ہذا القیاس (انتخاب از کوارٹرلی ریویو نمبر ۲۵۴)

الخطبة الخامسة

فی

حالات کتب المسلمین

حسبنا کتاب الله

جس زمانہ سے کہ خدا مجید کی توحید کے سب سے بڑے مجدد نے لا الہ الا اللہ کا وعظ فرمایا اس زمانہ سے تمام مسلمان خدائے پاک بے چون و بے نمون پر دلی مضبوطی اور متزلزل اعتقاد اور ایمان رکھنے میں ہمیشہ اور ہر جگہ ممتاز اور سرفراز رہے ہیں اور دینی علوم کی طرف بھی بہت بڑی توجہ کی ہے مگر جب تک کہ خلفائے بنی عباس کی خلافت کو جو بنی امیہ کے بعد ہوئی تھی پوری مضبوطی نہ ہوئی مسلمانوں میں دنیاوی علوم وفنون کا رواج جیسا کہ چاہیے ویسا نہ ہوا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان میں خلفائے عباسیہ کی سرپرستی سے مسلمانوں میں ہر ایک قسم کے علوم وفنون کا چرچا ہوا۔ ان سینہ میں علم کی محبت بھی قرآن مجید کی ترویج کے شوق کی ہمسری کرنے لگی۔ عرب کے لوگوں کے چال چلن میں بلاشبہ یہ ایک عجیب وغریب وصف ہے کہ جب اسماعیل کی اولاد کو مناسب تحریک ہوئی تو انہوں نے ہر قسم کے علم کی دولت کو بھی اسی آسانی سے لوٹ لیا جس طرح کہ انہوں نے مشرق میں بے مثل فتوحات حاصل کی تھیں۔ ان کے قلم کی فتوحات بھی ان کی تلوار کی فتوحات کی مانند معروف ومشہور لیکن ان سے زیادہ دیرپا ہوئیں۔ پرانی دنیا کا ایک بہت بڑا حصہ اپنی موجودہ شائستگی اور روشن دماغی میں مسلمانوں کا مرہون منت ہے کیونکہ یورپ کی مغربی حدود کے مرکز سے علم کی وہ شعائیں نمودار ہوئیں جنہوں نے خدا تعالیٰ کی کروڑ مخلوق کے دلوں کو منور کر دیا۔

ایک غیر متعصب عیسائی مصنف کا قول ہے کہ ''اگر زیادہ تصریح سے بیان نہ کیا جائے تو بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان نویں صدی سے تیرھویں صدی تک جاہل یورپ کے روشن دماغ معلم بنے ہیں۔ عربی علم حکمت' علم طب' تاریخ طبعی' جغرافیہ' تواریخ عام' صرف نحو' بلاغت اور دل آویز فن شاعری میں بکثرت تصنیفیں عمل میں آئی ہیں اور اکثر ان میں سے تا قیام سلسلہ بنی آدم جاری رہیں گی اور اپنے مفید مطالب سے ان کو فیض بخشیں گی۔''

مگر حال کے زمانہ کے نکتہ چینوں کو اگلے زمانہ کے علمائے دین کی تصانیف کے عیب وہنر جانچنے کے وقت ان تصانیف کے اصلی حالات پر خیال نہیں رہتا۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان مصنفوں نے وہ تصنیفیں اس زمانہ میں کی تھیں جب کہ ''عام تحقیق'' کے مسلم قواعد کا عرب میں وجود بھی نہ تھا۔ اسی وجہ سے جس طرح کہ ان مصنفوں کے خیالات کے بلند پروازی اور ان کے استعارات کی وسعت کی کچھ روک ٹوک نہ تھی اسی طرح قواعد ترتیب اور خوش اسلوبی سے اتفاقیہ انحراف کی بھی کوئی چیز ان کی مانع اور مزاحم نہ تھی۔

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ کسی مصنف کے عیب وہنر کی نسبت کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہوسکتی اور نہ کسی شخص کو اس کے منشاء کا ٹھیک علم ہوسکتا ہے بجز ان کے جن کو مصنف کے زمانہ کے قواعد انشا پردازی اور خیالات کے ڈھنگ سے یا ان امور سے جو کسی نہ کسی طرح پر

اس مضمون سے جس میں وہ کتاب تصنیف ہوئی ہے علاقہ رکھتے ہیں پوری واقفیت اور کامل مہارت حاصل ہو۔ اسی عدم مہارت اور عدم واقفیت کا سبب ہے کہ غیر ملک کے محققین نے جب ہمارے مذہب کی خوبیوں پر کوئی رائے قائم کرنے کا حوصلہ کیا ہے تو اس میں فاش فاش غلطیاں کی ہیں۔

اس کے سوا اور امور بھی ایسے ہیں جو کسی مصنف کی لیاقت کا صحیح صحیح انداز کرتے وقت دھوکے میں ڈال دیتے ہیں۔ مثلاً ایک ایک مصنف کی دو تصنیفوں میں سے ایک تو تو بڑا اعلیٰ درجہ رکھتی ہے اور دوسری محض بے حقیقت ہوتی ہے اور اس کا سبب دونوں تصنیفوں کے موضوع کا مختلف ہونا ہوتا ہے۔ محمد بن اسمٰعیل بخاری مسلمانوں میں بہت بڑا عالم اور مقدس مصنف ہے۔ ایک کتاب اس کی صحیح بخاری ہے جو بلحاظ اس حیثیت کے جس حیثیت سے کہ وہ تصنیف ہوئی ہے نہایت معتبر اور مستند خیال کی جاتی ہے گو کہ دوسری حیثیت سے وہ ویسی نہ ہو۔ دوسری کتاب اس کی تاریخ بخاری ہے جو کچھ بھی قدر کے لائق نہیں ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ان دونوں کتابوں کی تصنیف کا موضوع مختلف ہے۔ اسی طرح نام کی مشابہت بھی دھوکے میں ڈال دیتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ کتاب اسی شخص کی ہے جو ایک مشہور مصنف ہے حالانکہ وہ اس کی تصنیف نہیں ہوتی بلکہ اس کے ہم نام دوسرے شخص کی تصنیف ہوتی ہے۔ کبھی اس طرح پر دھوکا پڑ جاتا ہے کہ ایک کتاب میں اس کے مصنف نے کسی مشہور شخص کی روایتیں کثرت سے نقل کیں لوگوں نے سمجھا کہ وہی مشہور شخص اس کا مصنف ہے اور اس خیال سے اس کتاب کو مشہور شخص کی طرف منسوب کیا اور مستند قرار دیا۔ رفتہ رفتہ اس کی ایسی قدر ہو گئی جس کی وہ ہرگز مستحق نہ تھی جیسے کہ تفسیر ابن عباس کا حال ہے۔

یہ باتیں تو صرف تمہید کی تھیں جن کو ہم لکھ چکے اب ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ کتب مذہبی کی تصنیف کے فن کا نرالا ڈھنگ جو مسلمانوں نے اختیار کیا تھا سب لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے اور اس مقصد کے لئے مصنفین نے جو مختلف طریقے دینیات کے متعدد شعبوں مثل حدیث، سیر، تفسیر فقہ کی کتابوں کی تصنیف میں اختیار کئے ہیں ان کو بیان کریں۔ اس سے ہمارا فرض یہ ہے کہ ہمارے مذہب کے آئندہ نکتہ چینوں کی ہدایات کے لئے ایک سیدھا رستہ بن جائے کیونکہ اکثر لوگوں نے جو ہماری دینیات کی کتابوں کے حالات سے ناواقف تھے ہماری کتب دینیات کو دیکھ کر نہایت ناسزا اور درشت کلمات کہے ہیں اور ان کے بعد جو لوگ گزرے ہیں انہوں نے بھی بارہا اندھوں کی طرح ان کی تقلید کی ہے۔

اول کتب حدیث

جناب پیغمبر خدا اور صحابہ کرام اور نیز تابعین کے زمانہ میں حدیثوں کے قلم بند نہ ہونے کی دو وجہیں تھیں ایک یہ کہ اس زمانہ میں لوگوں کو اس کی چنداں ضرورت نہ تھی اور اگر ٹھیک اور اصلی وجہ بیان کی جائے تو یہ تھی کہ حدیثوں کے لکھنے اور جمع کرنے کے اکثر صحابہ کرام شدید مخالف تھے اور ہمارے نزدیک انہیں صحابہ کرام کی رائے نہایت صحیح اور بہت درست تھی دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں فن تصنیف عرب میں محض ایک ابتدائی حالت میں تھا اس وقت میں ایسی باتوں کے لئے حافظہ بہترین مخزن خیال کیا جاتا تھا۔ ان اسباب سے نبوت سے دوسو برس تک اور ہجرت سے دوسو برس قریب تک حدیثوں کا قلمبند ہونا عمل میں نہیں آیا تھا۔ جب حدیثوں کا لکھنا شروع ہوا تو اس وقت یہ شکل پیش آئی کہ مختلف سببوں سے احادیث موضوعہ جو صحیح حدیثوں میں مخلوط ہو گئی تھیں اس قدر زمانہ کے بعد صحیح حدیثوں کو موضوع حدیثوں سے تمیز کرنا ایک امر اہم معلوم ہوا مگر بایں ہمہ بہت سے شخصوں نے جن کی استعداد اور علم

کے اعلیٰ درجہ میں کسی کو کلام نہ تھا صحیح حدیثوں کو موضوع حدیثوں سے علیحدہ کرنے کا بوجھ اپنے سر پر اٹھایا اور اپنے کام میں بہت کچھ کامیابی حاصل کی۔

ان علماء نے جو محدثین کہلاتے ہیں کے اعتبار اندازہ کرنے کو چند قواعد قرار دیئے جن کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

اول: حدیث کے ہر ایک راوی کو جملہ راویوں کے نام جن کے ذریعہ سے ان کو حدیث پہنچی ہو سلسلہ وار پیغمبر خدا تک یا جہاں تک وہ جانتا ہو بتلا دینا لازمی قرار دیا۔

دوم: یہ امر ضروری قرار دیا کہ خود راوی اور نیز وہ سب لوگ جن کے ذریعہ سے سلسلہ وار وہ حدیث اس تک پہنچی ہو راست گو اور معتبر ہوں اگر اس سلسلہ راویوں میں سے ایک راوی بھی ایسا نہ خیال کیا جاتا تو وہ حدیث معتبر نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ سلسلہ حدیث سے خارج کر دی جاتی تھی۔

سوم: حدیثوں کے لکھنے کے وقت اس بات کو لازمی کیا تھا کہ جملہ راویوں کے نام جن تک اس حدیث کا سلسلہ پہنچتا ہے حدیث کے ساتھ لکھ دیئے جائیں تا کہ اگر ان راویوں کے عام چال چلن کی بابت اور لوگوں کو کسی قسم کی آگاہی ہو تو اس سے مطلع کر دیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ راوی کس درجہ تک اعتبار کے لائق ہے۔

چہارم: مذکورہ بالا قواعد کے سوا بعض محدثین نے اپنی تصنیفات میں حدیثوں کے درجہ اعتبار کے قلم بند کرنے کی رسم اختیار کی تھی۔

جملہ حدیثیں مختلف اوقات میں ان اصولوں پر لکھی گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ کتب حدیث کی اس قدر کثرت ہوگئی ہے کہ اگر سب کی سب ایک جگہ جمع کی جائیں تو ان کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانے کو اونٹوں کی ضرورت ہو ان بے شمار کتب احادیث میں سے کتب مندرجہ ذیل بمقابلہ اوروں کے زیادہ مستند ہیں۔

(۱) صحیح بخاری[1] (۲) صحیح مسلم' (۳) ترمذی' (۴) ابوداؤد' (۵) نسائی' (۶) ابن ماجہ' (۷) موطا امام مالک۔

ابوعبدالرحمٰن نے احمد نسائی سے پوچھا کہ تیری کتاب کی سب حدیثیں صحیح ہیں تو اس نے انکار کیا۔ صراط المستقیم میں لکھا ہے کہ ''از روئے پرسیدند کہ کتاب سنن تو ہمہ صحیح است گفت لا''

ان کتب احادیث کی اور کتابوں پر ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ ان میں وہی حدیثیں منقول ہیں جو حتی الامکان صرف معتبر اشخاص سے مروی ہوئی ہیں اور کتب احادیث میں یہ قید نہیں ہے مگر بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح کتب مذکورہ بالا میں بعض مشتبہ یا موضوع حدیثوں کے ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے اسی طرح اور کتب حدیث میں بعض احادیث صحیح کا ہونا بھی ممکن ہے۔

---

[1] محمد بن اسماعیل بخاری ۱۹۴ ہجری مطابق ۸۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۲۵۶ ہجری مطابق ۸۷۰ء میں انتقال فرمایا۔
مسلم ۲۰۴ ہجری مطابق ۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور ۲۶۱ ہجری مطابق ۸۷۵ء میں انتقال فرمایا۔
ابوعیسیٰ محمد ترمذی ۲۰۹ ہجری مطابق ۸۲۴ء میں پیدا ہوئے اور ۲۷۹ ہجری مطابق ۸۹۲ء میں انتقال فرمایا۔
ابوداؤد ۲۰۲ ہجری مطابق ۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۷۵ ہجری مطابق ۸۸۸ء میں انتقال فرمایا۔
ابوعبدالرحمٰن احمد نسائی نے ۳۰۳ ہجری مطابق ۹۱۵ء میں انتقال فرمایا۔
ابوعبداللہ محمد ابن ماجہ نے ۲۹۳ ہجری مطابق ۱۰۰۶ء میں انتقال فرمایا۔
امام مالک ۹۵ ہجری مطابق ۷۱۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ ہجری مطابق ۷۹۵ء میں انتقال فرمایا۔

مگر پہلی قسم کی کتابوں کے استثناء کی نسبت یہ درجہ اشتباہ کا ایسا ضعیف ہے کہ علماء کو ان پر اعتقاد کامل رکھنے سے (بشرطیکہ وہ اعتقاد صرف مذہبی بنا پر نہ ہو) تاوقتیکہ ان کی تکذیب میں کوئی صریح دلیل نہ پیش ہو باز نہیں رکھتا مگر دوسری قسم کی کتابوں کی نسبت یہ اعتقاد نہیں ہے۔ جو حدیثیں کہ ان میں منقول ہیں وہ جبھی قابل اعتبار خیال کی جاتی ہیں کہ ان کی صحت کے لئے کوئی شہادت موجود ہو یا ان کے نامعتبر ہونے کے لئے کوئی دلیل نہ ہو۔

جس زمانہ میں یہ کتب حدیث زبانی روایتوں سے لکھی گئی تھیں راویوں نے اس بات کا التزام نہیں کیا (اور یقیناً ویسا کرنا بھی ناممکن تھا) کہ وہی الفاظ بجنسہ جو پیغمبر خدا کی زبان مبارک سے نکلے تھے بیان کریں بلکہ اپنے الفاظ میں پیغمبر خدا کا مدعا ادا کرتے تھے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کوشش کسی حدیث کے مخصوص الفاظ کے معنی معین کرنے سے بعض احکام یا واقعات کے قائم کرنے میں کی جائے اس میں بڑی احتیاط چاہیے کیونکہ ہم کو اطمینان کامل نہیں ہے کہ درحقیقت جناب پیغمبر خدا نے انہیں الفاظ کو استعمال کیا تھا۔

بہت سی حدیثیں ایک ہی باب میں ایک دوسری سے مختلف ہیں۔ پس ان میں سے ایک کو صحیح مان لینا اور باقیوں کو غلط بہت مشکل کام ہے۔ اس مشکل کے حل کرنے کو عالموں نے چند قواعد وضع کئے ہیں اور ان کا نام اصول علم حدیث رکھا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض ان میں سے کسی خاص حالت میں اس مدعا کے انجام دینے کے لئے وضع کئے گئے ہیں قاصر ہوں۔

تمام بیہودہ قسم کی حدیثیں مشتبہ خیال کی گئی ہیں اور ایسی حدیثیں جو مطالب قرآن مجید سے متناقض ہیں غلط قرار دینے کے لائق ہیں جس طرح کہ حضرت عائشہ نے حدیث ''سماع موتیٰ'' کی نسبت کیا تھا کیونکہ وہ حدیث قرآن مجید کے اس بیان سے بالکل مخالف تھی ''**وما انت بمسمع من فی القبور**'' حضرت عائشہ کے اس قول سے ہر ایک مسلمان واقف ہے۔

ایسے لوگ جو بہ کثرت حدیث بیان کرتے تھے صرف ان کے کثیر الروایت ہونے کی وجہ سے ان کی روایتوں کی صحت میں کلام ہوتا تھا اور کسی شخص کی روایت کی ہوئی کوئی حدیث غلط ثابت ہو جاتی تھی تو اس کی اور تمام روایتوں کے مشتبہ ہونے کے لئے کافی ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے راویوں کے باب میں بہت سی کتابیں اسماء الرجال کی مرتب ہوئیں تاکہ معتبر اور غیر معتبر راویوں کا حال معلوم ہو جائے۔ مجد الدین فیروز آبادی نے جو ایک مشہور محدث اور بہت بڑے عالم ہیں اپنی کتاب مسمیٰ بہ سفر السعادت میں ترانوے مضمون شمار کئے ہیں اور بیان کیا ہے کہ تمام حدیثیں جو ان مضمونوں میں سے کسی مضمون کے باب میں ہوں سب غیر معتبر ہیں علاوہ اس کے اور بہت سے ذی لیاقت محدثین نے احادیث موضوعہ پر بحث کی ہے اور کتابیں لکھی ہیں۔

پس ان لوگوں کو جو ہمارے دین کے اصول پر رائے دینا یا ہمارے علماء نے جو واقعات سیر ان کتابوں میں لکھے ہیں ان پر یا ہمارے دین کے مختلف مسائل پر بحث کرنا چاہیں تو ان کو اپنی رائے اور خیال کی تائید میں صرف ان حدیثوں کے حوالہ دینے پر اکتفا کرنا نہیں چاہیے جن کا اوپر ذکر ہوا بلکہ مثل ایک محقق کے سب سے پہلے اس ذریعہ کے صدق وصحت کی تحقیق کرنی چاہیے جہاں سے وہ حدیثیں پہنچی ہوں۔

ان ضروری اصولوں کی فراموشی یا ناواقفیت کی وجہ سے غیر ملک کے بعض مصنفوں سے (شاید نادانستہ) جناب پیغمبر خدا کی سوانح عمری یا تاریخ لکھتے وقت بڑی ناانصافی کا جرم سرزد ہوا ہے علی الخصوص اس وقت جب کہ باقاعدہ اور غیر متعصبانہ تحقیق کی جائز دلیلوں

کے عوض انہوں نے اپنے نالائقی سے ٹھیک تضحیک اور ہجو اختیار کی ہے۔

دوم کتب سیر

مصنفین کتب احادیث نے تو یہ خیال کیا تھا کہ جس مضمون پر وہ کتابیں لکھتے ہیں اور حدیثیں جمع کرتے ہیں ان کو مذہب سے تعلق ہے اور وہ مذہبی مسائل کی بنا قرار پائیں گے اور ان کی بنیاد پر بے انتہا مسائل اور جدید عقائد اور مناظرات مذہبی پیدا ہوں گے اگر ان میں احتیاط نہ کی جائے تو مذہب اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ اسی خیال سے انہوں نے راویوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے پر نہایت کوشش کی اور جس کو معتبر سمجھا اس کی روایت لکھی مگر اہل سیر نے سیر کی کتابیں تصنیف کرتے وقت اس کا کچھ خیال نہیں کیا کیونکہ ان کو اس قسم کا مطلق اندیشہ نہ تھا اور کبھی ان کو یہ خیال نہیں تھا کہ ان کی لکھی ہوئی کتابیں کسی عقیدہ یا مذہبی مسئلہ کی بنیاد قرار پائیں گی اور مذہبی اختلافات اور بدعات کا مادہ ہوں گی اس لئے انہوں نے مثل اہل حدیث کے ان مضامین کی صحت پر جو انہوں نے اس میں لکھے اور ان راویوں کے اعتبار پر جن سے وہ حالات ان کو پہنچے بہت ہی کم التفات کیا۔ ان کی تحریرات کا سب سے بڑا خزانہ زبانی روایتیں تھیں۔ جس کسی نے جو قصہ ان سے بیان کیا انہوں نے نہایت اشتیاق سے اس کو سنا اور اس قصہ کی اصلیت اور راوی کے چال چلن کی نسبت ذرا بھی تفتیش نہیں کی اور اس کو اپنی کتاب میں لکھ لیا۔

ان مصنفوں کی غرض نہ تو کسی قصہ کی تصدیق تھی اور نہ کسی روایت کی اصلیت کی تحقیق بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو کچھ ہر ایک واقع کی نسبت مشہور اور زبان زد ہے اس کو لکھ لیں اور ایک جگہ جمع کر دیں اور ان قصوں کی صحت یا لغویت کی چھان بین پڑھنے والے کی جان فشاں تحقیق اور رائے پر چھوڑ دیں۔ یہ رسم بہت جلد عام ہو گئی۔ اول اول تو راویوں کے نام بھی لکھے گئے اور پھر رفتہ رفتہ راویوں کے نام لکھنے کو بھی متروک کر دیا۔ ان کتابوں میں اکثر ایسی روایتیں بھی مندرج ہیں جن کے راوی مصنف کے زمانہ سے بہت پہلے گزر چکے تھے اور کچھ پتا نہیں معلوم ہوتا کہ مصنف نے کس طرح پر اس روایت کو اپنی کتاب میں لکھ دیا۔ ان کتابوں میں اکثر انبیائے سابقین کے قصے بھی مندرج ہیں اور وہ وہی قصے ہیں جو ایک زمانہ میں یہودیوں میں مشہور اور زبان زد تھے اور جن کی اصلیت بالکل محض تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور ان کا رتبہ دیو پری کے قصوں سے کچھ زیادہ نہ تھا اس لئے مسلمانوں کے جملہ علوم میں سے وہ علم جو سب سے زیادہ غور اور تحقیق کا محتاج ہے وہ علم سیر ہے اور جس پر تمام علماء کو نہایت عمیق توجہ کرنی لازم ہے۔

پس ان کتابوں کو صرف یہ امر کہ وہ مشہور اور معروف علمائے سابقین کی تصنیفات سے اعتبار کا مستحق نہیں کرتا مذہب اسلام پر نکتہ چینی کرنے والوں کو ان کے اعتبار کو بلحاظ اس اصول کے جس پر خود ان کے مصنفوں نے ان کو تصنیف کیا ہے ساقط سمجھنا چاہیے اور جب تک کہ ان کتابوں کی مندرجہ روایات کی صحت فی نفسہ نہ ثابت ہو لے اور اصول تحقیقات سے ان پر طمانیت نہ ہو لے ان روایتوں کا ان کتابوں میں مندرج ہونا اعتبار کے لئے کافی نہیں ہے۔

ان وجوہ سے تاریخ محمد بن اسماعیل بخاری' تاریخ محمد بن جریر طبری' سیرت ابن سعد کاتب الواقدی اور دیگر علمائے متبحر کی مشہور معروف تصنیفیں جیسے مدارج النبوت' قصص الانبیاء' معراج نامہ' مولد نامہ وغیرہ اور اسی قسم کی کتابیں سب کی سب یکساں حالت میں ہیں۔

ہمارے جناب پیغمبر خدا کی سوانح عمری لکھنے میں اور کتب سیر سے ان حالات کو منتخب کرنے میں یورپین مصنفوں نے اس قدر

متحملانہ تحقیقات کو اختیار نہیں کیا ہے جو اس مضمون کی عظمت کے شایاں ہے بلکہ برخلاف اس کے از راہ تعصب اور بغض کے انہوں نے دیدہ و دانستہ اس روشنی سے آنکھ چرائی ہے جس کی شعائیں ان کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں اور اس طرح پر انہوں نے اپنے حق میں اس مثل کی تصدیق کی ہے کہ ''کوئی شخص ایسا اندھا نہیں ہے جیسے کہ وہ لوگ ارادتاً نہیں دیکھتے۔''

سوم کتب تفسیر

اکثر لائق شخصوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے بعض نے اس کی بلاغت اور فصاحت آمیز کلام اور خوبصورت اور بے نظیر طرز بیان کی تفسیر کی ہے بعض نے اس کے پڑھنے کا خاص طریقہ مع قرأت اور لہجہ کے بتلایا ہے۔ بعضوں نے صرف آیات احکام کی وج قرآن مجید میں ہیں تفسیر کی ہے بعض نے اپنا وقت اور اپنی محنت آیات کے شان نزول دریافت کرنے میں صرف کی ہے۔ بعض نے اپنی تفسیروں میں واعظین کے لئے دلچسپ اور عجیب و غریب اور حمقا کے خوش کرنے کے لئے دور از عقل و قیاس مضامین جو یہودیوں کے ہاں مروج تھے جمع کر دیئے ہیں۔ بعضوں نے ایسی تفسیریں لکھیں جو ان تمام مضامین پر حاوی ہیں۔

ان مفسرین نے اپنی تفسیریں لکھنے میں کتب سیر اور احادیث کی طرف رجوع کیا تھا جن کا بیان ہم ابھی کر چکے ہیں۔ یہ بات نہایت افسوس کے قابل ہے کہ یہ مفسرین ان بے شمار جھوٹی روایتوں اور مصنوعی قصوں ہی کو جن کا موجود ہونا ان کتابوں میں ابھی بیان ہو چکا ہے کام میں لائے بلکہ ایسی روایتیں اور حدیثیں بھی انہوں نے اپنی تفسیروں میں لکھ دیں جو صرف انہیں تفسیروں میں پائی جاتی ہیں۔

حدیث کی کتابوں میں بعض جو حیثیات سے درجہ اعتبار رکھتی ہیں اور جو صحاح ستہ یا صحاح سبعہ کے نام سے مشہور ہیں اور جن کے نام ہم اوپر لکھ آئے ہیں قرآن مجید کی تفسیر کے لئے خاص ابواب مخصوص ہیں جو کتاب التفسیر کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں اگر ان کل کتابوں کے مضامین کو جو قرآن مجید کی تفسیر سے متعلق ہیں ایک جگہ جمع کیا جائے تو معدودے چند صفحوں سے زیادہ نہ ہوں مگر مفسرین نے نہایت موٹی موٹی جلدیں ایسی بیہودہ اور نامعتبر روایتوں سے بھر لی ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے غرضیکہ ایسی تفسیریں اور علی الخصوص وہ جو واعظین کے فائدے کے لئے لکھی گئی ہیں اور جن میں خیالی اور بیہودہ قصے انبیاء علیہم السلام کے بھرے ہوئے ہیں اور ملائک اور بہشت اور دوزخ اور ان کے اوصاف و خواص کے بیان کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کتب سیر سے خلاف قیاس بیانات کو پیش کرتے ہیں سراسر غیر معتبر روایات سے مملو ہیں اور وہ روایتیں صرف یہودیوں کے ہاں جاری تھیں مگر خود مذہب یہود میں ان کے معتبر ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ان تفسیروں میں اکثر ایسی روایتیں بھی موجود ہیں جو علمائے دین کی طرف منسوب کی گئی ہیں مگر اس امر کا تحقیق کرنا کہ وہ روایتیں درحقیقت انہیں عالموں کی روایتیں ہیں ایسا ہی مشکل ہے جیسے کہ اس بات کا دریافت کرنا کہ وہ روایتیں ان مفسرین تک کیونکر پہنچیں۔

ان تفسیروں کے وہ حصے جن میں قرآن شریف کی بلاغت اور فصاحت اور اس کے طرز بیان کی خوبصورتی اور ان کی قرأت کے خاص لہجوں کا بیان ہے بلاشبہ نہایت عمدہ اور قابل قدر کے ہیں مگر ان حصوں کے سوا تمام روایتیں اور قصے جو ان تفسیروں میں شامل ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کیونکہ وہ مثل سچے اور جھوٹے موتیوں کے باہم مخلوط ہیں اور یہ کام خریدار کا ہے ان میں سے سچے موتیوں کو منتخب

کرلے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو شخص بدوں مناسب چھان بین اور کافی تحقیقات کے کسی ایسی تفسیر کے قصوں کا حوالہ دے کر ہمارے پاک مذہب پر خوردہ گیری اور عیب چینی کی بنیاد قائم کرتا ہے جیسے کہ اکثر یورپ کے مصنفین نے کیا ہے وہ نہایت غلطی اور دھوکا میں پڑتا ہے۔

غرض کہ یہ تینوں قسم کی کتابیں جن کا اوپر ذکر ہوا مذہبی امور پر لکھنے والے اور بحث کرنے والے کے لئے نہایت بیش بہا اور نہایت بے قدر مادہ کو آن واحد میں جمع کرتے ہیں علمائے محققین اسلام نے بہت سے طریقے اختیار کئے ہیں جن کے وسیلہ سے وہ اس مخلوط مادہ سے معتد بہ فائدہ اٹھاتے ہیں مگر یورپ کے مصنفین اس سے محروم ہیں۔

اکثر عالم ایسے گزرے ہیں جو خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ میں اپنی نیک دلی سے نہایت سچا اور مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کو اپنی قدرت کاملہ سے ہر ایک امر کرنے کا پورا اختیار ہے گو وہ کام عقل اور قوانین فطرت کی رو سے کیسے ہی متناقض کیوں نہ ہوں اس مسئلہ کا ان کو ایسا دلی اعتقاد ہے کہ جو کوشش ان کے اس اعتقاد کے سست اور متزلزل کرنے میں کی جائے یقینا ناکام ہوگی وہ ہر حجت اور دلیل کے سننے سے یا اس پر ذرا سی بھی غور کرنے سے جو ان کے دل نشین عقیدہ کے مخالف ہو ضد سے انکار کئے جائیں گے۔ ایسے سادہ مزاج اور صاف باطن آدمیوں کو بہشتی آدمیوں کا لقب دیا گیا ہے۔ "**کما قیل اھل الجنة بله**" ان مقدس اور بزرگوار لوگوں نے اپنی تصنیفات میں یہ طریقہ رکھا ہے کہ بلا کسی تمیز کے جملہ روایتوں کو معتبر خیال کرتے ہیں اور ہر واقع کو جو اس میں مندرج ہے صحیح سمجھتے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی روایت مختلف صورتوں میں ان کے پاس پہنچے یا ایک ہی واقعہ کی نسبت متعدد روایتیں جو آپس میں متناقض ہوں ان تک پہنچیں تو وہ ان کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ واقعہ متعدد دفعہ اور متعدد صورتوں میں واقع ہوا ہوگا جن کا الگ الگ بیان ہر ایک روایت میں ہے۔

پس ایسے لوگوں کی تصنیفات جنہوں نے صحیح اور کامل غور وفکر کے ساتھ اس مضمون کو نہیں لکھا ہے بلکہ اندھا دھندی سے مذہبی جوش وحرارت کی بنا پر لکھ ڈالا ہے غیر ملک کے ان علماء کی نکتہ چینی کے قابل نہیں ہے جو اپنے دلائل کو ان کتابوں کی روایات مندرجہ پر مبنی کر کے ان سے ایسے نتائج مستنبط کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مذہب اسلام کے حق میں مضر ہوں۔

اقسام مذکورہ بالا کے سوا ایک اور قسم کی کتابیں بھی ہیں جو محض ان لوگوں کے لئے لکھی گئی تھیں جو مذہب اسلام پر بغیر کسی وسوسہ کے قوی اعتقاد رکھتے ہیں۔ یہ کتابیں اس غرض سے لکھی گئی تھیں کہ ان لوگوں کو مذہبی اعتقاد زیادہ ہو اور ان کی حرارت مذہبی زیادہ مشتعل ہو جائے جیسی کتاب شفاء قاضی عیاض ہے جس کی سند پر ہم اس کتاب سے عبارت پیش کرتے ہیں۔

قال القاضی ابو الفضل حسب المتامل ان یحقق ان کتابنا ھذالم نجمعه لنکر نبوۃ نبینا ولا لطاعن فی معجزاته فنحتاج الی نصب البرا ھین علیھا وتحسین حوزتھا حتی لا نتوصل المطاعن الیھا ونذکر شروط المعجزۃ والتحدی وحده وفساد قول من ابطل نسخ الشرایع ودده بل القناه لاھل ملة الملبین لدعوته والمصدقین لنبوۃ لیکون تا کیدا فی محبتھم ومنماۃ لا عمالھم ولیز دادوا ایمانا مع ایمانھم.

ان مصنفین نے اپنی تصنیفات میں واقات کا ذکر بلا تمیز ان کی صحت اور عدم صحت کے اور بدون کوشش ان واقعات کے اصلی

معنی دریافت کرنے کے کیا ہے پس اگر کوئی محقق نکتہ چین اپنی دلیل کو کسی جھوٹی روایت پر جو ایسی کتاب میں منقول ہوں مبنی کرتا ہے تو وہ ایمانداری اور راستبازی سے ہمارے مذہب کی تحقیق اور تدقیق نہیں کرتا۔

اسی قسم کے بعض بزرگوار ذی علم لوگوں نے جو اسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں اپنی تصنیف کے دائرہ کو بھی وسیع کر دیا ہے۔ وہ ہر چیز کے امکان کو خدا تعالیٰ کی قدرت کاملہ کی طرف منسوب کر کے اس بنا پر ہر ایک واقعہ کو صحیح خیال کرتے ہیں اور اس کے وقوع کے امکان کو منطقی دلیلوں سے تائید کر کے اپنے مذہب کے مخالف عیب چینوں کو جواب باصواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

• یہ کتابیں درحقیقت ایسی مصرح اور مدلل لکھی گئی ہیں کہ کوئی شخص جو کسی مذہب کو مانتا ہو اور مذہبی معجزات کا قائل ہو کسی عقیدہ مندرجہ کتب مذکور پر بدون اس کے کہ اپنے مذہب کو بھی ویسے ہی الزمات اور اعتراضات کا مورد بنائے حرف گیری نہیں کرسکتا۔

لیکن اس شخص کے نزدیک جو قوانین قدرت کے برخلاف کسی امر کے ہونے پر اعتقاد نہیں رکھتا اور وحی اور الہام کو بھی نہیں مانتا ان کتابوں کی دلیلیں جن کی نصف کی بناء مذہب کے اوپر ہے اس آدمی کی مانند ہیں جس کی صرف ایک ٹانگ ہو اور چلنے پھرنے سے عاری ہو۔

ان علماء نے جو اوروں کی نسبت زیادہ ذی علم تھے اپنی تصانیف میں ایک فلسفیانہ قاعدہ اس امر کے ثابت کرنے کے لئے اختیار کیا ہے کہ مذہب علم سے مطابقت رکھتا ہے انہوں نے ہر روایت کی صحت کی تحقیق کی ہے اور ہر ایک لفظ کے معنوں پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان الفاظ سے کیا مراد ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ علمائے فلسفی میں سب سے پچھلے خیال کئے جاتے ہیں مگر افسوس کی بات ہے کہ ایسی تصنیفات جیسی کہ ان کی ہیں کچھ زیادہ مطبوع اور مروج نہ ہوئیں کچھ تو اس وجہ سے کہ ان کے مضامین عام لوگوں کے احاطہ فہم وادراک سے باہر ہیں اور کچھ اس سبب سے کہ وہ ان بزرگوار مصنفوں کے مطبوع خاطر نہیں جو عقائد مذہبی پر فلسفی دلیلیں لانے پر اعتراض کرتے ہیں اور اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ مذہب کے ثبوت پر حکمت سے استمداد کی جائے۔

پہلی قسم کے علماء کو جنہوں نے اپنے مذہب کے فلسفی دلائل پیش کرنے میں جانفشانی کی ہے۔ دوسری قسم کے علماء ان کو دین حق کا دشمن قرار دیتے ہیں اور ان کو گمراہ کہتے ہیں جس اتہام سے خود شاہ ولی اللہ صاحب بھی نہیں بچے۔

لیکن ان کتابوں میں ایک اور نقص بھی پایا جاتا ہے یعنی وہ دلیلیں جو ان پر مستعمل ہوئی ہیں فلسفہ قدیم کے اصول پر مبنی ہیں جن میں سے اکثر تو رواج سے ساقط یا غلط ثابت ہوگئی ہیں یا علوم جدیدہ میں مختلف طور پر بیان ہوئی ہیں مگر یہ نقص صرف علمائے دین اسلام پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ اور مذہبوں کے عالموں میں بھی جو دین کی بحث اصول فلسفہ پر کرتے ہیں موجود ہے۔ اس لئے ہر مذہب وملت کے عالموں کا جو اس کو پاک اور بے لوث رکھنا چاہتے ہیں یہ فرض ہے کہ ان کتابوں کی جو فلسفہ قدیم کے اصول پر لکھی گئی ہیں نظر ثانی کریں اور فلسفہ جدیدہ کے اصول پر نئی کتابیں لکھیں اور اپنے مذہب کے اصول کو اصول قانون قدرت کے مطابق بحث کرنے کے قابل کریں۔

چہارم کتب فقہ

جب کہ حدیثوں کا یہ حال تھا جو ہم نے اوپر بیان کیا تو ان لوگوں کا جنہوں نے احکام شرعی کو مستنبط کرنا چاہا نہایت ہی مشکل تھا اور جب کہ کتب حدیث لکھی جا چکیں اس وقت یہ کام اور بھی زیادہ مشکل ہو گیا۔ جو عالم کہ سب سے زیادہ لائق تھا اس نے صرف [1] قرآن مجید کو اپنا رہنما سمجھا جس کی صحت وصداقت علی العموم مسلم تھی اور بڑے بڑے عالموں نے جو مجتہد کہلاتے ہیں قرآن اور احادیث جو دستیاب ہوئیں (اور کچھ شک نہیں جو افادہ ظن سے زیادہ اور کوئی بات ان سے حاصل نہیں ہوئی تھی) احکام شرع کے لئے ماخذ قرار دیا۔ اول قرآن مجید کو اور بعد اس کے ان حدیثوں کو جن کی صحت پر ان لوگوں کو یقین تھا جنہوں نے ان کو جمع کیا تھا درجہ دیا جاتا تھا اس کے بعد صحابہ کے اقوال اور کاموں کو اور بعض عالم تابعین کے اقوال اور کاموں کو بھی اس کام کے لئے فائدہ مند خیال کرتے تھے۔

جو لوگ کہ اس کام پر متوجہ ہوئے مجتہد اور فقیہ اور ان کا لقب تھا۔ اکثر ایسی صورتیں بھی فقہائے اسلام کے سامنے پیش کی گئیں یا درحقیقت واقع ہوئیں جو قرآن مجید یا احادیث میں نہیں پائی گئیں اور اسی وجہ سے بادی النظر میں کوئی قطعی فیصلہ ان صورتوں کا قرآن مجید یا کتب حدیث میں نہیں پایا گیا۔ اس مجبوری کی حالت میں فقہائے اسلام نے قرآن مجید اور احادیث میں ایسے اصول کی تلاش کی جو ان صورتوں پر حاوی ہوں اور خوش قسمتی سے وہ اس میں کامیاب ہوئے اور الفاظ کے استعمال اور طرز بیان سے اور ایک حکم کے جو کسی واقعہ میں ہوا تھا اس کے مشابہ ایک دوسرے واقعہ پر قیاس کرنے سے اس مطلب کو حاصل کیا۔

ان علماء نے بعض اوقات قرآن مجید کے ایسے حکم کو جو کسی خاص سے متعلق تھا عام ٹھہرایا اور کبھی قرآن مجید کے ایسے حکم میں جو ظاہر میں عام ہوتا تھا مستثنیات قائم کئے۔ انہیں علماء نے بعض ایسے اصول وقواعد منضبط کئے جن پر عمل کرنے سے عجیب وغریب مقدمات میں بھی قرآن مجید اور حدیث سے احکام مستخرج ہو سکیں اور یہ ایک نئی شاخ علم دین کی علوم دینیہ میں قائم ہو گئی جو بنام اصول فقہ موسوم ہے۔ اسی بنیاد پر انسان کے تمام افعال کی نسبت احکام استخراج کئے گئے اور اس میں کتابیں لکھی گئیں جو کتب فقہ کہلاتی ہیں۔ ان کتابوں میں سب سے پچھلی کتاب جو فرقہ حنفیہ کے اصول پر لکھی گئی وہ فتاویٰ عالمگیری ہے جو شہنشاہ عالمگیر کے حکم سے مرتب ہوئی تھی۔ فقہ کی تمام کتابوں کے مصنفین کا نہایت شکر گزر ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس قدر محنت اور جانفشانی سے ان کو لکھا ہے اور جس قدر تعظیم واکرام ان مصنفین کو شایان ہے اتنی ہی قدر ومنزل ان کتابوں کی سزاوار ہے لیکن باستثنائے ان احکامات کے جو خاص قرآن مجید سے جن میں کچھ شبہ نہیں ہو سکتا اخذ کئے گئے ہیں اور ان احکامات کے جو ان احادیث سے لئے گئے ہیں جن میں روایتاً اور درایتاً دونوں طرح پر صحیح ومعتبر ہونے کا ظن غالب ہے باقی احکامات کو گو کہ فقہا نے قرآن مجید اور احادیث ہی سے مستنبط کیا ہو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ مثل نصوص صحیح کے مذہبی احکام ہیں۔ غیر ملک کے مصنفین اور نکتہ چین محققین نے ایسے مستخرجہ احکام

---

[1] جناب پیغمبر خدا کے زمانہ میں قرآن مجید جیسا کہ بالفعل موجود ہے تمام وکمال یک جا لکھا ہوا نہ تھا وہ علیحدہ علیحدہ حصوں میں لکھا ہوا تھا اور کچھ آیتیں ایسی تھیں جو صرف لوگوں کو یاد تھیں اور بعض آدمی ایسے بھی تھے جن کو تمام وکمال حفظ تھا۔ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں ان لوگوں نے ان تمام متفرق حصوں کو ایک جگہ جمع کیا جس طرح کہ اب موجود حالت قرآن مجید کی ہے اور ان تمام لوگوں نے جنہوں نے اس کو خود پیغمبر خدا کی زبانی سنا تھا اس مجموع کی صحت اور درستی کو تسلیم کیا۔

کواصلی ارکان دین اسلام سمجھنے میں اکثر مغالطہ کھایا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ وہ ذی لیاقت علماء جنہوں نے ان احکامات کو اسلام کے اصول اصلی سے متخرج کیا ہے بہ نسبت ہمارے بہت بڑے عالم تھے مگر اس اصول پر کہ "الانسان مرکب من الخطاء و النسیان" یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں کچھ خطا نہیں ہے اور وہ سب احکامات متخرجہ خطا و غلطی سے بالکل مبرا ہیں۔ اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری کتب فقہ دو قسم کے اصول واحکامات سے بھری ہوئی ہیں۔ ایک ان احکامات اصلی سے جو بغیر کسی شبہ کے منصوص ہیں دوسرے وہ جن کو علمائے مجتہدین نے مستنبط اور متخرج کیا ہے اور جو اسی وجہ سے ممکن الخطاء خیال کئے جاسکتے ہیں پس ان لوگوں کا جو ہمارے احکام شرعی کی تحقیق وتدقیق کرنا چاہیں فرض ہے کہ اول قسم کے احکام کو دوسری قسم کے احکام سے تمیز کریں کیونکہ اگر دوسری قسم کے احکام میں کوئی نقص پایا جائے تو اس کو مذہب اسلام پر عائد کرنا نہیں چاہیے بلکہ اس کا الزام اس عالم کے سر پر ہے جس نے ان احکامات کو استخراج کیا ہے اور جو مذہب اسلام کے ایک فقیہ ہونے سے کچھ زیادہ رتبہ کا مستحق نہیں ہے۔

مذہب اسلام میں جو چار بڑے فقیہ اور مجتہد گزرے ہیں جن کی تمام مسلمان پیروی کرتے ہیں ان کی بھی یہی رائے ہے۔[1]

قال الشیخ عبدالوھاب الشعرانی فی الیواقیت کان ابوحنیفة رحمة الله علیه اذا افتی یقول ھذا رای النعمان ابن ثابت یعنی فی نفسه وھو احسن ما قدرنا علیه فمن جاء باحسن منه فھو اولی بالصواب.

وقال کان الا مام مالک رحمة الله تعالیٰ یقول ما من احد الا ھو ماخوذ من کلامة و مردود علیه الرسول ﷺ.

ثم قال و کان الامام احمد رحمة الله علیه یقول لیس کا حد مع الله ورسوله ﷺ کلام وقال ایضاً للرجال لا تقلدونی ولا تقلدن مالکا ولا الاوزاعی ولا غیر ھم وخذوا الا حکام من حیث اخذوا من الکتاب والسنة وروی الحاکم و البیھقی من الشافعی رحمة الله انه قال یوما للمزنی یا ابراھیم لا تقلدنی فی کل ما اقول وانظرنی ذلک بنفسک فانه دین وکان وحمد الله یقول لا حجة فی قول احد دون رسول الله ﷺ.

☆☆☆

[1] اما ابوحنیفہ ۸۰ ہجری مطابق ۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۵۰ ہجری مطابق ۷۶۷ء میں وفات پائی۔
امام مالک ۹۵ ہجری مطابق ۷۱۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹ ہجری مطابق ۷۹۵ء میں وفات پائی۔
امام احمد بن حنبل ۱۶۴ ہجری مطابق ۷۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ ہجری مطابق ۷۵۵ء میں وفات پائی۔
امام شافعی ۱۵۰ ہجری مطابق ۷۶۷ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰۴ ہجری مطابق ۷۱۹ء میں وفات پائی۔

الخطبة السادسة

فی

الروایات المرویات فی الاسلام

یاایها الذین امنوا ان جاء کم فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوما بجالهة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین.

مذہب اسلام کی روایتوں کی اصلیت اوران کے رواج کی ابتدا

تاریخ اسلام کے ابتداء زمانہ سے آج تک قرآن مجید شرع محمدی کا لازوال منبع رہا ہے اور ہمیشہ تک رہے گا۔ ہر مسلمان کا یہ اعتقاد ہے کہ خود جناب پیغمبر خدا ہمیشہ قرآن مجید کے موافق کاربند ہوتے ہوئے ہیں یعنی جو احکام قرآن مجید میں بہ صریح مندرج ہیں خواہ استدلالاً اس سے نکلتے ہیں انہیں کے مطابق عمل فرمایا ہے۔ یہ اصول ہر قرن میں ملحوظ رہا اور کوئی قول برخلاف قرآن مجید کے تسلیم نہیں کیا گیا۔ یہی اصول ہم کو حضرت عائشہ نے سکھایا ہے جب کہ اس نے سماع موتی کی حدیث کو قرآن مجید کے برخلاف ہونے کی وجہ سے رد کر دیا پس جو حدیث کہ قرآن مجید کے منشاء کے متناقض ہو اس کو یک لخت غیر معتبر اور موضوع خیال کرنا چاہیے۔

لیکن جب کہ ہم وحی ''غیر متلو'' میں بھی یعنی ایسی وحی میں جس کا مطلب آنحضرت ﷺ پر القا ہوا ہو اور اس مطلب کو آنحضرت ﷺ نے اپنے لفظوں میں بیان فرمایا ہو جس پر حدیث کا اطلاق ہوتا ہے اعتقاد رکھتے ہیں تو بلاشک ہم پر واجب ہے کہ احادیث نبوی کو جمع کر کے جہاں تک ممکن ہو ان کی تحقیق اور تدقیق کریں۔ مگر جب ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی صحیح حدیث قرآن کے منشاء کے خلاف نہیں ہوسکتی تو ہم کو اس تحقیقات میں معلوم ہوگا کہ صحیح حدیثیں صرف تین قسم کی ہوسکتی ہیں۔ اول وہ جو قرآن مجید کے مطابق ہوں اور اس کی تائید کرتی ہوں۔ دوسری وہ جن سے قرآن مجید کی آیتوں کی تفسیر ہوتی ہو اور تیسری وہ جو ایسے امور سے متعلق ہوں جن کا قرآن مجید میں کچھ ذکر نہیں ہے۔

لیکن خود جناب پیغمبر خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ سوائے قرآن مجید کے ان کا تمام کلام وحی نہیں ہے بلکہ وحی وہ ہے جو تبلیغ رسالت سے علاقہ رکھتی ہے اور جس کی نسبت خود جناب پیغمبر خدا نے ان کا وحی سے ہونا بیان فرمادیا ہے یا ان میں ایسے امور بیان ہیں جو عقائد مذہبی اخلاق، عالم عقبیٰ اور روح کے حالات سے علاقہ رکھتے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ بغیر وحی کے معلوم نہیں ہوسکتے مذکورہ بالا اقسام کے سوا باقی کلام آنحضرت کا وہ ہے جو تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا اور جس کی نسبت خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ

انما انا بشرا اذا امرتکم بشئی من امر دینکم فخذوه واذا امرتکم بشئی من رائی فانما انا بشر.

''اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں ایک انسان ہوں جب میں تم کو تمہارے دین کی کسی چیز میں حکم کروں تو اس کو پکڑلو اور جب

میں تم کواپنی رائے سے کسی چیز میں حکم کروں تو میں بھی انسان ہوں۔''
اور حدیث تابیر النخل میں فرمایا ہے کہ

فانی انما ظننت ظنا ولا تواخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئا فخذوبہ انی لم اکذب علی اللہ.

''میں نے ایک طرح کا گمان کیا تھا اور گمان کرنے میں تم مجھ سے کچھ جھگڑا مت کرو لیکن جب میں تم کو خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو پکڑلو کیونکہ اس خدا پر جھوٹ نہیں کہتا۔''

شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے جو بیماریوں کا علاج بتایا یا کسی رنگ کے گھوڑے کو پسند یا ناپسند کیا یا کوئی کام آنحضرت نے بطریق عادت کیا نہ بطور عبادت کے یا اتفاقیہ کوئی کام بغیر قصد کے ہوگیا یا آنحضرت کی ایسی باتیں جیسی کہ لوگ آپس میں کیا کرتے ہیں اور نیز ایسے کام جو سرداروں کو لشکروں کے معین کرنے اور ان کے لئے نشانیوں کے قرار دینے اور متخاصمین کے درمیان فیصلہ کرنے کے ہیں یہ سب اسی دوسری قسم میں داخل ہیں۔ زید ابن ثابت نے کہا کہ میں آنحضرت کے ہمسایہ میں رہتا تھا پھر جب وحی آتی تھی تو مجھ کو یاد فرماتے تھے اور میں اس کو لکھ دیتا تھا۔ پھر جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آنحضرت بھی ہمارے ساتھ اسی کا ذکر کرنے لگتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو ہمارے ساتھ اسی کا ذکر کرنے لگتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو کھانے کا ذکر فرماتے تھے پس سوائے ذکر آخرت کے باقی تمام باتیں تمام باتیں تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتیں۔ بایں ہمہ آنحضرت کے تمام افعال واقوال کا نہایت ادب کرتے ہیں اور ان کو مقدس اور نہایت نیک خصال اور پاک اقوال اور افعال سمجھتے ہیں مگر رسالت سے ان کو کچھ تعلق نہیں۔

غرض کہ چار قسم کے اقوال آنحضرت کے ایسے ہیں۔ جن پر ہم کو غور کرنی لازمی ہے۔ (۱) وہ جو ہمارے دین سے علاقہ رکھتے ہیں۔ (۲) جو جناب پیغمبر خدا کے مخصوص حالات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ (۳) ایسے اقوال جو تمام لوگوں کے حالات پر موثر ہیں۔ (۴) وہ احکام جو سیاست ملکی اور انتظام مدنی سے متعلق ہیں۔

ان میں سے پہلی قسم تو کچھ طلب نہیں ہے مگر صرف پچھلی تین قسمیں اس قابل ہیں کہ ان کی نسبت اس قسم کی تحقیق وتدقیق کی جائے کہ کون سے ان میں کے ازروئے وحی کے ہیں اور کون سے ان میں کے ازروئے وحی کے نہیں ہیں اور ہم کو لازم ہے کہ صرف انہیں احادیث کو وحی سمجھیں جن کی نسبت ہم کو ایسا سمجھنے کے لئے کافی دلیل اور ثبوت ہو۔

اگرچہ جناب پیغمبر خدا نے ہم کو بہ تصریح ان کے قدم بقدم چلنے بلکہ صحابہ اور تابعین کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے مگر یہ حکم محض متعلق بہ معاملات دین سمجھا گیا ہے۔ ہم مسلمان کو بھی حتی الامکان مذکورہ بالا امور میں ان کی پیروی کی کوشش کی ہے مگر اخیر کے تین امروں کی پیروی کرنے میں اتنا فرق ہے کہ پہلی صورت میں یعنی اگر ان کا وحی سے ہونا ثابت ہو تو اس کی اطاعت اور پیروی ہم پر فرض ہے اور دوسری صورت میں ہم اپنی خوشی سے عالم عقبیٰ میں ثواب حاصل کرنے اپنے پیغمبر کی محبت اور ان کی تعظیم اور عقیدت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں اور اگر ہم چاہیں یا حالات زمانہ اس کے ترک پر ہم کو مجبور کریں تو بغیر اس کے کہ مذہب میں کچھ نقصان عائد ہو یا کسی گناہ کے مرتکب ہوں اس کو ترک کر سکتے ہیں۔

اسی قسم کے خیالات نے ہم کو جناب پیغمبر خدا کی جملہ احادیث کو جمع کرنے اور ان کی تحقیق کرنے پر مجبور کیا۔ جناب پیغمبر کی

حیات ہی میں اسلام کی سلطنت جزیرہ عرب میں وسیع ہوگئی تھی اور بیشمار لوگوں نے دین اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہر مسلمان کی جناب پیغمبر خدا تک رسائی محال تھی اس لئے جناب پیغمبر خدا کے اقوال اور افعال اور عادات کا علم ان مسلمانوں تک پہنچانا جو اقطاع دور دراز میں رہتے تھے لازم ہوا اور اسی وجہ سے پیغمبر خدا نے اس بات کو پسند کیا جیسا کہ حدیث ذیل میں مذکور ہے پس اسی زمانہ سے روایتوں کے بیان کرنے کا رواج ہوا۔

عن ابن مسعود قال سمعت رسول الله ﷺ یقول نضر الله امرأ سمع منا شیئا فبلغه کما سمعه فرب مبلغ اوحی له من سامع. (رواه الترمذی وابن ماجه ورواه الدارمی عن ابی الدردا.)

''ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ نے فرمایا کہ خدا اس شخص کو سیراب کرے جس نے مجھ سے کوئی بات سنی اور اس کو اسی طرح دوسروں کو پہنچایا جیسے کہ مجھ سے سنا تھا سو اکثر پہنچائی گئی سننے والے سے زیادہ اس کو یاد رکھنے والے ہیں۔''

اگرچہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب پیغمبر خدا کی حیات ہی میں چند اشخاص بعض متفرق احادیث کو بھی قلمبند کر لیا کرتے تھے اور آنحضرت کی وفات کے بعد سے اس رواج کو زیادہ ترقی ہوتی گئی مگر ان دونوں زمانوں میں یہ رسم اس قدر محدود تھی کہ کسی خاص غور اور توجہ کے لائق نہیں ہے۔ اس زمانہ میں بہت سے لوگ زندہ موجود تھے جنہوں نے خود جناب پیغمبر خدا کا کلام سنا تھا اور جو ایسے نہ تھے ان کو جناب پیغمبر کے اقوال اور افعال اور عادات کی نہایت آسانی سے واقفیت ہو سکتی ہے اور اس لئے احادیث کے جمع کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

مگر رفتہ رفتہ جب کہ وہ سن رسیدہ آدمی جنہوں نے جناب پیغمبر خدا کا زمانہ دیکھا تھا یکے بعد دیگرے انتقال کرتے گئے اس وقت لوگوں کو احادیث کے جمع کرنے کی اشد ضرورت معلوم ہوئی یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری کے شروع میں چند دین دار اور پرہیزگار آدمیوں نے جنہوں نے اس دنیائے دون پر لات ماری تھی اور اپنی جان کو محض راہ خدا میں وقف کر دیا تھا اور احادیث کے جمع کرنے کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا' کتابیں لکھنی شروع کیں اور رفتہ رفتہ صحیح اور غیر صحیح کتابوں کا ایک انبار ہو گیا۔

اس سزا کا بیان جس کا مستحق جھوٹ حدیث کرنے والے کو جناب پیغمبر خدا نے قرار دیا ہے

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ جناب پیغمبر خدا کی حیات ہی میں اور آنحضرت کے ارشاد کے مطابق حدیثوں کے اور لوگوں تک پہنچانے کی رسم شروع ہوگئی تھی مگر اس بات کا بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ ایک شخص کے دوسرے شخص تک حدیث پہنچانے میں کس قدر احتیاط کرنے کا منشاء آنحضرت کا تھا اور اس منشاء کے ظاہر کرنے کو ترمذی اور مسلم کی حدیثوں کو اس مقام پر ذکر کر دینا کافی ہوگا۔

ترمذی کی حدیث میں ہے کہ

عن ابن عباس قال قال رسول الله ﷺ اتقوا الحدیث عنی الا ما علمتم فمن کذب علی متعمدا فلیتبوء مقعده من النار. (رواه الترمذی)

''ابن عباس سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے حدیث روایت کرنے میں پرہیز کرو مگر اس قدر جتنا کہ تم جانتے ہو۔ سو جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ کہے گا اس کو اپنا ٹھکانا آگ میں بنانا چاہیے۔ (ترمذی)
مسلم کی حدیث میں ہے کہ

عن سمرة بن جندب والمغيرة بن شعبه قال قال رسول الله من حدث عني بحديث يرى انه كذب فهوا حدا الكاذبين. (رواه مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص مجھ سے کسی حدیث کو یہ جان کر روایت کرے کہ وہ جھوٹ ہے تو وہ خود جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا ہے۔

مگر باوجود اس احتیاط کے ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اسلام میں جھوٹی اور بے بنیاد روایتیں اور موضوع کتابیں یہودیوں اور عیسائیوں میں مروج ہو گئی تھیں۔ لیکن اتنا فرق ہے کہ علمائے اسلام نے مقدس جھوٹ کو کبھی اپنے مذہب کے عقائد میں قرار نہیں دیا بلکہ وہ ایسے کام کو ہمیشہ گناہ عظیم سمجھتے رہے اور اس لئے انہوں نے ایسی جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کو گو کیسے ہی پاک اور نیک ارادہ سے انہوں نے ایسا گیا ہو جہنم کے سوا اور کوئی جگہ نہیں دی اور ان کو اس آگ سے بچانے میں کبھی کوشش نہیں کی مگر برخلاف اس کے علماء کے مذہب عیسوی نے مثل آرجن وغیرہ کے صریح اپنے باطنی عقائد کے خلاف معاملات مذہبی میں مقدس جھوٹ کو کچھ جائز ہی نہیں رکھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول خیال کیا۔

سر ولیم میور صاحب اپنی اردو تاریخ دین مسیحی میں بیان کرتے ہیں کہ ''دوسری صدی میں مسیحیوں میں گفتگو رہی کہ جب بت پرست فیلسوف اور حکیموں کے ساتھ دین کا مباحثہ کیا جائے تو انہیں کی بحث کا طرز اور طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کہ نہیں۔ آخر کار آرجن وغیرہ کی رائے کے بموجب طریقہ مذکور تسلیم ہوا اس سے البتہ مسیحی مباحثوں کی تیز عقلی نکتہ سنجی نے بحث میں زیادہ رونق پائی لیکن راستی اور صفائی میں کچھ خلل پڑا۔ پھر اسی سبب سے بعض لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جعلی تصنیفات پیدا ہوئیں جو کہ اس زمانہ کے بعد کثرت سے لکھی گئیں اس طرح سے کہ فیلسوف لوگ جب کسی طریقہ کی پیروی کرتے تھے تو کبھی کبھی اس کے حق میں کتاب لکھ کے کسی معروف حکیم کے نام سے اجرا کرتے تھے کہ اس حیلہ سے لوگ اس پر متوجہ ہو کر اس کی باتیں زیادہ مانیں گے اگرچہ اس کی باتیں برملا خود مصنف کی ہوتیں سو اسی طرح مسیحی جو فلسفیوں کی طرح بحث کرتے تھے کتاب لکھ کے کسی حواری یا خادم حواری یا معروف اسقف کے نام سے رواج دیتے تھے۔ ایسا دستور تیسری صدی میں شروع میں ہوا اور کئی سو برس تک رومی کلیسیا میں جاری رہا۔ یہ بات بہت ہی اس کے حق اور قابل الزام شدید کے تھی''۔ میور صاحب کی تاریخ دین مسیحی حصہ دوم باب ۳)

موشیم نے اپنی کتاب تاریخ مذہبی میں اس طرح پر لکھا ہے کہ ''افلاطونی اور فیثا غورثی حکماء نے صدق اور پاکبازی کی حمایت میں فریب دینے اور جھوٹ بولنے کو جائز ہی قرار نہیں دیا ہے مگر مستحسن ٹھہرایا ہے۔ یہودیان ساکن مصر نے اس عقیدہ کو قبل سنہ مسیحی کے ان سے سیکھا۔ اس میں اس شخص کو کچھ کلام نہ ہوگا جس کو کہ کتابوں کو مشہور آدمیوں کی طرف منسوب کرنے کی بیشمار جعلسازیاں۔ نظمی پیشین گوئیاں اور اسی قسم کی واہیات چیزیں جن کی ایک بڑی مقدار اس صدی اور آئندہ صدیوں میں ظاہر ہوئی تھی یاد ہیں۔ میں نہیں کہتا کہ پکے عیسائیوں نے اس قسم کی سب کتابوں کو موضوع کیا تھا برخلاف اس کے اغلب یہ ہے کہ ان کے ایک جز و اعظم کے موجد فرفجاب نسطیق بانی ہوئے تھے مگر اس بات سے کہ پکے عیسائی اس قصور سے محض مبرانہ تھے صریح انکار نہیں ہو سکتا

(اینکلیز یا سٹکل ہسٹری باب ۴ صفحہ ۷۰ مطبوع ۱۸۶۰ء)

ایک اور مقام پر موشیم نے اسی مضمون کو اس طرح پر لکھا ہے ''لیکن اس کا اس قدر جلد عمل میں آنا مختلف اسباب پر موقوف تھا بالخصوص یہ امر کہ حضرت مسیح کے صعود کے بعد بھی ان کی سوانح عمری اور احکامات کی بہت ہی تواریخیں جن میں جھوٹے قصے اور کہانیاں بھری ہوئی تھیں ایسے لوگوں نے شاید مرتب کی تھیں جن کے ارادے شائد برے نہ تھے بلکہ وہ وہمی سادہ مزاج اور مقدس جھوٹ کے عادی تھے اور بعد ازاں مختلف موضوع تصنیفات بنام نہاد حواریان مقدس سارے جہان میں مشہور کی گئیں۔''
(اینکلیز یا سٹکل ہسٹری (سیرت) حصہ دوم باب ۲ صفحہ ۳۶)

اس طرز تحریر کے بیان میں جو روایات کے لکھنے میں مستعمل کیا گیا تھا

اس بات کے ظاہر کرنے کو کہ حدیث ایک شخص سے دوسرے تک کس طرح پہنچی محدثین نے چند کلمات بطور اصطلاح کے مقرر کئے تھے اور اسی لئے حدیث کے ہر ایک راوی پر واجب تھا کہ انہیں کلمات مخصوص سے جو اس حدیث کے واسطے موزوں ہوں حدیث کو شروع کرے اور یہ اس لئے کیا گیا تھا کہ ہر حدیث بلحاظ بیان کے اسی قدر اعتبار کیا جائے جس درجہ اعتبار کے وہ سزاوار ہو۔

کلمات مذکورہ یہ ہیں (۱) ''حدثنا'' یعنی اس نے مجھ سے کہا (۲) ''سمعته یقول'' یعنی میں نے اس کو کہتے سنا' (۳) ''قال لنا'' یعنی اس نے مجھ سے کہا' (۴) ''ذکرنا'' یعنی اس نے مجھ سے ذکر کیا' (۵) ''اخبرنا'' یعنی اس نے مجھ کو خبر دی' (۶) ''انبانا'' یعنی اس نے مجھ کو آگاہ کیا' (۷) ''عن فلان'' یعنی اس سے۔

اول کے چار کلمے صرف اس صورت میں استعمال کئے جاتے تھے جب کہ کوئی راوی کسی دوسرے شخص سے حدیث کے الفاظ بجنسہ بیان کر دیتا تھا۔ پانچواں اور چھٹا کلمہ اس مقام پر استعمال کیا جاتا تھا جب کہ کوئی راوی اپنے سے اوپر کے راوی سے کسی امر یا واقعہ کی صحت یا عدم صحت کی نسبت دریافت کرتا تھا۔ اخیر کلمہ ایک مبہم کلمہ ہے اور اسی وجہ سے یہ امر منقح نہیں ہو سکتا کہ اخیر راوی نے جو دوسرے راوی کا نام لیا ہے وہ حدیث درحقیقت اس راوی نے بیان کی ہے یا اس کے اور اخیر راوی کے درمیان اور لوگ روایت کرنے والے بھی چھوٹ گئے ہیں۔ اس اشتباہ کے رفع کرنے کو خارجی امور کی تحقیقات ضرور ہوتی ہے مگر ان کی نسبت علماء کی مختلف رائیں ہیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ اگر یہ محقق ہو جائے کہ وہ راوی سلسلہ روایت میں اور راویوں کے نام بفریب چھوڑ دینے میں متہم نہیں ہے اور وہ ایسے زمانہ میں اور ایسے مقام پر رہتا تھا کہ ان کا ایک دوسرے سے ملاقی ہونا ممکن تھا۔ گو کہ اس ملاقات کا ثبوت نہ ہو تو بھی یہ فرض کر لیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی اور راوی نہیں چھوٹا ہے۔

دوسری رائے جو بعض علمائے مستند کی رائے ہے یہ ہے کہ اس امر کا ثابت ہونا بھی ضرور ہے کہ وہ دونوں اپنی تمام عمر میں ایک مرتبہ بھی ملاقی ہوئے ہوں۔

تیسری رائے جو بعض علماء کا قول ہے یہ ہے کہ اس امر کا ثبوت بھی ضروری ہے کہ وہ اتنے عرصہ تک یکجا رہے ہوں جو ان کے ایک دوسرے سے حدیث سیکھنے کے واسطے کافی ہو۔

چوتھی رائے بعض عالموں کی یہ ہے کہ اس امر کا ثبوت بھی ضروری ہے کہ ایک نے دوسرے سے درحقیقت حدیث سیکھی بھی تھی۔

درجات احادیث کے بیان میں ایک راوی دوسرے تک پہنچنے کے لحاظ سے

جب کبھی کوئی حدیث بیان ہوتی ہے اس کا رتبہ سلسلہ سے جانچا جاتا ہے اور اس کی شناخت کے لئے الفاظ مصطلح مقرر کئے گئے ہیں۔

اول: ''مسند یا مرفوع'' یہ لقب اس حدیث کو دیا جاتا ہے جب کہ راوی صاف صاف بیان کرتا ہے کہ فلاں بات خود پیغمبر خدا نے خود بیان فرمائی تھی یا خود کی تھی یا اوروں نے ان کے روبرو کی تھی اور آپ نے منع نہیں فرمایا تھا۔

دوم: ''مرفوع متصل'' اگر ایسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ پیغمبر خدا تک لگا تار یعنی بلا فصل پہنچتا ہو تو اس کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔

سوم: ''مرفوع منقطع'' اگر ایسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ بلا فصل پیغمبر خدا تک نہ پہنچے تو اس حدیث کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔

چہارم: ''مرسل یا موقوف'' یعنی وہ حدیث جس کو پیغمبر خدا کے اصحاب نے بیان کیا ہو مگر پیغمبر خدا سے منسوب نہ کیا ہو۔

پنجم: ''مرسل یا موقوف متصل'' اگر راویوں کا سلسلہ اس صحابی تک جس نے اس کو بیان کیا ہے بلا فصل چلا گیا ہو تو اس حدیث کو یہ لقب دیا جاتا ہے۔

ششم: ''مرسل یا موقوف منقطع''، لیکن اگر راویوں کا سلسلہ اس صحابی تک مسلسل نہ ہو تو اس حدیث کا یہ لقب ہوتا ہے۔

اس بات میں کہ آیا حدیث ''مرسل یا موقوف متصل'' کو معتبر اور قابل استدلال خیال کرنا چاہیے یا نہیں علماء میں اختلاف رائے ہے لیکن صحابہ کی ایسی حدیث جس میں ایک ایسے واقعہ یا مقام کا مذکور ہو جہاں وہ خود موجود نہیں تھے تو اس حدیث کو کسی طرح بغیر اور کسی سند کے حدیث نبوی کے ہم پایہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان علماء کی رائے نہایت صحیح اور قرین انصاف ہے جو دربارہ نزول وحی کے حضرت عائشہ کی روایات کو قابل سند نہیں خیال کرتے کیونکہ وہ اس زمانہ میں موجود نہ تھیں۔

ہفتم: ''مقطوع'' یعنی وہ حدیثیں جو تابعین نے بیان کی ہیں اور اپنے سے اوپر کے صحابہ کی طرف منسوب نہیں کیا ہے۔

ہشتم: ''مقطوع متصل'' اگر ایسی حدیث کے راویوں کا سلسلہ اس تابعی تک برابر ہو جائے تو اس حدیث کا یہ نام ہے۔

نہم: ''مقطوع منقطع'' اگر اس کا سلسلہ اس تابعی تک نہ پہنچے تو اس حدیث کو اس نام سے پکارتے ہیں۔

دھم: ''روایت'' یہ اقسام مندرجہ بالا سے بالکل علیحدہ ہے۔ یہ نام ان حدیثوں کا ہے جو اس طرح پر شروع ہوتی ہیں ''یہ بیان کیا گیا ہے'' یا ''فلاں شخص نے یوں روایت کی ہے'' اس قسم کی روایتیں بازاری گپ سے کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔

ایسی ہی روایتوں سے ہمارے مفسرین و مورخین نے اپنی تصنیفات کا حجم بڑھا لیا ہے اور ایسی ہی واہیات اور بے ہودہ باتوں سے ہشامی طبقات کبیر' کاتب الواقدی وغیرہ کتابیں سیر و تواریخ کی پایہ اعتبار سے ساقط گنی جاتی ہیں اور جو مایہ افتخار و نازان عیسائی مصنفوں کا ہے جو مذہب اسلام کے برخلاف کتابیں لکھتے ہیں۔

درجات احادیث کے بیان میں بلحاظ راویوں کے چال وچلن یعنی ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کے

جب بھی کسی حدیث کے درجہ صحت کا امتحان راویوں کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کے لحاظ سے کیا جاتا ہے تو اس کا درجہ بترتیب ذیل قرار پاتا ہے۔

اول: ''صحیح'' اس نام سے وہ حدیث موسوم ہوتی ہے جس کے تمام راوی اول سے آخر تک پکے دیندار اور متقی اشخاص ہوں اور کبھی کسی قسم کی برائی کے ساتھ متہم نہ ہوئے ہوں بلکہ تدین اور صدق مقال کے واسطے مشہور اور سب لوگوں کے نزدیک مسلم ہوں۔

ایسی حدیثوں کا درجہ اعتبار اس سبب سے اور بھی بڑھ جاتا ہے جب کہ اس قسم کے راویوں نے علیحدہ علیحدہ بلا کسی اختلاف کے اسی حدیث کو بیان کیا ہو مگر ایسی حدیثیں نہایت ہی قلیل ہیں۔

دوم: ''حسن'' اس لقب سے وہ حدیثیں ملقب ہوتی ہیں جن کے تمام راوی اور اوصاف حمیدہ میں اول قسم کی حدیث کے راویوں کی کوئی ہمسری نہ کر سکتے ہوں مگر باایں ہمہ پرہیزگاری اور عام ثقاہت کے ساتھ متصف ہوں اور اس حدیث کی اصلیت بھی غیر مشتبہ ہو۔ اس قسم کی بیشمار حدیثیں ہیں جن سے معتبر کتب احادیث مملو ہیں۔

سوم: ''ضعیف'' یہ نام ان حدیثوں کو دیا جاتا ہے جن کے تمام راویوں میں سے ایک شخص بھی اول یا دوم قوم کے راویوں کی مانند نہ ہو۔ ان احادیث کے ضعف کا درجہ دیگر اسباب سے بھی زیادہ یا کم ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی کتب احادیث جو دوسرے درجہ کی کہلاتی ہیں اسی قسم کی احادیث سے بھری پڑی ہیں۔

چہارم: ''غریب'' یہ لقب ان حدیثوں کا ہے جن کے راویوں میں سے کسی نے بجز ایک آدھ حدیث کے اور کوئی حدیث نقل نہ کی ہو جس سے یقین ہوتا ہے کہ وہ فن حدیث میں کچھ تبحر نہیں رکھتا۔

راویوں کے درجہ اعتبار کے بیان میں ان کے تفقہ فی الدین کے لحاظ سے

تمام صحابہ کبار اور تابعین اور تبع تابعین جب کوئی حدیث آنحضرت ﷺ کی بیان کرتے تھے تو ان کے الفاظ بعینہ وہی نہیں ہوتے تھے جو آنحضرت نے فرمائے ہوں اور ایسا کرنا امکان سے بھی خارج تھا۔ معہذا خیال کیا گیا ہے کہ بعض دعائیں ایسی ہیں جن کے الفاظ بجنسہ محفوظ ہیں غرض کہ تمام حدیث کے راویوں میں حدیث کو بالمعنی روایت کرنے کا رواج تھا پس یہ بات قرین قیاس ہے کہ جو لوگ زیادہ علم رکھتے تھے اور تفقہ فی الدین کا ان کو زیادہ ملکہ تھا وہ آنحضرت ﷺ کے کلام کا بہ نسبت اوروں کے اچھی طرح پر مطلب سمجھتے ہوں گے اور اوروں کو بھی ٹھیک طور پر بخوبی سمجھا سکتے ہوں گے اس واسطے راویوں کے باعتبار ان کے علم کے سات درجے کئے گئے ہیں۔

اول: وہ جو علم اور تفقہ میں زیادہ تر ممتاز تھے اور حافظہ بھی قوی رکھتے تھے۔ ایسے اشخاص آئمہ حدیث کہلاتے ہیں۔

دوم: وہ جو پہلوں سے کم درجہ رکھتے تھے اور جن سے شاذ و نادر ہی کسی غلطی کے سرزد ہونے کا احتمال تھا۔
سوم: وہ جنہوں نے مسائل مذہبی میں اختلاف کیا تھا مگر اس کو اس قدر تعصب نہیں ہو گیا تھا کہ اعتدال سے متجاوز ہو گئے ہوں اور نیز ان کے تدین اور صدق کلام میں کسی طرح کا شک وشبہ نہیں تھا۔
چہارم: وہ جن کے حالات کی نسبت کچھ اچھی طرح آگاہی نہیں ہے۔
پنجم: وہ جنہوں نے مسائل مذہبی میں اختلاف کیا تھا مگر ان کا تعصب حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔
ششم: وہ جن کی طبیعت میں شک اور وہم بڑھا ہوا تھا اور ان کا حافظہ بھی قابل اعتبار کے نہ تھا۔
ہفتم: وہ جھوٹی حدیثیں بنانے میں مشہور اور بدنام تھے۔

علمائے دین کی یہ رائے ہے کہ اول تین درجے کے لوگوں کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو باعتبار ان کے مراتب کے صحیح خیال کرنا چاہیے اور اخیر کے تین درجے کے لوگوں کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو بلا تامل رد کر دینا چاہیے۔ باقی رہ گئے چوتھے درجہ کے لوگ ان کی بیان کی ہوئی حدیثوں کو جب تک کہ ان کے راویوں کا حال معلوم نہ ہو قابل اعتبار سمجھنا نہ چاہیے۔

جو روایتیں کہ یہودیوں کے ہاں مذکور تھیں ان کے بیان کرنے سے مسلمانوں کو ممانعت نہ تھی

آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہودیوں کے ہاں جو روایتیں ہیں ان کے بیان کرنے میں کچھ ہرج نہیں ہے چنانچہ اس کی تصدیق اس حدیث سے ہوتی ہے جو بخاری میں مذکورہ ہے اور اسی وجہ سے مسلمان یہودیوں کی روایتوں کے بیان کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں سمجھتے اور وہ حدیث یہ ہے۔

عن عبداللہ ابن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ بلغوا عنی ولوایة وحدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج من کذب علی متعمد افلیتبر مقعدہ من النار۔ (رواہ البخاری)

''عبداللہ بن عمر کہتے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پہنچاؤ مجھ سے اگرچہ ایک آیت ہو اور حدیث بیان کرو بنی اسرائیل سے اس میں کچھ ہرج نہیں ہے اور جو شخص قصداً مجھ پر جھوٹ بولے گا۔ تو اس کو اپنا ٹھکانا آگ میں بنانا چاہیے۔''

روایات میں اختلاف ہونے کے اسباب

جب کبھی ہم راویوں کی روایتوں میں اختلاف دیکھیں تو ہم کو یہ نتیجہ نکالنا نہیں چاہیے کہ یہ روایتیں راویوں کی بناوٹ ہے جیسا کہ عیسائی مورخ عموماً خیال کرتے ہیں۔ اس لئے احادیث موضوعہ کے سوا اور بھی قدرتی اسباب کو بیان کرتے ہیں جن کے سبب دو روایتوں میں اختلاف پڑتا ہے۔

اول: حدیث کے مطلب کی غلط فہمی۔
دوم: حدیث کے معنی سمجھنے میں دو راویوں کے باہم اختلاف یعنی ایک ہی حدیث کے ایک نے کچھ معنی سمجھے اور ایک نے کچھ۔

سوم: حدیث کا مطلب لوگوں سے صاف صاف بیان کرنے کی عدم قابلیت۔

چہارم: راوی کے حافظہ کا قصور کہ یا تو اس نے کسی حدیث کا کوئی جزو چھوڑ دیا یا دو مختلف حدیثوں کو باہم خلط ملط کر دیا۔

پنجم: راوی کا کسی جزو حدیث کی تفصیل کا بیان کرنا اس غرض سے کہ سننے والا آسانی اس کو سمجھ جائے لیکن سننے والے نے از راہ غلطی اس تفصیل کو بھی حدیث کا جزو سمجھا۔

ششم: راوی نے اپنی گفتگو میں جناب پیغمبر خدا کے چند کلمات بیان کئے اور سننے والوں نے اس کے تمام کلام کو حدیث سمجھ لیا۔

ہفتم: کسی راوی نے یہودیوں کی روایتیں بیان کیں اور سننے والے نے ان کو غلطی سے حدیث سمجھ لیا اور اسی ذریعہ سے یہودیوں کی روایتوں کا ختلاف مسلمانوں کے ہاں منتقل ہو آیا۔ اگلے نبیوں اور بزرگوں کے قصے جن سے ہمارے ہاں کی تاریخیں اور تفسیریں سیاہ ہیں سب انہیں ذریعوں سے پیدا ہوئے ہیں۔

ہشتم: وہ اختلافات جو زبانی روایات کے سلسلہ سے خود بخود عارض ہوتا ہے اور اسی ذریعہ سے معمولی باتیں معجزات اور کرامات کی صورت پیدا کر لیتے ہیں۔

نہم: مختلف حالات جن میں کہ راوی نے انحضرت کو دیکھا تھا یا کچھ فرماتے سنا تھا یا ذکر کرتے دیکھا تھا۔

یہ تمام اسباب ایسے ہیں جن کے سبب سے بغیر ارادہ تصنع کے قدرتی طور پر روایتوں میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔ منجملہ ان کے نویں قسم ایسی ہے کہ باوجود اختلاف کے کل روایتوں کا سچا ہونا ممکن ہے۔

موضوع حدیثوں کا بیان

اس میں کچھ شک نہیں کہ بہت سی حدیثیں جناب پیغمبر خدا کے نام سے جھوٹی اور موضوع بنائی گئیں اور جو لوگ کہ ایسی شرمناک جعلسازی کے مرتکب ہوئے تھے وہ مختلف قسم کے لوگ تھے۔

اول: وہ لوگ تھے جو عوام الناس میں کسی نیک رسم یا کسی ثواب کے کام کی ترویج کے خواہاں تھے اور اپنے کامیاب ہونے کی غرض سے انہوں نے کوئی حدیث بنا لی۔ اس قسم کی جعلسازی زیادہ تر ان حدیثوں سے متعلق ہے جن میں چھوٹے چھوٹے نیک کاموں کے کرنے میں بڑے بڑے ثواب بیان کئے ہیں اور نوافل کے پڑھنے میں گناہوں کے بخشے جانے اور قیامت میں اعلیٰ درجے ملنے کے وعدے کئے گئے ہیں۔ قرآن کی سورتوں کے پڑھنے کی عجیب عجیب خاصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ بیماریوں سے شفا پانے اور رزق میں فراخی ہونے کی خاصیتیں یا بعض قرآن کی سورتوں کا قیامت میں گناہ بخشوانے کے لئے شفیع ہونا بیان ہوا ہے۔ ان موضوع حدیثوں کے بنانے والوں کا منشاء یہ تھا کہ لوگ نیک کاموں میں اور قرآن مجید کی تلاوت اور نوافل کے ادا کرنے میں زیادہ متوجہ ہوں لیکن مذہب اسلام اس قسم کے فریبوں اور جھوٹوں کو پناہ نہیں دیتا بلکہ ان کو جہنم کی آگ میں ڈالتا ہے۔

دوم: واعظین نے اس غرض سے کہ ان کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو جائیں اور سننے والے عجیب وغریب باتوں کے سننے سے خوش ہوں اور نیز اس غرض سے کہ سننے والوں کے دل میں نرمی اور رحم اور خدا ترسی اور رقت قلب اور نیک کاموں کی رغبت پیدا ہو اور برے کاموں کی دہشت ان کے دل میں پیدا ہو اور خدا کا خوف اور نجات کی امیدیں ان کے دل میں

بھڑک اٹھیں بہت سی حدیثیں موضوع کرلیں مگر افسوس ہے کہ ان کو یہ خیال نہیں کہ ان کے ان افعال سے مذہب اسلام بالکل نفرت کرتا ہے۔ وہ حدیثیں زیادہ تر دوزخ اور بہشت اور ملائکہ کے حالات وغیرہ سے علاقہ رکھتے ہیں۔

سوم: وہ لوگ ہیں جنہوں نے مذہب کے مسائل میں اختلاف کئے اور اس تعصب میں اعتدال سے بڑھ گئے اور اپنی دلیلوں میں غلبہ حاصل کرنے کی غرض سے اس قسم کی حدیثیں وضع کرلیں جو ان کے مفید مطلب ہوں۔

چہارم: مخالفین مذہب اسلام نے جو اس زمانہ میں زیادہ تر یہودی اور مشرکین تھے، بہت سی باتیں سچ اور جھوٹ آنحضرت ﷺ کی نسبت مشہور کی تھیں اور وہ عرب میں پھیل گئی تھیں، رفتہ رفتہ بطور روایت کے بیان ہونے لگیں اور لوگوں نے غلطی سے ان کو حدیثوں میں شمار کیا۔

ہمارے علماء نے احادیث موضوع اور غلط روایات مروجہ کے دریافت کرنے میں از حد کوشش کی ہے اور اس بات میں اکثر کتابیں تصنیف ہوئی ہیں اور صحیح اور باطل روایتوں کی تحقیق اور تمیز کرنے کے لئے قواعد اور اصول منضبط کئے ہیں۔

مقدم اصول جو اس امر کی تحقیق کے لئے علماء نے قرار دیئے ہیں وہ یہ ہیں کہ احادیث کے الفاظ اور طرز عبارت کا امتحان کیا جائے۔ ہر حدیث کے مضمون کو قرآن مجید کے احکام اور عقائد و مسائل مذہبی مستخرجہ قرآن اور احادیث مستند سے مقابلہ ہو۔ احادیث کے منشاء اور بیان کی تحقیق اور تدقیق کی جائے کہ اس میں کوئی ایسا تاریخی واقعہ تو نہیں ہے جو از روئے تاریخ کے غلط ہو یا اس میں ایسے عجائبات تو نہیں بیان ہوئے جن کو عقل تسلیم نہ کرتی ہو۔ جن حدیثوں میں اس قسم کی باتیں پائی جاتی ہیں وہ موضوع خیال کی جاتی ہیں۔

مختصر طور پر اس کتاب کے پڑھنے والے جان لیں گے کہ جن احادیث کو ہم مسلمان قابل سند خیال کرتے ہیں ان میں کم سے کم مندرجہ ذیل امور کا ضرور بالضرور ہونا چاہیے یعنی راوی نے صاف اور مصرح طور پر بیان کردیا ہو کہ فلاں بات پیغمبر خدا نے فرمائی تھی یا کی تھی۔ سلسلہ راویوں کا پیغمبر خدا تک غیر منقطع ہو۔ پیغمبر خدا سے لے کر اخیر راوی تک جملہ راوی تقویٰ اور تدین اور نیک اعمال کے لئے مشہور ہوں ہر راوی کو اپنے ماسبق راوی سے ایک سے زیادہ حدیثیں پہنچی ہوں۔ ہر راوی لیاقت علمی اور تفقہ میں ممتاز ہوتا کہ یہ امر تلقین ہو جائے کہ اس نے حدیث کے صحیح معنی کو سمجھ لیا ہوگا اور اوروں کو بھی ٹھیک طور سے سمجھا دیا ہوگا۔ حدیث کا منشاء احکام مندرجہ قرآن مجید یا عقائد مذہبی مستخرجہ قرآن یا حدیث مستند سے متناقض نہ ہو۔ اس میں عجائبات وغرائبات دور از عقل بیان نہ ہوں بلکہ منشاء حدیث کا اس قسم کا ہو جس کے تسلیم کرنے میں لوگوں کو کلام نہ ہو۔

کوئی حدیث جس کی صحت اس طرح ثابت ہو جائے کسی عقیدہ مذہبی کی بناء ہوسکتی ہے مگر بااین ہمہ اس میں ایک اور شبہ کا عارض ہونا باقی رہ جاتا ہے یعنی وہ حدیث اس لئے کہ صرف ایک ہی شخص کی روایت ہے مفید یقین نہیں ہوسکتی بلکہ افادہ ظن کرتی ہے۔

اس شبہ کے سبب سے احادیث مستندہ کے بھی تین درجے قائم کئے گئے ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) متواتر، (۲) مشہور، (۳) خبر آحاد۔

متواتر: وہ حدیثیں کہلاتی ہیں جن کو جناب پیغمبر خدا کے زمانہ سے لے کر جملہ صحابہ کبار اور علمائے دین نے ہر ایک زمانہ میں پے در پے بالاتفاق مستند تسلیم کرلیا ہو اور ان میں کسی نے کبھی کوئی جرح وقدح نہ کی ہو۔ ہر زمانہ کے علماء کا قول ہے کہ صرف قرآن مجید ہی حد تواتر کو پہنچا ہے مگر بعض حدیثوں کو بھی متواتر بتاتے ہیں اور ان کی تعداد پانچ سے متجاوز نہیں ہوتی۔ ایسی احادیث پر بلاتکلف اعتبار کرنا اور ان پر معتقدانہ عمل کرنا واجب ہے۔

مشہور: ان حدیثوں کو کہتے ہیں جو تواتر کے درجہ تک نہ پہنچی ہوں مگر زمانہ کے عالموں نے ان کو صحیح تسلیم کیا ہو۔ یہ وہ حدیثیں ہیں جو ہماری کتب حدیث میں جو معتبر گنی جاتی ہیں منقول ہیں اور اس باعث سے ان کی صحت بالعموم مسلم ہے اور ہمارے **بعض عقائد** مذہبی بھی ان پر مبنی ہیں گو کہ وہ درایۃً تنقیح اور تنقید کے امتحان سے بری نہیں۔

خبر آحاد: **ان حدیثوں** کا نام ہے جو مذکورہ بالا حدیثوں کے اوصاف تک نہیں پہنچیں اور اسی قسم کی حدیثیں بہت کثرت سے حدیث کی کتابوں میں ہیں۔ علمائے عقائد اسلام اس باب میں کہ اس پچھلی قسم کی حدیثوں پر کوئی عقیدہ مذہبی مبنی ہوسکتا ہے یا نہیں مختلف الرائے ہیں۔

جن لوگوں نے کہ احادیث کے جمع کرنے کا بوجھ اٹھایا تھا ان میں سے جو سب سے اعلیٰ اور افضل اور ائمہ حدیث کہلاتے تھے انہوں نے اپنی ہمت صرف اس بات پر مصروف کی تھی کہ راویوں کے اعتبار کی کماحقہ تحقیق کرنے کے بعد حدیثوں کو لکھیں اور انہیں لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں صحاح میں داخل ہیں اور بعضوں نے اس بات پر ہمت مصروف کی تھی کہ جس قدر حدیثیں ان کو ملیں وہ جمع کرلیں انہیں کی لکھی ہوئی کتابیں دوسرے درجہ کی گنی جاتی ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جامعین حدیث نے ایسی کسی حدیث کو نہ اختیار کیا ہوگا جو علانیہ بادی النظر میں غلط ہو مگر جس قدر کہ حدیثیں انہوں نے منتخب کر کے جمع کرلیں اس پر ان کو از روئے درایت کے تحقیق اور تدقیق کرنے کا موقع نہیں ملا۔ انہوں نے یہ کام اپنے سے بعد کے لوگوں پر چھوڑا تھا افسوس ہے کہ ان کے بعد ان کی حدیثوں کی ایسی وقعت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی کہ ان بجز خاص علماء محققین کے درایۃً ان حدیثوں کی تنقیح اور تنقید کی جرأت نہیں ہوئی مگر از روئے مذہب اسلام کے ہر ایک مسلمان کا حق ہے کہ ان کی حدیثوں کی درایۃً تنقیح اور تنقید کرے۔ ہمارے مورخین نے اور مفسرین نے جو کام اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام دلدر اور ناقص اور ضعیف حدیثوں کو اپنی تصنیفات میں جگہ دیتے ہیں۔

عیسائی عالم جو کسی حدیث کے درجہ صحت اور تحقیق کے ان قواعد سے جو علما اسلام نے مقرر کئے ہیں محض ناواقف ہوتے ہیں اور درایت کے تو نام سے بھی واقف نہیں ہیں جب کوئی ایسی کتاب پڑھتے ہیں جس میں بجز بازارین احادیث اور روایات کے اور کچھ نہیں ہوتا تو اپنے دل میں سمجھ لیتے ہیں کہ جزئیات اسلام سے واقف ہوگئے اور ہمارے مذہب کی نکتہ چینی اور تضحیک شروع کرتے ہیں اور جب کہ ان کی یہ مایہ افتخار تصنیفیں مسلمانوں کی نظر سے گزرتے ہیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مصنفین کی بے علمی اور تعصب پر جو ان کی تصنیفات سے مترشح ہوتی ہے ہنستے ہیں اور ان کی بے فائدہ صرف اور اوقات پر افسوس کرتے ہیں۔

سر ولیم میور اور دیگر عیسائی مصنفوں کے شبہات کی تردید

اگرچہ ہم نے مسلمانوں کی روایتوں کا پورا پورا اور بہ تفصیل بیان کیا ہے تاہم بہ نظر مزید تحقیق اس آگاہی کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو ہم کو اپنے نبی کی سوانح عمری لکھنے والے دو لائق عیسائی مصنفوں سے حاصل ہوئی ہے یعنی اے اسپرنگر ایم ڈی اور سر ولیم میور ایل ایل ڈی سی۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے مسلمانوں کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بہت تھوڑا بیان کیا ہے اور اس تھوڑے ہی بیان سے ان کے مضمون سے بہت کم واقفیت ظاہر ہوتی ہے یہاں تک کہ ان کی مثال ٹھیک ٹھیک اس شخص کی سی ہے جو نہایت تاریکی میں پڑا ہو اور نور کی حقیقت کی تلاش میں تعصب اور کم فہمی سے جھوٹے شبہوں سے دھوکا کھا کر راہ گم کر گیا ہو اور بے اصل چیزوں کی پیروی میں اصل چیز

کو بھی ہاتھ سے کھودیا ہو مگران کا ایک بیان قابل غور ہے وہ کہتے ہیں کہ کتب دینیات اہل سنت جماعت کے ہاں چھ کتابیں سب سے معتبر ہیں یعنی صحیح بخاری' مسلم' سنن ابوداؤد' ترمذی' نسائی' ابن ماجہ ان کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں جو اکثر کتب سابق پر مبنی ہیں جن کی سنیوں کے ہاں بہت قدر ہے۔ مثلاً (واضح ہو کہ بعض ناموں کی صحت جو انگریزی میں لکھے ہوئے تھے نہیں ہوسکی) داری' دار قطنی' ابن عیینہ' اصمعی' برقانی' احمد سنی' بیہقی' حمیدی' خطابی' بغوی' رزین' جوزی ابن الاثیر مبارک ابن جوزی' نووی۔

اب اول تو یہ اخیر کی چودہ کتابیں ان میں سے جس قدر سے کہ ہم واقف ہیں پہلی چھ کتابوں پر مبنی نہیں ہیں سوائے مشکوۃ کے جو بغوی کی ہے اور اکثر ان میں کی غیر معتبر اور غیر مستند ہیں اور ان میں جو حدیثیں مذکور ہیں وہ ان چھ کتابوں میں نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی حدیث ہو خواہ پہلی قسم کی کتابوں میں نہ کسی مذہبی عقیدہ کی بناء قرار پاتی ہے' نہ صحیح اور مستند تسلیم ہوتی ہے جب تک کہ وہ ان قواعد سے جو اوپر مذکور ہوئے صحیح نہ ثابت ہوئی ہو۔

سر ولیم میور نے کسی قدر طوالت کے ساتھ اسلام کی روایتوں اور راویوں کی نسبت بحث کی ہے۔ مگر افسوس بیان کرتے ہیں کہ ان کے طرز تحریر سے صاف منکشف ہوتا ہے کہ قبل اس کے کہ ایک غیر متعصبانہ اور آزادانہ تحقیق اور جائز اور منصفانہ دلیل سے کوئی نتیجہ مستخرج کریں' ان کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ یہ سب روایتیں جھوٹی اور لوگوں کی محض بناوٹیں اور ایجادیں ہیں اور اول ہی سے اس بات کا قصد کر لیا ہے کہ ان سب روایتوں کو ایسا ہی ثابت کریں۔ وہ امر حق کی تحقیق کرنا نہیں چاہتے گو وہ امر حق کچھ ہی کیوں نہ ہو جس کی تحقیق ہر بے غرض مصنف کا اصلی منشاء ہوتا ہے یا کم سے کم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہونا چاہیے ان کے طرز استدلال ہی سے ان کی غرض ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ اس فقرہ سے مطلب کو آغاز کر کے کہ ''اگلے مسلمانوں کی عادتیں روایت کے رواج کی موید ہیں'' فرماتے ہیں کہ اپنے نبی کے کاموں اور باتوں سے زیادہ اور کس مضمون پر مسلمانان سابق سرگرمی سے بحث کرتے'' اس کے بعد صاحب موصوف یہ رائے بیان کرتے ہیں کہ ''ان روایات ہی نے امتداد زمانہ کی وجہ سے محمد (ﷺ) کو انسانی طاقت سے بڑھ کر قدرتیں حاصل ہیں...... اسی مادہ سے اس قدر کثیر روایتیں وجود میں آئیں ہیں۔ جب کبھی ان بیانات کے امتحان کے لئے واقعات کا کوئی اندازہ سردست موجود نہ ہوتا تو حافظے کو قوت واہمہ کی بے روک کوششوں سے مدد دی جاتی۔'' ''صحابہ کبار کی روایتوں کی تعظیم اور حرمت جو زمانہ مابعد میں لوگوں کی تھی'' وہ بقول صاحب موصوف ''امتداد ایام کا اثر تھا جو لوگوں کے دلوں میں اور روایتوں پر خود بخود ہوا ہوگا۔

اب کہ سر ولیم میور اس طرح پر استدلال کرتے ہیں تو یہ سوال پیش آتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ نیک اور پرہیزگار شخص کا کیا حال ہوگا اگر اس کی ہر بات اور حرکت کو دغا بازی اور ریاکاری کی دھندلی اور خراب عینک سے دیکھیں اور اس کے جملہ کلمات اور افعال کی غلط تاویل کریں اور جس قدر خراب معنی ہمارا تعصب اور حسد ایجاد کر سکے ان کے اوپر عائد کریں۔

کیا حضرت موسیٰ کے تمام معجزات ''ان کے عصا کا سانپ کی شکل میں ہو جانا' ان کا ید بیضا' دریا کا خون کی مانند ہو جانا' مینڈکوں کی وبا اور معجزات جو ان کے مصر میں ظہور پذیر ہوئے تھے' بحراحمر میں بنی اسرائیل کے لئے رستہ کا کھل جانا' من وسلویٰ کا آسمان سے نازل ہونا' پتھر کی منقش لوحوں کا ملنا جن پر خدا تعالیٰ نے اپنی انگشت مبارک سے لکھا تھا' خدا تعالیٰ کا بنی اسرائیل کو تمام قوموں پر ترجیح دینا اور ان کو ''میری منتخب قوم'' کے خطاب سے سرفراز کرنا اور اس قدر برکتیں ان کو عطا فرمانا اور حضرت اسرائیل کو ''میرا پہلوٹا'' بیٹا کہہ کر ممتاز کرنا کیا ان سب باتوں کو دل لگی کے قصے اس طرز استدلال کے طور پر جس کو سر ولیم میور نے اختیار کیا ہے نہیں کہہ سکتے جن

کو اس نبی کے سرگرم پیروؤں یعنی بنی اسرائیل نے ایجاد اور وضع کیا ہو۔ جنہوں نے بہ سبب ''متشکیانہ تعظیم'' اور ''شائقانہ تکریم'' کے امتداد زمانہ میں اپنے نبی کو ''عجیب وغریب اوصاف سے'' متصف کر دیا کیا یہ بات بھی حضرت موسیٰ پر اسی طرح صادق نہیں آ سکتی ہے کہ ''ان کی وضع کی شان کو دھیان اور مراقبہ سے عروج حاصل ہوا اور جس قدر دور زمانہ ان کے پیروؤں سے ان کو کرتا گیا اس عجیب وغریب انسان کا نقشہ جو آسمان کے فرشتوں (بلکہ خود خدا ہی سے) بے تکلف پیغام وسلام رکھتا تھا زیادہ دھندلا لیکن زیادہ بڑا تناسب حاصل کرتا گیا۔ دل میں نادانستہ یہ خیال گزرا کہ ان کو انسانی طاقت سے زیادہ قدرتیں حاصل اور ایسے سامانوں سے جو انسان کے امکان سے باہر ہیں گھرے ہوئے ہیں۔'' حضرت عیسیٰ اور ان کے بااعتقاد اور سرگرم متبعین کا اس وقت کیا حال ہوتا اگر ہر شخص ان روایات کو محض بناوٹی ایجادیں سمجھ کر مضحکہ میں ڈال دیتا جن میں آنحضرت عیسیٰ کی کراماتی پیدائش اور حضرت عیسیٰ کا از سر نو زندہ ہونا اور اپنے مجروح ہاتھ اپنے متبعین کو دکھلانا اور ان کا آسمان پر چڑھ جانا اور اللہ تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھنا یعنی حسب قانون وحدت فی التثلیث کے اپنے ہی دست راست کی طرف بیٹھنا مذکور ہے۔

لیکن عقل وفہم کی تعظیم ہم کو ان لوگوں کی احادیث اور افعال پر عیب رکھنے اور ان کی بدترین تاویل کرنے سے مانع آتی ہے جنہوں نے تقویٰ اور نیک اعمال کی وجہ سے شہرت اور عظمت حاصل کی ہو اور اس امر سے بھی البتہ انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر مصنف کو لازم ہے کہ جب اوروں کی تحریرات اور تصنیفات کی چھان بین کرنے کا ارادہ کرے تو اپنے آپ کو تعصب اور کم ظرفی سے پاک اور صاف کر لے۔

محمد رسول اللہ کے اصحاب اور خلفاء ایسے لوگ تھے جنہوں نے اپنے آپ کو محض خدا تعالیٰ کی طرف مصروف کر دیا تھا وہ امر حق کو مانتے تھے اور اس جہان فانی کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ وہ ایماندار صادق القول اور نیک طینت تھے اور ہمارے احادیث کے جمع کرنے والوں نے بدیں غرض کہ احادیث نبوی کا ایک مجموعہ ہو جائے دور دراز کے سفر اختیار کئے تھے۔ انہوں نے حکام وقت کے ہاتھ سے سخت تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ ان کو بیشمار دقتیں پیش آئیں اور ایسی ایسی مصیبتیں اور اذیتیں سہنی پڑیں جو بہ مشکل خیال میں آ سکتی ہیں۔ باایں ہمہ انہوں نے کبھی اپنے کام سے پہلو تہی نہیں کی اور ان کو انجام تک پہنچایا جس سے صریح ثابت ہے کہ ان کو دینی اور نیک نیت وجہوں سے اس امر کی تحریک ہوئی تھی۔ اور ہم کسی طرح مجاز نہیں ہو سکتے کہ ان کے افعال کو ریاکاری اور فریب کی طرف منسوب کریں اور ان کی تصنیفات کی اس بے بنیاد بیان پر کہ محض بناوٹی ایجادیں ہیں بے جا تحقیر کریں۔

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ ''ترقی پذیر سلطنت کی احتیاطیں قرآن کے مجموعہ سیاست کی افزائش کی خواہاں ہوئیں جو چیز کہ پہلے عربوں کی سادہ وضعی اور محدود نظام مدنی کے واسطے بخوبی کفایت کرتی تھی ان کی اولاد کی روز افزوں احتیاطوں کے واسطے غیر مکتفی ہو گئی۔'' وہ کہتے ہیں کہ ''یہ اور اسی قسم کے اسباب قرآن کے متعدد اور معرا مسائل کو توسیع اور اس کے اخلاق کے غیر مکمل مجموعہ کی تکمیل کے متقاضی ہوئے۔''

اس بیان میں سر ولیم نے دو طرح پر غلطیاں کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جامعین حدیث کو ترقی سلطنت اور مجموعہ سیاست سے کچھ سروکار نہ تھا۔ یہ لوگ محض دین کی طرف متوجہ تھے انہوں نے احادیث نبوی کو محض باغراض دینی جمع کیا تھا۔ ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں میں دین ہی کو بہت بڑی نسبت ہے یعنی ان کا بیسواں حصہ بھی امور سیاست سے متعلق نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا کہ مسلمانوں نے امور متعلق سیاست کو الہامی سمجھا ہو۔ خود جناب پیغمبر خدا اپنے زمانہ کے بعد بھی ایسے امور میں صحابہ

سے صلاح لیتے تھے اوراس صلاح کے مطابق کاربند ہوتے تھے اس زمانہ کے بعد بھی ان روایتوں کو جو سیاست سے متعلق تھیں کسی نے الہامی نہیں سمجھا چنانچہ اس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ قرآن مجید اور نیز جناب پیغمبر خدا نے ہر چیز متعلق سیاست اور انتظام مدن کو باستثنائے چند اصول عام کے بالکل فرمانرواؤں کی رائے پر چھوڑ دیا ہے اور صرف یہ حکم دیا ہے کہ ذی فہم لوگوں سے مشورہ کر کے کام کریں جو زمانہ کے حالات اور ڈھنگ کے واسطے ضروری ہیں پس مسلمانوں کو اور ان کی اولاد کو اپنی روز افزوں احتیاجوں کے واسطے قرآن مجید کی تکمیل کے لئے حدیثوں کی تلاش کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی' ہاں بلاشبہ مسلمانوں میں یہ خواہش تھی کہ ہرامر میں خواہ وہ دین سے متعلق ہو یا دنیا سے اسی طرح پر کارروائی کریں جس طرح کہ پیغمبر خدا نے کی تھی اور یہ اس محبت وعشق کا تقاضا تھا جو ہم مسلمان اپنے پیغمبر کے ساتھ رکھتے ہیں اور اسی لئے ہر قسم کی احادیث کو جمع کرتے تھے پس یہ عشق اور محبت نہایت قابل ستائش تھی مگر افسوس ہے کہ سرولیم میور نے مسلمانوں کی اس عمدہ صفت کو بھی بدترین تاویل میں بیان کیا ہے۔

اس کے بعد سرولیم میور صاحب یہ فقرہ لکھ کر کہ ''قرآن ہی چال وچلن کا نافذ قانون تھا'' یہ بیان کرتے ہیں کہ ''پھر وہ اپنی غرض اصلی کے واسطے مکتفی نہ ہوا اور اس نقص کی تلافی سنت یعنی پیغمبر صاحب کے احکام اور افعال سے کی گئی'' اس کے بعد لکھتا ہے کہ ''انہوں نے (یعنی پیغمبر خدا نے) کبھی اپنے آپ کو خطا سے مبرا نہیں قرار دیا بجز اس صورت کے جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے القاء ہوتا تھا مگر اس نئے عقیدہ نے یہ بات تراش کر لی کہ پیغمبر صاحب کے ہر قول وفعل میں ایک الہٰی اور غیر خاطی ہدایت منضم ہے۔

ہم مسلمانوں کا معاملات دینی و دنیوی میں اپنے پیغمبر کی تقلید میں کوشش کرنا خواہ وہ امور دین سے علاقہ رکھتے ہوں خواہ امور دنیا سے خواہ امور سیاست مدن سے اور خواہ امور متعلق عادت اور عبادت سے دوسری چیز ہے اور اس بات کا اعتقاد کہ پیغمبر خدا ﷺ کا کون سا قول اور فعل از روئے وحی کے غیر قابل خطا کے تھا اور کون سے افعال صحابہ کے مشورہ سے کئے گئے تھے جن کو وحی سے کچھ تعلق نہ تھا دوسری چیز ہے۔ سرولیم میور نے لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے خواہ خود غلطی میں پڑ کر ہماری نسبت ناانصافی سے یہ اعتقاد منسوب کیا ہے کہ جناب پیغمبر خدا کے ہر قول وفعل میں ایک الہٰی اور غیر خاطی ہدایت منضم ہے۔ ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم مسلمان تمام قول وفعل اپنے پیغمبر کو اسی ادب اور عظمت سے دیکھتے ہیں کہ روایتوں کی بناوٹ اور اشاعت کا ''کام عوام الناس کے فائدوں اور سلطنت کے ملکی حالات پر اس قدر موثر تھا کہ بطور خود لوگوں کی سرگرمی پر بالکل چھوڑ دینے کے قابل نہ تھا۔'' اور اپنے بیان کی تائید میں ڈاکٹر اسپرنگر کے مندرجہ ذیل فقرہ کو نقل کرتے ہیں جو قسطلانی شرح بخاری سے ان کو ہاتھ لگا تھا اور وہ فقرہ یہ ہے: ''چونکہ پیغمبر صاحب کے ہر معتبر اور صحیح بیان کی جو دستیاب ہو سکے قلمبند کرنے کی ضرورت اشد تھی اس لئے خلیفہ عمر نے ایک گشتی حکم اس باب میں جاری کیا اور بالتخصیص ابوبکر بن محمد کو روایات کے جمع کرنے پر مامور کیا۔''

اگر قسطلانی نے یہ مضمون لکھا ہے تو محض غلط ہے۔ حضرت عمر حدیثوں کے جمع کرنے کے خود مخالف تھے جس کو سرولیم میور نے بھی قبول کیا ہے اور عنقریب معلوم ہوگا۔ کسی خلیفہ یا کسی مسلمان حاکم نے ان لوگوں کے کام میں جو بطور خود حدیثیں جمع کرتے تھے کبھی دخل نہیں دیا۔ ہم علانیہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ جن کا یہ بیان ہے کہ ''خلیفہ عمر نے تمام احادیث موجودہ کے باقاعدہ جمع کرنے کا گشتی حکم جاری کیا تھا'' ہم کو حدیث کی کوئی ایک کتاب بھی تمام کتب احادیث میں سے ایسی نشان دیں جو کسی خلیفہ یا حاکم کے حکم سے جمع کی گئی ہو۔ برخلاف اس کے ہم اعتماد سے کہتے ہیں کہ یہ کل کتابیں بلا استثناء ایسے مقدس لوگوں نے مرتب کی تھیں جو اپنے زمانہ کے خلفا کے دربار میں جانے سے بھی از حد پرہیز کرتے تھے۔ اس زمانہ کے خلفا جناب پیغمبر خدا کے خلیفہ نہ تھے بلکہ سلاطین اور

بادشاہ تھے کیونکہ سلسلہ خلافت کا جناب رسالت مآب کی وفات کے تیس برس بعد ختم ہوگیا تھا۔

سرولیم میور اپنی کتاب کے حاشیہ میں نہایت ضعیف اور نہایت غیر مستند روایتیں واقدی سے نقل کرتے ہیں۔ان روایتوں میں اخیر روایت یہ ہے کہ خلیفہ عمر جانشین ابوبکر نے سنت کے قلمبند کرنے کا ارادہ کیا اور ایک مہینہ تک اس باب میں اللہ جل شانہ سے دعا کی لیکن آخرکار جب اس کام کے شروع کرنے پر آمادہ ہوئے تب یہ فرما کر باز رہے کہ ''مجھ کو ایک قوم کا ذکر یاد ہے جنہوں نے اسی قسم کی تحریرات قلمبند کی تھیں اور کتاب ربانی کو چھوڑ کر ان پر عمل کیا تھا۔

یہ روایت جس طرز بیان میں واقدی نے نقل کی ہے وہ ایسی ہے جیسی کہ اس قسم کی روایتوں میں ایک افواہی باتیں شامل ہوجاتی ہیں۔دراصل صرف اتنی بات ہے کہ حضرت عمر احادیث کے جمع کرنے کے برخلاف تھے اور ان کو یقین تھا کہ حدیثوں کا ٹھیک ٹھیک طور پر جمع ہونا نہایت مشکل ہے اور ان کے جمع ہونے سے بلاشبہ ایسی ہی خرابی پیدا ہوگی جیسی کہ یہود کے ہاں پیدا ہوگی۔

اختلاف روایات کے اسباب یعنی انسان کے حافظہ کا عام ضعف'غلطیاں'مبالغے' تعصب' حمایت اور نیز وہ تفرقہ اور فساد جو بعد شہادت حضرت عثمان کے اسلام میں پھیل گیا تھا سرولیم میور نے بیان فرمایا ہے کہ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''اسی صدی میں روایات نے جڑ پکڑی اور مستقل حاصل کی۔اختتام صدی پر روایات موجودہ کی باقاعدہ تلاش شروع ہوئی اور باضابطہ لکھی گئیں۔وہ نمونہ جو اس وقت ڈھالا گیا تھا کم سے کم اپنی مخصوص ہیئت پر برابر چلا آیا''۔

ہم کو اس مقام پر اختلاف روایات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہم اس کو اوپر بیان کر چکے ہیں لیکن ہم کو اس بات کے دیکھنے سے نہایت تعجب آتا ہے کہ اگرچہ سرولیم کے نزدیک قریب قریب تمام موجودہ روایات اسلام محض بناوٹی ہیں با ایں ہمہ انہوں نے اپنے سب بیانات کو واقدی کی روایت پر مبنی کیا ہے جس میں ضعیف ترین روایات منقول ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ ان سب روایتوں کو ہمارے خلاف استعمال کرتے ہیں حالانکہ تحقیق اور غیر متعصبانہ تصنیف کے مسلمہ قوانین کی رو سے اور نیز مطابق اپنے عقیدہ کے ان کو لازم تھا کہ اول احادیث صحیحہ اور موضوعہ کی تحقیق اور تمیز کرتے اور پھر مذہب اسلام اور بانی اسلام کی نسبت معترض ہوتے۔تمام عیسائی مصنفوں کی تصنیفات میں جنہوں نے دین اسلام کی نسبت لکھا ہے اسی امر ضروری کی کوتاہی پائی جاتی ہے مگر وہ اپنے عیبوں کو نہایت خوش گواری سے ہضم کر جاتے ہیں اور دوسروں کی نسبت عجیب وغریب پیرایہ میں نکتہ چینی کرنے کو موجود ہوتے ہیں۔

اگر سرولیم میور کی محض یہ غرض ہے کہ روایات اسلام کا لغو اور غیر معتبر اور موضوع ہونا لوگوں کو معلوم ہوجائے تب بھی مذہب کی کچھ بے حرمتی اور ذلت نہیں ہے۔مسلمانوں نے اس امر کو کچھ چھپا نہیں رکھا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر کتابیں حدیث صحیحہ اور غیر صحیحہ میں تمیز کرنے کی غرض سے قرار دیئے گئے ہیں۔جھوٹی حدیثوں کے بنانے والے گنہگار ٹھہرائے گئے ہیں اور اسی قسم کی اور باتیں اسی غرض سے کام میں لائی گئی ہیں۔ہم اس بات کے بیان کرنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ اس باب میں یہود کے مذہب کا حال بدتر اور عیسائی مذہب کا حال بدترین ہے۔مذہب عیسوی میں موضوعہ کتابوں اور بے شمار رسالوں کی وجہ سے کتب دینی جو روزانہ ہر کلیسا میں مستعمل ہوتی تھیں بہت بڑھ گئی تھیں اور دیندار لوگوں کے باہم بے انتہا مناقشوں اور قضیوں کی باعث ہوگئی تھیں جبکہ قسطنطین اعظم نے دین عیسوی قبول کیا تو منجملہ اور اغراض کے جن کے واسطے اس نے مجلس نیس (نائیسیا) کو ۳۲۵ء میں جمع کیا تھا ایک یہ بھی غرض تھی کہ صحیح اور موضوع اناجیل میں تمیز کی جائے۔

والٹیر لکھتا ہے کہ ''عیسائیان سابق اس بات سے موردنفرین تھے کہ انہوں نے عیسیٰ کے نام پر صنعیت ترشیح میں چند اشعار لکھ کر ایک پرانی کاہنہ کی طرف منسوب کئے تھے اور حضرت عیسیٰ کی طرف سے بادشاہ اوڈیسا کے نام جعلی خطوط بنائے جس زمانہ میں کہ کسی ایسے بادشاہ کا وجود بھی نہ تھا حضرت مریم کے خطوط سنیقا کی جانب سے پولس کے نام کے خطوط' پلاط کے خطوط اور افعال مصنوعی اناجیل' جھوٹے معجزات اور ہزاروں جعلسازیاں اور فریبوں کے الزامات بھی لگائے تھے یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ کے بعد دو یا تین صدیوں کے اندر اس قسم کی کتابوں کی تعداد کثیر ہوگئی تھی۔

وہ اہم مسئلہ دربارہ الوہیت مسیح جس نے کہ کلیسائے نصاریٰ میں ہل چل ڈال دی تھی مجلس نیس میں جو روم کے بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں منعقد کی تھی طے ہوا۔ اس مجلس میں اٹھارہ بشپ اور دو ہزار پادریوں نے مسیح کی الوہیت سے انکار کیا اور اس پر حجت کی لیکن سب سے سخت مباحثوں اور مناظروں کے بعد یہ بات قرار پائی کہ حضرت مسیح خدا کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ خدائے پدر سے پیدا ہوئے ہیں۔ (نعوذ باللہ منہا) ایرس جو منجملہ اٹھارہ بشپہائے معترضین کے تھا فرقہ یونٹیرین (موحدین) کا سرغنہ ہوا یعنی ان لوگوں کا جو حضرت مسیح کی الوہیت کے منکر تھے اور اسی بناء پر الزام بے دینی جلاوطن کیا گیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کو قسطنطنیہ میں پھر بلا لیا اور اپنے عقائد کو فوقیت بخشنے میں کامیاب ہوا' حتیٰ کہ تمام صوبجات روم میں انہوں نے رواج پایا باوجود اس کے کہ اس کے سخت مخالف آثاناسیوس نے جو فرقہ تثلیثیہ کا سرگروہ تھا از حد کوشش کی۔ اسی مجلس نیس کی کارروائی کے تتمہ میں مرقوم ہے کہ آبائے کلیسا نے اس امر کی تحقیق میں نہایت حیران اور ششدر ہو کر کہ تورات اور انجیل میں کون سے صحیفے صحیح اور کون سے غیر صحیح ہیں ان سب کو بلاتمیز ولحاظ ایک قربان گاہ پر رکھ دیا۔ سنا ہے کہ جو صحیفے لائق تنسیخ تھے زمین پر گر پڑے۔

دوسری مجلس ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ میں ہوئی تھی جن میں ان امور کی جو روح القدس کے بارہ میں مجلس نیس نے غیر منفصل چھوڑ دیئے تھے تشریح کی گئی تھی اور اسی موقع پر یہ عقیدہ قرار پایا کہ روح القدس بلاشک وہ رب ہے جو باپ سے نفاذ پاتا ہے اور باپ اور بیٹے کے ساتھ باہم مخلوط ہو کر اس نے احترام حاصل کیا ہے۔ ۴۳۱ء میں تیسری عام مجلس نے جو بمقام افسیس مجتمع ہوئی تھی یہ فیصلہ کیا کہ حضرت مریم بلاشک ام اللہ تھیں۔ خلاصہ یہ کہ حضرت عیسیٰ میں دو صفتیں تھیں اور ایک وجود۔ نویں صدی میں کلیسائے روم اور یونان کے مابین وہ اختلاف وتفرقہ عظیم واقع ہوا جس کے بعد شہر روم میں تخمیناً انتیس خونریز مشاجرات کرسی پوپ کے حصول کے واسطے واقع ہوئے۔''

سرولیم میوران مضرت آمیز اسباب کا ذکر کر کے جو خلیفہ مامون الرشید کی متعصبانہ عملداری میں اپنی کارروائی کر رہے تھے اور یہ بیان کر کے کہ ''روایتوں کا عام طور سے جمع ہونا ایسے ہی اسباب کی وجہ سے عمل میں آیا' یہ فرماتے ہیں کہ ''خراب اور بے اصل مادہ کی کثرت خود مسلمانوں ہی کی چھان بین کے اندازہ سے قیاس کی جاسکتی ہے۔ ان کا قول ہے کہ اس باب میں ڈاکٹر ویل کی رائے قابل اعتماد اور تعریف ہے۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں کہ ایسے وقت میں روایات زبانی پر اعتماد کرنے نے جب کہ وہ حافظہ سے منتقل ہوتی آئی تھیں اور ہر روز نئے نئے اختلافات اسلام میں پیدا کرتی تھیں اختراع اور بناوٹ کے لئے ایک وسیع رستہ کھول دیا جب کہ کسی دینی یا دنیوی معاملہ کی حمایت کی ضرورت ہوتی تو اس سے سہل کوئی بات نہ تھی کہ پیغمبر صاحب کی کسی زبانی روایت کا حوالہ دیتے۔ اس قسم کی روایات کی اصلیت اور جس طور سے کہ محمد (ﷺ) کے نام کو تمام دروغ اور بیہودہ ممکنات کی تائید میں بدنام کرتے تھے اس امر سے صاف صاف ذہن نشین ہوسکتا ہے کہ بخاری نے جو علماء سے روایات حاصل کرنے کے واسطے ملکوں ملکوں پھرا تھا

بہت سے برسوں کی چھان بین کے بعد اس بات پر قرار پکڑا کہ منجملہ چھ لاکھ روایات کے جن کا اس زمانہ میں مروج ہونا تحقیق ہوا تھا صرف چار ہزار معتبر اور مستند تھیں اور منتخب تعداد میں سے یورپین محقق کم سے کم نصف کے خارج کرنے پر بلا دسواس مجبور ہوتا ہے۔ اس زمانہ کے بالیاقت جامعین کے تجربہ سے بھی یہی منکشف ہوتا ہے۔ اسی طرح ابوداؤد کی نسبت بھی سنا گیا ہے کہ پانچ لاکھ روایتوں میں سے جو اس نے جمع کی تھیں چار لاکھ چھیانوے ہزار کو صرف مستند قرار دیا۔''

اس جگہ ہم اس بات پر کہ تعداد روایات خارج شدہ کی کیا اصلیت ہے اور کس اصول پر خارج شدہ روایتیں خارج کی گئی تھیں اور آیا اس سے ان کل روایتوں خارج شدہ کا موضوع ہونا لازم آتا ہے یا نہیں بحث کرنی نہیں چاہتے بلکہ ہم ڈاکٹر ویل اور سر ولیم میور دونوں کی رائے سے متفق ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہم اس بات کا بھی افسوس کرتے ہیں کہ ڈاکٹر ویل کے اس بیان کے بموجب کاربند ہونے کے بجائے کہ ''چار ہزار روایات منتخبہ بخاری میں سے یورپین محقق کم سے کم نصف کے خارج کرنے پر بلا وسواس مجبور ہوتا ہے'' یورپین محققوں نے جن میں سر ولیم میور سب سے نمبر اول ہیں بخاری کی چار ہزار روایات پر بھی قناعت نہ کر کے اپنی تصنیفات کو واقدی، ہشامی، مولود نامہ، معراج نامہ، اور اور کتابوں پر جن میں بجز بے ہودہ باتوں کے اور کچھ نہیں ہے اور جن کو خود مسلمانوں ہی نے خارج کر دیا ہے' مبنی کرنے کی جانب مائل ہوئے ہیں۔

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ ''جامعین نے گو کہ وہ غیر معتبر روایات کے خراج میں بے دھڑک تھے روایات معتبر کی تمیز میں کسی عمدہ قانون کا برتاؤ نہیں کیا۔'' اس کی تشریح وہ اگلے جملہ میں اس طرح پر کرتے ہیں کہ ''مضمون روایت سے کچھ بحث نہ تھی بلکہ محض نام ہی جن کی طرف وہ روایت منسوب ہوتی تھی مسئلہ اعتبار کو حل کر دیتے تھے اگر یہ نام الزام سے مبرا ہوتے تو روایت مستند قرار پاتی۔ کوئی بیہودگی کیسی ہی صریح کیوں نہ ہو کسی روایت کو جو اس امتحان میں پوری ہوتی روایات مستند کے رتبہ سے خارج نہیں کر سکتی تھی۔

سر ولیم میور کا یہ بیان ہمارے نزدیک بالکل صحیح ہے مگر انہوں نے اس موضوع سے جس پر جامعین حدیث نے حدیثوں کو جمع کیا غور نہیں کی۔ جس وقت کہ حدیثیں جمع نہیں ہوئی تھیں اور اول اول ان کے جمع ہونے کا کام شروع ہوا تو پہلا کام جامعین حدیث کا یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو صرف ان کے راویوں کی معتبری تحقیق کر کے ان حدیثوں کو قلم بند کر لیں بشرطیکہ بادی النظر میں کوئی ایسا امر جو اس حدیث کی صحت میں مخل ہو موجود نہ ہو۔ دوسرا کام ان حدیثوں کی معتبری کا بلا لحاظ ان کے مضامین کے تھا۔ اس کا وقت ان جامعین کو نہیں ملا تھا کیونکہ پہلا ہی کام جو انہوں نے کیا وہی نہایت سخت اور مشکل تھا۔ اگرچہ پچھلے لوگوں کے دلوں میں ان بزرگوں کی جنہوں نے حدیثوں کو باعتبار راویوں کے جمع کیا تھا ایسا ادب اور ایسی عظمت جم گئی تھی کہ اکثروں نے اس دوسرے کام کی نسبت جو باقی رہا تھا توجہ نہ کی لیکن بہت سے علماء محققین ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اس دوسرے فرض کو بھی ادا کیا ہے اور اس کے لئے قواعد بھی منضبط کئے ہیں اور اصول حدیث کی کتابیں تصنیف کی ہیں اور بلحاظ مصنف حدیث کے حدیث کی معتبر اور نامعتبری قرار دینے کو فن روایت سے موسوم کیا ہے۔ قطع نظر اس کے اس وقت ہر ایک مسلمان کے اختیار میں ہے کہ بلحاظ اصول درایت کے جس کتاب کی حدیث پر چاہے اس معتبر اور نامعتبر ہونے کی بحث کرے اور جس کو نامعتبر سمجھے اس کو نہ مانے۔''

سر ولیم میور اپنے بیان کے ضمن میں راویوں کے ایماندار ہونے کو تسلیم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اس کے یہ بھی کہتے ہیں کہ موضوع روایتیں معتبر روایتوں کے ساتھ مخلوط ہو گئی ہیں اور بغرض تمیز مابین صحیح اور موضوع روایتوں کے اس طرح پر لکھتے ہیں کہ ''امور جن پر

کسی روایت کے اعتبار کا غلبہ بالخصوص منحصر ہونا چاہیے یہ معلوم ہوتے ہیں کہ آیا مسلمانوں میں بالعموم مضمون مروی کی جانب رعایت اور طرفداری پائی جاتی تھی یا نہیں۔ دوم یہ کہ آیا راویوں میں کسی خاص غرض تعصب یا کسی غرض کے آثار، پائے جاتے ہیں یا نہیں اور سوم یہ کہ آیا راوی کو واقعات کے علم کا بذات خود موقع ملا تھا یا نہیں۔''

ان تین قواعد معینہ سر ولیم میور میں اخیر کے دو قواعد کے تسلیم کرنے میں ہم کو کچھ کلام نہیں ہے کیونکہ یہ وہ بھی منجملہ انہیں قواعد کے ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ قاعدہ اول کی نسبت ہم حیران ہیں کہ بغیر زائدہ کسی تفصیل کے ہم اس کو اس بات کے لئے کہ آیا فلاں حدیث صحیح ہے یا غلط اور کس قدر صدق یا کذب اس میں موجود ہے کس طرح پر قاعدہ قرار دیں۔

اس حیرانی کے رفع کرنے کو ہم نے اس تفصیل کی طرف رجوع کی جو اس کی نسبت سر ولیم میور نے تحریر فرمائی ہے وہ مذکورہ بالا امر پر دو طرح سے نظر ڈالتے ہیں یعنی زمانہ کے لحاظ سے اور مضمون کے لحاظ سے زمانہ کو وہ چند حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا حصہ اس وقت تک شمار کرتے ہیں کہ ''پیغمبر صاحب کے اس زمانہ کے حالات شاہد یا تو عمر میں ان سے چھوٹے یا ان کی برابر ہیں۔ اس واسطے پیغمبر صاحب کی ولادت سے پیشتر کے واقعات یا ان کی طفولیت کے حالات کے باب میں ان کی شہادت معتبر نہیں ہے اور ان کی نوجوانی کے سوانح بھی ان میں سے بہت کم اشخاص نے مشاہدہ کئے ہوں گے۔''

بظاہر یہ بیان لوگوں کے خیال میں صحیح معلوم ہوتا ہوگا لیکن اس میں غلطی یہ ہے کہ سر ولیم میور نے سب سے اول یہ فرض کر لیا ہے جیسا کہ انہوں نے خود لکھا ہے کہ ''روایت کی سب سے پہلی ترویج کا زمانہ پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہوا تھا'' مگر اس رائے کے برخلاف محکم ترین دلائل موجود ہیں اور ثابت ہے کہ روایات کے بیان کرنے کی رسم جناب پیغمبر خدا کی حیات میں شروع ہوئی تھی۔ دوم یہ کہ صاحب موصوف نے اس بات کو ایک امر واقعی تسلیم کر لیا ہے کہ جملہ اصحاب اور وہ بھی جنہوں نے جناب پیغمبر خدا کی حیات میں وفات پائی تھی یا تو جناب پیغمبر خدا سے چھوٹے تھے یا ان کے ہم عمر تھے یہ امر تاریخی واقعہ کے برخلاف ہے اور صحابہ بھی بلحاظ عمر کے اتنے تو ضرور ہی تھے کہ جناب پیغمبر خدا کی ولادت سے ذرا پیشتر کے واقعات اور نیز ان کے بچپن اور جوانی کے حالات کو بچشم خود مشاہدہ کیا اور نیز ان کو صحیح صحیح یاد رکھ کر اوروں سے بے کم و کاست نقل کیا ہو اور ایسے ہی لوگوں کے بیان کو ہم مستند قرار دیتے ہیں۔''

علاوہ اس کے کسی واقعہ کے صدق کی تحقیق کو محض گواہان معائنہ کی موجودگی پر موقوف رکھنا شہادت کے قواعد معینہ سے جن کو تمام شائستہ اور مہذب قوموں نے تسلیم کر لیا ہے سراسر انحراف کرتا ہے۔ گواہان معائنہ کے سوا اور بھی چند امور ہیں جن کا عمل ایسا ہی مستحکم ہوتا ہے اور کسی واقعہ کے صدق یا کذب کو ضرور قائم کر دیتے ہیں۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ ہر واقعہ جس کی نسبت کوئی معتبر گواہ معائنہ تصدیق کرے فی الفور تسلیم کر لیا جاتا ہے اور صورت ثانی میں تواتر اور کثرت راویوں کی اس کی صحت کو بتلاتے ہیں۔ پس جناب پیغمبر خدا کے کسی زمانہ کے واقعات کی تصدیق میں ہم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے کہ ان مسلمہ قوانین کی شہادت کے بموجب جو انسان کے قوائے عقلی نے بدون لحاظ کسی مذہب کے مرتب کئے ہیں گواہ کے بیان صدق کا امتحان کریں۔

سر ولیم میور بیان کرتے ہیں کہ ''اگر کسی واقعہ کی جانب توجہ بالتحقیق مائل نہ ہو تو اس کی نسبت کامل اور ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی اور بہت سے برسوں کے گزرنے کے بعد ایسے گواہ سے زیادہ سے زیادہ یہ توقع ہو سکتی ہے کہ واقعات قابل الذکر کا عام طور پر بیان کر دے۔ اس اصول کو صاحب موصوف جناب پیغمبر کی سوانح عمری کے اس زمانہ تک جب کے بقول ان کے جناب پیغمبر خدا ایک فریق کے سرگروہ ہو گئے نہایت شد و مد سے مستعمل کرتے ہیں اور اس کو اس زمانہ کے پیشتر تک وسعت دیتے ہیں جبکہ

بقول ان کے ''آنحضرت ﷺ نے علانیہ دعویٰ نبوت کیا تھا اور شرک سے ممانعت کی تھی اور اہالیان مکہ سے کھلم کھلا لڑائی اختیار کی تھی اور اس بیان سے یہ نتیجہ پیدا کرتے ہیں کہ جناب پیغمبر خدا کے ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا جب تک کہ انہوں نے عام شہرت حاصل نہیں کی تھی غیر ممکن ہے۔

سر ولیم میور کے اس فرضی اصول کو جو انہوں نے اپنی ذہانت سے اختراع کیا ہے، ہم بلا وسواس مان لیتے اگر ہم اس تردد میں نہ ہوتے کہ یہ اصول مان لیا جائے تو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی اس سوانح عمری کی نسبت جو ان کی شہرت حاصل کرنے سے پیشتر وقوع میں آئی تھی کیا کیا جائے گا۔ کیا ''ان کی نسبت بھی کامل اور ٹھیک ٹھیک بیان کی امید رکھنی بے فائدہ ہوگی'' اور کیا ان حالات کا ٹھیک ٹھیک اور قرار واقعی دریافت ہونا غیر ممکن ہوگا۔

ہم کو جناب پیغمبر خدا کے اس زمانہ کی سوانح عمری کی بہ نسبت حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے حالات قبل از پیدائش اور وقت پیدائش اور ان کے ایام طفولیت اور ایام جوانی کی سوانح عمری سے زیادہ غرض ہے کیونکہ ہم جناب پیغمبر خدا کے کسی واقعہ ماقبل ولادت اور ان کی کسی سوانح عمری ایام طفولیت کو ایسا نہیں پاتے جس کی صحت پر آنحضرت کی نبوت کی صحت کا مدار ہو ہم کو آنحضرت کے تمام حالات زندگی میں ایک امر بھی ایسا نہیں دکھائی دیتا جس کی اصلیت آنحضرت کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کے کسی واقعہ کی صحت پر موقوف ہو مگر حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے باب میں ایسا نہیں ہے ان دونوں انبیاء علیہما السلام کی عمر کے تمام مشہور زمانہ کی اصلیت ان کی عمر کے غیر مشہور زمانہ کی صحت پر منحصر ہے۔ ہم کو کس طرح اس امر کا یقین ہوسکتا ہے کہ وہ لامعلوم بچہ جس کو فرعون کی بیوی نے دریائے نیل میں ایک صندوق میں بہتا ہوا پایا تھا عمران کا حقیقی بیٹا تھا جس کو کہ تمام دنیا حضرت موسیٰ کہتی ہے اور ہم کو کس طرح اس بات کا یقین کلی ہوسکتا ہے کہ وہ بچہ جس کو ہم ''کلمۃ اللہ'' اور ''روح اللہ'' اور عیسائی ابن اللہ کے خطابوں سے مخاطب کرتے ہیں اور جس کی نسبت یقین ہے کہ بن باپ کے پیدا ہوا تھا داؤد کی نسل میں سے تھا اور وہ وہی تھا جس کو اب عیسیٰ مسیح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ دونوں امر جو موسوی اور عیسوی مذہب کی بنیاد ہیں ایسے اسرار سے بھرے ہوئے ہیں جن کا ثابت کرنا ایسا محال اور ایسا غیر ممکن ہے جیسا کہ دنیا میں کسی چیز محال اور غیر ممکن کا ثابت کرنا ہے اگر ہم سر ولیم میور صاحب کے اصول مندرجہ بالا کو تسلیم کرلیں تو ہم کو اندیشہ ہے کہ مبادا ہمارے مذہب کے حق میں مضر ہو کیونکہ ہم بھی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ پر اعتقاد کامل رکھتے ہیں چونکہ اس خیال سے ہمارا دل تھراتا ہے اس لئے ہم سے یہ امید ہرگز رکھنی نہیں چاہیے کہ ہم ایسے ضرر رساں اصول کو منظور کریں۔

ہم کو صرف اس زبانی بیان سے کہ سر ولیم میور کا اصول صحیح ہے تسکین نہیں ہوتی بلکہ ہم زیادہ بحث کر کے اس سقم کو دریافت کریں گے جس سے محمد رسول اللہ ﷺ اور حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کی زندگی کے غیر مشہور زمانہ کے حالات کو صحیح ماننے میں حیرانی ہوتی ہے۔

یہ سقم جس کو ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں سر ولیم میور کے الفاظ ''بہت سے برسوں کے گزرنے کے بعد'' کے غیر مصرح ہونے سے واقع ہو رہا ہے اور ایسا کلام شہادت کے مسلمہ قوانین کے برخلاف ہے۔ ان کو بجائے ان الفاظ کے اس طرح کہنا چاہیے تھا کہ ''ایسے زمانہ کے انقضا کے بعد جو ایک جائز تحقیق اور نتیجہ کی صحت کے احتمال غیر ممکن کردے'' لیکن جناب پیغمبر خدا کے غیر مشہور زمانہ حیات کو اس قدر عرصہ نہیں گزرا تھا۔ زمانہ رواج روایت میں بہت سے آدمی زندہ موجود تھے جنہوں نے جناب پیغمبر کی پیدائش ان کا بچپن ان کا لڑکپن اور ان کی نوجوانی دیکھی اور گو بقول سر ولیم میور کے ''ان کا حافظہ اور خیال پیغمبر صاحب کی زندگی کے حالات کو

بالتخصیص ذہن نشین کرنے میں مصروف نہ تھا'' تاہم اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ تمام چشم دیدہ باتوں کو بھول گئے ہوں۔

برخلاف اس کے جب کہ''ایک بے کس یتیم بچہ ایک محض بے شرباشندہ'' ایک ایسا شخص''جس کی نسبت تمام سکنائے مکہ میں سب سے کم یہ گمان ہوسکتا تھا کہ ان کے پڑوسیوں کی آنکھیں اس کی طرف متوجہ ہوں'' اور جب کہ ایسا غیر مشہور شخص ایسا عام چال وچلن اختیار کرے جو اپنی نوعیت میں نہایت جلیل القدر ہو اور جو اس کے خاندان اس کے ہمسائیوں اور اس کے ہم وطنوں پر بالعموم شاق ہو تو قیاس اس کا مقتضی ہے کہ ہر شخص جو اس سے قربت رکھتا ہوگا اس کی زندگی کے غیر مشہور زمانہ کے حالات اور خفیہ طرز معاشرت کی سخت چھان بین کرے گا اور اس کی خفیہ معاشرت کے ہر واقعہ کا اسی طرح کے ان واقعات سے مقابلہ کرے گا جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہیں اور جن کی نسبت وہ سب معائنہ گے گواہ ہوں۔

سرولیم میور آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ''ضرور یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جملہ صورتوں میں جن پر کوئی قاعدہ منجملہ قواعد متذکرہ صدر کے موثر ہوتا ہو صراحت ایک بڑی علامت بناوٹ کی ہوگی اور عیسائیوں کے لئے فن تحقیق اور تدقیق کے اسی قسم کے قانون کا اختیار کرنا بہتر ہوگا کہ ہر روایت جس کی ابتدا واقعات مرویہ کے درحقیقت ہم عصر نہیں ہے حسب اندازہ صراحت بیان کے بے ہودہ ہے اس سے ہمارا (یعنی عیسائیوں کا) بے ہودہ قصوں کی ایک تعداد کثیر سے پیچھا چھوٹ جائے گا جن میں کہ گندھے ہوئے بیان اور منجھے ہوئے کلام کی جزوی علامات نقلی کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہیں۔

جب کہ ہم نے یہ ثابت کردیا ہے کہ سرولیم میور کے مذکورہ بالا قواعد شہادت کے اصول مسلمہ کی رو سے سراسر غلط ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جو نتیجہ ان قواعد سے مستنبط کیا ہے کہ''صراحت ایک بڑی علامت بناوٹ کی ہوگی'' وہ بھی غلط ہے اور جناب پیغمبر خدا کی زندگی کے زمانہ غیر مشہور پر ٹھیک ٹھیک صادق نہیں آتا ہے۔ان کا یہ بیان کہ''ہر روایت جس کی ابتدا واقعات مرویہ کے درحقیقت ہمعصر نہیں ہے حسب اندازہ صراحت بیان کے بے ہودہ ہے'' قانون شہادت کے خلاف ہے اگر وہ اس طرح پر کہتے کہ''وہ روایت جس کا راوی نہ یہ کہ جس کی ابتدا سے روایت واقعات مرویہ کے درحقیقت ہم عصر نہیں ہے حسب اندازہ صراحت بیان بے ہودہ ہے'' تو گنجائش تھی۔

وہ نتیجہ جو سرولیم میور نے عیسائیوں کے فن تحقیق وتدقیق کے روایات اسلام پر مستعمل کرنے سے حاصل کیا ہے یہ ہے کہ''بیہودہ قصوں کی ایک تعداد کثیر سے ان کا پیچھا چھوٹ جائے گا جن میں کہ گندھے ہوئے بیان اور منجھے ہوئے کلام کی علامتیں نقلی کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہیں'' لیکن ہم کو اس بات کے کہنے سے نہایت افسوس ہوتا ہے کہ صاحب موصوف نے اس استنباط میں بھی غلطی کی ہے کیونکہ یہ استنباط بھی شہادت کے مسلمہ قوانین کے سراسر خلاف ہے جب کبھی کوئی ایسی روایت بیان کی جاتی ہے جس میں کہ تمام جزوی علامتیں کل کی تازگی کے ساتھ موجود ہوں اور جو امتداد زمانہ کی وجہ سے غیر ممکن معلوم ہوتی ہیں تو اس بناء پر جو شبہ پیدا ہوتا ہے راوی کی نسبت ہوتا ہے کہ اس کو کیونکر یہ تفصیل یاد رہی نہ مضمون روایت کی نسبت کیونکہ اس کا صحیح ہونا حیز امکان سے خارج نہیں ہے اور اس لئے اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جامعین روایات کو قواعد منضبط کے بموجب راوی کا حال چلن ہر طرح بے لوث ثابت ہوجائے اور اس کے حافظہ پر اعتماد ہو اور ان واقعات کے یاد رہنے کا بھی امکان ہو تب مضمون روایت کو بھی صحیح تسلیم کرنے میں کچھ شک وشبہ نہیں رہتا۔

اس کے بعد سرولیم میور دوسرے زمانہ کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی''وہ جداگانہ حصہ زمانہ کا جو محمد (ﷺ) کے مشہور حصہ عمر

اور فتح مکہ کے مابین حائل ہوتا ہے۔'' ان کے کل بیان کا لب لباب یہ ہے کہ ہم ان روایات کو معتبر تسلیم نہیں کر سکتے جن میں ''بناوٹ کے افعال'' ''بے بنیاد اتہامات'' اور مبالغہ آمیز الزامات جو محمد (ﷺ) کے مخالفوں کی طرف عائد ہوتے ہیں منقول ہیں کیونکہ تمام کفار نے جو مکہ کے رہنے والے خواہ مدینے کے رہنے والے تھے سب نے اسلام قبول کر لیا تھا اور تمام یہودی عیسائی اور مشرکین نکال دیئے گئے تھے اور اب کوئی ایسا شخص وہاں نہ رہا تھا جو ایک طرفہ بیان کی تردید کرتا اور چونکہ خود محمد (ﷺ) کفار پر لعنت کیا کرتے تھے تو کب ممکن تھا کہ کسی مسلمان کو ان کی حمایت کی جرأت ہوتی اور اسی وجہ سے ''اہل روایت بھی کفار سے نفرت کرتے تھے'' اور مورخین ہمیشہ اس شہادت کی طرز پر جو ان کے خلاف ہوتی تھی آنکھ لگائے رہتے تھے۔

بغیر اس کے کہ ہم اس مقام پر بیان کو طول دیں یا یہ کہیں کہ صاحب موصوف کا یہی قول اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبعین پر بھی صادق آتا ہے۔ خصوصاً اس زمانہ پر جب کہ حضرت موسیٰ نے نہایت بے رحم لڑائیوں کے بعد تمام کفار کو نیست و نابود کر دیا تھا اور جب کہ قسطنطین اعظم کے زور سے تمام لوگوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا مگر ہم اس امر کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی منصفانہ رائے پر چھوڑتے ہیں اور یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ ممکن ہے کہ نیکی ایمانداری اور صداقت کے کل آثار یعنی قانون قدرت کے وہ بیش بہا جوہر جو انسان کے قوائے اخلاقی کا مادہ ہیں لاکھوں ذی فہم اشخاص کے سینوں سے یک لخت محو ہو گئے ہوں اور وہ سب یک دل' یک زبان ہو کر بدترین افعال کی طرف مائل ہوئے ہوں یعنی دروغ گوئی اور واقعات کی غلط بیانی کی طرف جو ان سب کے روبرو واقع ہوئے ہوں اور جن کو سب نے بچشم خود مشاہدہ کیا ہو۔ یہی امر یعنی ان واقعات کے گواہان معاینہ کی تعداد کا ہزاروں اور لاکھوں کو پہنچنا ان واقعات کے غلط بیانی کی عدم امکان پر دلالت کرتا ہے۔

ذاتی میلان پر غور کرنے کے وقت سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ ''راوی کی اس ہوس نے کہ محمد صاحب کی صحبت میں بار پائے'' کیونکہ ان کے نام کے ساتھ ''شرافت وحرمت مربوط تھی اور ان کی دوستی حصول مدارج اور عزت کی باعث تھی اور اس ہوس نے کہ ''محمد صاحب کے کسی فرضی الہام یا معجزہ سے علاقہ قریبہ حاصل کرے'' کس واسطے کہ ''وحی میں مذکور ہونا سب سے بڑی ممکن الحصول عزت شمار کی جاتی تھی خلاف فطرت واقعات کے اختراع یا مبالغہ پر'' جرأت بڑھائی اور ''روایات کے مبالغہ غلط بیانی اور نیز ایجاد کی باعث ہوئی۔''

جب کوئی مصنف ایسے میلان رائے اور تعصب کی وجہ سے بالکل طرف دار بن جائے تو اس میں کچھ چارہ نہیں یہ کس طرح پر خیال میں آ سکتا ہے کہ کسی مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین جو اپنے مذہب پر سچا اعتقاد رکھتے ہوں اور جن کے دلوں کے مخفی سے مخفی کونوں میں بھی یہ اعتقاد ہو کہ پیغمبر خدا کی سنت کا اتباع ہماری نجات کا یقینی اور محفوظ رستہ ہے اور ان کے احکام سے سرتابی کرنا ضلالت ابدی کا موجب ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسے پاک اور پرہیزگار آدمی سب کے سب اپنے نبی کے فرمانے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنی مقدس کتاب کے احکام اور نصائح سے آنکھ بند کر کے دروغ گوئی' فریب دہی ریا کاری میں یک لخت مبتلا ہو گئے ہوں خلاصہ یہ ہے کہ ہر طرح کی بد اعمالیاں اور گناہ ان سے سرزد ہوئے ہوں۔ بطور مثال کے کسی مذہب کو لو ہندو مذہب کو' بدھ مذہب کو' دیگر مشرکین مذہب کو' یہودی مذہب کو' عیسوی مذہب کو مع اس کے بہت سے فرقوں کیتھولک پروٹسٹنٹ' یونی میرین' ٹرینیٹیرین' ویزدلنز' بپٹسٹ' جمپرز' مورمنز وغیرہ کو تو تم ان میں سے ہر مذہب کے ابتدائی زمانہ کے معتقدین میں نیکی' صداقت' ایمانداری' راست بازی' سرگرمی' راسخ الاعتقادی' اور جان نثاری کی بو پاؤ گے اور اپنے نبی کے احکامات اور اپنے مذہب کے قوانین

انحراف کرنے کے خیال ہی سے ان کو خائف اور ہراساں پائیں گے ہم کو اپنے بیان کی تائید اور تصدیق کے لئے منجملہ ہزاروں مثالوں کے صرف ایک ہی مثال کافی ہوگی اور وہ یہ ہے کہ جب کہ زید ابن ثابت سے حضرت ابوبکر نے قرآن کے اجزائے منتشر کو ایک جگہ جمع کرنے کا ارشاد کیا تو کچھ عرصہ تک زید بن ثابت خوف کے مارے عالم سکوت میں رہے اور پھر جب ہوش وحواس درست ہوئے تو حضرت ابوبکر سے خوف اور غصہ اور بے صبری کے ملے ہوئے جوش سے استفسار کیا کہ ایسے کام کرنے کی جو خود پیغمبر خدا کی موجودگی میں نہیں کیا گیا آپ کیونکر جسارت کرتے ہیں۔ پھر یہ کس طرح ذہن میں آ سکتا ہے کہ ان لوگوں نے جو پیغمبر خدا سے اس قدر خوف اور ان کی اس قدر تعظیم کرتے تھے اور جو بجز صداقت کے اور کسی چیز کو نہیں جانتے تھے فی الفور ایسی برائیوں کے اختیار کرنے میں اپنے آپ کو ذلیل اور خوار کر دیا ہو اور ایسے گناہ عظیمہ ان سے سرزد ہوئے ہوں۔

اسی طرح کی متعصبانہ طبیعت سے سر ولیم میور آگے چل کر یہ بیان کرتے ہیں کہ ”ہم اس باب میں غیر مشتبہ شہادت رکھتے ہیں کہ رعایت اور جانب داری نے روایت پر ایک گہرا اور مستقل نقش کر دیا۔“ اس کے بعد صاحب موصوف روایات موضوعہ کے رواج کے بہت سے اسباب کے ضمن میں یہ کہتے ہیں کہ ”قومی میلان عموماً تمام اسلام میں پھیلا ہوا ہے اس وجہ سے زیادہ مضر ہے۔“ اسی طرح ”محمد صاحب کی توقیر اور ان کی عجیب وغریب اوصاف سے متصف کرنے کی خواہش“ سر ولیم میور کے نزدیک تمام قصوں کی ابتدا آنحضرت سے ہوئی تھی کیونکہ سر ولیم میور بموجب اپنے اعتقاد کے ذرا بھی شک نہیں رکھتے کہ ”اصلی واقعات ایک وہم ناک خیال کی رنگ آمیزی سے اس طرح آراستہ یا مبدل ہو گئے ہیں“ اس کے بعد سر ولیم کہتے ہیں کہ ”محمدؐ کی توقیر کی اسی عام خواہش کی طرف ان مسلم معجزات کو بھی منسوب کرنا چاہیے جن سے کہ ان کی سب سے ابتدائی تاریخیں بھی مملو ہیں“ اس کے بعد سر ولیم میور نے اپنی بے انتہا خفگی ان یہودی اور عیسائی عالموں پر ظاہر کی ہے جنہوں نے آنحضرت ﷺ اور اسلام کی بشارات کا ذکر کیا ہے سر ولیم میور آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ کو بھی موضوع اور بے اصل اس وجہ سے بتلاتے ہیں کہ ”پیغمبر صاحب اسلام کو حضرت اسماعیل کی اولاد میں خیال کرنے کی خواہش اور شاید ثابت کرنے کی کوشش ان کی حیات ہی میں شروع ہوئی تھی“ بعد اس کے وہ کہتے ہیں کہ ”دلیل خلف سے بھی یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے یعنی وہ روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی اور مسلم تھیں اس لئے کہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں عموماً بے اعتبار یا بالکل خارج ہو گئیں کیونکہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی“ پھر وہ کہتے ہیں کہ ”اس معاملہ میں حالت کی وجہ سے اس مقام کو اس قدر کامل طور سے ثابت کرنا جیسا کہ مقامات گزشتہ کو ثابت کیا گیا غیر ممکن ہے کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کا جو اوائل میں ترک کر دی گئی تھیں کچھ پتا نہیں معلوم ہوتا۔

یہ خلاصہ ہے سر ولیم کے ایک طول طویل بیان کا جس سے صریح ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی محققانہ تحریر نہیں ہے بلکہ ایک مخالف مذہب کی تحریر ہے اور ایسے طرز میں لکھی گئی ہے جو ایک متعصب مخالف کے مناسب اور موزوں ہے جو اپنے بیانات اور اپنی زبان اور جائز تحقیق کی رعایت میں محتاط نہیں ہے اور جو اپنے مذاہب کے سوا اور مذاہب کی باتوں پر اور بالخصوص اس مذہب کی باتوں پر جس سے اس کے مذہب کو کسی نہ کسی طرح پر مضرت پہنچی ہو نہایت حقارت اور بے اصل شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر ہم سے ایسے بے موقع اور غیر معتدل بیانات کی نظیر طلب کی جائے تو ہم ان سخت اور کفر آمیز کلمات کا حوالہ دیں جو یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے مذاہب کے بارہ میں استعمال کیا کرتے تھے۔

سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ ”روایتیں جو عمدہ شہادت پر مبنی نہیں کیونکہ اوائل اسلام میں مشہور تھیں عموماً بے اعتبار یا کل خارج

ہوگئیں کیونکہ ان سے محمد صاحب کی تحقیر یا کسی فاسد عقیدہ کی تائید معلوم ہوئی۔''

مگر یہ کیسا غلط بیان ہے اور کیسی عجیب بات ہے کہ جس امر کو وہ خود اس قدر اعتماد اور گھمنڈ کے ساتھ نہایت صاف اور بے لاگ زبان میں بیان کرتے ہیں گویا کہ وہ درحقیقت ایک مسلم تاریخی واقع ہے اور شک وشبہ کی گنجائش نہیں رکھتا ہے اس کی نسبت کوئی سند نہیں پیش کرتے ہیں بلکہ ہم نہایت دل جمعی سے اس معاملہ کو محض یہ کہہ کر دفعتہ طے کرتے ہیں کہ ''اس معاملہ کی حالت کی وجہ سے اس مقام کو اس قدر کامل طور سے ثابت کرنا غیر ممکن ہے کیونکہ اب ہم کو ان روایتوں کا جو اوائل میں ترک کر دی گئی تھیں کچھ پتہ معلوم نہیں ہوتا'' کیا اس طرح پر دلیل لانا ایک تعصب کا اثر نہیں ہے! معہذا سر ولیم میور کا یہ بیان بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ تمام اتہامات اور تحقیر کے الفاظ جو مشرکین اور یہود آنحضرت ﷺ کی نسبت استعمال کیا کرتے تھے مسلمانوں کی کتابوں میں بلکہ قرآن مجید میں بھی بیان ہوئے ہیں اور کوئی بات نہ خارج کی گئی ہے اور نہ مخفی کی گئی۔ رہی یہ بات کہ مسلمانوں کی روایات میں اختلافات واقع ہوئے تھے ہم تسلیم کرتے ہیں مگر ہم ان کے اس تہشک آمیز اسباب کی طرف منسوب ہونے سے جو سر ولیم میور صاحب نے بیان کئے ہیں اعتماد کے ساتھ انکار کرتے ہیں کیونکہ اختلافات محض ان وجہوں سے عارض ہوئے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔

ہم کو اس بات کے دریافت ہونے سے کہ عیسائی مصنفوں نے آنحضرت ﷺ پر صرف غلط اور بے جا اتہامات ہی نہیں لگائے ہیں بلکہ بدوں کسی وجہ کے اپنے دل میں یہ سمجھ کر خوش ہوئے ہیں کہ ہمارے پیغمبر کے نام پاک پر انہوں نے دھبہ ثابت کیا ہے کچھ بھی تعجب اور ملال نہیں ہوا ہے کیونکہ بے اصل بات کچھ بھی تعجب اور ملال کے لائق نہیں ہوتی مگر ان بے اصل خیالات کی بنا اے اسپرنگر ایم ڈی سے معلوم ہوتی ہے جنہوں نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے ایک جرنل یعنی ایک رسالہ میں اور بعد ازاں اپنی کتاب بائی اوگرفی[1] آف محمد میں اس مضمون پر بحث کی تھی۔ سر ولیم میور کی عمدہ خصلت اور لیاقتوں کی قدر سے جو ہمارے دل میں تھی اور ان کی بہت بڑی مہارت مشرقی علم ادب کی وجہ سے ہم کو قوی امید ہوئی تھی وہ ڈاکٹر اسپرنگر کے یک طرفہ بیانات اور الزامات کی کماحقہ موشگافی کریں گے اور ایک سنجیدہ تحقیقات اور منصفانہ رائے رسول عرب کی معصومیت کی حمایت کریں گے مگر افسوس کہ وہ امید کیسی بے اثر نکلی۔

ڈاکٹر اسپرنگر سورہ ''والنجم'' کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ محمد صاحب نے قریش کے بتوں اور معبودوں کی نہایت تعریف کی اور ان کو تسلیم کر لیا' اور جب کہ وہ سجدہ میں گئے قریش نے بھی سجدہ کرنے میں ان کا اتباع کیا۔ اس تمام قصہ کی صحت کو وہ مصنف مواہب لدنیہ کے حوالہ پر مبنی کرتے ہیں۔

سر ولیم میور اس مضمون پر یوں بحث کرتے ہیں کہ ''بظاہر ایک خوب معتبر قصہ موجود ہے۔ جس سے محمد صاحب کا کفار مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کرنا ثابت ہوتا ہے وہ اپنے بیان کو واقدی اور طبری کے بیان پر مبنی کرتے ہیں اور خاص کر ایک دلچسپ عبارت جو اس قصہ کی اسناد کی تشریح میں مصنف مواہب لدنیہ نے لکھی ہے۔'' جو اعتراضات وشکوک کو اسلام کی ضرر اور فساد عقیدہ کے خوف کی طرف منسوب کرتا ہے۔

مصنف مواہب لدنیہ نے اپنی کتاب میں اس مضمون پر تمام مختلف روایتوں اور علماء کی رایوں کو لکھ دیا ہے اور اس لئے ہم اس

---

[1] سوانح عمری محمدؐ (مخدومی)

مقام پر اس کتاب کا بجنسہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس کی کامل تشریح بھی کریں گے اور اس غرض سے کہ مطلب سمجھنے میں آسانی ہو مواہب لدنیہ کی عبارت کو جداگانہ دفعات میں منقسم کرتے ہیں۔

اول:

وقدم نفر من مهاجرة العبشة حين قراء عليه السلام والنجم اذا هوى حتى بلغ افرائيتم اللات والعزى ومنات الثالثة الاخرى القى الشيطان فى امنية اى فى تلاوت تلك العزانيق العلى وان شفاء عتهن لترجى فلما ختم السورة سجد ﷺ وسجد معه المشركون لتوهمهم انه ذكر الهتهم بخير وفشى ذلك بالناس واظهره الشيطان حتى بلغ ارض الحبشة ومن بها من المسليمن عثمان ابن مظعون و اصحابه وتحدثوا ان اهل مكة قد اسلموا كلهم وصلوا معه ﷺ وقد امن المسلمين بمكة فاقبلوا سراعاً من الجشة.

چندلوگ حبش کے ہجرت کرنے والوں میں سے آئے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی "**والنجم اذا اهوى**" (قسم ہے ستارہ کی جب نیچے آتا ہے) یہاں تک کہ جب آنحضرت اس آیت پر پہنچے "**افرئيتم اللات والعزى منات الثالثة الاخرى**" (کیا تم نے دیکھا لات اور عزیٰ کو اور پھر منات کو جو تیسرا ہے) تو شیطان نے ان کی تلاوت میں یہ الفاظ ڈال دیئے "**تلك الغرانيق العلى وان شفا عتهن لترجى**" (یہ بڑے بت ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے) پس جب آنحضرت نے سورہ ختم کی تو سجدہ کیا۔ مشرکین نے بھی آپ کے ساتھ سجدہ کیا کیونکہ ان کو یہ گمان ہوا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے خداؤں کو بھی بھلائی سے یاد کیا اور یہ بات لوگوں میں پھیل گئی اور شیطان نے اس کو مشہور کیا یہاں تک کہ ملک حبش میں اور ان مسلمانوں میں جو وہاں تھے یعنی عثمان بن مظعون اور ان کے ساتھیوں میں یہ خبر عام ہوئی۔ ان لوگوں نے آپس میں گفتگو کی کہ مکہ کے سب لوگ اسلام لائے اور آنحضرت کے ساتھ نماز پڑھی اور مسلمانوں کو مکہ میں امن ہو گیا۔ وہ لوگ بڑی تیزی سے حبش سے روانہ ہوئے۔

دوم:

اور جب مشرکین کو معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے تو پہلے سے زیادہ سختی پر مائل **ولما تبين المشركين عدم ذلك** ہوئے۔
رجعا الى اشد ما كانوا عليه.

سوم:

وقد تكلم قاضى عياض رضه فى الشفاء على هذا القصة توهين اصلها بما يشفى ويكفى لكن تعقب فى بعضه كما سياتى.

"قاضی عیاض نے "شفاء" میں اس قصہ پر اور اس کی اصل کے سست ہونے پر کافی وشافی گفتگو کی ہے لیکن اس کے بعض حصوں پر گرفت کی گئی ہے جیسا کہ آتا ہے"

چہارم:

وقال الاما م فخر الدين الرازی مما لخصته من تفسيره هذه القصة باطله وموضوعه لا يجوز القول بها قال الله تعالى وما ينطق عن الهوى ان هو الاوحی يوحی وقال الله تعالیٰ سنقرئک فلا تنسی.

امام فخرالدین رازی نے کہا ہے ''جیسا کہ میں نے ان کی تفسیر کا ملخص سمجھا ہے کہ یہ قصہ جھوٹ ہے اور گڑھا ہوا ہے۔ اس کا بیان کرنا جائز نہیں ہے خدا نے کہا ہے کہ ''آنحضرتؐ اپنی خواہش نفسانی سے نہیں بولتے۔ وہ نہیں ہے مگر وحی جو کہ وحی بھیجی گئی'' اور خدا نے کہا ''ہم تم کو پڑھا دیں گے سو تم نہ بھولو گے۔''

پنجم:

وقال البيهقی هذه غير ثابتة من جهة النقل ثم اخذ يتكلم فی ان رواة هذه القصة مطعونون.

''بیہقی نے کہا یہ ثابت نہیں ہے روایت کی رو سے۔ پھر بیہقی نے اس بات پر گفتگو کی ہے کہ اس قصہ کے راوی مطعون ہیں۔''

ششم:

وايضاً فقدر روی البخاری فی صحيحه انه عليه السلام قراء سورة النجم وسجد معه المسلمون والمشركون والانس والجن وليس فيه حديث الغرانيق بل روی هذا الحديث من طرق كثيرة وليس فيها البتة حديث الغرانيق.

''نیز بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۂ نجم پڑھی اور ان کے ساتھ مسلمانوں اور مشرکوں اور آدمی اور جن نے سجدہ کیا۔ اس روایت میں غرانیق کی حدیث نہیں ہے بلکہ یہ حدیث بہت سے طریقوں سے مروی ہے مگر کسی میں غرانیق کی حدیث مذکور نہیں ہے۔''

ہفتم:

ولا شک ان من جوز علی الرسول تعظيم الاوثان فقد كفر لان من المعلوم بالضروة ان اعظم سعية كان فی نفی الاوثان ولو جو زنا ذلک ارتفع الامان عن شرعه وجوزنا فی كل واحد من الاحكام والشرايع ان يكون كذلک ويبطل قوله تعالیٰ يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالته فانه لا فرق فی الفعل النقصان فی الوحی والزيادة فيه فبهذه الوجوه عرفنا علی سبيل الاجمال ان هذا القصة من وضع الزنا دقة لا اصل لها انتهی.

''اور کچھ شبہ نہیں ہے کہ جو شخص اس بات کو جائز رکھے کہ رسول اللہ نے بتوں کی تعظیم کی تو وہ کافر ہے کیونکہ یہ تو بداہتہً معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بڑی کوشش بتوں کا مٹانا تھا اور اگر ہم اس بات کو جائز رکھیں تو شریعت پر کچھ اعتبار نہ رہے گا اور ہم کو کل احکام و شریعتوں میں ایسا ہی جائز خیال کرنا لازم آئے گا۔ اور خدا کا یہ قول باطل ہو جائے گا کہ ''اے

رسول خدا کی طرف سے جو تجھ پر اتارا گیا ہے اس کو لوگوں کو پہنچا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تو نے اپنی رسالت کو نہیں پہنچایا" کیونکہ کام کے اعتبار سے وحی کے گھٹانے میں اور زیادہ کر دینے میں کچھ فرق نہیں ہے پس ان دلیلوں سے ہم نے مجملاً جان لیا کہ یہ قصہ گھڑا ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ قصہ زندیقوں کے موضوعات سے ہے جس کی کچھ اصل نہیں ہے۔"

ہشتم:

ولیس کذلک بل لها اصل فقد اخرجها ابن ابی حاتم والطبری و ابن المنذر من طرق عن شعبة عن ابی بشر عن سعید ابن جبیر وندا ابن مردویه والبزار وابن اسحق فی السیرة و موسیٰ ابن عقبة فی المغازی وابو معشر فی السیرة کمانبة علیه الحافظ عما د الدین ابن کثیر وغیره.

"اور ایسا نہیں ہے بلکہ اس کی ایک اصل ہے کیونکہ اس کو روایت کیا ہے ابن ابی حاتم وطبری وابن المنذر نے متعدد طریقوں سے شعبہ سے انہوں نے ابوبشر سے انہوں نے سعید ابن جبیر سے اور اسی طرح ابن مردویہ اور بزار اور ابن اسحٰق نے سیرت میں اور موسیٰ ابن عقبہ نے مغازی میں اور معشر نے سیرت میں جیسا کہ حافظ عماد الدین ابن کثیر وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

نہم:

لکن قال ان طرقها کلا مرسلة وانه لم یرها مسندة من من وجه صحیح وهذا متعقب بما سیاتی.

"لیکن کہا ہے کہ اس کے سب طریقے مرسل ہیں اور یہ کہ وہ صحیح طور سے مستند نہیں کی گئی ہے اور اس پر اعتراض کیا گیا ہے جیسا کہ آگے آتا ہے۔"

دہم:

کدابنه علی ثبوت املها شیخ الاسلام والحافظ ابو الفضل العسقلانی فقال اخرج ابن ابی حاتم والطبری و ابن المنذر و من طرق عن شعبة عن ابی بشر عن سعید ابن جبیر قال قرأ رسول الله ﷺ بمکة والنجم فلما بلغ افرائیتم اللات والعزی ومنات الثالثة الاخر القی الشیطان علی لسانه تلک الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترجی فقل المشرکین ما ذکر الهتنا بخیر قبل الیوم فسجد وسجد فنزلت هذه الایة وما ارسلنا من قبلک من رسول ولانبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیة الایه.

"اور اسی طرح اس کے اصل کے ثابت ہونے پر شیخ الاسلام اور حافظ ابوالفضل عسقلانی نے تنبیہ کی ہے سو کہا کہ روایت کیا ہے ابن ابی حاتم اور طبری و المنذر نے متعدد طریقوں سے شعبہ سے انہوں نے ابو بشر سے انہوں نے سعید بن جبیر سے کہا انہوں نے پڑھا رسول اللہ نے مکہ میں "والنجم" کو پس جب پہنچے آیت پر "افرئیتم اللات والعزی ومنات الثالثة الاخری" شیطان نے آنحضرت کی زبان پر یہ الفاظ ڈال دیئے "تلک الغرانیق العلی وان شفا عتهن لترجی" پس کہا مشرکوں نے آج سے پہلے کبھی محمد نے ہمارے خداؤں کو بھلائی سے یاد نہیں کیا تھا۔ پھر آنحضرت ﷺ

نے سجدہ کیا اور مشرکوں نے بھی سجدہ کیا۔ پس یہ آیت اتری **وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیة** اخیر آیت تک۔

یازدہم:

فاخرجه البزار وابن مردودیه من طریق امیه بن خالد عن شعبة فقال فی اسناده عن سعید ابن جبیر عن ابن عباس فیما احسب ثم ساق الحدیث وقال البزار لا یروی متصلا الا بهذا الاسناد تفرد بوصله امیه بن خالد وهو ثقة مشهور.

''اور روایت کیا ہے اس کو بزار نے اور ابن مردویہ نے امیہ بن خالد کی روایت سے امیہ نے شعبہ سے پس کہا'' اس کی اسناد جہاں تک میں جانتا ہوں سعید ابن جبیر کی روایت ابن عباس سے ہے'' پھر حدیث بیان کرنے لگے اور بزار نے کہا۔ یہ حدیث اتصال کے ساتھ صرف اسی اسناد سے مروی ہے۔ اس کے وصل کرنے میں امیہ بن خالد متفرد ہے اور وہ مشہور ثقہ ہے۔''

دوازدہم:

وقال انما یروی هذا من طریق الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس انتهی و الکلبی متروک لا یعتمد علیه.

''اور کہا کہ یہ روایت کی گئی ہے کلبی کے طریقہ سے اس نے ابوصالح سے اس نے ابن عباس سے انتہی اور کلبی چھوڑ دیا گیا ہے اس پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔''

سیزدہم:

وکذا اخرجه النحاس بسند اخر فیه الواقدی وذکرها ابن اسحق فی السیرة مطولا واسند عن محمد ابن کعب ولذلک ابن عقبة فی المغازی عن ابن شهاب عن الزهری وکذا ابو معشر فی سیرة له عن محمد ابن کعب القرظی ومحمد ابن قیس و اوردة من طریقة الطبرو اورد ابن ابی حاتم من طریق اسباط من طریق بساط عن السدی ورواه ابن مردویه من طریق عباد ابن صهیب عن یحیی ابن کثیر عن الکلبی عن ابی صالح و عن ابی بکر الهذلی وایوب عن عکرمة و سلیمان التیمی عن من حدثه ثلاثتهم عن ابن عباس و اوردها الطبری من طریق العوفی عن ابن عباس ومعناهم کلهم فی ذلک واحد وکلها سوی طریق سعید ابن جبیر اما ضعیف واما منقطع لکن کثرة الطرق تدل علی ان للقصة اصلا.

''اور اسی طرح اس کو نحاس نے ایک دوسری سند سے روایت کیا ہے جس میں واقدی ہے اور اس کو ابن اسحٰق نے کتاب سیرت میں تفصیلاً ذکر کیا ہے اور اس کو محمد بن کعب سے اسناد کیا ہے اور اسی طرح ابن عقبہ نے مغازی میں ابن شہاب سے اس نے زہری سے اور اسی طرح ابومعشر نے سیرت میں محمد بن کعب قرظی کے طریقہ سے وہ محمد بن قیس کے طریقہ سے

اور طبری اسی کے طریقہ سے لایا ہے اور ابن ابی حاتم لایا ہے اسباط کے طریقہ سے وہ سدی ہے اور ابن مردویہ نے اس کو روایت کیا ہے طریقہ عباد بن صہیب سے وہ یحییٰ بن کثیر سے وہ کلبی سے وہ ابو صالح سے اور ابوبکر ہذلی سے اور ایوب سے وہ عکرمہ سے اور سلیمان تیمی نے ان تین شخصوں سے جنہوں نے ابن عباس سے روایت کیا اور طبری اس کو عوفی کے طریق سے لایا ہے اور وہ ابن عباس سے اور سب کا مطلب ایک ہی ہے اور وہ سب طریقے سوائے سعید ابن جبیر کے طریقہ کے یا ضعیف ہیں یا منقطع ہیں لیکن بہت سے طریقوں کا ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قصہ کی کچھ اصل ہے۔''

چہاردہم:

مع ان لها طريقين اخرين مرسلين رجالهما على شرط الصحيح احدهما اخرجه الطبرى من طريق يونس ابن بزيد عن اب شهاب حدثنى ابو بكر ابن عبدالرحمن بن الحرث عن ابن هشام فذكر نحوه والثانى ما اخرجه ايضا من طريق المعتمر ابن سليمان وحماد ابن سلمة كلا هما عن داؤد ابن ابى هند عن العاليه.

''باوجود اس کے کہ اس کے دو طریقے ہیں جو مرسل ہیں اور ان کے راوی صحیح کی شرط کے موافق ہیں۔ایک تو وہ جس کو طبری نے روایت کیا ہے یونس بن یزید کے طریقہ سے یونس ابن شہاب سے کہ حدیث بیان کی مجھ سے ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحرث نے ابن ہشام سے پس اسی طرح ذکر کیا اور دوسرے وہ جس کو طبری نے روایت کیا معتمر بن سلیمان کے طریقہ سے اور حماد بن سلمہ کے طریقہ سے دونوں نے داؤد بن ابی داؤد بن ابی ہند سے داؤد نے عالیہ سے۔''

پانزدہم:

قال الحافظ ابن حجر وقد تجراء ابن العربى كعادته فقال ذكر الطبرى فى ذلک روايات كثيرة لا اصل لها وهو اطلاق مردود عليه وكذا قول القاضى عياض هذا الحديث لم يخرجه اهل الصحة ولا رواه ثقة بسند سليم متصل مع ضعف نقله واضطراب رواية وانقطاع اسانيده وكذا قوله ومن حكيت عنه هذه القصة من التابعين والمفسرين لم يسند ها احدا منهم ولا رفعها الى صاحب واكثر الطريق عنهم فى ذلک ضعيفة واهية.

''کہا حافظ ابن حجر نے جرأت کی ابن العربی نے اپنی عادت کے موافق پس کہا کہ''ذکر کیا طبری نے اس باب میں بہت سے روایتوں کو جن کی کچھ اصل نہیں ہے۔'' اور یہ مطلقاً حکم لگانا رد کیا گیا ہے اور اسی طرح قاضی عیاض کا قول کہ''اس حدیث کو صحت والوں نے نہیں روایت کیا۔اس کے ساتھ اس کی نقل کرنے والے ضعیف ہیں اور اس کی روایتوں میں اضطراب ہے اور اس کی سندیں منقطع ہیں'' اور اسی طرح قاضی عیاض کا یہ قول کہ تابعین ومفسرین میں سے جن سے اس قصہ کی حکایت کی گئی ہے کسی نے اس کو سند کے ساتھ نہیں بیان کیا اور نہ کسی نے اس کو کسی صاحب کی طرف مرفوع کیا اور اکثر طریقے جو ان سے مروی ہیں ضعیف اور واہی ہیں۔''

شانزدہم:

قال وقد تبین البزار انه لا یعرف من طریق یجوز ذکره الا طریق ابی بشر عن سعید ابن جبیر مع الشک الذی وقع فی وصله واما الکلبی فلا یجوز الروایة عنه لقوة ضعفه ثم رده من طریق النظر بان ذلک لوقع لا رتد کثیر ممن اسلم قال ولم ینقل ذلک انتهی.

''کہا کہ بزار نے بتا دیا کہ یہ حدیث کسی ایسے طریقہ سے مروی نہیں ہے جس کا ذکر کرنا جائز ہو بجز اس طریقہ کے جو ابو بشر نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے لیکن باایں ہمہ اس کے وصل میں شک واقع ہوا ہے لیکن کلبی تو اس سے روایت کرنی جائز نہیں ہے بوجہ اس کے ضعف کے۔ پھر اس حدیث کو عقلاً رد کیا ہے کہ اگر یہ واقعہ ہوا ہوتا تو بہت سے مسلمان مرتد ہو جاتے حالانکہ یہ کہیں منقول نہیں۔ انتہے

ہفت دہم:

وجمیع ذلک لا یتمشی علی القواعد فان الطرق اذا کثرت وتباینت نحارجها دل ذلک علی ان لها اصلا وقد ذکرنا ان ثلاثة اسا نید منها علی شرط الصحیح وهی مراسیل یحتج بمثلها من یحتج بالمرسل وکذا من لا یحتج به لا عتضاد بعضها ببعض. (مواهب)

''اور یہ سب باتیں قواعد حدیث کے مطابق نہیں چل سکتیں کیونکہ جب حدیث کے بہت سے طریقے ہوں اور ان کے مخرج جداگانہ ہوں تو اس بات کی دلیل ہوگی کہ اس کی کچھ اصل ضرور ہے اور ہم نے بیان کیا کہ تین سندیں ان میں سے صحیح کی شرط کے موافق ہیں اور وہ مرسل ہیں ان مثل سے دلیل لاتے ہیں وہ لوگ جو مرسل سے دلیل لاتے ہیں اور اسی طرح وہ لوگ بھی جو مرسل سے نہیں دلیل لاتے ہیں کیونکہ بعض طریقہ کو بعض سے تقویت ہوتی ہے۔''

اس قصہ کی نسبت مصنف مواہب لدنیہ نے جو طول طویل بیان کیا ہے وہ اس مقام پر ختم ہوتا ہے مگر مصنف مواہب لدنیہ نے اخیر کو جو یہ بات بیان کی ہے کہ ''روایت کے متعدد مخرج ہونے سے اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ ان کی کچھ اصلیت ہے اور تین سندیں جن کا سلسلہ آنحضرت ﷺ تک نہیں پہنچا صحیح تصور کرنے کے لائق ہیں اور جو لوگ کہ ایسی روایتوں کو جن کا سلسلہ آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچا ہو صحیح تصور نہیں کرتے وہ بھی اس کے متعدد ہونے کے سبب اس کو تسلیم کریں گے۔'' یہ بیان اس کا محض غلط ہے۔ جو روایتیں کہ اس باب میں ہیں اور جو خود اس نے بیان کی ہیں باہم مختلف ہیں اور روایات مختلفہ کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے متعدد مخارج ہیں اور روایات مرسل یعنی جس کا سلسلہ آنحضرت ﷺ تک نہ پہنچا ہو گو اس کو متعدد لوگوں نے بیان کیا ہو قابل سند نہیں ہے جب تک کہ اس کی تائید کے لئے کوئی روایت مسند موجود نہ ہو اور نیز وہ روایت قرآن مجید کے مخالف نہ ہو لیکن جب کوئی روایت مثل روایت مذکورہ بالا کے قرآن مجید کے احکام کے برخلاف ہو اور جب کہ وہ جناب پیغمبر خدا کے ان تمام حالات کے برخلاف ہو اور خدائے واحد کی عبادت کرنے سے متعلق ہیں اور جب کہ وہ اسلام کے اصلی اصول سے اتفاق نہ رکھتی ہو اور معہذا ایسی مختلف اور مشتبہ ہو جس کا مدار صرف اس بات پر ہو کہ وہ الفاظ کس نے کہے تھے اور کہنے والا بھی محقق نہ ہو تو ایسی روایت از روئے عقل اور انصاف کے کس طرح ان قواعد میں داخل ہو سکتی ہے جن میں اس روایت کے داخل کرنے کو مصنف مواہب لدنیہ نے کوشش کی

ہے۔

وہ لوگ بھی جو اس روایت کے حامی ہیں اس بات کا صاف صاف اقرار کرتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی تائید میں کوئی کافی ثبوت اور کوئی قابل اعتماد سند موجود نہیں ہے۔ اب یہ سوال ہوسکتا ہے کہ سر ولیم میور اس قدر اعتماد کے ساتھ کس بنا پر یہ بیان فرماتے ہیں کہ ''بظاہر ایک خوب مستند قصہ موجود ہے جس سے محمدؐ کا مشرکین مکہ کے ساتھ ایک عارضی موافقت اور مصالحت کر لینا ثابت ہوتا ہے''۔

اس روایت کی صحت کی نسبت رائے قائم کرنا اس کتاب کے پڑھنے والوں پر چھوڑتے ہیں۔ خود مصنف مواہب لدنیہ نے جو روایتیں اس کی نسبت لکھی ہیں انہیں سے اس کی صحت اور عدم صحت کا سراغ لگاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ فقرہ **"تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترجی"** ہرگز جناب پیغمبر خدا ﷺ کی زبان سے نہیں نکلا تھا کیونکہ مصنف مواہب لدنیہ نے لکھا ہے جیسا کہ فقرہ دوم میں ہم نے نقل کیا ہے کہ ''جب مشرکوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر خدا نے یہ لفظ نہیں فرمائے تھے تو انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ دشمنی اختیار کی۔''

جناب پیغمبر خدا کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ گزرا ہے یعنی جب جناب مکہ میں تشریف رکھتے تھے کہ کفار مکہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہایت جفا اور بے رحمی سے پیش آتے تھے اور ہر طرح پر جو ان کا وحشیانہ بغض ایجاد کر سکتا تھا آنحضرت کو ایذا اور تکلیف دیتے تھے۔ کفار مکہ جناب پیغمبر خدا کے وعظ میں خلل انداز ہونے کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں دیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو نماز پڑھتے وقت تنگ کرتے تھے اور جب کہ آنحضرت خدائے واحد کی حمد وثنا بیان فرماتے تھے مشرکین بھی جھوٹے معبودوں کی تعریف کیا کرتے تھے۔ پس مذکورہ بالا روایت سے جو منصفانہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ جب آنحضرت ﷺ سورہ نجم نماز میں پڑھ رہے تھے کفار مکہ حسب عادت مخل ہوئے اور اپنے بتوں کی تعریف کی۔

یعنی جب کہ جناب پیغمبر خدا اس سورہ نجم پڑھ رہے تھے اور اس آیت پر پہنچے **"افرایتم اللات والعزی ومنات الثالثة الاخری"** تو مشرکین میں سے کسی نے اپنے بتوں کی تعریف کی غرض سے یہ جملہ کہا **"تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترجی"** اور جب کہ جناب پیغمبر خدا نے سجدہ کیا مشرکین نے بھی براہ برابری اپنے بتوں کو سجدہ کیا۔ مشرکین میں اس بات کا اختلاف ہوا کہ وہ جملہ کس نے کہا کچھ عجب نہیں کہ مشرکین سمجھے ہوں کہ وہ جملہ پیغمبر خدا ہی نے فرمایا تھا مگر ان کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ پیغمبر خدا نے وہ جملہ نہیں کہا اور اس لئے آنحضرت ﷺ سے زیادہ دشمنی پر مستعد ہوگئے۔ اس وقت کے مسلمان ہرگز تعین نہیں کر سکتے تھے کہ آنحضرت نے وہ جملہ فرمایا ہو اور کہنے والا بھی متحقق نہیں ہوا۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ شیطان نے کہا تھا بعد اس کے جب روایات کے بیان کرنے اور لکھنے کی نوبت پہنچی تو مسلمان عالموں میں اختلاف ہوا جو لوگ شیطان کے زیادہ معتقد تھے اور اس بات پر یقین کرتے تھے کہ شیطان پیغمبروں کے کلام میں اس طرح پر اپنا کلام ملا دے سکتا ہے کہ پیغمبر ہی کی زبان سے نکلتا ہوا معلوم ہو انہوں نے کہا کہ پیغمبر ہی کی زبان سے وہ لفظ نکلے تھے کیونکہ شیطان نے وہ لفظ ملا دیئے تھے مگر دونوں فریق اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ پیغمبر نے وہ لفظ کہے تھے۔ بایں ہمہ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ جناب رسول خدا کے اصحابہ میں سے کسی نے ان الفاظ کا کسی نہج پر پیغمبر خدا کی زبان مبارک سے نکلنا نہیں خیال کیا کیونکہ کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ ان صحابہ میں سے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے کسی نے اس بات کو بیان کیا ہو بلکہ نہ کسی نے صحابہ میں سے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے کسی نے اس

بات کو بیان کیا ہو بلکہ نہ کسی صحابہ میں سے اور نہ کسی نے کبار تابعین میں سے اس کو بیان کیا ہے یہی بے سروپا روایتیں ہیں جن کا ذکر طبری اور واقدی اور ابن اسحق نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ وہ جملہ مشرکین میں سے کسی نے کہا تھا اس کی تشریح خود مواہب لدنیہ کی ایک روایت میں مندرج ہے۔ جس کو ہم بعینہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں:

وقیل انه لما وصل الی قوله و مناة الثالثة الاخری خشی المشرکون ان یاتی بعدها یشی یذم الهتهم به فباد روا الی ذلک الکلام فخلطوه فی تلاوة النبی ﷺ عاتهم فی قولهم لا تسمعو الهذ القران والغوا فیه ونسب ذلک الی الشیطان لکون الحامل لهم علی ذلک او المراد بالشیطان شیطان الانس. (مواهب)

''اور کہا گیا ہے کہ رسول اللہ جب اس آیت پر پہنچے ''و مناة الثالثة الاخری''تو مشرکوں کو ڈر ہوا کہ اس کے بعد کچھ ایسی چیز نہ پڑھیں جن میں ان کے خداؤں کی مذمت بیان کریں پس وہ لوگ فوراً یہ کلام کرنے لگے اور رسول اللہ کی تلاوت میں ملا دیا اپنی اس عادت کے موافق جیسا کہ وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ اس قرآن کو سنو مت اور اس میں گڑبڑ کر دو اور یہ بات منسوب ہوگئی شیطان کی طرف کیونکہ اس نے ان لوگوں کو اس پر آمادہ کیا تھا یا شیطان سے مراد آدمیوں کے شیطان ہیں۔(یعنی شریر آدی)

روایات کے معتبر قرار دینے کے لئے سر ولیم میور نے ایک اور قاعدہ ایجاد کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ'' جب کسی روایت میں محمد کی تحقیر کے کلمات ہوں مثلاً بعد ہجرت کے اگر ان کے متبعین میں سے کسی نے ان سے بے ادبی یا ان کے دشمنوں نے گستاخی کی ہو یا کارخیر میں ناکام ہونا یا کسی واقعہ یا عقیدہ میں اصول اور منشاء اسلام سے اختلاف اور انحراف پایا جائے تو اس کے تسلیم کرنے کی قوی دلیلیں ہیں کیونکہ یہ قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایتیں اختراع کرلی جائیں یا مخترع ہو کر محمد صاحب کے متبعین میں رواج پاسکیں۔

درحقیقت کسی روایت کی صحت کے اثبات کا یہ ایک عجیب طرز ہے! کیا ہم کو ان تمام روایات کو صحیح اور مستند مان لینا چاہیے جن کو مخالفین اسلام نے موضوع اور مخترع کیا تھا اور جن کو مسلمان عالموں نے اپنی کتابوں میں اس غرض سے نقل کیا ہے کہ ان کی تردید کریں اور ان کو موضوع اور بے اصل ثابت کریں یا وہ کسی غلطی کے سبب سے مسلمانوں میں رواج پاگئیں تھیں اور جن کی نسبت علماء نے تحقیق کی اور بتایا کہ یہ روایتیں ملحدوں اور کافروں کی پھیلائی ہوئی روایتیں ہیں۔ دراصل یہودیوں نے اور بالخصوص عیسائیوں نے اس قسم کی بیہودہ روایتیں اور قصے آنحضرت کی نسبت اس حاسدانہ ارادہ سے کہ نئے مذہب اور اس کے بانی پر عیب لگائیں اختراع کرلئے تھے پس ان مذکورہ بالا وجوہات سے مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہونا کوئی دلیل ان کی صحت کی نہیں ہوسکتی۔

تعجب ہے کہ سر ولیم میور ان روایات کے معتبر ہونے کی یہ دلیل بیان کرتے ہیں کہ'' قیاس میں نہیں آتا کہ ایسی روایات اختراع کرلی جائے یا مخترع ہو کر متبعین محمدؐ میں رواج پاسکیں۔ یہی ان کی دلیل اس بات کی کافی دلیل ہے کہ وہ روایتیں جھوٹی اور مخالفین اسلام اور یہودیوں اور عیسائیوں کی مخترع ہیں۔

سر ولیم میور ایک اور نیا قاعدہ ایجاد کرتے ہیں اور اس کا نام ''تلون آمیز اختراع'' قرار دیتے ہیں اور اس کی مثالیں اس طرح پر بیان کرتے ہیں کہ ''مثلاً بیس گواہ تو یہ بیان کرتے ہیں کہ محمدؐ خضاب کیا کرتے تھے اور خضاب کی دوا کا نام بھی بتاتے ہیں بعض صرف

اسی قدر دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم نے بچشم خود اس امر کو پیغمبرؐ کی زندگی میں مشاہدہ کیا تھا بلکہ ان کی وفات کے بعد آپ کا بال جس پر کہ رنگ محسوس ہوتا تھا دکھلا دیا تھا اور بیس گواہ جن کو ایسے ہی عمدہ ذریعے واقفیت کے حاصل تھے بیان کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے کبھی خضاب نہیں کیا اور ان کو خضاب کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ ان کے سفید بال اس قدر تھوڑے تھے کہ شمار میں آسکتے تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب پیغمبر خدا کے سفید بال نہایت کم تھے کہ گنتی میں آسکتے تھے اور آنحضرت ﷺ نے تمام عمر کبھی خضاب نہیں کیا۔ جو لوگ کہ ہمیشہ پاس رہتے تھے اور ان کا یہی بیان ہے کہ جو کہ سفید بال ہونے سے پہلے اکثر بال بھورے ہو جاتے ہیں تو جن لوگوں نے ان بھورے بالوں کو دیکھا خیال کیا کہ خضاب کئے ہوئے ہیں اور انہوں نے آنحضرت ﷺ کا خضاب کرنا بیان کیا اور اسی بھورے بال کو دکھا کر استدلال کیا۔ خضاب کی دوا کا ذکر کسی معتبر حدیث میں نہیں ہے بلکہ حدیث میں اس شئے کا ذکر ہے جس کو پیغمبر خدا بروقت غسل کے اپنے سر پر ملتے تھے پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان روایات کا اختلاف حالات مذکورہ بالا کے سبب قدرتی اسباب سے وقوع میں آسکتا ہے ان کو دیدہ ودانستہ عیارانہ بناوٹیں نہیں کہہ سکتے اور نہ ان روایتوں کو اور نہ اسی قسم کی اور روایتوں کو جن کا ذکر سرولیم نے اپنی کتاب کے حاشیہ میں کیا ہے متناقض روایتیں کہہ سکتے ہیں۔

بعد اس کے سرولیم میور اس قسم کی ایک اور مثال پیش کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ”خاتم نبوی کے باب میں جس میں کوئی جانب داری مطالب خاندانی یا عقیدہ کے مضر نہ تھی نہایت متناقض روایتیں ہیں۔ ایک فریق کا قول ہے کہ اپنے مراسلات پر مہر لگانے کی ضرورت سے پیغمبرؐ نے خالص چاندی کی ایک انگشتری بنوائی تھی۔ دوسرے فریق کا بیان ہے کہ خالد ابن سعید نے اپنے واسطے ایک لوہے کی انگوٹھی جس پر چاندی کا خول چڑھا ہوا تھا بنوائی تھی اور محمدؐ نے اس انگوٹھی کو پسند کر کے اپنے پاس رہنے دیا۔ ایک تیسری روایت ہے کہ اس انگشتری کو عمرو ابن سعد حبش سے لائے تھے۔ اور چوتھی روایت یہ ہے کہ معاذ ابن جبل نے اس مہر کو اپنے لئے یمن میں کھدوایا تھا۔ بعض روایتوں میں منقول ہے کہ محمد صاحب اس انگشتری کو سیدھے ہاتھ میں پہنا کرتے تھے اور بعض میں لکھا ہے کہ الٹے ہاتھ میں۔ بعض روایات میں مندرج ہے کہ مہر کا رخ اندر کی طرف رکھا کرتے تھے اور بعض میں یہ ہے کہ باہر کی طرف کو بعض روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس مہر پر جملہ ”صدق اللہ“ منقش تھا اور بعض سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ ”محمد رسول اللہ“ تھا اب یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتے ہیں کیونکہ یہ متواتر بیان کیا گیا ہے کہ محمد صاحب کی وفات کے بعد اس انگشتری کو ابوبکر اور عمر اور عثمان نے زیب انگشت کیا تھا اور عثمان کے ہاتھ سے چاہ غرلیس میں گر پڑی تھی۔ ایک روایت یہ ہے کہ نہ تو پیغمبرؐ نے اور نہ کبھی ان کے خلفائے راشدین نے کوئی انگشتری پہنی تھی۔“

جس طبیعت سے ان روایتوں کو بیان کیا ہے بلاشبہ نہایت افسوس کے قابل ہے اور سرولیم میور کی طبیعت سے نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ یہ بیان سرولیم میور کا کہ ”یہ سب روایتیں ایک ہی انگشتری کی طرف اشارہ کرتی ہیں“ محض غلط ہے اور جو دلیل اس کی بیان کی ہے وہ اس سے بھی زیادہ غلط ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ چاندی کے خول کی انگشتری کو کسی دیکھنے والے نے چاندی کی انگوٹھی خیال کی ہو؟ یا چاندی کی انگوٹھی علیحدہ اور خول والی انگوٹھی علیحدہ ہو۔ کیا یہ بات ممکن نہیں ہے کہ معاذ ابن جبل والی پر جملہ ”صدق اللہ“ اور جناب پیغمبر خدا کی بنوائی ہوئی انگوٹھی پر جملہ ”محمد رسول اللہ“ کندہ؟ کبھی آنحضرت ﷺ نے انگوٹھی کو سیدھے ہاتھ میں پہنا ہو اور کبھی الٹے ہاتھ میں اور کبھی اس طرح پہنا ہو کہ مہر کا رخ اندر کی طرف ہوا اور کبھی باہر کی طرف اس انگوٹھی کو آنحضرت اور خلفائے راشدین ہمیشہ اور ہر وقت پہنے نہیں رہتے تھے۔ جس شخص نے ان کو ایسی حالت میں دیکھا اس نے بیان کیا

کہ کبھی انگوٹھی نہیں پہنی تھی جو کہ سر ولیم میور نے غلطی سے یادانستہ ان سب روایتوں کو ایک ہی انگشتری سے متعلق کیا ہے اس لئے اپنی دلیل میں بلا تفصیل بیان کرتے ہیں کہ وہ انگشتری صحابہ تک پہنچی تھی حالانکہ وہ صرف وہ انگشتری تھی جس پر جملہ **"محمد رسول اللہ"** کندہ تھا پس ان روایتوں میں سے کوئی روایت بھی متناقض نہیں ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے فرضی اور دل نشین نقوش وخیالات کو اس قدر آزادی دے دی ہے کہ ان کو حجت وبرہان کی صراط مستقیم سے منحرف کر دیا ہے اور ہر شئے متعلق باسلام کو گو کیسی ہی سادہ اور قرین قیاس کیوں نہ ہو شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے پر مائل کیا ہے اور اس کو جعلسازی اور ایجاد اور اختراع وغیرہ ناموں سے بدنام کرتے ہیں۔ سر ولیم میور کی تجربہ کاری سے بحیثیت ایک اعلیٰ درجہ کے عالم ہونے کے یقینی امید تھی کہ ان کو اس بات سے مطلع کر دے گی کہ محض بیانات جن کی تائید میں کوئی دلیل وثبوت نہ ہو ہمیشہ اسی مقصد کی خرابی کے باعث ہوتے ہیں جس کی حمایت کی ان سے توقع کی گئی ہو۔

ہر صحیح دماغ اور ذی ہوش شخص کو اس بات کے معلوم ہونے سے ملال ہوگا کہ سر ولیم میور نے قواعد فن تصنیف سے اس قدر انحراف اختیار کیا ہے کہ دین اسلام پر الفاظ ذیل میں ایک بے جا اتہام عائد کرتے ہیں یعنی وہ فرماتے ہیں کہ ''مقدس جھوٹ کی رسم اصول اسلام سے منحرف نہیں ہے۔ مروجہ دینیات اسلام کی رو سے فریب بعض حالتوں میں روا ہے خود پیغمبرؐ نے اپنے احکام ونظیر سے اس عقیدہ کی ترغیب دی ہے کہ بعض مواقع پر جھوٹ بولنا جائز ہے'' اس عبارت کے حاشیہ میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ''مسلمانوں کے ہاں عام اعتقاد یہ ہے کہ چار موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز ہے۔ اول کسی شخص کی جان بچانے کے واسطے' دوم صلح اور اتفاق کرانے کے واسطے سوم عورت کی ترغیب دینے کے واسطے' چہارم سفر یا مہم کے وقت میں۔''

ان کی مثالیں بھی صاحب موصوف لکھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ''اول کی نسبت تو پیغمبرؐ کی صریح منظوری موجود ہے۔ عمار ابن یاسر کو کفار مکہ نے بہت اذیت پہنچائی اور اسلام سے انکار کرنے پر انہوں نے رہائی پائی۔ پیغمبرؐ نے اس فعل کو پسند کیا اور فرمایا کہ ''اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر اسی طرح انکار کر دینا۔'' (کاتب الواقدی صفحہ ۲/۱-۲۲۷)

ایک اور روایت خاندان یاسر میں چلی آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مشرکین نے عمار کو پکڑ لیا اور جب تک کہ ان سے محمدؐ کی مذمت اور اپنے معبودوں کی تعریف نہ کرالی ان کو نہ چھوڑا اور جب وہ پیغمبرؐ کے پاس آئے اور انہوں نے حال پوچھا تو کہا یا نبی اللہ بڑی خرابی کی بات ہوئی۔ جب تک کہ میں نے آپ کی مذمت اور ان کے معبودوں کی تعریف نہ کی مجھ کو نہ چھوڑا۔ پیغمبرؐ نے پوچھا کہ تو اپنے دل کا کیا حال پاتا ہے تو جواب دیا کہ ایمان میں مستقل اور مطمئن ہے۔ اس وقت محمدؐ نے فرمایا کہ اگر وہ پھر ایسا کریں تو پھر یہی کہہ دینا۔ محمدؐ نے بھی فرمایا کہ عمار کا جھوٹ ابوجہل کے سچ سے بہتر ہے۔

سر ولیم میور کی نکتہ چینی ہر ایک شخص کو تعجب میں ڈالتی ہوگی۔ شیکسپیئر کا قول ہے ''دیکھو کہ کس طرح ایک سادہ قصہ تم کو دھوکا دے گا۔'' اول تو ان روایتوں کی جس کو سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معتبر سند درکار ہے دوسرے جن الفاظ میں صاحب موصوف نے ان مضمون کو بیان کیا ہے وہ درست اور ٹھیک نہیں ہیں یعنی زیادہ تر عام اور غیر معین' ہیں۔ سر ولیم میور اول موقع جھوٹ بولنے کے جواز کا ''کسی کی جان بچانا'' بیان کرتے ہیں اول تو یہی غلط ہے کیونکہ بموجب ان روایتوں کے جو انہوں نے بیان کی ہیں ان کو لازم تھا ''اپنی جان بچانا'' لکھتے اور اس بے دھڑک اور پر جرأت بیان کے بجائے سر ولیم میور کو لازم تھا کہ جملہ شرائط وقیود اور مواقع کی جو صدق سے اس طرح انحراف کرنے کو جائز ٹھہراتے ہیں تصریح کر دیتے۔ جس فریبندہ اور معیوب پوشاک میں سر ولیم میور نے اس

مضمون کوملبوس کیا ہے اگر وہ اتار لی جائے تو وہ اصلی نتائج جو بذریعہ جائز اور منصفانہ دلیل اور صحیح مقدمات سے مستنبط ہوں گے یہ ہوں کہ ''اگر کفار یا کوئی بے رحم و جفا کار اشخاص جبر اور اذیت یا قتل کی دھمکی سے کسی ایسے آدمی سے اس شئے کا انکار کرالیں جس کو کہ وہ اپنے دل سے اور ایمان سے برحق سمجھتا ہو اور جس کے اوپر وہ ایسی مصیبت میں بھی دلی اعتقاد رکھتا ہو تو ایسے حال میں اگر وہ اس سے انکار کرے تو سزائے ارتداد کا ہرگز مستوجب نہیں ہے۔''

جبریہ مواعید سے انحراف کے جواز کی تصدیق فرانسیس اول بادشاہ فرانس کی مشہور و معروف نظیر سے بھی ہوتی ہے یعنی اس بادشاہ کو چارلس پنجم نے چنگ پا دیا (۱۵۲۵ء) میں مقید کر کے میڈرڈ کے پر ذلت صلح نامہ کا بالجبر اقبال کرا کے دستخط کرا لئے تھے بادشاہ فرانس نے مخلصی پاتے پاتے ہی اپنے قول وقرار پر قائم رہنے سے بعذر اجبار انکار کیا اور پوپ کلیمنٹ ہفتم نے درحقیقت اس کو اس جبریہ حلف سے بری کر دیا۔

آدمی کے افعال کے جرم اور بے جرمی کا مدار نیت اور اختیار پر ہوتا ہے اور اسی بناء پر تمام لوگ افعال کو نیک و بد قرار دیتے ہیں۔ کیا وہ کلمات اور حرکات جو کسی شخص سے بہ سبب اذیت اور قتل کی دھمکیوں کے لکھوا اور کرا لئے گئے ہوں اسی درجہ اور ویسی سزا کے مستوجب ہیں جیسے کہ اس شخص کے کلمات اور حرکات جو بلا اجبار و اکراہ اس سے سرزد ہوئے ہوں۔

یہ اصول جس سے کہ اسلام کی پاکیزگی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے اور جو محض ایک بے خطا اور قدرتی فطرت کا بے کم وکاست کا سچا نمونہ ہے اور جس کو سر ولیم میور نے بیان کیا ہے قرآن مجید میں نہایت سادہ اور صریح طور پر بالفاظ ذیل بیان کیا گیا ہے کہ:

من کفر باللہ من بعد ایمانہ الا من اکراہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدر افعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم. (سورۃ النحل: ۱۰۸)

''جس نے خدا کے ساتھ کفر کیا بعد ایمان لانے کے مگر وہ جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو لیکن جس نے کفر کے ساتھ سینہ کھولا پس اس پر خدا کا غصہ ہے اور ان پر بڑا عذاب ہے۔''

اس آیت پر فقہا نے غور کی ہے اور اس کے حکم کا مقصد دو طرح قرار دیا۔ اول عزیمت یعنی باوصف اذیتوں اور تکلیفوں اور قتل کے خوف کے جو کفار اس پر روا رکھیں۔ وہ ظاہر میں بھی اسی سچ پر قائم رہے۔ جس پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ دوم رخصت یعنی ایسی حالت میں اس کو اپنے بچانے کے لئے اجازت ہے کہ ظاہر میں اس ایمان کا جس کی تصدیق اس کے دل میں ہے بطور تقیہ کے انکار کرے اور دشمنوں کی ایذا سے نجات پائے۔ البتہ یہ ایک عجیب بات ہے کہ سر ولیم میور نے اس حقیقت کو اس مقدس جھوٹ پر محمول کیا ہے جس کا رواج عیسائیوں میں تھا اور اس پر بھی ہم کو نہایت تعجب آتا ہے کہ انہوں نے اپنے مدعا کو عجیب اختصار کے ساتھ ادا کیا ہے یعنی ان چند لفظوں میں کہ ''کسی کی جان بچانے کے واسطے'' جس کے بیان کے لئے قرآن مجید میں بھی باوجود اس کی مشہور و معروف مختصر البیانی کے ایک پوری آیت درکار ہوئی ہے۔

دوسرا موقع جواز کذب کا بقول سر ولیم میور کے وہ ہے جبکہ کوئی شخص صلح و آشتی کرانا چاہے اور وہ فرماتے ہیں کہ یہ امر روایت ذیل سے بخوبی ثابت ہے۔ اس روایت کا ترجمہ انگریزی زبان میں جو انہوں نے فرمایا ہے وہ حسب مندرجہ ذیل ہے۔

''وہ شخص جو دو شخصوں کے مابین صلح کرائے اور ان کے رفع نزاع کے واسطے کلمات خیر کہے جھوٹا نہیں ہے گو وہ کلمات دروغ ہوں۔''

مگر یہ ترجمہ جو سر ولیم میور نے کیا ہے محض غلط ہے۔ اصل حدیث جو بخاری اور مسلم میں ہے اور جس کو مشکوٰۃ میں بھی نقل کیا گیا ہے ہم بجنسہ اس مقام پر لکھتے ہیں:

عن ام کلثوم قالت قال رسول اللہ ﷺ لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس فیقول اخیر اویمنی خیرا (متفق علیه مشکوۃ)

''ام کلثوم نے کہا کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا نہیں ہے جھوٹا وہ شخص جو صلح کرائے درمیان آدمیوں کے پس کہے بھلائی اور پہنچائے بھلائی۔''

قال القاضی البیضاوی ای یبلغ ما یسمعه ویدع شره (کرمانی)

''قاضی بیضاوی نے اس کی شرح اس طرح کی ہے کہ پہنچائے وہ باتیں جو منوائیں اس کو اور چھوڑ دے شر کی باتوں کو۔''

سر ولیم میور کی عربی علیت کو خیال کر کے ہم کو افسوس ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ خود اصل حدیث پر غور کرتے اور خود اس کا صحیح ترجمہ لکھتے انہوں نے کپتان ای این میتھو کے غلط ترجمہ مشکوٰۃ کو اختیار کیا اور کپتان میتھو نے دانستہ یا نادانستہ کیسی غلطی کی ہے کہ الفاظ ''گو وہ کلمات دروغ ہوں'' اپنے ترجمہ میں بڑھا دیئے ہیں اور وہ الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔

ہمارے مذہب میں اگر کوئی شخص کسی ماجرے کے حالات پورے پورے نہ بیان کرے اور قصداً کسی بدنیتی سے اس ماجرے کی کوئی بات کہے اس پر بھی کذاب کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے جناب پیغمبر خدا نے فرمایا کہ اگر صلح کروانے کی حالت میں صرف اچھی ہی باتوں کا تذکرہ کرے تو وہ کذابوں میں داخل نہیں ہے یعنی جو سزا کہ ایسے شخص کے لئے ہے جس نے بدنیتی سے کچھ باتوں کو چھوڑ دیا ہے اس سزا کا مستحق نہیں ہے۔

تیسرا اور چوتھا موقع جس میں سر ولیم میور اسلام میں جھوٹ بولنا جائز قرار دیتے ہیں' وہ یہ ہے ''کسی عورت کو ترغیب دینے میں'' اور ''سفر یا مہم میں'' سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ ''بلحاظ تیسرے موقع کے ہمارے پاس ایک افسوس آمیز نظیر موجود ہے کہ محمدؐ نے ماریہ قبطیہ کے معاملہ میں اپنی ازواج سے جھوٹے وعدے کرنے معیوب نہ سمجھے اور بلحاظ چوتھے موقع کے ان کا معمول تھا کہ بوقت ترتیب مہمات (باستثنائے مہم تبوک) اپنے مدعائے اصلی کو پوشیدہ رکھتے تھے اور کسی سمت غیر کی جانب روانگی کا عزم مشتہر کر دیتے تھے۔''

سر ولیم میور نے تیسرے موقع کی جو نظیر پیش کی ہے وہ محض غلط ہے۔ کوئی صحیح روایت اس معاملہ میں قابل اعتبار موجود نہیں اور حدیث کی معتبر کتابوں میں اس کی بابت ایک لفظ بھی نہیں پایا جاتا اور چونکہ بنیاد کے استحکام اور ضعف ہی سے اوپر کی عمارت کے استحکام اور ضعف کا حال کھل جاتا ہے پس کوئی بات قابل اعتبار نہیں ہو سکتی جب کہ اس روایت کی صحت کا جس پر وہ مبنی ہو کافی ثبوت نہ ہو۔

ترتیب مہمات کے وقت غیر سمت کو مشتہر کرنے کی تائید میں بھی کوئی معتبر روایت نہیں لیکن اگر ہم اس کو صحیح بھی تسلیم کر لیں تو کیا سر ولیم میور قوانین جنگ سے بھی واقف نہیں ہیں جو اس پر نکتہ چینی کرتے ہیں؟ جب تک کہ کسی فریق سے عزم جنگ مشتہر نہیں کیا گیا ہے اس وقت تک کوئی ایسا کام کرنا جس سے طرف ثانی کو دھوکا ہو بلاشبہ خلاف اخلاق اور صداقت کے ہے لیکن جب جنگ کا اشتہار دے دیا جائے تو اس وقت کوئی ایسا حیلہ کرنا جس سے فریق ثانی مغلوب ہو صداقت کے خلاف نہیں ہے۔

تعجب یہ ہے کہ سر ولیم میور اس الزام کو جو عیسائی مذہب پر قدیم سے چلا آتا ہے مسلمانی مذہب پر عائد کرنا چاہتے ہیں۔ مقدس

جھوٹ کا تو مسلمانوں کو خواب میں بھی خیال نہیں آیا ہوگا کیونکہ اس کا تصور ہے اس صدق حقیقی کی نقیض ہے جو قرآن مجید کا لب لباب اور جوہر ہے اور اس کی ہر سطر میں جلوہ نما ہے۔ برخلاف اس کے یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں جیسا کہ تاریخ سے صاف صاف ثابت ہوتا ہے منجملہ ارکان مذہبی کے مقدس جھوٹ بھی ایک رکن تھا اور ہم کو اس بات کے سننے سے تعجب آتا ہے کہ مقدس پال حواری اس کو برا بھی نہیں سمجھتا تھا گناہ سمجھنا تو درکنار جیسے کہ خود عیسائی عالم اس امر کو مقدس پال۔ اس کلام سے ثابت کرتے ہیں جہاں انہوں نے فرمایا ہے کہ ''اگر میرے جھوٹ کے سبب خدا کی سچائی ظاہر ہوئی اور اس کی بزرگی زیادہ ہوئی تو کس لئے میں گنہگار گنا جاتا ہوں۔'' (پال کا خط رومیوں کو باب ۳ آیت ۷)

اب ہم تاریخ کی کتابوں سے اس مقدس جھوٹ کا ذکر کرتے ہیں جو عیسائی مذہب میں مروج تھا۔ کتاب کرسچین ایتھولوجی ان ویلڈ میں مرقوم ہے کہ ''کلیسیا کا وہ شریف اور راست باز فرزند۔ یعنی موشیم جس کی سند اور مسلمہ صداقت میں پادریوں کو کبھی کلام نہیں ہوا ہے امر ذیل کی تصدیق کرتا ہے۔ پیروان افلاطون فیثا غورث نے اس عمر کو ایک اصول قرار دیا تھا کہ صدق و پرہیز گاری کے مطالب کی ترقی کی غرض سے دھوکا دینا اور نیز بروقت ضرورت جھوٹ کا استعمال کرنا جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ یہودیانِ سکنائے مصر نے حضرت عیسیٰ کے آنے سے پیشتر اس اصول کو ان کے (یعنی پیروان افلاطون وفیثا غورث سے) سیکھا اور اخذ کیا تھا جیسا کہ بیشمار تحریرات سابقہ سے بلا حجت واعتراض ثابت ہے اور عیسائیوں پر اس مضر غلطی نے ان دونوں ذریعوں سے اثر کیا جیسا کہ ان بے شمار کتابوں سے جن کو نامی وگرامی اشخاص کی طرف اتہاماً منسوب کیا ہے ظاہر ہے خلاصہ صدر صرف دوسری صدی کی طرف اشارہ کرتا ہے جب کہ بیشمار اناجیل وخطوط وغیرہ کے حسب بیان موشیم غلط موضوع ہوئی تھیں اور غلط منسوب کی گئی تھیں مگر چوتھی صدی میں اس مروجہ اصول میں کہ دینی مطالب کی ترقی کے واسطے دھوکا دینا اور جھوٹ بولنا نہایت ثواب کا کام ہے۔ بہت کم استثناء وقوع میں آئے ہیں...... بلانڈل دوسری صدی کے ذکر میں بیان کرتا ہے کہ خواہ مزدوروں اور کذابوں کی اشد بے حیائی خواہ معتقدین کی قابل افسوس سریع الاعتقادی کے لحاظ سے یہ ایک نہایت خراب زمانہ تھا اور مقدس جھوٹ میں اور سب زمانوں سے سبقت لے گیا تھا...... کسوبن اس طرح پرشاکی ہے کہ مجھ کو دین عیسوی کے ابتدائی زمانہ میں اس بات کے دریافت ہونے سے رنج ہوا کہ بہت سے لوگ کلام ربانی کو اپنے اختراعات سے مدد دینے سے ناموری سمجھتے تھے بدیں غرض کہ ہمارے نئے عقیدہ کو عقلائے کفار گوش دل سے سنیں۔'' (صفحہ ۸۰-۸۲)

اسی کتاب میں یہ بھی بیان ہے ''اور جب کبھی معلوم ہوتا تھا کہ انجیل ہر امر میں اہل دین کے مطالب یا حکام ملکی کے اغراض کے جو ان سے ساز رکھتے تھے موافق نہیں ہے تو ضروری تحریفات کر لی جاتی تھیں اور طرح طرح کے مقدس جھوٹ اور جعلسازیاں کچھ مروج ہی نہ تھیں بلکہ بہت سے پادریوں نے ان کو جائز قرار دیا تھا۔'' (صفحہ ۵۲)

اس کتاب میں ایک اور مقام پر یہ بیان ہے ''اول کی تین صدیوں کے لحاظ سے ہم کو اپنے دین کی صحیح تاریخ کا کچھ علم نہیں بجز اس کے جو نہایت خراب اور بگڑے ہوئے ذریعوں سے حاصل ہوتا ہے کس واسطے کہ ان اہل سیر کی روائتیں اور حکایتیں جو اس زمانہ میں گزرے تھے ذرا بھی اعتبار کے قابل نہیں ہیں یہ محض مقدس جھوٹ اور جعلسازیوں کی وجہ سے مشہور ہیں مگر ان موروثی کرتبوں اور ہنروں میں بھی یوسی بیس بشپ قیصریہ صدی آئندہ میں ان سے بھی سبقت لے گیا جس کا کلام حق کو چھانٹ چھونٹ کر دین کے عام مطالب سے موافق کر دینے میں کوئی ہمسر نہ تھا۔ وہ خود براہ فخر بیان کرتا ہے کہ ''جس سے ہمارے دین کی عظمت و نام آوری بڑھے

میں نے بیان کر دیا ہے اور جو اس کی تحقیر وتذلیل کی طرف مائل ہو میں نے سب چھوڑ دیا ہے۔" (صفحہ ۲۶)

متعدد اہل سیر کی تحریرات میں عدیم الامکان ریاضت اور عام سفلہ پن کی عیاشی و بدوضعی کی طرف مائل ہے۔ ایک عجیب ملاوٹ پائی جاتی ہے۔ شہوات جسمانی اور خوف ایمانی کے مابین غلبہ حاصل کرنے کی صریح کوششیں اکثر قابل تضحیک معلوم ہوتی ہے مگر یہ صرف طبیعت انسانی کے ضعف کی وجہ ہے اور ہم کو صرف اسی وقت رنج آمیز حیرت ہوتی ہے جبکہ وہ صفات ملکوتی کے حصول کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے خام اور بیہودہ عقائد جولاطینی زبان میں بیان ہیں پادریان کیتھولک کے ہر وعظ وخطبہ میں مخلوط ہیں اور حواریان ذی الہام کے عقائد اور نیز حضرت مسیح کے ملفوظات کی نسبت زیادہ تر منقول ہوتے ہیں لیکن یہ امید ہے کہ ٹرٹیولین کے خیالات لا طائل "ڈی ہابی ٹیو مولیرس" اور سنٹ باسل کی "ڈی ویرا درجی نے ٹے ٹی" نوجوان عورتوں کو نہیں دکھلائی جائیں گی۔ تمام بے اعتقاد مصنف جنہوں نے احکام الٰہی کا فلسفہ کی رو سے امتحان کیا ہے دین عیسوی کو کفر بتا کر مضرت پہنچانے میں اس قدر ساعی نہیں ہوئے ہیں جس قدر کہ حضرات اہل سیر ہوئے ہیں۔ انہوں نے چشمہ آب ہی کو زہریلا کر دیا ہے اور ان سب بے اعتقاد مصنفین نے اس کا پانی پینے سے لوگوں کو باز رکھا ہے۔ ان کی سریع الاعتقادی نے جو اس وجہ سے عارض ہوئی تھی کہ وہ طبائع و معاملات انسانی سے محض ناتجربہ کاری اور علوم طبیعی سے بالکل ناواقف رکھتے تھے انجیل کی بے شرمانہ تحریفات وتصرفات کی استعانت سے کلیسائے روم میں عجیب وغریب بیہودگیوں اور بدعتوں کا ایک جم غفیر شائع کر دیا جن کو باوجود دوفریاد عقل کے خوش اعتقادی اب بھی ہضم کر جاتی ہے۔ صرف اسی قدر مضرت ان سے نہیں پہنچی انہوں نے اخلاق کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا۔ انہوں نے اس مقولہ کی (جس کو میں موشیم کے الفاظ میں لکھتا ہوں) تلقین کہ "دھوکا دینا اور جھوٹ بولنا جب کہ ان ذریعوں سے مطالب دین ترقی پذیر ہوں ثابت ہے۔" کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس مطلق العنان اصول نے دروغ گوئیوں اور جعلسازیوں کے چشمہ کا دہانہ کھول دیا جس کا پانی ابتدا دین عیسوی کی سرزمین میں مثل طوفان کے چھا گیا اور ان فریبوں اور باطنی ذخیروں کو جو فی زمانہ عیسائیان رومن کیتھولک کو انگشت نما اور بدنام کرتے ہیں رواج دیا۔ اہل سیر میں اول سے لے کر آخر تک سب سے بڑا خاصہ یہ پایا جاتا ہے کہ کفر آمیز سفلگی، سریع الاعتقادی، تعصب اور فریب دہی کے حامی تھے باایں ہمہ ایسے لوگوں کو جانشینان پطرس حواری نے پاک اور مقدس لوگوں کی فہرست میں لکھا ہے۔

سر ولیم میور کو مناسب تھا کہ ان حالات پر خیال کر کے اسلام کی نسبت مقدس جھوٹ کے بے جا طور پر تہمت لگانے کی کوشش نہ فرماتے۔ اسلام سرتاپا صدق ہے۔ وہ نہایت درجہ کی صدق اور راست بازی کا دین ہے اور اسی حیثیت سے اور سب دینوں پر جن میں کسی نہ کسی قدر جھوٹ کی آمیزش پائی جاتی ہے فوقیت کے دعویٰ کا مجاز ہے۔

☆☆☆

الخطبة السابعة

فی

القران وھو الھدی والفرقان

انه لقران کریم فی کتاب مکنون لا یمسه الا المطھرون

قرآن جناب پیغمبر خدا پر کس طرح نازل ہوا

قرآن مجید جناب پیغمبر خدا پر حضرت موسیٰ کی طرح پتھر کی تختیوں پر کھدا ہوا نازل نہیں ہوا تھا۔ اور نہ اس بات کی ضرورت پڑی تھی کہ ان کے ٹوٹ جانے کے سبب اس کے ضائع ہونے کا خوف ہوا اور پھر آنحضرت ﷺ کے اصحاب کے لئے اس کی دوبارہ نقل پتھر کی تختیوں پر کھودنے کی ضرورت پڑی ہو۔ اس کے نزول کے وقت نسبت کوئی امر عجائبات سے بھرا ہوا نہ تھا کیونکہ محمد ﷺ کا دل سینا کا پہاڑ تھا اور مسلمانوں کے دل پتھر کی لوحیں تھیں۔ خدا فرماتا ہے کہ:

"وانه لتنزیل رب العالمین نزل به الروح الا مین علی قلبک لتکون من المنذرین بلسان عربی مبین وانه لفی زبر الاولین" (سورۃ شعراء)

"بیشک وہ اتارا ہوا ہے عالموں کے پروردگار کا اس کو اتارا ہے روح الامین نے اوپر تیرے دل کے تاکہ تو ہو ڈرنے والوں میں سے (اس کو اتارا ہے) عربی زبان واضح میں اور بیشک وہ ہے اگلوں کے صحیفوں میں۔

"عن عائشه ان الحارث بن هشام سأل رسول الله ﷺ فقال یارسول الله کیف یاتیک الوحی فقال رسول الله ﷺ احیانا یاتینی مثل صلصلة الجرس وهو اشد علی فیفصم عنی وقد رعیت عنه ما قال و احیانا تمثل لی الملک رجلا فیکلمنی فاوعی ما یقول" (متفق علیه)

حضرت عائشہؓ نزول وحی کی کیفیت اس طرح بیان کرتی ہیں کہ حارث بن ہشام نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! آپ پر وحی کیونکر آتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کبھی گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے پس پھر مجھ سے منقطع ہو جاتی ہے اور میں نے یاد رکھا جو کہا۔ اور کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں مجھ سے کلام کرتا ہے پس میں یاد رکھتا ہوں جو کہتا ہے۔

جو طریقہ نزول وحی کا اس حدیث میں رسول خدا نے بتایا اس میں کوئی عجیب امر یا اسرار نہیں ہے لیکن بالفعل ہم اس مضمون کو اور وحی کی حقیقت کے بیان کو چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ ہمارا ارادہ ہے کہ جب پیغمبر خدا کی سوانح عمری کے اس مقام پر پہنچیں۔ جب کہ آنحضرت ﷺ پر اولاً وحی نازل ہوئی تھی اس وقت ہم اس کو شرح و بسط سے بیان کریں گے۔

وحی یعنی قرآن مجید جب نازل ہوتا تھا لکھا جاتا تھا یا نہیں

آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے پیشتر اور نیز آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ملک عرب میں کوئی معین یا باقاعدہ طریقہ تعلیم کا جاری نہیں تھا۔ عربوں میں صرف دو شاخیں علم کی تھیں یعنی قدرتی فصاحت و بلاغت اور علم الانساب۔ ان کی تحصیل کے لئے کسی مکتب یا مدرسہ میں تعلیم کے پانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ صرف زبانی تعلیم پر منحصر تھے اسی وجہ سے اس زمانہ میں بیشمار آدمی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور جو لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے ان کی تعداد نہایت محدود تھی۔ پہلے یعنی جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے پچھلوں کے مقابلہ میں امی کہلاتے تھے۔ اگرچہ ان دونوں قسموں کے لوگوں میں بہت ہی کم فرق تھا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ آنحضرت ﷺ کو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تھا نہ وہ خود لکھ سکتے تھے اور نہ اوروں کا لکھا پڑھ سکتے تھے اور اسی سبب سے آنحضرت ﷺ کا لقب امی ہو گیا تھا۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق بیشمار معتبر اور مستند روایات اور احادیث سے ہوتی ہے اس کے برخلاف ایک بھی ایسی روایت نہیں پائی جاتی جو کسی قدر بھی معتبر ہو۔ درحقیقت اگر آنحضرت ﷺ کو لکھنا پڑھنا آتا ہو ان کے صحابہ رفقا اور متبعین اس امر میں کسی طرح سکوت اختیار نہ کرتے اور ان کی ازواج مطہرات اور ان کے عزیز اور اقربا اور بالخصوص ان کے چچا جنہوں نے ان کو پالا تھا بے خبر نہیں رہ سکتے تھے اور نہ ایسی جرأت ہو سکتی تھی کہ اپنے قبیلہ کے سامنے خلاف واقعہ اپنے آپ کو امی فرماتے اور قرآن مجید میں بھی اپنے تئیں اسی لقب سے ظاہر کرتے کیونکہ ایسی صورت میں مخالفین کو اس کی گرفت کا آسان موقع ہاتھ آجاتا اور عقائد اسلام کی تصدیق پر ان کو ہرگز یقین نہ آتا۔ قطع نظر اس کے ایک ایسی خفیف بات کے چھپانے سے جناب پیغمبر خدا کو کیا فائدہ تھا۔ ان کا لکھا پڑھا ہونا منصب نبوت کے کسی طرح مخالف نہ تھا اور نہ اس سے قرآن مجید کی شان اور اس کے معجزہ میں اور بے مثل فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق آسکتا تھا کیونکہ حروف کے لکھ لینے یا پڑھ لینے سے کوئی انسان فصیح و بلیغ نہیں ہو سکتا خصوصاً ایسے فصیح و بلیغ جس کا مثل عرب کے بڑے بڑے فصحا میں سے کوئی بھی نہ تھا۔

اسلام کے مؤرخوں میں سے کسی کو اس بات کا انکار نہیں ہے کہ اس زمانہ میں فن تحریر کا عرب میں رائج تھا اور کچھ لوگ لکھنا جانتے تھے اور دوسروں کا لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے شاعر اپنے قصیدوں کو کعبہ کے دروازوں پر آویزاں کرتے تھے چنانچہ قصائد سبعہ معلقہ اسی نام سے مسلمانوں میں معروف و مشہور ہیں ان کا قول صرف اسی قدر ہے کہ فن تحریر کا رواج تھا مگر بہت کم لوگ اس کو جانتے تھے اور بمقابلہ نہ جاننے والوں کے ان کی تعداد بہت قلیل تھی۔

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وحی جو آنحضرت ﷺ پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتی تھی دو قسم کی تھی۔ اول وہ تھی جس کے بجنسہ وہی الفاظ جو بذریعہ وحی کے القا ہوتے تھے لکھوا دیتے تھے تاکہ لوگ اس کو بخوبی یاد کر لیں اور وہ محفوظ رہیں۔ خود قرآن مجید کی اکثر آیتیں جیسے کہ "الم ذلک الکتاب" اور آیت "لایمسه الا المطهرون" اس پر دلالت کرتی ہیں گو کہ پچھلی آیت کی دوسری حقیقت ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات نازلہ کے لکھ لینے کی رسم اوائل ایام نزول وحی سے اختیار کی گئی تھی کیونکہ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے مکہ سے ہجرت کرنے سے پیشتر یعنی اس زمانہ میں جبکہ اسلام کا آغاز تھا اور ایک ضعف کی حالت میں تھا ان معدود لوگوں کے پاس جو ایمان لے آئے تھے ان وحیوں کی نقلیں موجود تھیں اور حضرت عمرؓ کے خاندان میں بھی ان کے

مسلمان ہونے سے پہلے اس کی ایک نقل تھی اس لئے کہ ان کی بہن مسلمان ہوگئی تھیں۔

''عن ابن عباس قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یعرف فصل السورۃ حتی ینزول علیہ بسم اللہ الرحمن الرحیم. (رواہ ابو داؤد)

جب کوئی قرآن کی آیت ایسی نازل ہوتی تھی کہ اس کے پہلے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' ہوتی تھی تو سمجھا جاتا تھا کہ نئی سورت شروع ہوئی ہے چنانچہ ابوداؤد نے ابن عباس کی روایت سے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ سورۃ کا علیحدہ ہونا نہیں جانتے تھے جب تک کہ ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' نازل ہو۔

پوری سورۃ وقت واحد میں نازل نہیں ہوتی تھی بلکہ بعض آیتیں کسی وقت اور بعض آیتیں کسی وقت نازل ہوتی تھیں اور اسی وجہ سے کسی سورت کی آیتیں بہ ترتیب لکھی نہیں جاتی تھیں بلکہ جدا جدا چمڑوں یا اونٹ کی ہڈیوں یا کھجور کی چھال پر لکھی جاتی تھیں۔

اس بات کے ثبوت میں کہ جو کچھ چمڑوں یا ہڈیوں یا کھجور کی چھال وغیرہ پر لکھا گیا تھا وہ بالکل محفوظ اور متعدد لوگوں کے قبضہ میں تھا' چار معتبر حدیثیں موجود ہیں۔

پہلی حدیث ابن عباس کی ہے جو بخاری میں منقول ہے:

''عن ابن عباس قال جمعت المحکم فی عهد رسول اللہ ﷺ فقلت له وما المحکم قال المفصل'' (بخاری باب تعلیم الصبیان القران)

''ابن عباس نے کہا کہ میں نے محکم کو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جمع کیا میں نے ان سے کہا کہ محکم کیا۔ انہوں نے کہا مفصل۔

دوسری حدیث قتادہ کی بھی بخاری میں موجود ہے:

''حدثنا قتادہ قال سئلت انس بن مالک من جمع القران علی عهد النبی ﷺ قال اربعة کلهم من لانصار ابی بن کعب و معاذ ابن جبل و زید بن ثابت و ابو زید'' (بخاری باب القراء)

''قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک سے پوچھا کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں قرآن کس نے جمع کیا کہا چار اشخاص نے جو چاروں انصار تھے۔ ابی بن کعب' معاذ بن جبل' زید بن ثابت' ابوزید۔''

تیسری حدیث انس کی بخاری میں موجود ہے:

''عن انس قال مات النبی ﷺ ولم یجمع القران غیر اربعة ابو الدر داء و معاذ بن جبل وزید بن ثابت و ابو زید. (بخاری باب القراء)

''انس کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے وفات کی اور چار شخصوں کے سوا کسی نے قرآن نہیں جمع کیا ابودرداء' معاذ بن جبل' زید بن ثابت' ابوزید۔''

چوتھی حدیث وہ حدیث ہے جس میں بیان ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں زید بن ثابتؓ نے جب قرآن مجید کو ایک جگہ جمع کرنا چاہا تو قرآن مجید کی تمام آیتیں جو مختلف وقتوں میں نازل ہوئی تھیں اور مختلف چیزوں پر لکھی ہوئی تھیں اور مختلف اشخاص کے قبضہ میں تھیں ان سب کو منگا کر اکٹھا کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تحریرات تھیں سب موجود اور محفوظ تھیں۔''

سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کیونکر ہوئی اور کس نے کی

"وعن ابن عباس قال قلت لعثمان ما حملکم علی ان عمدتم الی الانفال وھی من المثانی و الی البراۃ وھی من المائین فقرنتم بینھما ولم تکتبو بسم اللہ الرحمن الرحیم و وضعتموھا فی السبع الطوال ما حملکم علی ذلک قال عثمان کان رسول اللہ ﷺ منتھا یاتی علیہ الزمان ینزل علیہ السور ذوات العد دوکان اذا نزل علیہ شئی دعا بعض کان یکتب فیقول اضعوا ھؤلاء الایات فی سورۃ التی یذکر فیھا کذاوکذا وکانت الا نفال من اوائل ما نزل بالمدینۃ وکانت براۃ من اخرۃ القران نزلا وکانت قصتھا شبیھۃ فقض رسول اللہ ﷺ ولم یبین لنا انھا منھا افمن اجل ذلک قرنت بینھما ولم اکتب سطر بسم اللہ الرحمن الرحیم فی السبع اطوال " (رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد)

ہم کو واضح ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب خود جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اور ان کی ہدایت اور حکم کے موافق عمل میں آئی تھی۔ جیسے کہ ابن عباس کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے ابن عباس نے حضرت عثمان سے کہا کس چیز نے تم کو آمادہ کیا انفال کی طرف کہ وہ مثانی میں سے ہے اور براءۃ کی طرف کہ وہ مائین میں سے ہے۔تمہارے اس ارادہ کا پھر ان دونوں کو ملا دیا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو نہیں لکھا اور ان دونوں کو سبع طوال میں رکھا۔اس بات پر تم کو کس چیز نے آمادہ کیا۔عثمان نے کہا حضرت پر بہت سی آیتوں والی سورتیں ایک مدت میں اترتی تھیں اور جب آپ پر کچھ اترتا تھا تو آپ ان میں ُسے کسی کو جو لکھا کرتے تھے بلا کر فرماتے تھے کہ ان آیتوں کو اس سورت میں رکھو جس میں ایسا ذکر کیا گیا ہے اور انفال ان میں سے ہے جو اول مدینہ میں اتری۔اور براءۃ سب سے آخر میں اتری اور اس کا قصہ اس کے قصہ سے ملتا ہوا تھا پھر آنحضرت ﷺ کا انتقال ہو گیا اور آپؐ نے بتایا نہیں کہ وہ اس سے ہے۔پس اسی وجہ سے میں نے ان دونوں کو ملا دیا۔اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی سطر نہیں لکھی اور ان دونوں کو سبع طوال میں رکھا۔"

عن شقیق بن سلمۃ قال خطبنا عبد اللہ فقال واللہ لقد اخذت من فی رسول اللہ ﷺ بضعاو سبعین سورۃ. (بخاری باب تالیف القران)

بخاری کی اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے ستر سورتیں خود آنحضرت ﷺ کے منہ سے سن کر یاد کر لی تھیں چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ عبداللہ نے خطبہ پڑھا اور کہا کہ بخدا میں نے آنحضرت ﷺ کے منہ سے کچھ اوپر ستر سورتیں لیں (یعنی سیکھیں)

ایک اور روایت میں بخاری ان لوگوں کے نام بیان کرتے ہیں جنہوں نے قرآن مجید کو حفظ کر لیا تھا اور ان کے نام یہ ہیں عبداللہ ابن مسعودؓ سالمؓ معاذ بن جبلؓ ابی ابن کعب اور ایک روایت میں آیا ہے کہ منجملہ مقتولین جنگ یمامہ کے جو پیغمبر خدا کی وفات کے تھوڑے ہی بعد ہوئی تھی ستر شخص ایسے شہید ہوئے تھے جن کو قرآن مجید بالکل حفظ تھا۔

ان تمام روایتوں سے دو امر بخوبی ثابت ہوتے ہیں اول یہ کہ گو جناب پیغمبر خدا کی حیات میں قرآن مجید چمڑے وغیرہ پر کیسی ہی بے ترتیبی سے لکھا ہوا موجود ہو۔ مگر جن لوگوں نے کہ پوری سورتیں یاد کر لی تھیں ان میں آیتوں کی بالکل ترتیب تھی اور وہ ترتیب یقینی آنحضرت ﷺ کی ہدایت اور حکم کے موافق تھی۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں نے قرآن مجید کو ترتیب وار حفظ کر لیا تھا اس سے یہ دلیل مستنبط ہوتی ہے کہ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب بھی آنحضرت ﷺ نے ہی کے فرمانے سے لوگوں کو معلوم ہو گئی تھی۔

جناب پیغمبر خدا خود بھی قرآن مجید کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی اس کے پڑھتے رہنے کی ہمیشہ ہدایت کرتے تھے

اس مضمون کی نسب ہم کو کچھ زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ صرف ان معتبر اور مستند حدیثوں کا نقل کر دینا کافی ہے جن سے امر مذکورہ کا ثبوت ہوتا ہے اور جن سے پایا جاتا ہے کہ قرآن مجید کے پڑھنے اور یاد رکھنے میں جس ترتیب سے کہ پیغمبر خدا نے فرما دیا تھا کس قدر لوگوں کو توجہ تھی حدیثیں یہ ہیں۔

"عن عثمان رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم خیر کم من تعلم القرآن و علمه" (رواه البخاری)

پہلی حدیث بخاری کی ہے اس میں بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم میں اچھا وہ شخص ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا۔

"عن عقبة بن عامر قال خرج رسول الله صلی الله علیه وسلم و نحن فی الصفة فقال ایکم یحب ان یغدو کل یوم الی بطحان و العقیق فیاتی بناقتین کومدین فی غیر اثم ولا قطع رحم قلنا یا رسول الله کلنا تحب ذلک قال افلا یغد واحد کم الی المسجد فیعلم اویقرا ایتین من کتاب بالله خیر له من ثلث واربع خیرله عن ثلث واربع خیر له من اربع ومن اعداد هن من الا بل" (رواه مسلم)

دوسری حدیث مسلم کی ہے: عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور ہم لوگ صفہ میں تھے۔ پس فرمایا کہ تم لوگوں میں سے کس کو یہ پسند ہے کہ ہر روز صبح کو بطحان یا عقیق جائے اور دو اونٹنیاں لائے بغیر اس کے کہ مرتکب جرم ہو یا قطع رحم کرے۔ ہم لوگوں نے کہا یا رسول اللہ یہ تو ہم سب لوگ چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کیا پس تم لوگ مسجد میں ہر صبح کو آ کر دو آیتیں کتاب اللہ کی نہیں سیکھتے یا نہیں پڑھتے جو اونٹنیوں سے اس کے لئے بہتر ہیں اور تین تین سے بہتر ہیں اور چار چار سے بہتر ہیں اور جتنی ہوں اتنی اونٹنیوں سے بہتر ہیں۔"

"عن عائشة قالت قال رسول الله ﷺ الماهر بالقرآن مع السفرة الکرام البررة والذی یقرأ القران ویقتعتع فیه وهو علیه شاق له اجران " (متفق علیه)

تیسری حدیث مسلم اور بخاری دونوں کی ہے عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو قرآن کا ماہر ہو وہ پاکیزہ بزرگ نیک لوگوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور اس میں دقت اٹھاتا ہے اور وہ اس پر شاق ہے

اس کو دوہرا ثواب ہے۔''

''عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ لا حسد الا علی اثنین رجل اتاه الله القرآن فهو یقوم به اناء اللیل و اناء النهار و رجل اتاه الله مالا فهو ینفق منه اناء اللیل و اناء النهار'' (متفق علیه)

چوتھی حدیث بھی مسلم اور بخاری دونوں میں موجود ہے ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رشک کے قابل صرف دو شخص ہیں۔ایک وہ جس کو خدا نے قرآن دیا ہو (یعنی اس کو قرآن پڑھنا آتا ہو) اور وہ برابر دن رات تلاوت کرتا رہے اور ایک وہ جس کو خدا نے مال دیا ور وہ برابر دن رات خرچ کیا کرے (یعنی خیرات دیا کرے)۔''

''عن ابی موسیٰ قال قال رسول الله ﷺ مثل المومن الذی یقراء القران مثلا لا ترجة ریحها طیب و طعمها طیب و مثل المومن الذی لایقراء القران مثل الثمرة لا ریح لها و طعمها حلو و مثل المنافق الذی لا یقراء القرآن کمثل الحنظلة لیس لها ریح و طعمها مرو مثل المنافق الذی یقراء القران مثل الریحانه ریحها طیب و طعمها مر ''(متفق علیه)

پانچویں حدیث کو بھی مسلم اور بخاری دونوں نے نقل کیا ہے ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا جو مسلمان قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ترنج کی سی ہے۔اس کا مزا بھی اچھا اور خوشبو بھی اچھی ہے اور جو مسلمان قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال چھوارے کی سی ہے۔خوشبو نہیں اور مزہ میٹھا ہے اور جو منافق قرآن نہیں پڑھتا اس کی مثال اندرائن کی سی ہے خوشبو کچھ نہیں اور مزا کڑوا۔اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ریحانہ کی ہے خوشبو اچھی اور مزا کڑوا۔

''عن ابی هریرة قال قال رسول الله ﷺ تعلمو القران فاقرؤه فان مثل القران لمن تعلم فاقراء وقامه به کمثل جواب محشو مسکا تفوح ریحه کل مکان و مثل من تعلم فقد وهو فی جوفه کمثل جواب او کی علی مسک۔ (رواه الترمذی و النسائی و ابن ماجه)

چھٹی حدیث کو ترمذی اور نسائی اور بن ماجہ نے نقل کیا ہے۔ابو ہریرہ کہتے ہیں فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیکھو قرآن اور پڑھاؤ۔کیونکہ جو شخص قران سیکھے اور پڑھے اور اس پر قائم رہے اس کے لئے قرآن ایسا ہے جیسے ایک کیسہ مشک سے بھرا ہوا۔اس کی خوشبو ہر جگہ پھیلتی ہے اور جو شخص قرآن سیکھ کر سو گیا ہو اور وہ اس کے پیٹ میں ہو وہ مثل ایک کیسہ کے ہے جو مشک بھر کر بند کر دیا ہو۔''

''عن ابن عمر قال قال رسول الله ﷺ ان هذا القلوب تصداء کما یصدا الحدید اذا اصابه الماء قیل یا رسول الله ما و جلاء ها قال کثرة ذکر الموت وتلاوت القران'' (رواه البیهقی)

ساتویں حدیث کو بیہقی نے نقل کیا ہے۔ابن عمر کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جس طرح لوہے کو لگتا ہے لوگوں نے کہا یا رسول اللہ پھر وہ صاف کیونکر ہو فرمایا موت کے بہت یاد کرنے اور قرآن کی تلاوت کرنے سے۔

''عن عبدالله بن مسعود قال قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم المنبر اقراء علی قلت اقراء علیک و علیک انزل قال انی احب ان اسمعه من غیری فقراء ت سورة النساء حتی اتیت الی

هذه الاية فكيف اذا جئنا من كل امة شهيد وجئنا بك على هولاء شهيدا قال حسب الان فالقفت اليه فاذا عيناه تذرقان (متفق عليه)

آٹھویں حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ منبر پر مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن سناؤ۔ میں نے کہا۔آپ کے آگے میں پڑھوں اورآپؐ پرتو نازل ہوا ہے۔آپؐ نے فرمایا کہ مجھے یہ دل پسند ہے کہ دوسرے سے سنوں۔پس میں نے سورۂ نساء پڑھی یہاں تک کہ میں اس آیت پرآیا" **فيكف اذا جئنا من كل امة بشهيد وجئنا بك على هولاء شهيدا**" (یعنی پس کیا حال ہوگا جب ہم ہرامت میں سےایک گواہ لائیں گے اور تجھ کو ان سب گواہوں پر گواہ لائیں گے) آپ نے فرمایااچھاپس۔میں نے جوآنکھ اٹھا کر دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسوگرر ہے تھے۔

"**عن ابى سعيد الخدرى قال جلست فى عصابة من ضعفاء المهاجرين وان بعضهم يستتر ببعض من العرى وقارى يقرء علينا اذ جاء رسول الله ﷺ فقال علينا فلما قام رسول الله ﷺ سكت القارى فسلم ثم قال ما كنتم تصنعون قلنا كنا نستمع الى كتاب الله قع فقال الحمد لله الذى جعل من امتى من امرت ان اصبر نفسى معهم قال فجلس و سلطان ليعدل بنفسه فينا ثم قال بيده هكذ افتحلقوا و بزرت وجوهم له فقال ابشر وايا معشر صعاليك المهاجرين بالنور التام يوم القيمة تدخلون الجنة قبل اغنياء الناس نصف يوم ذلك خمسمائة سنة**" (رواه ابو داؤد)

نویں حدیث ابوداؤد میں بیان ہوئی ہے۔ابوسعید کہتے ہیں کہ میں ضعیف مہاجروں کےایک گروہ میں بیٹھاتھااوران میں سے بعض بعض سے بوجہ عریانی چھپتے۔اورایک قاری ہم پرقرآن پڑھتاتھا اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور کھڑے ہوئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھڑے ہوئے تو قاری چپ وہ گیا۔آپ نے سلام کی اورفرمایا کہ خدا کاشکر ہےجس نے میری امت میں سے ایسےلوگوں کو کیا جن کے ساتھ مجھے صبر کرنے کاحکم ہے کہاابوسعید خدری نے کہ پھرآنحضرت ہم لوگوں کے بیچ میں بیٹھ گئے تا کہ اپنے کو ہم لوگوں کے برابر کریں۔پھر ہاتھ سے اشارہ کیا کہ پس لوگ گرداگرد بیٹھ گئے اور سب کا منہ آنحضرت ﷺ کی طرف تھاپس فرمایا کہ اے مفلس مہاجرین تم کوخوشخبری ہونورکامل کی۔قیامت کے دن تم لوگ جنت میں مالداروں سے آدھے دن پہلے جاؤ گےاور یہ دن پانچ سو برس کا ہوگا۔

نازل ہونا قرآن کا سات قرآءاتوں میں یا قرأت مختلفہ میں

اختلاف قرأت ایک ایسی اصطلاح ہےجس کے سبب سے عیسائی مصنفوں کونہایت دھوکا پڑا ہےاوروہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح عہدعتیق اورعہدجدید کی کتابوں میں اختلاف قرأت ہےاسی طرح اختلاف قرأت قرآن مجید میں بھی ہے۔حالانکہ وہ دونوں بالکل مختلف ہیں اور جواسباب کہ عہدعتیق اورعہد جدید میں قرأت مختلفہ کے پیش آئے ہیں اس سے قرآن مجید کی قرأت سبعہ سے زمین و آسمان کافرق ہے۔اگرہم قرآن مجید کی قرأت سبعہ یااختلاف قرأت کوانہیں معنوں لیں جن معنوں میں عیسائیوں نے لیا ہے توبہ آسانی کہاجاسکتا ہے کہ ہم مسلمانوں کےقرآن مجید میں اختلاف قرأت مطلق نہیں ہے۔

عہد عتیق اور عہد جدید میں جو اختلاف قرأت ہے اس کی بنیاد اور اس کے اسباب اور اس کے نتائج رورنڈ مسٹر ہارن نے یہ بیان کئے ہیں کہ ''دو یا زیادہ قرأت مختلفہ میں صرف ایک ہی قرأت صحیح ہو سکتی ہے اور باقی یا تو کاتب کی عمداً تحریفات یا غلطیاں ہوں گی مگر قرآن مجید میں یہ بات نہیں ہے کیونکہ تمام اختلاف قرأت اس معنی میں ہیں جس میں کہ مسلمانوں نے اس اصطلاح کو قرار دیا ہے جس قدر قرآن مجید میں پائے جاتے ہیں وہ سب صحیح اور سب درست ہیں گو ظاہر میں یہ امر کیسا ہی متناقض معلوم ہوتا ہو۔

رورنڈ مسٹر ہارن نے عہد عتیق اور عہد جدید میں قرأت مختلفہ کے واقع ہونے کے یہ اسباب بیان کئے ہیں (۱) ناقلوں کی چوک اور غلطیاں (۲) منقول عنہ میں سقم اور غلطیوں کا موجود ہونا (۳) کاتبوں کا بدوں کسی کافی سند کے متن کی عبارت کی اصلاح کی خواہش کرنا (۴) قصداً تحریفات کا کرنا جو کسی فریق کے حصول مدعا کے واسطے کی گئی ہوں۔ ان اسباب کو قرآن مجید کی اختلاف قرأت سے کچھ بھی علاقہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں جو اختلاف قرأت ہیں ان کے اسباب حسب تفصیل ذیل ہیں۔

اول: تمام قرآن مجید یا اس کی سورتیں ایک وقت میں نازل نہیں ہوئی تھیں بلکہ کوئی آیت کسی سورت کی کسی وقت میں اور کوئی آیت کسی وقت میں نازل ہوئی تھی۔ ایک سورت ابھی ختم ہونے نہیں پائی تھی کہ دوسری سورت نازل ہونی شروع ہوئی اور ایسی چند آیتیں نازل ہوئیں جن کا مضمون اس سورت کی آیتوں سے جو پہلے نازل ہو چکی تھیں محض مختلف تھا اور یہ سورت بھی نامکمل رہ کر ایک اور سورت نازل ہونا شروع ہو گئی اور اسی طرح سلسلہ جاری رہا۔ تمام آیتیں جس طرح پر نازل ہوئیں علیحدہ علیحدہ چمڑوں کے ٹکڑوں پر اور بے ترتیبی سے لکھی ہوئی رہیں۔ اگرچہ پیغمبر خدا نے تمام آیتوں اور سورتوں کی ترتیب لوگوں کو بتلا دی تھی تاہم لوگوں کو جن کے پاس قرآن مجید کی آیتوں کی نقلیں منتشر حالت میں موجود تھیں ان سب کو اس کا علم نہیں ہوا تھا۔ اس سبب سے آیتوں کو بہ ترتیب پڑھنے میں اختلاف واقع ہوا۔ بعض لوگوں نے بعض آیتوں کو ان آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جن سے وہ ٹھیک طور پر علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔

دوم: نقطوں کا اختلاف' قدیم تحریر میں جس کے نمونے اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ نقطوں کے دینے کا بہت کم رواج تھا۔ فعل مضارع کے پہلے حرف ''ی'' غائب کے صیغہ پر اور حرف ''ت'' حاضر کے صیغہ پر آتی ہے۔ لکھنے میں ان دونوں حرفوں کی ایک ہی صورت ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ پہلے حرف کے نیچے دو نقطے ہوتے ہیں اور دوسرے حرف کے اوپر دو نقطے ہیں۔ نقطوں کے لکھنے کا قدیم تحریر میں رواج نہ ہونے سے کسی نے اس حرف کو ''ی'' پڑھا اور کسی نے ''ت'' اور علماء نے اس کو اختلاف قرأت قرار دیا۔

سوم: عرب کی مختلف قوموں میں جو مختلف اقطاع میں رہتی تھیں مختلف لہجے تھے اور ہر ایک قوم اپنے لہجہ میں قرآن مجید کی آیتوں کو پڑھتی تھی اور اختلاف لہجہ کو بھی علماء اختلاف قرأت میں داخل کیا ہے۔

چہارم: اعراب کا اختلاف۔ قدیم تحریروں میں لفظوں پر اعراب دینے کا بھی دستور نہ تھا اور اہل عرب کو کہ عربی خود ان کی مادری زبان تھی اعراب دینے کی ضرورت تھی مگر بعض دفعہ جملوں کے دو طرح پر ربط دینے سے اعراب میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس سبب سے لوگ بعض الفاظ کے اعراب میں اختلاف رکھتے ہیں مثلاً وضو کی آیت میں جو لفظ ''ارجلکم'' واقع ہے بعضوں نے خیال کیا کہ اس کا عطف ''وجوھکم'' پر ہے جو اسی میں واقع ہے اور اسی سبب سے انہوں نے ''ارجلکم'' کے ''ل'' کو مفتوح پڑھا اور بعضوں نے اس کا عطف ''رؤسکم'' پر خیال کیا۔ اور ''ارجلکم'' کے

"ل" کومکسور پڑھا۔ اگر چہ ایسی مثالیں بہت کم ہیں مگر علماء نے اس کو بھی اختلاف قرأت میں داخل کیا۔ حالانکہ درحقیقت یہ ایک بحث نحو کے قواعد سے متعلق ہے نہ اختلاف قرأت سے۔

پنجم: عربی زبان سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی مادہ کے افعال کے لیے عربی زبان میں متعدد ابواب ہوتے ہیں اور ان ابواب سے ایک ہی مادہ کے مختلف طرح پر صیغے مشتق کئے جاتے ہیں اور گو وہ لکھنے میں ایک ہی صورت کے ہوں مگر ان کا تلفظ مختلف ہو جاتا ہے اس وجہ سے بعض لفظوں کو قرآن مجید کے کسی شخص نے کسی باب سے مشتق سمجھ کر کس تلفظ سے پڑھا اور کسی نے دوسرے باب سے مشتق سمجھ کر کسی تلفظ سے پڑھا۔ عرب میں بعض قومیں ان ابواب میں سے کسی باب کا استعمال کرتی تھیں اور بعض قومیں کسی باب کا۔ اور اسی سبب سے ان الفاظ کے تلفظ میں اختلاف ہو جاتا تھا۔ اس قسم کا اختلاف بھی بہت ہی شاذ و نادر قرآن مجید میں ہے علمائے اسلام نے اس کو بھی اختلاف قرأت میں داخل کیا حالانکہ وہ صرف عربی زبان کے قواعد صرف سے متعلق ہے۔

اس بیان سے واضح ہوگا کہ کتب عہد عتیق اور عہد جدید پر عیسائی عالموں نے جن معنی پر اختلاف قرأت کا اطلاق کیا ہے اور جو اسباب اس کے بیان کئے ہیں اس سے وہی معنی قرآن مجید کے اختلاف قرأت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہے۔ اگر اختلاف قرأت کے وہی معنی قرار دیں جو عیسائی عالموں نے قرار دیے تو اس کا قرآن مجید کی نسبت استعمال کرنا صریح غلطی اور خطا ہے۔

جو امور کہ ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ان کی توضیح کے لیے ہم چند حدیثوں کو اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

"عن جابر قال خرج علینا رسول اللہ ﷺ ونحن نقراء القران وفینا الا عرابی و العجمی فقال اقراؤا فکل حسن و سیجیی اقوام یقیمونہ کما یقام القد ح یتعجلونہ ولاینا جلونہ" (رواہ ابو داؤد و البیھقی فی شعب الایمان)

پہلی حدیث ابوداؤد اور بیہقی کی ہے۔ اس نے جابر سے بیان کیا ہے کہ جابر کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ہم لوگوں کے سامنے تشریف لائے اور ہم لوگ قرآن پڑھ رہے تھے اور ہم عربی و عجمی دونوں قسم کے لوگ تھے۔ پس فرمایا کہ پڑھو سب اچھا ہے اور آئندہ ایسی قومیں آئیں گی کہ اس کو سپاٹے سے پڑھیں گی تیر کے سپاٹے کی مانند جلدی کریں گی اور ٹھہر کر نہ پڑھیں گی۔"

"عن ابی ابن کعب قال لقی رسول اللہ ﷺ جبرئیل فقال یا جبرئیل انی بعثت الی امة امین منھم العجوز والشیخ الکبیر والغلام الجاریة والرجل الذی لم یقراء کتاباً قط قال یا محمد ان القران انزل علی سبعة احرف" (رواہ الترمذی)

دوسری حدیث ترمذی کی ہے اس نے ابی ابن کعب سے بیان کیا ہے۔ ابی ابن کعب نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل سے ملے پس فرمایا کہ اے جبرائیل میں مبعوث ہوا ایک جاہل امت کی طرف جس میں بوڑھے اور بڑھیا اور لڑکا و لڑکی اور ایسے آدمی ہیں جنھوں نے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی جبرئیل نے کہا۔ اے محمدؐ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔"

"عن ابن عباس ان رسول اللہ ﷺ قال اراء نی جبرئیل علی حرف فراجعتہ فلم ازل استزیدہ

ویزیدنی حتی انتهی الی سبعة احرف قال ابن شهاب بلغنی تلک السبعة الاحرف انما هی فی الامریکون واحد الا یخلف فی حلال ولا حرام" (متفق علیه)

تیسری حدیث بخاری اور مسلم کی ہے ان دونوں نے ابن عباس سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ کو جبرائیل نے قرآن پڑھایا ایک حرف پر پھر میں نے ان سے دوہرا کر پڑھوایا پس میں زیادہ برابر پڑھوا تا رہا اور وہ زیادہ کرتے گئے کہ سات حرف (یعنی قرأت) تک پہنچے ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ کو یہ ساتوں حرف معلوم ہوئے سو مطلب ایک ہی رہتا ہے۔ کسی حلال وحرام میں ان سے اختلاف نہیں پڑتا۔

"عن عمر بن الخطاب ؓ قال سمعت هشام بن حزام یقرء سورة الفرقان علی غیر ما اقراء ها وکان رسول الله صلی الله علیه وسلم اقرینها فکدت ان عجل علیه ثم امهلته حتی انصرف ثم لبته بردائه فجئت به رسول الله صلی الله علیه وسلم فقلت یا رسول الله انی سمعت هذا تقرء سورة الفرقان علی غیر ما اقراینها فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم اقراء فقراء القراة التی سمعته یقرأ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم هذا انزلت اوالقران انزل علی سبعة احرف فاقروا وما تیسر منه" (متفق علیه)

چوتھی حدیث بخاری اور مسلم کی ہے ان دونوں نے حضرت عمر سے بیان کیا ہے۔ عمر بن خطاب نے کہا کہ میں نے ہشام بن حکیم بن حزام کو سورۂ فرقان پڑھتے سنا خلاف اس کے جس طرح میں پڑھتا ہوں۔ اور مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھایا تھا پس قریب تھا کہ میں ان پر جلدی کروں پھر میں نے ان کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ پھر کر چلے پھر میں ان کو چادر پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا اور کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! میں نے ان کو سورۂ فرقان اور طرح سے پڑھتے سنا۔ اس طرح سے نہیں جس طرح آپ نے مجھ کو پڑھایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو چھوڑ دو کہ پڑھیں پس انہوں نے اسی طرح پڑھا جیسا کہ میں ان سے سن چکا تھا۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسی طرح اتری ہے۔ پھر مجھ سے کہا پڑھو۔ میں نے پڑھا تو فرمایا اسی طرح اتری ہے۔ قرآن سات حرفوں پر اترا ہے جس طرح آسان ہو پڑھو۔"

"عن ابن مسعود قال سمعت رجلا فقرؤ سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقراء خلافها فجیت به النبی صلی الله علیه وسلم فاخبرته فعرفت فی وجهه الکراهة فقال کما یحن فلا تخلفوا فان من کان قبلکم اختلفوا هلکوا" (رواه البخاری)

پانچویں حدیث بخاری کی ہے انہوں نے ابن مسعود سے بیان کیا ہے کہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو قرآن پڑھتے سنا اور رسول اللہ ﷺ کو اس کے برخلاف پڑھتے سنا۔ پس میں اس کو نبی ﷺ کے پاس لایا اور اس بات کی اطلاع کی۔ پس میں نے حضرت کے چہرہ پر ناگواری دیکھی۔ پھر آپ نے فرمایا تم دونوں ٹھیک پڑھتے ہو سو اختلاف مت کرو۔ تم سے پہلوں نے اختلاف کیا تو وہ ہلاک ہوئے۔"

جو کچھ ہم نے اوپر بیان کی اس سے ہر شخص کو معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن مجید کے اختلاف قرأت اور توریت اور انجیل کے اختلاف قرأت میں بہت بڑا فرق ہے اور وہ اختلاف قرأت جس کو ہم نے مذاول میں داخل کیا ہے یعنی آیتوں کا آگے پیچھے اور الٹ پلٹ

پڑھنا وہ اختلاف حضرت ابوبکرؓ کے زمانۂ خلافت میں قریب قریب معدوم ہوگیا جب کہ زید ابن ثابت نے قرآن مجید کے مختلف حصوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا اور جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کے عہد میں جنہوں نے زید ابن ثابت کے جمع کیے ہوئے قرآن کی مجید کی نقلیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی تھیں اس اختلاف کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا تھا۔

جس میں حاضر اور غائب کے صیغوں کا اختلاف جو صرف ی اور ت کے لفظوں کے سبب سے تھا وہ باقی رہا۔موجودہ قرآن قرآنوں میں اختلاف قرأت بھی لکھا جاتا ہے نہایت احتیاط سے حاشیہ پر ان اختلافات کو لکھ دیا جاتا ہے مگر قرآن مجید کے پڑھنے والوں کو ظاہر ہے کہ وہ اختلافات نہایت قلیل اور شاذ ونادر ہیں اور معہذا ان سے اصلی مطلب اور احکام قران مجید میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔

تلفظ کا اختلاف بھی قریب قریب معدوم ہوگیا ہے کیونکہ قریش کے تلفظ کو سند قرار دینے میں کوششیں کامیاب ہوئی ہیں۔قریش ہی کے لہجہ اور زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اور اسی لہجہ اور زبان میں جناب پیغمبر خدا اس کو پڑھا کرتے تھے۔لیکن جو کہ اس زبان میں بعض حروف ایسے ہیں جن کا تلفظ اور قوموں سے ادا نہیں ہوسکتا اس سبب سے اس اختلاف سے بالکل پیچھا نہیں چھوٹا مثلاً اگر ہم کسی ایک عجمی اور کسی بدو کو اور کسی تربیت یافتہ عرب کو قرآن پڑھتے ہوئے سنیں تو فوراً پہچان لیں گے کہ یہ اختلاف اب بھی موجود ہے۔مگر یہ اختلاف صرف قرآن مجید کے پڑھنے میں محسوس ہوگا نہ اس کے املا میں اور اسی لئے وہ اختلاف ضبط تحریر میں نہیں آ سکتا اس کا اندازہ کرنے کو ان لوگوں سے قرآن مجید کے سننے کی ضرورت ہے۔

اعراب کا اختلاف بھی چند مقام میں جو بلحاظ قواعد صرف ونحو کے وقوع میں آیا ہے اب تک موجود ہے۔اور اسی قسم کے قرآن مجید کے حاشیوں پر لکھ بھی دیا جاتا ہے اور قرآن مجید کی تفسیروں میں اس کی نسبت ہر ایک امر کی تشریح کی جاتی ہے۔ابواب کے اختلاف سے جو صیغوں میں تلفظ کا اختلاف ہے وہ بھی بعض بعض جگہ موجود ہے۔اس کی بھی تصریح اسی قسم کے قرآن مجید کے حاشیوں پر کی جاتی ہے اور تفسیروں میں ان پر پوری بحث ہے۔

مگر جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ان اختلافات سے قرآن مجید کے اصلی معنی اور مقصد میں کچھ اثر واقع نہیں ہوتا۔اور جو الزام کہ عیسائیوں پر اپنی کتابوں میں تحریف کرنے کا ہے اس قسم کا الزام مسلمانوں پر قرآن کی آیات میں تصرف کرنے اور کمی وبیشی کرنے کا یا کسی آیتوں کو چھپا ڈالنے کا الزام عائد نہیں ہوسکتا۔علم ادب کی ایک شاخ ہے جو بالتخصیص قرآن مجید کی عبارت پڑھنے سے علاقہ رکھتی ہے اور جس کا نام علم تجوید ہے۔اس پر بہت کتابیں لکھی گئی ہیں اور علماء نے شرح وبسط سے اس کی شرحیں کی ہیں۔

قرآن مجید کی آیات وناسخ ومنسوخ ہونے کا بیان

عیسائی عالموں نے الفاظ ناسخ ومنسوخ کے معنی سمجھنے میں جس کا اطلاق علمائے اسلام نے بطور اصطلاح کے آیات قرآنی پر کیا ہے بہت بڑی غلطی کی ہے۔انہوں نے غلطی سے یہ سمجھا ہے کہ ناسخ آیتوں نے منسوخ آیتوں کو اس وجہ سے کہ ان میں کچھ نقص یا کسی قسم کا اشتباہ تھا بیکار کر دیا ہے۔ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ اسلام نے جو دینیات کے مسائل محقق کئے ہیں ان معنوں سے جو عیسائی عالم سمجھتے ہیں مختلف معنی قرار دیے ہیں۔مسلمانوں کا اس بات پر ایمان رکھنا ایک مذہبی فرض ہے کہ خدا تعالیٰ علیم اور علام الغیوب ہے۔یعنی اس کو ماضی اور حال اور استقبال کا یکساں علم ہے۔پس اگر ناسخ ومنسوخ کے یہ معنی سمجھے جائیں کہ اللہ تعالیٰ نے

ایک اپنے حکم سابق کو کسی حکم مابعد سے بدیں وجہ کہ اس پہلے حکم میں کچھ نقصان تھا منسوخ کر دیا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ حکم سابق کے وقت خدا تعالیٰ کی صفت علم کامل میں کچھ نقصان تھا اور ایسا عقیدہ اسلام کی رو سے کفر ہے۔ پس ظاہر ہے کہ علمائے اسلام نے جن معنوں میں لفظ ناسخ ومنسوخ کو استعمال کیا ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں ہے جو عیسائی عالم سمجھتے ہیں۔

ناسخ ومنسوخ کا لفظ اصطلاحاً دو چیزوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ ایک نبی سابق کی ایسی شریعت پر جو دوسرے نبی کی شریعت سے تبدیل ہو گئی ہو۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے پہلے ایک مرد اپنی زوجہ کی حیات میں اس کی بہن یعنی اپنی سالی سے شادی کر سکتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مرد کو کامل اختیار دیا تھا کہ جب چاہے اپنی زوجہ کو طلاق دے دے اور گھر سے باہر نکال دے اس حکم کو بقول عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تبدیل کر دیا اور حکم دیا کہ مرد اپنی زوجہ کو کسی صورت سے طلاق نہیں دے سکتا جب تک کہ اس نے کسی سے زنا نہ کیا ہو۔ آنحضرت ﷺ نے بھی طلاق دینے کو مرد کے اختیار میں رکھا لیکن اس پر یہ قید لگائی کہ اگر بغیر کسی اشد ضرورت اور معقول وجہ کے ایسا کرے تو وہ ایک گناہ کا مرتکب ہوگا۔

الفاظ ناسخ ومنسوخ کا استعمال جو علمائے اسلام نے شریعت انبیائے سابقین کی نسبت کیا ہے اور جس کا یہ مقصود ہے کہ ناسخ سے وہ شریعت مراد ہے جو شریعت نبی سابق کو غیر واجب العمل کر دے اور منسوخ سے وہ شریعت سابق مراد ہے جو غیر واجب العمل ہو گئی ہو۔ ان معنوں میں تو قرآن مجید کی آیتوں پر لفظ منسوخ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن مجید کے بعد کوئی ایسی شریعت نازل نہیں ہوئی اور نہ نازل ہوگی جو شریعت اسلام کو غیر واجب العمل کر دے۔ مگر ہم انبیائے سابقین کی شریعت کے منسوخ ہونے پر زیادہ بحث نہیں کریں گے بلکہ صرف اس مختصر بیان پر ختم کریں گے کہ علمائے اسلام نے شریعت انبیائے سابقین پر بھی ناسخ ومنسوخ ہونے کا اطلاق ان معنوں میں نہیں کیا ہے جو عیسائی خیال کرتے ہیں۔

جو کچھ کہ ہم نے اوپر بیان کیا اس سے ظاہر ہوگا کہ قرآن مجید کی وہ آیت جس کو ہم ذیل میں لکھتے ہیں قرآن مجید کی ایک آیت کے دوسری آیت کے منسوخ ہونے سے کچھ علاقہ نہیں ہے اور نہ اس سے اس بات پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت قرآن مجید کی دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہے کیونکہ اس آیت میں جو کچھ بیان ہے وہ سابقین کی شریعت کے ناسخ ومنسوخ ہونے سے متعلق ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت کی دوسری آیت سے اور وہ آیت یہ ہے۔

"ما یرد الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم واللہ یختص برحمته من یشاء واللہ ذو الفضل العظیمo ما ننسخ اية اوننسها نات بخیر منها اومثلها الم تعلم ان اللہ علی کل شئی قدیر" (سورہ بقرۃ آیت ۹۹،۱۰۰)

"اہل کتاب جو کافر ہوئے اور مشرکین یہ نہیں چاہتے کہ تم پر تمہارے خدا کی طرف سے کوئی بھلائی اترے۔ اور خدا خاص کرتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے اور خدا بڑی فضیلت والا ہے۔ ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے اچھی لاتے ہیں یا اس کے برابر۔ کیا تو یہ نہیں جانتا کہ خدا ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔"

مذکورہ بالا آیتوں سے کوئی ذی فہم شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ان سے قرآن مجید کی ایک آیت کا قرآن مجید کی دوسری آیت سے منسوخ ہونا پایا جاتا ہے بلکہ صاف اس میں اہل کتاب کا ذکر ہے۔ اور اہل کتاب جو اس بات کے مخالف تھے کہ ان کی شریعت کے برخلاف کوئی حکم نہ ہو اس کی نسبت خدا نے کہا کہ ہم جس آیت یعنی حکم شریعت اہل کتاب کو منسوخ کرتے یا بھلاتے ہیں تو اس سے

بہتر یا اسی کی مانند حکم بھیج دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس آیت سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہے بلکہ اس کو صریح شریعت اہل کتاب یا رسوم مشرکین سے علاقہ ہے جن کی طرف خاص اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے جن کی شریعت کے احکام میں شریعت محمدیؐ سے کسی قدر کمی و بیشی ہوگئی ہے۔

دوسرے ناسخ و منسوخ کی اصطلاح کا اطلاق علماء نے قرآن مجید کی آیتوں اور احادیث نبوی پر بھی کیا ہے لیکن نہ ان معنوں میں جو عیسائی سمجھتے ہیں۔

قرآن مجید اور احادیث نبوی میں ایسے احکام ہیں جو امر واحد سے علاقہ رکھتے ہیں مگر وہ احکام مختلف حالات اور مواقع پر صادر ہوئے ہیں اور جب کہ وہ حالت باقی نہیں رہتی تو وہ حکم جو اس حالت سے متعلق تھا غیر الواجب التعمیل ہو جاتا ہے اور دوسرا حکم جو حالت تبدیل شدہ سے مناسب ہو صادر ہوتا ہے ایسی حالت میں علمائے اسلام حکم اول پر منسوخ اور حکم ثانی پر ناسخ کا اطلاق کرتے ہیں مگر اس کے یہ معنی کسی طرح نہیں ہو سکتے کہ حکم اول میں کسی قسم کا نقص تھا بلکہ وہ حالت خاص جس کے واسطے وہ حکم مناسب تھا باقی نہیں رہی اس لئے وہ حکم بھی واجب التعمیل نہیں رہا لیکن درحقیقت منسوخ نہیں ہوا۔ کیونکہ اگر احیاناً وہی حالت پھر ظہور پذیر ہو تو وہی پہلا حکم واجب التعمیل ہوگا اور دوسرا حکم واجب التعمیل نہ رہے گا۔

مثلاً جب شراب پینے کی امتناع کا حکم نازل ہوا تو آنحضرت ﷺ نے سبز رنگ کے پیالوں کے استعمال کا بھی جو عرب میں بالتخصیص شراب پینے کے لئے مخصوص تھے منع فرمایا۔ مگر جب شراب پینے کی امتناع کا حکم عموماً سب لوگوں کو معلوم ہو گیا اور اس کا رواج بھی اٹھ گیا اس وقت آنحضرت ﷺ نے سبز رنگ کے پیالوں کے استعمال کی اجازت دے دی۔ اسی قسم کی ایک یہ مثال ہے کہ جب تک مسلمان مکہ میں رہے جہاں کفار قریش کی حکومت تھی اور مسلمان ان کے محکوم تھے اس وقت تک ان کو اپنے حکام کے ہاتھ سے ہر قسم کی تکلیفوں اور سختیوں کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم رہا۔ لیکن جب کہ مسلمان ان کی عملداری کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں چلے گئے تو اس وقت جہاد کرنے کے احکام صادر ہوئے۔ ان دونوں مثالوں میں علمائے اسلام نے اصطلاحاً حکم اول کو منسوخ اور حکم ثانی کو ناسخ سمجھا ہے لیکن اگر پہلی صورتیں پھر پیش آئیں تو وہی پہلے حکم واجب التعمیل ہوں گے۔

مختلف امور میں بعض احکام شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایسے تھے کہ جب تک خاص احکام ان کے نسبت آنحضرت ﷺ پر نازل نہیں ہوئے آنحضرت ﷺ نے انہیں حکموں پر عمل کیا۔ مگر جب خاص حکم نازل ہوئے تو ان کے مطابق کاربند ہوئے اور علماء نے ان احکام موسوی پر بھی منسوخ اور ان احکام خاص پر ناسخ کا اطلاق کیا۔ ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ الفاظ صرف اصطلاحیں ہیں جو علماء نے مقرر کی ہیں۔ محققین علمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ الفاظ ناسخ و منسوخ اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں قرآن مجید کی نسبت مستعمل نہیں ہوئے ہیں۔

جعفر کی حدیث میں جو یہ روایت ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا کہ "میرا کلام قرآن مجید کو منسوخ نہیں کرتا ہے مگر قرآن مجید کا کلام میرے کلام کو منسوخ کرتا ہے اور قرآن مجید کی ایک آیت ایک آیت کو منسوخ کرتی ہے۔" اور ابن عمر کی حدیث میں جو یہ روایت ہے کہ "میرا ایک کلام میرے دوسرے کلام کو منسوخ کرتا ہے جس طرح کہ قرآن کی آیتیں بعض آیتوں کو منسوخ کرتی ہیں۔" ان حدیثوں کی معتبر سند نہیں ہے اس لئے تسلیم کے قابل نہیں ہیں۔

اس باب میں ابن ماجہ کی حدیث نہایت صحیح اور معتبر ہے جوان دونوں حدیثوں کے برخلاف ہےاور جن سے ان لوگوں کی رائے کی جوقرآن کی ایک آیت سے دوسری آیت کے منسوخ ہونے کے قائل ہیں بخوبی تردید ہوتی ہےاور وہ حدیث یہ ہے:

"عن عمر ابن شعیب عن ابیه عن جده قال سمع النبی صلی الله علیه وسلم تو مایتدارؤن فی القران فقال انما هلک من کان قبلکم بهذا ضربوا کتاب الله بعضه ببعض وانما نزل کتاب الله یصدق بعضه بعضا فلا تکذبوا بعضه ببعض فما علمتم منه فقولوا به وما جهلتم فوکلوه الی عالمه" (رواه احمد و ابن ماجه)

"رسول اللہ ﷺ نے ایک قوم کو سنا کہ قرآن میں جھگڑا کرتے ہیں۔پس فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اسی سے ہوئے خدا کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے لڑایا (یعنی رد کیا) اور خدا کی کتاب تو اس لئے اتری ہے کہ بعض سے بعض کی تصدیق ہو۔پس بعض کی بعض سے تکذیب مت کرو۔اس میں سے جو جانو وہ کہواور جو نہ جانو اس کو اس کے واقف کار پر چھوڑ دو۔"

اس حدیث سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی آیتوں میں سے کوئی آیت بھی کسی آیت کی ناسخ ہے نہ کوئی آیت منسوخ ہے۔

مگر عالموں کا یہ اختلاف محض لفظی بحث پر مبنی ہے کیونکہ دونوں فریق یعنی وہ لوگ جو ناسخ ومنسوخ کے ہونے کے قائل ہیں اور جو لوگ اس کے قائل نہیں ہیں دونوں کے مباحثوں سے ایک ہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس لئے ہم اس مقام پر ان پہلی دو حدیثوں کے نامعتبر اور غیر مستند ہونے پر بحث کرنی بے فائدہ سمجھتے ہیں کیونکہ دونوں فریقوں کا بہ لحاظ حقیقت حال کے ایک ہی عقیدہ ہے۔

ایک زمانہ کے بعد جب کہ فقہائے اسلام نے قرآن مجید سے اوامر اور نواہی کا استنباط شروع کیا اور کتب فقہ کا تالیف ہونا شروع ہوگیا تو انہوں نے الفاظ ناسخ ومنسوخ کو اور بھی زیادہ وسیع اصطلاح میں استعمال کرنا شروع کیا جس پر نہ تو ان الفاظ کے لغوی اور لفظی معنی کا اور نہ ان معنوں کا جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ٹھیک ٹھیک اطلاق ہوسکتا ہے۔

مثلاً انہوں نے دیکھا کہ قرآن مجید کی ایک آیت میں کسی معاملہ کی نسبت ایک عام حکم ہےاور پھر کوئی خاص آیت ان کو ایسی ملی کہ جس سے اس عام حکم میں کسی حالت میں استثناء پایا جاتا تھا تو انہوں نے اس خیال سے کہ وہ پہلی آیت اپنی عمومیت پر باقی نہیں رہی اس کو منسوخ اور دوسری آیت کو اس کا ناسخ قرار دیا حالانکہ یہ صرف ایک فرضی اصطلاح ہے چنانچہ ہم ایک مثال سے اس امر کی زیادہ تر تشریح اور توضیح کرتے ہیں۔

"والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجاً وصیة لا زواجهم متاعًا الی الحول غیر اخراج فان خرجن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی انفسهن من معروف والله عزیز حکیم" (سورة البقرة: ۲۴۲)

"قرآن مجید میں ایک یہ آیت ہے کہ اور جو لوگ تم میں سے وفات پاتے ہیں اور چھوڑ جاتے ہیں بیویاں۔وصیت کر جائیں اپنی بیویوں کے لئے فائدہ دینا ایک برس تک بن نکالے۔پس اگر نکل جائیں پس نہیں گناہ ہے تم پر اس چیز میں کہ کریں وہ اپنے حق میں کچھ بہتری اور اللہ غالب ودانا ہے۔"

اس آیت کے صاف اور سیدھے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ اپنے مرنے کے بعد ازواج چھوڑ جائیں ان کے ایک برس کے نان و

نفقہ کے لئے وصیت کر جائیں تا کہ عورت (جو کہ اس جہان میں اپنے تمام حوائج ضروری میں اپنے خاوند کی محتاج ہوتی ہے) اپنے رنج و مایوسی کے ایام میں خاوند کے مرجانے سے مصیب اور تکلیف میں نہ پڑے۔ ہمارے فقہاء نے بیان کیا کہ اس آیت سے تین حکم نکلتے ہیں۔

(۱) شوہر پر واجب ہے کہ زوجہ کے سال بھر کے نان ونفقہ کی وصیت کر جائے۔
(۲) زوجہ شوہر متوفی کی جائیداد میں سے ایک سال سے زیادہ کے نان ونفقہ کی مستحق نہیں ہے۔
(۳) زوجہ شوہر کی وفات کی تاریخ سے سال بھر تک کسی دوسرے سے نکاح نہیں کر سکتی۔

جب کہ فقہاء نے اپنی ذہانت سے یہ قرار دیا کہ اس آیت سے یہ تین مسئلے نکلتے ہیں تو ان کو ایک اور آیت نظر پڑی جو ذیل میں مندرج ہے:

"والذین یتوفون منکم ویذرون ازواجا یتربصن بانفسھم اربعة اشھر وعشر فاذا بلغن اجلھن فلا جناح علیکم فیما فعولن فی انفسھن بالمعروف واللہ بما تعملون خبیر ولا جناح علیکم فیما عرضتم بہ من خطبة النساء او کنتم فی انفسکم علم اللہ انکم ستذکر ونھن ولکن لا تواعدو من سرا الا ان تقولو القولا معروفا" (سورة البقرة: ۲۳۴، ۲۳۵)

"اور جو لوگ تم میں سے وفات پاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں تو انتظار کرائیں (یہ عورتیں) اپنی جانوں کو چار مہینے اور دس دن۔ پس جب پہنچیں اپنی مدت کو پس تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اس چیز میں کہ وہ اپنے حق میں بھلائی سے کوئی بات کریں۔ اور خدا اس چیز سے خبر رکھتا ہے جو تم کرتے ہو اور نہیں گناہ ہے تم پر اس بات میں کہ اشارۃً تم نے عورتوں سے پیغام نکاح کیا ہو یا تم نے اپنے دل میں چھپا رکھا ہو۔ خدا جانتا ہے کہ تم ان کو یاد کرو گے مگر ان سے خفیہ وعدہ مت کر لو بجز اس کے کہ اچھی بات کہو۔"

اس آیت میں انہیں فقہاء نے اس میعاد کی تصریح اور تعیین پائی جس میں عورت کو شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے سے نکاح کرنا نہیں چاہیے اور انہوں نے سمجھا کہ یہ متعین میعاد پہلی آیت کے تیسرے حکم سے جو انہوں نے از خود اپنی ذہانت سے قرار دے لیا تھا مختلف ہے تو انہوں نے پہلی آیت کے تیسرے حکم کو بہ لفظ منسوخ تعبیر کیا اور پچھلی آیت کو اس کا ناسخ قرر دیا۔

اس کے بعد ان کو ایک اور آیت نظر پڑی جو ذیل میں مندرج ہے:

"ولھن الربع مما ترکتم ان لم یکن لکم ولد فان کان لکم ولد فلھن الثمن مما ترکتم من بعد وصیة توصون بھا او دین" (سورة النساء: ۱۴)

"اور ان کے لئے چوتھائی حصہ ہے تمہارے ترکہ میں سے اگر تمہارے کوئی اولاد نہ ہو پس اگر کوئی ہو تو ان کے لئے آٹھواں ہے تمہارے ترکہ میں سے بعد وصیت کے جو تم نے کی ہو یا قرضہ ہو۔"

اس آیت سے انہوں نے یہ دیکھا کہ بیوہ عورت کے لئے اس آیت میں صاف صاف معین حصہ شوہر کے ترکہ میں سے معین ہے تو انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ پہلی آیت سے جو انہوں نے پہلا اور دوسرا حکم استخراج کیا تھا وہ دونوں حکم بھی اس آیت سے منسوخ ہو گئے اور یہ آیت ان کی ناسخ ہے۔

ہر سمجھدار آدمی یہ بات جانتا ہے کہ مذہب اسلام میں فقہاء کا ایسا درجہ نہیں ہے جیسا کہ عیسائی مذہب میں پوپ کا درجہ ہے جس کو عیسائی خطا اور نسیان سے مبرا سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذہب میں قرآن مجید ہر شخص کی دسترس میں ہے اور ہر شخص کو اس میں حق بات تلاش کرنے کا اختیار ہے۔ ہر مسلمان اس کا مجاز ہے کہ اگر وہ چاہے تو مذکورہ بالا تینوں مسئلوں کو جو فقہانے مذکور بالا آیت سے اخذ کئے ہیں جو درحقیقت ایک مسئلہ بھی ان مسئلوں میں سے اس آیت سے اخذ نہیں ہوسکتا نہ مانے اور صاف کہہ دے کہ ان آیتوں میں سے کوئی آیت بھی ایک دوسرے کی ناسخ و منسوخ نہیں ہے پس کسی آیت کو ناسخ اور کسی کو منسوخ قرار دینا صرف فقہاء کی رائے ہے جو انہوں نے اپنے مسائل کے استنباط کے طریقہ کی تسہیل کے لئے اختیار کی ہے مگر اس سے یہ بات کہ درحقیقت قرآن میں ناسخ و منسوخ ہے لازم نہیں آتی۔

مگر افسوس یہ ہے کہ عیسائی عالموں نے جو سمجھا ہے اس میں دانستہ یا نادانستہ غلطی کی ہے۔ مشہور و معروف مورخ گبن اور ہمارے زمانے کے بڑے عالم سر ولیم میور نے ناسخ و منسوخ کی اصطلاحوں کے صحیح اور اصلی معنوں سے جن میں ہمارے فقہاء نے ان کو مستعمل کیا تھا ناواقفیت کی وجہ سے صریح مغالطہ کھایا ہے اور وہ خیالات بیان کئے ہیں جن کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

گبن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ "مرضی الٰہی کے دائمی اور کامل انداز کی بجائے آیات قرآن مجید محمد (ﷺ) کی سمجھ کے مطابق مرتب ہوئی تھیں۔ ہر وحی ان کی حکمت عملی یا خواہش کے مناسب ہے اور آیتوں کا تناقض اس وسیع قول سے کہ کسی پہلی آیت میں کسی پچھلی آیت سے تبدیل یا ترمیم ہو گئی ہے رفع ہو گیا ہے۔"

سر ولیم میور اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں لکھتے ہیں کہ "اگرچہ تنسیخ کا آسان عقیدہ قرآن میں تسلیم کیا گیا ہے مگر مسلمان اس اجتماع ضدین کی تطبیق کی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں۔ تاہم بہ مجبوری ان کو معترف ہونا پڑا ہے کہ قرآن میں کم سے کم دو سو پچیس آیتیں منسوخ ہیں۔"

اس خطبہ کے شروع میں ہم نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ پر دو قسم کی وحی نازل ہوتی تھی۔ اول وحی متلو یعنی کلام اللہ۔ دوم وحی غیر متلو یعنی حدیث۔ یہ ممکن ہے کہ بعض شخصوں نے غلطی سے دوسری قسم کی وحی کو پہلی قسم کی وحی سمجھا ہو اور ان کو قرآن مجید میں نہ پا کر یہ گمان کیا ہو کہ بعض آیتیں منسوخ ہوگئی ہیں اور چونکہ ان کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی اس لئے قرآن مجید میں مندرج نہ ہوئیں مگر ظاہر ہے کہ ایسا خیال جس کو ہوا خود اس کی غلطی ہے۔ علاوہ اس کے اس بات کے فرض کر لینے کے لئے کہ کوئی آیت ایسی تھی جس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی اور اس لئے قرآن مجید سے خارج رکھی گئی تھی کوئی سند نہیں ہے۔ چنانچہ ہم اس امر کی نسبت اس خطبہ کے آخر میں پوری بحث کریں گے۔

کیا آنحضرت ﷺ قرآن مجید کی کوئی آیت بھول گئے تھے

ہم مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ جناب آنحضرت ﷺ کو تمام قرآن میں من اولہ الی آخرہ جو نازل ہوا تھا یاد تھا اور کبھی کوئی آیت آنحضرت ﷺ نہیں بھولے نہ آپؐ کے دل سے محو ہوئی اور تمام آیتیں جو آپؐ پر نازل ہوتی تھیں آپ کاتبوں سے لکھوا دیتے تھے اس کی سند میں قرآن مجید کی ایک آیت کا اور بخاری کی ایک حدیث کا لکھ دینا کافی ہے قرآن کی آیت یہ ہے کہ

"سنقرئک فلا تنسیٰ الا ماشاء اللہ" (سورۃ سبح اسم آیت ٦)

''ہم تجھ کو پڑھادیں گے سوتو نہ بھولے گا مگر جو خدا چاہے۔''

''(سنقرئک) علی لسان جبرئیل او سنجعلک قاریا بالھام القراۃ (فلا تنسیٰ) اصلا من قوۃ الحفظ مع انک امی لیو کن ذلک ایۃ اخری لک... (الاماشاء اللہ) نسیانہ بانہ نسخ تلاوتہ وقیل المراد بہ القلۃ والندرۃ لماروی انہ علیہ السلام اسقط ایۃ فی الصلوۃ فحسب ابیؓ انہا نسخت فسالہ فقل نسیتہا اونفی النسیان واسا فان القلۃ تستعمل للنفی (بیضاوی)

''بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر اس طرح پر کی ہے (ہم تجھ کو پڑھادیں گے) جبرئیل کی زبان سے یا تجھ کو قاری کریں گے قرأت کے الہام سے (پس تو نہ بھولے گا) ہرگز حافظہ کی قوت سے باوجود اس کے کہ تو ان پڑھ ہے تا کہ یہ ایک نشانی ہو دوسری تیرے لئے (مگر جو خدا چاہے) ان کا بھلا دینا اس طرح پر کہ اس کی تلاوت منسوخ کر دی اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد کم ہونا اور نادر ہونا ہے اس لئے کہ روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک آیت نماز میں چھوڑ دی۔ پس ابی رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ وہ منسوخ ہوگئی۔ سو حضرت سے پوچھا آپ نے فرمایا کہ میں بھول گیا یا بھولنے کی مطلقاً نفی مراد ہے۔ کیونکہ قلت کا لفظ نفی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔'' (بیضاوی)

بیضاوی نے اول تو یہ لکھا ہے کہ "فلا تنسیٰ" سے یہ مطلب ہے کہ آنحضرت ﷺ قرآن کو ہرگز نہیں بھولنے کہ "الا ماشاء اللہ" کے لفظ میں اس نے تین رائیں قائم کی ہیں۔ ایک یہ کہ منسوخ شدہ آیت کو بھول جائیں گے۔ یہ صرف ان کی رائے ہے قرآن مجید سے اس پر کوئی نص نہیں ہے۔ دوسری رائے انہوں نے ایک حدیث پر قائم کی ہے کہ آپ ایک آیت پڑھنی بھول گئے تھے۔ اگر ہم اس حدیث کو صحیح تسلیم کرلیں تو بھی اس سے بھول جانا کسی آیت کا یعنی دل سے محو ہو جانا ثابت نہیں ہوسکتا۔ تیسرے رائے اس کی نسیان سے قطعی انکار کی ہے۔ یہ رائے صحیح ہے گو کہ جو وجہ انہوں نے لکھی ہے وہ خود ان کے دل کی پیدا کی ہوئی ہے جس کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔

قرآن مجید کا طرز بیان یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے قدر مطلق ہونے کے اظہار کے لئے ہر ایک حکم اور ہر ایک امر کے ساتھ جملہ استثنائیہ فرماتا ہے مگر اس سے درحقیقت یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ واقع بھی ہوگا بلکہ اس سے محض اظہار قدرت مراد ہوتا ہے اس کی سینکڑوں مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ پس اس مقام پر بھی جملہ استثنائیہ سے یہ مراد نہیں ہے کہ درحقیت آنحضرت ﷺ کسی آیت کو بھول گئے تھے یا بھول جائیں گے۔ بلکہ صرف اظہار قدرت کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم قرآن کا کوئی جزو نہیں بھولو گے لیکن جس کو خدا چاہے۔ زمخشری جو علم عربیت کا بہت بڑا عالم ہے یہی بات لکھتا ہے کہ اس جملہ سے استثناء مراد نہیں ہے اور اس کی مثال اس طرح پر دی ہے:

فی الکشاف کما تقول لصاحبک انت سہیمی فیما املک الا ماشاء اللہ لا یقصد استثناء شی.
(کشاف)

کہ مثلاً کوئی شخص اپنے ساتھی سے کہے کہ جو کچھ میری ملکیت میں ہے اس میں تو بھی شریک ہے مگر جو خدا چاہے۔ تو اس طرح کہنے سے کسی چیز کا استثناء کرنا شریعت سے مقصود نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس مقام پر بھی جملہ استثنائیہ سے کسی آیت کا مستثنیٰ کرنا مقصود نہیں ہے۔

"عن عائشة سمع البنی صلی الله علیه وسلم رجلا یقرأ فی المسجد فقال یرحمه الله لقد اذکرنی کذا ایة من سورة کذا" (بخاری باب نسیان القران)

بخاری میں اسی کے متعلق دوحدیثیں حضرت عائشہؓ سے مذکور ہیں۔ پہلی حدیث یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو مسجد میں پڑھتے سنا پس کہا کہ خدا اس پر رحم کرے مجھ کو یہ آیتیں اس سورۃ سے یاد دلائیں۔"

"عن عائشه قالت سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم رجال یقراء فی سورة باللیل فقال یرحمه الله لقد اذکرنی کذ او کذا ایة کلت انسیتها من سورة کذا." (بخاری باب نسیان القران)

دوسری حدیث یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ایک سورۃ پڑھتے سنا رات کو پس فرمایا کہ خدا اس پر رحم کرے مجھ کو فلاں فلاں آیتیں یاد دلائیں جن کو میں فلاں سورۃ سے بھول گیا تھا۔"

اول تو ان دونوں حدیثوں کو ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مسجد میں ہوا تھا اور اس بات پر یقین نہیں ہوسکتا کہ حضرت عائشہؓ خود موجود تھیں کیونکہ اس کا کوئی اشارہ ان حدیثوں میں نہیں ہے اور اس لئے یہ حدیثیں قابل استدلال نہیں۔ دوسری وجہ ان حدیثوں کے قابل استدلال نہ ہونے کی یہ ہے کہ ان میں سے کسی میں نہیں بیان کیا کہ وہ آیت کونسی تھی جس کو آنحضرت ﷺ بھول گئے تھے اور یہ بیان کیا ہے کہ کس سورہ کی دو آیت تھی۔ قطع نظر اس کے مسلمان جو نسیان سے انکار کرتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی آیت آنحضرت ﷺ کے سینہ مبارک سے محو نہیں ہوگئی تھی کہ ہمیشہ کے واسطے معدوم ہوگئی ہو۔ اگر اس نسیان کو جو ان حدیثوں میں مذکور ہے تسلیم بھی کرلیں تو اس کا نتیجہ صرف اتنا ہے کہ جس وقت اس شخص نے وہ آیت پڑھی اس وقت آنحضرت ﷺ کو اس کا خیال نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ خوب یاد دلایا۔ یہ امر بہ مقتضائے بشریت ہوسکتا ہے کیونکہ ہم بشریت سے آنحضرت ﷺ کو مبرا نہیں کرتے ہیں۔ اس آیت کا یاد آجانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سینہ مبارک سے وہ آیت محو نہیں ہوئی تھی۔

قرآن مجید حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں کس طرح جمع ہوا

قرآن مجید کے جمع ہونے کا صحیح اور کامل بیان حضرت ابوبکرؓ کی خلافت میں بخاری کی ایک صحیح اور معتبر حدث میں مذکور ہے جس کو ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور وہ حدیث یہ ہے:

"عن زید ابن ثابت قال ارسل الی ابو بکرؓ عند مقتل اهل الیمامة فاذا عمرؓ بن الخطاب عنده قال ابو بکرؓ ان عمرؓ اتانی فقال ان القتل قد استحر یوم الیمامة بقراء القران وانی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فیذهب کثیر من القرآن وانی اری ان تامر بجمع القران قلت لعمر کیف تفعل شینا لم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم قال عمر هذا والله خیر فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح الله صدری لذلک درایت فی ذلک الذی رای عمر قال زید قال ابو بکر انک رجل شاب عاقل لانتهمک وقد کنت تکتب الوحی لرسول الله صلی الله علیه وسلم فتتبع القران فاجمع الله لو کلفونی نقل جبل من الجبال ما کان اثقل علی مما امرنی به من جمع

القران قال قلت لابی بکر کیف تفعلون شیئالم یفعله رسول الله صلی الله علیه وسلم قال هو والله خیر فلم یزل ابو بکر یراجعنی حتی شرح الله صدری للذی شرح له صدر ابی بکر و عمر فتبعت القران اجمعه من العسب واللخاف و صد ور الرجال حتی وجدت اخر سورة التوبة مع ابی خزیمة الانصاری لم اجد ها مع احد غیر "لقد جائکم رسول من انفسکم عزیز علیه ماعنتم" حتی خاتمة براة وکانت الصحف عند ابی بکر حتی تو فاه الله ثم عند عمر حیاته ثم عند حفصة بنت عمر " (رواہ البخاری)

''زید ابن ثابت کہتے ہیں کہ مجھ کو ابو بکر نے اہل یمامہ کے قتل کے زمانہ میں بلا بھیجا۔عمر بن خطاب بھی وہاں موجود تھے ابو بکرؓ نے کہا عمر میرے پاس آئے اور کہا کہ یمامہ کے دن قرآن کے قاری کثرت سے قتل ہو گئے اور میں ڈرتا ہوں کہ اور موقعوں میں بھی قاری کثرت سے مقتول ہوں تو قرآن بہت سا جاتا رہے گا اور میری یہ رائے ہوئی ہے کہ تم قرآن کے جمع کرنے کا حکم کرو۔ میں نے عمر سے کہا تم وہ کام کیونکر کرو گے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔عمر نے کہا خدا کی قسم یہ عمدہ بات ہے۔عمر اسی طرح مجھ سے اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ خدا نے میرا سینہ اس کے لئے کھول دیا اور میں نے بھی اس کام میں وہ فائدہ دیکھا جو عمر نے سوچا تھا۔زید کہتے ہیں کہ ابو بکر نے کہا تم جوان عاقل آدمی ہو تم پر ہم بدگمانی نہیں کر سکتے اور تم رسول اللہ ﷺ کے لئے وحی لکھا کرتے تھے۔پس قرآن کی جستجو کر کے اس کو جمع کرو۔سو خدا کی قسم اگر کسی پہاڑ کے ہٹا دینے کو کہتے تو مجھ پر اتنا گراں نہ ہوتا جتنا کہ قرآن کے جمع کرنے کا حکم گراں معلوم ہوا۔ میں نے ابو بکرؓ سے کہا تم لوگ وہ کام کیونکر کرو گے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ابو بکرؓ نے کہا خدا کی قسم یہ اچھا کام ہے۔ابو بکرؓ اسی طرح اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ خدا نے میرا سینہ اس کے لئے کھول دیا جس کے لئے ابو بکرؓ وعمر کو خیال دلایا تھا۔پس میں قرآن کو تلاش کر کے جمع کرنے لگا ہڈیوں اور اور سفید پتھر کی تختیوں سے اور لوگوں کے سینہ سے یہاں تک کہ سورۂ توبہ کا اخیر میں نے ابو خزیمہ انصاری کے پاس پایا اور کسی کے پاس نہیں پایا "لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیه ما عنتم" سے براۃ کے آخیر تک۔اور سب قرآن ابو بکر کے پاس تھے یہاں تک کہ خدا نے ان کو وفات دی۔پھر عمر کے پاس تھے ان کی زندگی تک پھر حفصہ کے پاس جو عمر کی بیٹی تھیں۔

مذکورہ بالا حدیث سے تین امر کی قرار واقعی تصریح ہوتی ہے:

اول

حضرت عمرؓ کے اس کہنے سے کہ یمامہ میں قرآن کے قاری قتل ہو گئے ہیں اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ اگر اور مقاموں میں سخت لڑائی ہوا اور قرآن کے قاری بہت مارے جائیں تو اکثر حصہ قرآن کا ضائع ہو جائے گا۔اس قول سے پایا جاتا ہے کہ اس وقت تک بہت سے قاری جن کو قرآن مجید جس قدر کہ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا تھا بخوبی یاد تھا' موجود تھا۔

دوم: ہم کو بدرجہ یقین ثابت ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو قرآن مجید حفظ یاد تھا۔

سوم: اس میں کچھ شبہ نہیں رہتا کہ قرآن مجید کی کوئی آیت ایسی نہیں تھی جو تلاش کے بعد چمڑے یا ہڈیوں یا اور کسی چیز پر لکھی

ہوئی نہ ملی ہو۔

ان تمام بیانوں سے جو اوپر مذکور ہوئے اور نیز عبدالعزیز بن رفیع کی حدیث سے جس کو ہم ابھی نقل کریں گے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ زید ابن ثابت نے کل قرآن مجید کو بے کم وکاست جمع کر لیا تھا اور یہ قرآن جو بالفعل ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے بجنسہ وہی ہے۔ کوئی چیز اس میں چھوٹی ہوئی نہیں ہے۔

"عن عبد العزیز بن رفیع قال دخلت انا و شداد بن معقل علی ابن عباس فقال له شداد بن معقل اترک النبی صلی الله علیه وسلم من شئی قال ماترک الا ما بین الدفتین قال و دخلنا علی محمد بن الحنفیة فسالنا فقال ماترک الا ما بین الد فتین" (بخاری شریف)

عبدالعزیز بن رفیع کہتے ہیں کہ میں اور شداد بن معقل، ابن عباس کے پاس گئے۔ شداد نے ان سے کہا کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ چھوڑا۔ ابن عباس نے کہا کچھ نہیں چھوڑا مگر دو دفتیوں کے درمیان میں (یعنی قرآن) کہا اور گئے ہم محمد بن حنفیہ کے پاس اور ان سے بھی پوچھا اور انہوں نے کہا کچھ نہیں چھوڑا مگر دو دفتیوں کے درمیان میں۔"

حضرت عثمانؓ جامع الناس علی القرآن کی خلافت میں قرآن مجید کی نقلوں کا تقسیم ہونا

وہی قرآن جس کو زید ابن ثابت نے جمع کیا تھا حضرت عثمان کی خلافت تک محفوظ چلا آتا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنی خلافت میں اس کی متعدد نقلیں مختلف ممالک میں بھیجیں چنانچہ یہ امر نہایت تفصیل کے ساتھ بخاری کی حدیث میں مذکور ہے اور وہ حدیث یہ ہے:

عن انس بن مالک ان حذیفة بن الیمان قدم علی عثمان و کان یغازی اهل الشام فی فتح ارمینية واذ ربیجان مع اهل العراق فافزع حذیفة اختلافهم فی القراة فقال حذیفة لعثمان یا امیر المومنین ادرک هذه الامة قبل ان یختلفوا فی الکتاب اختلاف الیهود و النصاری فارسل عثمان الی حفصة ان ارسل الینا بالصحف ننسخها فی المصاحف ثم نردها الیک فارسلت بها حفصة الی عثمان فامرزید ابن ثابت وعبدالله ابن الزبیر وسعید بن العاص وعبدالرحمن بن الحارث بن هشام فنسخوها فی المصاحف وقال عثمان للرهط القرشیین المثلثة اذا اختلفتم انتم وزید ابن ثابت فی شی من القران (وفی حدیث "فی عربیة القران باب نزل القران بلسان قریش) فاکتبوه بلسان قریش فانما نزل بلسانهم ففعلوا حتی اذا نسخوا الصحف فی المصحف رد عثمان الصحف الی حفصة وارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا وا مر بما سواه من القران فی کل صحیفة او مصحف ان یحرق قال ابن شهاب واخبر نی خارجة بن زید بن ثابت انه سمع زید بن ثابت قال فقدت ایه من الاحزاب حین نسخنا المصحفه وقد کنت اسمع رسول الله ﷺ یقراء بها

فالتمسنا ها فوجد نامع خزیمة بن ثابت الانصاری "من المومنین رجال صدقوا ما عاهدو الله علیه" فالحقناها فی سورتها فی المصحف (رواه البخاری)

''حذیفہ بن یمان عثمان کے پاس آئے اور وہ عراق والوں کے ساتھ اہل شام سے لڑے تھے آرمینیہ وآذربائیجان کی فتح میں۔ تو حذیفہ کو ان لوگوں کا قراۃ قرآن میں مختلف ہونا رنج دہ ہوا۔ حذیفہ نے عثمان سے کہا اے امیر المومنین اس امت کی خبر لو قبل اس کے کہ قرآن میں مختلف ہو جس طرح یہود و نصاریٰ مختلف ہوئے۔ عثمان نے حفصہ کے پاس آدمی بھیجا کہ صحیفے ہمارے پاس بھیج دو ہم نقل کر کے واپس بھیج دیں گے۔ حفصہ نے عثمان کے پاس وہ صحیفے بھیج دیئے۔ عثمان نے زید ابن ثابت وعبداللہ بن الزبیر سعید بن العاص وعبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام کو حکم دیا۔ سو ان لوگوں نے ان کو مصحفوں میں نقل کیا اور عثمان نے تین قریشی گروہوں سے کہا کہ جب تم لوگ اور زید بن ثابت قرآن کی کسی چیز میں اختلاف کرو (اور ایک حدیث میں ہے کہ قرآن کی کسی عربیت کے متعلق اختلاف کرو دیکھو باب نزول القرآن بلسان قریش) تو اس کو قریش کی زبان میں لکھو کیونکہ قرآن انہیں کی زبان میں اترا ہے پس ان لوگوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ جب صحیفوں کو مصحفوں میں نقل کر لیا تو عثمان نے صحیفے حفصہ کے پاس واپس بھیج دیئے اور جو قرآن کے نسخے نقل ہوئے' ان کو ملک کے ہر ایک حصہ میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جو کچھ کہ کسی صحیفہ یا مصحف ہیں ہو سب جلا دیا جائے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ کو خارجہ بن زید بن ثابت نے خبر دی کہ انہوں نے زید بن ثابت سے سنا وہ کہتے تھے کہ میں نے ''احزاب'' کی ایک آیت نہیں پائی قرآن کی نقل کرتے وقت اور میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کو پڑھتے سنا تھا پس ہم نے اس کی جستجو کی۔ پس خزیمہ بن ثابت انصاری کے پاس یہ آیت پائی ''**من المومنین رجال صدقوا ما عاهد والله علیه**'' پس اس کو اس کی سورت میں مصحف میں ملا دیا۔''

یاد رکھنا چاہیے کہ جملہ ''**اختلافهم فی القرآت**'' سے وہی اختلاف قرأت مراد ہے جس کا بیان شرح وبسط سے اوپر ہو چکا ہے اور جملہ ''**فی عربیة من عربیة القران**'' جس کو ہم نے دو خطوط ہلالی میں لکھا ہے اور جو ایک اور حدیث کا ٹکڑا ہے اس مطلب کو زیادہ تر واضح کرتا ہے حضرت عثمان کی خلافت میں جو نقلیں ہوئیں تھیں وہ بالکل مطابق اصل کے تھیں اور ان میں کسی طرح تغیر وتبدل یا کمی وبیشی نہیں کی گئی تھی۔ لہجہ یا صیغوں کے تلفظ کا جو اختلاف عرب کی زبانوں میں تھا اس کا بھی کچھ نشان نہ تھا۔

زید ابن ثابت کی پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ توبہ کا اخیر حصہ خزیمہ انصاری کے پاس سے ملا تھا لیکن اس روایت میں بیان ہے کہ سورۂ احزاب کی ایک آیت خزیمہ انصاری کے پاس سے نکلی تھی۔ ان دونوں بیانوں میں کچھ اختلاف نہیں ہے کیونکہ جس زمانہ میں زید ابن ثابت نے قرآن کو جمع کیا تھا اس زمانہ میں سورۂ توبہ کا آخری حصہ بھی خزیمہ کے پاس سے ملا ہوگا اور سورۂ حزاب کی آیت بھی انہیں کے پاس سے نکلی ہوگی۔ اس اخیر کی روایت سے یہ سمجھنا کہ احزاب کی آیت بروقت نقل کرنے قرآن کے دستیاب ہوئی تھی یہ غلطی ہے کیونکہ یہ ذکر بھی اس روایت میں اسی وقت کا ہے کہ حضرت ابوبکر کے وقت میں زید ابن ثابت نے قرآن جمع کیا تھا اور اگر فرض کریں کہ یہ ذکر اس وقت کا ہے جب کہ قرآن کی نقلیں ہوئی تھیں تو بھی ممکن ہے کہ اس جمع کئے ہوئے قرآن میں سے وہ آیت کسی طرح خراب ہو گئی ہو اور پھر تلاش سے خزیمہ کے پاس سے ملی ہو۔ یا ابن شہاب کو یا حضرت انس کو اس روایت کے بیان کرنے میں کچھ اشتباہ واقع ہوا ہو۔

قرآن مجید کا اپنے طرز میں کامل ہونا اس کے الہامی الاصل ہونے کو ثابت کرتا ہے

اس موقع پر ہم بشپ مڈلٹن کے بیان کو جو ایک عالم اور فاضل آدمی تھا نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ''یونانی تورات اور انجیل سے بالکل جہالت اور وحشیانہ پن ظاہر ہوتا ہے اور جملہ عیوب سے جن کا کسی زبان میں پایا جانا ممکن ہے بھری ہوئی ہیں مگر ہم کو از روئے فطرت کے خود بخود یہ توقع ہوتی ہے کہ الہامی زبان کا سلیس اور لطیف عمدہ پر اثر ہونا چاہیے اور اس کا عام کلام کی قوت اور اثر سے بھی متجاوز ہونا ضرور ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی چیز ایسی نہیں ہو سکتی جس میں کسی قسم کا نقص ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو افلاطون کی سی لطافت اور سسرو کی سی بلاغت کا متوقع ہونا چاہیے۔

اب چونکہ قرآن مجید اپنی طرز میں کامل ہے اس واسطے اس کا الہامی الاصل ہونا لازم آتا ہے اور اسی طرح اس کا الہامی الاصل ہونا اس کے کامل النوع ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ انسان سے جو خود ضعیف البنیان اور مرکب من الخطاء والنسیان ہے کوئی کامل اور بے عیب شئے پیدا نہیں ہو سکتی اسی امر کی نسبت قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیتیں دعویٰ کرتی ہیں۔

پہلی آیت: یہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

وان كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا فاتو بسورة من مثله وادعوا شهداء كم من دون الله ان كنتم صدقين فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التي وقودها الناس والحجارة اعدت للكافرين.

(سورة البقرة: ۲۱- ۲۲)

''اور اگر تم شک میں ہو اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری پس لاؤ اسی کی سی ایک سورۃ اور بلاؤ اپنے گواہوں کو خدا کے سوا اگر تم سچے ہو پس اگر نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو بچو اس آگ سے جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔''

دوسری آیت: یہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

قل لئن اجتمعت الانس والجن على ان ياتوا مثل هذا القران لا ياتون بمثله ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا. (سورة بنى اسرائيل: ۹۰)

''کہہ دے کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اتفاق کریں کہ اس قرآن کا مثل لائیں تو نہ لا سکیں گے گو ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔''

ان آیتوں کا مقصود و مدعا ہی ہے جو اوپر بیان ہوا کہ انسان ضعیف البنیان کی بنائی ہوئی کوئی چیز کامل النوع نہیں ہو سکتی بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جو خود ذات کامل ہے ہر شئے کامل النوع کا مخرج ہے اور یہ امر اس بات پر غور کرنے سے اور بھی زیادہ واضح اور غیر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ قدرت کی سب سے زیادہ سادہ اور سب سے کم پیچیدہ اشیاء میں سے ایک چیز کی بھی کسی مصنوعی شئے نے ہمسری نہیں کی ہے سبقت لے جانا تو درکنار۔

اگرچہ یہ بات ممکن ہے کہ انسان کوئی ایسی چیز بنائے جو مصنوعی چیزوں کے وسیع دائرہ میں یکتائی کا دعویٰ کرے اور باوجود اس کے کہ اور اشخاص اس کی خوبی تک پہنچنے کے لئے بہت کچھ جدوجہد کریں اور اس تک نہ پہنچ سکیں تاہم اس کو کامل النوع کہنا ٹھیک اور

جائز نہیں ہوسکتا۔قرآن مجید کی خوبی چار چیزوں سے ثابت ہوتی ہے۔(۱) اس کے نہایت صاف اور شستہ دل پر اثر کرنے والی اور چھانے والی فصاحت و بلاغت سے' (۲) اس کے اصول متعلق بہ دینیات سے' (۳) اس کے اخلاقی اصول سے' (۴) قانون سیاست اور انتظام مدن کے اصول سے جو اس میں مندرج ہیں۔ان چار چیزوں میں سے پہلی چیز تو محض اہل عرب سے متعلق تھی کیونکہ قرآن مجید انہیں کی زبان میں نازل ہوا تھا اور وہی دعویٰ بے مثلی کر رہے تھے۔باقی تین چیزیں تمام جہان کی طرف خطاب کی گئی تھیں اور ہم اپنے مخالفوں اور حریفوں کے روبرو جرأت اور اعتماد سے دعویٰ کرتے ہیں کہ کسی غیر الہامی شخص نے اس کا مثل نہ تو پیدا کیا ہے اور نہ کوئی قیامت تک پیدا کر سکے گا۔

جو اصول کہ ہم نے اوپر بیان کئے ان سے مشہور مورخ گبن محض ناواقف تھا اور اسی ناواقفی کے سبب سے اس نے مغالطہ کھایا ہے جہاں اس نے یہ بیان کیا ہے کہ ''پیغمبر خدا حرارت مذہبی یا جوش کی حالت میں اپنی رسالت کی صداقت کو اپنے قرآن کی خوبی پر منحصر کرتے ہیں اور انسان اور ملائک دونوں کو اپنے قرآن کے ایک صفحہ کی بھی خوبیوں کی برابری کرنے کے لئے قسم دلاتے ہیں اور جوش سے دعویٰ کرتے ہیں کہ ایسا بے نظیر کلام صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہوسکتا ہے۔یہ دلیل نہایت استحکام کے ساتھ ایک سرگرم عرب کی طرف خطاب کی گئی ہے جس کا دماغ ایمان کیفیت کے واسطے موزوں ہے اور جس کا کان سریلی آوازوں سے مسرت اندوز ہوتا ہے اور جس کی بے علمی انسانی ذہانت کی ایجادوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔طرز بیان کی فصاحت اور بلاغت ترجمہ کے ذریعہ سے یورپ کے کافروں تک نہیں پہنچ سکتی وہ اس کے قصے اور احکام اور بیان کی اس بے انتہا ناموزوں بے ربطی کو جس سے کسی قسم کا تصور و خیال بہت کم پیدا ہوتا ہے جو کبھی تو خاک پر غلطاں ہوتا ہے اور کبھی بادلوں کے پار ہو جاتا ہے نہایت بے صبری کے ساتھ پڑھتے ہیں'' مگر ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید کی بے مثل فصاحت و بلاغت کا دعویٰ محض اہل عرب کے واسطے مخصوص تھا نہ اور ملک کے لوگوں کے لئے۔اس لئے مسٹر گبن کا بیان کچھ اس دعویٰ کے مخالف نہیں ہوسکتا۔

پھر یہی مصنف بیان کرتا ہے کہ ''اگر قرآن کی تحریر استعداد انسانی سے متجاوز ہے تو ہومر کی ایلیڈ اور ڈی موستھنیز کی فلپکس کس برتر عقل کی طرف منسوب کرنی چاہیے۔'' مگر ہم کسی ایسی مصنوعی شئے کے وجود کے امکان کا اوپر اقرار کر چکے ہیں جس کو خوبی سے کوئی اور چیز ہمسری نہ کر سکے اور جو اسی نوع کی اور مصنوعی اشیاء کے تمام دائرہ میں ہمیشہ دعویٰ یکتائی کرتی رہے بااین ہمہ یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ وہ اپنی نوع میں کامل ہو۔

یہی مورخ پھر بیان کرتا ہے کہ ''اوصاف الٰہی کا بیان رسول عرب کی قوت مدرکہ کو اعزاز بخشتا ہے لیکن ان کے بلند ترین خیالات صحیفہ ایوب کی ذی شان سادگی کے سامنے جو اسی ملک میں اور اسی زبان میں بہت مدت پہلے لکھا گیا تھا پست ہیں۔''

ہم مسٹر گبن کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ مسٹر گبن میں قرآن مجید اور صحیفہ ایوب کے باہمی تفرق کی نسبت حکم دینے کا مادہ نہیں ہے لیکن ہم بدوں خوف اعتراض کے کہہ سکتے ہیں کہ نہایت ذی علم عربی دانوں نے قرآن مجید کو بلحاظ فصاحت و بلاغت کے بے مثل قرار دیا ہے اور اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی تحریر اس سے سبقت نہیں لے گئی اور نہ لے جا سکے گی۔لبید سا بڑا شاعر قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی چند آیتوں کو سن کر متحیر ہوگیا اور اس کی بلاغت کا انسانی قوت سے برتر ہونے کا اقرار کیا اور آنحضرت کی رسالت کو قبول کر لیا۔

چند اور عیسائی عالموں نے بھی اسی کے موید رائیں قرآن مجید کی نسبت لکھی ہیں جن کو ہم اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

مسٹر کارلائل کا بیان ہے کہ ”میرے نزدیک قرآن مجید میں سچائی کا جوہر اس کے تمام معانی میں موجود ہے جس نے کہ اس کو وحشی عربوں کی نظروں میں بیش بہا کر دیا تھا۔ سب سے اخیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب یعنی قرآن سب سے اول اور سب سے اخیر جو عمدگیاں ہیں وہ اپنے میں رکھتا ہے اور ہر قسم کے اوصاف کا بانی ہے بلکہ دراصل ہر قسم کے وصف کی بناء صرف اسی سے ہو سکتی ہے۔“

مسٹر گاڈ فری ہگنز لکھتے ہیں کہ ”حضرت مسیح کی انجیل کی طرح قرآن مجید غریب آدمی کا دوست اور غمخوار ہے۔ بڑے آدمیوں اور دولت مند آدمیوں کی ناانصافی کی ہر جگہ مذمت کی گئی ہے۔ وہ آدمیوں کی باعتبار مدارج کے توقیر نہیں کرتا ہے۔ یہ امر اس کے مصنف کی لازوال نیک نامی کا موجب ہے (خواہ وہ محمد عرب کے نامی پیغمبر ہوں یا اس کے تیسرے خلیفہ عثمان)۔ (واضح ہو کہ گاڈ فری ہگنز کا یہ اعتقاد تھا کہ قرآن حضرت عثمان کا تصنیف کیا ہوا ہے) کہ اس میں ایسا ایک بھی کوئی حکم نہیں بتلایا جا سکتا ہے جس میں پولیٹیکل خوشامد ورواداری کی طرف ذرا سا بھی میل ہو اور جس طرح کہ ویسٹ منسٹر ریویو نے منصفانہ رائے دی ہے کہ اگر کسی خود مختار مشرقی حاکم کو کوئی چیز کبھی روک سکتی ہو تو وہ غالباً قرآن مجید کی ایک بے تکلف آیت کسی باجرأت مظلوم کی زبانی ہوگی۔“

ایک اور مصنف نے کوارٹرلی ریویو میں قرآن مجید کی نسبت یہ مضمون لکھا ہے کہ ”ان تبدیلات مضامین میں جو مثل برق کے تیز وطرار ہیں اس کتاب کی ایک نہایت بڑی خوبصورتی پائی جاتی ہے۔ اور گیتھ کا یہ قول بجا ہے کہ جس قدر ہم اس کے قریب پہنچتے ہیں یعنی اس پر زیادہ غور کرتے ہیں وہ ہمیشہ دور کھینچتی جاتی ہے یعنی زیادہ اعلیٰ معلوم ہوتی ہے وہ بتدریج فریفتہ کرتی ہے پھر متعجب کرتی ہے اور آخر کار فرحت آمیز تحیر میں ڈال دیتی ہے۔“

وہی مصنف ایک اور مقام پر لکھتا ہے کہ ”شادی اور غم محبت اور بہادری اور جوش کے وہ عظیم الشان اظہارات جن کی محض ضعیف آوازہائے بازگشت اب ہمارے کانوں پر اثر کرتی ہیں محمد کے وقت میں پوری پوری آواز رکھتے تھے اور محمد کو سب سے زیادہ نامی گرامی لوگوں سے کچھ ہم سری ہی کرنی نہیں پڑی تھی بلکہ ان پر فوقیت حاصل کرنی تھی اور اپنے کلام کو اپنی رسالت کی علامت اور دلیل گردانا پڑا تھا۔“

ایک اور مقام پر یہی مصنف لکھتا ہے کہ ”ہم دفعتہ از راہ ترجیح اس عجیب کتاب کی ماہیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کی اعانت سے عربوں نے سکندر اعظم کے جہان سے بڑا جہان اور روم کی سلطنت سے وسیع تر سلطنت فتح کر لی اور جس قدر زمانہ کہ روم کو اپنی فتوحات حاصل کرنے میں درکار ہوا تھا اس کا دسواں حصہ بھی ان کو نہ لگا۔ ایسی کتاب جس کی اعانت سے جملہ بنی سام میں یہی لوگ بہ حیثیت سلاطین یورپ میں آئے تھے جہاں کہ اہل فنیشیا تاجروں کی حیثیت سے اور یہود پناہ گیروں یا قیدیوں کی طرح پر آئے تھے۔ یہی لوگ مع اپنے پناہ گیروں کے یورپ کو انسانیت کی روشنی دکھلانے کے واسطے آئے تھے۔ یہی لوگ جبکہ تاریکی محیط ہو رہی تھی یونان کی مردہ عقل اور علم کو زندہ کرنے اور اہل مغرب اور اہل مشرق کو فلسفہ، طب، ہیئت اور نظم لکھنے کا خوشنما اور دلچسپ فن سکھلانے اور اور علوم جدیدہ کے بانی مبانی ہوئے تھے اور ہم لوگوں کو غرناطہ کی تباہی کے دن پر ہمیشہ کے واسطے رلانے کو آئے تھے۔“

مسٹر سیل اس طرح پر لکھتے ہیں کہ ”یہ بات علی العموم مسلم ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں جو جملہ اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہے انتہا کی لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ لیکن اور زبانوں کی بھی کسی قدر آمیزش ہے گو وہ آمیزش بہت ہی قلیل ہے۔ وہ لاکلام عربی زبان کا نمونہ ہے اور زیادہ پکے عقیدہ کے لوگوں کا یہ قول ہے اور نیز اس کتاب سے بھی ثابت ہے

کہ کوئی انسان اس کا مثل نہیں لکھ سکتا۔ (گو بعض فرقوں کی مختلف رائے ہے) اور اسی واسطے اس کو لازوال معجزہ قرار دیا ہے جو مردہ کے زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے اور تمام دنیا کو اپنی زبانی الاصل ہونے کا ثبوت دینے کے لئے اکیلا کافی ہے اور خود محمد نے بھی اپنی رسالت کے ثبوت کے لئے اسی معجزہ کی طرف رجوع کیا تھا اور بڑے بڑے فصحائے عرب کو (جہاں کہ اس زمانہ میں اس قسم کے ہزارہا آدمی موجود تھے جن کا محض یہ شغل اور حوصلہ تھا کہ طرز تحریر اور عبارت آرائی کی لطافت میں لائق اور فائق ہو جائیں) علانیہ کہلا بھیجا تھا اس کے مقابلہ کی ایک سورۃ بھی بنا دو۔ اس بات کے اظہار کے واسطے کہ اس کتاب کی خوبی تحریر کی ان ذی لیاقت لوگوں نے دراصل تعریف وتوصیف کی تھی جن کا اصل کام مصر ہونا مسلم ہے منجملہ بے شمار مثالوں کے ایک مثال کو بیان کرتا ہوں۔ لبید ابن ربیعہ کا ایک قصیدہ جو محمد کے زمانہ میں سب سے بڑے زباں آوروں میں تھا خانہ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا (یہ رتبہ نہایت اعلیٰ تصنیف کے واسطے مرعی تھا) اور کسی شاعر کو اس کے مقابلہ میں کسی اپنی تصنیفات کو پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن جب کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد قرآن کی دوسری سورۃ کی آیتیں اس کے مقابلہ میں لگائیں گئیں تو خود لبید (جو اس زمانہ میں مشرکین میں سے تھا) شروع ہی کی آیت پڑھ کر بحر تحیر میں غوطہ زن ہوا اور فی الفور مذہب اسلام قبول کر لیا اور بیان کیا کہ ایسے الفاظ صرف نبی ہی کی زبان سے برآمد ہو سکتے ہیں ..... قرآن کا طرز تحریر عموماً خوشنما اور رواں ہے بالخصوص اس جگہ جہاں کہ وہ پیغمبرانہ وضع اور توریتی جملوں کو نقل کرتا ہے وہ مختصر اور بعض مقامات میں مبہم ہے اور مشرقی ڈھنگ کے موافق پر حیرت صنعتوں سے مرصع اور روشن اور پر معنی جملوں سے مزین ہے اور اکثر جگہ اور علی الخصوص اس مقام پر جہاں کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اوصاف کا بیان ہے نہایت عالی درجہ اور رفیع الشان ہے۔''

سرولیم میور اور دیگر عیسائی مؤرخوں کی غلطیاں نسبت قرآن مجید کے

عیسائی عالموں نے قرآن مجید کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اگر چہ وہ صریحاً لغو اور بے ہودہ ہے تاہم اس پر نظر ڈالنے اور ان غلطیوں کو بیان کرنے سے درگزر نہیں کی جاسکتی۔

مسلمان بادشاہوں یا عالموں کو تو خدا نے توفیق نہیں دی کہ قرآن مجید کو خود دوسری زبانوں میں ترجمہ کرتے اور مختلف ملکوں میں شائع کرتے۔ یورپ کی زبان میں جس قدر اس کے ترجمے ہوئے وہ غیر مذہب کے لوگوں یعنی عیسائیوں نے کئے۔ ابتدا میں جس طرح پر بذریعہ ان ترجموں کے قرآن مجید کا رواج یورپ میں ہوا اس کا بیان گاڈفری ہگنز نے عمدہ طرح پر ان الفاظ میں کیا ہے کہ ''اگر عبرانی تورات کا ترجمہ اس طرح شائع ہوتا کہ ہر لفظ قابل تبدیل متین اور شائستہ معنی سے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت پر جس کا مضمون کسی جوڑ توڑ اور نا قابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف پر معیوب معنی پہنانے کا ذریعہ بنایا جاتا اور ایک بے قدر اور خراب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور بندھ سکتا ہے جن کی وساطت سے یورپ میں قرآن مجید کی اشاعت ہوئی۔''

یہ بیان ایک ایسا بیہودہ ہے جس کی تردید لکھنی بھی بے فائدہ ہے۔ جب کبھی مسلمانوں کی نظر سے ایسا بیان گزرتا ہے تو تعجب اور متحیر رہ جاتے ہیں کہ یہ کہاں سے اور کیونکر لکھا گیا ہے۔

مشہور مورخ مسٹر گبن نے اسی طرح کی جہالت کی باتیں لکھنے میں کچھ تامل نہیں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''وجود قرآن بقول

آنحضرت کے یا ان کے متبعین کے غیر مخلوق اور ابدی ذات الٰہی میں موجود ہے اور نور کے قلم سے لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے۔ اس کی ایک نقل کاغذ پر لکھی ہوئی ریشم اور جواہرات کی جلد میں حضرت جبرائیل فلک اول پر لے آئے تھے۔''

لوح محفوظ کا نام مسٹر گبن نے انگریزی ترجمہ میں دیکھ لیا اور اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں سمجھی اور یہ بات کہ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق ایک فلسفی مسئلہ ہے جس کے سمجھنے تک مسٹر گبن کا خیال بھی نہیں پہنچا۔

ڈین پریڈو کی نادرست مگر دلچسپ ایجادیں جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں کچھ کم تعجب انگیز اور تحیر آمیز نہیں ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ''محمدؐ کے پاس کاغذ پر لکھی ہوئی پوری نقل قرآن مجید کی لائی گئی تھی اور انہوں نے اس کو ایک صندوق میں رکھا تھا جس کا نام صندوق رسالت تھا اور ابوبکر نے جو ان کے جانشین ہوئے سب سے اول اس کو جمع کیا کیونکہ جب مسیلمہ نے انہیں کی طرح اخیر زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو ایسی ہی کامیابی کی امید میں اسی طرح اس نے ایک قرآن مرتب کیا اور اس کی ایک کتاب بنا کر اپنے متبعین میں شائع کی۔ اس وقت ابوبکر نے محمدؐ کے قرآن کو بھی اسی طرح مشہور کرنا ضروری سمجھا۔''

یہ چند مثالیں منجملہ ان سینکڑوں بیہودہ باتوں کے جو عیسائی مصنفوں کی جملہ تحریرات میں اسلام کی نسبت پائی جاتی ہیں۔ سر ولیم میور نے ایک معقول قاعدہ منصفی کا برتا ہے اور اپنے استدلات میں مسلمانوں کی دینیات سے کس قدر واقفیت ظاہر کی ہے لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ انہوں نے بحث کے واسطے صرف ان روایتوں کو منتخب کیا ہے جن کو خود مسلمان بھی سب سے زیادہ ضعیف سب سے زیادہ مشکوک اور سب سے زیادہ ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں یا ان کے مطلب اور مقصد میں مختلف الرائے ہیں۔

انہوں نے اولاً اپنی تمام لیاقتوں کو اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کیا ہے کہ محمدؐ کے عہد میں نوشت وخواند عرب میں معدوم نہ تھی اور نہ ''وحی بالعموم کھجور کے پتوں یا چمڑے یا پتھروں یا اور ایسی بے جوڑ اشیاء پر جو سر دست دستیاب ہوتیں...... لکھ لی جایا کرتی تھی۔'' مگر اس امر سے ہم نے خود اقرار کیا ہے اور کسی مسلمان کو اس سے کبھی انکار نہیں ہوا بلکہ اس کو تو ہم قرآن مجید کے لفظ بہ لفظ محفوظ ہونے کا جیسا کہ پیغمبر خدا پر نازل ہوا تھا سب سے قوی دلیل خیال کرتے ہیں۔

سر ولیم میور آیات کے منسوخ ہونے کی نسبت کسی قدر طوالت کے ساتھ بحث کرتے ہیں جو کہ حسب قاعدہ اسلام درست نہیں ہے اور اس کی تائید میں کوئی شہادت بھی نہیں ہے مثلاً ان کا بیان ہے کہ ''اکثر حصہ قرآن کا صرف عارضی مدعا تھا جو ایسے حالات کی وجہ سے عارضی ہوا تھا جس کی عظمت بہت جلد جاتی رہی اور یہ امر مشتبہ معلوم ہوتا ہے کہ آیا پیغمبرؐ کا منشاء اس قسم کی آیات سے ان کی عام عظمت یا ان کی ترویج تھی یا نہیں۔ قرینہ اس کو نہیں چاہتا کہ ان حصوں کے نگاہ رکھنے کی انہوں نے کوشش کی ہو۔''

یہ غلطی جو سر ولیم میور کو ہوئی اکثر عیسائی مصنفوں کو لفظ منسوخ کے معنی نہ سمجھنے کے سبب یا غلط سمجھنے کے سبب ہوئی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ منسوخ کے جو معنی عیسائی مصنف سمجھتے ہیں ان معنوں میں قرآن مجید کی مطلق کوئی آیت منسوخ نہیں ہے اور اگر اس لفظ کے وہ معنی لئے جائیں جس میں مسلمان فقیہوں نے اس لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے تب کوئی آیت عارضی مدعا کی قرآن مجید میں موجود نہ تھی اور سب سے دائمی ترویج مقصود تھی۔

سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیہ میں مارکسی اور ویلس سے مندرجہ ذیل روایتیں نقل کرتے ہیں ''ایک روایت ہے کہ عبداللہ ابن مسعود نے محمد ﷺ کی زبانی ایک آیت کو لکھ لیا اور صبح کو اس کو کاغذ پر سے اڑا ہوا پایا جس کی نسبت پیغمبر صاحب نے بیان کیا کہ وہ آسمان پر اڑ گئی۔ اس کے بعد کی روایتوں میں اس واقعہ میں یہ معجزہ نما مضمون اور اضافہ کر دیا گیا کہ اس آیت کا اڑ جانا بہت سے

مسلمانوں کے قرآنوں میں آن واحد میں واقع ہوا تھا۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت جس کے راوی کا بھی نام معلوم نہیں گروشیس کے کبوتر کی مانند ایک صریح ایجاد ہے اور ہم اس بات سے خوش ہیں کہ سرولیم میور نے بھی کہا ہے کہ اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور ''بلاشک بناوٹ ہے۔''

سرولیم میور نے ایک نئی اصطلاح ''وحی کامل'' کی مسلمان کے مذہب میں قائم کی ہے اور لکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے محاورہ کے موافق ہے اور پھر اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ ''وحی کامل سے میری مراد بلاشک اس وحی سے ہے جو محمدؐ کے اخیر زمانہ میں موجود اور مروج تھی علاوہ اس کے جو شاید ضائع یا غارت یا غیر مستعمل ہوگئی ہو۔''

اس اصطلاح سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں۔ شاید ''آیات محکم'' کا ترجمہ سرولیم میور نے ''وحی کامل کیا ہو لیکن آیات محکم'' کے وہ معنی نہیں ہیں جو سرولیم میور نے بیان کئے ہیں لیکن اگر ہم سرولیم میور کی اصطلاح کو تسلیم کریں تو وحی کامل کا اطلاق ان سب وحیوں پر ہوگا جو جناب پیغمبر خدا پر نازل ہوئی تھیں اور ہم اس بات کا یقین دلاتے ہیں اور آگے چل کر ثابت بھی کریں گے کہ کبھی کوئی وحی ضائع یا غارت یا غیر مستعمل نہیں ہوئی ہے۔''

قرآن مجید کی ترتیب کی نسبت سرولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ ''قرآن جس طرح کہ ہمارے زمانہ تک چلا آتا ہے اپنے مختلف حصول کی ترتیب اور بندش میں مضمون یا وقت کی کسی معقول ترتیب اور نظام کا پابند نہیں ہے اور یہ قیاس میں نہیں آتا کہ محمد (ﷺ) نے اس کے ہمیشہ اس تسلسل میں پڑھنے کے واسطے فرمایا ہو مضامین کی ابتر ملاوٹ زمانہ اور معنی کے لحاظ سے جا بجا بے ربطی کسی جزو کا جو مدینہ میں نازل ہوا ہو بعض اوقات اس آیت سے پیشتر واقع ہونا جو بہت عرصہ پہلے مکہ میں نازل ہوئی ہو کسی احکام کا ایسے احکام کے پیچھے ملحق ہونا جو اس کی تنسیخ یا ترمیم کرتا ہو یا کسی دلیل کا دفعتہً ایسے فقرہ کے حائل ہو جانے سے منقطع ہو جانا جو اس کے مقصد کے موافق نہ ہو یہ سب باتیں ہم کو اس امر کے یقین سے باز رکھتی ہیں کہ ترتیب موجودہ یا درحقیقت کوئی کامل ترتیب محمدؐ کی حیات میں مستعمل اور مروج تھی۔''

ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن مجید کی ترتیب اس طرز میں جس میں قرآن مجید ہے ایسی باقاعدہ ہے اور بلحاظ معنی کے اپنی طرز خاص میں ایسی منظوم ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں ہے۔ بہت سی کتابیں محض اس علاقہ کی تشریح کی غرض سے تصنیف ہوئی ہیں جو سب سورتوں اور آیتوں کے مابین موجود ہے۔ قرآن مجید کی عبارت ایسی موجز اور مختصر ہے کہ دو آیتوں کے علاقہ باہمی کی جن کے معنی بادی النظر میں ایک دوسرے سے بے گانہ معلوم ہوتے ہیں کسی قدر تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے اور ان لوگوں کو جو اس سے ناواقف ہوتے ہیں ''گونجنے والی اور سامعہ خراش' ابتر' خام' بے سری' مکرر بیانی' طول کلام اور الجھاوٹ' نہایت خام اور مہمل' جیسا کہ سرولیم میور نے بیان کیا ہے معلوم ہوتی ہے۔

اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید کسی مصنف کی تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے۔ وہ خدا کا کلام ہے اور بجنسہ وہی الفاظ لکھ لئے گئے ہیں۔ کلام جب مخاطبین سے کیا جاتا ہے تو بہت سے امور مخاطبین کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں اور متکلم اپنے کلام سے ان کو محذوف رکھتا ہے مگر جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے وہ ایسا نہیں کرتا۔ عیسائی مصنف اس باریکی پر خیال نہیں کرتے اور نہ شان نزول آیتوں کی ان کے ذہن میں ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو آیات کے ربط میں مشکل پڑتی ہے مگر مسلمانوں کو ایسا نہیں ہوتا۔

ہم افسوس سے بیان کرتے ہیں کہ سرولیم میور کے اعتراضات اس قدر عام ہیں کہ جواب کے قابل نہیں ہیں۔ اگر وہ کسی مخصوص

آیتوں کا نشان دیتے جن میں ان کے نزدیک زمانہ اور معنی کے اعتبار سے جا بجا بے ربطی ہو یا ان کے مدعا سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو اس وقت ہم یقیناً کسی ایسے فقرہ کے حائل ہو جانے سے منقطع ہو گئے ہوں جو ان کے مدعا سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو اس وقت، ہم یقیناً صاحب موصوف کی دقتوں کو حل کر دیتے ہیں اور آیات کے واقعی علاقہ باہمی کا نشان دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے۔ بلحاظ سر ولیم میور کے اس بیان کے ''جو کسی احکام کے پیچھے کسی ایسے احکام کے ملحق ہونے کے باب میں ہے جو اس کی ترمیم یا تنسیخ کرتا ہو'' بارہا ہم لکھ چکے ہیں کہ ان اصلی معنوں کی ناواقفیت جن میں کہ علماء اسلام نے اصطلاحات ناسخ و منسوخ کو دراصل استعمال کیا تھا ایسے لائق مصنف کے قلم سے ایسا بیان نکلا ہے۔''

حضرت ابوبکر کے عہد خلافت میں قرآن مجید کے یکجا جمع ہونے کے طریقہ کو بیان کر کے سر ولیم میور حضرت عثمان کی خلافت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ''اصلی جلد جو پہلی دفعہ مرتب ہوئی حفصہ کے گھر میں دستیاب ہوئی اور ایک پر غور نظر ثانی عمل میں آئی۔ اگر زید اور ان کے ساتھیوں میں کوئی اختلافات پایا گیا تو ساتھیوں کی رائے کو ترجیح دی گئی اس وجہ سے کہ محاورہ قریش سے واقف تھے اور اس نئے مجموعہ کی اس طرح سے مکی زبان میں تطبیق کر دی جس میں کہ پیغمبرؐ نے اپنے الہامات کو بیان کیا تھا۔''

سر ولیم میور نے جو کچھ کہ بیان کیا ہے اس کا مخرج دریافت کرنے میں ہم نہایت حیران ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں تو کسی کتاب میں ایسی حدیث یا کوئی روایت نہیں ہے۔ مذکورہ بالا بیان میں تین جملے علانیہ اعتراض کے قابل ہیں۔ (۱) نظر ثانی' (۲) اس طرح سے تطبیق کر دی' (۳) نیا مجموعہ کسی قسم کی روایت سے ہم کو ثابت نہیں ہوتا کہ زید کے جمع کئے ہوئے قرآن مجید پر کبھی نظر ثانی ہو۔ جس حدیث میں کہ اس امر کا تذکرہ ہے اور جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اس میں یہ الفاظ ہیں **"فنسخوھا فی المصاحف"** یعنی انہوں نے اس کی چند نقلیں کر لیں مگر اس میں پر غور نظر ثانی کا کچھ ذکر نہیں۔''

اس حدیث میں یہ عبارت بھی ہے کہ **"اذا اختلفتم انتم و زید ابن ثابت فی شئی من القران"** یعنی جب کہ تم میں اور زید ابن ثابت میں قرآن مجید کے اندر کسی چیز میں اختلاف واقع ہو اگرچہ وہ چیز جس میں کہ ان کو اختلاف واقع ہو بہت سے احتمالات کی گنجائش رکھتی ہے لیکن ہم اس کو بعد ہی اس کی تشریح پاتے ہیں جہاں کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ **"فکتبوہ بلسان قریش"** یعنی اس کو قریش کی زبان میں لکھو اب یہ صریح ظاہر ہے کہ وہ چیز اختلاف تلفظ کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ بخاری کی حدیث سے جو نقل کی گئی ہے یہ امر بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔ جس میں مذکور ہے کہ **"فی عربیة من عربیة القران"** یعنی اگر تم کو قرآن کی عربیت کی کسی عربیت میں اختلاف ہو۔ ان لفظوں سے زیادہ تر تلفظ اور مد اور ادغام اور نون ہائے تنوین سے علاقہ معلوم ہوتا ہے جو عربی عبارت کے پڑھنے میں مختلف قومیں عرب کی استعمال کرتی ہیں۔ اس جملہ کے کہ ''اس طرح سے مکی زبان سے تطبیق کر دی'' یہ معنی ہیں کہ کچھ اختلاف واقع ہوا تھا اور جامعین نے اس کو بدل دیا مگر حدیث سے یہ بات نہیں پائی جاتی۔ بے شک جامعین کو کہا گیا تھا کہ اگر کچھ اختلاف تم میں ہو تو قریش کے محاورہ میں لکھو لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ درحقیقت ان میں اختلاف واقع ہوا تھا پس سر ولیم کا یہ کہنا کہ ''انہوں نے مکی زبان سے تطبیق کر دی'' صحیح نہیں ہے۔

ہم نہیں جانتے کہ سر ولیم میور نے لفظ ''نیا مجموعہ'' کس بنا پر استعمال کیا ہے اور کس جگہ سے ان کو یہ بات معلوم ہوئی ہے۔ اس امر کی نسبت وہ اپنی کتاب کے حاشیہ میں اس طرح پر تحریر فرماتے ہیں کہ ''اس معاملہ کی خرابی اور ناموزونیت سے بچنے کے واسطے کہا گیا ہے کہ قرآن اپنے بیرونی لباس کے لحاظ سے زبان عربی کی سات مختلف زبانوں میں نازل ہوا تھا۔ یہ بعید از قیاس نہیں ہے کہ خود

محمدؐ ہی اس کے خیال کے بانی اور موید ہوئے ہوں بدیں غرض کہ ایک ہی آیت قرآنی کی مختلف الالفاظی کی دقت رفع ہو جائے'' یہ عبارت ایک ایسی طرز اور تعصب سے لکھی گئی ہے جس پر ہم افسوس کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر جو تقویٰ' نیکی' صداقت' صاف باطنی' راست بازمی کے واسطے ممتاز ہوں دغا' فریب اور ریاکاری کا الزام لگانا برہان جائز کے معینہ قوانین اور اخلاق اور تہذیب کے مسلم اصول کے خلاف ہے۔ ہم اس امر کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑتے ہیں اور اس پر زیادہ بحث نہیں کرتے کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سچے پاک باز اور تقویٰ شعار ہیں گو وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں ویسی ہی تعظیم اور تکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے ہاں کے بزرگ اور مقدس لوگ معہذا کیا سرولیم میور اس بات سے ناواقف ہیں کہ عربی زبان میں الفاظ کو مد اور بغیر ادغام اور با نون تنوین اور بغیر تنوین پڑھنے سے جو عرب کی مختلف قوم کے مختلف طریقے سے تلفظ میں کس قدر فرق ہو جاتا ہے لیکن درحقیقت لفظ میں یا معنی میں کچھ نہیں ہوتا۔ یا لفظ کا ایک ہی مادہ مختلف صورت سے بلا تبدیل اصلی مادہ لفظ اور معنی کے پڑھا جاسکتا ہے جیسے کہ سورہ الحمد میں لفظ ''مالک'' کا ہے قدیم تحریر میں اس کی یہ صورت ہے ''ملک'' یہ لفظ ملک بھی پڑھا جاتا ہے ملاک بھی پڑھا جاسکتا ہے لام کی تشدید سے اور مالک بھی پڑھا جاسکتا ہے پس اگر اس لفظ کو کسی عرب نے کسی طرح پڑھا ہو یا باوصف اختلاف تلفظ کے کوئی تبدیل مادہ لفظ یا معنی میں نہیں ہے لیکن قریش کی زبان میں مالک کا لفظ جاری تھا اس کا قائم رکھنا کون سے اعتراض کا مقام ہے۔

سرولیم میور نے جو کچھ لکھا وہ مقتضائے اس مقصد کا تھا جس مقصد سے انہوں نے کتاب لکھی ہے مگر سب سے زیادہ سچی بات جو ان کے قلم سے نکلی ہے وہ یہ ہے کہ ''دنیا میں غالباً کوئی اور ایسی کتاب نہیں ہے جو بارہ سو برس تک ایسے خالص متن کے ساتھ رہی ہو'' اور ہمارا اعتقاد ہے کہ وہ ہمیشہ تک ایسی رہے گی اور اس امر کی تصدیق اس پیشین گوئی سے ہوتی ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے خدا فرماتے ہیں ''انا نحن نزلنا الذکر وانه له لحفظون'' یعنی تحقیق ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم بالتحقیق اس کی حفاظت کریں گے۔

سرولیم میور اپنے بیانات کے اثناء میں فرماتے ہیں کہ ''اگر ابوبکر کے قرآن کا متن خالص ہوتا تو ایسی جلدی وہ کیونکر خراب ہو جاتا اور اپنے اختلافات کی وجہ سے ایک کامل نظر ثانی کا محتاج ہوتا'' ہم نہایت صاف طور سے اوپر ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر کا قرآن نہ خراب ہوا تھا اور نہ وہ کسی نظر ثانی کا محتاج ہوا تھا اور نہ اس میں نظر ثانی کی گئی تھی بلکہ صرف اس کی نقلیں کی گئی تھیں۔

قرآن مجید میں اختلاف کے اسباب جو سرولیم میور نے بیان کئے ہیں وہ صحت سے بالکل معرا ہیں ہم قرأت مختلفہ کے ذیل میں جس قدر کہ اس مضمون کی نسبت بیان کرنا ممکن تھا شرح وبسط کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

سرولیم میور آگے چل کر بیان فرماتے ہیں کہ ''لیکن جب کہ یہ بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید میں جس حیثیت سے اس کو پیغمبرؐ نے چھوڑا تھا اب بجنسہ ویسا ہی موجود ہے۔ اس دعویٰ کے واسطے کہ خود پیغمبرؐ ہی نے بعض آیات کو جو ایک مرتبہ وحی ظاہر کی گئی ہوں بعد کو تبدیل یا خارج نہ کر دیا ہو کوئی دلیل نہیں ہے۔''

مگر ہم کہتے ہیں کہ جب تک یہ بات ثابت نہ ہو کہ درحقیقت بعض آیتیں ایسی تھیں کہ پیغمبر خدا نے ان کو خارج کر دیا تھا اس وقت تک بلا شبہ یہ بات کہ جس حیثیت سے قرآن پیغمبرؐ نے چھوڑا تھا بجنسہ ویسا ہی موجود ہے جیسا کہ حدیث عبدالعزیز سے اوپر بیان ہو چکا ہے اور تمام وحی قرآنی جو آنحضرت پر نازل ہوئی تھیں قرآن میں موجود ہیں اس بات کی کافی دلیل ہے پیغمبر خدا نے نہ

کسی آیت کو تبدیل کیا ہے اور نہ کسی آیت کو خارج کیا ہے مگر ہم کسی جگہ وعدہ کر چکے ہیں کہ اس مضمون پر کسی قدر طوالت کے ساتھ بحث کریں گے پس اس جگہ اس وعدہ کو پورا کرتے ہیں۔

سرولیم میور اپنے مذکورہ بالا دعویٰ کی تصدیق پر مندرجہ ذیل سندیں پیش کرتے ہیں اور ان بیانات کو کاتب الواقدی سے نقل کرتے ہیں کہ ''عمر نے ابی ابن لعب کی تعریف کی اور فرمایا کہ وہ قرآن مجید کا سب سے کامل قاری ہے ہم بہ تحقیق بعض آیات کو جو ابی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں کیونکہ ابی کہا کرتا ہے کہ میں نے پیغمبر کو یوں فرماتے سنا ہے اور میں ایک لفظ بھی جو پیغمبرؐ نے قرآن مجید میں درج کیا ہے نہیں چھوڑتا ہوں مگر اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کے وہ حصے ابی کی عدم موجودگی میں نازل ہوئے تھے جو بعض آیتوں کو جن کو وہ پڑھتا ہے تنسیخ یا ترمیم کرتے ہیں۔''

مرولیم میور نے جیسا کہ ان کی تمام تحریر سے پایا جاتا ہے اس مضمون کو چھوڑ دیا ہے اور جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے اس اصل حدیث کے مضمون سے جو حضرت عمر سے منقول ہے سراسر خلاف ہے اور اس عبارت کا کہ ''بعض آیات کو جو ابی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں'' اس حدیث میں پتہ بھی نہیں ہے۔ ہم اس حدیث کو بجنسہ بے کم وکاست ذیل میں مندرج کرتے ہیں اور وہ حدیث یہ ہے کہ

حدثنا عمرو بن علی قال حدثنا یحیی قال حدثنا سفیان بن حبیب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس قال قال عمر قرأنا ابی و اقضانا علی والندع من قول ابی و ذلک ان ابیا یقول لا ادع شیئا سمعته من رسول اللہ ﷺ قد قال اللہ تعالی ما ننسخ من آیة او ننسخها. (بخاری کتاب التفسیر)

''ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا ہم لوگوں میں ابی بڑے قاری ہیں اور علیؓ بڑے قاضی ہیں اور ہم لوگ ابی کا قول چھوڑ دیتے ہیں اور وہ یہ بات ہے کہ ابی کہتے ہیں کہ میں کوئی چیز جو رسول اللہ ﷺ سے سن چکا ہوں نہ چھوڑوں گا اور حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے "ما ننسخ من اية او ننسها"

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ کسی جگہ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمر بعض آیات قرآنی کو جن کو ابی پڑھا کرتے تھے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ یہ حدیث قرآن مجید سے احکامات استخراج کرنے سے متعلق ہے۔ ابی قرآن مجید کی ہر ایک آیت سے جو حکم مستخرج ہوتا تھا استخراج کرتے تھے اور جملہ احکام مستخرجہ کو صحیح خیال کرتے تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ ظواہر آیات سے جو معنی یا احکام نکلتے ہوں ان کے استخراج میں دوسری آیت پر نظر رکھنا ضروری نہیں جیسے کہ اہل ظواہر کا مذہب ہے لیکن حضرت علی مرتضیٰ کی رائے اس کے برخلاف معلوم ہوتی ہے۔ اس پر حضرت عمر نے کہا کہ ابی سب سے عمدہ قرآن پڑھنے والا ہے اور حضرت علی ہم میں سب سے بڑے قاضی ہیں یعنی سب سے بہتر حکم دینے والے ہیں اور ہم سب سے زیادہ قرآن مجید سے احکام وقوانین مستخرج کر سکتے ہیں اس واسطے ہم چھوڑ دیتے ہیں ابی کے قول کو یعنی جو ابی نے قرآن سے حکم کا استخراج کیا ہے اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور حضرت علی سے اتفاق کرتے ہیں۔ ہماری اس تشریح کی تصدیق خود اسی حدیث کے اس جملہ سے ہوتی ہے کہ "اقضانا علی" کیونکہ اگر یہ حدیث محض قرأت مختلفہ سے متعلق ہو تو یہ جملہ اس کے بقیہ حصہ سے کچھ علاقہ نہ رکھے گا۔''

ہمارے اس بیان کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ بخاری نے جو مسلمانوں کے ہاں نہایت نامی اور مقدس اور مستند محدثین میں سے ہیں اس

حدیث کو اس مقام پر بیان کیا ہے جہاں کہ وہ احکامات ناسخ ومنسوخ سے بحث کرتے ہیں نہ اس جگہ جہاں کہ اس نے قرأت مختلفہ کا بیان کیا ہے مگر بخاری نے اسی حدیث کو کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں اس مقام پر بھی بیان کیا ہے جہاں کہ انہوں نے قاریوں کے باہمی اختلاف پر بحث کی ہے چنانچہ اس حدیث کو بھی ہم نقل کرتے ہیں اور اس بات پر بھی بحث کریں گے کہ ان دونوں حدیثوں میں سے کون سی حدیث صحیح ہے اور وہ حدیث یہ ہے۔

حدثنا صدقة ابن الفضل قال اخبرنا يحيى عن سفيان عن حبيب بن ابى ثابت عن سعيد بن جبير عن ابن عباس قال قال عمرؓ عليؓ اقضانا وابى اقرأنا وانا لندع من لحن ابى وابى يقول اخذته من فى رسول الله صلى الله عليه وسلم فلا اتركم لسى قال الله تعالىٰ ماننسخ من اية او ننسهانات بخير منها او مثلها. (بخارى باب القراء)

''ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا علیؓ ہم لوگوں میں سب سے بڑے قاضی ہیں اور ابی ہم لوگوں میں سب سے بڑے قاری ہیں اور ہم لوگ ابی کی قرأت کو چھوڑ دیتے ہیں اور ابی کہتے ہیں کہ میں نے اس کو رسول اللہ ﷺ کے منہ سے لیا ہے پس اس کو کسی طرح نہ چھوڑوں گا اللہ تعالیٰ نے کہا ''**ما ننسخ من اية او نسهانات بخير منها او مثلها**. (یعنی جب ہم کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے اچھی یا اس کے برابر لاتے ہیں)

اس حدیث میں وہ لفظ جس کا ترجمہ ہم نے قرأت کیا ہے ''لحن'' ہے مگر چونکہ قرآن مجید اور اس کی آیتوں کا ایک ہی لحن ہے اس لئے آیات قرآنی کی تلاوت پر بھی لحن کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہ پچھلی حدیث دو وجہ سے مشکوک ہے۔ اول یہ کہ گو اس حدیث کے اور نیز حدیث ماسبق دونوں کے راوی ایک ہیں مگر پہلی میں لفظ ''قول'' اور دوسری میں لفظ ''لحن'' مستعمل ہوا ہے اس لئے ہمارا عقیدہ ہے کہ صدقہ ابن فضل اس حدیث کے راوی نے لفظ ''لحن'' کو بجائے ''قول'' کے براہ غلطی استعمال کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس حدیث میں دو جملے ہیں ایک ''**على اقضانا**'' اور دوسرا ''**ما ننسخ من اية او ننسهانات بخير منها او مثلها**.'' ان دونوں جملوں کو قرآن کی قرات مخصوص سے قابل قیاس کوئی علاقہ نہیں ہے اس واسطے ہماری رائے ہے کہ صدقہ نے پہلی حدیث کے سمجھنے میں اور اس دوسری حدیث کے بیان کرنے میں علانیہ غلطی کی ہے لیکن بغرض اختتام حجت تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیتے ہیں کہ یہ پچھلی حدیث بھی صحیح ہے تو اس سے زیادہ اس کے اور کچھ معنی نہیں ہو سکتے کہ حضرت عمر نے حضرت علی مرتضیٰ کے لحن کو ابی کے لحن پر ترجیح دی۔ بہر کیف سر ولیم میور نے براہ زبردستی اس سے یہ نتیجہ مستنبط کیا ہے کہ ''حضرت عمر نے کہا کہ ہم بالتحقیق بعض آیات کو جو ابی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں۔''

سر ولیم میور واقدی سے ایک اور روایت نقل کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ''ابن عباس نے کہا کہ مجھ کو عبداللہ ابن مسعود کا پڑھنا پسند ہے کیونکہ محمد (ﷺ) ہر رمضان میں ایک مرتبہ قرآن جبرائیل سے پڑھوایا کرتے تھے اور اپنی وفات کے سال میں اس کو دو مرتبہ پڑھوایا تھا اور عبداللہ دونوں مرتبہ حاضر تھے اور جو چیز کہ منسوخ ہوئی تھی اور جس چیز میں ترمیم ہوئی تھی اس کو مشاہدہ کیا تھا۔''

اس روایت کے اخیر حصہ کی کوئی معتبر سند نہیں ہے اور نہ ہم اس کو کسی مستند اور صحیح حدیث میں پاتے ہیں اور اگر بالفرض وہ واقدی میں موجود بھی ہو جس میں کہ ہم کو ہمیشہ شک رہے گا' تب بھی وہ اعتبار کے مستحق نہیں ہیں اور اگر ہم بغرض تمام حجت اس کی اصلیت تسلیم کر لیں تو بھی سر ولیم میور کا فرض کیا ہوا یہ عقیدہ کہ ''قرآن مجید میں شائد بعض ایسی آیتیں نہ موجود ہوں جو ایک زمانہ میں نازل

ہوئی ہوں مگر بعد کو منسوخ یا ترمیم ہوگئی ہوں' کیونکر ثابت ہوتا ہے۔ باقی رہی یہ آیت کہ "ما ننسخ من ایة او ننسهانات بخیر منها او مثلها" اس پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ وہ شریعت یہود سے علاقہ رکھتی ہے نہ آیات قرآن سے۔

سر ولیم میور اپنی کتاب کے حاشیوں کے ضمن میں بعض روایات کو قرآن مجید کی آیتوں کے اخراج یا عدم اندراج کی تمثیلات کے طور پر نقل کرتے ہیں۔

اول بیر معونہ کی روایت کو لکھا ہے کہ "بیر معونہ پر ستر مسلمانوں کے شہید ہونے پر محمد (ﷺ) نے اللہ تعالیٰ کی وساطت سے ان لوگوں کے پیغام پہنچنے کا دعویٰ کیا جس کو مختلف راویوں نے (کسی قدر اختلاف کے ساتھ) اس طرح پر نقل کیا ہے "بلغوا قومنا عنا انا لقینار بنا فرضی عناو رضینا عنه" (کاتب الواقدی) تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کر دی گئی۔

اول تو اس روایت کی صحت ہی میں کلام اور انکار ہے۔ مزید برآں سر ولیم میور کا یہ فرضی بیان کہ "تمام مسلمان اس کو کچھ مدت تک آیت قرآنی کے طور پر پڑھتے رہے اس کے بعد یہ منسوخ یا خارج کر دی گئی" محض بے بنیاد ہے اور کسی معتبر اور مستند روایت میں پایا نہیں جاتا۔ اور اگر بالفرض ہم اس کو صحیح تصور کر لیں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی غلطی سے وحی غیر متلو یعنی حدیث کو وحی متلو یعنی قرآن سمجھا تھا اور در حقیقت وہ قرآن کی آیت نہ تھی۔

دوسری روایت سر ولیم میور نے متعلق احکام زنا کے لکھی ہے کہ "عمر کی نسبت کہا گیا ہے کہ اپنی خلافت میں اہل مدینہ سے اس طرح گفتگو کی" اے لوگو اس بات کا احتیاط رکھو کہ اس آیت کو نہ بھول جاؤ جو زنا کی نسبت سنگساری کا حکم دیتی ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم دو سزاؤں کو یعنی بیاہے اور بے بیاہے اشخاص کے زنا کاری کی بابت کتاب اللہ میں نہیں پاتے ہیں تو اس کا میں یہ جواب دیتا ہوں کہ میں نے پیغمبر کو زنا کی پاداش میں سنگسار کرتے ہوئے دیکھا ہے اور اس پر ہم نے ان کے بعد عمل درآمد کیا ہے اور واللہ اگر یہ امر مانع نہ ہوتا کہ لوگ کہہ دیں گے کہ عمر نے ایک نئی بات قرآن میں درج کر دی تو میں نے اس کو قرآن میں درج کر دیا ہوتا کیونکہ میں نے بہ تحقیق اس آیت کو پڑھا ہے کہ "والشیخ والشیخة اذا زنیا فارجمو هما البتة" (کاتب الواقدی اور ویلس)

اول تو اس بیان میں جو واقدی نے لکھا ہے اصلی حدیث کی غلط بیانی اور غلط نمائی ہے۔ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ یہ فقرہ کہ "والشیخ والشیخة اذا زنیا فارجمو هما البتة" اصل حدیث میں نہیں ہے اور نہ اس بات کی کوئی سند ہے کہ کبھی مسلمانوں نے اس کو قرآنی آیت سمجھا ہو دوسرے اس فقرہ کی عبارت ایسی ناقص اور خراب ہے کہ قطع نظر عربوں سے کوئی عجمی ادنیٰ درجہ کا عربی داں بھی اس کو نہ لکھے گا چہ جائے اس کے کہ وہ خدا کا کلام ہو مگر ہم اس امر کو ابتدا سے بیان کریں گے اور اس بیان کے اثناء میں اصلی حدیث کو بھی نقل کریں گے جس سے ثابت ہوگا کہ عربی فقرہ مذکورہ بالا اس میں نہیں ہے۔

قرآن مجید میں زنا کی سزا یہ ہے

واللاتی یاتین الفاحشة من نسائکم فاستشهدوا علیهن اربعة منکم فان شهدوا فامسکو هن فی البیوت حتی یتوفهن الموت او یجعل الله لهن سبیلا. (سورۂ نساء: ۱۹)

"اور تمہاری عورتوں میں سے جو زنا کریں تو ان پر چار گواہ لاؤ پس اگر وہ گواہی دیں تو ان کو گھروں میں روک رکھو یہاں تک کہ وہ اپنی موت سے مریں یا خدا ان کے لئے کوئی راہ نکالے۔"

دوسری آیت جس میں زنا کی سزا کی تفصیل ہے وہ یہ ہے:

الزانی و الزانیة فاجلدوا کل واحد منھما مایة جلدہ. (سورۂ نور: ۲)

''زانی اور زانیہ ہر ایک کو ان میں سے سو کوڑے مارو''

بعد اس کے پیغمبرؐ خدا نے زنا کے باب میں اس طرح فرمایا جو ذیل کی روایت میں بیان ہوا ہے۔

عن عبادة بن الصامت قال.... قال خذوا عنی قد جعل اللہ لھن سبیلا الثیب بالثیب و البکر بالبکر الثیب مایة ثم رجم بالحجارة و البکر جلد مایة ثم نفی سنة. (مسلم باب جلد الزنا)

''عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ کہا..... لو مجھ سے۔ خدا نے ان کے لئے رستہ نکالا ثیب ثیب کے ساتھ اور باکرہ باکرہ کے ساتھ۔ ثیب کو سو کوڑے مارے جائیں گے پھر سنگسار کیا جانا ہے اور باکرہ کو سو کوڑے مارے جائیں گے پھر ایک برس جلاوطن کر دینا کافی ہے۔''

اور اس میں کچھ شک نہیں کہ خود پیغمبرؐ نے یہودی مرد اور عورت کو جو زنا کاری کے مجرم قرار پائے تھے یہودی شریعت کے موافق سنگسار کرنے کی اجازت دی تھی اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیں کہ یہودی کے سوا اور کسی کو بھی آنحضرت نے سنگسار کیا تھا تو بھی اس بات کا ثابت کرنا غیر ممکن ہے کہ بعد نزول اس آیت کے جس میں زنا کی سزا کا حکم ہے آنحضرت نے ایسا حکم دیا ہو۔ اسی طرح مسلم کی اس حدیث کی نسبت جو اوپر مذکور ہے ثابت کرنا مشکل ہے کہ وہ حدیث سورۂ نور کی آیت کے بعد کی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد زنا کی سزا کی نسبت اختلاف رائے ہوا جس کا ہونا ضرور تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں اور ایک حدیث کی بناء پر جو اوپر مذکور ہوئیں تین مختلف رائیں پیدا ہوئیں۔

اول: سورۂ نساء کی آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ ''ان کو اپنے مکانوں سے باہر نہ جانے دو یہاں تک کہ موت ان کو ٹھکانے لگائے یا اللہ تعالیٰ ان کے واسطے کوئی سبیل نکال دے۔'' اس آیت کے اخیر لفظوں سے بعض لوگ یہ سمجھے کہ وہ سبیل یہی ہے جو مسلم کی حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ بیاہے ہوئے اشخاص کو بجرم زنا سو درے لگانے چاہئیں اور سنگار کرنا چاہیے اور کنوارے شخصوں کو سو درے لگانے چاہئیں اور ایک سال کے واسطے جلاوطن کر دینا چاہیے۔ کچھ عجب نہیں ہے کہ لوگوں نے اس حکم کو ایک جزو قرآن سمجھا ہو۔

دوم: بعض لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ سورۂ نساء کی آیت سورۂ نور کی آیت سے منسوخ ہوگئی ہے اور زنا کی سزا خواہ اس کا مرتکب بیاہا ہوا شخص ہو خواہ کنوارا سو درے قرار پائے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے مسلم کی حدیث کی کچھ وقعت نہیں کی اور اس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) یہ کہ یہ محقق نہیں ہے کہ یہ قول آنحضرت ﷺ کا جو مسلم کی حدیث میں ہے سورۂ نور کی آیت کے بعد کا ہے۔ (۲) یہ کہ جب تک کسی امر میں کوئی خاص حکم نازل نہیں ہوتا تھا تو آنحضرت ﷺ یہود کی شریعت کے موافق عمل فرمایا کرتے تھے اور اس لئے مسلم کی حدیث حجت کے قائل نہیں ہو سکتی۔

سوم: بعض لوگ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ سورۂ نسا کی آیت تو سورۂ نور کی آیت سے منسوخ ہوگئی ہے مگر چونکہ سورۂ نساء کی آیت میں کوئی قطعی سزا مذکور نہیں ہے اس لئے مسلم کی حدیث میں جو سزا ہے وہ بیاہے ہوئے شخصوں کے لئے سزا ہے اور سورۂ نور کی آیت میں جو سزا ہے وہ کنوارے لڑکوں کے لئے سزا ہے۔ مسعودی کی بھی اسی قسم کی رائے معلوم ہوتی ہے۔

یہ اختلاف رائے آج تک چلا آتا ہے کیونکہ معتزلی اور خارجی جو مسلمانوں کے دو بڑے فرقے ہیں اور معتزلی فرقہ کے لوگ جو عربیت میں بہت بڑا اعالی درجہ رکھتے ہیں اب بھی یہی کہتے ہیں کہ زنا کی سزا سنگسار کرنا نہیں ہے اور خطبہ کے راقم کو بھی گو وہ ان دونوں فرقوں سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا ہے بلکہ سنی مذہب کی بھی یہی رائے ہے' معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ وہ رائے رکھتے تھے جس کو ہم نے تیسری میں بیان کیا ہے اور اس لئے جب کہ وہ مسند آرائے خلافت ہوئے تو اکثر اشخاص کے سامنے یہی بیان کیا اور شاید اپنی تمام سلطنت میں یہی حکم دیا ہو۔

واقدی نے اس حدیث کو زیادہ افراط وتفریط کے ساتھ لکھا ہے اور سرولیم میور نے اپنی کتاب میں اس کو بجنسہ نقل کیا ہے۔ اصل حدیث جو مسلم میں منقول ہے ہم ذیل میں مع ترجمہ کے لکھتے ہیں:

قال عمر بن الخطاب هو جالس على منبر رسول الله ﷺ ان الله بعث محمد ﷺ بالحق انزل عليه الكتاب فكان مما انزل الله عليه اية الرجم قرانا ها وعينا ها و عقلنا ها فرجم رسول الله ﷺ ورجمنا بعد فاخشى ان طال بالناس زمان ان يقول قائل ما نجد الرجم فى كتاب الله تعالىٰ فيضلوا بترک فريضة انزلها الله و ان الرجم فى كتاب الله حق على من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البينة او كان الحبل و الاعتراف' (مسلم باب حد الزنا)

''عمر بن الخطابؓ نے جب کہ رسول اللہ ﷺ کے منبر پر بیٹھے تھے کہا کہ اللہ نے محمد ﷺ کو برحق بھیجا۔ ان پر مقرر کئے ہوئے حکم اتارے سو ان چیزوں میں سے جو ان پر اللہ نے اتاریں رجم کا حکم تھا۔ ہم نے اس کو پڑھا اور متعین کیا اور خیال کیا۔ سو رجم کیا رسول اللہ ﷺ نے اور ہم نے ان کے بعد رجم کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ زیادہ زمانہ گزر جانے پر کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کو خدا کے مقرر کئے ہوئے احکام میں نہیں پاتے پس تو گمراہ ہوں گے اس فرض کے چھوڑنے سے جس کو خدا نے اتارا اور رجم حق ہے خدا کے مقرر کئے ہوئے حکم میں اس شخص پر جس نے زنا کیا ہو اور بیاہا ہوا ہو۔ مردوں اور عورتوں میں سے جب دلیل قائم ہو جائے یا حمل رہ گیا ہو یا خود ان کو اقرار ہو۔'' (مسلم باب حد الزنا)

اما قوله ﷺ فقد جعل الله لهن سبيلا فاشارة الى قول الله تعالىٰ فامسكو هن فى البيوت حتى يتوفهن الموت او تجعل الله لهن سبيلا فبين النبى ﷺ هذا هو ذلک السبيل و اختلف لعلماء فى هذه الاية فقيل هى محكمة وهذا الحديث مفسر لها وقيل منسوخة بالاية التى فى اول سورة النور وقيل ان آية النور فى البكرين وهذه الاية فى الثيبين. (نووى)

''لیکن آنحضرت ﷺ کا قول کہ'' خدا نے ان کے لئے رستہ نکالا'' اللہ کے اس قول کی طرف **''فامسكو هن فى البيوت حتى يتوفهن الموت او يجعل الله لهن سبيلا''** (یعنی پس ان کو روک رکھو گھروں میں یہاں تک کہ موت ان کو اٹھالے یا خدا ان کے لئے رستہ نکالے) اشارہ ہے پس نبی ﷺ نے اس رستہ کا بیان کر دیا اور عالم لوگ مختلف ہوئے ہیں اس حکم میں پس کہا گیا کہ وہ محکم ہے اور یہ حدیث اس کی مفسر ہے اور کہا گیا وہ منسوخ ہے اس حکم سے جو سورۂ نور کے اول میں ہے اور کہا گیا کہ ''نور'' کا حکم باکرہ کے باب میں ہے اور یہ حکم ثیبہ کے باب میں ہے۔''

قوله فكان مما انزل الله عليه اية الرجم قرأنا ها وعيناها وعقلناها اراد به اية الرجم ''الشيخ

والشیخة اذا زنیا فارجموھما البتة" (نووی)

''حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ ''ان چیزوں میں سے جو خدا نے ان پر اتاریں رجم کا حکم تھا ہم نے اس کو پڑھا اور متعین کیا اور خیال کیا اس سے مراد رجم کا یہ حکم ہے "الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجمو ھما البتة" (یعنی جب بوڑھا اور بوڑھی زنا کریں تو ان کو ضرور سنگسار کرو)۔''

وفی ترک الصحابة کتابة ھذہ الایة دلالة ظاھرة ان المنسوخ لا یکتب فی المصحف. (نووی)

''اور صحابہ نے جو اس حکم کا لکھنا چھوڑ دیا تو اس بات کی صاف دلیل ہے کہ منسوخ قرآن میں نہیں لکھا جاتا۔ (نووی)

قولہ فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل ما نجد الرجم فی کتاب اللہ فیضلوا بترک فریضة ھذا الذی خشیة قد وقع من الخوارج ومن وافقھم. (نووی)

''حضرت عمر کا یہ قول کہ ''میں ڈرتا ہوں کہ جب زیادہ زمانہ گزر جائے تو کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کو خدا کے مقرر کئے ہوئے حکم میں نہیں پاتے پس لوگ گمراہ ہوں گے ایک فرض کے چھوڑنے سے'' یہ ڈر جو حضرت عمر کو تھا خارجیوں اور ان کے موافقوں سے اس کا ثبوت بھی ہو گیا۔'' (نووی)

واجمع العلماء علی وجوب جلد الزانی البکر مائة ورجم المحصن و ھو الثیب ولم یخالف فی ھذا واحد من اھل القبلة الا ماحکی القاضی عیاض وغیرہ عن الخوارج و بعض المعتزلة کالنظام واصحابہ فانھم لم یقولوا بالرجم. (نووی)

اور اجماع کیا ہے عالموں نے اس پر کہ جو زانی بکر ہو اس کو کوڑے پیٹنا واجب ہے اور جو بیاہا ہوا اور ثیب ہو اس کو سنگسار کرنا واجب ہے اور اس امر میں اہل قبلہ میں سے ایک شخص نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ سوائے اس کے کہ قاضی عیاض وغیرہ نے خارجیوں اور بعض معتزلہ سے جیسے نظام اور اس کے متبعین سے نقل کیا ہے کیونکہ یہ لوگ رجم کے قائل نہیں ہیں۔

اس ترجمہ میں ہم نے لفظ ''آیت'' اور ''کتاب'' کے ترجمہ میں ''حکم'' کا لفظ مستعمل کیا ہے ہم اس باب میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں کہ یہ الفاظ خود قرآن مجید اور احادیث میں ان معنوں میں مستعمل ہوئے ہیں مگر ہمارا مخالف اس ترجمہ پر معترض ہونے کا مجاز ہے اور کہہ سکتا ہے کہ الفاظ ''آیت'' اور ''کتاب'' ہی کیوں نہ مستعمل کئے اس لئے ہم دوسرا ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں جس میں ''آیت'' کا ترجمہ ''آیت'' اور ''کتاب'' کا ترجمہ ''قرآن'' کیا ہے۔ اس ترجمہ کے پڑھنے والوں پر ظاہر ہو گا کہ اگر اس طرح پر ترجمہ کیا جائے تو حدیث کیسی مہمل اور بے معنی ہو جاتی ہے۔

دوسرا ترجمہ

عمر بن الخطابؓ نے جب کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر بیٹھے تھے یہ کہا کہ ''اللہ نے محمد ﷺ کو برحق بھیجا ان پر قرآن اتارا۔ سو ان چیزوں میں سے جو ان پر اللہ نے اتاریں رجم کی آیت تھی۔ ہم نے اس کو پڑھا اور متعین کیا اور خیال کیا سو رجم کیا رسول اللہ ﷺ نے اور ہم نے ان کے بعد رجم کیا۔ میں ڈرتا ہوں کہ زیادہ زمانہ گزر جانے پر کوئی کہنے والا کہے کہ ہم رجم کو قرآن میں نہیں پاتے۔ پس تو گمراہ ہوں گے اس فرض کے چھوڑنے سے جس کو خدا نے اتارا اور رجم حق ہے قرآن میں اس شخص پر جس نے زنا کیا ہو اور بیاہا

ہوا ہو۔ مردوں اور عورتوں میں سے جب دلیل قائم ہو جائے یا حمل رہ گیا ہو یا خود ان کو قرار ہو۔ (مسلم)

کیا اس حدیث کے یہ دو فقرے کہ ''ہم قرآن میں رجم کا حکم نہیں پاتے'' اور یہ فقرہ کہ اور ''بے شک رجم قرآن میں ہے'' ایک دوسرے کے نقیض نہیں ہیں؟

اس لفظی بحث کو چھوڑ کر اب ہم اصل مطلب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ اس حدیث میں یہ عبارت جس کو سر ولیم میور واقدی سے نقل کرنا بیان کرتے ہیں کہ ''اور واللہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ کہہ دیں گے کہ عمر نے ایک نئی چیز قرآن میں درج کر دی تو میں اس کو قرآن مجید میں درج کر دیتا کیونکہ بہ تحقیق میں نے اس آیت کو سنا ہے "**والشیخ والشیخة اذا زنیا فارجمو هما البتة**"

اپنی تصنیفات کا حجم بڑھانے کی نیت سے اور نیز اپنی کامل آگہی کی غرض سے ہمارے مفسرین اور اہل سیر نے تمام مہمل اور بیہودہ افسانوں کو جو عوام الناس میں مشہور تھے بہ کمال آرزو جمع کر کے اپنی کتابوں میں درج کر لیا ہے اور ہم اس کتاب کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ تمام محققین مسلمان ان کو مہمل تصور کرتے ہیں اور اسلام ان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

نووی مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں کہ لفظ ''حکم'' سے جس کی طرف اس عبارت میں اشارہ ہے منجملہ احکامات کے جو پیغمبر خدا پر نازل ہوئے تھے آیت رجم بھی تھی اور ہم نے اس آیت کو دیکھا پڑھا اور سمجھا تھا اور وہ آیت **الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجمو هما البتة** ہے۔ اس کے بعد نووی یہ بیان کرتے ہیں کہ چونکہ آیت مذکورہ کا قرآن مجید میں کہیں پتہ نہیں ہے اس لئے تیقن کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آیات منسوخ شدہ قرآن مجید میں درج نہیں کی گئی تھیں۔

مگر ہر ذی فہم شخص سمجھتا ہے کہ نووی کا یہ بیان نہ تو کوئی حدیث نبوی ہے اور نہ کوئی حکم مذہبی ہے بلکہ ایک مفسر کی محض رائے ہے۔ معہذا یہ رائے بھی تسکین بخش نہیں ہے کیونکہ اس پر اعتراض عائد ہوتے ہیں۔ (۱) یہ کہ نووی نے اس امر کے ثبوت کی کوشش بھی نہیں کی کہ آیت مذکورہ درحقیقت قرآنی آیت تھی۔ (۲) یہ کہ وہ اس بات کی بھی کوئی دلیل نہیں پیش کرتے کہ حضرت عمر کی مراد اسی آیت سے تھی۔ (۳) انہوں نے ان دونوں باتوں کو بلا دلیل غلطی سے صحیح تصور کر کے یہ نتیجہ باطل مستنبط کیا ہے کہ آیات منسوخ شدہ قرآن مجید میں درج نہیں ہوتی تھیں۔ افسوس ہے کہ ہماری اکثر کتب سیرۃ و تفاسیر ایسی ہی روایات اور احادیث سے مملو ہیں جو مفروضات باطل پر مبنی ہیں اور بجز مصنف ہی کے قیاسات کے اور کسی چیز سے ان کی تائید نہیں ہوتی عیسائی مصنف ان کی تحقیق سے ناواقف ہوتے ہیں اور ان کو صحیح حدیثیں تصور کر لیتے ہیں اور بکمال شوق اسلام کی نسبت بے اصل الزامات ان پر مبنی کرتے ہیں اس مقام پر ہم کو اس امر سے کہ رجم کا حکم اسلام میں ہے یا نہیں زیادہ بحث نہیں ہے۔ بحث صرف اس قدر ہے کہ جس کو آیت رجم کہا جاتا ہے وہ کبھی قرآن کی آیت نہیں تھی اور نہ کبھی قرآن مجید سے خارج کی گئی تھی۔

آیتوں کے اخراج اور عدم اندراج کی بابت سر ولیم میور نے تیسری مثال مارکسی کی نقل کی ہوئی روایت بیان کی ہے جو سونے کی گھاٹی کے باب میں تھی اور جو قرآن میں مندرج ہونے سے رہ گئی ہے۔ چوتھی تمثیل میں وہ عبداللہ ابن مسعود کے اس قصہ کو پیش کرتے ہیں جس میں کہ انہوں نے بیان کیا ہے کہ میں نے رات کو اپنے ورقوں میں سے ایک آیت کو غائب پایا۔ پانچویں تمثیل میں اس آیت کا ذکر کرتے ہیں کہ جو مکہ کے معبودان مجازی کے بارہ میں تھی لیکن ہم ان کے نہایت شکر گزار ہیں کہ انہوں نے خود یہ بات کہہ کر کہ یہ سب روایتیں غلط اور موضوع ہیں اس جھگڑے کو چکا دیا ہے پس ہم کو مردہ کے مارنے کی کچھ ضرورت نہیں رہی۔

الخطبة الثامنة

فی

احوال بیت اللہ الحرام والسوانح اللتی مضت فیھا قبل الاسلام

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکة مبارکا وھدی للعالمین

عرب کے ملک میں جونہایت قدیم روایت اس زمانہ سے جب کہ قرآن مجید کا ذکر بھی نہ تھا برابر چلی آتی ہے اور جس کو عرب کی تمام قومیں بغیر کسی شبہ اور اختلاف کے پشت در پشت مانتی چلی آئی ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم نے بنایا تھا اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل ان کے شریک تھے۔

قرآن مجید میں اس گھر کے بننے کی جو خبر آئی ہے وہ بھی اسی قدر ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

اذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسماعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم (سورة البقرة: ١٢١)

''جب کہ ابراہیم اور اسماعیل نے اس گھر کی بنیاد اٹھائیں تو انہوں نے یہ دعا مانگی کہ اے ہمارے پروردگار اس گھر کو ہم سے قبول کر بے شک تو اس دعا کو سنتا اور دلی نیت کو جانتا ہے۔''

اس دعا سے جو اس کے بنانے والوں نے کی اور قرآن مجید کی اور بہت سی آیتوں سے جو اس کے بعد ہیں بخوبی ظاہر ہے کہ یہ خدا کے واسطے یعنی اس کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا جیسے کہ اس زمانہ میں لوگ مسجد بناتے ہیں۔

قرآن مجید میں کعبہ کو بالتصریح مسجد کہا گیا ہے۔ایک جگہ خدا نے فرمایا کہ

ان المشرکین نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا (سورة التوبة: ٢٨)

''مشرک ناپاک عقیدہ کے ہیں وہ اس برس کے بعد اس بزرگ مسجد (یعنی کعبہ) کے پاس نہ آئیں۔''

لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق لتدخلن المسجد الحرام انشاء اللہ (سورة الفتح: ٢٧)

اور ایک اگر جگہ خدا نے فرمایا کہ ''خدا نے اپنے رسول کو یہ سچا خواب دکھلایا بالکل ٹھیک کہ بے شک تم داخل ہوگے اس بزرگ مسجد (یعنی کعبہ) میں انشاءاللہ۔''

جس زمانہ میں یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں اس زمانہ میں کعبہ کے گرد وہ مکانات نہیں تھے جو اب ہیں اور جو حرم کہلاتی ہیں اور جن کا مطلب یہ ہے کہ مسجد داخل حد حرم ہے لیکن خاص کعبہ وہ مسجد ہے جس کو حضرت ابراہیم نے بنایا اور اسی خاص عمارت کو قرآن مجید میں مسجد الحرام کہا ہے۔

قرآن مجید میں کوئی خاص زمانہ کعبہ کی تعمیر کا نہیں بتایا ہے صرف دو صفتیں اس کی بیان ہوئی ہیں ایک ''بیت العتیق'' یعنی نہایت پرانا قدیم گھر' دوسرے ''اول بیت وضع للناس'' یعنی سب سے پہلا گھر جو آدمیوں کے لئے خدا کی عبادت کرنے کو بنایا گیا

جس قاعدہ پر حال کے زمانہ کے مورخ پرانے زمانہ کا حساب لگاتے ہیں اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سنہ کی بیالیسویں صدی میں یعنی حضرت عیسیٰ سے اتیسویں صدی ماقبل میں کعبہ بنا تھا پس اگر اسی حساب کو صحیح مانا جائے تو بھی ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں جہاں تک کہ اس کا حال معلوم ہوا ہے کعبہ سے پہلے کوئی گھر خدا کی عبادت کے لئے نہیں بنایا گیا تھا بلکہ سب سے اول کعبہ بنا تھا۔

ہم صرف عرب کی روایت اور قرآن مجید کی آیت ہی کو اس بات کے ثبوت کے لئے کہ کعبہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا ہے پیش کرنے پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے ثبوت کے لئے ایسی دلیلیں بھی ہیں جو واقعی ایک حقیقت ہیں اور جن کو ان لوگوں نے لکھا ہے جن کو مذہب اسلام سے کچھ تعلق نہ تھا چنانچہ امر مذکورہ کا ثبوت مفصلہ ذیل مقدمات کے ملانے اور ان سے نتیجہ نکالنے سے بخوبی حاصل ہوتا ہے۔

مقدمہ اول ابراہیم نے اپنے بیٹے اسماعیل کو اسی نواح میں یعنی حجاز میں بسایا جہاں اب کعبہ ہے

ہم اس کے ثبوت کے لئے ایسی مذہبی یا تاریخی روایتوں پر جو متنازعہ ہیں اور جن کے الفاظ کے معنی یا مصداق پر بحث ہے توجہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ ایسے واقعات پر استدلال کرتے ہیں جو سب کو تسلیم ہیں یا جو جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت ہوتے ہیں اور ان کو ایسے لوگوں نے تحقیق کیا ہے جن کو اسلام سے کچھ نہ تھا۔

یہ بات سب کو تسلیم ہے کہ حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے تھے (۱) نبایوث' (۲) قیدار' (۳) ادبئیل' (۴) مبسام' (۵) مشماع' (۶) دوماہ' (۷) مسا' (۸) حدر' (۹) تیما' (۱۰) یطور' (۱۱) نافیس' (۱۲) قیدماہ اور یہ سب حجاز میں تھے جہاں مکہ ہے۔

پہلا بیٹا: حضرت اسماعیل کا نبایوث عرب کے شمال مغربی حصہ میں آباد ہوا ریورنڈ گارٹری پی کاری ایم اے نے اپنے نقشہ میں اس کا نشان ۳۸ و ۳۹ درجہ عرض شمالی اور ۳۶ و ۳۸ درجہ طول شرقی کے درمیان لگایا۔

دوسرا بیٹا: حضرت اسماعیل کا قیدار نبایوث کے پاس جنوب کی طرف حجاز میں آباد ہوا ورنڈ مسٹر فاسٹر کہتے ہیں کہ اشعیاہ نبی کے بیان سے بھی صاف صاف قیدار کا مسکن حجاز ثابت ہوتا ہے جس میں مکہ و مدینہ بھی شامل ہیں اور زیادہ ثبوت اس کا حال کے جغرافیہ میں شہر الحذرا اور نبت سے پایا جاتا ہے جو اصل میں القیدار اور نبایاث ہیں اہل عرب کی یہ روایت کہ قیدار اور اس کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عہد عتیق میں قیدار کا مسکن عرب کے اسی حصہ میں یعنی حجاز میں بیان ہوا ہے دوسرے یہ کہ یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ یورینیس اور بطلیموس اور پلینی اعظم کے زمانوں میں یہ قومیں حجاز کی باشندہ تھیں گیڈری یعنی قیدری دری یعنی مخفف قیدری اور گیڈرو ناتیٔ یعنی قیداری کدریتی یعنی قیدری چنانچہ اس کا ذکر ہسٹری جغرافیہ جلد اول صفحہ ۲۴۸ میں مندرجہ ہیں پس بخوبی ثابت ہے کہ قیدار حجاز میں آباد تھا۔

رونڈر گارٹری پی کاری نے اپنے نقشہ میں قیدار کی آبادی کا نشان ۲۶ و ۲۷ درجہ عرض شمالی و ۳۷ و ۳۸ درجہ طول شرقی

کے درمیان لگایا ہے۔

تیسرا بیٹا: حضرت اسماعیل کا اوبجیل ہے۔ بموجب سند جوزیفس کے اوبجیل بھی اپنے ان دونوں بھائیوں کے ہمسایہ میں آباد ہوا تھا۔

چوتھا بیٹا: حضرت اسمٰعیل کا بسام ہے مگر اس کی سکونت کے مقام کا پتہ نہیں ملتا۔

پانچواں بیٹا: حضرت اسماعیل کا مشماع ہے۔ ریورنڈ مسٹر فاسٹر کا یہ قیاس صحیح ہے کہ عبرانی میں جس کو مشماع ہے اسی کو یونانی ترجمہ سبعو ایجنٹ میں مسما اور جوزیفس نے مسماس و بطلیموس نے سمیز لکھا ہے اور عرب میں اسی کی اولاد بنی مسما کہلاتی ہے پس کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا نجد کے اولاً آباد ہوا تھا۔

چھٹا بیٹا: حضرت اسماعیل کا دوماہ تھا۔ مشرقی اور مغربی جغرافیہ داں قبول کرتے ہیں کہ یہ بیٹا تہامہ میں آباد ہوا تھا۔

ساتواں بیٹا: حضرت اسماعیل کا مساتھا ریورنڈ مسٹر فاسٹر بیان کرتے ہیں کہ یہ بیٹا مسوپوٹیمیا میں آباد ہوا مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا جب حجاز سے نکلا تو یمن میں آباد ہوا اور یمن کے کھنڈرات میں اب تک مسا کا نام قائم ہے ریورنڈ گاٹری پی کاری نے اپنے نقشہ میں اس مقام کا نشان ۱۳ درجہ اور ۳۰ دقیقہ عرض شمالی اور ۴۳ درجہ اور ۳۰ دقیقہ طول شرقی میں قائم کیا ہے۔

آٹھواں بیٹا: حضرت اسماعیل کا حدر تھا اور عہد عتیق میں حداد بھی اس کا نام ہے یمن میں شہر حدیدہ اب تک اسی کا مقام بتلا رہا ہے اور قوم حدیدہ جو یمن کی ایک قوم ہے اسی کے نام کو یاد دلاتی ہے زہیری مورخ کا بھی یہی قول ہے اور ریورنڈ فاسٹر بھی اسی کو تسلیم کرتے ہیں۔

نواں بیٹا: حضرت اسماعیل کا تیما تھا ان کی سکونت کا مقام نجد ہے اور بعد کو رفتہ رفتہ خلیج فارس تک پہنچ گئے۔

دسواں بیٹا: حضرت اسماعیل کا یطور ہے ریورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ اس کا مسکن جدور میں تھا جو جبل کسیونی کے جنوب اور جبل الشیخ کے مشرق میں واقع ہے۔

گیارھواں بیٹا: حضرت اسماعیل کا نافیش تھا۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر توریت اور جوزیفس کی سند سے لکھتے ہیں کہ عربی ڈزرٹا میں ان کی نسل اسی نام سے آباد تھی۔

بارھواں بیٹا: حضرت اسماعیل کا قیدماہ تھا انہوں نے بھی یمن میں سکونت اختیار کی تھی۔ غرض کہ اہل جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسماعیل اور ان کی اولاد کا مسکن حجاز تھا۔

مقدمہ دوم۔ حجر اسود اور قربانی کی رسم کو اور کعبہ کا بیت اللہ نام ہونے کو خاص ابراہیم سے تعلق ہے

خود حضرت ابراہیم اور تمام ان کی اولاد میں یہ رواج تھا کہ خدائی عبادت کی جگہ پر بطور ایک نشان کے لمبا بن گھڑا پتھر کھڑا کر لیتے تھے اور اس کو مذبح یعنی قربانی گاہ اور بیت اللہ قرار دیتے تھے اور وہاں خدا کی عبادت بجالاتے تھے اور اس کے نام پر قربانی

کرتے تھے پس کعبہ میں سی رسم کا برابر جاری چلا آنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس معبد کی اصل ابراہیم سے ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ پتھر اور قربانی اور بیت اللہ نام رکھنے کی رسم ابراہیم سے چلی آتی ہے تورات مقدس سے جس کی قدامت میں کوئی شبہ نہیں کر سکتا ثابت ہوتی ہے۔

کتاب پیدائش باب ۱۲ آیت ۷ میں لکھا ہے کہ ''تب خداوند نے ابراہیم کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لئے جو اس پر ظاہر ہوا ایک مذبح بنایا'' اور اسی باب کی آٹھویں آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پھر وہاں سے ابراہیم نے کوچ کیا اور آگے جا کر پھر ایک مذبح بنایا اور خدا کے نام سے اس کو موسوم کیا۔

اسی کتاب کے تیرھویں باب کی آٹھویں آیت میں ہے کہ بلوطستان ممری میں جو حبرون میں ہے ابراہیم جار ہا اور وہاں خداوند کے لئے ایک مذبح بنایا۔

ان تینوں آیتوں سے ثابت ہے کہ خدا کے لئے مذبح تعمیر کرنا اور خدا کے نام سے اس کو پکارنا اور وہاں خدا کے نام پر قربانی کرنا حضرت ابراہیم کا طریقہ تھا۔

یہ طریقہ ان کی اولاد میں بھی جاری تھا چنانچہ کتاب پیدائش باب ۲۶ آیت ۲۵ میں لکھا ہے کہ بیر شبع میں اسحٰق پسر ابراہیم کو خدا دکھائی دیا اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور خدا کے نام سے اس کو موسوم کیا۔''

اب ہم کو یہ بتانا رہا کہ یہ مذبح کس طرح بنایا جاتا تھا اس کی تفصیل بھی تورات مقدس میں موجود ہے۔

کتاب خروج باب ۲۵ میں لکھا ہے کہ ''اگر میرے لئے پتھر کا مذبح بنائے تو تراشے ہوئے پتھر کا مت بنائیو کیونکہ اگر تو اسے اوزار لگاوے گا تو اسے ناپاک کرے گا۔

اور اسی کتاب کے باب ۲۴ آیت ۴ میں لکھا ہے کہ ''اور موسیٰ نے خداوند کی ساری باتیں لکھیں اور صبح کو سویرے اٹھا اور پہاڑ کے تلے ایک مذبح بنایا اور اسرائیل کے بارہ سبطوں کے موافق بارہ ستون بنائے گئے۔

اور کتاب پیدائش باب ۲۴ آیت ۴ میں لکھا ہے کہ ''یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا' لے کے ستون کی مانند کھڑا کیا اور اس کے سر پر تیل ڈالا۔

اور اس مقام کا نام بیت ایل (یعنی بیت اللہ خدا کا گھر) رکھا۔

اور کہا کہ دو یہ پتھر جو میں نے ستون کی مانند کھڑا کیا خدا کا گھر یعنی بیت اللہ ہوگا۔

ان آیتوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیم اور اس کی اولاد کا یہ طریقہ تھا کہ خدا کی عبادت کے لئے مذبح ایک بن گھڑا پتھر کھڑا کر کے بناتے تھے کبھی اس کے ساتھ کوئی مکان بھی بنا دیتے اور کبھی پتھر کھڑا کرنے کے بعد بناتے تھے اور اس کو بیت اللہ کہتے تھے۔

بالکل یہی حالت کعبہ کی اور حجر اسود کی ہے جو ایک بن گھڑا لمبا پتھر ہے پہلے صرف حجر اسود کھڑا کیا تھا پھر جب وہاں کعبہ بنایا تو اس کے کونہ میں اس کو لگا دیا۔

توریت میں صرف بنی اسرائیل کے حالات اور واقعات بیان ہوئے ہیں اور بنی اسمٰعیل کا اس میں ذکر نہیں ہے مگر ملکی روایتوں یا جاہلیت کے اشعار میں ان کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ارزقی کی کتاب اخبار مکہ سے پایا جاتا ہے کہ بن گھڑا پتھر کھڑا کر کے خدا کی عبادت گاہ

بنانا صرف بنی اسرائیل ہی میں نہ تھا بلکہ بنی اسمٰعیل میں بھی بکثرت رائج تھا۔
چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ:

ان بنی اسمٰعیل و جرھم من ساکنی مکة ضاقت علیھم مکة فتفسحوا فی البلادو التمسوا المعاش لیزعمون ان اول ما کانت عبادة الحجارة فی بنی اسمٰعیل نه کان لا یظعن من مکة ضاعن منھم الااحتلموا معھم من حجارة الحرم تعظیما للحرم صیابة بمکة وبالکعبة حیث ما حملو اوضعوه فطافوابه کالطواف بالکعبة حتی سلخ ذلک بھم الی کانوا یعبدون ما استحسنوا من الحجارة واعجبھم من حجارة الحرم خاصة حتی خلفت الخلوف بعد الخلوف ونسوما کانوا علیه واستبدلوا ابدین ابراھیم واسمٰعیل وغیره. فعبدوا الا وثان (صفحه ۲۷)

''بنی اسمٰعیل و جرہم جو مکہ میں رہتے تھے وہاں رہنے کی ان کو گنجائش نہ ہوئی تو وہ ملک میں نکلے اور معاش کی تلاش میں پڑے۔ پس لوگ خیال کرتے ہیں کہ اولاً پتھر کا پوجنا بنی اسمٰعیل میں اس طرح شروع ہوا کہ جب ان میں سے کوئی مکہ سے جاتا تو حرم کے پتھروں میں سے ایک پتھر اٹھالیتا حرم کو بزرگ سمجھ کر اور مکہ اور کعبہ کے شوق میں جہاں اترتے تو اس پتھر کو رکھ لیتے اور اس کے گرد مثل کعبہ کے طواف کرتے پھر اس کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جو پتھر اچھا دیکھتے اور جو حرم کا پتھر عجیب اور اچھا معلوم ہوتا اس کی عبادت کرتے۔ اسی طرح پشتوں پر پشتیں گزر گئیں اور بھول گئے جو بات پہلی تھی اور ابراہیم اور اسمٰعیل کے دین کو بدل دیا اور بتوں کو پوجنے لگے۔

مسلمانوں کی کتابوں میں اس پتھر کی نسبت نہایت قصہ آمیز روایتیں لکھی ہیں اور ترمذی اور ابن ماجہ ودارمی میں بھی چند عجیب عجیب روایتیں آئی ہیں۔ جیسا کہ یہ پتھر نہایت پرانا ہے اور حضرت ابراہیم کے ساتھ منسوب ہونے سے قدیمی ہونے پر تقدس اور زیادہ ہوگیا ہے ویسے ہی لوگوں نے اس کی نسبت جیسا کہ پرانی باتوں کی نسبت دستور ہے قصہ آمیز اور تعجب انگیز روایتیں بنائی ہیں۔
قرآن مجید میں اس پتھر کا مطلق ذکر نہیں ہے اگر درحقیقت وہ ایسا ہی ہوتا جیسا کہ روایتوں کے بنانے والوں نے بیان کیا ہے تو ممکن نہ تھا کہ باوجودیکہ قرآن مجید میں کعبہ کے بننے کا ذکر ہے اور اس پتھر کا ذکر نہ کیا جاتا۔ جس قدر روایتیں اس پتھر کی نسبت آئی ہیں سب مجروح ومرجوح ہیں اور کسی کی سند قابل اعتبار کے نہیں ہے اور نہ ان کا سلسلہ درستی اور صحت سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے مگر ان روایتوں کا خلاصہ بیان کرنا خصوصاً ان کا جو ترمذی وابن ماجہ ودارمی میں ہے خالی از لطف نہ ہوگا۔

روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ یہ پتھر حضرت جبرائیل بہشت سے لائے تھے اور وہ اول دودھ کی مانند سفید تھا لیکن انسان کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا اور روایت کا یہ مضمون ہے کہ وہ بہشت میں کے جواہرات میں کا ایک لعل بے بہا ہے خدا نے اس کی چمک دمک لے لی ہے۔ اگر نہ لیتا تو تمام ممالک دنیا ایک سرے سے دوسرے سرے تک منور ہو جاتی۔ ایک اور روایت ہے کہ ''قیامت کے دن اس پتھر کے دو آنکھیں اور ایک زبان ہوگی جن کے ذریعہ سے وہ ان کو پہچان لے گا اور ان کے نام بتا دے گا جنہوں نے اس دنیا میں اس کو بوسہ دیا ہے۔ ایک لا مذہب نے اس روایت کو سن کر کہا کہ جب دنیا میں اس کی آنکھیں نہیں ہیں تو قیامت میں آنکھیں ملنے سے وہ کیونکر شناخت کرلے گا۔ ایک احمق مسلمان نے جواب دیا کہ خدا کی قدرت سے۔ لا مذہب بولا کہ پھر آنکھیں دینے کی کیا ضرورت ہے۔ بالفرض اگر کوئی ان روایتوں کو صحیح تسلیم کرے تو ان کے الفاظ کے لغوی معنی نہیں لئے جائیں

گے بلکہ ان کو بطور استعارہ قرار دیا جائے گا اور اس صورت میں ان کا مقصود یہ ہوگا کہ کسی آدمی کے افعال جو اس نے دنیا میں کئے ہیں قیامت میں پوشیدہ نہیں رہیں گے۔ اس قسم کے مضامین کو استعارہ میں بیان کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ اس کو آسانی سمجھ لیتے ہیں جیسے کہ کہا جاتا ہے کہ قیامت کے دن آدمی کے ہاتھ گواہی دیں گے کہ اس نے ان سے کیا کیا ہے اور اس کی زبان ان سب باتوں کو بیان کرے گی جو اس کے ہونٹوں سے نکلی ہیں اور جس زمین پر وہ اترا۔ اترا کر غرور اور تکبر کی چال سے چلا تھا وہ اس کی گواہی دے گی۔ اب ان سب روایتوں کا مطلب یہ ہے انسان کی زندگی کا ہر ایک کام خدا سے مخفی نہ رہے گا اگرچہ اب بھی مخفی نہیں ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک روایت بھی صحیح نہیں اور ان موضوع روایتوں نے ایسی خرابی ڈال دی ہے کہ اصلی و صحیح بات بھی تاریکی میں پڑ گئی ہے مگر ارزقی نے ایک روایت کتاب اخبار مکہ میں لکھی ہے اگر اس کی زوائد اور مبالغہ آمیز باتوں سے جو اس میں شامل ہیں، قطع نظر کی جائے تو اس سے اصلیت اس کی کسی قدر معلوم ہوتی ہے۔ بعد ایک قصہ بیان کرنے کے اس میں لکھا ہے کہ:

"وکان اللہ عزو جل استودع الرکن اباقبیس حین غرق اللہ الارض زمن نوح وقال اذارایت خلیلی مینی بیتی فاجہ لہ الخ۔ (کتاب اخبار مکہ صفحہ ۲۲)

''حجر اسود کو اللہ تعالیٰ نے طوفان نوح کے زمانہ میں ابوقبیس پہاڑ کو سپرد کر دیا تھا اور اس کو سمجھا دیا تھا کہ جب تو میرے خالص دوست یعنی ابراہیم کو دیکھے کہ وہ میرا گھر بناتا ہے تو اس پتھر کو نکال دیجیو۔''

ہر ایک شخص اس روایت سے سمجھ سکتا ہے کہ صحیح بات صرف اس قدر ہے کہ یہ پتھر جبل ابوقبیس میں کا جو مکہ کے پاس ہے ایک پتھر ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مثل اپنی عادت و طریقہ کے اول اس پتھر کو بطور مذبح کے کھڑا کیا۔ جب ان کی اولاد یہاں مستقل رہنے لگی تو انہوں نے مکان مذبح بھی بنایا اور اس پتھر کو اس کے کونہ میں لگا دیا۔

اسی کتاب میں یہ بھی ایک ٹھیک روایت لکھی ہے کہ

وانما شدة سواده لانه اصابه الحرقی مرة بعد مرة فی الجاهلية والاسلام فاما حريقه فی الجاهليت فانه ذهبت امراة فی زمن قريش تجمر الكعبة فطارت شرارة فی استار الكعبة فاحترقت الكعبة واحترق الركن الاسود و اسود توهنت الكعبة فكان هو الذی هاج قريشا علی هدمهما وبناء هاو اما حريقه فی الاسلام ففی عصر ابن الزبير ايام حاضرة الحصين بن نمير الكندی احترقت الكعبة واحترق الركن فتفلن بثلاث خلق حتی شعبه ابن الزبير بالفضة فسواده لذلک (صفحہ ۳۲)

''وہ دو دفعہ آتش زدگی میں جلنے کے سبب سے اس قدر کالا ہو گیا ہے۔ ایک دفعہ زمانہ جاہلیت میں قریش کے زمانہ میں ایک عورت کے ہاتھ سے کعبہ کے پردہ میں خوشبو جلاتے وقت آگ لگ گئی تھی جس کے سبب سے کعبہ اور حجر اسود دونوں جل گئے تھے اور حجر اسود کالا ہو گیا تھا اور ایک دفعہ زمانہ اسلام میں ابن زبیر کے وقت کعبہ میں آگ لگی تھی اور حجر اسود جل کر تین ٹکڑے ہو گیا تھا اور ابن زبیر نے اس کے گرد چاندی کا حلقہ چڑھا دیا تھا۔''

یہ پتھر جو کعبہ کے کونہ میں لگایا گیا تھا اس سے مقصود اس پتھر کی پرستش نہ تھی بلکہ صرف اس لئے لگایا گیا تھا کہ کعبہ کا طواف (جس کی حقیقت ہم بیان کریں گے) شروع ہونے اور ختم ہونے کی نشانی ہو۔

حدثنی جدی قال حدثنا سفيان بن عيينة عن مجاهد عن الشعبی قال لما امر ابراهيم ان يبنی

البیت وانتھی الی موضع الحجر قال الاعیل اتنی بحجر لیکون علما للناس یبدون منه الطواف فاتاه بحجر فلم یرضه فاتی ابراهیم بهذا الحجر ثم قال اتانی به من لم یکلنی علی حجرک.
(کتاب اخبار مکه صفحه ۲۹)

''کتاب اخبار مکہ ارزقی میں لکھا ہے کہ جب ابراہیم کو حکم ہوا کہ خدا کا گھر بنا دے اور جب وہ بناتے بناتے وہاں پہنچے جہاں اب حجر اسود ہے تو انہوں نے اسماعیل سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تا کہ وہ لوگوں کے لئے ایک نشانی ہو اور اس سے طواف شروع کیا کریں وہ ایک پتھر لائے ابراہیم نے اس کو پسند نہیں کیا پھر ابراہیم کو یہ پتھر مل گیا پھر ابراہیم (اسماعیل کے اس سوال کے جواب میں کہ یہ پتھر کہاں سے آیا) کہا کہ اس نے دیا جس نے تیرے پتھر کے بھروسہ پر مجھے نہیں رکھا۔

مقتدر باللہ ابوالفضل جعفر ابن معتضد کے عہد میں جو ۲۹۵ ہجری میں خلیفہ ہوا تھا قرامطہ حجر اسود کو کعبہ سے اکھاڑ کر لے گئے تھے مدت بعد پھر لا کر رکھ دیا۔

مقدمہ سوم کعبہ بلاشبہ بیت العتیق ہے

ملکی اور مذہبی روایتوں کے سوا غیر مذہب مورخوں کی تحقیقات سے بھی کعبہ کا نہایت قدیم زمانہ سے موجود ہونا ثابت ہوتا ہے مسٹر گبن جیسا کہ وہ نہایت مشہور مورخ ہے ویسا ہی نہایت بڑا عالم اور فلسفی ہے اس نے اپنی تاریخ میں کعبہ کے ذکر میں بیان کیا ہے کہ کعبہ کی صحیح قدامت سنہ عیسوی سے پہلے کی ہے ساحل بحر احمر کے ذکر میں ڈایوڈورس یونانی مورخ نے تھمودیت اور سبین کے بیان میں ایک مشہور معبد (یعنی کعبہ) کا ذکر کیا ہے جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے'' اگر ڈایوڈورس کے زمانہ میں کعبہ ایک مشہور و معروف معبد تھا جس کے اعلیٰ درجہ کے تقدس کی تمام عرب تعظیم کرتے تھے تو ہم کو اس کی اصلیت کو درحقیقت ایک نہایت قدیمی زمانہ (ابراہیم کے زمانہ) سے منسوب کرنا چاہیے۔

سر ولیم میور صاحب اس پر ایک معترضانہ تقریر لکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ''جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے اس سے عرب کی اس روایت کی صحت پر کہ کعبہ اور اس کے تمام مراسم کی اصلیت ابراہیم و اسماعیل سے ہے کیونکر قیاس ہو سکتا ہے۔ عرب کی یہ روایت مسلمانوں کی بنائی ہوئی نہ تھی بلکہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے بہت مدت پہلے اہل مکہ کی عام رائے تھی ورنہ قرآن میں بطور ایک حقیقت مسلمہ کے اس کا ذکر نہ ہوتا اور بعض مقامات کے نام جو کعبہ کے گرد واقع ہیں ابراہیم و اسماعیل سے متعلق کئے جاتے جیسا کہ وہ متعلق کئے گئے ہیں۔''

مگر ہم سمجھتے ہیں کہ سر ولیم میور نے بلاشبہ یہاں غلطی کی ہے جو کچھ ڈایوڈورس نے لکھا ہے اس سے عرب کی اس قدیم روایت کی صحت کا ثبوت ہوتا ہے اس بات سے کہ مذہب اسلام سے پیشتر اہل عرب تسلیم کرتے تھے کہ کعبہ کو اور ان تمام مراسم کو جو کعبہ سے علاقہ رکھتی ہیں ابراہیم سے تعلق ہے اس کی اصلیت و صحت نہایت مضبوطی سے ثابت ہوتی ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا وجہ تھی کہ اہل عرب نے اور بنی جرہم نے اور تمام مختلف عرب کی قوموں نے اس کو ابراہیم اور اسماعیل سے منسوب کیا تھا۔ عرب ایک بت پرست قوم تھی اور ابراہیم بت شکنی میں ایک مشہور شخص تھا۔ اس لئے ضرور تھا کہ تمام عرب کی قومیں ابراہیم و اسماعیل سے نفرت کرتیں اور کبھی اپنے معبد کو ابراہیم یا اسماعیل سے منسوب نہ کرتیں باوجود اس مغایرت و منافرت کے تمام عرب کی قوموں کا اس بات کو تسلیم

کرنا کہ کعبہ کو اور اس کے مراسم کو ابراہیم و اسماعیل سے تعلق ہے علانیہ اس کی صحت و اصلیت کی دلیل ہے نہ اس کے برخلاف جیسا کہ سر ولیم میور نے تصور کیا ہے' اس روایت کا اسلام کے زمانہ سے پیشتر بطور حقیقت مسلمہ کے تسلیم ہوتا چلا آنا ہمارے لئے دلیل ہے نہ ہمارے مخالف کے لئے۔

مقدمہ چہارم سر ولیم کے اعتراضوں کی تردید

سر ولیم میور نے اپنی کتاب مسمی لائف آف محمد میں بلا کسی دلیل اور بغیر کسی ثبوت کے ان تمام واقعات سے جن سے کسی مورخ نے انکار نہیں کیا انکار کیا ہے اور ایک خیالی اور فرضی بات کو جو ان کے دل میں آئی حقیقت واقعہ قرار دیا ہے' جن کی تردید ہم کرنا چاہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سر ولیم میور نے اپنے خیال کی فرضی سچائی قائم کرنے کو جو فی نفسہ سچ نہیں ہے' حسب تفصیل ذیل وجوہات قائم کی ہیں۔

اول: انہوں نے یہ بات فرض کر لی ہے کہ مکہ کے قریب اسماعیل کا آباد ہونا اور یہ بات کہ یقطان اہل عرب کے مورث اعلیٰ تھے سب بناوٹ اور قصہ ہے اور ہر قسم کی تاریخ سچائی اور احتمال سے مبرا ہے۔

لیکن اس بات کے کہنے سے پہلے سر ولیم میور پر فرض تھا کہ یہ بات بیان کرتے کہ اہل عرب کو اگر وہ نسل میں اور رسومات میں اور مذہب میں یقطان اور اسماعیل سے بالکل مختلف تھے تو اس بناوٹ کی کیا ضرورت پیش آتی تھی اور کیوں تمام ملک اور تمام قبیلے جو آپس میں نہایت دشمنی اور سخت عداوت رکھتے تھے اور روز خانہ جنگیاں اور باہمی لڑائیاں کرتے تھے اس ایک بات پر متفق ہو گئے تھے۔

عرب کی تمام تاریخوں سے جن کو عیسائی مورخوں نے بھی تسلیم کیا ہے ثابت ہوتا ہے کہ یقطان عرب کا مورث اعلیٰ تھا ان تمام باتوں کی کس طرح سر ولیم میور تردید کرتے ہیں کہ ایسے مواقع پر بمقابل ثبوت کے صرف انکار کر دینا کافی نہیں ہے۔

یونانی مورخ اہل جغرافیہ حجاز میں اسماعیل کی اولاد کی سکونت کا نشان بتاتے ہیں یونانی مورخوں نے حجاز کی ان قوموں کا ذکر کیا ہے جو اسماعیل کے بیٹوں کے نام سے موسوم تھیں۔ ان سب واقعی باتوں کو سر ولیم میور کس طرح معدوم کرتے ہیں۔

دوم: وہ فرماتے ہیں مگر صرف از راہ خود پسندی کہ ''اس عقیدہ باطل کے اصلی اجزا میں کسی بات کا ایسا کوئی نشان نہیں ہے کہ جو حضرت ابراہیم سے متعلق ہو۔ حجر اسود کا بوسہ دینا کعبہ کے گرد طواف کرنا' مکہ اور عرفات اور منیٰ میں رسومات کا ادا کرنا اور مقدس مہینوں اور مقدس ملک کی تعظیم کرنا ان سب باتوں کو حضرت ابراہیم سے یا ان خیالات اور اصول سے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے جو غالباً ان کی اولاد کو ان سے پہنچیں یہ باتیں یا تو ٹھیک ٹھیک مختص المقام تھیں یا ان کو بت پرستی کے اس اصول سے جو جزیرہ عرب کے جنوب میں جاری تھے تعلق تھا اور وہاں سے بنی جرہم یا بنی قطورہ یا از روایت یا کوئی اور قوم جو یمن سے نقل مکانی کر کے مکہ میں آباد ہوئی تھی اپنے ساتھ لائی تھی۔''

مگر ہم کو افسوس ہے کہ سر ولیم میور نے بنی ابراہیم یا بنی اسرائیل کی تمام رسومات سے جو ان کے ہاں جاری تھیں یک لخت چشم پوشی کر لی ہے ورنہ وہ دیکھتے کہ ان رسومات میں اور بنی اسرائیل کی رسومات میں بالکل اتحاد پایا جاتا ہے۔

حجر اسود وہی مذبح ہے کو خدا کے حکم سے ابراہیم' اسحٰق' یعقوب' اور موسیٰ بناتے تھے (دیکھو کتاب پیدائش باب ۱۲ آیت ۷' ۸ و باب ۲۶ آیت ۲۵ و باب ۲۸ آیت ۱۸' ۱۹' ۲۲ کتاب خروج باب ۲۰ آیت ۲۵ باب ۲۴ درس ۴) بوسہ کے خاص فعل کی نسبت ہم جدا لکھیں

گے اس مقام پر جو سر ولیم میور نے اس کا ذکر کیا اس سے ایک عام مقصود بیان کرنا معلوم ہوتا ہے یعنی پتھر کی تعظیم، مگر انہوں نے ان پتھروں کی اس تعظیم کو فراموش کر دیا جو ابراہیم اسحٰق ویعقوب وموسیٰ کرتے تھے یہ سب بزرگ ایسے پتھروں کو مقدس جانتے تھے خدا کے نام سے ان کی تعظیم کرتے تھے۔ یعقوب نے ان پر تیل ڈالا (دیکھو پیدائش باب ۲۸ ورس ۱۹) جو اس زمانہ کے دستور کے موافق غایت الغایت تعظیم پرستش کے قریب تھے۔ یعقوب نے کہا کہ یہ جگہ خانہ خدا ہوگی۔ دیکھو کتاب پیدائش باب ۲۸ آیت ۲۲ خدا نے منع کیا کہ اس گھر کے اوپر مت چڑھو تا کہ تمہاری شرمگاہ اس کے اوپر ننگی نہ ہو جائے (دیکھو کتاب خروج باب ۲۰ آیت ۲۶) پس اب کونسا دقیقہ تعظیم کا باقی رہ گیا ہے جو اس قسم کے پتھروں کی نسبت بنی ابراہیم میں جاری نہ تھا جس کے سبب سر ولیم میور حجر اسود کی اس خفیف تعظیم کو (اگر وہ بھی) بنی ابراہیم کی رسم سے جدا کر کر عرب کے بت پرستوں کی رسم بتاتے ہیں۔

ایک گھر کا خدا کے واسطے بنانا اور بیت اللہ اس کا نام رکھنا جیسے کہ کعبہ ہے اگر ابراہیم کی رسومات سے نہ تصور کیا جائے تو وہ کون تھا (یعنی موسیٰ) جس نے مقام کبعون بیابان میں خدا کا گھر بنایا۔

(دیکھو کتاب خروج باب ۴۰ آیت ۲۴ کتاب اول تاریخ الایام باب ۲۱ آیت ۲۹)

اور وہ کون تھا (یعنی داؤد) جس نے بعد کو خرمنگاہ ارنان بیوسی کو خدا کا گھر بنانے کو مول لیا اور پتھر ولکڑی ولوہا وپیتل اس کے بنانے کو جمع کیا۔ (دیکھو کتاب اول تاریخ الایام باب ۲۲)۔

پس کعبہ کی بنا کو اور اس کو خدا کا گھر قرار دینے کو ابراہیم کی طرف منسوب نہ کرنا بلکہ عرب کے بت پرستوں کی رسم بتانا نہایت تعجب کی بات ہے۔

مکہ میں خاص کعبہ کے ساتھ جو رسم ادا کی جاتی ہے وہ صرف طواف ہے (جس کی حقیقت ہم بیان کریں گے) سر ولیم میور کو اس رسم کی نسبت ابراہیمی رسم ہونے سے انکار کرنا اس وقت مناسب تھا جب کہ اولاً وہ کسی تاریخ یا توریت مقدس سے یہ بات ثابت کر لیتے کہ ابراہیم واسحٰق ویعقوب نے جو مذبح اور بیت اللہ بنائے تھے ان میں وہ کیا کیا کرتے تھے اس واسطے کہ تورات سے موسیٰ کے وقت سے پیشتر صرف خدا کا نام یا عبادت کے لئے ان گھروں کا بننا تو معلوم ہوتا ہے مگر اس سے عبادت کا طریقہ نہیں معلوم ہوتا اور ہم کو اس بات کے یقین کرنے کی قوی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا کی عبادت کا طریقہ یہی تھا جو طواف کی صورت میں پایا جاتا ہے اور اسماعیل کی اولاد نے اپنے دادا کے اسی طریقہ کو اور اسی ہیئت کو اب تک قائم رکھا ہے۔

ہم کو امید ہے کہ سر ولیم میور اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ حج خانہ کعبہ کا نہیں ہوتا حج کو خانہ کعبہ سے کچھ تعلق نہیں ہے پس یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمانوں کے مذہب میں خانہ کعبہ کا حج ہوتا ہے۔

عرفات ایک ایسی چیز ہے جو خاص ابراہیم اور اس کی اولاد سے علاقہ رکھتی ہے ہزاروں جگہ تورات میں آیا ہے کہ خدا ابراہیم کو مرئی ہوا خدا اسحٰق کو مرئی ہوا خدا یعقوب کو مرئی ہوا خدا موسیٰ کو مرئی ہوا۔ پس ٹھیک ٹھیک یہی معنی عرفات کے ہیں۔ جس پہاڑ پر جو قریب مکہ کے ہے خدا ابراہیم واسماعیل کو مرئی ہوا اس پہاڑ کا نام جبل عرفات ہے" معلوم نہیں کہ سر ولیم میور نے عرفات کو کیا سمجھا۔ جو اس کی نسبت کہا کہ اس کو ابراہیم رسوم یا حالات سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

عرفات ایک ایسی چیز ہے جو تمام دنیا کے بت پرستوں سے کچھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ یہ خاص امر ابراہیم کی نسل میں مروج تھا اس مقام پر ہم اس کے مطلب پر کہ خدا کیونکر دکھائی دے سکتا ہے بحث نہیں کرنا چاہتے اور نہ ان الفاظ کے مطلب ومراد سے بحث

منظور ہے بلکہ یہاں صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ عرفات کا استعمال بجز خاندان ابراہیم کے دنیا کے اور کسی خاندان یا مذہب میں نہ تھا اور اس لئے عرفات یا جبل عرفات کے نام سے اس کا خاص تعلق ''ابراہیم سے ثابت ہوتا ہے۔''

یہی مقام ہے جہاں حاضر ہونے کو حج کہتے ہیں۔ وہاں کوئی چیز نہیں ہے پہاڑ تلے کا میدان ہے اس میں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خدا کی یاد کرتے ہیں اس کی تسبیح کرتے ہیں اس قدوس کو قدوس کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ اس مجمع میں صرف خطبہ پڑھا جاتا ہے جس میں خدا کی تعریف ہوتی ہے اور خدا کے احکام سنائے جاتے ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ موسیٰ نے کوہ سینا کی تلیٹی میں سنائے تھے۔ پس غور کرنا چاہیے کہ اس رسم کی اصلیت بت پرستوں سے پائی جاتی ہے یا خاص ابراہیم سے۔

منیٰ کا مقام صرف قربانی کے لئے ہے وہاں بجز قربانی کے اور کوئی رسم نہیں ہوتی تمام تورات قربانی کی رسم سے بھری پڑی ہے جہاں بیت اللہ بنایا تھا وہاں قربانی ہوتی تھی اور اسی قربانی کے سبب سے بیت اللہ مذبح کے نام سے پکارا جاتا تھا منیٰ اور خانہ کعبہ نہایت قریب ہے اور اس لئے قربانی نذر کرنے کے لئے وہ مقام قرار دیا گیا تھا۔ ہاں ابراہیم اور یعقوب و اسحٰق اور موسیٰ اور داؤد اور سلیمان کی قربانی اور مذہب اسلام کی قربانی میں یہ فرق ہے کہ اس قربانی میں جانور کو مار کر اس کی لاش کو آگ میں جلا دیتے تھے اس خیال سے کہ خدا کو اس کی خوشبو یعنی چراند پسند آتی تھی مذہب اسلام میں وہ قربانی غریب محتاج لوگوں کو تقسیم کی جاتی ہے تاکہ وہ بھوک کی سختی سے محفوظ رہیں پس اگر اسی امر کے سبب سرولیم میور نے منیٰ کی رسومات کو بت پرستی کی رسوم تصور کیا ہے تو کچھ افسوس کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر ذی عقل اس پہلی قربانی سے اس پچھلی قربانی کو نہایت عمدہ اور بہتر سمجھتا ہوگا۔ (اس امر کی تحقیق کہ مذہب اسلام میں قربانی کیا چیز ہے ہم جداگانہ لکھیں گے)۔''

کسی ملک کو مذہب اسلام نے مقدس نہیں ٹھہرایا بلکہ مقدس جگہ کو جو خاص خدا کی پرستش کو مقدس ہاتھوں سے بنائی گئی تھی مقدس ٹھہرایا ہے یہ بھی ابراہیم کا طریقہ تھا اور برابر اس کی اولاد میں چلا آتا تھا جہاں وہ خانہ خدا یا مذبح بناتے تھے۔ موسیٰ کو خدا نے کہا کہ سینا پہاڑ کے لئے حد ٹھہرا' اور اس کو مقدس کر (کتاب خروج باب ۱۹ آیت ۲۳) وہ کون تھا (یعنی خدا) جس نے کہا کہ ''مقام مقدس مرا احترام نمائید (سفر لویان باب ۲۶ آیت ۲) اسی طرح بیت المقدس مقدس ٹھہرایا۔ خانہ کعبہ کے لئے بھی جب سے وہ بنا ایک حد ٹھہرائی گئی جو حرم کہلاتی ہے اور اس کو اس مقدس نام کے ادب کے لئے جس کے نام پر وہ پاک جگہ بنائی گئی مقدس ٹھہرایا تھا۔ یہ بھی ایک نہایت عمدہ ثبوت اس بات کا ہے کہ بیت اللہ کو اور حرم کو مقدس ٹھہرانا خاص ابراہیم سے تعلق رکھتا ہے نہ بت پرستوں کی رسم سے۔

ہاں سرولیم میور کی ایک بات کو میں تسلیم کروں گا کہ رجب اور ذیقعدہ اور ذی الحجہ اور محرم کے چار مہینوں کا مقدس ٹھہرانا زمانہ جاہلیت کی رسم تھی ان کو مقدس اس امر سے ٹھہرایا تھا کہ ان مہینوں میں زمانہ جاہلیت عرب لڑائی نہیں لڑتے تھے۔ عرب کی قومیں نہایت مفسد اور خانہ جنگ تھیں برسوں تک آپس میں لڑائی جاری رہتی تھی اور ان چار مہینوں میں عام قوموں کو مکہ میں آنا اور حج کرنا اور کعبہ کے بتوں کو پوجنا ہوتا تھا پس ان سب قوموں نے آپس میں عہد کر لیا تھا کہ ان دنوں میں لڑائی موقوف رہے گی پس یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ان مہینوں کا اشہر حرم نام رکھا تھا مگر سرولیم میور نے جو غلطی کی ہے وہ یہ ہے کہ مذہب اسلام نے بھی ان کو مقدس جانا ہے حالانکہ مذہب اسلام نے ان کی تقدیس کو رد کر دیا ہے اور کوئی مہینہ مسلمانی مذہب میں مقدس نہیں رہا ہے۔ اسلام نے کہا کہ چار مہینے جو مقدس ٹھہرائے گئے ہیں ان میں تم لڑائی کی ابتدا مت کرو لیکن اگر کافر لڑیں تو لڑو۔

خدا تعالیٰ سورۂ توبہ میں فرماتے ہیں کہ

ان عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهراً فی کتاب الله خلق السموات والارض منها اربعة حرم ذلک الدین القیم فلا تظلموا فیهن انفسکم وقاتلوا المشرکین کافه کما یقاتلونکم کافه (سوره توبه)

''گنتی مہینوں کی اللہ کے نزدیک برس کے بارہ مہینے ہیں خدا کے مقرر کئے ہوئے حکم میں جب سے کہ آسمان وزمین پیدا کیا (یعنی لوند کے مہینہ کا اس میں حساب نہیں ہے) انہی میں سے چار مہینے وہ ہیں جن کو اہل عرب اشہر حرم کہتے ہیں یہی ٹھیک حساب ہے۔ اب خدا تعالٰی فرماتے ہیں کہ ان چار مہینوں پر کچھ حصر نہیں ہے بلکہ تم ان بارہ کے بارہ مہینوں میں آپس میں مت لڑو۔''

اور تمام کافروں سے لڑو جس طرح کہ وہ تم سے لڑیں۔ پس یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مذہب اسلام میں اشہر حرم نہیں مانے جاتے بلکہ بارہ کے بارہ مہینے ایک سے ہیں۔

ضمیر فیهن کی اثنا عشر شهرا کی طرف راجع ہے نہ اربعة کی طرف

سوم: وہ فرماتے ہیں کہ ''عرب کے خاص طریقے سیبئن [1] ازم اور بت پرستی اور پتھر کی پرستش تھی اور ان سب کو مکہ کے مذہب سے بڑا تعلق تھا۔''

---

[1] مذہب صابیہ ۱۲

ہم کو اس بات کے قبول کرنے میں کچھ تامل نہیں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو طریقے مکہ میں جاری تھے ان میں بہت کچھ رسومات بت پرستی کی شامل ہوگئی تھیں۔ سیبئن ازم یعنی صابئین کا مذہب بھی اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہا تھا اس میں ہزاروں باتیں کفر وشرک اور کواکب کی پرستش کی داخل ہوگئی تھیں اور وہ بگڑا ہوا مذہب اور بت پرستی آپس میں مل کر زمانہ جاہلیت میں اس نے نہایت عجیب صورت پیدا کی تھی مگر جو خاص باتیں ابراہیم کے مذہب کی ان میں پائی جاتی تھیں ان کو بھی سر ولیم میور بت پرستی سے منسوب کرتے ہیں یہی ان کی غلطی ہے خانہ کعبہ کو اور ابراہیم اور اسماعیلی نماز کے طریقہ کو جس کو اب طواف کعبہ کہتے ہیں اور (اور جس کی اصل ہم بیان کریں گے) سیبئن ازم یا بت پرستی سے کچھ تعلق نہ تھا پتھر یا حجر اسود کی پرستش جس کو سر ولیم میور خاص عرب کا دستور بیان کرتے ہیں (اگر در حقیقت وہ پتھر کی پرستش ہی ہو) خاص ابراہیم کا طریقہ تھا جیسا کہ ہم ابھی ثابت کر آئے ہیں کہ یہ طریقہ خاص ابراہیم سے پیدا ہوا اور یعقوب واسحٰق اور اسماعیل اور موسیٰ نے اس کی پیروی کی جو بن گھڑے اور ننگے پتھروں کو ستون کی مانند کھڑا کرتے تھے اور ان پر تیل چڑھاتے تھے خواہ یوں کہو کہ مہادیو کی پنڈے کی طرح ان پتھروں کی پرستش کرتے تھے غرضیکہ جو کچھ ان کی نسبت کہو ہم تسلیم کر لیں گے مگر یہ بات کہ وہ طریقہ ابراہیم نہ تھا بلکہ خاص عرب کے بت پرستوں کا طریقہ تھا جیسا کہ سر ولیم میور بیان کرتے ہیں تسلیم نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کی غلطی اعلانیہ ثابت ہے۔

ان تمام قابل افسوس قیاسات اور فرضی قصوں کے بعد سر ولیم میور نے مکہ کی ابتدا اور مکہ کے مذہب کی ایک فرضی تاریخ بیان کی ہے اور ہر ایک بات کو بلا دلیل اور بغیر ثبوت کے فرض کر لینے کے بعد سر ولیم میور بالطبع (جو در حقیقت ایسا ہی ہونا ضرور تھا) اپنے عالی دماغ اور تر وتازہ موج زن ذہن کے ایجادات کو عرب کی واقعی تاریخ سے مطابق کرنا ناممکن پاتے ہیں مگر جس طرح کہ سر ولیم کا خیال بہت بلند اور فکر بہت تیز ہے اس کی بہ نسبت ان کے قلم تیز رفتار کی جولانی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پس وہ ایک لحہ میں اپنے خیال کو جولانی دے کر اپنے قلم کے چند اشاروں سے تمام ناممکن باتوں پر غالب آتے ہیں مگر جو کہ ان کے قلم سے نکلی ہوئی وہ باتیں نہ تاریخی واقعات ہیں اور نہ عرب کی مختص المقام روایتیں اور نہ کتاب مقدس کی سچی باتیں بلکہ صرف سر ولیم کے عجیب وغریب کام کرنے والے خیال کی ایجادیں ہیں اور کسی قسم کی معتبر سند اور ہر ایک قسم کی تائید وتصدیق سے مبرا ہیں۔ اس وجہ سے ہم ان کو اپنے خطبہ میں ذکر کرنا محض بے فائدہ سمجھتے ہیں۔

تعمیر ابراہیم

پرانی باتوں کے ساتھ ہمیشہ قصے کہانیاں لوگ ملا دیتے ہیں ان کو مقدس و متبرک بنانے کو ایسے ایسے واقعات ان کے ساتھ منسوب کرتے ہیں جن کی کچھ بھی اصل نہیں ہوتی۔ مذہب اسلام میں بھی لوگوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ مکہ کی نسبت جو حالات روایتوں میں مذکور ہیں ان کا بھی یہی حال ہے۔ قرآن مجید میں بہت تھوڑے لفظ ہیں اور نہایت مختصر ان کا مطلب ہے کہ ابراہیم نے خدا کی عبادت کے لئے مسجد بنائی اور خدا سے دعا کی کہ تو اس کو اپنے مبارک نام پر قبول کر مگر مورخین نے اس پر وہ حاشیے چڑھائے اور وہ واقعات لگائے کہ نعوذ باللہ خدا کو بھی معلوم نہ تھے پس ایک خاص منصف شخص کا یہ کام نہیں ہے کہ ان چھوٹی باتوں کو جن کو ہم خود جھوٹا کہتے ہیں مذہب اسلام قرار دے اور پھر اس پر اعتراضات کی بنا قائم کرے کیونکہ وہ تو بنائے فاسد علی الفاسد ہے اور نہ اس شخص کو جس کے دل میں اسلام کی جناب سے کچھ شبہ پیدا ہو یہ مناسب ہے کہ ان جھوٹی روایتوں سے ڈگمگا دے کیونکہ وہ تو خود جھوٹی ہیں مگر جو واقعات کو مبالغہ آمیز تقدس کے ساتھ بیان ہوتے ہیں ان میں اصلی واقعات بھی شامل ہوتے ہیں اس لئے ہر عقلمند و منصف کو لازم ہے کہ ان اصلی واقعات کو ان جھوٹی باتوں سے بمقدور چھانٹ لے اور پھر اس پر جو وہ چاہے اپنی رائے قائم کرے۔

تمام روایتیں جو مکہ کی نسبت کتابوں میں مندرج ہیں سب کی سب نامعتمد و غیر مستند و مشتبہ ہیں اور ان میں سچی اصلی بات کے ساتھ بہت کچھ جھوٹ اور قصے کہانیاں شامل کر دیئے ہیں مگر جس قدر کہ سچ ہے وہ ان سے بخوبی ممیز ہو سکتا ہے چنانچہ ہم اس خطبہ میں اسی قدر تحریر پر اکتفا کریں گے جس قدر کہ ہمارے نزدیک سچ ہے۔

فبنا البيت وجعل طوله في السماء تسعة اذرع وعرضه في الارض اثنين و ثلاثين ذراعا من الركن الا سود الى الركن الشامي الذى عند الحجر من وجهه وجعل عرض ما بين الركن الشامي الى الركن الغربى الذى فيه الحجر اثنين وعشرين ذراعا وجعل طول ظهرها من الركن الغربى الى الركن اليماني احد وثلاثين ذراعا وجعل عرض شقها اليماني من الركن الاسود الى الركن اليماني عشرين ذراعاً (كتاب اخبار مكه ازرقى صفحه ۳۱)

"حضرت ابراہیم نے بیت اللہ بنانے کو پہاڑ کی گھاٹی میں جہاں اس قسم کی عمارتیں بنانے کو بالطبع جگہ پسند کی جاتی ہے جگہ پسند کی اور زیادہ تر پسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ چشمہ زمزم کے نہایت قریب تھی وہاں انہوں نے حضرت اسماعیل کی شرکت سے کعبہ یعنی مسجد بنائی کتابوں میں اس کا ارتفاع نو ذرعہ اور ایک طرف کا عرض بیس اور ایک طرف کا بائیس اور ایک طرف کا طول اکتیس اور ایک طرف کا بتیس لکھا ہے اگر یہ پیمائش صحیح ہو تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نیک زمانہ میں پیمائش کے آلات نہ تھے اور قائمے زاویے نہیں نکل سکتے تھے غالباً اسی وجہ سے ہر مقابلے کے ضلع مساوی نہیں بن سکے۔

جو پیمائش کہ مذکور ہوئی ہے اس کے مطابق ہم اس مقام پر نقشہ کعبہ کا ثبت کرتے ہیں جس سے اس کی قطع بخوبی معلوم ہوگی۔ دائیں طرف جو حصہ نقطوں سے گھرا ہوا ہے حضرت ابراہیم کے وقت میں وہ بھی کعبہ میں داخل تھا۔ قریش نے تعمیر کے وقت اس قدر چھوڑ دیا تھا۔ کعبہ کے اندر جو نقطہ دار نشان ہیں وہ ان ستونوں کے ہیں جو قریش نے بنائے تھے وہ اب نہیں بعوض اس کے عبداللہ ابن زبیر نے تین ستون بنائے ہیں جن کے سیاہ نشان بیچ میں بنے ہوئے ہیں غرض کہ جس قدر سیاہ ہے وہ اب موجود کعبہ ہے۔

تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دیواریں ہی دیواریں بنی تھیں چھت نہیں تھی اور دروازہ زمین سے ملا ہوا تھا اور اس میں نہ کواڑ چڑھے تھے نہ کنڈی لگی تھی اور بلاشبہ اس زمانہ کی حالت ایسی تھی کہ اس سے زیادہ تعمیر مکان میں گو وہ خدا ہی کا گھر بنایا گیا ہو اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس عمارت کے ایک بیرونی گوشہ پر طواف کے شمار کرنے کو جس سے اس کی ابتدا اور انتہا معلوم ہوسکے ایک لمبا پتھر لگا دیا جو حجر اسود کے نام سے مشہور ہے اور جس کے قیاس کرنے کی وجہ سے ہوسکتی ہے کہ وہ پتھر غالباً اسی قسم کا پتھر ہے جیسا کہ ابراہیم خدا کی عبادت کے لئے کھڑا کر لیا کرتے تھے جس کو مذبح یا قربانی گاہ یا آلٹر کہتے ہیں۔ اس چار دیواری کے اندر ایک کنواں کھودا تھا جس کو خزانہ کعبہ کہتے تھے اور جو کچھ نذر و نیاز کعبہ میں آتی تھی وہ اس میں رکھ دیتے تھے تا کہ چوری سے محفوظ رہے۔

تعمیر بنی جرہم

قالوا وتوفی اسماعیل و دفن فی الجو کانت امه قد دفنت فی الحجر ایضا وترک ولد امن رعلة ابنة مضاض بن عمرو الجرهمی فقام مضاض بامر ولد اسماعیل ومنهم لا نهم بنو ابته فلم یزل امر جرهم یعظم بحة و یستفحل حتی روا البیت وکانوا اولاته و حجابه و ولاة الاحکام بمکة فجاء یسل فدخل البیت فانهدم فاعادته جرهم علی بناء ابراهیم وکان طوله فی السماء تسعة اذرع. (کتاب اخبار مکه صفحه ۴۸)

"کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت اسماعیل اس کے محافظ رہے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو بنی جرہم کو اس میں مداخلت ہوئی کیونکہ وہ ان کے قریب تر رشتہ دار تھے اور بنی اسماعیل کے خیر خواہ و محافظ تھے۔ مضاض ابن عمرو جرہمی جو نانا اسماعیل کے بیٹے کا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں سب اختیار لے لیا۔ بنی جرہم کے اختیار کے زمانہ میں پہاڑی نالہ آیا اور کعبہ میں پانی چڑھ گیا اور کعبہ ڈھے گیا جس کو بنی جرہم نے انہیں بنیادوں پر جو ابراہیم نے بنائی تھیں اور اسی صورت پر پھر بنالیا اس کی بلندی زمین سے نو ذرعہ تھی۔"

ہم کو کسی تاریخ سے اس تعمیر کا زمانہ نہیں معلوم ہوا اور اسی سبب سے ہم کوئی زمانہ اس کی تعمیر کا قرار نہیں دے سکتے۔

تعمیر عمالیق

عرب میں جو لوگ آباد ہوئے وہ تین ناموں سے مشہور ہیں۔ ایک عرب البائدہ ایک عرب العاربہ اور ایک عرب المستعربہ عرب البائدہ وہ لوگ کہلاتے تھے جن میں عادہ ثمود اور جرہم الاولیٰ اور عمالیق اولیٰ تھے۔ وہ قومیں برباد ہوگئیں اور تاریخ کی کتابوں میں ان کا بہت کم حال ملتا ہے اور یہ سب قومیں ابراہیم سے اور بناء کعبہ سے پہلے تھیں۔

عرب العاربہ عرب کی وہ قومیں ہیں جن کی نسل یقطان یا قحطان سے چلی ہے اور تمام قبائل عرب سے نسل میں ہیں۔ حمیر بھی انہیں کا ایک قبیلہ ہے اور بنی حمیر میں بھی ایک قبیلہ عمالیق کے نام سے تھا جو مکہ میں بستا تھا۔ اس پچھلی قوم نے بنی جرہم پر غلبہ پالیا تھا اور کعبہ کی مختار ہوگئی تھی اس زمانہ میں اس قوم عمالیق ثانی نے کعبہ کو پھر بنایا جو غالباً پہاڑوں کے نالے چڑھ آنے سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔

بعض مورخوں نے ان دونوں قوموں میں تمیز نہیں کی اور عرب البائدہ میں جو قوم عمالیق تھی اس کی نسبت تعمیر کعبہ کو خیال کیا اور جو کہ وہ قوم بنی جرہم سے پہلے تھی اس لئے لکھ دیا کہ عمالیق نے قبل بنی جرہم کے تعمیر کعبہ کی تھی حالانکہ اس زمانہ میں نہ ابراہیم تھے نہ کعبہ تھا۔

مورخوں کی اس غلطی میں پڑنے کا سبب ان کا خیال اور غلط خیال بھی ہے۔ مسلمانوں میں بہت سی ایسی روایتیں جو دو پری کے قصہ سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں موجود ہیں جن میں بیان ہوا ہے کہ کعبہ پہلے عرش کے نیچے چار ستون کے چوکھبے کی طرح بنایا گیا تھا۔ اس کے ستون زبرجد کے تھے اور یاقوت احمر کی پچی کاری سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس گھر کا نام تو بیت المعمور ہوا پھر خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ زمین پر اسی کے مقابل اتنا ہی بڑا اور اسی شکل کا گھر بناؤ۔ انہوں نے بنایا اور وہ اس جگہ بنایا تھا جہاں اب کعبہ ہے مگر افسوس ہے کہ وہ فرشتے' اچھے انجینئر نہ تھے۔ حضرت آدم کے پیدا ہوتے ہوتے وہ گھر نہ رہا تھا کہ حضرت آدم کو پھر بنانا پڑا مگر نوح کے طوفان نے پھر اس کو ڈھا دیا۔ تب نوح نے بنایا پھر اسی طرح ٹوٹتا ڈہتا رہا۔ یہ سب جھوٹی روایتیں قرآن مجید کے ایک لفظ ''عتیق'' پر بنالی گئی ہیں جن میں سے ایک جگہ کی بھی کچھ اصل نہیں ہے۔ اسی قسم کی جھوٹی روایتیں ہیں جنہوں نے اسلام کی سچائی کو چھپا دیا اور ہر سمجھدار کے دل میں جب وہ غور کرتا ہے اسلام کی طرف سے شبہ ڈال دیا مگر ان کو سمجھنا چاہیے کہ اسلام مشتبہ نہیں ہے بلکہ اس قسم کی روایتیں مشتبہ اور جھوٹی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ بہت سے سادہ لوح مسلمان اور نادان مورخ ان روایتوں پر یقین رکھتے ہیں اور جب کہ انہوں نے قدامت مکہ ایسی پرانی فرض کر لی جو آدمی سے بھی پرانی ہے تو اب ان کو اس بات کے کہنے میں کہ جرہم سے پہلے عمالیق نے تعمیر کی تھی کچھ باک نہیں رہا۔

ایک فرانسیسی مورخ نے اپنی کتاب موسومہ ڈائی کرائیکن ڈراسٹ مکہ'' میں حضرت علی کی روایت سے لکھا ہے کہ پہلے بنی جرہم نے اور اس کے بعد عمالیق نے (یعنی عمالیق ثانی نے) کعبہ کی تعمیر کی۔

عمالیق ثانی کی تعمیر کا زمانہ بھی نہیں معلوم ہوسکتا لیکن اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سنہ عیسوی سے ایک صدی پیشتر وہ لوگ مکہ پر قابض تھے۔ اس لئے کہ جذیمہ بادشاہ دوم خاندان حیرہ کی ایک نہایت سخت لڑائی عمالیق سے ہوئی تھی جس میں عمالیقوں نے شکست فاش پائی تھی اور یہ واقعہ عیسوی سے تخمیناً سو برس پیشتر ہوا تھا۔

تعمیر قصی

ایک مدت بعد بھی کچھ نقصان آ گیا اور بجز اس کے کہ سیلاب سے نقصان پہنچا ہو' جواب بھی کبھی آ جاتا ہے اور کوئی سبب نقصان کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس وقت قصی ابن کلاب نے اس کو بنایا اگرچہ اس تعمیر کا زمانہ بھی ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہے مگر جو کہ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ قصہ چھ پشت پیشتر آنحضرت ﷺ سے تھا اس لئے غالباً یہ تعمیر دو سو برس پیشتر آنحضرت ﷺ کی ولادت سے ہوئی تھی۔

تعمیر قریش

فلما احترقت الكعبة توهنت جدارها من كل جانب وتصدعت وكانت الحزف والاربعة مظلة والسيول متواترة ولمكة سيول عوارم فجاء سيل عظيم على تلك الحال فدخل الكعبة و صدع

جدارها واخافهم فضزعت من ذلک قریش فزعاشد یدا وها بواهد مها وخشوا ان مسوها ان ینزل علیهم العذاب. (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۷)

"رسول خدا ﷺ پیدا ہو چکے تھے اور آپ کا سن شریف تخمیناً بارہ چودہ برس کا ہوگا یعنی تیسری دہائی ماقبل سال اظہار نبوت میں کعبہ کے غلاف میں آگ لگی اور کعبہ کی دیواریں آتشزدگی کے سبب بودی ہوگئیں اور کئی جگہ سے پھٹ بھی گئیں اسی عرصہ میں پہاڑی نالوں کی جنہیں عرب سیل عوارم کہتے ہیں کثرت ہوئی اور ایک نالہ نہایت زور وشور سے آیا اور خانہ خدا پانی سے بھر گیا اور دیواریں پھٹ گئیں اور گرنے کو ہوئیں تب قریش نے اس کے بنانے کی فکر کی۔"

فبیناهم علی ذلک ینظرون و یتشاورون اذ اقبلت سفینة الروم حتی اذا کانت بالشعیبة وهی یومئذ ساحل مکة قبل جدة انکسرت فسمعت بها قریش فرکبوا الیها فاروا خشبها واذنوا لاهلها ان ید خلوا مکة فیبیعون ما معهم من متاعهم ان لا یعشروهم... فکان فی السفینة رومی نجار بناء یسمی باقوم فلما قد موا بالخشب مکة قالوا لو بیننا بیت ربنا فاجمعوا لذلک وتعاونوا علیه وتراودوفی النفقة (کتاب اخبار مکه صفحه: ۱۰۷)

"معلوم ہوتا ہے کہ قریش فن تعمیر عمارت سے بہت کم واقف تھے اور وہ اس فکر میں تھے کہ اس کو کون بنائے اور کیونکر بنائے اس درمیان میں رومیوں کا جو اس زمانہ میں عیسائی اور رومن کیتھولک مذہب کے تھے ایک جہاز بندرگاہ مکہ میں آیا اس زمانہ میں جدہ بندرگاہ نہ تھا بلکہ شعیبہ بندرگاہ تھا اور وہاں وہ جہاز ٹوٹ گیا جب قریش نے یہ بات سنی تو وہاں گئے اور اس کی لکڑی مول لے لی اور جہاز والوں کی خاطرداری کی اور کہا کہ تم مکہ میں آؤ اور اپنا اسباب بیچ لو ہم تم سے محصول بھی نہیں لینے کے۔ اس جہاز میں ایک عیسائی رومن کیتھولک انجینئر بھی تھا اور باقوم اس کا نام تھا اس سے خواہش کی کہ وہ خدا کے گھر کو بنادے پس لوگوں نے اس کام میں مدد کی اور اخراجات جمع کرنے کی تدبیر شروع کی۔"

فنقلوا الحجارة و رسول الله یومعذ علام لم ینزل علیه الوحی نقل معهم الحجارة علی رقبه (کتاب اخبار مکه صفحه: ۱۰۷)

"سب لوگ مل کر پتھر ڈھوتے تھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اس زمانہ میں اگرچہ تھوڑی عمر تھی مگر آنحضرت بھی پتھر ڈھونے میں شریک تھے۔"

فلما اجتمع لهم ما یریدون من الحجارة و الخشب وما یحتاجون الیه عدوا الی هدمها.... فهابت قریش هدمه و قالوا من یبدا فیهدمه فقال الولید بن المغیرة انا ابدء کم فی هدمه انا شیخ کبیر فان اصابنی امر کان قدونا اجلی وان کان غیر ذلک لم یرزانی فعلا البیت وفی یده تهة یهدمها... فهدمت قریش معه حتی بلغوا الاساس الاول الذی رفع علیه ابراهیم واسمعیل القواعد من البیت (کتاب اخبار مکه صفحه ۱۰۰، ۱۰۹)

"جب کہ پتھر ولکڑی سب جمع ہوگئی تو انہوں نے کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا مگر سب وہم و وسواس میں گرفتار تھے اور ڈرتے تھے کہ اگر ڈھاویں گے تو خدا جانے کیا آفت آوے گی۔ ولید ابن مغیرہ نے اپنا دل کڑا کیا اور کہا کہ میں ڈھاتا

شروع کرتا ہوں۔ میں بڈھا تو ہو ہی لیا ہوں اگر کچھ آفت آوے گی تو مرنے کو تو ہو ہی رہا ہوں۔ چنانچہ ولید ابن مغیرہ کعبہ کی دیوار پر چڑھا اور کدال سے ڈھانا شروع کیا۔ پھر سب ڈھانے لگے اور بنیاد تک جس پر حضرت ابراہیم نے چنائی شروع کی تھی برابر کر دیا۔"

فلما اجمعوا ما اخر جوامن النفقة قلت النقة ان تبلغ لهم عمارة البيت كله فتشاوروا في ذلک فاجمع رايهم على ان يقسر واعن القواعد و يحجروا ما يقدرون عليه من بناء البيت ويتركوا بقيته في الحجر عليه جدار مدار يطوف الناس من ورائه ففعلوا ذلک وبنوافي بطن الكعبة اساسايبنون عليه من شق الحجر وتركوا من وراء ه من بناء البيت في الجهر ستة اذرع وشبرا فبنوا على ذلک. (كتاب اخبار مكه صفحه: ١٠٩)

"جب سب ڈھا چکے تو معلوم ہوا کہ جو کچھ سامان انہوں نے جمع کیا ہے وہ اس سب کے بنانے کو کافی نہیں ہے۔ قریش نے کعبہ کی عمارت کو بہ نسبت سابق کے دو چند مرتفع بنایا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پتھر و مصالح وغیرہ کی کچھ کمی نہ تھی۔ غالباً لکڑی اس قدر نہ تھی جس سے کل کعبہ کی چھت بن سکے۔ اس لئے انہوں نے اس کو چھوٹا کر بنایا چھ ذرعہ اور ایک بالشت زمین حجر کی طرف چھوڑ دی اور اس طرف عرض میں ایک جدید بنیاد کھود کر دیوار چن لی جو اب ہمارے نقشہ میں سیاہ بنی ہوئی ہے۔"

"فلما وضعوا ايديهم في بناء ها قالوا ارفعوا بابها من الارض واكبسرها حتى لاقد خلها السيول ولا ترقا الا بسلم ولا يدخلها الا من اردتم ان كرهتم احداد فعتموه ففعلوا ذلک."

(كتاب مكه صفحه: ١٠٩)

"انہوں نے کعبہ کو چار ذرعہ اور ایک بالشت کرسی دے دی اور اس قدر کرسی پر دروازہ بنایا تا کہ نالے کا پانی پھر اندر نہ گھسے اور کوئی شخص بغیر سیڑھی کے نہ چڑھ سکے اور اس حکمت سے جس کو چاہیں نہ جانے دیں"۔
حال کے زمانہ میں کعبہ کے اندر جانے کو داخلی کہتے ہیں۔"

حتى انتهوا الى موضع الركن فاختلفوا في وضعه وكثر الكلام فيه وتنانسوافي ذلک... فقال ابو امية بن المغيرة يا قوم انما اردنا البرولم نرادالشر فلا تحاسدوا ولا تنافسوا فانكم اذا اختلفتم تشتت امور كم وطمع فيكم وغير كم ولكن مكبوا بينكم اول من يطلع عليكم من هذا الفج قالو ارضينا وسلمنا فطلع رسول الله صلى الله عليه وسلم قالوا هذا لا مين قدر ضينا به فحكموه فبسط رواء ه ثم وضع فيه الركن قد عامن كل ربع رجلا فاخذوا باطراب الثوب... فرفع القوم الركن وقام النبي صلى الله عليه وسلم على الجدرثم وضعه بيده.

(كتاب اخبار مكة: ١٠٩، ١١٠)

"جب بناتے بناتے وہاں پہنچے جہاں حجر اسود لگانا تھا تو آپس میں جھگڑا و تکرار ہوئی۔ ایک قبیلہ کہتا تھا کہ ہم کھڑا کریں گے دوسرا کہتا تھا کہ ہم کھڑا کریں گے۔ بڑی خیر ہوئی کہ ابوامیہ بن مغیرہ کے سمجھانے سے سب لوگ اس بات پر راضی ہو

گئے کہ جو سب سے پہلے اس رستہ سے آئے وہی فیصلہ کے لئے حکم بنا جائے۔ ان سب کی خوش قسمتی یہ ہوئی کہ محمد ﷺ سامنے سے تشریف لائے۔ اگرچہ حضرت کی عمر چھوٹی تھی مگر سب امین امین کہہ کر چلا اٹھے۔''

آنحضرت نے بتائید روح القدس وہ فیصلہ فرمایا کہ سب متحیر ہو گئے۔ آپ نے ردائے مبارک بچھائی اور حجر اسود کو اس میں رکھا اور سب قوموں کے سرداروں کو کہا کہ سب مل کر چادر پکڑ کر اٹھائیں اور وہاں تک لے چلیں جہاں لگانا ہے۔ سب نے اسی طرح مل کر اٹھایا اور جب کونے کے پاس لائے تو آنحضرت نے اس کو وہاں رکھ دیا۔ متقدمین و متاخرین علماء اس وقعہ کو واقعہ قبل بعثت کہتے ہیں۔ مگر میں ان لفظوں سے متفق نہیں ہوں کیونکہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وقت ولادت سے ہی مبعوث تھے۔ النبی نبی ولو کان فی بطن امه.''

فبنوا حتى ارفعوا اربعة اذرع وشبرائم كبسوها و وضعوابا بها مرتفعا على هذا الذرع... فقال لهم يا قوم الرومي اتحبون ان تجعلوا اسقفها مكبسا اومسطحا فقالوا ابل ابن بيت ربنا مسطحا قال فبنوا مسطحا وجعلوا فيه ست دعائم في صفين في كل صف ثلاث دعائم... وجعلوا ارتفا عها من خارجه من الارض الى اعلاها ثمانية عشر ذرا عاو كانت قبل ذلك تسعة اذرع فزادت قريش في ارتفا عها في السماء تسعة اذرع اخر... وجعلوا ميز ابها يسكب في الحجور وجعلوا درجه من خشب في بطنها في الركن الشامي يصعد منها الى ظهر هاد كتاب اخبار مكه صفحه: ۱۱۰)

جب کہ یہ تنازعہ رفع ہو گیا تو تعمیر شروع ہوئی جتنا کہ کعبہ پہلے زمین سے بلند تھا قریش نے اس سے دوگنا بلند کر دیا۔ یعنی زمین سے اٹھارہ ذرع اور پہلے صرف نو ہی ذرعہ تھا۔ جب دیواریں بن چکیں تو باقوم نے پوچھا کہ اس کی چھت کیسی بناؤں۔ بنگلہ نما یا چورس؟ سب نے کہا کہ ہمارے خدا کے گھر کی چھت چورس بناؤ۔ تب باقوم نے اس کے عوض میں چھ ستون کھڑے کئے اور چورس چھت بنا دی غالباً اس قدر لمبی لکڑی نہ تھی کہ پورا شہتیر پڑ جاتا اسی سبب سے بیچ میں ستون بنانے کی ضرورت ہوئی اور شاید اسی وجہ سے باقوم نے بنگلہ نام بنانی چاہی ہوگی تا کہ قینچی پڑ جائے اور بیچ میں ستون بنانے نہ پڑیں۔ اس کی چھت کا پرنالہ اس جگہ میں ڈالا جو چھوڑ دی گئی تھی اور کعبہ کے اندر ایک کاٹ کی سیڑھی چھت تک بنائی اور چھت میں ایک روشندان رکھا جس سے کعبہ کے اندر اجالا بھی رہے اور اس میں سے جب ضرورت ہو کعبہ کی چھت پر چڑھ جائیں۔''

تعمیر عبداللہ ابن زبیر

حضرت معاویہ بن ابی سفیان کے بعد جب یزید نے اپنے تئیں اپنے باپ کا جانشین کیا تو حضرت عبداللہ ابن زبیر نے اس سے بیعت میں یعنی اس کو خلیفہ تسلیم کرنے میں تامل کیا۔ اس حصین بن نمیر یزید کی طرف سے فوج لے کر مکہ پر چڑھ گیا اور کئی دن تک عبداللہ ابن زبیر سے لڑائی ہوتی رہی۔ عبداللہ ابن زبیر کے سب لوگ کعبہ کے گرد خیموں میں پڑے ہوئے تھے حصین بن نمیر ابوقبیس پہاڑ پر سے گوپھن میں پتھر مارتا تھا اور غلاف کعبہ اس کے صدمہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ اتفاق سے ایک خیمہ میں آگ لگ گئی

ہوا تیز چل رہی تھی کعبہ میں بھی جا لگی اور تمام کعبہ جل گیا۔ اس کی دیواروں میں کاٹ لگا ہوا تھا اس کے جلنے سے تمام دیواروں کے پتھر ایسے ہوگئے کہ کبوتر کے بیٹھنے سے بھی گر پڑتے تھے اور کئی جگہ سے دیواریں شق ہوگئیں۔ یہ واقعہ تیسری ربیع الاول ۶۴ ہجری کو ہوا اس کے دس گیارہ دن بعد یزید مر گیا۔ جب یہ خبر مکہ میں پہنچی تو ابن زبیر نے حصین بن نمیر سے کہا کہ دیکھو کعبہ بھی جل گیا امیر بھی مر گیا پھر ہم سے کیوں لڑتے ہو۔ کیا معلوم کہ نیا خلیفہ کیا کرے گا۔

فلما ادبر جيس حصين بن نمير وكان خروجه من مكة لخمس ليال خلون من ربيع الاخرسنة اربع وستين دعا ابن زبير وجوه الناس واشرافهم واشاورهم في هدم الكعبة.

(كتاب اخبار مكه صفحه: ۱۴۰)

فامر ابن الزبير بهد مها فما اجتراء احد على ذلك فلما راى ذلك علاها هوا بنفسه ياخذ المعول وجعل يهدمها ويرمي بحجار تها فلما روه انه لم يصبه شي اجتواؤا فصعدوا يهد موها. كتاب اخبر مكه صفحه: ۱۴۱)

وكان هدمها يوم السبت نصف من جمادى الا خرسنة اربع وستين ولم يقرب ابن عباس مكة حين هد مت الكعبة حتى فرغ منها و ارسل الى ابن الزبير لا تدع الناس بغير قبلة نصب لهم حول الكعبة الخشب واجعل عليها الستو حتى يطوف الناس من ورائها ويصلون علها ففعل ذلك ابن الزبير. (كتاب اخبار مكه صفحه: ۱۴۲)

فلما هدم ابن الزبير الكعبة وسواها الارض كشف عن اساس ابراهيم فوجده وادخلا في الحجرنحوا من ستة اذرع وشبر. (كتاب اخبار مكه صفحه: ۱۴۲)

ثم وضع البناء على ذلك الا ساس ووضع عدت البنات باب الكعبة على مدماک على الشاذروان اللاصق بالارض وجعل الباب الاخر بازاء ه في ظهر الكعبة مقابلته.

(كتاب اخبار صفحه:۱۴۳)

قالو او كانت الكعبة يوم هدمها ابن الزبير ثمانية عشر ذراعاً في السماء فلما ان بلغ ابن الزبير بالبناء ثمانية عشر ذراعا قصرت مجال الزياد التى زاده من الحجر فيها واستسميح ذلك اذمارت عريضة لا طول لها فقال قد كانت قبل قريش تسعة اذرع حتى زادت قريش فيها تسعة اذرع طولا في السماء فانا ازيد تسعة افرع اخرى فبناها سبعة وعشرين ذراعا في السماء وهي سبعة وعشرون مد ما كاد عرض جدارها ذراعان وجعل فيها ثلث دعايم وكانت قريش في الجاهلية جعلت فيها ست دعايم (كتاب اخبار مكه صفحه: ۱۴۴)

امر ابن الزبير ابنه عباد بن عبدالله بن الزبير وجبير بن شيبة بن عمثان ان يجعلو الركن في ثوب وقال لهم ابن الزبير اذا دخلت في الصلوة صلوة الظهر فاحملوه واجعلوه في موضعه فان اطول الصلوة فاذا فرغتم فكبروا حتى احفف صلوتي وكان ذلك في حرشد يد فلما اقيمت الصلوة

كبر ابن الزبير وصلى بهم ركعة خرج عباد بالركن من دار الندوة وهو يحمله ومعه جبير بن شيبة بن عثمان دار الندوة يومئذ قوية من الكعبة فخر قابه الصفوف حتى ادخلاه في الستر الذي دون البناء وكان الذي وضعه في موضعه هذا عباد بن الزبير واعانه عليه جبير بن شيبة فلما اقروه في موضعه وطرق عليه الحجر ان كبرو فاخفف ابن الزبير صلوته وتسامع الناس بذلك.

(كتاب اخبار مكه صفحه: ۱۴۳، ۱۴۴)

اس پر حصین بن نمیر مع اپنے لشکر کے پانچویں ربیع الثانی ۶۴ ہجری کو مکہ سے شام کو چلا گیا۔ تب ابن زبیر نے مکہ کے ذی وجاہت اور شریف لوگوں کو بلایا۔

''اور کعبہ کے ڈھانے میں مشورہ کیا۔ بہت وہمی اور وسواسی باتیں جو ایسے موقع پر ہوتی ہیں ہوئیں آخر کار ابن زبیر نے کعبہ کے ڈھانے کا حکم دیا مگر کسی کو ڈھانا شروع کرنے کی بوجہ توہم و وسواس وخوف کے جرأت نہ ہوئی تو خود ابن زبیر کدال لے کر اوپر چڑھ گئے اور ڈھانا شروع کر دیا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ابن زبیر پر کچھ آفت نہیں پڑی تو اوروں کو بھی جرأت ہوئی اور سب چڑھ گئے اور ڈھانے لگے۔ جمادی الاول ۶۴ ہجری تک سب کعبہ ڈھا دیا گیا۔ مگر ابن عباس اپنے خوف یا وہم یا کعبہ کا منہدم کرنا خلاف طبع ہونے کے سبب مکہ میں نہ آئے۔ ابن زبیر نے بموجب فہمائش ابن عباس کے کعبہ کے چاروں طرف تختہ بطور دیوار کے کھڑا کر دیا اور کپڑے سے منڈھ دیا اور اندر اندر کام ہوا کیا لوگ اس تختہ کی دیوار کی گرد طواف کیا کئے اور نماز پڑھا کئے۔ جب کہ کعبہ بالکل ڈھ کر زمین کے برابر ہو گیا اور حضرت ابراہیم کے ہاتھ کی بنیاد رکھی ہوئی نکل آئی تو ضرور بالطبع ابن زبیر کو رغبت ہوئی ہوگی کہ کل تعمیر ابراہیم پر تعمیر کی جائے اور جس قدر کہ قریش نے بہ سبب نہ میسر ہونے سامان کے چھوڑ دیا تھا وہ بھی تعمیر میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ ابن زبیر نے ایسا ہی کیا اور کل بناء ابراہیم پر تعمیر کعبہ شروع ہوئی۔ ایک نہایت عمدہ تجویز جو ابن زبیر نے کی تھی وہ یہ تھی کہ کعبہ کے دو دروازے رکھے جائیں' ایک جانب مشرق جو قدیم سے تھا۔ اور دوسرا جانب غرب تاکہ جو لوگ شرقی دروازہ سے کعبہ میں داخل ہوں وہ غربی دروازہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور جو کرسی قریش نے باقوم کی صلاح سے دی تھی وہ بھی موقوف کر دی اور زمین پر دروازوں کو قائم کیا مگر بلندی اس کی قریش کی بلندی سے بھی نو ذرعہ بڑھا دی یعنی ستائیس ذرعہ کر دی اور بلاشبہ جب کہ کعبہ لمبا ہو گیا تھا تو اس کا اس قدر اونچا کرنا بھی نہایت ضرور تھا قریش نے کعبہ کے اندر چھ ستون قائم کئے تھے چھت پاٹنے کو ابن زبیر نے صرف تین ستون بنائے غالباً ان کو بہ نسبت قریش کے لکڑی لمبی مل گئی تھی۔''

حجر اسود رکھے جانے کا ایک عجیب حال کتابوں میں لکھا ہے جس کی کچھ وجہ ہمارے خیال میں نہیں آتی۔ ابن زبیر نے لوگوں کو ایک دھوکا میں رکھا اور اپنے بیٹے عباد اور جبیر ابن شیبہ کو سمجھا دیا کہ جب نماز پڑھانے کھڑا ہوں گا تو بڑی نماز پڑھاؤں گا۔ اس وقت تم حجر اسود کو جو دار ندوہ میں قریب کعبہ کے رکھا ہوا ہے ایک کپڑے میں لپیٹ کر لے آنا اور جو جگہ اس کے کھڑا کرنے کی ہے وہاں کھڑا کر دینا۔ جب کھڑا کر چکو تو پکار کر اللہ اکبر کہنا پس میں نماز کو ختم کر دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا کہ جب ابن زبیر نماز پڑھانے کو کھڑے ہوئے اور ایک رکعت پڑھا چکے تو عباد اور جبیر حجر اسود کو کپڑے میں لپیٹ کر دار ندوہ میں سے لے آئے۔ جماعتوں کو چیر کر تختوں کی دیوار کے اندر لے گئے اور ان دونوں نے حجر اسود کو اس کی معین جگہ میں کھڑا کر دیا اور پھر پکار کر اللہ اکبر کہا

تب ابن زبیر نے اپنی نماز ختم کی۔اس بات پر لوگوں نے بہت کانا پھوسی کی اور بعض لوگ علانیہ ناراض ہوئے مگر ہم نہیں سمجھتے کہ ابن زبیر کو ایسا کرنے سے کیا فائدہ تھا اور کیوں ایسا دھوکا دینے کی ضرورت ہوئی تھی۔حقیقت میں کوئی اور بات ہوئی ہوگی۔لوگوں نے قیاسات اس پر لگائے اور انہیں قیاسات کو بطور واقعہ کے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اپنی روایتوں میں بیان کیا بہرحال کچھ ہی ہوا خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ حجر اسود کھڑا ہوگیا۔

تعمیر حجاج بن یوسف

حتی قتل ابن الزبیر رحمه الله ودخل الحجاج مكة فكتب الى عبد الملك ابن مروان ان ابن الزبير زاد في البيت ما ليس منه واحدث فيه بابا اخر فكتب اليه عبدالملك ابن مروان ان سد بابها الغربی الذی كان فتح ابن الزبير واهدم ما كان زادفيه من الحجر واكبسها على ما كانت عليه فهذ الحجاج منها سبعة اذرع و شبدا ممايلى الحجر وبناها على اساس قريش الذی كانت استقصرت عليه و كبسهابما هدم منها وسد الباب الذی فی ظهرها وترک سا يرهالم يحرک منه شينا فكل شی فيها اليوم بناء ابن الزبير الا الجدار الذی فی الحجر فانه بناء الحجاج وسد الباب الذی فی ظهرها وما تحت عتبة الباب الشرفی الذی يدخل منه اليوم الى الارض اربعة اذرع وشبرو كل هذا بناء الحجاج والدرجة التی فی بطنها اليوم والبابان الذان عليها اليوم هما ايضامن عمل الحجاج' (كتاب اخبار مكه صفحه: ۱۴۵٬۱۴۶)

عبداللہ ابن زبیر کی حکومت مکہ میں بہت جلد ختم ہونے والی تھی اور تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ اب بناء کو بہت زیادہ قیام نہ ہوگا چنانچہ عبدالملک ابن مروان جب خلیفہ ہوا تو اس نے حجاج کو مع فوج کے عبداللہ بن زبیر کے مقابلہ کے لئے بھیجا۔اس لڑائی میں عبداللہ بن زبیر مارے گئے اور حجاج مکہ چلا آیا تب اس نے عبدالملک کو لکھا کہ کعبہ میں ابن زبیر نے ایسی چیزیں بنادی ہیں جو پہلے نہ تھیں اور ایک نیا دروازہ بھی بنایا ہے۔عبدالملک نے لکھا کہ اس دروازہ کو بند کردو اور جس قدر ابن زبیر نے زیادہ بنادیا ہے وہ سب توڑ دو چنانچہ حجاج نے چھ ذراع اور ایک بالشت کعبہ کو توڑ دیا اور قریش کی بنیاد پر وہاں دیوار بنادی اور وہ نیا دروازہ بھی بند کردیا اور باقی سب چیزیں بدستور بنی رکھی۔اب کعبہ کی جو عمارت ہے وہ ابن زبیر کی بنائی ہوئی ہے صرف وہ دیور جو حجر کی جانب ہے اور غربی دروازہ کا تیغہ اور شرقی دروازہ کی چار ذرعہ ایک بالشت اونچائی اور کعبہ کے اندر کی سیڑھی اور اس کے دونوں روشندان حجاج کے بنائے ہوئے ہیں۔

فلما فرغ الحجاج من هذا كله وفد بعد ذلک الحارث بن عبدالله ابن ربيعة المخزومی على عبدالملک ابن مروان فقال له عبد الملک ما اظن ابا خبيب يعنی ابن الزبير سمع من عائشة ما كان يزعم انه سمع منها فی امر الكعبة فقال الحارث انا سمعته من عائشة قال سمعتها تقول ماذا قال سمعتها تقول قال لی رسول الله صلى الله عليه وسلم ان قومک اسقصروا فی بناء البيت ولولا حداثة عهد قومک بالكفر اعدت فيه ماتركو منه... وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم

جعلت لها بابين موضوعين على الارض بابا شرقيا يد خل الناس منه وبابا غربيا يخرج الناس منه قال عبدالملک بن مروان انت سمعتها تقول هذا قال نعم يا امير المومنين انا سمعت هذا منها قال فجعلت ينكت منكسا بقضيت في يده ساعة طويلة ثم قال وددت والله انى تركت ابن الزبير وما تحمل من ذلک (كتاب اخبار مكه صفحه: ۱۴۶)

مؤرخ بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ ابن زبیر نے کعبہ کی تعمیر میں جو کچھ نیا بنایا تھا وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق تھا جس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے کیا تھا۔ چنانچہ حجاج جب کعبہ کو توڑ کر قریش کی تعمیر کے برابر کر چکے تو حارث ابن عبداللہ عبدالملک کے پاس گئے ان سے عبدالملک نے پوچھا کہ ابن زبیر نے کوئی بات کعبہ کی نسبت حضرت عائشہؓ سے سنی تھی۔ حارث بن عبداللہ نے کہا کہ میں نے خود حضرت عائشہؓ سے سنا ہے کہ ان سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ تیری قوم نے کعبہ کی تعمیر میں کمی کر دی۔ اگر تیری قوم کا زمانہ کفر کے زمانہ سے نیا بدلا ہوا نہ ہوتا تو جو کچھ انہوں نے چھوڑ دیا ہے میں پھر کعبہ میں ملا دیتا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اس میں دو دروازے بنا دیتا ایک شرقی دروازہ جس میں سے لوگ اندر جاتے اور غربی دروازہ جس میں سے لوگ باہر نکل جاتے۔ عبدالملک نے پوچھا کہ تم نے خود یہ بات سنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں اے امیر المومنین میں نے خود یہ بات سنی ہے۔ عبدالملک یہ سن کر ہاتھ کی لکڑی پر سر ٹیک کے بڑی دیر تک سوچ میں گئے اور پھر کہا کہ بخدا میں پسند کرتا ہوں کہ میں نے ابن زبیر کے برخلاف نہ کرتا۔

یہ زمانہ جب کہ اس حدیث کا چرچا ہوا ایسے فتنہ و فساد کا زمانہ تھا کہ روایت کی صحت پر بہت کم یقین ہوتا تھا۔ خلافت میں سخت سے سخت واقعات گزر چکے تھے۔ حضرت امام حسین کی نسبت واقعہ کربلا ہو چکا تھا' مدینہ منورہ میں قتل عام ہو چکا تھا' مکہ معظمہ میں محاربات ہو چکے تھے اور عبداللہ ابن زبیر قتل ہو چکے تھے اور ہر ایک واقعہ کے ساتھ ایک جدا فرقہ قائم ہو گیا تھا جو ایک کا طرف دار اور دوسرے کا مخالف تھا۔

بیشک ہمارا دل اور غالباً ہر ایک کا دل اس بات کو زیادہ پسند کرتا ہوگا کہ کعبہ بنائے ابراہیم پر بنایا جاتا اور دو دروازے اس میں بنانے بھی نہایت عمدہ اور مفید کام تھا مگر یہ بات کہ آنحضرت ﷺ نے ایسا فرمایا تھا اس کی صحت پر یقین نہیں ہوسکتا۔ اول تو اس معاملہ میں حضرت عائشہ کو مخاطب کرنے اور اس فعل کو جو ایام جاہلیت میں ہوا تھا خاص حضرت عائشہؓ کی قوم کا فعل قرار دینے کی کوئی وجہ نہ تھی کیونکہ وہ فعل تمام قوم قریش نے بجبوری کیا تھا جس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل تھے۔ دوسرے یہ کہ بعد فتح مکہ تمام قریش اسلام لے آئے تھے اور رسول خدا ﷺ کے ادنیٰ اشارے پر جان دینے کو موجود تھے۔ خانہ کعبہ کے تمام بتوں کو جن کی پرستش ان کے باپ دادا نے صدہا سال تک کی تھی توڑ ڈالا تھا اور نکال کر پھینک دیا تھا۔ پس کعبہ کو بڑا کر دینے اور حضرت ابراہیم کی بنیاد پر پورا بنا دینے میں کونسی مشکل تھی جو آنحضرت ﷺ فرماتے "**لولا حد اثة عهد قومک بالكفر اعدت فيه ماتر كوا منه**" پس یہ حدیث کسی طرح صحیح اور قابل وثوق نہیں ہوسکتی بلکہ اس بات سے کہ رسول خدا ﷺ نے بناء ابراہیم سے جس قدر زمین خانہ کعبہ کی تعمیر سے خارج رہ گئی تھی اس کی کچھ پرواہ نہ فرمائی' ثابت ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کی کوئی خاص وضع یا اس کے لئے کوئی خاص قطع مقصود اور مدار علیہ نہ تھی بلکہ صرف وہ ایک مسجد تھی جو حضرت ابراہیم نے بنائی تھی جب وہ ڈھ گئی اور دوبارہ بنائی گئی تو جس طرح سے بن گئی بن گئی۔ یہ کچھ ضرور نہ تھا کہ بعد بن جانے کے خواہ مخواہ پھر توڑ کر اسی قدر بنائی جاتی کہ حضرت ابراہیم نے

بنائی تھی جیسے کہ عبدالملک ابن مروان نے اپنی نادانی یا حضرت عبداللہ بن زبیر کی عداوت سے اس بنی ہوئی عمارت کو پھر توڑ کر ویسا ہی کر دیا جیسا قریش نے ایام جاہلیت میں بنایا تھا۔

غلاف کعبہ

"وکان هو (ای اسعد الحمیری وهو تبع) اول من کسا الکعبة... اری فی النوم انه یکسوها فکساها الا نطاع ثم ا ری ان یکسوها فکسوها الوصایل یثا ب حیرة من عصب الیمن وجعل لها بابا یغلق (کتاب اخبار مکه صفحه: ۱۷۳' ۱۷۴)

حضرت ابراہیم کے وقت میں اور اس کے بعد کعبہ کی دیواریں ویسی ہی دکھائی دیتی تھیں جیسی کہ بنی تھیں مگر سنہ عیسوی سے چھ سو برس پیشتر اسعد حمیری نے کعبہ کی دیواروں پر غلاف چڑھایا اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ کعبہ کو کپڑا پہنا رہا ہے۔ جب جاگا تو اس نے انطاع کا غلاف چڑھایا مگر پھر اس نے وہی خواب دیکھا۔ تب اس نے یمن کے کپڑے کا جو عمدہ ہوتا تھا غلاف چڑھا دیا تب سے کعبہ پر غلاف چڑھانے کی رسم جاری ہو گئی اور جس کے قبضہ اقتدار میں کعبہ رہتا آیا' وہ ہر سال پرانے غلاف پر نیا چڑھاتا گیا اور اس سبب سے مختلف قسم کا بہت سا کپڑا کعبہ کی دیواروں پر چڑھ گیا تھا اور اسی تو بر تو کپڑے کے سبب کئی دفعہ آگ لگ گئی تھی اور خانہ کعبہ جل گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن زبیر کے وقت تک پرانے غلاف پر نیا غلاف چڑھانے کا دستور تھا اور اسی سبب سے ان کے عہد میں بھی کعبہ میں آگ لگ گئی تھی۔ اس کے بعد سے پرانے غلاف پر نیا غلاف چڑھانے کی رسم جاتی رہی بلکہ ہر سال پرانا غلاف اتار کر نیا غلاف چڑھایا جاتا ہے اور کعبہ کے خادم پرانے غلاف کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بطور تبرک کے تقسیم کرتے ہیں اور حاجی ان ٹکڑوں کو نہایت شوق سے لاتے ہیں اور اس میں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر اپنے دوستوں کو دیتے ہیں۔ اکثر مسلمان جن کے پاس یہ ٹکڑے ہوتے ہیں اپنے ساتھ کفن میں رکھ کر قبر میں لے جاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس کی برکت سے عذاب سے بچ جائیں گے مگر مسلمانوں کے یہ سب اوہام وخیالات ہیں۔ مذہب اسلام ایسی باتوں سے جو کچے سوت سے بھی زیادہ بودی ہیں پاک وصاف ہے۔ مذہب اسلام سے نہ یہ بات پائی جاتی ہے کہ غلاف کعبہ کچھ متبرک ہو جاتا ہے نہ یہ پایا جاتا ہے کہ اس کے قبر میں ساتھ لے جانے سے بجز اس کے کہ وہ بھی مثل جسم وکفن کے خاک ہو جائے اور کچھ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اسلام کی رو سے اگر کچھ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے تو صرف اعتقاد وتوحید سے ہو سکتا ہے نہ کسی اور چیز سے۔

کسا البیت فی الجاهلیة الانطاع ثم کساه النبی صلی الله علیه وسلم الثیاب الیمانیة ثم کساه عمر و عثمان القباطی ثم کساه الحجاج الدیباج ویقال اول من کساه الدیباج یزید من معاویه ویقال ابن الزبیر ویقال عبد الملک بن مروان' (کتاب اخبار صفحه: ۱۷۶)

اس میں کچھ کلام نہیں ہو سکتا کہ زمانہ اسلام میں بھی کعبہ پر غلاف چڑھائے گئے۔ اگرچہ کتابوں میں روایتیں ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اور ان کے بعد ابوبکر صدیق وعمر وعثمانؓ نے بھی کعبہ پر غلاف چڑھایا مگر ہم کو جہاں تک شبہ ہے وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کی نسبت شبہ ہے کیونکہ جو روایتیں اس باب میں ہیں وہ درجہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں باایں ہمہ ان کے تسلیم کر لینے میں کچھ زیادہ بحث نہیں ہے غرض کہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یمن کے

کپڑے کا جو نہایت عمدہ ہوتا تھا کعبہ کو غلاف چڑھایا اور عمرؓ وعثمانؓ نے قباطی کپڑے کا غلاف چڑھایا پھر دیباج کے کپڑے کا غلاف چڑھایا گیا۔ بعضوں کا قول ہے کہ دیباج کا غلاف سب سے اول یزید بن معاویہ نے چڑھایا تھا' بعض کہتے ہیں کہ عبدالملک ابن مروان نے' بعض کہتے ہیں کہ حجاج بن یوسف نے ۔ غرض یہ کہ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ تمام خلفائے بنی امیہ اور عباسیہ ودیگر خلفاء کے عہد میں خانہ کعبہ پر غلاف چڑھانے کا بڑا اہتمام رہا اور سب چڑھاتے رہے۔ زمانہ حال میں سلطان روم کی جانب سے نہایت عظیم وشان سے بہت عمدہ غلاف سیاہ رنگ کا جس پر بعض آیات قرآنی نہایت خوشخط بناوٹ میں بنی ہوئی ہوتی ہیں چڑھایا جاتا ہے۔

اسلام کی رو سے جو کچھ بحث اس پر ہوسکتی ہے وہ اس قدر ہوسکتی ہے کہ **"ما هذا التعبد الكعبة اولتحسينها فالا ول كفر على مذهب الاسلام والثانى امرلا باس به"** یعنی یہ کام کس ارادہ سے کیا جاتا ہے کعبہ کی پرستش کے لئے یا اس کی خوبصورتی اور آرائش کے لئے۔ اگر پہلی نیت سے کیا جاتا ہے تو اسلام کی رو سے کفر ہے اور اگر دوسرے ارادہ سے کیا جاتا ہے تو اس کا کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

آرائش کعبہ کی ایسی ہی ہے جیسی کہ ہم اور تمام مسجدوں کی آرائش کرتے ہیں مگر چونکہ کعبہ ایک نہایت قدیم مسجد ہے اور ایسے بانی اسلام کے ہاتھ سے بنی ہے جس نے سب سے اول یہ کہا کہ **"لا احب الا فلين' انى وجهت وجهى للذى فطر السموات والارض حنيفاً وما انا من المشركين"** اس لئے اس کی قدر ہم کو بہ نسبت اور مسجدوں کے زیادہ کرنی ضرور ہے کیونکہ سب سے پہلی خدا کی پرستش کی نشانی ہے۔

اصنام کعبہ

اساف' نائلہ: بنی جرہم کے زمانہ میں صفا ومروہ کے پہاڑوں پر دو بت رکھے گئے۔ صفا پر جو بت تھا وہ مرد کی شکل تھا اور اساف اس کو کہتے تھے دوسرا بت جو مروہ پر تھا وہ عورت کی شکل کا تھا اور نائلہ اس کو کہتے تھے جو روایتیں حقارت آمیز ان کی نسبت پائی جاتی ہیں وہ قدیم نہیں ہیں غالباً اسلام کے زمانہ کی بنائی ہوئی ہیں۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں انسان تھے اور بنی جرہم ان کو دیوتا سمجھتے تھے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے دو بت بنائے گئے اور پرستش ہونے لگی۔ فتح مکہ کے روز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اور بتوں کے ساتھ توڑ ڈالا۔

نہیک ومطعم: یہ بھی دو بت تھے نہیک کو صفا پر نصب کیا گیا تھا اور مطعم کو مروہ پر۔

ہبل: یہ ایک بت بڑا بہت خانہ کعبہ کے اندر تھا۔ کعبہ کے اندر دائیں طرف جو خزانہ کا کنواں تین ذرعہ گہرا حضرت ابراہیمؑ کا کھودا ہوا تھا' اس پر یہ بت کھڑا کیا گیا تھا۔ عمرو بن لحی اس کو ارض جزیرہ سے لایا تھا۔ احد کی لڑائی میں ابوسفیان نے فتح ہونے کے لئے اسی بت سے مدد چاہی تھی۔

مناۃ: یہ بھی بڑا بت تھا اور سمندر کے کنارہ پر قدید کے پاس عمرو بن لحی نے نصب کیا تھا اور یہ دونوں بت قبیلہ ازد وغسان کے کہلاتے تھے اور بعضوں کا قول ہے کہ اوس وخزرج وغسان کے کہلاتے تھے جو ازد کی شاخیں ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ وہ صرف قبیلہ

ہذیل کا ایک پتھر تھا اور کچھ عجب نہیں کہ وہ بن گھڑا ایک لمبا پتھر ہو۔

لات وعزیٰ: لات ایک بن گھڑا پتھر تھا جس میں لوگ خیال کرتے تھے کہ شان باری کے کرشمہ نے حلول کیا ہے اور عزیٰ تین درخت تھے جس میں ذات باری کا حلول سمجھ کر پوجتے تھے جیسے کہ ہمارے زمانہ میں بھی بہت سے مسلمان اسی طرح پر درختوں کی جو درگاہوں میں ہوتے ہیں پرستش کرتے ہیں۔ ہمارے شہر دہلی میں کبھی شاہ بولا کی بڑ پر بھی منتوں کے ناڑے باندھے جاتے تھے۔ لات تہامہ میں تھا اور عزیٰ طائف میں۔

ذات انواط: یہ بھی ایک بہت بڑا سرسبز وشاداب درخت حنین میں تھا جس کو لوگ پوجتے تھے۔

ذوالکفین: یہ بھی ایک بت تھا جس کو عمر بن حممہ نے بعد فتح مکہ جلایا تھا۔

سواع: یہ ایک مشہور بت قبیلہ ہذیل کا جس کو عمرو بن العاص نے بعد فتح مکہ کے آنحضرت ﷺ کے حکم سے توڑا تھا۔

ود: ایک بت بنی کلب کا دومۃ الجندل میں تھا۔

یغوث: پہلے اس کو بنی مراد پوجتے تھے پھر بنی عطیف پوجنے لگے۔

یعوق: بنی ہمدان میں تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔

نسر: بنی حمیر آل ذی الکلاع کے پوجنے کا بت تھا۔

علاوہ ان بتوں کے مشہور روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ بت بنے ہوئے تھے اور نہایت استحکام کے ساتھ سیسہ سے جڑ کر کھڑے کئے تھے جو فتح مکہ کے دن سب توڑ ڈالے گئے۔

تصاویر خانہ کعبہ

ادرک (ای عطا ابن ابی رباح) فیھا (ای فی البیت) تمثال مریم مزوقا فی حجرھا عیسیٰ ابنھا قاعد امزوقا " (کتاب اخبار مکہ صفحہ: ۱۲۰)

خانہ کعبہ میں فرشتوں کی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اور حضرت مریم کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گود میں لئے ہوئے تصویریں تھیں۔ غالباً حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر باقوم نے بنائی ہوگی جب کہ اس نے قریش کے زمانہ میں کعبہ بنایا تھا۔ جب رسول خدا ﷺ کعبہ میں داخل ہوئے تو آپ نے حضرت ابراہیمؑ کی تصویر کو دیکھ کر فرمایا کہ خدا ان کو مارے ابراہیمؑ کو تیروں سے شگون لیتا اور فال دیکھتا بنایا ہے۔ پھر آنحضرت ﷺ نے حضرت مریم ؓ کی تصویر پر ہاتھ رکھ لیا اور فرمایا کہ سب تصویروں کو مٹا دو مگر مریم کی تصویر کو چھوڑ دو۔ اگر یہ واقعات صحت کو پہنچیں تو اس کی وجہ صاف پائی جاتی ہے۔ فرشتوں کی کوئی صورت نہیں ہے۔ پس ان کی تصویر بنانا محض جھوٹ اور خلاف واقع تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر ایسے فعل کی حالت کی بنائی تھی جو شرک میں داخل ہے اور بلاشبہ حضرت ابراہیمؑ اس سے پاک تھے صرف مریم اور حضرت عیسیٰ ؑ کی تصویر ایسی تھی جس میں کوئی

اشارہ کفریا شکریا کذب کا نہ تھا اور نہ وہ پرستش کے لئے بنائی گئی تھی اس کے چھوڑ دینے میں کچھ ہرج نہ تھا۔

زمزم

جب سے کعبہ کا نام ہے اسی کے ساتھ اس چشمہ کا نام بھی چلا آتا ہے بلکہ یہی چشمہ مکہ کی آبادی اور کعبہ کے اس جگہ بننے کا سبب ہے اگر چہ یہ چشمہ مدت سے خشک ہوگیا ہے مگر اس کی جگہ ایک کنواں کھود گیا ہے جو چاہ زمزم کے نام سے مشہور ہے۔

عرب کی سرزمین نہایت خشک ہے یا پہاڑ ہیں یا ریگستان ہے۔ برسات وہاں بہت کم ہوتی ہے۔ کوئی دریا اس میں نہیں بہتا۔ اس سبب سے پانی کی بہت قلت ہے۔ کہیں کہیں جنگلوں میں یا پہاڑوں کی تلیوں میں یا پہاڑ کے اونچے غاروں میں پانی جمع ہو جاتا ہے اور لوگ پانی کی تلاش میں پھرتے ہیں جہاں پانی مل گیا وہیں خیمے تان دئے اور آباد ہو گئے۔ جب وہاں کا پانی خشک ہو گیا وہاں سے چل دیئے اور دوسری جگہ جہاں پانی مل گیا ڈیرے ڈال دیئے۔ یہی طریقہ قدیم سے عرب کے صحرا نشین بدوؤں کا تھا۔

اونچے مقاموں میں جو پانی جمع ہو جاتا تھا اور زمین یا پہاڑوں کے نیچے نیچے سوتوں کی راہ سے پانی کو نکلنے کا کوئی رستہ مل جاتا تھا تو اپنے مخزن سے دور جا کر بطور چشمہ کے نکل آتا تھا مگر ایسی ایسی سوتیں ایسی ضعیف ہوتی تھیں کہ سطح سے اگر تھوڑے نیچے بھی ہوں تو معلوم نہیں ہوتی تھیں اور اگر کہیں کھل بھی جاتی تھیں تو تھوڑی سی چیز کے پڑ جانے سے ڈھک جاتی تھیں حال کے زمانہ میں بھی بدو اسی طرح کے پانی کی سوتوں کو تھوڑے سے کنکر پتھر کانٹوں کے ڈالنے سے اس طرح پر چھپا دیتے ہیں کہ کسی کو اس کا نشان نہیں ملتا۔

زمزم کی نسبت ایسی ایسی دوراز کار روایتیں مشہور ہیں جن میں سے ایک بھی معتبر اور مذہب اسلام کے بموجب صحیح نہیں ہے جتنا کہ یہ چشمہ پرانا ہے اسی قدر تقدس آمیز اور تعجب خیز مبالغہ سے وہ روایتیں بنائی گئی ہیں۔ اصلیت اس چشمہ کی صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ جب حضرت ہاجرہ زوجہ حضرت ابراہیم مع اپنے بیٹے اسمٰعیل کے بسبب اس نزاع اور حسد کے جو قدرتی ایک شوہر کی دو بیویوں میں ہوتی ہے سر بصحرا نکال دی گئیں اور یہاں پہنچیں تو پانی جو ان کے پاس تھا ختم ہو چکا۔ پیاس کی شدت ہوئی۔ بسبب نہ ملنے پانی کے مایوسی طاری ہوئی۔ اس گھبراہٹ میں ہر چہار طرف پانی کی تلاش کرتی تھیں۔ اسی جستجو میں اتفاقاً کنکروں اور پتھروں کے نیچے پانی کا نشان معلوم ہوا اور انکے ہٹانے سے پانی نکل آیا۔ انہوں نے اس تائید غیبی پر خدا کا شکر ادا کیا اور وہ اور ان کے بیٹے پانی پی کر سیراب ہوئے۔

جس طرح کہ عرب کے چشمے چند مدت تک جاری رہتے تھے اور پھر خشک ہو جاتے تھے اسی طرح یہ چشمہ بھی کسی مدت کے بعد خشک ہو گیا اور کسی کو اس کی طرف خیال بھی نہیں رہا اور سینکڑوں برس اس پر گزر گئے مگر عام الفیل کے بعد عبدالمطلب جد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال ہوا کہ جہاں وہ چشمہ تھا وہاں کنواں کھود کر پانی نکالا جائے۔ چنانچہ انہوں نے کھودنا شروع کیا۔ اس پر بعض لوگ مانع ہوئے اور فساد پر آمادہ ہوئے مگر کسی نہ کسی طرح وہ فساد درفع ہوا اور عبدالمطلب اپنے مقصد پر کامیاب ہوئے۔ جو قصے کتابوں میں اس کنوئیں کی نسبت اور عبدالمطلب کو اس خاص مقام دریافت ہونے کی نسبت لکھے ہیں ان میں سے کسی کی کچھ صحت نہیں ہے۔ کچھ عجیب نہیں ہے کہ انہوں نے خواب میں دیکھا ہو کہ کنواں کھودتا ہوں اور اس سبب سے کنواں کھودنے کا خیال پیدا ہوا ہو۔ یہ کنواں پہاڑ میں کھودا گیا ہے۔ جس میں سے سوتیں مشکل سے نکلتی ہیں چنانچہ اس میں صرف تین سوتیں نکلی تھیں، سنہ ۲۲۳، ۲۲۴ھ میں اس کا پانی خشک ہو گیا تھا اس لئے دو ذرعہ اور کھودا گیا تھا مگر سنہ ۲۲۵ھ میں کثرت سے بارش ہوئی اور اس سبب سے

کنوئیں میں بہت سا پانی ہوگیا۔

خلافت ہارون رشید میں بھی یہ کنواں بسبب کمی پانی کے قریب دو ذرعہ گہرا کیا گیا تھا اور مہدی اور محمد بن الرشید کی خلافت میں بھی گہرا ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسا کہ تمام کنوؤں کا حال ہے ویسا ہی اس کا بھی حال ہے اور تمام عجائب اور غرائب روایتیں جو اس کے پانی کے قبل قیامت نہ سوکھنے کی ہیں وہ سب موضوع ہیں جن کی کچھ بھی اصلیت اسلام میں نہیں۔

زمزم کا کنواں اس وجہ سے کہ ہمارے آنحضرت ﷺ کے وقت کا ہے جس میں سے آنحضرت ﷺ نے بھی پانی پیا ہے بلاشبہ قابل ادب اور عزت کے ہے لیکن اس کے پانی کے فضائل میں جو روایتیں ہیں وہ سب بے سند اور ضعیف ہیں اور اکثر موضوع۔ حاجی جو زمزم کا پانی چھوٹی چھوٹی زمزمیوں میں بھر کر بطور تبرک کے ہندوؤں کی مانند دور لے جاتے ہیں اور سب لوگ بطور تبرک کے اس کو رکھتے ہیں اس پانی کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور بغیر اظہار ادب کھڑے ہو کر پیتے ہیں۔ اس کی کچھ اصل مذہب اسلام میں نہیں ہے۔ جیسے اور کنوؤں کا پانی ہے وہ بھی ویسا ہی کنوئیں کا پانی ہے مزہ میں میٹھا نہیں ہے بلکہ کل ملا تا ہے۔ جس وقت کھینچیں اگر اسی وقت پی لیں تو شاید پینے کے قابل ہو الا رکھا رہنے سے زیادہ کل ملا ہو جاتا ہے۔

اسماء کعبہ

کعبہ کا اصلی نام بیت اللہ ہے یعنی خانہ خدا۔ یہ ایک نہایت قدیم طریقہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے جاری تھا کہ جہاں وہ کوئی نشان خدا کی عبادت کے لئے قائم کرتے تھے اس کو ''بیت الامال'' یعنی خانہ خدا کہتے تھے مگر جو کہ وہ عمارت جو حضرت اسمٰعیلؑ نے بنائی تھی بشکل مکعب تعمیر ہوئی تھی اس لئے کعبہ کے نام سے مشہور ہوگئی۔

کعبہ کا نام بیت عتیق اور مکہ و بکہ و ام القریٰ بھی آیا ہے۔ پچھلے تینوں نام تغلیباً کعبہ پر اطلاق ہوتے ہیں ورنہ وہ تمام حرم یا شہر پر صادق آتے ہیں۔

کتابوں میں کعبہ کے اور نام بھی لکھے ہیں ''ام ارحم' الباسہ' الحاطمہ' مگر یہ سب وہ نام ہیں جو لوگوں نے بعض صفات کے خیال سے گھڑ لئے ہیں۔

عمال کعبہ

جس وقت کعبہ بنایا گیا اس وقت وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے قبضہ میں بطور تولیت کے رہا اور ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد اس مقدس مسجد کی سب سے بڑی محافظ تھی۔ مگر بنی اسمٰعیل اور بنی جرہم میں نہایت قریب قرابت تھی اور حضرت اسمٰعیل کی اولاد بجز قیدار کے عرب کے مختلف مقامات میں جا بسی تھی اس وجہ سے خدا کے گھر کی حفاظت اسمٰعیلؑ کی اولاد سے نکل کر بنی جرہم کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ ایک مدت دراز کے بعد بنی عمالیق جو حمیر کے خاندان سے تھے اس پر غالب آ گئے تھے اور خانہ خدا کے مالک مطلق ہوگئے تھے۔ اس موقع پر بنی اسمٰعیل اور بنی جرہم آپس میں متفق ہوئے اور عمالیق کو خانہ خدا سے بے دخل کر دیا اور پھر دوسری مرتبہ بنی جرہم اس مقدس معبد کے مالک ہوگئے۔

پھر بنی بکر اور بنو خزاعہ بنی جرہم کے مقابلہ کو کھڑے ہوئے اور دونوں نے اپنی اپنی فوجوں کو جمع کر کے دفعتہً بنی جرہم پر حملہ کیا اور

بہت بڑی سخت لڑائی کے بعد بنی جرہم بالکل مغلوب ہو گئے اور بھاگ گئے اور حفاظت اس معبد کی بنی خزعہ کے پاس آ گئی۔ پہلا شخص جس نے کہ مکہ کی حفاظت مکہ کی حکومت اور کعبہ کا انتظام اپنے ذمہ لیا عمرو بن الحی تھا یہ وہ شخص ہے جس نے سب سے اول کعبہ کے اندر ہبل بت کو کھڑا کیا تھا۔

چند مدت بعد قصی ابن کنانہ نے جو اجداد رسول اللہ ﷺ سے ہیں بنو بکر اور بنو خزعہ پر چڑھائی کی۔ خوب مقابلہ ہوا مگر ان قوموں کو شکست ہوئی اور قصی نے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ پشت اوپر تھا حکومت مکہ اور تولیت کعبہ کی ان سے چھین لی اور خود حاکم اعلیٰ ہو گیا اور اب قریش کعبہ کی ہر ایک بات کے مالک ہو گئے۔

قصی کے بعد عبدالدار ان کا بیٹا ان کی جگہ سردار ہو گیا اور جو خاص خاص عہدے خود عبدالدار سے متعلق تھے وہ ان کے بھائی عبد مناف کو مل گئے۔

کعبہ کے متعلق پانچ بڑی خدمتیں تھیں۔

اول: **سقیا و رفادہ** یعنی حاجیوں کو پانی اور کھانا دینے کا عہدہ۔

دوم: **قیادہ** یعنی لڑائی کے وقت فوج کی سپہ سالاری کرنا۔

سوم: **لوا** یعنی علم بردار ہونے کا عہدہ۔

چہارم: **حجاب** یعنی کعبہ کی حفاظت کا عہدہ۔

پنجم: **دول الندوہ** یعنی دارالندوہ میں پریسیڈنٹ یا صدر انجمن ہونے کا استحقاق۔

عبد مناف کی وفات کے بعد ان کے وارثوں میں ایک خاندانی نزاع پیدا ہوا جس کی وجہ سے ان عہدوں کی تقسیم ان طرح پر ہو گئی۔

ہاشم کو سقیا اور رفادہ کا عہدہ ملا۔

عبدالدار کے بیٹے شیبہ نے کعبہ کی حفاظت اور دارالندوہ کی صدر انجمنی اور علم بردار ہونے کا عہدہ اپنے قبضہ میں رکھا۔

ہاشم نے بڑی فیاضی اور سرچشمی و دریا دلی کے ساتھ حاجیوں کی خبر گیری کی خدمت ادا کی۔ چنانچہ سر ولیم میور تسلیم کرتے ہیں کہ ہاشم نے جو اس طرح پر حاجیوں کی تواضع کے لئے مامور کیا گیا تھا شاہانہ عظمت کے ساتھ اس کو ادا کیا۔ خود ان کے پاس بڑی دولت تھی۔ قریش کے بہت سے آدمیوں نے تجارت کے ذریعہ سے بہت سی دولت جمع کی تھی۔ ہاشم نے مثل قصی اپنے دادا کے قوم قریش سے التجا کی کہ تم خدا کے ہمسایہ اور اس کے گھر کے محافظ ہو۔ جو حاجی اس کے مکان کی تقدس کی تعظیم کرنے کو آتے ہیں وہ اس کے مہمان ہیں اور یہ مناسب ہے کہ سب سے پہلے ان مہمانوں کی خاطر تواضع کرو تم کو خاص خدا نے منتخب کیا ہے اور اس بڑے رتبہ کے ساتھ تم معزز ہو پس خدا کے مہمانوں کی تعظیم کرو اور ان کو ترو تازہ کر دو۔ کیونکہ وہ نہایت دور دراز شہروں سے اپنے لاغر اور خراب و خستہ اونٹوں پر سوار ہو کر تمہارے پاس نہایت تھکے ہوئے اور پریشاں آتے ہیں۔ ان کے بال بکھرے ہوئے ان کا جسم دور دراز کے رستہ سے گرد و غبار میں آلودہ ہوتا ہے پس تم مہمان نوازی کے ساتھ ان کی دعوت کرو ان ان کو بہت سا پانی دو۔

ہاشم نے اپنے پاس سے بہت سا روپیہ خرچ کر کے ایک عمدہ نظیر قائم کی اور تمام قریش نے بھی نہایت مستعدی سے مدد کی اور ہر ایک شخص نے اپنے مقدور کے موافق چندہ دیا اور تمام قوم قریش پر ایک معین محصول لگایا اور حاجیوں کے جم غفیر کے لئے حوضوں میں

کافی پانی کعبہ کے قریب کنوئیں سے بھروایا اور عرفات کے رستہ میں چمڑے کے عارضی حوض بنائے۔ جب کہ حاجی منیٰ اور عرفات کو روانہ ہوتے تھے اس روز کھانا تقسیم ہونا شروع ہوتا تھا اور جب تک وہ ہجوم منتشر نہ ہوتا تھا اس وقت تک برابر کھانا تقسیم ہوتا رہتا تھا غرض کہ پانچ چھ روز تک گوشت اور روٹی اور مکھن اور جو سے جو مختلف طور پر پکائے جاتے تھے اور چھواروں سے جو عرب کا نہایت عمدہ اور پسندیدہ کھانا ہے ان کی تواضع ہوتی رہتی تھی اس طرح پر ہاشم نے مکہ کی نام آوری کو بخوبی قائم رکھا مگر خود ہاشم کا نام ایک بہت اعلیٰ درجہ کی خیرات سے اور بھی زیادہ مشہور ہو گیا اور جس نام آوری سے اہل وطن کی بہت سی ضرورتوں کو رفع کیا جو مدت دراز کے قحط کے سبب سے نہایت تنگ آ گئے تھے یعنی ہاشم نے ملک شام کا سفر اختیار کیا اور وہاں بہت بڑا ذخیرہ روٹیوں کا خرید کیا اور ان کو ٹوکروں میں بھر کر اور اونٹوں پر لاد کر مکہ کو لائے اور وہاں اونٹ ذبح کیے گئے اور بھونے گئے اور تمام لوگوں نے کھانا تقسیم کیا گیا فاقہ زدگی اور گریہ وزاری دفعتہً خوشی اور افراط سے مبدل ہو گئی اور گویا قحط کے بعد ان کو ایک نئے سرے سے زندگی حاصل ہو گئی۔

ہاشم کے بعد مطلب کو سقایا ورفادہ کی خدمت ملی اور ان کے بعد عبدالمطلب ابن ہاشم کے پاس وہ خدمت آئی اور انہی کے عہد میں ابرہۃ الاشرم نے جو اصحاب الفیل کہلاتا ہے کعبہ کے ڈھانے کے قصد سے فوج کشی کی تھی۔ عبدالمطلب کے بعد یہ خدمت زبیر بن عبدالمطلب کو پہنچی مگر ان سے بخوبی کام نہ چلا تو انہوں نے ابو طالب اپنے بھائی کو وہ خدمت دے دی اور انہوں نے بھی خیال کیا کہ یہ کام نہایت مشکل ہے اور اس میں بہت خرچ کرنا پڑتا ہے اس لئے انہوں نے اپنے بھائی عباس کے سپرد کر دی لیکن حضرت عباس کو اس قدر مقدور نہ تھا کہ وہ عہدہ سقایا ورفادہ کا کام خوبی اور شہرت سے انجام دے سکتے اس لئے یہ عہدے ان کے خاندان سے منتقل ہو کر عبد مناف کی دوسری شاخ میں چلے گئے۔

واقعہ اصحاب فیل

مکہ کے واقعات میں یہ بھی ایک بہت بڑے واقعات میں گنا جاتا ہے۔ اس کا واقعہ عظیم متصور ہونا اس وجہ سے ہے کہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے اس کا ذکر فرمایا ہے اور نہ اس وجہ سے ہے کہ درحقیقت ایک ایسا عظیم واقعہ ہے کہ مثل اس کے کبھی نہ ہوا ہو بلکہ اس کی عظمت صرف ہمارے مفسروں اور جھوٹی روایتوں کے بنانے والوں کی بدولت ہے جنہوں نے سیدھے سیدھے واقعہ کو ایک عجیب گھڑت اور الف لیلیٰ کے قصوں سے عجیب تر قصہ کر کے بیان کیا ہے۔

منش کردہ ام رستم داستاں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

میں اپنے اس خطبہ میں ان لغو اور بیہودہ روایتوں پر اور قرآن مجید کے غلط معنی بیان کرنے پر جو مفسرین نے اس قصہ کی بابت بیان کیے ہیں بحث کرنا نہیں چاہتا جس میں ایک لمبا جداگانہ مباحثہ ہے مگر جو واقعہ کہ گزرا اس کو صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیتا ہوں۔

کتابوں میں مذکور ہے کہ اصحاب فیل سے پہلے تبع نے تین دفعہ کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا مگر ظلمت و آفت میں گرفتار ہوئے وہ قصے چنداں مشہور نہیں ہیں۔ مشہور قصہ اصحاب فیل کا ہے ابرہۃ الاشرم جو ایک عیسائی حاکم یمن کا تھا اس نے صنعاء یمن میں قریب غمدان کے ایک عظیم الشان کنیسہ یعنی گرجا بنایا تھا اور قلیس اس کا نام رکھا تھا اور یہ بات چاہی کہ لوگ کعبہ کا حج چھوڑ دیں اور اس

کنیسہ کا حج کیا کریں اور اس لئے اس نے کعبہ کے ڈھانے کا ارادہ کیا اور معہ فوج کے اور چند ہاتھیوں کے روانہ ہوا اور مغمس میں اترا۔اس وقت قریش اور کنانہ اور خزاعہ اور ہذیل سب لڑنے کو تیار ہوئے مگر انہوں نے ابرہتہ الاشرم سے مقابلہ کرنے کی طاقت اپنے میں نہیں پائی ابرہتہ الاشرم نے کہلا بھیجا کہ مجھ سے تم سے جدال وقتال منظور نہیں ہے بلکہ صرف کعبہ ڈھانا مقصود ہے۔اس گفتگو میں چندروز گزر رے اور اسی درمیان میں ابرہہ کے لشکر میں چیچک کی وباء پھیلی جو اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔تمام لشکر برباد ہوگیا۔ بہت سے مرگئے اور بہت سے اسی حالت میں پھر گئے۔خدا تعالیٰ نے ان پر ایسی آفت ڈالی کہ جو بدارادہ انہوں نے کیا تھا اس پر کامیاب نہیں ہوئے۔

اسی سال میں آنحضرت ﷺ پیدا ہو چکے تھے جو اس بے نظیر اصلاح کا ذریعہ ہونے والے تھے جو قیامت تک بے نظیر رہے گی۔عبدالمطلب اور ابو طالب ان کی پرورش میں مصروف تھے جب آنحضرت ﷺ کا سن شریف اس حد کو پہنچا جس میں اس منصب کے ادا کرنے کا وقت منحصر تھا جس کے لئے آنحضرت پیدا ہوئے تھے تب آپ نے اپنے فطرتی منصب نبوت کو اختیار کیا اور خدائے واحد کی پرستش کا وعظ فرمانا شروع کیا اور بوجہ ان مصائب کے جو اس کام میں پیش آئے وطن چھوڑنا اور مکہ سے مدینہ کو ہجرت کرنا پڑا۔مکہ اب اپنے تئیں محفوظ سمجھتا تھا اور خوشی اور اطمینان کے ساتھ اپنے بتوں کی پرستش میں مشغول تھا کہ دفعتہً آنحضرت ﷺ نے اس کا محاصرہ کیا اور بغیر کسی مزاحمت کے اس کو فتح کرلیا'اس کے بتوں کو توڑا اور پھر خدائے واحد کی پرستش کو قائم کیا جو قیامت تک محمد ﷺ کے نام نامی کے ساتھ قائم رہے گی۔

☆☆☆

الخطبة التاسعة

فی

حَسبہٖ وَنَسبہٖ عَلَیہِ الصَّلٰوۃَ وَالسَّلام انّ اللّٰہ اصطَفٰی اٰدَمَ وَ نوح وَاٰل ابراھِیمَ و اٰل عمران علی العَالِمین

عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں نہایت اکھڑ گنوار جاہل بن لکھے اور بن پڑھے تھے۔علم ادب بھی جس کوٹھیک ٹھیک علم ادب کہتے ہیں ان میں نہ تھا اور نہ اور کسی فن کو اچھی طرح جانتے تھے وہاں دو باتیں ان میں بے مثل تھیں۔ ایک نہایت مؤثر اور پر مطلب گنواری فصاحت جو بالتخصیص دہقانیوں میں پائی جاتی تھی اور اس سبب سے اس کے مضامین طبعی جوشوں پر مبنی ہوتے تھے اور دلوں پر زیادہ اثر کرتے تھے۔ دوسرے بے مثل اور بے نظیر حافظہ۔ اگر چہ بن لکھے پڑھوں کا حافظہ ہمیشہ قوی ہوتا ہے مگر عرب والوں کا حافظہ بہت قوی تھا۔ اسی قوی حافظہ کے سبب وہ اپنی قوموں کی تمام نسلوں کو یاد رکھتے تھے اور نسلوں کے یاد رکھنے کو نہایت فخر سمجھتے تھے جو رفتہ رفتہ ایک علم ہوگیا اور علم الانساب اس کا نام پڑ گیا۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ اپنے نسب پر بہت فخر کرتے تھے اور ہر موقع پر اس کا ذکر کرنے اور اس پر شیخی بگھارنے سے نہ چوکتے تھے اور اس سبب سے ان کو صرف اپنا ہی نسب نامہ یاد رکھنا کافی نہ تھا بلکہ اپنے مخالفوں اور رقیبوں اور ہمسایوں کا نسب نامہ بھی یاد رکھنا ضروری ہوتا تھا تا کہ اپنی شیخی کے سامنے دوسرے کی شیخی نہ چلنے دیں۔ لکھنا ان کو آتا نہ تھا اس لئے ان کے نسب نامے لکھے ہوئے نہ تھے۔ جہاں تک یاد تھی یا جو باتیں یاد رکھنے کے قابل تھیں وہ سب بر زبان یاد تھیں ان کا حافظہ ہی ان کے لئے لوح محفوظ تھا۔ حافظہ کیسا ہی قوی ہو مگر تمام پشتوں کا ترتیب یاد رکھنا ایک غیر ممکن بات تھی۔ اس سبب سے بڑے بڑے جلیل القدر اور مشہور ومعروف اشخاص کے نام تو یاد رہتے باقی لوگوں کے نام جس قدر یاد رہ سکتے تھے اس قدر رہتے تھے۔ ان مشہور آدمیوں کے نام یاد رہنے کا یہ بھی بڑا سبب تھا کہ ان کے نام اور ان کے حالات شعروں میں ہوتے تھے جو بڑے بڑے معرکوں اور میلوں اور لڑائیوں میں نہایت فخر کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ ان سب رسموں اور عادتوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر شخص اپنے آپ کو اور اپنے ہمسایہ اور اپنے مخالف اور رقیب کو بخوبی جانتا تھا کہ وہ کس قوم اور کس نسل کا ہے اور کسی کو ایسی جرأت اور ایسی طاقت نہ تھی کہ اپنی قوم اور نسل کو بدل سکے یا جھوٹ موٹ اپنے آپ کو کسی ایسی نسل کا جس کا درحقیقت وہ نہیں ہے کہنے لگے۔ مگر با ایں ہمہ سلسلہ وار تمام پشتوں کو بتلا دینا ہر ایک کو نام بنام مورث اعلیٰ تک گن دینا ایک غیر ممکن امر تھا اس لئے ہر شخص اپنے باپ دادا کے نام وہاں تک بیان کر سکتا تھا جہاں تک یاد ہوتے تھے۔ پھر بیچ کی پشتوں کو چھوڑ کر ان کے نام لے دیتا تھا جن کے نام اشعار میں مذکور ہوتے تھے۔ پس جس مؤرخ نے ایسے لوگوں کا پورا سلسلہ وار نسب نامہ بیان کرنا چاہا اس کو یہ سب دقتیں پیش آئیں اور یہ ایسی مشکلیں تھیں جن کا حل ہونا کچھ آسان نہ تھا۔

ایک اور مشکل عرب کے نسب ناموں میں یہ تھی کہ ایک ہی نام کے کئی کئی شخص نسب ناموں میں ہوتے تھے اور اس لئے مؤرخ دھوکے میں پڑ جاتے تھے اور پچھلے شخص کو وہ شخص سمجھ جاتے تھے جو اگلوں میں اسی نام کا کوئی گذرا ہے اور جو پشتیں ان دونوں شخصوں کے درمیان میں فی الحقیقت گزری ہیں ان کا ذکر چھوٹ جاتا تھا اور جب کہ ایک شخص کے کئی نام ہوتے تھے تو دوسری قسم کا دھوکا پڑتا تھا۔ تجنیس خطی کے سبب سے ایک ہی نام کو بعضوں نے کچھ پڑھا اور بعضوں نے کچھ۔ شام میں اور عرب میں یہ بھی دستور تھا کہ بجائے باپ کے نام کے اس شخص کا نام لے دیتے تھے جو نسب نامہ کے اشخاص میں معروف ومشہور تھا یا جس سے نسل گنی جاتی تھی۔ چنانچہ سینٹ متی حواری نے اپنی انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نسب نامہ میں لکھا ہے کہ ''کتاب نسب نامہ عیسیٰ مسیح ابن داؤد ابن ابراہیم'' حالانکہ مسیح سے داؤد تک اور داؤد سے ابراہیم تک بہت سی پشتیں ہیں مگر داؤد جو ایک مشہور نام تھا ان ہی کا بیٹا حضرت مسیح کو بتا دیا اور ابراہیم کا بیٹا داؤد کو کہہ دیا جس سے نسل چلی تھی اور بیچ کے سب نام چھوڑ دیئے۔

عرب کے لوگوں کی یہ بھی عادت تھی کہ اپنے باپ داداؤں کے ناموں کو جہاں تک ان کو یاد ہوتے تھے بیان کرتے جاتے اور جب ان کی یاد کے نام ختم ہو جاتے تھے تو آخری یاد میں رہے ہوئے شخص کو اسکا بیٹا کہہ دیتے تھے جس سے وہ نسل چلی ہے یا جب وہ ایسے شخص پر پہنچتے تھے جس کو ہر کوئی یقیناً اسی کی اولاد میں جانتا ہے جس سے نسل چلی ہے تو اس شخص کا اسی کا بیٹا کہہ دیتے تھے اور اس سبب سے مؤرخوں کو ایسے لوگوں کا سلسلہ وار نسب نامہ لکھنے میں اور بھی مشکل پڑی ہے۔

جب کہ ہم اپنے پیغمبر خدا محمد ﷺ کا نسب نامہ سلسلہ وار لکھنا چاہتے ہیں تو اس میں بھی یہ سب مشکلات پیش آتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور اسی سبب سے کوئی صحیح حدیث آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ کی موجود نہیں ہے۔ یہ بات بے شک انہوں نے فرمائی کہ ''ابراہیم خلیل اللہ میرے باپ اور میرے ولی ہیں۔'' جیسا کہ ترمذی نے عبداللہ ابن مسعود کی روایت سے بیان کیا ہے مگر کرسی نامہ کے طور پر نہ کبھی اپنا نسب نامہ بیان فرمایا اور نہ اس کے بیان کی ضرورت تھی کیونکہ عرب کے لوگ یقینی بلا کسی شک وتردد کے جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ ﷺ قبیلہ قریش سے ہیں اور اس بات پر بھی سب کو یقین تھا کہ قبیلہ قریش کا معد ابن عدنان کی اولاد میں ہے اور عدنان اولاد ہے قیدار ابن اسمٰعیل ابن ابراہیم کی اور اتنی ہی بات اس امر کے ثبوت کے لئے کہ آنحضرت ﷺ اولاد اسمٰعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں ہیں کافی تھی گو ان کے درمیان کتنی ہی پشتیں گزری ہوں جن کی تعداد میں اختلاف ہو۔

ہاں اس بات میں کچھ شک نہیں کہ جب لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ بترتیب لکھنا چاہا تو اس میں اختلاف ہوا۔ اسی بناء پر کاتب الواقدی نے ایک قول آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ ''کذب النسابون'' یعنی نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں اور مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں ایک روایت بیان کی ہے کہ اسی اختلاف کے سبب جو نسب نامہ میں لوگ کرتے تھے فرمایا کہ معد ابن عدنان سے آگے مت بڑھو کیونکہ آنحضرت ﷺ نسب نامہ کے بڑے دور تک ہونے سے اور اس کے زمانہ دراز میں متعدد رائیں ہونے سے بخوبی واقف تھے۔

(ولذالک ای لتنازع الناس فی النسب) بنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن تجاوز معد لعلمہ من تباعد الا نساب و کثرت الاراء فی طول ھذہ الاعصار. (مروج الذھب :مسعودی)

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "انا ابن الذبیحین" یعنی میں دو قربانی کیے گئے شخصوں کا بیٹا ہوں اور اس قربانی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں سے اسمٰعیل اور ابن ابراہیم اور عبداللہ اب محمد رسول اللہ (ﷺ) مراد ہیں۔

"وروی عن ام سلمة زوجة النبی صلی الله علیه وسلم انها قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم عدنان ابن اود بن زید بن براء بن عراق الثری فقالت ام سلمة زید همیسع وبرا بنت و اسمٰعیل عراق الثری"

"ابوالفدا نے حضرت ام سلمہ زوجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت لکھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عدنان بیٹا اود کا اور وہ بیٹا زید کا اور وہ بیٹا برا کا اور وہ بیٹا عراق الثریٰ کا ہے اور ام سلمہ نے یہ بھی کہا کہ زید اور ہمیسع ایک ہی شخص کے دو نام ہیں اور برابنت اسمٰعیل اور عراق الثریٰ ایک ہیں۔"

یہ تمام روایتیں جو اوپر بیان ہوئیں محض غلط اور بے سند ہیں اور ذرا بھی اعتبار کے لائق نہیں۔ آنحضرت ﷺ کے روبرو کبھی آنحضرت کے نسب نامہ کی نسبت ذکر نہیں ہوا۔ صرف ان کے نسب کا یقین کہ قریش ہیں تمام عرب کے دلوں پر جما ہوا تھا اور اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ اس زمانہ میں آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ پر کچھ بحث ہوتی۔ کئی صدی بعد جب کتابوں کی تحریر کا رواج شروع ہوا اور مؤرخین کو نسب نامہ کی تحقیق میں مجبوری ہوئی تو انہوں نے اپنی کتابوں کے رونق دینے کو جھوٹی روایتیں خود گھڑ لیں یا افواہا سنی سنائی اپنے مطلب کے موافق سمجھ کر بلا تحقیق مندرج کر لیں۔

"انا ابن الذبیحین" کی روایت نہایت غلط ہے۔ اسماعیلؑ کبھی قربانی نہیں ہوئے جیسا کہ ہم نے اپنے اس خطبہ میں ثابت کیا ہے جو عرب کے تاریخی جغرافیہ پر لکھا ہے اور عبداللہ کی قربانی کا بیان محض غلط ہے۔

ہاں بلاشبہ ترمذی نے جو روایت عبداللہ ابن مسعود سے بیان کی ہے وہ کسی قدر اعتبار کے لائق ہے۔

"عن عبدالله بن مسعود قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان لکل نبی ولاة من النبیین وان ولیی ابی وخلیل ربی ثم قرا ان اولی الناس بابراهیم للذین اتبعو وهذا النبی والذین امنوا والله ولیٔ المومنین. (رواه الترمذی)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ایک نبی کے لئے ایک مربی نبیوں میں سے ہوتا ہے اور میرا مربی میرا باپ میرے پروردگار کا دوست (یعنی ابراہیم) ہے پھر قرآن کی یہ آیت پڑھی کہ سب سے زیادہ دوست ابراہیم کے وہ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی ہے اور یہ نبی یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور سب ایمان والوں کا دوست ہے۔ پانچ شخص ہیں جن کے تحقیق کیے ہوئے نسب ناموں میں معدابن عدنان سے لے کر ابراہیم تک پشتوں کا بیان ہوا ہے۔ ایک بیہقی' دوسرے ابن ہشام' تیسری ابن الاعرابی' چوتھی برخیا کاتب الوحی ارمیانبی علیہ السلام' پانچویں الجرا۔

ان میں سے پہلے یعنی بیہقی نے عدنان سے ابراہیم تک دس پشتیں اس طرح پر لکھی ہیں "عدنان اب عدوابن المقوم بن یاحور بن یارح بن یعرب بن یشحب بن نابت بن اسمٰعیل بن ابراہیم۔

اور دوسرے شخص ابن ہشام نے اپنی کتاب المغازی و سیر میں نوپشتیں اس طرح پر لکھی ہیں ''عدنان ابن عدوابن ناحورابن سودا بن یعرب ابن یشجب ابن نابت ابن اسمٰعیل ابن ابراہیم۔

اور تیسرے شخص یعنی ابن الاعرابی نے اس طرح پر نوپشتیں نسب نامہ میں مندرج ہیں ''عدنان ابن ادابن ادوابن الھمیسع ابن نابت ابن سلامان ابن قیدارابن اسمٰعیل ابن ابراہیم۔

اول تو ان نسب ناموں کو اسمٰعیل تک سمجھنا غلطی ہے کیونکہ اس کے لکھنے والوں نے جہاں تک ان کو نام یاد تھے وہاں تک لکھ کر اس کے مشہور اشخاص قیدار و اسمٰعیل کا نام لے دیا ہے اور بیچ کے نام جو یاد نہ رہے تھے چھوڑ دیئے ہیں۔ جن لوگوں نے ان کو پورا سمجھا ہے بڑی غلطی کی اور خود اس زمانہ سے جو عدنان اور ابراہیم کے درمیان میں گزرا ہے ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ نسب نامے خود بھی غلط ہیں۔ ابن ہشام کے دونوں نسخے آپس میں مختلف ہیں اور نابت کے ذریعہ سے اسمٰعیل تک قریش کا نسب نامہ پہنچانا ایک ایسی غلطی ہے جو خود عرب جاہلیت کی روایتوں سے جو تاریخی وقعت کے درجہ کو پہنچ گئی ہیں، غلط ثابت ہوتی ہے۔ ابن الاعرابی کے نسب نامہ کا بھی کچھ ثبوت روایتاً یا درایتاً نہیں۔

پس دو نسب نامے باقی رہ گئے ایک باروخ یا برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کا اور دوسرا الجرا کا۔

''واما الذی ذکرہ الجرا فی النسابۃ فی شجرۃ النسب ھو المختار' (ابو الفدا)

ابوالفدا نے بھی لکھا ہے کہ جو نسب نامہ الجرا نے لکھا ہے وہی درست ہے اور وہی اختیار کرنے کے لائق ہے۔ کوئی وجہ اس بات کی نہیں ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد کا جو سلسلہ برخیا کاتب الوحی حضرت یرمیا نبی نے اپنے زمانہ تک کا لکھا ہے اس پر ہم اعتبار نہ کریں خصوصاً اس وجہ سے کہ معدابن عدنان حضرت یرمیا نبی کے وقت میں تھے اور بخت نصر کے ہنگامہ میں حضرت یرمیا نبی نے ان کو بچایا تھا اور ساتھ لے گئے تھے اور یہ ایک قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ برخیا کاتب الوحی یرمیا نبی کو معد کا نسب نامہ لکھنے کی اسمٰعیل ابن ابراہیم تک ضرورت پڑی ہوگی۔ یہ شجرہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کا یا یوں کہیے کہ معدابن عدنان کا ابراہیم علیہ السلام تک نسب نامہ جو برخیا کاتب الوحی نے لکھا ہمارے ہاں کی کتابوں میں بھی مندرج ہے۔ چنانچہ مسعودی نے اپنی کتاب مروج الذہب میں اس کو بعینہ نقل کیا ہے۔ ہشام کلبی کی روایت میں جو واقدی میں ہے، اس میں اس شجرہ کو بیان کیا ہے مگر ناموں کے تلفظ میں بہ سبب مجانست الفاظ کے اور نقل کے فرق ہوگیا ہے۔ مثلاً ایک نے ایک نام لکھا ہے اقناد کاف اور نون سے دوسرے نے لکھا ہے افتاد فے اور تے سے یا مثلاً ایک نے لکھا ہے عیسے بالیاء اور دوسرے نے لکھا عیسر بالراء اور غالباً کاتب نے کشش دار حرف یا کو حرف الراء سمجھ لیا ہے اسی طرح ناموں کے تلفظ و نقل میں اختلاف ہے ورنہ وہ دونوں واحد ہیں اور وہی شجرے ہیں جو برخیا کاتب الوحی نے اپنے زمانہ تک کے لکھے ہیں۔

الجرا کا نسب نامہ درحقیقت اسمٰعیل ابن ابراہیمؑ تک نہیں ہے بلکہ حمل ابن معد ابن عدنان اول تک ہے یعنی وہاں تک کا برخیا کاتب الوحی نے شجرہ لکھا تھا مگر چونکہ الجرا نے بھی ان ناموں کو جو برخیا کاتب الوحی نے لکھے تھے چھوڑ کر حسب دستور عرب و شام اس کے آخیر میں قیدار بن اسمٰعیل اور ابراہیم کا نام لکھ دیا تھا' لوگوں کو شبہ پڑا کہ یہ مستقل جداگانہ نسب نامہ ہے حالانکہ درحقیقت وہ برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کا تتمہ ہے۔ ایک اور وجہ غلطی میں پڑنے کی یہ بھی ہوتی ہے کہ برخیا کاتب الوحی اور الجرا کے نسب نامہ میں مکرر نام آتے ہیں خصوصاً معد اور عدنان کے اور اس سبب سے لوگوں نے اس کو جداگانہ نسب نامہ خیال کیا حالانکہ مکرر ناموں کا آنا

کوئی امر قابل اشتباہ کے نہیں ہے پس اب ہم برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کے نیچے الجرا کا نسب نامہ جو اس کا تتمہ ہے لگا دیتے ہیں جس سے آنحضرت ﷺ کا نسب نامہ اسمٰعیل علیہ السلام ابن ابراہیم علیہ السلام تک پورا ہو جاتا ہے جن وجوہات سے کہ ہم نے الجرا کے نسب نامہ کو برخیا کاتب الوحی کے نسب نامہ کا تتمہ بیان کیا اور دونوں کی صحت کو تسلیم کیا اس کی وجوہات یہ ہیں۔

اول یہ کہ اسمٰعیل ۲۰۹۴ دنیاوی مطابق ۱۹۱۰ قبل مسیح کے پیدا ہوئے تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۴۵۸۰ دنیاوی مطابق ۵۷۰ بعد مسیح کے پیدا ہوئے تھے پس دونوں ولادتوں میں چوبیس سو چھہتر برس کا فاصلہ ہے اور اسمٰعیل سے آنحضرت تک اس نسب نامہ کی ستر پشتیں گزرتی ہیں جو از روئے حساب اس سلسلہ نسب کے جو علی العموم علوم طبعی کی تحقیقات سے اختیار کیا جاتا ہے بالکل صحیح ہے یعنی تین پشت کے ایک صدی میں۔

"وقد کان لا رمیا معه معد ابن عدنان اخبار یطول ذکرها (مسعودی)"

دوسرے یہ کہ معد وارمیا نبی دونوں ایک وقت میں تھے چنانچہ مروج الذہب مسعودی جلد ۴ صفحہ ۱۱۹ میں لکھا ہے کہ معد ابن عدنان کے ارمیا نبی کے ساتھ جو حالات گزرے ہیں بہت طولانی ہیں اور وہ حالات یہ ہیں کہ جب بخت نصر نے عرب پر حملہ کیا اور عدنان اور بنی جرہم کو شکست دی اور مکہ کو لوٹ لیا اور صدہا آدمیوں کو پکڑ کر بابل میں لے گیا اس وقت اللہ تعالیٰ نے معد ابن عدنان کو اس سے بچایا اور ارمیا نبی اور برخیا خدا کے حکم سے معد کو اپنے ساتھ لے گئے اور حیران میں ان کو بحفاظت رکھا۔ ارمیا نبی کا زمانہ سال دنیوی کے حساب سے پینتالیسویں صدی میں یعنی چھٹی صدی قبل مسیح میں تھا اور جو نسب نامہ ہم نے صحیح قائم کیا ہے اس میں بھی نسلوں کا عام سلسلہ بموجب معد بھی اسی زمانہ میں ہوتا ہے جو ایک نہایت قوی دلیل اس سلسلہ کی صحت کی ہے اور برخیا کاتب الوحی کی تاریخانہ تحریر اور عام عرب کی مشہور روایت سے عجب طرح پر مطابق پائی جاتی ہے۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمد جلد ا صفحہ ۱۹۴ میں لکھا ہے کہ یہ روایت معد اور ارمیا نبی کی صحیح معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ آنحضرت ﷺ و عدنان میں اٹھارہ پشتیں ہیں اور نسلوں کے صحیح حساب سے عدنان کی پیدائش ۱۳۰ قبل مسیح سے پہلے کی نہیں ہو سکتی حالانکہ بخت نصر کے حملوں کا زمانہ ۵۷۷ قبل مسیح میں پایا جاتا ہے۔

مگر سر ولیم میور کو ناموں کے متحد ہونے سے یہ شبہ پڑا ہے۔ عدنان بھی دو ہیں اور معد بھی دو ہیں۔ ایک وہ ہیں جو برخیا کاتب الوحی کے شجرہ میں ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو الجرا والے نسب نامہ میں ہیں۔ پس وہ روایت نسبت پہلے معد ابن عدنان کے ہے۔ سر ولیم میور نے دوسرے معد ابن عدنان کی نسبت وہ روایت تصور کی ہے۔ عک بلاشبہ معد کا بھائی تھا مگر اس سے پہلے معد کا نہ دوسرے معد کا جیسا کہ سر ولیم نے تصور کیا ہے عرب نے ضلع حضر موت میں جو قلعہ قوم عاد کا از نام حصن الغراب تھا اور جس میں سے ایک کتبہ نکلا جس میں ہود پیغمبر کا ذکر ہے اور اس میں عک کا بھی نام ہے۔ یہ عک اسی پہلے معد کا بھائی معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عدنان تک جو ہمارے مرتبہ شجرہ میں پچاسویں نمبر پر ہے پشتوں کا سلسلہ عموماً تسلیم کیا گیا اور کسی مورخ کو اس میں اختلاف نہیں ہے مگر عدنان سے آگے بلحاظ ان وجوہات کے جو اوپر مذکور ہوئیں مؤرخوں میں اختلاف ہے۔ بیہقی کا قال ہے کہ:

"قال البیهقی المذکور وکان شیخنا ابو عبدالله الحافظ یقول نسب رسول الله صلی الله علیه وسلم صحیحة الی عدنان و ماوراء عدنان فلیس فیه شی نعتمد علیه. (ابو الفدا)"

اس کے استاد حافظ ابوعبداللہ کہتے تھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب عدنان تک صحیح ہے اور اس سے اوپر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر بھروسا کیا جائے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ قول اگر بیہقی کا صحیح ہو تو اس کے استاد کی ایک رائے وسمجھ ہے کوئی مذہبی حدیث نہیں ہے جس پر یہ استدلال ہو سکے کہ مذہبی روایت کے بموجب اس کی صحت نہیں ہے۔

بلاشبہ اہل عرب بنی اسرائیل سے نہایت قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ وہ اسمٰعیل کی اولاد تھے اور یہ اس کے بھائی اسحٰق کی۔ وہ ان پڑھ جاہل تھے اور یہ لکھے پڑھے قابل۔ پس یہ ایک قدرتی وطبعی بات تھی کہ جس بات سے وہ ناواقف ہوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے دریافت کریں یا جس بات کی تفصیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی تھی اس کا مفصل حال اپنے اسرائیلی بھائیوں سے پوچھیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گذشتہ حالات وتاریخی واقعات کی نسبت بنی اسرائیل سے روایت کرنے کو منع نہیں فرمایا تھا بلکہ اجازت دی تھی اور جس کسی بات میں کوئی خاص حکم نہ تھا تو یہود کی تتبع کو جو اہل کتاب تھے مناسب سمجھا تھا۔ پس جب کہ مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے نسب نامہ لکھنے کا خیال ہوا جس کا کبھی مذکور آنحضرت ﷺ کی زندگی میں نہ ہوا تھا تو بلاشبہ انہوں نے یہودیوں اپنے اسرائیلی بھائیوں سے جو پڑھے لکھے تھے اور جن کے ہاں تاریخ نویسی اور نسب ناموں کی تحریر کا بھی سلسلہ جاری تھا مدد لی اور ان کی کتابوں کی بھی تحقیق کی اور نسب نامہ مرتب کیا اور یہی وجہ ہوئی کہ بہ سبب مشابہ ہونے حروف تہجی عبرانی کے پھر اس کی دوسرے خط کوفی میں نقل ہونے پھر خط ثلث میں نقل ہونے اور پھر موجودہ خط عربی میں نقل ہونے سے الفاظ کا الٹ پھیر وتلفظ کا ادل بدل ہوا اور کاتبین کی غلطی سے کوئی نام رہ گیا کوئی بڑھ گیا جو منشاء اختلاف ہے۔ مگر جب کمال غور وفکر سے اس پر لحاظ کیا جائے تو اس کی صحت بخوبی ہو سکتی ہے جیسے کہ بقدر اپنے فہم کے ہم نے کی ہے۔ چنانچہ انہی واقعات کا ذکر واقدی نے اپنی کتاب میں کیا ہے کہ میں نے اس بات میں کہ معد اولاد قیدار بن اسمٰعیل میں ہے کسی کا اختلاف نہیں دیکھا اور یہ اختلاف جو آپ کے نسب میں ہے اس بات کی دلیل ہے کہ اہل عرب کو یا مسلمانوں کو نسب نامہ یاد نہیں تھا انہوں نے یہ نسب نامہ اہل کتاب سے لیا ہے انہوں نے اس کو ترجمہ کر دیا۔ اور پھر ان کو اس میں اختلاف ہو گیا اور اگر نسب نامہ صحیح ہوتا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سب لوگوں سے زیادہ اس کے جاننے والے تھے۔ پس ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ معد ابن عدنان تک ٹھہر جانا چاہیے اور اس سے آگے اسمٰعیل تک کچھ نہیں کہنا چاہیے۔

ولنا و بینهم اختلافاً ان معد من اولاد قیدار بن اسمٰعیل و هذااختلاف فی نسبه یدل علی انه لم یحفظ وانما اخذ ذلک من اهل الکتاب و ترجموه لهم فاختلفوا فیه ولو صح ذلک کان رسول الله اعلم الناس به فالامر عند علی الانتهاء الی معد ابن عدنان ثم الا مساک عما وراء ذلک الی اسمٰعیل بن ابراهیم (کاتب الواقدی)''

واقدی کے اس فقرہ کو سرولیم میور نے بھی اپنی کتاب لائف آف محمد میں نقل کیا ہے مگر اس میں کوئی ایسی بات جس میں آنحضرت ﷺ کے اولاد اسمٰعیل ہونے میں شبہ پڑے نہیں ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ ہم کو نسب نامہ ابراہیم تک یاد نہ تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم نے یہودیوں سے جو ہمارے اسرائیلی بھائی ہیں یا ان کی کتابوں سے اس کی تحقیق کرنے پر مدد لی ہے۔ جو وجہ اختلاف ہم نے بیان کی ہے اس کی طرف واقدی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اعلم الناس تھے اگر ان کے سامنے اس کا تذکرہ ہوتا یا اس کے بیان کرنے کی ضرورت ہوتی یا آنحضرت سے پوچھا جاتا تو خدا کی ہدایت سے بالکل صحیح ودرست

بتا دیتے۔ مگر نہ اس کی ضرورت ہوئی نہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا اور اسی وجہ سے ہم کو اور ذریعوں سے تحقیق کرنے کی بھی ضرورت پڑی اور جو کچھ واقدی نے کہا ہے وہ خاص واقدی کی رائے ہے۔ اس کے نزدیک معد بن عدنان تک نسب نامہ کی تحقیقات میں کچھ شبہ نہیں رہا اس سے زیادہ اس کو تحقیق نہیں ہوا اس لئے وہ کہتا ہے کہ معد بن عدنان سے زیادہ بیان کرنا کچھ ضرور نہیں مگر ہماری تحقیق یہ ہے کہ برخیا کاتب الوحی ارمیا نبی کا لکھا ہوا شجرہ صحیح ہے اور وہ اسمٰعیل ابن ابراہیم تک پہنچا ہوا ہے۔

سر ولیم میور صاحب کا یہ کہا ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ ''یہ بات صاف صاف تسلیم کی جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے'' مگر ہماری تحقیق اور سر ولیم میور کی تحریر میں اتنا فرق ہے کہ وہ اس عدنان تک عرب کی ملکی روایتوں کا نسب نامہ بتاتے ہیں جو ہمارے مرتبہ کرسی نامہ میں پچاس نمبر پر ہے اور ہم اس عدنان تک ملکی روایتوں کا نسب نامہ قبول کرتے ہیں جو اکتالیس نمبر پر ہے اور باقی کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہود کی تاریخ سے لیا ہوا ہے۔

ہم کو اس بات کے دیکھنے سے نہایت تعجب ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنی کتابوں اور تحریریں میں کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے اور اپنا وقت ضائع کیا ہے اور قوائے عقلیہ و دماغیہ کو صرف کیا۔ جس سے ہم مسلمان کبھی منکر نہیں ہوئے یعنی یہ امر کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے اور جب وہ اس امر کو نہایت سعی بے حاصل سے ثابت کر چکتے ہیں تو از راہ طعن ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں بات یہودیوں کے مذہب سے لی ہے گویا مذہب اسلام میں ایسی بات نہیں ہے جو خود وہ اپنے اصول پر قائم ہو بلکہ یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا ہے اور جیسے کہ مذہب عیسائیا نکل مذہب یہود کا محتاج ہے ویسا ہی مذہب اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے اگر چہ یہ امر کہ کونسا مذہب مسلمانی یا عیسائی زیادہ تر بلکہ بالکل مذہب یہود کا محتاج ہے ہر ایک پر روشن ہے مگر ہم خوشی سے اس امر مذکور کو تسلیم کریں گے کیونکہ جو مشابہت ان دونوں ربانی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اس کو اپنا نہایت فخر سمجھ لیں گے کہ ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدم و نوح اور ابراہیم و یعقوب و اسحاق و اسمٰعیل و موسیٰ و عیسیٰ صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب کا ایک ہی دین تھا۔ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ:

"قل یا اهل الکتاب تعالوا لی کلمة سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا الله" (قرآن)

''یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دے کہ ایک بات کو مان لو جو تمہارے ہاں بھی وہی وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کسی کو مت پوجو''

ہم مسلمانوں کا ذاتی فخر یہی ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں جنہوں نے یحییٰ و عیسیٰ اور محمد رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور ان کی پیروی کی ہدایت کی تھی مگر یہودیوں نے ان تینوں کو اور عیسائیوں نے اس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا نہ مانا۔ مگر سچی پیروی موسیٰ و عیسیٰ کی ہم مسلمانوں ہی نے کی۔

آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کا پورا ہونا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ کی زبانی کیا کہ ''میں تمہارے بھائیوں یعنی اسمٰعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا'' کچھ اس بات

پر منحصر نہ تھا کہ بنی اسمٰعیل کی نسلیں محمد سے لے کر اسمٰعیل تک ہم کو کامل ترتیب اور پوری تعداد سے یاد ہوں اور نہ اس بات پر اس کا انحصار تھا کہ وہ کرسی نامہ ہم عرب کی ملکی روایتوں سے یاد کریں یا یہود کی روایتوں اور برخیا کاتب الوحی ارمیانبی کی تحریروں سے۔ وہ تو اسمٰعیل کی اولاد میں سے ایک کے لئے ہونا تھا سو محمد رسول اللہ کی نسبت پورا ہوا۔ تمام عرب اور یہود اور عرب کے قرب وجوار کی تمام قومیں اور تمام اگلے اور پچھلے مؤرخ خواہ وہ عرب کے رہنے والے ہوں یا کسی اور ملک کے مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب کے اس بات میں ذرا بھی شبہ نہیں رکھتے بلکہ بالکل تسلیم کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ بنی ہاشم قریش اسمٰعیل ابن ابراہیم کی اولاد میں ہیں۔ محمد رسول اللہ نے قریش کو پکار کر مخاطب کیا کہ "ابیکم ابراھیم" جس کو سب نے تسلیم کیا اور کون ایسا شخص ہے کہ جس میں اس قدر جرأت ہو کہ وہ سچ بات کو تسلیم نہ کرے۔ چنانچہ ہم اس مقام پر چند رائیں عالم مؤرخوں کی نقل کرتے ہیں۔ ابوالفداء لکھتا ہے۔

"ونسبه صلى الله عليه وسلم الى عدنان متفق عليه من غير خلاف وعدنان من ولد اسمعيل بن ابراهيم الخليل عليه السلام من غير خلاف لكن الخلاف في هذه الا باء الذين بين عدنان و اسمعيل فعد بعضهم منها نحو اربعين رجلا معد بعضهم سبعة (ابو الفدا)"

"نسب آنحضرت ﷺ کا عدنان تک متفق علیہ ہے بغیر اختلاف کے اور اس میں بھی کہ عدنان اولاد اسمٰعیل ابن ابراہیم میں ہے۔ کچھ اختلاف نہیں ہے لیکن ان پشتوں کی تعداد میں اختلاف ہے جو عدنان اور اسمٰعیل کے درمیان میں ہیں۔ پس بعضوں نے تو چالیس پشتوں کے قریب گنی ہیں اور بعضوں نے سات۔ جن لوگوں نے جس شبہ سے سات گنی تھیں اس کی تفصیل ہم اوپر بیان کر چکے ہیں پس اصل میں وہ بھی کچھ اختلاف نہ تھا بلکہ سمجھ کی غلطی تھی۔

مشہور مؤرخ مسٹر گبن جو تمام عالم میں مشہور ہے لکھتا ہے کہ "محمد کو حقیر اور مبتذل نسل سے کہنا عیسائیوں کا ایک احمقانہ افترا ہے۔ ایسا افترا کرنے سے بجائے اس کے کہ اپنے مخالف کی خوبیوں کو گھٹائیں اس کی خوبیوں کو اور زیادہ بڑھاتے ہیں۔ اسمٰعیل سے ان کی نسل کا ہونا ایک قومی تسلیم کی ہوئی بات اور ملکی روایت سے ثابت شدہ امر ہے۔ بالفرض اگر کرسی نامہ کی پہلی نسلیں بخوبی معلوم نہ ہوں اور ابہام میں ہوں تو اور بہت سی پشتیں ایسی ہیں جو صاف صاف شریف ونجیب ہیں۔ وہ قریش اور بنی حاشم ہیں جو اہل عرب میں نہایت نامی اور مکہ کے فرماں روا اور کعبہ کے موروثی محافظ تھے"۔

روورنڈ مسٹر فارسٹر صاحب بھی یہی گواہی دیتے ہیں اور ان کی گواہی ایسی ہے جو غالباً انہوں نے خوشی سے نہ دی ہوگی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اب تک ہم نے قیدار کا سراغ قدیمی جغرافیہ سے لگایا ہے۔ اب اس بات کا دیکھنا باقی ہے کہ قدیمی روایتوں کو عرب کی روایتوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے کیا ثبوت حاصل ہوسکتا ہے۔ کیونکہ یورپ کے نکتہ چینوں کی رائے میں عرب کی ایسی روایت جس کی تائید میں اور کوئی ثبوت نہ ہو گو کیسے ہی اعتراض کے قابل ہو مگر روایت کی جانچ اور پڑتال کے جو قوانین مسلمہ ہیں ان کے مطابق ان پر غور کرنے سے اس بات کا انکار کرنا ناممکن ہے کہ وہ روایت مذہبی اور دنیاوی دونوں طرح کی تاریخ کے مطابق ہے۔ خاص عرب کے لوگوں کی یہ خاص قدیمی روایت ہے کہ قیدار اور اس کی اولاد ابتداء میں حجاز میں آباد ہوئی تھی۔ چنانچہ قوم قریش اور خصوصاً مکہ کے بادشاہ اور کعبہ کے متولی ہمیشہ اس بزرگ کی نسل میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور خاص حضرت محمدؐ نے اسی بنیاد پر کہ اسمٰعیل کی نسل اور قیدار کی اولاد ہیں اپنی قوم کی دینی اور دنیوی عظمتوں کے استحقاق پر تائید کی ہے۔

صرف سرولیم میور نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ میں علماء کی متفق رائے سے اختلاف کیا ہے۔ ہم اس اختلاف کے جانچنے پر مستعدو آمادہ ہیں۔ انہوں نے صرف اپنی قیاسی باتوں سے ان حقیقتوں پر اعتراض کیا ہے جو آفتاب کی طرح روشن ہیں اور مذہبی اور دنیوی دونوں طرح کی تاریخ سے بلا کسی شبہ کے ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ سرولیم میور کہتے ہیں کہ ''جو کوشش ہمیشہ مذہب اسلام کی روایتوں اور عرب کے قصوں کو توریت اور یہودیوں کی روایتوں سے مطابق کرنے کے واسطے کی گئی ہیں اس کو بھی ہم اسی سبب سے منسوب کر سکتے ہیں۔ اس کلیہ کو خاص حضرت محمدؐ کے حالات حیات سے بہت کم تعلق ہے لیکن وہ ان کے بزرگوں اور عرب کی قدیمی روایتوں سے ایک وسیع اور موثر تعلق رکھتا ہے۔ یہ خواہش کہ مذہب اسلام کے پیغمبر کو اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے خیال کیا جائے اور غالباً یہ کوشش کہ وہ اسمٰعیل کی اولاد میں سے ثابت کئے جائیں ان کی حین حیات میں پیدا ہوئے تھے اور اس پر محمدؐ کے ابراہیمی نسب نامہ کے ابتدائی سلسلہ گھڑے گئے تھے اور اسمٰعیل اور بنی اسرائیل کے بیشمار قصے نصف یہودی اور نصف عربی سانچہ میں ڈھالے گئے تھے''۔

مگر سرولیم میور کے اس خیال کی غلطی کیسی علانیہ ظاہر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں ہوا کہ کوئی نسب نامہ ابراہیم تک درست کیا جائے نہ کبھی اس بات کا دھیان ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو اولاد ابراہیم ثابت کرنے میں کوشش ہو۔ یہ ایک ایسی بات ثابت شدہ و محقق تھی کہ جس میں کسی کو کسی جدید ثبوت کے تلاش کی حاجت نہ تھی۔ کیا آفتاب نصف النہار کے اثبات کا دن دھاڑے کسی کو خیال آسکتا ہے؟ تمام قرآن مجید میں کہیں اس بات پر زور نہیں ڈالا گیا۔ تمام معتبر کتابیں حدیثوں کی اس مباحثہ سے خالی ہیں چند نامعتبر روایتیں جو کئی صدی بعد وفات آنحضرت ﷺ کے پیدا ہوئیں اور اس وقت پیدا ہوئیں جب کتابوں کی تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا اور مصنفوں نے آنحضرت ﷺ کا نسب نامہ لکھنا چاہا۔ ان کا بھی سلسلہ سند آنحضرت ﷺ تک نہیں پہنچایا گیا پس یہ قیاس کرنا کیسا غلط قیاس ہے کہ یہ خواہش آنحضرت ﷺ کی زندگی میں پیدا ہوئی تھی۔ ہمارے علماء نے جب آنحضرت ﷺ کا نسب نامہ لکھنا چاہا تو اس کی تحقیقات کی اور اس کی نسبت جو ان کی رائے اور تحقیقات ہوئی بلا کسی تامل کے بلا کسی خیال کے بلا کسی تردد کے بلا کسی دھکڑ پکڑ کے نہایت بے پروائی اور سادگی و صفائی سے لکھ دی جس سے خود یہ بات ثابت ہوئی کہ مسلمانوں کے دل میں نہ کبھی اس امر میں شبہ تھا نہ ان کو تردد تھا نہ کبھی ان کو اس بات کے ثابت کرنے کی فکر تھی اور نہ کبھی چوری و فریب ان کے دل میں تھا اور نہ کبھی اس کے ثبوت کے درپے تھے جس کا قیاس سرولیم میور نے اپنی رائے میں کیا ہے۔ پس وہ ان کا قیاس محض غلط ہے اور مطلق اعتبار کے لائق نہیں ہے۔

اب ہم اس خطبہ کے خاتمہ میں اپنے پیغمبر کا نسب نامہ جس طرح کہ ہم نے تحقیق کیا مندرج کرتے ہیں اور جو کہ مجھ کو بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں بھی اسی آفتاب عالمتاب کے ذروں میں سے ہوں اس لئے اپنے نسب نامہ کو بھی اس کے ساتھ شامل کر دیتا ہوں تا کہ جو روحانی ارتباط مجھ کو اس سرور دو جہان سے ہے اور جو خون کا اتحاد مجھ میں اور اس سرور عالم میں ہے اور جس کے سبب ''**لحمک لحمی دمک دمی**'' کا ہمارا موروثی خطاب ہے اس ظاہری ارتباط سے بھی معزز ہو جائے۔

گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ
ذرہ آفتاب تابانیم

بتا دیتے۔ مگر نہ اس کی ضرورت ہوئی نہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا اور اسی وجہ سے ہم کو اور ذریعوں سے تحقیق کرنے کی بھی ضرورت پڑی اور جو کچھ واقدی نے کہا ہے وہ خاص واقدی کی رائے ہے۔ اس کے نزدیک معد بن عدنان تک نسب نامہ کی تحقیقات میں کچھ شبہ نہیں رہا اس سے زیادہ اس کو تحقیق نہیں ہوا اس لئے وہ کہتا ہے کہ معد بن عدنان سے زیادہ بیان کرنا کچھ ضرور نہیں مگر ہماری تحقیق یہ ہے کہ برخیا کاتب الوحی ارمیانبی کا لکھا ہوا شجرہ صحیح ہے اور وہ اسمٰعیل ابن ابراہیم تک پہنچا ہوا ہے۔

سرولیم میور صاحب کا یہ کہنا ہم دل سے قبول کرتے ہیں کہ ''یہ بات صاف صاف تسلیم کی جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ عدنان تک خاص عرب کی ملکی روایتوں سے لیا گیا ہے اور عدنان سے آگے یہودیوں سے'' مگر ہماری تحقیق اور سرولیم میور کی تحریر میں اتنا فرق ہے کہ وہ اس عدنان تک عرب کی ملکی روایتوں کا نسب نامہ بتاتے ہیں جو ہمارے مرتبہ کرسی نامہ میں پچاس نمبر پر ہے اور ہم اس عدنان تک ملکی روایتوں کا نسب نامہ قبول کرتے ہیں جو اکتالیس نمبر پر ہے اور باقی کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہود کی تاریخ سے لیا ہوا ہے۔

ہم کو اس بات کے دیکھنے سے نہایت تعجب ہوتا ہے کہ عیسائیوں نے اپنی کتابوں اور تحریروں میں کیوں اس امر کے ثابت کرنے میں بے فائدہ سعی کی ہے اور اپنا وقت ضائع کیا ہے اور قوائے عقلیہ و دماغیہ کو صرف کیا۔ بہ جس سے ہم مسلمان کبھی منکر نہیں ہوئے یعنی یہ امر کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے مذہب میں ایک تعلق ہے اور پچھلا پہلے پر مبنی ہے اور جب وہ اس امر کو نہایت سعی بے حاصل سے ثابت کر چکتے ہیں تو از راہ طعن ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم نے فلاں فلاں بات یہودیوں کے مذہب سے لی ہے گویا مذہب اسلام میں ایسی بات نہیں ہے جو خود وہ اپنے اصول پر قائم ہو بلکہ یہودیوں کے ہاں سے چرایا ہوا ہے اور جیسے کہ مذہب عیسائیا لکل مذہب یہود کا محتاج ہے ویسا ہی مذہب اسلام بھی مذہب یہود کا محتاج ہے اگر چہ یہ امر کہ کونسا مذہب مسلمانی یا عیسائی زیادہ تر بلکہ بالکل مذہب یہود کا محتاج ہے ہر ایک پر روشن ہے مگر ہم خوشی سے اس امر مذکور کو تسلیم کریں گے کیونکہ جو مشابہت ان دونوں ربانی الہامی مذہبوں میں پائی جاتی ہے اس سے انکار کرنے کے بدلے ہم اس کو اپنا نہایت فخر سمجھ لیں گے کہ ہم مسلمان ہی ہیں جو ہر ایک سچے اور خدا کے بھیجے ہوئے نبی کے سچے پیرو ہیں۔ ہم ہی یقین کرتے ہیں کہ آدم و نوح اور ابراہیم و یعقوب و اسحاق و اسمٰعیل و موسیٰ و عیسیٰ صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب کا ایک ہی دین تھا۔ ہمارے پیغمبر کو خدا نے فرمایا کہ:

''قل یا اهل الکتاب تعالوا لی کلمة سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا الله'' (قرآن)''

''یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دے کہ ایک بات کو مان لو جو تمہارے ہاں بھی وہی وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا اور کسی کو مت پوجو''

ہم مسلمانوں کا ذاتی فخر یہی ہے کہ ہم یہودیوں سے زیادہ موسیٰ کلیم اللہ کے اور عیسائیوں سے زیادہ عیسیٰ روح اللہ کے پیرو ہیں جنہوں نے یحییٰ و عیسیٰ اور محمد رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کی خبر دی تھی اور ان کی پیروی کی ہدایت کی تھی مگر یہودیوں نے ان تینوں کو اور عیسائیوں نے اس پچھلے کو جس پر ایمان کا خاتمہ تھا نہ مانا۔ مگر سچی پیروی موسیٰ و عیسیٰ کی ہم مسلمانوں ہی نے کی۔

آنحضرت ﷺ کے نسب نامہ کی نسبت کیا بیہودہ گفتگو عیسائیوں نے کی ہے خدا تعالیٰ کے اس وعدہ کا پورا ہونا جو اس نے بنی اسرائیل سے موسیٰ کی زبانی کیا کہ ''میں تمہارے بھائیوں یعنی اسمٰعیل میں سے موسیٰ کی مانند ایک نبی پیدا کروں گا'' کچھ اس بات

الخطبة العاشره

فی

البشارة المذکورة فی التوراة والانجیل

یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والانجیل

توریت زوصف تست معمور
انجیل زنام تست مشہور

قرآن مجید کے بموجب ہم مسلمان اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ توریت اورانجیل دونوں میں محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغمبر ہونے کی ایسی صاف صاف بشارتیں مذکور ہیں جن میں کچھ شبہ نہیں ہوسکتا۔

"الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونه مکتوبا عندهم فی التوراة والانجیل بامرهم بالمعروف وینهاهم عن المنکر ویحل لهم الطیبات و یحریم علیهم الخبائث ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم فالذین امنوا به وعزروه ونصروه واتبعو النور الذی انزل معه اولئک هم المفلحون (سورة اعراف' آیت ۱۵۶)

خداتعالیٰ سورۂ اعراف میں فرماتا ہے کہ:

"جولوگ کہنا مانتے ہیں رسول بن پڑھے نبی کا جس کا ذکر اپنے پاس لکھا پاتے ہیں توریت اورانجیل میں۔ وہ ان کو اچھی باتوں کے کرنے کو کہتا ہے اور بری باتوں کے کرنے سے منع کرتا ہے اور ستھری چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتا ہے اور ان کا بوجھ ان پر اتارتا ہے اور جو مشقتیں ان کے گلے کا طوق ہو رہی تھیں ان کو دور کرتا ہے۔ پھر جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کا ادب کیا اور اس کی مدد کی اور اس نور کی تابعداری کی جو اس کے ساتھ اترا وہی لوگ ہیں نجات پانے والے۔"

پھر دوسری جگہ خداتعالیٰ سورۂ صف میں فرمایا ہے کہ:

واذ قال عیسٰی ابن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول الله الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراة ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمه احمد فلما جائهم بالبینات قالوا هذا سحر مبین" (سوره صف: آیت ۶)

"جب کہا عیسٰی مریم کے بیٹے نے کہ اے بنی اسرائیل بیشک مجھ کو خدا نے رسول کر کے تمہارے پاس بھیجا ہے تصدیق کرتا ہوا توریت کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دیتا ہوا ایک پیغمبر کی جو میرے بعد ہوگا اور اس کا نام احمد ہے۔ پھر جب

وہ پیغمبر (یعنی علیہ ﷺ) ان کے پاس آیا کھلی ہوئی دلیلیں لے کر تو انہوں نے کہا یہ تو علانیہ جادو ہے۔''

مسلمان کل عہد عتیق کو جس میں حضرت موسیٰ کی پانچوں کتابیں اور زبور وصحف انبیاء داخل ہیں توریت کہتے تھے کیونکہ ان سب کے سرے پر جو کتاب تھی اس کا نام توریت تھا۔ اور عہد جدید کی کتابوں کو سوائے اعمال وحواریوں کے ناموں کے انجیل کہتے تھے کیونکہ وہ سب کتابیں انجیل کے نام سے موسوم تھیں۔ قرآن وحدیث میں بھی انہی معنوں میں لفظ توریت وانجیل کا وارد ہوا ہے۔ پس قرآن مجید سے یہ تو پایا گیا کہ توریت وانجیل میں یہ ذکر ہے۔ اس سبب سے مسلمان عالموں نے توریت وانجیل میں اس کی تلاش شروع کی۔ مگر انہوں نے عہد عتیق وعہد جدید کی کتابوں کو نہایت ابتر وپریشان حالت میں پایا۔ کیونکہ کوئی اصلی قلمی نسخہ توریت وانجیل کا دنیا میں موجود نہ تھا اور جس قدر نقلیں موجود تھیں وہ آپس میں نہایت مختلف تھیں۔ یہودیوں کے جو بڑے نامی دو مدرسے تھے تو جو کتابیں مشرقی مدرسہ میں مروج تھیں ان میں اور مغربی مدرسہ کی کتابوں میں نہایت اختلاف تھا اور سامری یونانی زبان میں توریت کے جو ترجمے تھے وہ بھی آپس میں مختلف تھے اور جو ترجمے مشرقی زبانوں میں ہوئے تھے وہ بھی ایسے ہی مختلف تھے اور ہرگز یہ خیال نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ سب ایک ہی اصلی کتاب کے ترجمے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمان عالم مذہبی روایتوں اور کلام الٰہی کی تصدیق کے لئے سند مسلسل عادی تھے اور ہر مسلمان اپنی مذہبی کتاب اور مذہبی روایت کو اپنے استاد اور اپنے استاد کے استاد (اور علیٰ ہذا القیاس) کی زبانی گواہی یا سند سے اصل تک اس کا ثبوت رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ قرآن مجید کی بھی مکتوبی نسخوں کے بھروسہ پر نہ تھے بلکہ اس کے ہر ہر لفظ کی اور زیر وزبر تک کی مسلسل سند اپنے پاس رکھتے تھے۔ مگر توریت وانجیل کی ایسی مسلسل سند بھی کوئی موجود نہ تھی بلکہ ان موجودہ نقلوں کی صداقت کے لیے بھی کوئی ایسا سلسلہ ثبوت کا جس سے کچھ شبہ نہ رہے موجود نہ تھا علاوہ اس کے جب مسلمان عالموں نے توریت میں بعض مقام پر ایسی باتیں لکھی ہوئی پائیں جو نہایت اخلاق کے برخلاف تھیں اور بعض ناپاک افعال پاک اور مقدس بزرگوں اور نبیوں کی طرف منسوب تھے جن کا واقع ہونا ان بزرگوں سے مسلمان کسی طرح یقین نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ خود مذہب اسلام نے ان کو تعلیم کی تھی کہ تمام انبیاء معصوم تھے اور افعال قبیحہ ایسے پاک اور معصوم بزرگوں سے سرزد ہونے غیر ممکن ہیں تو وہ ان مقاموں کو دیکھ کر نہایت حیران اور متعجب ہوا اور ان کے دل میں اس بات کا شبہ پیدا ہوا کہ توریت وانجیل میں تحریف ہوئی ہے۔

اور جب ان کو قرآن مجید کی یہ آیت یاد آئی کہ:

''یحرفون الکلم عن مواضعه'' ''یہودی بدل ڈالتے ہیں لفظوں کو ان کی جگہ سے'' تو ان کا وہ شبہ درجہ یقین کو پہنچ گیا اور انہوں نے توریت وانجیل میں زیادہ تر تفتیش کرنے کی ہمت نہ کی اور یہ خیال کر کے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے توریت وانجیل میں تحریف کر دی ہے اور خصوصاً وہ مقامات جہاں جہاں ہمارے پیغمبر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں تھیں بدل دی ہیں؛ تلاش کرنی چھوڑ دی اور اپنی کم محنتی اور کاہلی اور ہمت چھوڑ دینے کے الزام سے بچنے کے لئے تحریف کے الزام کو بطور سپر کے بنا لیا۔

مگر یہ خیال انہی لوگوں کا تھا جو علم اور تحقیق کے اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچے تھے اور استقلال کے ساتھ تحقیقات بھی نہیں کی تھیں بلکہ اوپراد پر باتوں میں پھنس رہے تھے۔ برخلاف اس کے بڑے بڑے عالم اور فاضل اور دیندار لوگ جن کا نام دنیا میں بھی مشہور تھا اور آخرت میں بھی مشہور ہوگا نہایت استقلال اور تحمل سے اس کی تحقیقات میں مصروف تھے اور اس کی جڑ تک پہنچ گئے تھے۔ ان کا قول تھا کہ قرآن مجید میں جو تحریف کا الزام یہودیوں وعیسائیوں پر خدا نے لگایا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر قصداً توریت وانجیل کے لفظوں کو بدل دیا ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ لفظوں کے معنی پھیر دیئے ہیں۔ چنانچہ امام محمد بن اسمٰعیل بخاری

رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "یحرفون الکلم عن مواضعه" کی تفسیر میں لکھا ہے "ای یاو لونه علی غیر تاویله" پس وہ لوگ تحریف لفظی کے قائل نہ تھے البتہ یہ بات تسلیم کے قابل تھی کہ قلمی نسخوں میں کاتبوں کے سہو اور غلطی سے بہت سی غلطیاں پڑ گئی تھیں اس لئے ان بزرگوں نے پہلی قسم کے عالموں کی مانند ہمت نہیں ہاری اور تلاش و تفتیش سے باز نہیں رہے اور یہودیوں کی روایتوں میں وہ مقام ڈھونڈ نکالے جہاں پیغمبر خدا محمد ﷺ کے مبعوث ہونے کی بشارتیں موجود تھیں۔ چنانچہ وہ سب روایتیں ہم مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں اور قرآن مجید کی تفسیروں میں اور کتب سیر و تواریخ میں مندرج ہوتی چلی آتی ہیں۔

اگرچہ میں ان بزرگ عالموں کی کوشش اور محنت کی نہایت قدر کرتا ہوں اور ان بزرگوں کا مسلمانوں پر نہایت احسان مانتا ہوں اور ان کو ہر طرح قابل ادب سمجھتا ہوں مگر میں اپنے اس خطبہ میں ان سب کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھتا ہوں کیونکہ جو کچھ ان عالموں نے اپنی انتھک محنت سے نکالا ہے گو وہ کیسا ہی مفید ہو الا نقص سے خالی نہیں۔

اول

تو یہ نقص ہے کہ وہ بزرگ عام طور پر لکھ دیتے ہیں کہ یہ بشارت توریت میں ہے اور وہ بشارت انجیل میں ہے اور اس خاص مقام کا جہاں سے وہ مطلب اخذ کیا ہے کچھ پتا و نشان نہیں بتلاتے۔

دوم

ان بشارات کے بیان کرنے میں اس خاص کتاب کا بھی نام نہیں بیان کرتے جہاں سے وہ بشارت نکالی ہے یعنی یہ نہیں بتلاتے کہ وہ بشارت حضرت موسیٰ کی کتابوں میں ہے یا زبور میں یا صحف انبیاء میں اور جو پرانے قدیم نسخے چلے آتے تھے اور جن میں اختلاف عبارت بھی تھا اور ان کے جدا جدا نام تھے ان میں سے بھی کسی نسخے کا نام نہیں بتلاتے کہ کون سے نسخہ میں یہ بشارت تھی اور نہ جس کتاب سے وہ بشارت لکھی ہے اس کی اصل عبارت نقل کرتے ہیں بلکہ اس کا مطلب اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہیں جو مذکورہ بالا نسخوں میں سے کسی کے ساتھ مطابق نہیں ہوتا۔

سوم

ان کتابوں کے سوا جو اس وقت مجموعہ عہد عتیق اور عہد جدید میں داخل ہیں اور کتابیں بھی تھیں جو اب دستیاب نہیں ہوتیں یا غیر معتبر اور مشتبہ سمجھی جاتی ہیں اور اس سبب سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بشارتیں جو ان بزرگوں نے لکھی ہیں اور موجودہ نسخوں میں نہیں پائی جاتی وہ کن نسخوں سے لی گئی ہیں۔ یعنی ان کتابوں سے جو اب دستیاب نہیں ہوتی یا ان سے جو غیر معتبر و مشتبہ سمجھی جاتی ہیں۔

چہارم

اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ بعض بشارتیں کتابوں میں لکھیں ہوئی موجود نہ تھیں۔ بلکہ سینہ بسینہ بطور روایت کے چلی آتی تھیں۔ جیسے کہ انجیل متی میں حضرت مسیح کے ناصری کہلانے کی بشارت کا اس طرح پر ذکر ہے کہ "وہ آیا اور اس شہر میں رہا جس کو ناصرہ کہتے تھے تاکہ وہ بشارت پوری ہو جو انبیاء کہتے آتے تھے کہ وہ ناصری کہلائے گا۔" (متی باب ۲ صفحہ ۲۳) حالانکہ یہ بشارت کسی نبی کی کتاب میں مندرج نہیں ہے پس وہ بشارتیں جن کو مسلمان عالموں نے زبانی روایتوں سے لیا ہے ان کی بھی کوئی معتبر سند نہیں بتائی گئی تو وہ بھی نقص سے خالی نہیں اور اس لئے ان کا بھی اس خطبہ میں ذکر کرنا کچھ مناسب نہیں۔

پنجم

بعض بشارتیں اب بھی ان کتابوں میں موجود ہیں جن کو عیسائی نامعتبر سمجھتے ہیں اور گو ہمارے پاس کافی ثبوت اس بات کا ہو کہ وہ صحیح ہیں لیکن ہم اپنے اس خطبہ میں ان کا بھی ذکر نہیں کرنے کے بلکہ صرف ان ہی بشارتوں کا ذکر کریں گے جو موجودہ مجموعہ عہد عتیق اور عہد جدید میں موجود ہیں جس کو تمام یہودی اور عیسائی مانتے ہیں تا کہ کسی کو اس میں دم مارنے کا مقام نہ رہے۔

ششم

علاوہ اس کے موجودہ مجموعہ عہد عتیق اور عہد جدید میں دوقسم کی بشارتیں موجود ہیں ا۔ایک ایسی ہیں کہ اگر بغیر تعصب وطرف داری وضد کے ان پرغور ہو اور ان کے معنوں میں تحریف نہ کی جائے تو وہ صاف صاف ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں اور دوسری قسم کی ایسی ہیں کہ ان سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی پیغمبر کے ہونے کی بشارت ہے مگر یہ بات صاف نہیں معلوم ہوتی کہ کس پیغمبر کی بشارت ہے اور اس لئے ہر ایک قوم یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ بشارت ہمارے پیغمبر سے متعلق ہے۔اس قسم کی بشارتیں بھی جھگڑے سے خالی نہیں ہیں اس لئے میں ان کا بھی اس خطبہ میں ذکر نہیں کروں گا۔پس ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے خیال کریں گے کہ باوجوہات مذکورہ بالا جس قدر بشارتوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے ان کی تعداد بمقابل ان بشارتوں کے جن کا اس خطبہ میں ذکر کیا ہے بہت زیادہ ہے۔

توریت وانجیل میں آنے والے پیغمبر کی بشارتیں ایسی مہمل اور مجمل طور سے بیان ہوئی ہیں کہ پہیلی اور معمے کی مانند ہوگئی ہیں اور جب تک ان کی تشریح نہ کی جائے اور ان کا حل نہ بتایا جائے تو ان کا مطلب ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔پس اگر ہم یکا یک جناب پیغمبر خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتوں کو بیان کرنا شروع کر دیں تو ضرور بعض لوگوں کے دل میں خیال ہوگا کہ یہ کیسی مجمل اور مشکل بشارت ہے۔اس لئے ہم ان بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو حواریوں کے کہنے کے مطابق عہد عتیق میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت آئی ہیں اور اس کے بعد ان بشارتوں کو لکھیں گے جو توریت اور انجیل میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آئی ہیں۔اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے'ایک تو یہ کہ ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے اب اس بات سے واقف ہوں جائیں کہ بشارتوں کے بیان کرنے کا کیا طریقہ ہے اور کس طرح کنایہ اور اشارہ سے بطور پہیلی یا چیستاں کے بیان ہوتی ہیں دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت جو بشارتیں ہیں اور جو بشارتیں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ہیں ان کے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہمارے ہمارے پیغمبر صاحب کی بشارتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارتوں کی بہ نسبت بہت زیادہ روشن اور نہایت صاف صاف ہیں جن کی صحت کو مخالف کا دل بھی قبول کر لیتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت یہ بشارتیں ہیں جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں

ا۔جب احاز یہود کے بادشاہ پر رصین بادشاہ ارم اور پقحٰ بادشاہ رملیا بادشاہ اسرائیل نے چڑھائی کی تو احاز بادشاہ یہوادہ بہت گھبرایا۔اس زمانہ میں حضرت اشعیاہ پیغمبر تھے۔ان سے التجا کی انہوں نے احاز کو تسلی دی اور فرمایا کہ تو خوف نہ کر تیرے دشمن تجھ پر غالب نہ ہوں گے اور اس خوف کے رفع ہونے کی مدت اور اپنے قول کی صداقت کا یہ نشان بتایا''ایک کنواری کو حمل رہے گا اور وہ

بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوئیل رکھا جائے گا اور جب وہ ذرا ہوشیار ہو گا تو جو خوف تجھ کو دشمنوں سے ہے' جاتا رہے گا اور تیرے لئے بہت اچھے دن آئیں گے۔'' (یہ مضمون اشعیاہ نبی کی کتاب کے ساتویں باب میں مندرج ہے) پھر اسی کتاب کے آٹھویں اور نویں باب میں مذکور ہے کہ وہ لڑکا پیدا ہوا جس کا نام ماہیر شالال ہاشبز رکھا گیا اور جب وہ ہوشیار ہوا تو احاز کو دشمنوں کا جو خوف تھا جاتا رہا۔

بااین ہمہ انجیل متی میں لکھا ہے کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ کی ہے جو کنواری مریم سے پیدا ہوئے ہیں چنانچہ سینٹ متی فرماتے ہیں کہ ''جب حضرت مسیح کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہوئی تو اس سے پہلے کہ وہ ہم بستر ہوں روح قدس سے حاملہ پائی گئی تب اس کے شوہر یوسف نے نے جو راستباز تھا نہ چاہا کہ اس کی تشہیر کرے' ارادہ کیا کہ اسے چپکے سے چھوڑ دے۔ وہ ان باتوں کے سوچ میں تھا کہ خداوند کے فرشتہ نے اس پر خواب میں ظاہر ہو کے کہا اے یوسف داؤد کے بیٹے اپنی جورو مریم کو اپنے ہاں لانے سے مت ڈرو کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے سو روح قدس سے ہے اور وہ بیٹا جنے گی تو اس کا نام یسوع رکھنا کیونکہ وہ اپنے لوگوں کو ان کے گناہوں سے بچائے گا' یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ جو خداوند نے نبی کی معرفت کہا تھا پورا ہوا کہ دیکھو ایک کنواری پیٹ سے ہوگی اور بیٹا جنے گی اور اس کا نام عمانوئیل رکھیں گے' جس کا ترجمہ یہ ہے' خدا ہمارے ساتھ'' (انجیل'' متی باب ا۔۱۸ لغایت ۲۲)

پس اب غور کرنا چاہیے کہ یہ کیسی مجمل اور مشتبہ پیشین گوئی ہے اور کس وقت اور کس مطلب کے لیے کی گئی تھی مگر حضرت متی نے اس کو اشارۃً کنایۃً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت قرار دی ہے۔

2- حضرت میکاہ نبی نے بہت سی باتیں آئندہ کی' اشارات وکنایات میں کہی ہیں کہ یہ ہو گا اور وہ ہو گا۔ اس میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ''اے بیت لحم افراتاہ اگرچہ تو یہود کے ہزاروں میں سے چھوٹا ہے لیکن میرے لئے ایک شخص جو بنی اسرائیل میں سلطنت کرے گا اور اس کا ہونا بہت قدیم زمانہ سے مقرر ہو چکا ہے تجھ میں سے نکلے گا'' (کتاب میکاہ باب ۵'۲)

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ پیشین گوئی بھی حضرت مسیح کی ہے کیونکہ جب ہیرود بادشاہ نے سردار کاہنوں اور یہودیوں کے فقیہوں کو جمع کر کے پوچھا کہ مسیح کہاں پیدا ہو گا تو انہوں نے میکاہ نبی کی کتاب کی اس آیت پر استدلال کر کے کہا کہ بیت لحم میں پیدا ہو گا۔'' (انجیل متی باب ۲۔۳ لغایت ۶) اور چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیت لحم میں پیدا ہوئے اور گو دنیاوی سلطنت ان کو بنی اسرائیل پر نہیں ہوئی مگر سینٹ متی نے سلطنت کو روحانی سلطنت قرار دیا اور اس پیشین گوئی کو حضرت عیسیٰ کے ہونے کی پیشین گوئی ٹھہرایا۔

حضرت ہوشیع نبی نے لغز و[1] کنایہ میں کچھ فرماتے فرماتے یہ فرمایا کہ ''جب اسرائیل بچہ تھا اس کو میں پیار کرتا تھا اور اپنے بیٹے کو میں نے مصر سے بلایا'' (کتاب ہوشیع باب ۱۱۔۱)

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ بھی حضرت عیسیٰ کے متعلق بشارت ہے کیونکہ جب ہیرود نے حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے کے بعد ان کے مار ڈالنے کے لئے ان کی تلاش کی تو خداوند کے فرشتے۔ نے خواب میں یوسف سے کہا کہ ''اٹھ اس لڑکے کو اور اس کی ماں کو لے کر مصر بھاگ جا'' (متی باب ۲۔۳ لغایت ۱۵) اور چونکہ ہیرود بادشاہ کے مرنے کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصر سے واپس

---

[1] لغز بہ ضم اول وسکون غین معجمہ وبعدہ زائے معجمہ کلام مبہم چیستان۔

آئے تھے تو صرف اتنے ہی گھاؤ پر سینٹ متی نے اس بشارت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق کر دیا۔

(متی باب ۲۔۱۹الغایت ۲۱)

حضرت یرمیا نبی نے بنی اسرائیل کی مصیبتوں کو بیان کرتے کرتے یہ فرمایا کہ "خداوند فرماتا ہے کہ راماہ میں دھاڑیں مار کر رونے اور نالہ کرنے کی آواز سنائی دیتی ہے کہ راحیل اپنے بیٹوں کے لئے روتی ہے اور تسلی نہیں پاتی کیونکہ وہ نہیں ہیں۔

(کتاب یرمیا باب ۳۱۔۱۵)

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک بشارت حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے کیونکہ جب "حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے تو ہیرود بادشاہ نے اس شبہ میں کہ کونسا بچہ ہے جو عیسیٰ ہوگا بیت لحم اور اس کی سرحدوں کے سب لڑکوں کو جو دو برس کے اور اس سے چھوٹے تھے قتل کروا" (انجیل متی باب ۲۔۱۶)

اب سینٹ متی نے صرف اس قدر لگاؤ سے کہ ان بچوں کے مارے جانے سے راماہ میں رونا اور پٹینا ہوا فرمایا کہ یہ پیشین گوئی حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے۔ (انجیل متی باب ۲۔۱۷۔۱۸)

حضرت اشعیاہ پیغمبر نے یہ بیان کرتے کرتے کہ "اب بیت المقدس (یروشلم) میں تکلیف باقی نہ رہے گی" یہ بھی فرمایا کہ "تنگی کی ظلمت جس میں زمین مبتلا ہوتی ہے باقی نہ رہے گی جس طرح کہ اگلے زمانہ میں زبلوں کی زمین اور نفتالی کی زمین کو حقیر کر کے آخر کار اسی طرح دریائے اردن (فرات) کے کنارے جلیل میں بڑے قبیلے ہوں گے جو قوم کہ اندھیرے میں چلتی ہے نور عظیم دیکھے گی اور موت کے سایہ کی زمین کے رہنے والوں پر ایک نور چمکے گا۔" (کتاب اشعیاہ باب ۹۔۱'۲)

حضرت متی فرماتے ہیں کہ یہ بشارت بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہے کیونکہ جب حضرت عیسیٰ نے سنا کہ حضرت یحییٰ پیغمبر گرفتار ہو گئے تو وہ جلیل کو چلے گئے اور ناصرہ کو چھوڑ کر کفرناحوم میں جو دریا کے کنارے زبلوں اور نفتالی کی سرحدوں میں ہے جا رہے۔ (متی باب ۴۔۱۲'۱۳)

سینٹ متی نے صرف اتنی بات پر کہ حضرت عیسیٰ دریا کے کنارے جا رہے تھے حضرت اشعیاہ نبی کے اس قول کو حضرت عیسیٰ کی بشارت قرار دیا۔ (انجیل متی باب ۴۔۱۴الغایت ۱۶)

حضرت ملاکی نبی نے اسرائیل کو خدا کی عدول حکمی پر ملامت کرتے کرتے یہ فرمایا کہ "اب میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میری برابر راہ کو تیار کرے گا اور جس خداوند کی تفحص میں یعنی رسول کے عہد اور اس سے خوش ہو یکا یک اپنی ہیکل میں آجائے گا۔ لشکروں کا خداوند فرماتا ہے کہ وہ اب آتا ہے۔" (کتاب ملاکی باب ۳۔۱)

اور جس وقت اشعیاہ نبی نے بنی اسرائیل اور بیت المقدس کو تسلی دی تو اس وقت یہ فرمایا کہ "پکارنے والا پکارتا ہے کہ بیابان میں خداوند کے لئے ایک راہ تیار کرو اور جنگل میں ایک شہر راہ میرے خدا کے لئے درست کرو۔" (کتاب اشعیاہ باب ۴۰۔۳)

حضرت متی اور مرقس اور لوقا تینوں حواری اس بات پر متفق ہیں کہ دونوں بشارتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہیں اس لئے کہ حضرت یحییٰ پیغمبر نے جب لوگوں کو اصطباغ دیا تو انہوں نے گویا حضرت عیسیٰ کے لئے راہ بنائی اور حضرت یحییٰ یہ کہا کرتے تھے کہ "میرے بعد ایک اور آتا ہے جو مجھ سے بھی زیادہ قوی ہے" پس حضرت یحییٰ کا یہ اصطباغ دینا تو راہ بنانا ہو گیا اور حضرت یحییٰ کا یہ کہنا کہ "میرے بعد ایک اور آتا ہے" پکارنے والی کی آواز ہو گئی اور وہ دونوں بشارتیں حضرت عیسیٰ پر صادق آ گئیں (متی باب

۳۔او۳'۱۱) انجیل مرقس باب ۱'۲'۳'۴'۷'۸ انجیل لوقا باب ۳۔۲ الغایت ۴)

ہم مسلمان حضرت یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو پیغمبر برحق جانتے ہیں مگر یہودی ان کو پیغمبر نہیں مانتے اور عہد عتیق میں ان کا کچھ ذکر نہیں ہے اور نہ کوئی صحیفہ حضرت یحییٰ کا موجود ہے۔ پس جو اقوال حضرت یحییٰ کے انجیلوں میں مذکور ہیں وہ زبانی روایتوں سے لکھے گئے ہیں اور جن لوگوں سے انجیلوں کے لکھنے والوں نے وہ اقوال سنے ان کا نام نہیں بتایا۔ عیسائی یقین کرتے ہیں کہ وہ سب روح القدس کی تائید سے لکھا گیا ہے جس کی صحت یقینی ہے مگر ہم مسلمان جس طرح کہ اپنے پیغمبر کے حواریین یعنی صحابہ وتابعین کے کلام کی سند چاہتے ہیں اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے کلام کو سند کا محتاج سمجھتے ہیں "لا نفرق بین احد من رسلہ"

ان چند بشارتوں کے ذکر کرنے سے جن کو حواریوں نے حضرت عیسیٰ کی بشارتیں قرار دیا ہے ہمارے اس خطبہ کے پڑھنے والے سمجھ جائیں گے کہ انبیاء سابق نبی لاحق کی بشارت کیسے دھندلے لفظوں میں اور کیسے کنایہ اور اشارہ سے مکھم مکھم میں دیتے تھے جس کا سمجھنا پہیلی اور معما اور چیستاں سے بھی زیادہ مشکل ہوتا تھا اور اب ہم اپنے پیغمبر خدا رسول اللہ کی بشارتیں بیان کرتے ہیں جن کو لوگ دیکھیں گے کہ وہ ان کی بہ نسبت کیسی صاف اور روشن ہیں۔

بشارات محمد رسول اللہ ﷺ تورات میں سے بشارت اول

حضرت موسیٰ کی پہلی کتاب میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے حضرت اسماعیل کی نسبت یہ وعدہ کیا ہے۔

عربی ترجمہ

قد سمعت دعاک لاسمعیل وھانا بارکتہ واثمرتہ وفضلتہ کثیرا کثیرا یولد شنی عشر خلیفۃ واجلعہ جیلا کبیرا.

وقال اللہ لابراھیم لا یضیق صدرک علی المولد وعلی امتک کلما تقول لک سارہ فاسمع بقولھا فانہ باسحق یدعی نسلک واجعل ابن الامۃ ایضا امہ لا نہ نسلک.

اردو ترجمہ

"میں نے تیری دعا اسماعیل کے حق میں قبول کی ہاں میں نے اسے برکت دی اور اسے بارآور کیا اور اسے بہت کچھ فضیلت دی۔ اس سے بارہ امام پیدا ہوں گے اور اس کو بڑی قوم کروں گا۔" (تورات کتاب اول باب ۱۷۔۲۰)

"کہا اللہ نے ابراہیم سے تیری نظروں میں برا نہ معلوم ہو اس لڑکے اور اپنی لونڈی کی وجہ سے جو کچھ تجھ سے سارہ کہے اس کی بات مان لے کیونکہ اسحق سے تیری نسل کہلائے گی اور اس لونڈی کے لڑکے کو بھی ایک قوم کروں گا کیونکہ وہ تیری نسل ہے۔" (تورات کتاب اول باب ۲۱۔۱۲'۱۳)

ان آیتوں میں محمد رسول اللہ ﷺ کی صریح بشارت ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اسماعیل کو برکت دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس طرح پورا ہوا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو جو اسماعیل کی اولاد سے تھے تمام دنیا کے لئے دنیا کے ختم ہونے تک نبی مقبول مقرر کیا۔

جو ہمارے مخالف ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ خدا نے اسماعیل سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کی اولاد میں بارہ سردار پیدا ہوں گے چنانچہ حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے جو بمنزلہ بارہ بادشاہوں یا بارہ سرداروں کے تھے پیدا ہوئے اور جس برکت دینے کا اسماعیل سے وعدہ ہوا تھا وہ دنیاوی برکت تھی نہ روحانی مگر یہ تاویل کسی طرح صحیح نہیں ہوتی۔ ہر ایک مصنف مزاج ان آیتوں کو پڑھ کر معلوم کرے گا کہ ان آیتوں میں جدا جدا تین لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ اول یہ کہ ''میں نے اس کو برکت دی'' دوم یہ کہ ''اسے بارآور کیا اور اسے بہت کچھ فضیلت دی'' سوم یہ کہ ''اس کو بڑی قوم کروں گا'' پس اب ہم یوں پوچھتے ہیں کہ کیا یہ کہنا صحیح ہے کہ ان تینوں جدا جدا لفظوں کے ایک ہی معنی ہیں؟ یعنی اولاد کا زیادہ ہونا۔

جب کہ حضرت اسحٰق بیر شبع میں پہنچے تو خدا تعالیٰ نے خواب میں ان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ''تیرے باپ ابراہیم کا خدا ہوں۔ تو ڈرمت میں تیرے ساتھ ہوں۔ تجھ کو برکت دوں گا اور اپنے بندہ ابراہیم کے سبب تیری نسل کو بہت کروں گا۔'' (تورات کتاب اول باب ۲۷۔۲۴)

جس مضمون کا وعدہ کہ حضرت اسماعیل سے کیا گیا اور جو لفظ برکت کا استعمال ہوا اسی مضمون کا وعدہ اسحٰق سے کیا گیا اور وہی لفظ برکت کا اسحٰق کے وعدہ میں بھی لایا گیا۔ پس یہ کہنا کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اسماعیل سے جو وعدہ تھا وہ تو دنیاوی تھا اور اسحٰق کا جو وعدہ تھا وہ روحانی تھا۔

ہم کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ خدا نے حضرت ابراہیم سے کیا وعدہ کیا تھا۔ تورات میں لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیم کنعان میں پہنچے تو خدا نے ان سے کہا کہ یہ زمین تیری اولاد کو دوں گا۔ (تورات کتاب اول باب ۱۲۔۷)

اور جب کہ حضرت لوط اور حضرت ابراہیم سے جدا ہو گئے تو پھر خدا نے ابراہیم سے کہا کہ آنکھیں کھول اور چاروں طرف دیکھ کہ یہ تمام زمین جو تو دیکھتا ہے تیری اولاد کو دوں گا اور تیری اولاد کو زمین کی ریت کی مانند کروں گا جو کوئی ریت کے ذروں کو گن سکے تو تیری اولاد کو بھی گن سکے گا۔ (تورات کتاب اول باب ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶)

پھر ایک دفعہ خدا نے ابراہیم سے وعدہ کیا کہ تیری اولاد اتنی ہوگی جتنے آسمان کے ستارے جن کو گن نہیں سکتا۔ (تورات کتاب اول باب ۱۵۔۵)

پھر خدا نے ابراہیم سے ایک اور پختہ وعدہ کیا کہ یہ زمین مصر کے دریا سے فرات کے دریا تک تیری اولاد کو دوں گا۔ (تورات باب ۱۵۔۱۸)

اور جب کہ حضرت ابراہیم ضعیف ننانوے برس کے ہو گئے تھے تب پھر خدا نے حضرت ابراہیم سے وعدہ کیا کہ تجھ میں اور مجھ میں یہ وعدہ ہوتا ہے کہ تجھ کو زیادہ سے زیادہ کروں گا۔ تو بہت سی قوموں کا باپ ہوگا۔ تجھ سے قومیں پیدا ہوں گی۔ تجھ سے بادشاہ نکلیں گے اور تیری اولاد سے بھی یہ ہمیشہ کا عہد ہوگا اور کنعان کی زمین بوراثت دائمی تجھ کو دوں گا۔ (تورات کتاب اول باب ۱۷۔۳، ۴، ۵، ۸)

یہ تو وعدے تھے جو خدا نے حضرت ابراہیم سے کئے تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ خدا نے اسحٰق ویعقوب سے کیا وعدہ کیا تھا۔

تورات میں لکھا ہے کہ جب یعقوب بیر شبع سے حاران کی جانب روانہ ہوئے تو ایک مقام پر پتھر سرہانے رکھ کر سو رہے۔ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سیڑھی آسمان تک لگی ہوئی ہے اور خدا کے فرشتے اس پر اترتے چڑھتے ہیں اس پر خدا نے کھڑے ہو

کر کہا کہ میں تیرے باپ ابراہیم اور اسحٰق کا خدا ہوں۔ یہ زمین جس پر تو سوتا ہے تجھ کو اور تیری اولاد کو دیتا ہوں۔ تیری اولاد زمین کے ریت کے برابر ہوگی اور چاروں طرف پھیل جائے گی۔ (توارت کتاب اول باب ۲۸۔۱۲،۱۳،۱۴)

یہ بات بھی زبور سے ثابت ہے کہ خدا نے جو ابراہیم سے عہد کیا تھا وہی بعد کو بھی قائم رہا اور وہ صرف کنعان کی زمین دینے کا عہد تھا۔ چنانچہ زبور داؤد میں خدا کا کلام اس طرح لکھا ہے کہ ''وہ عہد جو میں ابراہیم سے کیا اور اسحٰق سے اس کی قسم کھائی اور یعقوب کے ساتھ بمنزلہ قانون کے مقرر کیا اور اسرائیل سے عہد دائمی کیا اور کہا کہ زمین کنعان تجھ کو دیتا ہوں تا کہ تیری میراث کا حصہ ہو۔'' (زبور ۱۰۵۔۹،۱۰،۱۱)

اب دیکھو کہ اسی وعدہ کا پورا کرنا خدا نے بتلایا چنانچہ تورات میں لکھا ہے کہ جب حضرت موسیٰ مواب کے جنگل میں نبو پہاڑ پر چڑھے جو ریحو کے سامنے ہے تو خدا نے موسیٰ سے کہا کہ ''یہ وہ زمین ہے جس کی نسبت میں نے بقسمیہ ابراہیم واسحاق ویعقوب سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری اولاد کو دوں گا۔ پس یہ زمین میں تجھ کو آنکھوں سے دکھلا دیتا ہوں مگر تو وہاں نہیں جائے گا۔'' (تورات کتاب پنجم باب ۳۴۔۴)

اب یہ تمام وعدے جو خدا نے ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کے ساتھ کیے تھے ہم نے منتخب کر کے ہر منصف مزاج پڑھنے والے کے سامنے رکھ دیئے ہیں اور اس کے بعد ہم دو سوال کرتے ہیں۔ اول یہ کہ جو وعدے خدا نے ابراہیم کی اولاد کے لئے کیے ہیں وہ وعدے اسمٰعیل اور اسحاق علیہم السلام دونوں کے حق میں کیوں نہیں سمجھے جاتے؟ حالانکہ خود خدا نے بھی کہا ہے کہ اسمٰعیل بھی ابراہیم کی اولاد ہے جیسا کہ باب ۲۱ آیت ۱۲ میں مذکور ہے۔

دوسرا سوال ہمارا یہ ہے کہ جو وعدہ خدا نے اسحٰق ویعقوب کی نسبت کیا تھا یعنی ملک کنعان دینے اور اولاد زیادہ کرنے کا اس میں کیا ایسی چیز ہے جس سے وہ روحانی قسم کا سمجھا جاتا ہے اور جو وعدہ اسمٰعیل کی نسبت کیا تھا اس میں کون سی چیز کی کمی ہے جس سے وہ دنیاوی سمجھا جاتا ہے۔

جو لوگ انصاف سے ان باتوں پر نظر کرتے ہیں وہ بہ یقین جانتے ہیں کہ خدا نے اسحٰقؑ سے بھی برکت کا وعدہ کیا اور ان کی اولاد میں انبیاء پیدا ہوئے'' ملک فتح کیے'' کنعان بھی فتح کیا۔ اسمٰعیل سے خدا نے برکت کا وعدہ کیا۔ اس کی اولاد میں سب سے آخر ایک پیغمبر آخر الزمان پیدا کیا۔ تمام دنیا کو اس سے برکت دی۔ اسمٰعیل کی اولاد نے بھی ملک فتح کیے۔ کنعان کو جو غیر خدا پرستوں کے ہاتھ چلا گیا تھا پھر فتح کیا اور ابراہیم ہی کی نسل میں پھر اس ورثہ کو لے آئے اور جب تک خدا کی مرضی ہے وہ ابراہیم کا ورثہ ان کے حصہ میں رہے گا اگرچہ بقائے اصلی صرف خدا کی ذات کو ہے۔

الا کل شئی ماخذ اللہ زائل

بشارت دوم

خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بہت سے احکام بتلائے اس میں یہ بھی فرمایا:

عربی ترجمہ

''الھک الموجود یقیم لک بنیان من بینک من اخوتک مثلی لہ تسلمون: نبی من بین اخوتھم'

اقیم لهم مثلک والقی کلامی بفیه و کل ما آمره یقول لهم"

اردو ترجمہ

قائم کرے گا تیرا معبود تیرے لئے نبی تجھ میں سے تیرے بھائیوں میں سے مجھ سا۔ اس کو مانیو ان کے بھائیوں میں سے نبی تیرا سا قائم کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں دوں گا اور جو کچھ میں اس سے کہوں گا وہ ان سے کہہ دے گا"(توریت پنجم باب ۱۸، ۱۵)

ان آیتوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی ایسی صاف اور ایسی مستحکم بشارت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ایک نبی مثل موسیٰ کے مبعوث کرے گا اور کچھ شبہ نہیں ہو سکتا کہ بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسمٰعیل اور بنی اسمٰعیل میں بجز محمد رسول اللہ ﷺ کے اور کوئی نبی نہیں ہوا اور اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ یہ بشارت ہمارے ہی جناب پیغمبر خدا ﷺ کی تھی۔

علاوہ اس کے ان آیتوں میں دو لفظ ہیں جن پر غور کرنا چاہیے۔ اول یہ کہ "اپنا کلام اس کے منہ میں دوں گا" دوم یہ کہ "مثل تیرے" یعنی موسیٰ علیہ السلام کے ان دونوں لفظوں کا مصداق سوائے محمد رسول اللہ ﷺ کے اور کوئی نہیں ہے۔

یہودی اور عیسائی دونوں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انبیائے بنی اسرائیل پر سوائے احکام عشرہ موسیٰ کے جو وحی آتی تھی اس کے لفظ وہی نہیں ہیں جو توریت زبور وصحف انبیاء میں لکھے ہوئے ہیں بلکہ انبیاء کو صرف مطلب القاء ہوتا تھا اور وہ اس کو اپنی زبان و محاورہ میں لوگوں کے سامنے بیان کرتے تھے۔ اناجیل اربعہ جو اب معتمد اور قابل سند عیسائیوں میں تسلیم ہوتی ہیں ان کے الفاظ تو وہ ہیں ہی نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان مبارک سے نکلے تھے کیونکہ حضرت عیسیٰ کی عبرانی زبان تھی اور وہ انجیلیں یونانی میں تحریر ہوئی ہیں۔ ہاں البتہ قرآن مجید ایسا ہے کہ اس کے لفظ پیغمبر کے منہ میں رکھے گئے اور وہی لفظ پیغمبر نے لوگوں کو پڑھ کر سنائے۔ پس یہ الفاظ اس بشارت کے کہ "اپنا کلام اس کے منہ میں دوں گا" سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی پر صادق ہی نہیں آتے۔

اب دوسری بات پر غور کرو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند کونسا پیغمبر ہوا ہے۔ بنی اسرائیل میں تو کوئی پیغمبر مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نہیں ہوا کیونکہ حضرت عزیر پیغمبر نے جب توریت کو بعد قید بابل کے تحریر فرمایا تو اس میں یہ لکھا ہے کہ:

عربی ترجمہ

"وما قام نبی وما بعد باسرائیل کموسی الذی عرف الله بالمشافهة"

اردو ترجمہ

"اور پھر قائم نہ ہوا کہ نبی بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند جس نے پہچانا اللہ کو رو برو"(توریت کتاب پنجم باب ۳۴، ۱۰)

پس اب بنی اسرائیل کے بھائیوں میں دیکھنا چاہیے کہ کون پیغمبر ہوا۔ وہ بجز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہے۔

ہاں اب یہ دیکھنا باقی رہا کہ وہ مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہیں یا نہیں۔ سو مندرجہ ذیل باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت محمد ہی ایسے پیغمبر ہیں جو مثل موسیٰ علیہ السلام کے ہوئے ہیں۔

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے کافر دشمنوں کے خوف سے اپنے وطن سے ہجرت کی۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ

وسلم کو بھی اپنے کافر دشمنوں کے خوف سے اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ہجرت کر کے شہر یثرب میں جس کو اب مدینہ کہتے ہیں اور جو بانی شہر کے نام پر کہلاتا تھا پناہ لی۔ اسی طرح حضرت محمد ﷺ نے بھی اپنے وطن مکہ سے ہجرت کر کے اسی شہر مدینہ میں پناہ لی۔

۳۔ حضرت موسیٰ پر کلام خدا کا بلفظہ نازل ہوا جو دس احکام ہیں۔ حضرت محمد ﷺ پر بھی کلام خدا کے بلفظہ نازل ہوا موجود ہے اور کلام اللہ کہلاتا ہے۔

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی کافروں کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت محمد ﷺ کو بھی وحدانیت خدا کے وعظ کرنے سے جو کافر مانع ہوں ان سے جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ البتہ جہاد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نہایت سخت قاتل خونریز تھا اور حضرت محمد ﷺ کا جہاد نہایت ملائم اور امن چاہنے والا اور امن دینے والا اور جانوں کا بچانے والا تھا۔

۵۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی متفرق اور پامال قوم کو مصر سے نکال کر یکجا جمع کیا۔ حضرت محمد ﷺ نے بھی تمام تفرق اور مختلف عرب کی قوموں کی جو آپس میں نہایت دشمن اور کینہ ور تھیں جن کے باہم ہر سال خون کے نالے بہتے تھے اکٹھا کر دیا بلکہ یک دل و یک جان کر دیا اور اس پر عمدہ بات یہ کہ سب کو ایک خدائے واحد ذوالجلال کی پرستش کرنے والا کر دیا اور ایسا قوی کر دیا کہ کوئی اس کے مقابل نہ تھا۔

۶۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ملک فتح کیے اور بنی اسرائیل میں دنیاوی بادشاہت بھی قائم کی۔ حضرت محمد نے بھی ملک فتح کیے اور بنی اسمٰعیل میں دنیاوی بادشاہت بھی قائم کر دی۔ اگرچہ اتنا فرق ہے کہ حضرت موسیٰ کا اصلی مقصد بادشاہت قائم کرنے اور ملک کنعان پر قبضہ کرنے کا تھا۔

۷۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا تعالیٰ کی جانب سے شریعت عطا ہوئی اور ایک کتاب دی گئی (یعنی توریت) جس میں تمام احکام شریعت کے ہیں۔ حضرت محمد کو بھی شریعت عطا ہوئی اور ایک کتاب دی گئی (یعنی قرآن پاک) جس میں تمام احکام شریعت کے ہیں اور غالباً کوئی اور پیغمبر سوائے حضرت موسیٰ اور حضرت محمد ﷺ کے ایسا نہیں ہوا جس کو ایسا قانون شریعت عطا ہوا ہو کیونکہ تمام انبیاء بنی اسرائیل اور خود حضرت عیسیٰ سب کے سب موسیٰ کی شریعت کے تابع تھے۔ کسی کو خاص شریعت عطا نہیں ہوئی تھی۔

۸۔ عیسائی مصنفوں نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ حضرت محمد مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تھے۔ مسٹر رینان نے حضرت عیسیٰ کے حالات زندگی کے بیان میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ صرف غور ہی کرنے والے اور سوچنے والے نہ تھے بلکہ وہ دونوں کام کرنے والے بھی تھے اور اپنے ہم وطنوں اور ہمعصروں کے لئے کام تجویز کرتے تھے اور اسی کے ذریعہ سے ان دونوں نے انسانوں پر حکومت کی۔

۹۔ کوارٹر لے ریویو نمبر ۲۵۴ میں جو آرٹیکل اسلام پر چھپا ہے اس آرٹیکل کا لکھنے والا لکھتا ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) کو اپنے وطن میں رہنا مشکل معلوم ہوا اور اس لئے انہوں نے ہجرت کی تاکہ کسی دوسرے مقام پر جا کر وعظ کریں جیسے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اور دوسرے نبیوں نے ہجرت کی۔

ان کے پیروؤں نے اطاعت اور وفاداری کا وعدہ کیا اور جب یہ ہو چکا تو انہوں نے ان میں سے بارہ آدمی منتخب کیے۔ حضرت

عیسیٰ علیہ السلام نے بھی بارہ حواری چنے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی بنی اسرائیل کی قوم میں سے اپنی بہ نسبت زیادہ عمر کے لوگ منتخب کئے تھے۔

۱۰ ہجری میں آخری مرتبہ آنحضرت ﷺ چالیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ مکہ میں آئے اور کوہ عرفات پر مثل حضرت موسیٰ کے ان کو برکت دی اور اپنی آخری نصیحتیں کیں اور خصوصاً یہ نصیحت فرمائی کہ کمزوروں مفلسوں اور عورتوں کو پناہ دو اور سود خوری سے پرہیز کرو۔

آنحضرت ﷺ نے بھی مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری مرتبہ مسلمانوں سے پوچھا کہ میں نے کسی کا کچھ نقصان تو نہیں کیا اور کسی کا کچھ قرض تو مجھ پر نہیں ہے؟ انتہیٰ

یہ سب تمثیلیں وہ تھیں جو کوارٹر لے ریویو میں لکھی ہیں۔ پس اب سوائے اس کے جو براہ تعصب اس صاف اور روشن بشارت سے آنکھ بند کرے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں ہے۔

جو آیتیں توریت کی ہم نے اوپر بیان کی ہیں ان میں سے ایک کے یہ الفاظ ہیں کہ "قائم کرے گا تیرا معبود موجود تیرے لئے نبی تجھ میں سے تیرے بھائیوں میں سے۔" اس لفظ "تجھ میں سے" پر ہم نے خطبات احمدیہ میں جو انگریزی زبان میں چھپی ہے کچھ بحث نہیں کی تھی۔ سبب اس کا یہ تھا کہ دوسری آیت میں یہ لفظ نہیں تھا اور اس میں نہایت صفائی سے بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے یعنی بنی اسمٰعیل میں سے نبی مبعوث ہونا ظاہر تھا اور جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچویں کتاب کے چونتیسویں باب کی دسویں آیت سے جو اوپر لکھی گئی صاف صاف ثابت تھا کہ بنی اسرائیل میں سے کوئی نبی مثل موسیٰ علیہ السلام کے نہیں ہوا تو صاف یقین ہو گیا تھا کہ بنی اسمٰعیل میں سے جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں نبی موعود ہونے والا تھا۔ مگر مولوی چراغ علی صاحب نے اپنے رسالہ بشارت مثل موسیٰ میں اس پر بحث کی ہے۔ وہ ارقام فرماتے ہیں کہ لفظ "تجھ میں سے" اصل صحیح نسخہ توریت میں تھا بلکہ کاتبوں کی غلطی سے یہ لفظ بڑھ گیا ہے اور اس کے ثبوت پر نہایت مضبوط تین دلیلیں پیش کیں ہیں۔

اول

یہ کہ اسی آیت کو پطرس حواری نے اعمال حواریین میں نقل کیا ہے اور اس میں یہ فقرہ "تجھ میں سے" نہیں ہے۔

دوم

یہ کہ استیفان حواری نے بھی اس آیت کو نقل کیا ہے اس میں بھی وہ فقرہ نہیں ہے۔

سوم

یہ کہ توریت کے یونانی ترجمہ میں جو سپٹو ایجنٹ کہلاتا ہے اور نہایت قدیم اور بہت معتبر ترجمہ ہے اس میں بھی یہ فقرہ نہیں ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم صحیح نسخوں میں یہ الفاظ نہ تھے۔

وہ یہ بھی ارقام فرماتے ہیں کہ پہلی آیت میں جو ضمیر واحد کی ہے وہاں اصل میں جمع کی تھی جیسے کہ ان حواریوں کی تحریروں اور یونانی ترجمہ سے پایا جاتا ہے۔

میں نے اس بحث کو جناب مولانا و بالفضل و مولانا جناب مولوی عنایت رسول صاحب چڑیا کوٹی کے سامنے پیش کیا جو عبرانی

زبان اور توریت مقدس کے بہت بڑے عالم ہیں اور غالباً ہم مسلمانوں میں آج تک عبرانی اور کالدی زبان اور توریت وزبور وصحف انبیاء کا ایسا کوئی عالم نہیں گزرا۔ جناب ممدوح نے فرمایا کہ ترجموں کی طرف ہم کو التجا لے جانے کی کچھ ضرورت نہیں ہے اور جب کہ یونانی ترجمہ توریت کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پیشتر ہو چکا تھا تو حواریوں نے بھی غالباً اسی ترجمہ سے نقل کیا ہوگا۔ تو پس گویا دلیل صرف ایک یونانی ترجمہ پر عود کرتی ہے اور ہم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ترجمہ کے استدلال سے اصل متن پر کچھ الزام لگا دیں مگر جن لفظوں میں بحث ہے وہ ہمارے مطلب کے بہت زیادہ مفید و موید ہیں۔

آیت جس کے لفظوں پر بحث یہ ہے کہ ''قائم کرے گا تیرا معبود موجود تیرے لیے نبی تجھ میں سے تیرے بھائیوں میں مجھ سا اس کو مانیو'' یہ قول حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے اور مخاطب اس کا کوئی شخص خاص نہیں ہے بلکہ کل قوم بنی اسرائیل ہے اور تمام قوم جو جنس واحد ہے اسی کی طرف ضمیر خطاب واحد کا استعمال کیا ہے۔

اب اس مقام پر حضرت موسیٰ کو یہ بتانا تھا کہ وہ نبی بنی اسرائیل میں سے نہیں ہونے کا بلکہ برادران بنی اسرائیل میں سے ہوگا۔ پس اگر اس مقام پر صرف یہی کہا جاتا کہ تیرے بھائیوں میں سے ہوگا تو یہ بات بخوبی روشن نہ ہوتی کہ بنی اسرائیل میں سے نہ ہوگا کیونکہ اگر قوم کو صرف یہ کہا جائے کہ تمہارے بھائیوں میں سے ہوگا تو اس وقت یہ احتمال کہ اسی قوم میں سے کوئی ہو زائل نہیں ہوتا۔ اس لئے اولاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ''تجھ میں سے'' اور پھر اس کا بدل واقع ہوا ''تیرے بھائیوں میں سے'' تو اس سے صاف متیقن ہو گیا کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہوگا نہ بنی اسرئیل میں سے۔ پس اسی طرز کلام سے بنی اسرائیل میں سے اس نبی موعود کے مبعوث ہونے کا احتمال بالکل زائل ہو جاتا ہے اور الفاظ کہ ''تیرے بھائیوں میں سے'' الفاظ ''تجھ میں سے'' کا بیان تصور نہیں ہو سکتے' کیونکہ اگر مقصود یہ ہوتا کہ وہ نبی موعود بنی اسرائیل میں سے ہوگا تو خود الفاظ ''تجھ میں سے'' ہی زیادہ تر اس مطلب کا بیان کرتے تھے بہ نسبت الفاظ ''تیرے بھائیوں میں سے'' کے۔ پس کسی طرح یہ پچھلے الفاظ پہلے الفاظ کی تفسیر اور بیان نہیں ہو سکتی' بلکہ وہ پہلے الفاظ کے بدل واقعہ ہوئے ہیں جن سے اس نبی موعود کا بنی اسمٰعیل سے ہونا معین ہو جاتا ہے۔

انقلس نے جو نہایت قدیم ترجمہ کالڈی زبان کا ہے اس مقام پر ترجمہ بصیغہ واحد کیا ہے یعنی بجائے اس کے کہ ''تیرے بھائیوں میں سے'' اس نے ترجمہ کیا ہے ''ترے بھائی میں سے'' اس کا سبب یہ ہے کہ عبرانی میں جو لفظ ''ماحیخا'' ہے اس کے حرف یا کو اگر علامت اضافت سمجھیں تو ترجمہ بصیغہ واحد ہونا چاہیے اور اگر علامت جمع سمجھیں تو ترجمہ بصیغہ جمع ہونا چاہیے۔ بہر حال ایک بڑے یہودی عالم کی یہ رائے ہے کہ وہ حرف یا علت اضافت ہے اور جب ترجمہ بصیغہ واحد ہو تو صاف بنی اسرائیل کے بھائی کوئی دوسری قوم ہونی چاہیے اور اس صورت میں بنی اسمٰعیل میں سے نبی موعود کا ہونا متعین ہو جاتا ہے اور ''ماحیخا'' کا بجز بدل ہونے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

مولوی چراغ علی صاحب نے اپنے رسالہ بشارت مثل موسیٰ میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ کہنا کہ بموجب محاورہ توریت کے بھائیوں کے لفظ سے ہمیشہ بنی اسرائیل ہی مراد ہوتے ہیں محض غلط ہے۔ بلکہ کتاب استثنا باب ۲۳۔۸ میں بنی قطورہ پر اور کتاب استثناء باب ۴۔۲ و باب ۲ و ۸ باب ۲۳۔۸ وصحیفہ اشعیاہ باب ۲۰۔۱۲ وصحیفہ عبدیا آیت ۱۰ میں بنی عیشاو پر اور کتاب پیدائش باب ۱۶' ۱۲۔ و باب ۲۵۔۱۸ میں بنی اسمٰعیل پر لفظ بھائیوں کا بولا گیا ہے اور جو کہ ان میں سے بجز اسمٰعیل کے اور کسی کو برکت نہیں دی گئی تھی اس لئے بنی اسمٰعیل ہی میں سے نبی موعود کا مبعوث ہونا متعین اور منحصر ہو گیا تھا۔

بشارت سوم

حضرت موسیٰ پیغمبر اور حضرت حبقوق نبی نے نبی عربی حجازی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی اس طرح بشارت دی ہے:

عربی ترجمہ

"وقال ان الله طلع من سينا– واشرق لهم من السعير ومن جبل فاران تجلي– بيمينه شريعة بيضاء بجند الملائكة اتي' ياتي الله من جنوب والقدوس من جبل فاران– زين السموات الارض بحمد ملئان"

اردو ترجمہ

اور کہا خدا سینا سے نکلا اور سعیر سے چمکا اور فاران کے پہاڑ سے ظاہر ہوا اس کے ہاتھ میں شریعت روشن ساتھ لشکر ملائکہ کے آیا۔ (توریت کتاب پنجم باب ۳۳-۲)

آئے گا اللہ جنوب سے اور قدوس فاران کے پہاڑ سے آسمانوں کو جمال سے چھپادیا اس کی ستائش سے زمین بھر گئی (کتاب حبقوق باب ۳-۳)

ان آیتوں میں جو کوہ فاران سے خدا کا ظاہر ہونا اور شریعت کا اس کے ہاتھ میں ہونا بیان ہوا وہ علانیہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے اور قرآن مجید کے نازل ہونے کی کہ وہی شریعت ہی بشارت ہے۔

یہ بات عرب کے قدیم جغرافیہ سے اور بڑے بڑے عالموں کی تحقیق اور تسلیم سے اور توریت کے محاورات سے بخوبی ثابت ہو گئی ہے کہ مکہ معظمہ کے پہاڑوں کا نام فاران ہے۔ چنانچہ امر مذکورہ کے ثبوت کی کافی دلیلیں بیان کرتے ہیں۔

اکتوبر ۱۸۶۹ کے کوارٹرلی ریویو میں اسلام پر ایک آرٹیکل چھپا ہے جو ایک بہت بڑے عالم یہودی زبان جاننے والے کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے صفحہ ۲۹۹ میں لکھا ہے کہ مصنف نے ان خاص آیتوں کی جن میں سینا اور سعیر اور فاران کی بشارت مذکور ہے اس پر تشریح کی ہے کہ "خدا سینا سے نکلا" یعنی عبرانی زبان میں شرع دی گئی (جس سے مراد توریت ہے) اور "سعیر سے چمکا" یعنی یونانی زبان میں بھی شریعت دی گئی جس سے مراد انجیل ہے (اور مسلمان کل عیسائیوں کو روی کہتے تھے) اور "فاران کے پہاڑ سے ظاہر ہوا اور اس کے ہاتھ میں شریعت روشن" یعنی عربی زبان میں شریعت دی گئی (جس سے مراد قرآن مجید ہے) پس اس عالم کے قول سے ثابت ہے کہ فاران وہی جگہ ہے جہاں سے مذہب اسلام ظاہر ہوا یعنی حجاز یا مکہ معظمہ۔

چند سطروں کے بعد آرٹیکل کا لکھنے والا پھر لکھتا ہے کہ "اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سینا اور سعیر اکثر بجائے اسرائیل اور عیسیٰ کے مستعمل ہوتے ہیں اور ادوم بجائے روم کے اور فاران تو صاف عرب کے لئے مستعمل ہے۔ صرف اس میں شبہ ہے کہ مکہ کے گرد کے پہاڑوں کا یہ نام ہے یا نہیں" مگر ہم اس شبہ کو بھی مٹا دیں گے اور قدیم جغرافیہ کی تحقیقات سے ثابت کر دیں گے کہ مکہ کے گرد پہاڑ ہی فاران ہیں۔

توریت کتاب اول باب ۲۱ آیت ۲۰ لکھا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنے اس سے نکال دیا تو وہ دونوں بیر شبع کے بیابان میں پھرا کیے اور اسی باب کی اکیسویں آیت میں لکھا ہے کہ بیابان فاران میں ساکن ہوئے۔

قرآن مجید سے بھی حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت بیابان معلوم ہوتی ہے۔قرآن مجید حضرت اسمٰعیلؑ کے اس زمانہ کی سکونت کا ذکر ہے جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے پاس آئے تھے اور خانہ کعبہ کی تعمیر کر کے اسی کے پاس حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت مستقل طور پر کر دی تھی اور یہ بات توریت سے بھی پائی جاتی ہے کہ پہلے حضرت اسمٰعیلؑ بیابان میں خانہ بدوش تھے پھر بیابان فاران میں سکونت اختیار کی۔

قرآن مجید میں حضرت ابرہیم علیہ السلام کی دعا اس طرح پر مذکور ہے کہ "اے خدا میں نے اپنی اولاد میں سے تیرے بزرگ گھر کے پاس بن کھیتی کے میدان میں آباد کیا ہے۔لفظ "مدبر" جو توریت میں عبرانی زبان کا آیا ہے اور لفظ "وادغیر ذی زرع" کا جو قرآن مجید میں آیا ہے ان دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔پس توریت مقدس اور قرآن مجید میں یہ بات تو متفق ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ وادی میں آباد ہوئے مگر اس وادی کے نام اور مقام میں بحث باقی رہی۔توریت مقدس سے تو اس کا نام فاران معلوم ہوا اور قرآن مجید سے اس کا مقام وہ معلوم ہوا جہاں کہ اب کعبہ ہے اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مکہ معظمہ جہاں کعبہ بنا ہوا ہے وادی فاران میں واقع ہے تو یہ امر بھی متفق علیہ ہو جائے گا۔

اب ہم اس بات سے جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے یعنی کعبہ کے پاس حضرت اسمٰعیلؑ کا آباد ہونا اس سے قطع نظر کرتے ہیں اور جو بات توریت میں ہے اور جس کو یہودی اور عیسائی دونوں تسلیم کرتے ہیں اسی کو مدار اپنے استدلال کا قرار دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ وادی فاران میں ساکن ہوئے۔

اب ہم کو قدیم جغرافیہ سے اس بات کی تلاش باقی رہی کہ حضرت اسمٰعیلؑ کس جگہ آباد ہوئے تھے کیونکہ جو مقام ان کی سکونت کا ثابت ہو جائے گا وہی وادی فاران ہوگا۔

اس مطلب کے حل کرنے کے لئے تین سوال قابل غور ہیں۔

اول

یہ کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی ماں کو گھر سے نکال کر کس مقام پر چھوڑا؟

دوم

یہ کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی ماں بیابان میں پھرنے کے بعد کس مقام پر آباد ہوئیں؟

سوم

یہ کہ وہ اسی جگہ رہتی رہیں جہاں انہوں نے پہلی دفعہ سکونت اختیار کی تھی یا کسی اور مقام پر جا رہی تھیں۔

قرآن مجید میں ان باتوں کا کچھ تذکرہ نہیں ہے لیکن چند روایتیں اور کچھ حدیثیں اس کے متعلق ہیں۔حدیثوں کا جو اس معاملہ سے متعلق ہیں یہ حال ہے کہ وہ کافی اعتبار کے لائق نہیں اور نہ وہ مرفوع ہیں یعنی ان کی سند پیغمبر خدا (ﷺ) تک نہیں ہے۔پس وہ بھی مثل روایتوں کے نامعتبر ہیں اور روایتیں تو کسی طرح قابل اعتبار کے ہیں ہی نہیں کیونکہ ان میں نہایت اختلاف ہے اور مختلف

اوقات کے واقعات سب ایک جگہ گڈمڈ کر دیئے ہیں پس پہلے سوال کی نسبت جو کچھ توریت مقدس میں لکھا ہے اس سے زیادہ لکھنے کی کچھ ضرورت نہیں اور وہ یہ ہے کہ ''حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو دو روٹیاں اور پانی کی ایک چھاگل دے کر نکال دیا اور وہ بیرشبع کے بیابان میں پھرا کیں'' (توریت کتاب اول باب ۲۱ آیت ۱۶)

دوسرے سوال کا جواب اس مقام کی تحقیق کرنے پر منحصر ہے جہاں حضرت اسماعیل آباد ہوئے اور اس مقام کی تحقیقات کا اس سے زیادہ عمدہ اور قابل اطمینان کوئی طریقہ نہیں ہے کہ ہم پرانے جغرافیہ پر متوجہ ہوں اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کے رہنے کے مکانات کے کھنڈروں کی تحقیقات کریں جہاں وہ ملیں وہی مقام سکونت حضرت اسماعیل کا ہوگا اور وہ وہی مقام وادی فاران بھی ضرور ہوگا۔ اس لئے کہ یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ وادی فاران میں آباد ہوئے تھے۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے:

(۱) نبایوث (۲) قیدار (۳) اوبنیل (۴) مبسام (۵) مشماع (۶) دوما
(۷) مسا (۸) حدر (۹) تیما (۱۰) یطور (۱۱) نافیش (۱۲) قیدماہ

پہلا بیٹا

حضرت اسمٰعیلؑ کا نبایوث عرب کے شمال مغربی حصہ میں آباد ہوا۔ ریورنڈ کارٹری پرکاری۔ ایم۔ اے نے اپنے نقشہ میں اس کا نشان ۳۸' ۳۰ درجہ عرض شمالی اور ۳۶' ۳۸ درجہ طول شرقی کے درمیان لگایا ہے۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ نبایوث کی اولاد عربیا پیٹیرا سے مشرق کی طرف عربیا ڈزرٹا تک اور جنوب کی طرف خلیج الامنک و حجاز تک پھیل گئی تھی۔

اسٹریبو کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ نبایوث کی اولاد نے اس سے بھی زیادہ ملک گھیر لیا تھا اور مدینہ تک اور بندر حوز اور بندر ینبوع تک جو بحر قلزم کے کنارہ پر ہے اور مدینہ سے جنوب مغرب میں واقعہ ہے ان کی عمل داری ہوگئی تھی۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر لکھتے ہیں کہ اس مختصر بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبایوث کی اولاد صرف پتھریلے میدانوں میں نہیں پڑی رہی بلکہ حجاز کے بڑے بڑے ضلعوں میں پھیل گئی۔

ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ نبایوث کی اولاد عرب کے بہت بڑے حصے میں پھیل گئی ہوالا یہ بات کہ بنایوث کی سکونت اور اس کی اولاد کی سکونت عرب میں تھی بخوبی ثابت ہے۔

دوسرا بیٹا

دوسرا بیٹا حضرت اسمٰعیلؑ کا قیدار نبایوث کے پاس جنوب کی طرف حجاز میں آباد ہوا۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ اشعیاہ نبی کے بیان سے بھی صاف صاف قیدار کا مسکن حجاز ثابت ہوتا ہے جس میں مکہ و مدینہ بھی شامل ہیں۔ اور زیادہ ثبوت اس کا حال کے جغرافیہ میں شہرالحدرا اور بنت سے پایا جاتا ہے جو اصل میں قیدار اور بنویوث ہیں۔ اہل عرب کی یہ روایت کہ قیدار اور اس کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ عہد عتیق میں قیدار کا مسکن عرب کے اسی حصہ میں یعنی حجاز میں بیان ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ بخوبی ثابت ہے کہ یورینس اور بطلیموس اور پلینی اعظم کے زمانوں میں یہ قوم حجاز کی باشندہ تھیں۔ کیڈری یعنی

قیدری دری یعنی مخفف قیدری اور کذور نائی یعنی قیداری کریتی یعنی قیدری چنانچہ اس کا ذکر ہسٹری جغرافیہ جلد اول صفحہ ۲۴۸ میں مندرج ہے۔ پس بخوبی ثابت ہے کہ قیدار حجاز میں آباد ہوا تھا۔

ریورنڈ کارٹری پی کاری نے اپنے نقشہ میں قیدار کی آبادی کا نشان ۲۶ '۲۸ درجہ عرض شمالی ۳۷ '۳۸ درجہ طول شرقی کے درمیان لگایا ہے۔

تیسرا بیٹا

تیسرا بیٹا حضرت اسمٰعیل کا اوبئیل ہے۔ بموجب سند جوزیفس کے اوبئیل بھی اپنے ان دونوں بھائیوں کے ہمسایہ میں آباد ہوا تھا۔

چوتھا بیٹا

چوتھا بیٹا حضرت اسمٰعیل کا مبسام ہے مگر اس کی سکونت کے مقام کا پتہ نہیں ملتا۔

پانچواں بیٹا

پانچواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا مشماع ہے۔ رورنڈ مسٹر فارسٹر کا یہ قیاس صحیح ہے کہ عبرانی میں جس کو مشماع لکھا ہے اس کو یونانی ترجمہ سپٹوایجنٹ میں مسما اور جوزیفس مساس وبطلیوس نے مسیمز لکھا ہے اور عرب میں اسی کی اولاد بنی مسماع کہلاتی ہے۔ پس کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا قریب نجد کے اولاً آباد ہوا تھا۔

چھٹا بیٹا

چھٹا بیٹا حضرت اسمٰعیل کا دوماہ تھا۔ مشرقی اور مغربی جغرافیہ دان قبول کرتے ہیں کہ یہ بیٹا تہامہ میں آباد ہوا تھا۔

"دومة الجندل... قد جاء في حديث الواقدي دوماه الجندل وعدها ابن السقفية من اعمال المدينة سميت جاوم ابن اسمعيل بن ابراهيم وقال الزجاجي دومان ابن اسمعيل وقيل كان لاسمعيل ولد امه دما ولعله مغير منه وقال ابن الكلبي دو ماه ابن اسمعيل قال ولما كثر ولد اسمعيل عم بالتهامة خرج دو ماه بن اسمعيل حتى نزل موضع دومه وبنى له حصناً فقيل دوماه نصب الحصن اليه.. قال ابو عبيد السكوني دومة الجندل حصن وقرى بين الشام و المدينة قرب جبل طي.. دومة من القريات من وادي القرىٰ (معجم البلدان)"

معجم البلدان میں لکھا ہے کہ دومۃ الجندل کا نام واقدی کی حدیث میں دوماہ الجندل آیا ہے اور ابن سقفیہ نے اس کو اعمال مدینہ میں گنا ہے اس کا نام دوم ابن اسمٰعیل ابن ابراہیم کے نام پر موسوم ہوا ہے اور زجاجی کا قول ہے کہ اسمٰعیل کے بیٹے کا نام دومان ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ اسمٰعیل کا ایک بیٹا تھا اس کا نام دما تھا اور شاید اس کے اصلی نام کو بگاڑ دیا ہے اور ابن کلبی کا قول ہے کہ دوماہ اسمٰعیل کا بیٹا تھا اور اسی کا قول ہے کہ جب تہامہ میں حضرت اسمٰعیل کی بہت سی اولاد ہوگئی تو دوماہ وہاں سے نکلا اور بمقام دومہ قیام کیا اور وہاں قلعہ بنایا اور اس کا نام دوماہ اپنے نام پر رکھا اور ابو عبیدہ سکونی کا قول ہے کہ دوماہ جندل قلعہ اور گاؤں شام اور مدینہ کے درمیان میں ہیں قریب جبل طے کے اور دوماہ وادی قریٰ کے گاؤں میں سے ہے۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر بھی اسی کو تسلیم کرتے ہیں ا؎

اب تک یہ ایک مشہور جگہ عرب میں موجود ہے۔

ساتواں بیٹا

ساتواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا مسا تھا۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ یہ بیٹا منو پوٹیما میں آباد ہوا مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ کچھ شبہ نہیں کہ یہ بیٹا جب حجاز سے نکلا تو یمن میں آباد ہوا اور یمن کے کھنڈرات میں اب تک مسا کا نام قائم ہے۔ ریورنڈ کارٹری پری کاری نے اپنے نقشہ میں اس مقام کا نشان ۱۳ درجہ اور ۳۰ دقیقہ عرض شمالی اور ۴۳ درجہ اور ۳۰ دقیقہ طول شرقی میں قائم کیا ہے۔

اسمٰعیل اور ان کی تمام اولاد اولاد حجاز میں تھی۔ بلاشبہ جب اولاد جوان ہوئی اور کثرت ہوگئی تب مختلف مقاموں میں جا کر سکونت اختیار کی۔ مگر عمدہ بات قابل غور یہ ہے کہ سب کا پتہ عرب ہی میں یا حجاز کے آس پاس پایا جاتا ہے۔

آٹھواں بیٹا

آٹھواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا حدد تھا اور عہد عتیق میں حداد بھی اس کا نام ہے۔ یمن میں شہر حدیدہ اب تک اسی کا مقام بتلا رہا ہے اور قوم حدیدہ جو یمن کی ایک قوم ہے اسی کے نام کی یاد دلاتی ہے۔ زہیری مؤرخ کا بھی یہی قول ہے اور ریورنڈ مسٹر فارسٹر بھی اسی کو تسلیم کرتے ہیں۔

نواں بیٹا

نواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا تیما تھا۔ ان کی سکونت کا مقام نجد ہے اور بعد کو رفتہ رفتہ خلیج فارس تک پہنچ گئے۔

دسواں بیٹا

دسواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا یطور ہے۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر بیان کرتے ہیں کہ اس کا مسکن جدور میں تھا جو جبل کسیرنی کے جنوب اور جبل الشیخ کے مشرق میں واقع ہے۔

گیارھواں بیٹا

گیارھواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا نافیش تھا۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر توریت اور جوزیفس کی سند سے لکھتے ہیں کہ عربیا ڈزرٹا میں ان کی نسل اسی نام سے آباد تھی۔

بارھواں بیٹا

بارھواں بیٹا حضرت اسمٰعیل کا قیدماہ تھا۔ انہوں نے بھی یمن میں سکونت اختیار کی تھی۔ ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے خیال کیا ہے کہ قیدماہ کاظمہ میں آباد ہوا تھا جو خلیج فارس پر ہے اور جس کا تذکرہ ابوالفدا نے کیا ہے مگر یہ خیال ان کا غلط ہے۔

"اصحاب الرس كانوا من ولد اسمعيل وهم قبيلتان يقال لا حدهما قدمان والا خرى يامين وقيل رعويل و ذلك باليمن. (مروج الذهب مسعودی)"

مسعودی نے صاف لکھا ہے کہ "اصحاب الرس اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے اور وہ دو قبیلے تھے۔ ایک کو قدمان کہتے تھے اور دوسرے کو یامین اور بعضوں کے نزدیک رعویل اور یہ یمن میں تھے۔"

اب اس تحقیقات سے جو جغرافیہ کی رو سے نہایت قابل اطمینان کے ہے دو باتیں ثابت ہوگئیں۔ایک یہ کہ حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی تمام اولاد عرب میں آباد ہوئی۔دوسری یہ کہ عرکز اس خاندان کی آبادی کا حجاز تھا جہاں اسمٰعیلؑ کی مقدم اولاد کا مسکن ہوا تھا اور پھر اس عرکز سے اور طرف عرب میں پھیلی۔پس ثابت ہوا کہ حضرت اسمٰعیلؑ نے حجاز میں سکونت اختیار کی تھی اور اسی کا قدیم نام فاران ہے جو حضرت موسیٰؑ اور حضرت حبقوق نے اپنی بشارتوں میں بتایا ہے۔

توریت سامری کا عربی ترجمہ جس کو آرکیونن نے ۱۸۵۱ء میں بمقام گلدونی نیادرم چھاپا فاران کو حجاز بتلایا ہے۔چنانچہ اس ترجمہ کی بعینہٖ یہ عبارت ہے۔

"وسکن بریہ فران (الحجاز) واخذت لہ امہ امرۃ من ارض مصر" (عربی ترجمہ توریت سامری) لفظ حجاز جو دو ہلالی خطوں میں ہے مترجم نے اسی طرح لکھا ہے۔

اگرچہ یہ بات نہایت صفائی سے ظاہر ہے کہ وادی حجاز اور وادی فاران دونوں ایک ہیں اور اسمٰعیلؑ کے خاندان کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اس کی گواہی دے رہے ہیں۔مگر بایں ہمہ عیسائی اس کو تسلیم نہیں کرتے اور موقع فاران کی نسبت مفصلہ ذیل تین رائیں قرار دیتے ہیں

اول

یہ کہ اس وسیع میدان کو جو بیرشبع کی شمالی حد سے کوہ سینا تک پھیلا ہوا ہے فاران کہتے ہیں اور اس کی حد عموماً اس طرح پر قرار دیتے ہیں۔

حد شمالی کنعان   حد جنوبی کوہ سینا   حد غربی ملک مصر   حد شرقی کوہ سعیر

اور کہتے ہیں کہ اس حد میں اور بہت سی چھوٹی چھوٹی وادی علیحدہ علیحدہ نام سے شامل ہیں مثلاً شور' بیرشبع' اتہان' سینا' سن' زن و ایدم وغیرہ۔

دوم

یہ کہ قادیش جہاں حضرت ابراہیمؑ نے کنواں کھدوایا جس کا نام بیرشبع تھا اور فاران دونوں ایک ہیں۔

سوم

یہ کہ فاران اس وادی کو کہتے ہیں جو کوہ سینا کے مغربی نشیب پر واقع ہے اور جہاں بہت سی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں اور پرانی قبریں اور بینار یں وغیرہ اب تک موجود ہیں مسٹر روپر کا بیان ہے کہ اس مقام پر ایک ٹوٹا ہوا گرجا ملا جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد پانچویں صدی کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی ان کا قول ہے کہ چوتھی صدی میں اس مقام پر عیسائی رہتے تھے اور ایک بشپ بھی وہاں رہتا تھا۔

ہماری رائے میں یہ تینوں توجیہیں محض غلط ہیں اور کسی طرح توریت مقدس کے بیان کے مطابق نہیں ہیں۔چنانچہ ہم ان تینوں توجیہوں کی تردید کرتے ہیں۔

اگرچہ یہ تینوں توجیہیں نہایت مختصر تقریر سے رفع ہوسکتی ہیں کہ جب ان مقاموں میں حضرت اسمٰعیلؑ یا ان کی اولاد کے رہنے کا

کوئی نشان تک نہیں ہے تو پھر کیونکر وہ مقامِ فاران تصور ہو سکتے ہیں۔ مگر ہم اس سے قطع نظر کر کے ہر ایک توجیہ کی جدا جدا تردید بیان کریں گے۔

توجیہ اول کی تردید

پہلی توجیہ کا منشا یہ ہے کہ فاران ایک بہت بڑی وادی ہے اور اس میں شور وسینا وغیرہ سب داخل ہیں۔ اس توجیہ کی تردید کے لئے توریت مقدس کی چند آیتیں نقل کر دینی کافی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فاران ایک مستقل اور جداگانہ وادی ہے اور دوسری وادیوں سے مل کر نہیں بنا ہے۔

۱۔ توریت کتاب چہارم باب ۱۰ آیت ۱۲ میں لکھا ہے "بنی اسرائیل نے بیابان سینی سے کوچ کیا اور بادل بیابان پاران میں ٹھہر گیا" پس اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ بیابان سینی ایک جدا بیابان ہے اور پاران جدا بیابان ہے۔

۲۔ توریت کتاب اول باب ۱۴ آیت ۶ میں لکھا ہے کہ "کدالاعومر نے حواریوں کو پہاڑ سعیر میں اہل فاران تک جو صحارا کے نزدیک ہے مارا" پس اس آیت سے ثابت ہے کہ سعیر جدا ہے اور وادی پاران علیحدہ ہے۔

۳۔ **توریت کتاب چہارم باب ۱۲ آیت ۱۶ و باب ۱۳ آیت ۳ میں لکھا ہے کہ "بنی اسرائیل حصیروت سے چلے اور بیابان فاران میں ٹھہرے اور وہاں سے زمین کنعان کی تلاش کو سرداران قوم روانہ کئے" اس سے صاف ثابت ہے کہ حصیروت سے آگے فاران اور ان سب وادیوں سے علیحدہ وادی ہے۔**

۴۔ **پھر اسی کتاب کے باب ۱۳ آیت ۲۵، ۲۶ میں لکھا ہے کہ "وہ سرداران کنعان کو دیکھ کر پھرے تو بیابان فاران میں سے قادیش میں پہنچے" پس کنعان سے مراجعت کرتے وقت پہلے بیابان فاران پڑتا ہے اور پھر قادیش اور یہ بالکل ٹھیک** ہے۔ کیونکہ قادیش جہاں ابراہیم نے بیر شبع بنایا اور بیابان فاران باہم پیوستہ ہیں۔ قادیش شمالی سرحد فاران پر واقع ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بیر شبع ابراہیم والا اور قادیش ایک ہیں۔ اس لئے کہ وہ قادیش میں بنایا گیا تھا اور اسحٰق علیہ السلام نے جو بیر شبع بنایا وہ علیحدہ اور قریب فلسطین کے واقع ہے۔ ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ خیال میں رکھنا ضرور ہے۔

یہ دونوں آیتیں توریت اور کتاب حبقوق نبی کی جن میں ہمارے پیغمبر خدا ﷺ کی بشارتیں مندرج ہیں اور جن پر ہم بحث کر رہے ہیں ان سے بھی ظاہر ہے کہ فاران وسعیر سب علیحدہ علیحدہ مقام ہیں۔

۵۔ کتاب اول سلاطین باب ۱۱ آیت ۱۸ میں ہدد اور اس کے ہمراہیوں کے مصر میں جانے کے حال میں لکھا ہے کہ "وہ مدیان سے نکلے اور فاران میں آئے اور وہاں سے آدمی ساتھ لے کر مصر کو گئے" مدیان وہ شہر ہے جس کو عرب میں مدین کہتے تھے اور ساحل بحر قلزم پر جو حجاز کی جانب ہے تبوک سے تخمیناً چھ منزل جانب جنوب واقع ہے اور یہ شہر عین وادیٔ فاران میں واقع تھا جو ٹھیک حجاز ہے۔ اس سے دو مطلب ایک حجاز اور وادیٔ فاران کا متحد ہونا دوسرے وادیٔ فاران کا ایک مستقل جدا وادی ہونا ثابت ہوتے ہیں۔

توجیہ دوم کی تردید

دوسری توجیہ یہ تھی کہ فاران اور وادی قادیش دونوں ایک ہیں۔ اس توجیہ کی تردید میں بھی توریت کی چند آیتیں لکھی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ وہ دونوں الگ الگ مقام ہیں۔

۱۔ توریت کتاب اول باب ۱۴ آیت ۶، ۷ میں لکھا ہے کہ ''کدر لاعومر نے حوریوں کو پہاڑ سعیر میں ایل فاران تک جو صحرا کے نزدیک ہے مارا اور وہاں سے پھر کر عین مشپاط میں جو قادیش ہے آئے۔'' اس سے بخوبی ثابت ہے کہ پاران اور قادیش دونوں علیحدہ ہیں متحد نہیں۔

۲۔ توریت کتاب چہارم باب ۱۳ آیت ۲۶ میں لکھا ہے کہ ''وہ سردار جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھیجے تھے از طرف فاران قادیش میں پہنچے'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قادیش و فاران جدا جدا دو مقام ہیں۔

آیت جس کا ہم نے ذکر کیا اس کے ترجمے میں لوگوں نے کسی قدر غلطی کی ہے اس لئے ہم اس آیت کو مع ترجمہ اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔

عربی ترجمہ

''ورحلوا وجاؤا الی موسیٰ والی هارون والی کل جماعة بنی اسرائیل الی بریه فاران بالقادس''

اردو ترجمہ

''اور کوچ کیا اور آئے موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) اور تمام جماعت بنی اسرائیل کی پاس طرف میدان فاران کے قادیش میں۔''

انقلس نے اس مقام پر قادیش کو مقام نہیں خیال کیا بلکہ اس کے معنی نائل کے لئے ہیں یعنی فاران میں واپس آئے بہ نیل مرام پس اگر یہ معنی لیے جائیں تو اس آیت سے قادیش اور فاران کے ایک ہونے پر کسی طرح استدلال نہیں ہوسکتا۔

توجیہ سوم کی تردید

تیسری توجیہ یہ ہے کہ پاران کوہ سینا کے مغربی نشیب میں واقع ہے جہاں کھنڈرات بھی پائے گئے ہیں۔ یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔ ہم اس بیان کے وجود سے جو کوہ سینا کے نشیب میں واقع ہے انکار نہیں کر سکتے۔ مشرقی جغرافیہ دانوں کی تحریروں سے ثابت ہے کہ تین مقام فاران کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک کوہستان حجاز یعنی مکہ معظمہ اور ابونصر بن قاسم بن قضاعۃ القضاعی الفارالاسکندری جو حجاز کا رہنے ولا تھا وہ حجاز ہی کے رہنے کے سبب فارانی کہلاتا تھا۔ دوسرا فاران کوہ طور یا سینا کے پاس تھا اور تیسرا فاران نواح سمرقند میں واقع تھا وہ تو بحث سے خارج ہے صرف اس فاران سے بحث ہے جو کوہ سینا کے مغربی نشیب میں واقع ہے' مگر اس کی نسبت اس قدر اور تحقیقات کرنی باقی ہے کہ آیا اس مقام پر فاران حضرت ابراہیمؑ کے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں تھا یا نہیں۔ اور یہ وہی وادی ہے جس کا ذکر توریت میں ہے اور جہاں بیر شبع کے بیابان میں پھرنے کے بعد حضرت اسمٰعیل

اور حضرت ہاجرہ نے قیام کیا تھا اور یہ وہی مقام ہے جہاں اسمٰعیل کی اولاد آباد ہوئی۔ ان باتوں میں سے ایک بھی ثابت نہیں بلکہ اس کے برخلاف ثابت ہے جیسا کہ اگلی بحثوں میں بیان ہو چکا' مگر بایں ہمہ جو دلیلیں عیسائیوں نے اس فاران کی نسبت لکھی ہیں اور جس کو ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے ایک نہایت عمدگی اور غور سے جمع کر دیا ہے ان سب کی ہم تردید بیان کرتے ہیں تا کہ بحث بخوبی پوری ہو جائے۔

روورنڈ مسٹر فارسٹر کہتے ہیں کہ ''توریت کتاب اول باب ۲۵ و آیت ۱۷ میں لکھا ہے'' کہ ''اسمٰعیل کی اولاد حویلاہ سے شور تک جو اشور کو جاتے ہوئے مصر کے برابر پڑتا ہے آباد ہوئی' اس آیت کو لکھ کر وہ کہتے ہیں کہ ''اقرار خدا کا پورا ہو گیا کہ بنی اسمٰعیل شور سے حویلاہ تک یعنی عرب میں مصر کے کنارہ سے دریائے فرات کے موہانہ تک پھیل گئی۔''

پہلی غلطی اس مصنف کی یہ ہے کہ حویلاہ کو دریائے فرات کے موہانہ پر قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ مقام جس کا بانی حویلاہ ہے اور جس کا نام توریت کتاب اول باب ۱۰ آیت ۲۹ میں آیا ہے یمن کے قریب واقع ہے۔ چنانچہ ریورنڈ کارٹری پی کاری ایم۔ اے کے نقشہ میں اس کا نشان ۱۷ درجہ ۳۰ دقیقہ عرض شمالی اور ۴۲ درجہ ۳۰ دقیقہ طول شرقی پر لگایا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

دوسری غلطی اس مصنف کی یہ ہے کہ وہ شور کو عربیا پٹریا کے مغرب میں بتاتے ہیں اور یہ صریح غلطی ہے کیونکہ شور کے بیابان سے وہ وسیع میدان بتایا جاتا ہے جو سریا کے جنوب سے مصر تک پھیلا ہوا ہے۔

توریت کی جس آیت کا ریورنڈ مسٹر فارسٹر نے ذکر کیا یعنی کتاب اول باب ۲۵ آیت ۱۸ اس میں دو لفظ ہیں۔ ''شور'' اور ''اشورہ'' اور کسی نام کے ساتھ لفظ بیابان کا نہیں ہے شور کا نام حال میں سریا ہے اور کچھ شک کا مقام نہیں ہو سکتا کہ حال کا نام اشورہ کا اس سریا ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اسمٰعیل کی اولاد اس قطعہ زمین میں آباد ہوئی جو یمن کی شمالی سرحد سے سریا کی جنوبی سرحد تک ہے اور یہ امر مطابق واقع کے بھی ہے اور توریت مقدس کے بیان کے بھی مطابق ہے' اور اسی مقام میں اسمٰعیل کی اولاد کی آبادیوں کے نشان ملتے ہیں اور یہ ٹکڑا زمین کا حجاز کہلاتا ہے اور اسی کا قدیم نام فاران تھا اور یہ ہمارا بیان اس بات سے اور زیادہ صحیح ہو جاتا ہے کہ جو مسافر وہاں سے اس سریا کو جاتا ہے تو ٹھیک مصر سامنے ہوتا ہے جیسا کہ توریت مقدس میں لکھا ہے۔

ریورنڈ مسٹر فارسٹر سینٹ پال کے خط سے جو گلتیوں کے نام لکھا تھا ایک نیا نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوہ سینا اور ہاجر متحد ہیں مگر یہ بھی سر اسر غلطی ہے۔ ہم سینٹ پال کے خط کی وہ عبارت لکھتے ہیں اور پھر اس کا مطلب بیان کر کے ریورنڈ مسٹر فارسٹر کی غلطی بتاتے ہیں۔

سینٹ پال کے خط کی یہ عبارت ہے ''تم جو شریعت کے تابع ہوا چاہتے ہو کیا تم نہیں سنتے کہ شریعت کیا کہتی ہے۔ یہ لکھا ہے کہ ابراہیم کے دو بیٹے تھے ایک لونڈی سے دوسرا بیوی سے۔ جو لونڈی سے ہوا تھا جسمانی طور پر پیدا ہوا اور جو بیوی سے تھا سو وعدہ کے طور پر پیدا ہوا۔ یہ باتیں تمثیلیں ہیں اس لئے کہ یہ دو عہد ہیں۔ ایک تو سینا پہاڑ سے جس سے نرے غلام پیدا ہوتے ہیں اور یہ ہاجرہ ہے۔ کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا اور یہاں کے یروشلم کا جواب ہے جو اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے۔ پر اوپر کی یروشلم آزاد ہے سو یہی ہم سب کی ماں ہے۔'' (نامہ سینٹ پال بنام گلتیوں باب ۴ آیت ۲ لغایت ۲۶)

اس مقام پر جو یہ لفظ آیا ہے کہ 'یہ ہاجرہ ہے' اس سے اس بات پر کہ کوہ سینا اور ہاجرہ ایک ہے استدلال نہیں ہو سکتا کیونکہ اس مقام پر امر مذکور بیان نہیں ہوا بلکہ سارا بیان بطور تمثیل کے ہے۔

سینٹ پال ان لوگوں کو جنہوں نے صرف ظاہری احکام شریعت کی پابندی اختیار کی تھی اور اس کے نتیجہ یعنی روحانی نیکی کو بالکل

چھوڑ دیا تھا ان کو نصیحت کرتے ہیں۔ یہ بات یہودیوں میں مشہور تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ ایک حضرت اسمٰعیل لونڈی سے (گو کہ یہ امر غلط ہے مگر یہ مقام اس کی بحث کا نہیں ہے) دوسرے حضرت اسحٰق بیوی سے اور یہ بھی مشہور تھا کہ حضرت اسمٰعیل تو جسمانی ہیں اور حضرت اسحٰق روحانی جو بموجب وعدہ کے پیدا ہوئے ہیں۔ اب سینٹ پال حضرت اسحٰق علیہ السلام کی اولاد یعنی بنی اسرائیل کا بھی جسمانی ہونا اور صرف عیسائیوں کا روحانی بیٹا ہونا بیان کرنا چاہتے ہیں اور اس لئے کہتے ہیں کہ جسمانی اور روحانی ہونا یہ تو تمثیلیں ہیں۔ حقیقت میں یہ دو عہد ہیں اب وہ کہتے ہیں کہ ایک تو کوہ سینا سے ہے جس سے بنی اسرائیل واسحٰق کی اولاد مراد ہیں۔ مگر اس عہد سے بھی غلام ہی پیدا ہوتے ہیں یعنی صرف ظاہری شریعت میں پڑے ہوئے۔ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''یہی ہاجرہ ہے'' یعنی یہی معنی لونڈی کی اولاد ہونا ہے اور اس کی دلیل میں بیان کرتے ہیں کہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور یروشلم کا جواب ہے جو یعنی یروشلم اپنے لڑکوں یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ غلامی میں ہے۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ روحانی یروشلم کا ہم کو بیٹا ہونا چاہیے اور مثل لونڈی کی اولاد کے غلامی کی حالت کو چھوڑ دینا چاہیے۔ پس اس مقام سے ہاجرہ اور کوہ سینا کا ایک ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صاف پایا جاتا ہے کہ حضرت ہاجرہ کوہ سینا سے علیحدہ عرب میں (حجاز) میں تھیں جن کو تمثیلاً عرب کا سینا بیان کیا ہے اور یروشلم کا مقابل۔

روورنڈ مسٹر فارسٹر کتاب اول تواریخ ایام کی آیت ۹'۱۰ کی سند پر بیان کرتے ہیں کہ ہگری یعنی بنی ہاجرہ کنارہ دریائے فرات زمین گلعاد میں ساکن تھے اور وہاں چند آبادیوں کے ایسے نام بھی تلاش کیے ہیں جو بنی اسمٰعیل کے ناموں کے مشابہ یا مطابق ہیں۔ مگر اس کہنے سے کیا فائدہ ہے۔ بلاشبہ زمانہ کے دور میں بنی اسمٰعیل حجاز میں سے نکلے اور تمام عرب میں خلیج فارس تک پھیل گئے۔ فاران کی تحقیقات میں اس مقام کو تلاش کرنا چاہیے جہاں حضرت اسمٰعیل آباد ہوئے سو وہ ثابت ہو گیا کہ حجاز میں اور گرد مکہ کے آباد ہوئے پس وہی مقام فاران ہے۔ بعد کو وہ کتنی دور تک ملکوں میں پھیل گئے ہوں اس سے کچھ بحث نہیں ہے۔

جو فاران کوہ سینا کے مغربی نشیب میں ہے اور جس کے کھنڈرات ملے ہیں وہ توریت کا فاران نہیں ہے اور حضرت موسیٰ کے زمانہ تک اس کا وجود نہ تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے بنی اسرائیل کو لے کر نکلے اور انہوں نے بحر احمر کی غربی شاخ کی نوک کو پار کیا جس کے پانی کو بہ سبب سمندر کے جذر کے خدا نے ہٹا دیا تھا۔ شور کے جنگل میں پہنچے اور جب سن کے جنگل کو طے کیا اور افیدم میں مقام ہوا تو وہاں عمالیق آئے اور موسیٰ (علیہ السلام) سے لڑے۔ چنانچہ یہ سب حال توریت کتاب دوم باب ۱۷ آیت الغایت ۸ میں مندرج ہے۔ ان آیتوں میں جو یہ لفظ مندرج ہیں کہ ''عمالیق آ کر لڑے'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عمالیق افیدم کے باشندے نہ تھے اور کیونکر ہو سکتے تھے کیونکہ وہ مقام محض بے آب تھا۔ مگر اس مقام پر اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ افیدم کوہ سینا کے مغرب میں یعنی شرقی مصر میں واقع ہے۔

اب یہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام مشرق کی طرف یعنی کوہ سینا کی طرف چلے اور بیابان کوہ سینا میں پہنچ گئے اور اس سفر میں وہ مقام فاران جس کا غربی کوہ سینا میں واقع ہونا بیان کیا جاتا ہے گزر گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا۔

اب بنی اسرائیل کوہ سینا سے آگے بڑھے اور شمال مشرق کو چلے اور اس راہ میں حضرت موسیٰ فرماتے ہیں کہ ''بنی اسرائیل بیابان سے نکلے اور بادل بیابان فاران میں ٹھہر گیا۔ (توریت کتاب چہارم باب ۱۰ ایت ۱۲)۔

پس اب بخوبی ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ کے وقت میں بیابان فاران جانب شمال و مشرق کوہ سینا کے تھا جو قریب قادیش کے واقع ہے اور وہی بیابان حجاز کا ہے۔ نہ غربی نشیب کوہ سینا کے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب العاربہ کی ایک قوم جو اولاد میں فاران بن

عوف بن حمیر کے تھے اور جو بنی فاران کے نام سے کہلاتی تھی کسی زمانہ میں وہاں جا کر بسی ہوگی اور اس سبب سے وہ مقام فاران مشہور ہوگیا ہوگا مگر وہ فاران ہرگز وہ فاران نہیں ہے جس کا ذکر توریت میں ہے۔

تمام مشرقی مؤرخ اور جغرافیہ دان اس بات پر متفق ہیں کہ جو کوہستان حجاز میں واقع ہیں وہی فاران ہیں۔ ان کے اس قول کی تصدیق اس بات سے ہوتی ہے کہ حمیر جو عرب کا بادشاہ تھا اس کا بیٹا عوف تھا جو نجد میں تھا اور جس کے نام سے کوہستان نجد معروف ہیں جیسا کہ کتاب مراصد الاطلاع علیٰ اسماء الامکنہ والبقاع میں لکھا ہے:

"عوف بفتح اوله وسكون ثانيه واخره فاء جبل بنجد... وعوق بالفتح ارض فى ديار غطفان بين نجد وخيبر". (مراصد الاطلاع)

اور تاریخ ابوالفدا سے ثابت ہے کہ فاران عوف کا بیٹا تھا اور نہایت قیاس غالب ہے کہ متصل نجد کے جو زمین وکوہستان حجاز کے واقع ہیں وہ اس فاران سے نام سے موسوم ہوئے۔ مگر جو کہ اس مقام پر ایک اور نای متبرک چیز یعنی کعبہ معظمہ قائم ہوگیا اس سبب سے بجائے پہلے نام فاران سے مکہ یا کعبہ کا نام مشہور ہوگیا۔ فاران سنہ ۱۹۷۸ دنیوی میں تھا یعنی حضرت موسیٰ سے ۴۵۳ برس پیشتر۔ پس اسی فاران کا نام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں آیا ہے۔ جہاں سے شریعت کے ظاہر ہونے اور خدا کے چمکنے کی بشارت دی گئی تھی جو خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے اور قرآن مجید کے نازل ہونے سے پوری ہوئی۔

اب باقی رہ گیا تیسرا سوال اور وہ یہ تھا کہ حضرت اسمٰعیل جہاں رہتے تھے وہاں سے کسی دوسری جگہ تو نہیں جا رہے۔ اس بات کو کوئی بھی مؤرخ کیا عیسائی اور کیا یہودی اور کیا مسلمان نہیں بیان کرتا کہ حضرت اسمٰعیل نے سکونت کو تبدیل کیا تھا۔ پس کچھ شبہ نہیں ہے کہ یہی ملک حجاز جہاں حضرت اسمٰعیل نے اول سے آخر تک سکونت اختیار کی تھی فاران ہے جس کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب میں آیا ہے۔

بشارت چہارم

حضرت سلیمان اپنے محبوب سے ملنا چاہتے ہیں اور جب نہیں مل سکتے تو خدا تعالیٰ کی مناجات اور اپنے محبوب کی تعریف اس طرح پر کرتے ہیں۔

عربی ترجمہ

حبيبى صح ادمات سيد بين الا لاف قصته متلتله حالك كالغراب رأسه لا معة الا لماس عيونه كحمامة على عين الماء مغسوله بالحليب قائمة الخيتام غداره صلاية الطيب كمعراج البشام شفتاه ورد تقطر مرا بطنه صحيفة العاج مر صص بالدرويداه مصوغتان من الذهب مملوتان بالجوهر سيقانه اعمدة الرخام موسسة على قواعد اللئالى سورته تمراء شاب كا الصنوبر حنكة حلو وكله محمديم هذا اخليلى وذا حبيبى بنات اورشليم"

اردو ترجمہ

"میرا دوست نورانی گندم گوں ہزاروں میں سردار ہے۔ اس کا سر ہیرے کا سا چمکدار ہے اس کی زلفیں مسلسل مثل کوے

کے کالی ہیں اس کی آنکھیں ہیں جیسے پانی کے کنڈل پر کبوتر دودھ میں ڈھلی ہوئی نگینہ کی مانند جڑی ہیں اس کے رخسار ایسے ہیں جیسے ٹی پر خوشبودار بیل چھائی ہوئی اور چکلے پر خوشبو رگڑی ہوئی اس کے ہونٹ پھول کی پنکھڑیاں جن سے خوشبو ٹپکتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سونے سے ڈھلے ہوئے اور جواہر سے جڑے ہوئے اس کا پیٹ جیسے ہاتھی دانت کی تختی جواہر سے لپی ہوئی اس کی پنڈلیاں ہیں جیسے سنگ مرمر کے ستون سونے کی بیٹھکی پر جڑے ہوئے اس کا چہرہ مانند مہتاب کے جوان مانند صنوبر کے اس کا گلا نہایت شیریں اور وہ بالکل محمدؐ یعنی تعریف کی گئی ہے یعنی یہ ہے میرا محبوب اے بیٹیوں یروشلم کی (کتاب تسبیحات سلیمان باب ۱۵ آیت ۱۰ الغایت ۱۶)

اگر چہ اس مقام پر حضرت سلیمان نے خدا کی تسبیح میں گیت گایا ہے اور اس کی مناجات کی ہے مگر ضرور وہ ایک کسی بڑے شخص قابل تعظیم و ادب کے آنے کے متوقع ہیں اور اس کی بشارت دیتے ہیں اور اسی کو اپنا محبوب بتاتے ہیں اور اپنے محبوب کی شاعرانہ تعریف کرتے ہیں اور پھر صاف بتاتے ہیں کہ وہ میرا محبوب (محمد ﷺ) ہیں۔

محمدؐ کے معنی تعریف کیئے گئے ہیں پس حضرت سلیمان نے اپنی مناجات میں اپنے محبوب کی تعریف کرتے کرتے اس کا نام ہی لے دیا کہ اگر اس کے معنی لو تو وہ بھی ایک لفظ تعریف ہے۔ ورنہ وہ صاف صاف نام تو ہے ہی۔

یہ مقام ایسا ہے جس میں صاف نام محمد ﷺ کا بتا دیا گیا ہے مگر ہمارے خطبہ کے پڑھنے والوں کے دل میں شبہ جائے گا کہ اگر یہ نام بتانا تھا تو محمد کہا ہوتا محمدیم کیوں کہا۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عبرانی زبان میں یے اور میم علامات جمع کی ہے اور جب کوئی بڑے قدر کا شخص اور عظیم الشان ہوتا ہے تو اس کے اسم کو بھی جمع بنا لیتے ہیں جیسا کہ خدا کا نام الوہ ہے اس کی جمع الوہیم بنالی ہے اور اسی طرح بعل جو ایک بت کا نام تھا جس کو نہایت عظیم الشان سمجھتے تھے۔ اس کی جمع بعلیم بنالی تھی اور یہی قاعدہ اسم استروث میں لگایا گیا ہے جو دوسرے بت کا نام ہے۔ پس اس مقام پر بھی حضرت سلیمان نے بہ سبب ذی قدر اور عظیم الشان ہونے اپنے محبوب کے اس کے نام کو بھی صیغہ جمع کی صورت میں بیان کیا ہے اور سچ ہے محمدؐ سے زیادہ کون شخص محمدیم کہلانے کا مستحق ہے پس یہ ایسی بشارت ہے جس میں صاف صاف نام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا گیا ہے۔

بشارت پنجم

حجی نبی ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی اس طرح بشارت دیتے ہیں۔

عربی ترجمہ

"وازلزل الامم کلها احمد جمیع الامم تجئی واملا هذا البیت محمد اقال رب الخلایق"

اردو ترجمہ

"سب قوموں کو ہلا دوں گا اور حمد سب قوموں کا آئے گا اور اس گھر کو بزرگی سے بھروں گا کہا خداوند خلائق نے" (کتاب حجی نبی باب ۱۱ آیت ۷)

اس آیت میں لفظ (حمدث) جو آیا ہے اس سے محمد ﷺ کی نسبت بشارت نکلتی ہے۔ ریورنڈ مسٹر پارک ہرسٹ حمد کے مادہ کی

نسبت کہتے ہیں کہ ''ہر قسم کی پاک چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے'' اسی مادہ سے محمد اور احمد اور حامد اور محمود ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے نام مبارک نکلے ہیں اور اس بشارت میں لفظ حمدث کے کہنے سے صاف اشارہ ہے کہ جس شخص کے مبعوث ہونے کی اس میں بشارت ہے وہ ایسا شخص ہے کہ اس کا نام حمد کے مادہ سے مشتق ہے اور وہ کوئی نہیں سوائے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

عیسائی مذہب کے پادری خیال کرتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ کے مبعوث ہونے کی ہے مگر یہ خیال دو وجہ سے صحیح نہیں اول اس لئے کہ حضرت متی نے جس قدر بشارتیں عہد عتیق میں حضرت عیسیٰ کی کی ہیں ان سب کو بالتفصیل اپنی انجیل میں لکھا ہے کیونکہ وہ انجیل عبرانی زبان میں یہودیوں کی ہدایت کے لئے لکھی گئی تھی اور اسی سبب سے تمام بشارتیں جو توریت و زبور و صحف انبیاء میں حضرت عیسیٰ کی نسبت تھیں ان سب کو حضرت متی نے لکھا تھا مگر اس بشارت کا ذکر حضرت متی نے نہیں کیا۔ اگر یہ بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہوتی تو ضرور حضرت متی اس کا ذکر کرتے۔

دوسرا یہ کہ حمد کے مادہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر کسی طرح اشارہ نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اشارہ خاص اسی شخص کے نام کا ہے جس کا نام اسی مادہ سے مشتق ہوتا ہے اور اس لئے بشارت حضرت عیسیٰ کی نہیں ہے بلکہ اس کی بشارت ہے جس کی نسبت حضرت عیسیٰ نے بشارت دی تھی کہ ''یاتی من بعدی اسمہ احمد''

گاڈفری ہگنس نے بھی اپنی کتاب میں باستدلال قول ریورنڈ پارک ہرسٹ صاحب کے لکھا ہے کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نہیں ہو سکتی بلکہ اس شخص کی ہے جس کے آنے کی بشارت خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔

بشارت ششم

حضرت اشعیاہ نبی وحی کی رو سے ان لوگوں کا ذکر جو خدا کی سچی پرستش از سر نو قائم کریں گے اس طرح پر کرتے ہیں۔

عربی ترجمہ

''ورائی مرکب الفارسین راکب حمار راکب جمل والتفت التفا تاجیدا''

اردو ترجمہ

''اور ایک جوڑی سواروں کی دیکھی اور ایک سوار گدھے کا اور ایک سوار اونٹ کا اور خوب متوجہ ہوا'' (کتاب اشعیاہ نبی باب ۲۱ و آیت ۷)

اس آیت میں حضرت اشعیاہ نبی نے دو شخصوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو خدا کی سچی پرستش از سر نو قائم کریں گے ان میں سے ایک کو گدھے کی سواری کے نشان سے بتلایا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جناب ممدوح گدھے پر سوار ہو کر یروشلم (بیت المقدس) میں داخل ہوئے تھے اور بلا شبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خدا کی سچی پرستش قائم کی اور یہودیوں نے جو مکاری اور دغا بازی سے شریعت کے صاف ظاہری احکام کی ریاء کاری سے پابندی اختیار کی تھی اور دلی نیکی اور روحانی پاکیزگی کو بالکل چھوڑ دیا تھا اس کو بتایا اور سچی پرستش خدا کی قائم کی۔

دوسرے شخص کو اونٹ کی سواری کے نشان سے بتلایا ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس سے حضرت محمد رسول اللہؐ کی طرف

اشارہ ہے جو عرب کی خاص سواری ہے بچے سے بوڑھے تک اور عالم سے جاہل تک جس سے چاہو پوچھو اونٹ کا نام لیتے ہی عرب کا اشارہ سمجھ جائے گا۔ اور جب رسول خدا ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو اونٹ پر سوار تھے اور بلا شبہ محمد رسول اللہ ﷺ نے خدائے واحد کی **پرستش قائم کی**۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جو لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانا اور تین خدا قائم کر کے پھر **تین سے ایک خدا بنایا تھا** اور خدائے واحد کی پرستش میں خلل آ گیا تھا اس کو مٹایا اور پھر سے خدا کی سچی پرستش قائم کی اور یوں فرمایا:

"**یا اھل الکتاب** تعالوا الی کلمة سواء بیننا و بینکم ان الا نعبد الا اللہ"

بشارات محمد صلی اللہ علیہ وسلم انجیل میں سے

بشارت اول

عید فسح سے تھوڑی مدت پہلے جب عیسیٰ کو معلوم ہوا کہ اب ان کا وقت بہت قریب آ گیا ہے اور اب وہ گرفتار ہونے والے ہیں تو انہوں نے اپنے حواریوں کو بہت سی نصیحتیں کہیں۔ انہی نصیحتوں میں یہ بھی فرمایا کہ:

''یہ امور میں نے تم سے کہے جب کہ تمہارے ساتھ ہوں' لیکن پیریکلیطاس پاک روح جس کو باپ بھیجے گا میرے نام سے ہر بات تم کو سکھا دے گا اور یاد دلا دے گا تم کو تمام وہ باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں''

(انجیل یوحنا باب ۱۴'۲۵'۲۶)

تاہم میں تم سے سچ کہتا ہوں یہ بھلا ہے تمہارے لئے کہ یہاں سے میں چلا جاؤں کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو پیریکلیطاس تمہارے پاس آئے گا'' (انجیل یوحنا باب ۶-۷)

بالفعل جو انجیل کے نسخے موجود ہیں ان میں لفظ پیریکلیطاس اسی املا سے لکھا ہوا ہے جس طرح کہ ہم نے لکھا ہے مگر ہم مسلمان یہ یقین نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰ نے یہ یونانی لفظ بولا تھا کیونکہ ان کی زبان عبرانی تھی جس میں کالڈی یعنی خالدیہ زبان کے لفظ بھی ملے ہوئے تھے۔ عبرانی و خالدی زبانیں ایک ہی ہیں۔ پس ہم مسلمانوں کا یہ یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ نے اس مقام پر فارقلیط کا لفظ فرمایا تھا جیسا کہ بشپ مارش صاحب کی بھی رائے ہے مگر جب انجیلیں یونانی زبان میں لکھی گئیں تب اس کی جگہ یونانی لفظ لکھا گیا با ایں ہمہ ابتدا میں اس لفظ کا ترجمہ پیریکلیطاس نہیں کیا گیا جس کے معنی تسلی دینے والے بیان کئے جاتے ہیں بلکہ اس کا ترجمہ پیر یکلیو طاس کیا گیا تھا جو ٹھیک فارقلیط کے لفظ کا ترجمہ ہے اور جس کا ترجمہ عربی زبان میں ٹھیک لفظ احمد ہے بلاشبہ اس بات کا ثبوت کہ یہ لفظ پیر یکلیو طاس ترجمہ ہوا تھا اور پیریکلیطاس نہیں تھا' ہمارے ذمہ ہے۔ چنانچہ ہم اس کو بتائید روح القدس بخوبی ثابت کریں گے۔ اس لفظ پر بہت بڑے بڑے عالموں نے بحث کی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ انہی کے اقوال کا ذکر کرنا شاید کافی ہوگا۔

سرولیم میور صاحب لائف آف محمد جلد اول صفحہ ۱۷ ارقام فرماتے ہیں کہ ''یوحنا کی انجیل کا ترجمہ جو بتدا میں عربی زبان میں ہوا اس میں اس لفظ کا ترجمہ غلطی سے احمد کر دیا ہوگا یا کسی خود غرض جاہل راہب نے محمد (ﷺ) کے زمانہ میں جعلسازی سے اس کا استعمال کیا ہوگا۔ جس کو مسلمان اپنے پیغمبر کی بشارت قرار دیتے ہیں۔

اول تو ہم مسلمانوں کو یوحنا کی انجیل کے کسی ایسے عربی ترجمہ کی جو آنحضرت ﷺ کے وقت سے پہلے یا آنحضرت ﷺ کے

زمانہ میں موجود ہو مطلق اطلاع نہیں دیتے نہ ہمارے اگلے بزرگوں نے اس کا کچھ ذکر کیا ہے اور نہ ایسے ترجمہ کے موجود ہونے کا کچھ ثبوت پیش کیا گیا ہے عرب میں حضرت متی کی اصلی انجیل جو عبرانی زبان میں تھی اور اب معدوم ہے البتہ پائی جاتی تھی اور اس کا ذکر ہمارے ہاں کی قدیم کتابوں میں پایا جاتا ہے مگر یوحنا کی انجیل کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ کسی خودغرض راہب نے یہ جعلسازی کی ہو اس پر ہم یقین نہیں کر سکتے کیونکہ اگر کسی خودغرض راہب کے اس لفظ میں جعل کرنے کا ہم یقین کریں گے جیسا کہ سر ولیم میور صاحب نے فرمایا ہے تو ہم کو مجبوراً اس بات کا یقین کرنا پڑے گا کہ بعض دیندار راہبوں نے آنحضرت ﷺ کی بشارتیں چھپانے کو بھی انجیل مقدس میں تحریفیں کی ہیں جیسا کہ عموماً مسلمان یقین کرتے ہیں کہ مگر ہم کو ایسی بدگمانیوں پر تحقیق سے باز رہنا نہیں چاہیے بلکہ استقلال سے تفتیش کرنی چاہیے کہ اگلے عالموں نے اس پر کیا بحث کی ہے اور فیلالجی یعنی علم مطابقت لسان جو اس زمانہ میں نہایت ترقی پر ہے اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔

گاڈفری ہیگنس جو ایک بہت بڑے عالم حال کے زمانے میں گزرے ہیں اور انگریز تو تھے ہی انگریزی زبان تو ان کی زبان ہی تھی مگر یونانی اور عبرانی وکالڈی زبان بھی خوب جانتے تھے اور علم مطابقت السنہ سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے اس کی کیا تحقیق کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ''مسلمان بیان کرتے آئے ہیں اور اب بھی بیان کرتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محمد رسول اللہ ﷺ کی دی ہے جس طرح حضرت اشعیاء نے کخسروکی پیشینگوئی تھی اور دونوں پیشینگوئیوں میں دونوں کا نام بتادیا گیا ہے۔

گاڈفری ہیگنس صاحب تو اس مقام پر مسلمانوں کی طرف سے ایک مجادلانہ تقریر کرتے ہیں اور اس کے بعد محققانہ۔ ان کی مجادلانہ تقریر مسلمانوں کی طرف سے یہ ہے کہ ''مسلمان کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو آنحضرت ﷺ کا نام لیا تھا وہ اس لفظ سے نہیں لیا جو لفظ کہ اب انجیلوں میں موجود ہے بلکہ وہ لفظ پیریکلیوطاس تھا جس کے معنی عربی زبان میں احمد کے ہیں اور ابتداء انجیل میں یہی لفظ تھا مگر سچ بات کے چھپانے کے لئے اس کو تحریف کر دیا ہے اور عیسائی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کی کتب موجودہ میں بہت سی تحریفیں یا اختلاف قرأت ہیں اور مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ اس عبارت کے چھپانے کے لئے تمام قلمی نسخے غارت کروائے گئے۔ قلمی نسخوں کے غارت ہو جانے کا انکار نہیں ہو سکتا اور یہ وہ بات ہے جس کی نسبت جواب باصواب دینا مشکل ہے اور قدیمی نسخوں کی نسبت تو یہ ہے کہ چھٹی صدی کے قبل کا کوئی بھی قلمی نسخہ موجود نہیں ہے۔

اگر اس کا جواب یہ دیا جائے کہ ترتولین اور قدیمی مصنفوں کی عبارت سے ثابت ہو سکتا کہ ہے انجیلوں کی صحیح قرأت آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے پیشتر ایسی ہی تھی جیسے کہ اب ہے اور اس لئے ان میں تحریف نہیں ہوئی تو اس صورت میں ان قدیمی نسخوں میں بھی تحریف کا ہونا ثابت کرنا چاہیے گا اور کیا عجب ہے کہ ان میں بھی ہوئی ہو۔ جن لوگوں نے انجیل مقدس کے قدیمی قلمی نسخوں کو غارت کر دیا انہوں نے ایک وصلی کو جس پر قدیمی مصنف کی تصنیف لکھی گئی ہو از سر نو لکھنے میں کیا دریغ کیا ہوگا۔ اس بات کو اول درجہ کے دیندار عالموں نے تسلیم کیا ہے کہ انجیل میں اور مقصدوں کے لئے تحریف ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ جو لوگ ایک مطلب کے لیے تحریف کریں گے وہ دوسرے مطلب کے لیے کیوں نہ کریں گے اور جو کہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے پس اگر غلط لکھا گیا ہو تو گمان غالب یہ ہے کہ ابتدا کے عیسائی مؤرخوں نے جو دنیا میں سب سے بڑھ کر جھوٹ بولنے والے ہیں اپنے خاص مطلب کے لئے جھوٹ بولا ہو اور یہ گمان نہایت ضعیف ہے کہ یوحنا حواری نے جو عبرانی شخص تھا کوئی غلطی کی ہو کیونکہ وہ عبرانی اور یونانی دونوں

زبانوں کو سمجھتے تھے اور اگر بالفرض وہ عبرانی زبان کے بڑے عالم نہ ہوں اور اسی وجہ سے انہوں نے لفظ کلیطاس کو بجائے کلیوطاس غلطی سے لکھ دیا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ یوحنا کی انجیل کے اصل متن میں تحریف ہوئی ہے۔

اس کے بعد گاڈفری ہیگنس صاحب مسلمانوں کی طرف سے ایک اور مجادلانہ تقریر لکھتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ **مسلمانوں کا بیان ہے کہ یہ بات** بخوبی ظاہر ہے کہ عیسائی اگر مناسب سمجھتے تو نہایت عمدہ قلمی نسخوں کو محفوظ رکھ سکتے تھے جس طرح کہ انہوں نے **بہت سے** ولیوں کی لاشوں کو نہایت آسانی سے محفوظ رکھا ہے۔ چنانچہ یوحنا اور مریم اور پطرس اور پولس وغیرہ کی لاشیں ہر روز اٹلی **میں نظر** آتی ہیں۔

پس مسلمان ضرور باصرار عیسائیوں سے کہیں گے کہ اس غلط ترجمہ کے چھپانے کے لئے کل قلمی نسخے غارت کر دیئے یا ان میں جھوٹ ملا دیا گیا اور اگر ایسا نہ تھا تو وہ غارت کیوں کر دیئے گئے اور عیسائیوں کو ان کا جواب باصواب دینے میں بہت کچھ دقت ہوگی کیونکہ قلمی نسخوں کے غارت ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ موجود نہیں ہیں۔

اس لئے گاڈفری ہیگنس صاحب نے محققانہ طور پر گفتگو شروع کی ہے۔ اول وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ جو بشارتیں ان آیتوں میں مندرجہ ہیں ان سے بہت سے قدیم عیسائی کسی شخص کے مبعوث ہونے کی پیشینگوئی سمجھتے تھے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رومی پادریوں اور پروٹسٹنٹ نے جو اس لفظ کے معنوں میں تحریف کی ہے اور اس سے صرف روح القدس کا حواریوں پر آنا مراد لیا ہے ابتدا میں یہ رائے عام نہ تھا۔ چنانچہ دوسری صدی میں ترتولین کے زمانہ سے پہلے مانٹینی آس ایک شخص پیدا ہوا تھا جس کو بہت لوگ سمجھتے تھے کہ وہی پیریکلیوطاس جس کے بھیجنے کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا۔ اس کے دشمنوں نے اس کی نسبت بے اصل بات مشہور کی تھی کہ وہ روح القدس ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں نے مانٹینی آس کے بسبب انجیلوں میں تحریف کی اور یہ ماجرا آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مانٹینی آس کے زمانہ کے بعد اور آنحضرت ﷺ کے زمانے سے بہت پیشتر مینس کو بھی اس کے پیروؤں نے جو بڑے عالم اور طاقت ور تھے وہی شخص سمجھا تھا جس کے مبعوث ہونے کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی۔ لیکن اس کے انجام سے ثابت ہوتا ہے کہ مینس شخص موعود نہ تھا اور اس کے پیرو غلطی پر تھے۔

بعد اس کے گاڈفری ہیگنس صاحب مسلمانوں کی طرف سے لکھتے ہیں کہ ''مسلمان کہتے ہیں کہ اس لفظ سے جو عیسائی روح القدس کا حواریوں پر اترنا مراد لیتے ہیں وہ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا اگر اس کے معنی تشفی دہندہ کے ہوں تو وعدہ تو ایک تشفی دہند کے آنے کا تھا پھر یہ کہنا کہ ظہور بارہ زبانہ آتشین کا وہی شخص موعود ہے محض فضول ہے۔ علاوہ اس کے حواریوں کے قوانین اور خود عیسائیوں کی کتاب سے کسی طرح پایا نہیں جاتا کہ روح القدس کا حواریوں میں آ جانا تشفی دہندہ موعود کا آنا ہوا اور صرف زبان سے کہہ دینے سے ایسے دعویٰ کی تصدیق نہیں ہو سکتی۔

علاوہ اس کے پینٹی کاسٹ کی ضیافت میں حواریوں پر روح القدس نازل ہو چکی تھی۔ کیونکہ بموجب قول عیسائیوں کے ایک بریدہ زبان آتش نے ہر ایک حواری پر طاری ہو کر اسی لحہ ان کو سب زبانیں بولنے کی طاقت بخشی تھی اور یوحنا کے بیسویں باب کی بائیسویں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے جانے سے تھوڑے عرصہ پیشتر یہ فیض ان کو عطا کر دیا تھا۔ یعنی پینٹی کاسٹ کی ضیافت کو جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں دو مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ فیض مذکور عنایت کیا گیا تھا۔ عیسائی مذہب کی

تمام مذہبی کتابوں میں کہیں نہیں پایا جاتا کہ یہ زمانہ ہائے آتشین جن سے کہ سب زبانیں بولنے کی طاقت عطا ہوئی تھی تشفی دہندہ موعود تھیں جو ایسا ہوتا تو ضرور کتاب مذکور میں ہوتا۔

اگر اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ وہ عطایا جن کا بیان متی کی انجیل میں ہے اور فیض روح القدس جس کا بیان یوحنا کی انجیل کے بیسویں باب کی بائیسویں آیت میں ہے صرف چند روز کے لئے تھے اور پھر لے گیا تھا اور بعد کو ہمیشہ کے لئے آیا' تو مسلمان کہیں گے کہ یہ صرف ایک حیلہ ہے جس کی تصدیق انجیل کے کسی لفظ سے نہیں ہوتی۔

اسی بحث میں گاڈفری ہیگنس صاحب نے ایک نہایت عمدہ قول فیصل لکھا ہے کہ یعنی اگر تسلیم کیا جائے کہ یہ لفظ وہی ہے جو اس زمانہ کے عیسائی کہتے ہیں اور اس کے معنی بھی روح القدس ہی کے ہوں تو مسلمان عیسائیوں سے کہیں گے کہ تم کہتے ہو کہ انجیل میں بشارت ہے کہ روح القدس آئے گی۔ یہ درست ہے کہ روح القدس آئی مگر محمد ﷺ میں آئی جن کو روح القدس سے الہام ہوتا تھا۔ پس تمہاری پیچیدہ عبارت کے یہی صحیح معنی ہیں اور یہی معنی درستی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔

یہ لفظ تو گاڈفری ہیگنس صاحب کے تھے اور میں اس پر اتنا اور زیادہ کرتا ہوں کہ جو عام ہدایت محمد ﷺ سے ہوئی اور تمام جزیرہ عرب بتوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی پرستش کرنے لگا اور تمام دنیا میں وحدانیت کا ڈنکا بج گیا اور حضرت عیسیٰ پر جو اتہام خدا کے بیٹے ہونے کا کیا تھا وہ مٹ گیا' اس بات کا بڑا ثبوت ہے کہ ضرور وہ روح القدس اور روح الصدق محمد ﷺ پر نازل ہوئی۔

اشهدان لا اله الا الله و اشهدان محمد رسول الله و اشهدان محمداً عبده ورسوله

اس کے بعد گاڈفری ہیگنس صاحب اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ لفظ پیریکلیطاس نہیں ہے جس کے معنی تسلی یا تشفی دہندہ کے بیان کیے جاتے ہیں بلکہ یہ لفظ پیریکلیوطاس ہے جس کے معنی احمد کے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی دلیل کی بابت ترجمہ لفظ پیریکلیوطاس کی بجائے پیریکلیطاس کے اس طرز تحریر سے بہت مدد ملتی ہے جو سینٹ جیروم نے انجیل کے لیٹن ترجمہ میں اختیار کی ہے یعنی اس ترجمہ میں لیٹن زبان میں پیریکلیطاس لکھا تھا پیریکلیوطاس کی جگہ۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جس کتاب سے سینٹ جیروم نے لیٹن میں ترجمہ کیا اس میں لفظ پیریکلیوطاس تھا نہ پیریکلیطاس۔

لفظ پیریکلیطاس کے معنی پر پادریوں میں بہت اختلاف ہے چنانچہ مشہور عالم مائی کیلس کہتا ہے کہ ارنسٹائی نے بہت مناسب کہا ہے کہ اس کے معنی نہ حامی کے ہیں نہ تشفی دہندہ کے اور یہ بھی کہتا ہے کہ میں تحقیق خیال کرتا ہوں کہ پیریکلیطاس یا تو روح القدس کو کہتے ہیں یا معلم یا مالک کو یعنی بتانے والا خدا تعالیٰ کی سچائی اور اس میں اس کی رائے سے درباب صحیح نہ ہونے ترجمہ کے مطابقت کرتا ہوں گو میں اس کو ڈاکٹر یعنی عالم تبحر کا لقب نہیں دیتا بلکہ ماسٹر یعنی معلم کا لقب دیتا ہوں اس لئے کہ جو معنی اس نے لفظ مذکور کے لکھے ہیں بہتیروں نے اختیار کیئے ہیں البتہ اس کے اثبات کا جو طرز اس نے اختیار کیا ہے وہ عجیب ہے۔ اس کو چاہیے تھا کہ لفظ مذکور کو کسی محقق کی تصنیف میں تلاش کرتا اور اس کے معنوں کی تشریح اس لفظ کے استعمال سے ثابت کرتا۔ اس نے ان سب باتوں کو چھوڑ کر جس زبان کے لفظ سے یہ نکلا ہے (یعنی کالڈی زبان سے) اس کے محاورہ اور استعمال سے اپنا بیان ثابت کرنے پر استدلال رکھا

ہے۔

بہت بڑے عالم اور معتبر بشپ مارش نے کہا ہے کہ لفظ پیریکلیطاس کے تین ترجمے ہیں اور ہم کو اختیار ہے کہ ان میں سے جونسا چاہیں پسند کر لیں۔ اول معنی حامی کے ہیں جو معتبر اور یونانی اکابر کے نزدیک مسلم ہیں۔ دوسرے معنی معین کے ہیں اور یہ وہ معنی ہیں کہ ارنستائی نے بحوالہ لفظ فارقلیط کے جو کالڈی زبان کا لفظ ہے کہیں ہیں۔ تیسرے معنی وعظ کے ہیں جس کو خود بشپ مارش نے بحوالہ ایک عبارت مصنفہ فائلو کے تسلیم کیا ہے۔ پس یہ صاف ظاہر ہے کہ اس مشہور لفظ کے معنوں میں اور اس پیغمبر کی قسم میں جس کے بھیجنے کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا، بہت اشتباہ و شک تھا۔

یہ لفظ گاڈفری ہیگنس صاحب کے ہیں مگر میں اس پر اتنا اور زیادہ کرتا ہوں کہ اگر بشپ مارش ہی کے معنی تسلیم کئے جائیں اور اس لفظ کو پیریکلیطاس ہی مانا جائے اور اس کے معنی واعظ ہی کے قرار دیئے جائیں تو بھی بجز محمد رسول اللہ ﷺ کے اور کسی کے حق میں یہ بشارت نہیں ہوسکتی اس لئے کہ حواریین جنہوں نے انجیل کا وعظ کیا وہ اس سے پہلے روح القدس سے معمور ہو چکے تھے۔
اور وہ سب اس وقت موجود تھے ان کی نسبت تو یہ کہا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ میں بھیجوں گا کیونکہ وہ موجود تھے محمد ﷺ جب آئے تو نہوں نے صاف صاف بتایا کہ "میں بھی تم سا ایک آدمی ہوں صرف مجھ پر وحی بھیجی گئی ہے کہ بیشک تمہارا خدا وہی ایک خدا ہے"۔

"قال انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم اله واحد (سورۃ مریم آیت ۱۱۰)

پھر اس سے بھی زیادہ صاف فرمایا کہ:

"قل لا املک لنفسی نفعا و لا ضرا الا ماشاء الله و لو کنت اعلم الغیب لا ستکثرت من الخیر و ما مسنی السوء ان انا الا نذیر و بشیر لقوم یومنون (سورۃ اعراف آیت ۱۸۸)

"میں اپنی جان کے لئے بھی کچھ فائدہ یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہوں بجز اس کے جو خدا چاہے اور اگر میں غیب کی بات جانتا ہوتا تو بہت کچھ بھلائیاں جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی برائی چھوتی بھی نہیں میں تو ان قوموں کو جو ایمان لائی ہیں ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں"

اور پھر اور بھی صاف فرمایا کہ:

"قل انما اعظکم بواحد ان تقوموا لله مثنی وفرادی ثم تتفکروا ما بصاحبکم من جنة ان هو الانذیر لکم بین یدی عذاب شدید. (سورۃ سبا آیت ۴۵)

"میں تو تم کو صرف ایک بات کا یعنی لا الہ الا اللہ کا وعظ کرتا ہوں پھر تم خالصاً للہ دو دو ایک ایک کھڑے ہو اور سوچو کہ جو شخص تمہارے ساتھ ہے اس کو کچھ جنون نہیں وہ تو تم کو صرف عذاب میں پڑنے سے ڈرانے والے ہے"

اس کے سوا اور بہت ہی جگہ رسول اللہ ﷺ نے خدا کی طرف سے فرمایا کہ:

"خدا تم کو اس بات کا وعظ کرتا ہے اور خدا کا وعظ کرنا اور پیغمبر کا وعظ کرنا برابر ہے"

پس سوائے محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی پیغمبر نے ایسا صاف صاف نہیں فرمایا کہ میں تو صرف وعظ کہنے والا ہوں۔ پس اُس لفظ کے معنی وعظ ہی کے ہوں جیسا کہ بشپ مارش نے کہا ہے تو بھی وہ سچا واعظ بجز محمد ﷺ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا"

بعد اس کے گاڈفری ہیگنس صاحب کہتے ہیں کہ ''یہ تسلیم کرنا ضرور ہے کہ لفظ مذکور (یعنی فارقلیط) جیسا کہ بشپ مارش نے لکھا ہے کہ یقیناً عیسیٰ علیہ السلام نے استعمال کیا تھا مسلمانوں کے دعویٰ کو بہت کچھ سہارا دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میری رائے میں اہل اسلام لفظ فارقلیط کو یونانی میں پیریکلیو طاس بنا لینے کا اسی قدر اختیار رکھتے ہیں جس قدر کہ عیسائی پیریکلیطاس کر لینے کا بلکہ ان کی رائے میں غلبہ کا پلہ مسلمانوں کی طرف ہے کیونکہ عیسائی مجاز نہیں کہ پچھلے جنگ میں لفظ زبان خالدی کے حرف کے حرف ید یعنی یائے تحتانی کو جو مثل حرکت کسرہ کے ہے یا حرف ایتا کو جو یائے تحتانی ممدودہ معروف کے برابر ہے حرف ایوتا کے عوض میں بدلیں۔

حرف ید حروف تہجی زبان خالدیہ کا دسواں حرف ہے اور شمار میں اس کے عدد بھی دس ہیں۔ پس اگر لفظ مذکور ایک زبان سے دوسری زبان میں بدلا جائے تو اس یونانی حرف سے بدلنا چاہیے جو دس کے معنی میں آیا ہے اور جو ابتدا میں حروف تہجی میں دسواں تھا قبل اس کے کہ یونانیوں کا حرف ڈگامہ جاتا رہے جیسا کہ میں نے اس کو کثرت سے اپنے اس جواب مضمون میں ثابت کیا ہے جو درباب جنوب مغربی فرنگستان کے قدیمی پادریوں کے لکھا ہے۔

مگر میں علاوہ اس کے یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا استعمال کیا ہوا لفظ فارقلیط تھا اور یہ کہ اس لفظ کے معنی ستودہ کے ہیں جیسا کہ سیل صاحب کا بھی قول ہے تو اس کا ترجمہ اس لفظ یونانی پیریکلیطاس میں غلط ہے یعنی اختلاف قرأت کی جہت سے اور یہ کہ بشپ مارش اور انسٹائی دونوں کے کل ترجمے غلط ہیں اور لفظ مذکور اس لفظ سے مبدل کرنا چاہیے جو ستود کے معنی رکھتا ہو اور واقع میں یہ لفظ پیریکلیو طاس ہونا چاہیے۔

مگر اس کا ترجمہ فارقلیط علم کے معنی لے کر نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسم صفت کے طور پر کرنا چاہیے۔ چنانچہ اہل اسلام بمعنی احمد کے لیتے ہیں۔ اگر یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا استعمال کیا ہوا زبان خالدیہ یا عبرانی عربی کا ہو تو اس سے وہی مراد پائی جانی چاہیے جو اس کے معنی ان زبانوں میں تھے اگر وہ خالدیہ کا لفظ عربی مصدر سے مشتق ہو تو اس کے وہی معنی چاہئیں جو عربی مصدر کے ہیں، اور تب اس کے معنی ستودہ یا شخص ممتاز کے ہوں گے۔

اگر ناظرین غور وخوض کریں گے تو معلوم کر لیں گے کہ لفظ کلیوطاس کو ہومر اور ہسیڈ دونوں نے بجائے ستودہ آدمی کے استعمال کیا ہے اس طرح سے میری دانست میں اہل اسلام کی دلیل اس سلیقہ کے ساتھ ہے کہ اگر ان کو ان کی غلطی پر معقول کیا جائے تو عجب نہیں کہ بہت مشکل پڑے یہ ادنی بات ہے مگر ان کی دلیل کی تردید میری نظر سے نہیں گزری۔

مگر مجھ کو اس مشہور لفظ فارقلیط کی نسبت کچھ اور بھی کہنا ہے۔ اس کو بشپ مارش نے جس کے قول کو عیسائی صادق جانتے ہیں ایک مسلمان کی منتخب کی ہوئی دلیل میں تسلیم کر لیا ہے کہ وہ سریانی یا خالدیہ یا عربی ہے مگر یونانی نہیں۔ ان زبانوں میں سے ایک یا دو حضرت محمد ﷺ ضرور بولتے ہوں گے یا ادنی درجہ یہ کہ سمجھتے ہوں گے اور یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لفظ مذکور کے یونانی ترجمہ کی نسبت آپ کو کچھ بحث ہوئی ہو کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کلاموں کے یونانی ترجموں سے عرب کے لوگوں کو کیا غرض تھی۔ عرب میں ان ترجموں کا کیا کام تھا؟ ان لوگوں کو وہ کیا فائدہ پہنچا سکتے تھے جو ان کا ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکتے تھے بجز ایسے لوگوں کو جو ایسے لوگوں کے جو اس اصل زبان کو سمجھتے تھے جس کو حضرت عیسیٰ بولتے تھے۔ آپ نے لفظ مذکور اسی طرح پر لیا ہوگا جیسے کہ منقول چلا آتا تھا یا جیسا کہ سیل صاحب نے اس کو لکھا ہے جس کے معنی ستودہ کے ہیں اور اس سے زیادہ غالباً آپ نے کبھی دریافت نہیں کیا۔ یہ خیال کرنا کیسا بیہودہ ہے کہ اپنی خاص زبان کے ایک لفظ کے معنی کی تشریح غیر زبان میں ڈھونڈتے۔ آپ نے لفظ مذکور کو مثل اس

زمانہ کے دوسرے فرقوں کے شخص انسانی پر محمول کیا اور یہ اجازت نہیں دی کہ اس کو ثالث ثلثہ کہیں جیسا کہ اس زمانہ کے موحد بھی کہتے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ آپ نے اس کو احمد کے معنی میں لیا ہو اور اس کی نسبت کبھی جھگڑا یا شک نہ کیا ہو۔

یہ تمام تقریر گاڈ فری ہیگنس صاحب کی ہے جو انہوں نے مسلمانوں کی طرف سے کی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی بحث لفظ پیریکلیطاس پر جو جواب یونانی انجیل میں ہے یا لفظ پیریکلیوطاس پر جو اصلی نسخوں میں تھا منحصر نہیں ہے کیونکہ یہ انجیلیں یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان نہیں تھیں۔ پس انہوں نے جو لفظ فرمایا تھا وہ عبرانی یا خالدی زبان کا تھا جو دونوں ایک ہیں۔ پس ہم مسلمان کہتے ہیں کہ وہ لفظ فارقلیط تھا۔ یونانی انجیلوں میں اس کے بجائے جو لفظ ہے فارقلیط کا ترجمہ ہے۔ ہم مسلمان کہتے ہیں کہ اس کا ترجمہ یونانی میں پیریکلیوطاس کیا گیا تھا جو درحقیقت صحیح ترجمہ ہے اور اس کا ثبوت بھی جہاں تک ہو سکا دیا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ نہیں پیریکلیطاس ہی اس کا ہمیشہ سے ترجمہ چلا آتا ہے تو ہم مسلمان یہ کہیں گے کہ یہ ترجمہ غلط ہے کیونکہ فارقلیط کا ترجمہ پیریکلیطاس نہیں ہے بلکہ پیریکلیوطاس ہے اور اس کا فیصلہ عبرانی و خالدی زبان کی لغت کی تحقیق پر بر وقت ہو سکتا ہے اور جو کہ مشہور ہے کہ انجیل یوحنا درحقیقت حضرت یوحنا حواری کی لکھی ہوئی ہے اس لئے ہم یقین نہیں کر سکتے کہ حضرت یوحنا نے فارقلیط کے ترجمہ میں غلطی کی ہو اور جو دلیلیں مذکور ہوئیں ان سے بھی پایا جاتا ہے کہ انہوں نے غلطی نہیں کی۔ اس لئے اصل میں وہ لفظ پیریکلیوطاس ہے بمعنی احمد نہ پیریکلیطاس بمعنی تسلی دہندہ۔

اکثر عیسائی خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس بشارت کو انجیل برناباس سے اخذ کیا ہے اور جارج سیل صاحب نے بھی ترجمہ قرآن کی دیباچہ میں یہی خیال کیا ہے بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی "یاتی من بعدی اسمہ احمد" اسی انجیل میں سے اخذ کی گئی ہے اور شاید آخری زمانہ کے ایک آدھ کچے مسلمان اور جاہل مولوی نے کہیں سن سنا کر کہ برناباس کی انجیل میں بھی یہ مطلب آیا ہے شاید اس کا حوالہ دے دیا ہو مگر قدیم عالموں اور بڑے بڑے محققوں نے اس بشارت کی بابت برناباس کی انجیل خواہ وہ صحیح ہو یا غلط نام تک نہیں لیا۔ جارج سیل صاحب کی غلطی ہے جو وہ ایسا کہتے ہیں۔

بشارت دوم

جب بعد مصلوب ہونے اور قبر میں دفن کئے جانے کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہو کر اٹھے اور حواریوں ۔۔۔ ملے اور ان کے سامنے مچھلی کا ٹکڑا اور شہد کھایا تو بیت عنیا میں جانے اور آسمان پر چلے جانے سے تھوڑی دیر پہلے انہوں نے اپنے حواریوں سے فرمایا "اور دیکھو میں بھیجتا ہوں وعدہ اپنے باپ کا تم پر لیکن تم ٹھہرو شہر یروشلم میں جب تک کہ تم پر عطا ہو قوت اوپر سے" (انجیل لوقا باب ۲۴ آیت ۴۹)۔

چند سطروں کے بعد لوقا اپنی انجیل ختم کرتے ہیں اور کچھ ذکر اس وعدہ کے پورا ہونے کا نہیں کرتے بلکہ لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ یہ کہہ کر آسمان پر چلے گئے تو تمام حواری ان کو سجدہ کر کے بڑی خوشی سے یروشلم کو پھرے اور ہمیشہ ہیکل میں خدا کی تعریف اور شکر کرتے رہے اور انہی لفظوں پر لوقا کی انجیل ختم ہوتی ہے۔ اور اس وعدہ کے وفا ہونے کا کچھ ذکر نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ لوقا کی زندگی تک یا کم سے کم اس انجیل کے لکھے جانے کے وقت تک وہ وعدہ جس کو لوقا سمجھے تھے پورا نہیں ہوا تھا۔

لوقا کے نزدیک روح القدس کا زمانہ ہائے آتشیں میں حواریوں پر نازل ہونا (اگر وہ اس کے بعد نازل بھی ہوئے ہوں) اس

وعدہ کا پورا ہونا نہیں تھا کیونکہ اگر ہوتا تو وہ اس وعدہ کے پورا ہونے کا ذکر ضرور لکھتے۔ پس ضرور ہے کہ یہ وعدہ کسی اور شخص کے مبعوث ہونے کا تھا۔

اب ہم کو اس شخص کی تلاش کرنی مناسب ہے جس کے آنے کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی۔ جب ہم اس آیت کو دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے حواریوں سے فرمایا کہ "اس وعدہ کے آنے تک تم شہر یروشلم میں ٹھہرے رہو" تو ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ اس وعدہ کے آنے اور شہر یروشلم میں ٹھہرے رہنے سے کیا تعلق ہے۔ اگر بالفرض اس وعدہ سے حواریوں پر روح القدس کا نازل ہونا ہی مراد تھی تو بھی یروشلم میں رہنے اور روح القدس کے آنے سے کوئی ضروری مناسبت نہیں پائی جاتی کیونکہ اگر حواریین شہر کے باہر چلے جاتے تو بھی ان کے پاس روح القدس اسی طرح آ سکتی تھی جیسے کہ شہر میں رہنے کی حالت میں آ سکتی تھی۔ پس شہر یروشلم میں میں ٹھہرنے سے یہ مطلب نہیں ہے جو اس کے لفظی معنوں سے نکلتا ہے' بلکہ یہ مطلب ہے کہ جب تک وہ وعدہ پورا ہو تم شہر یروشلم سے وابستہ رہو اور اس کی عزت و تعظیم جیسی کہ پیشتر سے کرتے آئے ہو کرتے رہو اسی کی طرف اپنا سر جھکاؤ اپنا منہ اسی کی طرف رکھو جب تک وہ وعدہ پورا ہو۔ چنانچہ محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور وہ وعدہ پورا ہوا اور یروشلم میں رہنے کا زمانہ منقطع ہو گیا اور بیت اللہ میں رہنے کا زمانہ آیا باپ کا وعدہ پورا ہوا اور اوپر سے عطا ہو گئی۔ بیت المقدس کی طرف جو مدت دراز سے قبلہ تھا موقوف ہوا اور مکہ میں ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے خانہ خدا اور کعبہ معظم کی طرف قبلہ اہل ایمان قرار پایا پس یہ بشارت صاف ہمارے پیغمبر کے مبعوث ہونے اور بیت المقدس کے قبلہ رہنے کے زمانہ کے اختتام اور بیت اللہ الحرام کے قبلہ ہونے کی بشارت ہے۔

"قال اللہ تبارک و تعالیٰ قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنو لینک قبلۃ ترضھا فول وجھک شطر المسجد الحرام"

بشارت سوم

جب کہ حضرت یحییٰ پیغمبر ہوئے تو یروشلم سے یہودیوں نے کاہنوں اور لیویوں کو ان کے پاس بھیجا تا کہ ان سے پوچھیں کہ وہ کون ہیں؟ چنانچہ وہ لوگ گئے اور ان سے یہ گفتگو ہوئی کہ اس نے یعنی یحییٰ نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا اور اقرار کیا کہ میں کرستاس یعنی عیسیٰ مسیح نہیں ہوں اور انہوں نے پوچھا اس سے پھر کون ہے کیا تو الیاس ہے؟ اور اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ تو وہ نبی ہے؟ اور اس نے جواب دیا نہیں' تب انہوں نے اس سے کہا کہ کون تو ہے تا کہ ہم جواب دے سکیں ان کو جنہوں نے کہ ہم کو بھیجا ہے اپنے تئیں تو کیا کہتا ہے۔ اس نے کہا میں ہوں آواز اس کی جو کہ جنگل میں چلاتا ہے سیدھا کرو رستہ خداوند کا جیسا کہ نبی اشعیا نے کہا اور وہ جو بھیجے گئے تھے فروسی تھے اور انہوں نے اس سے پوچھا اور اس سے کہا کہ تو کیوں اصطباغ کرتا ہے جب کہ تو نہ کرستاس یعنی عیسیٰ مسیح ہے اور نہ الیاس اور نہ وہ نبی (یوحنا باب ا' آیت ۲۰ لغایت ۲۵)

ان اوپر کی آیتوں میں تین پیغمبروں کا ذکر ہے ایک حضرت الیاس علیہ السلام کا اور دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تیسرا اس پیغمبر کا جو علاوہ حضرت عیسیٰ کے ہونے والا تھا یہودی یقین کرتے تھے پیغمبر الیاس جن کو مسلمان خضر کہتے ہیں مرے نہیں بلکہ صرف انسانوں کی نظروں سے غائب ہو گئے ہیں اور یہودیوں کو حضرت عیسیٰ مسیح کی نسبت یہ یقین تھا اور اب بھی ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن

آئیں گے لیکن ان آیتوں سے معلو ہوتا ہے کہ علاوہ حضرت مسیح کے ایک اور پیغمبر کے آنے کی بھی امید رکھتے تھے اور وہ پیغمبر ایسا مشہور تھا کہ بجائے نام کے صرف اشارہ ہی اس کے بتانے کو کافی تھا جیسے کہ ہم مسلمان بھی پیغمبر کے نام کی جگہ صرف آنحضرت ﷺ اشارہ میں لکھتے بولتے ہیں اور یہ مشہور پیغمبر کون ہوسکتا ہے بجز اس کے جس کے سبب خدا تعالیٰ نے ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کو برکت کی اور جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ تیرے بھائیوں میں تجھ سا پیغمبر پیدا کروں گا اور جس کی نسبت حضرت سلیمان نے کہا کہ میرا محبوب سرخ وسفید سب میں تعریف کیا گیا محمد ہے یہ میرا محبوب ہے اور یہی میرا مطلوب اور جس کی نسبت حجی نبی نے فرمایا کہ حمد تمام قوموں کا آئے گا اور جس کی نسبت حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ میرا جانا ضرور ہے تا کہ فارقلیط آئے۔ اب میں نہایت مضبوطی سے کہتا ہوں کہ یہ نامی اور مشہور پیغمبر حضرت محمد ﷺ ہیں واللہ حضرت محمد ہیں۔

☆☆☆

الخطبة الحادی عشر

فی

حقیقة شق الصدر و ما هیئة المعراج

وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنة للناس

اس خطبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کے شق کرنے کی حقیقت اور معراج کی اصلیت کا بیان ہے۔

جو واقعات کہ ہم اس خطبہ میں بیان کرتے ہیں ان کی اصلیت کی نسبت اور جن الفاظ میں وہ بیان ہوئے ہیں ان کے صحیح معنوں کی نسبت اکثر علمائے دین نے بحث کی ہے اور اسکی تحقیقات کو انتہا درجہ تک پہنچایا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین اور شارحین نے اپنی پیچ در پیچ تاویلات اور لاطائل براہین سے بجائے اس کے کہ شکوک کو رفع کریں یا غلطی کی تصحیح کریں ان الفاظ کے معانی کو اور بھی تاریکی میں ڈال دیا ہے۔

قرآن مجید کی رو سے ہم کو شرح صدر پر جس کو آخر کار لوگ شق صدر کہنے لگے اور نفس معراج کی صحت وصداقت پر بغیر کسی شبہ کے ایمان لانا چاہیے۔ پس جو امر کہ بحث طلب ہے اور جس پر ایک مدت تک علمائے اسلام کی توجہ مبذول رہی ہے اس بات سے علاقہ رکھتا ہے کہ شرح صدر یا شق صدر کی اصل حقیقت اور معراج کی ماہیت کیا تھی۔ ان دونوں کی حقیقت بیان کرنے کے لئے اولاً ہم قرآن مجید کی ان آیتوں کو نقل کرتے ہیں جو ان سے متعلق ہیں۔

آیت اول: "الم نشرح لک صدرک" ''کیا ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا۔''

آیت دوم: "**سبحن الذی اسری بعبده لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حوله لنریه من ایتنا انه هو السمیع البصیر**"

''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا، جس کے دور کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ ہم اس کو اپنی نشانیوں میں سے دکھلا دیں بیشک وہ سننے والا ہے دیکھنے والا''

آیت سوم: "وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنة للناس"

''اور نہیں کیا ہم نے اس رویا کو جو تجھ کو دکھلایا مگر آزمائش واسطے لوگوں کے۔''

جو آیتیں کہ اوپر لکھی گئیں ان میں سے صرف پہلی آیت شق صدر سے علاقہ رکھتی ہے اور باقی آیتیں معراج کے متعلق تصور کی گئی ہیں۔ ظاہر کہ پہلی آیت میں سینہ کے چیر پھاڑ کا کہیں ذکر نہیں ہے اور اس کے اصلی اور اصطلاحی معنی جیسے کہ مفسرین نے بھی تسلیم کیا ہے اس کشادگی کے ہیں جو دل اور سینہ میں عقلی اور روحانی وسعت سے عرفان الٰہی اور وحی کے منبع ہونے کے لئے کی گئی تھی۔

باقی رہیں وہ حدیثیں اور روایتیں جو شق صدر اور معراج سے علاقہ رکھتی ہیں لیکن وہ باہم اس قدر مختلف اور متعارض اور متناقض

ہیں کہ کوئی بھی قابل اعتبار کے نہیں ہے اوران کی صحت کی کافی سندیں بھی نہیں ہیں۔ ہشامی ذیل کا قصہ حلیمہ سے نقل کرتا ہے کہ اس نے بیان کی کیا ''ایک روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بھائی اور بہن کے ساتھ گھر کے قریب مویشی میں کھیل رہے تھے وہ دونوں دفعتہً میرے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور روکر کہنے لگے کہ دوسفید پوش آدمی ہمارے قریشی بھائی کو پکڑ کر لئے گئے اوران کا سینہ چاک کرڈالا۔ میں اور میرا خاوند اس مقام پر گئے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ کا مارے خوف کے رنگ فق تھا۔ہم نے ان کو چھاتی سے لگایا اوران کے اضطرار کا باعث پوچھا انہوں نے جواب دیا کہ دوآدمی سفید پوش میرے قریب آئے اور مجھ کو چت لٹا کر میرا دل چیرا اوراس میں سے کوئی چیز نکال ڈالی۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کیا چیز تھی۔

اس طرح کی ایک اور کہانی ہشامی نے بغیر کسی سند کے صرف یہ بیان کر کے کہ بعض علماء نے بیان کیا ہے اپنی کتاب میں لکھی ہے کہ بعض لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے کہا کہ آپ کچھ اپنی تعریف بیان فرمائیے اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''میں ان برکتوں کا مشتاق ہوں جن کے عطا کرنے کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا تھا اور میں وہ شخص ہوں جس کے آنے کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی جب کہ میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا میری ماں کو معلوم ہوا کہ ان سے ایک نور نکلا جس سے شام کے محل منور ہو گئے۔ایک دن میں اپنے دودھ بھائیوں کے ساتھ مویشی چرار ہا تھا کہ دفعتہً دوآدمی جو سفید لباس پہنے ہوئے تھے میرے پاس آئے اور مجھ کو لٹا کر میرے سینہ کو چاک کیا اور میرے دل کو نکال کر چیرا اوراس میں سے ایک سیاہ قطرہ دبا کر نکال ڈالا۔اس کے بعد انہوں نے دل کو اور سینہ کو برف سے دھودھلا کر پاک صاف کر دیا۔ان میں سے ایک نے کہا کہ اس کو ایک طرف رکھ کر اور دس آدمیوں کو دوسری طرف رکھ کر تولو مگر میں وزن میں زیادہ ہوا۔تب اس نے سوآدمیوں سے مجھے تولا اس پر بھی میں وزن میں بڑھتی رہا۔اس پر ایک نے دوسرے سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو کیونکہ اگر تم اس کو تمام جہاں کے مقابلہ میں تولو گے تب بھی یہ کم نہ نکلے گا۔

واقدی نے بھی ان دونوں روایتوں کو نقل کیا ہے اور کتاب شرح السنہ میں عرباض ابن ساریہ سے آنحضرت ﷺ کے مذکورہ بالا فضائل کا بیان ہوا ہے اور داری میں ابوذر غفاری سے آنحضرت ﷺ کے تولے جانے کی روایت بھی بیان ہوئی ہے۔مگران روایتوں میں جواختلاف ہے وہ غور کے قابل ہے۔حلیمہ سے جو روایت ہے اس میں برف کے پانی اور طشت کا اور دل کے دھونے کا کچھ ذکر نہیں ہے اوراس میں پایا جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا تولا جانا بطحائے مکہ میں ہوا تھا۔بایں ہمہ یہ تمام روایتیں نہایت نا معتبر ہیں اور کہانی ہونے سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتیں۔

عیسائی مصنف ایک بڑی غلطی میں پڑے ہیں اور وہ اپنے ہاں کی مقدس کتابوں کو جن میں کتب تواریخ اور ملوک اور قضاۃ وغیرہ داخل ہیں اور توریت وانجیل کے ان تمام مقاموں کو جن میں تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں بمنزلہ وحی یعنی کلام الٰہی کے سمجھتے ہیں اوران سب کو ہر طرح کی غلطی اور خطا سے پاک جانتے ہیں حالانکہ ان میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔اسی طرح انہوں نے یہ خیال کرلیا ہے کہ مسلمان بھی اپنی حدیثوں اور روایتوں کو ایسا ہی بے نقص سمجھتے ہوں گے اوراس خیال خام سے انہوں نے مسلمانوں کی تمام حدیثوں اور روایتوں کو نا قابل خطا تصور کر کے اسلام پر نہایت سخت طعن وتشنیع کی ہے' لیکن وہ بڑی غلطی میں پڑے ہیں کیونکہ مسلمان اپنے ہاں کی روایات واحادیث کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے کہ اور تواریخ کے واقعات کو دیکھتے ہیں اوران کو ویسا ہی ممکن الخطا خیال کرتے ہیں۔مسلمان اپنے ہاں کی حدیثوں اور روایتوں کو اس وقت صحیح سمجھتے ہیں جب کہ ان کے لئے کافی ثبوت اور

معتمد سند پاتے ہیں ورنہ ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے۔ یہ روایتیں جو شامی اور واقدی میں بیان ہوئی ہیں یا وہ روایتیں جو شرح السنہ اور داری میں مذکور ہیں صحت سے بہت دور ہیں۔ محققین علمائے اسلام ان کو محض نا قابل اعتبار سمجھتے ہیں اور بیہودہ افسانے جو محض جہلا کے خوش کرنے کے قابل ہیں خیال کرتے ہیں۔ پس عیسائی مؤرخوں نے اس بات میں بڑی غلطی کی ہے کہ ان نامعتبر روایتوں کی بنیاد پر اسلام پر اعتراض کیا ہے۔

البتہ شق صدر کے معاملہ میں ایک روایت ہے جو ایک معتبر کتاب میں لکھی ہے یعنی مسلم میں اور اس لئے وہ اس لائق ہے کہ علمائے اسلام اس پر توجہ کریں اور اس بات کی تحقیق و تدقیق کریں کہ وہ روایت صحیح ہے یا بے اصل کیونکہ مسلم میں اس روایت کے مندرج ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس کی صحت میں کچھ شبہ نہیں بلکہ صرف علماء کی توجہ کا استحقاق رکھتی ہے اور اگر بعد تحقیق کے معلوم ہو کہ وہ صحیح نہیں ہے تو گو کہ وہ مسلم نے بیان کی ہو ویسی ہی نامعتبر تصور ہوگی جیسے کہ اور کسی نے بیان کی ہوتی۔

مسلم میں ہے کہ انس ابن مالکؓ نے کہا کہ ''ایک روز جب کہ آنحضرت ﷺ مکہ میں لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے حضرت جبرائیل ان کے پاس آئے اور ان کا دل چیرا اور اس میں سے ایک قطرہ نکال کر کہا کہ تجھ میں یہ شیطان کا حصہ تھا تب اس کو ایک سونے کے طشت میں آب زمزم سے دھویا اور اس کو بجنسہ جہاں رکھا ہوا تھا وہیں رکھ دیا اور لڑکے بھاگ کر زہیرہ آنحضرت ﷺ کی دودھ پلائی کے پاس گئے اور کہا کہ آنحضرت ﷺ کو مار ڈالا۔ وہ فوراً محمدؐ کے پاس دوڑی آئی اور ان کا رنگ فق پایا۔ (انس کا بیان ہے کہ) سیون کا نشان جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر محسوس ہوتا تھا میں نے خود دیکھا تھا۔

قطع نظر اس کے کہ اس روایت سے وہ تمام روایتیں جن میں حلیمہ کے گھر شق صدر ہونے کا بیان ہوا ہے غلط اور باطل قرار پاتی ہیں۔ یہ روایت بھی چار مستحکم دلیلوں سے قابل اعتبار کے نہیں۔ اول یہ کہ انہی انس نے ایک دوسری روایت میں اس وقت کا ہونا سب معراج میں بیان کیا ہے اور وہ زمانہ اس زمانہ سے جو اس روایت میں مذکور ہے بالکل مختلف ہے۔ ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ انس کے بعد کے راوی نے انس کی اس لمبی روایت میں سے جو معراج سے متعلق ہے اور جس کا بیان آگے ہوگا ایک ٹکڑا توڑ کر اور اس میں کمی بیشی کر کے بیان کیا ہے جس سے اس روایت کی بے اعتباری اور اس مضمون کا کہ سیون کے نشان انس نے دیکھے تھے لغو اور بے اصل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس روایت میں انس کا یہ قول کہ میں نے آنحضرت کے سینہ پر سیون کے نشان بچشم خود دیکھے تھے بیان کیا گیا ہے حالانکہ یہ بات غیر ممکن ہے کیونکہ اگر مانا جائے کہ آنحضرت ﷺ کا سینہ درحقیقت چیرا گیا تھا جیسا کہ اس روایت میں مذکور ہے تو اس کی سیون کے نشان کا محسوس ہونا ناممکن تھا کیونکہ یہ سیون جرح کی سیون اور ٹانکوں کی مانند نہ تھی۔ کسی روایت کی اصلیت کے امتحان کرنے کا یہ بھی طریقہ ہے کہ اگر وہ کسی ایسے امر کو بیان کرے جو خود اس معجزہ کے جو اس روایت میں بیان ہوا ہے برخلاف ہو تو ایسی روایت محض بے اصل ہوگی۔ پس اس دلیل سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ یہ روایت محض بے اصل و نا معتبر ہے اور انس کے بعد راوی نے اس میں بالکل غلطی کی ہے۔ تیسرا یہ کہ آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ کے حلیہ کا مفصل بیان کیا ہے۔ مگر کسی نے اس سیون کے نشانوں کا جس کا بیان اس روایت میں ہے ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت سے صحابہ اس کا ذکر کرتے۔ چوتھے یہ کہ انس بروقت وقوع اس واقعہ کے موجود نہ تھے اور نہ انہوں نے ان اشخاص کے نام بیان کئے ہیں جن کی وساطت سے ان کو یہ روایت پہنچی۔ روایت کے نامعتبر قرار دینے کو ایک مستحکم اصول یہ قرار پایا ہے کہ اگر راوی کسی ایسے واقعہ کو بیان کرے جس میں وہ خود موجود نہیں تھا تو وہ روایت قابل اعتبار کے نہیں ہے گو کہ وہ راوی صحابہؓ میں سے کیوں نہ ہو۔

شق صدر کے متعلق روایتیں ایسی ہیں کہ ان کی باہمی تطبیق نہیں ہوسکتی اور اس لئے وہ سب کی سب نامعتبر ہیں۔ مصنف مواہب لدنیہ نے سب سے زیادہ نادانی کی ہے کہ ان مختلف روایتوں کو دیکھ کر بعوض اس کے کہ ان کو نامعتبر ٹھہراتا یہ تسلیم کیا ہے کہ واقع شق صدر پانچ مرتبہ واقع ہوا تھا۔ اول اس وقت جب کہ آنحضرت ﷺ اپنی دائی حلیمہ کے پاس رہتے تھے۔ دوم مکہ میں جب کہ آنحضرت کی عمر دس برس کی تھی۔ سوم غار حرا میں۔ چہارم شب معراج میں۔ پنجم ایک دفعہ اور جس کے وقت کی تعین خود مصنف نہ کر سکا۔ یہ تمام روایتیں ایسی ہیں جن پر تمام ذی علم اور تعلیم یافتہ مسلمان ذرا بھی اعتبار نہیں کرتے اور یہ روایتیں محققین علمائے اسلام کے نزدیک طفلانہ افسانوں سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتیں۔

شق صدر کی نسبت صرف ایک روایت جس میں شب معراج میں شق صدر کا ہونا بیان کیا گیا ہے اعتبار کے لائق ہوسکتی ہے اور اس واقعہ کو ہم معراج کے ساتھ بیان کریں گے۔ مگر معراج کے تمام واقعات جو کچھ کہ ہوں بطور رویا کے آنحضرت ﷺ پر منکشف ہوئے تھے پس جو بیان شق صدر کا اس روایت میں ہے وہ بھی رویا سے متعلق ہے۔

اب ہم معراج کے حالات بیان کرنے پر متوجہ ہوتے ہیں۔ معراج کے مقدم واقعات جن پر توجہ کی جاسکتی ہے یہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے سینہ مبارک کا شق کیا جانا۔ آپ کا براق پر سوار ہوکر مکہ سے بیت المقدس کو جانا اور وہاں سے آسمان پر تشریف لے جانا۔ وہ واقعات اور مکالمات جو آسمانوں پر پیش آئے۔ مگر مطلق ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان باتوں کے درحقیقت واقع ہونے کا کبھی دعویٰ کیا ہو۔ قرآن مجید سے اور نیز ان روایتوں سے جو راویوں نے معراج کی نسبت بیان کی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ مکہ سے بیت المقدس گئے ہیں اور اگر اس روایت کو جس میں شق صدر کا بھی ذکر ہے صحیح مانا جائے تو یہ بھی آنحضرت ﷺ نے خواب میں دیکھا تھا کہ ان کا سینہ چاک کر کے ان کا دل پانی سے دھویا گیا ہے اور اسی خواب میں آنحضرت ﷺ نے اور بھی کچھ خدا کی نشانیاں دیکھیں جس کی تفصیل قرآن مجید مذکور نہیں۔

اول ہم اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ معراج صرف ایک رویا تھا۔ بخاری میں لکھا ہے کہ:

”عن ابن عباس فی قولہ تعالیٰ وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنۃ قال ھی رویا عین اریہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ اسری بہ الی بیت المقدس“ (بخاری)

”ابن عباس نے قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر میں ”وما جعلنا الرویا التی اریناک الا فتنۃ للناس“ کہا کہ یہ آنکھ کا رویا ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات دکھایا گیا تھا جب وہ بیت المقدس کو لے جائے گئے تھے۔

قتادہ کی روایت میں ہے کہ معراج کی رات میں آنحضرت ﷺ چت لیٹے ہوئے تھے۔

حسن کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ معراج کی رات کو میں مقام حجر میں سوتا تھا۔

انس کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ مسجد حرام میں سوتے تھے اور جب تمام قصہ معراج کا انس بیان کر چکے ہیں تو اس کے آخر میں رسول اللہ ﷺ کے یہ لفظ بیان کئے ہیں ”پھر میں جاگ اٹھا اور مسجد حرام میں تھا“

ام ہانی کی روایت میں ہے کہ معراج کی رات کو آنحضرت ﷺ عشاء کی نماز پڑھ کر ہم میں سو رہے اور فجر سے پہلے ہم نے ان کو جگایا۔

عبدابن حمید کی روایت میں ہے کہ معراج کا حال بیان کرنے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ”کہ میں سوتا تھا“ یا یہ کہا کہ ”چت

لیٹا ہوا تھا'' یا یہ کہا کہ ''سونے اور جاگنے کے بیچ میں تھا۔

یہ روایتیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا آئندہ لکھی جائیں گی۔ یہ سب روایتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ معراج کے جو واقعات کہ بیان ہوئے ہیں وہ خواب کے واقعات ہیں اور اگر ان روایتوں کے معتبر ہونے پر شبہ کیا جائے تو اتنی بات تو ضرور اس سے ثابت ہوتی ہے کہ اس زمانہ کے لوگ جب کہ یہ روایتیں لکھی گئیں معراج کے واقعات کو رویا کے واقعات سمجھتے تھے علاوہ اس کے بہت سے علمائے محققین نے جن معاویہ اور حذیفہ بھی داخل ہیں جو معتبر اصحاب میں سے ہیں بالا تفاق معراج کو ایک رویا قرار دیا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل سندوں سے ثابت ہوتا ہے۔

"فذهب طائفة الى انه اسرى بالروح وانه رويا منام مع اتفاقهم ان رويا الانبياء حق ووحى والى هذا ذهب معاوية وحكى عن الحسن والمشهور عنه خلافه واليه اشار محمد بن اسحاق" (شفاء)

شفائے قاضی عیاض میں لکھا ہے کہ ''ایک گروہ عالموں کا اس طرف گیا ہے کہ معراج روحانی تھی اور وہ سونے میں ایک رویا تھا۔ اسی کے ساتھ ان سب نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ انبیاء کا رویا حق اور وحی ہے اور اسی بات کی طرف معاویہ بھی گئے ہیں اور حسن سے بھی یہی روایت کی گئی ہے لیکن ان کی مشہور روایت اس کے برخلاف ہے اور اس کی طرف محمد ابن اسحٰق نے اشارہ کیا ہے۔

"وحكى عن محمد بن جرير الطبرى فى تفسيره عن حذيفة انه قال ذلك روياو انه ما فقد جسد رسول الله ﷺ و انما اسرى بروحه وحكى هذا القول ايضاً عن عائشة ؓ و عن معاوية ؓ" (تفسير كبير)

تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ محمد بن جریر طبری سے اس کی تفسیر میں نقل کی گئی ہے کہ حذیفہ نے کہا کہ ''یہ (یعنی واقعہ معراج) رویا تھا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم نہیں گیا تھا اور معراج صرف روحانی تھی اور یہی قول عائشہؓ اور معاویہؓ سے بیان کیا گیا ہے۔

مگر علمائے متاخرین نے مذہبی گرمجوشی سے یہ بات قرار دی کہ معراج جسمانی تھی اور تمام واقعات جو واقع ہوئے ہیں فی الحقیقت واقع ہوئے تھے۔ لیکن اس ادعا کی نسبت ان کے پاس کوئی سند قرآن مجید کی موجود نہیں ہے بلکہ بعض الفاظ کے معنوں پر جوش وخروش کے ساتھ بحث کر کے اس امر کو قائم کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ لفظ ''اسریٰ'' کا اطلاق رویا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے معنی رات کے سفر کے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اس لفظ سے واقعی رات کا سفر مراد لیتے ہیں اسی طرح وہ یہ دلیل کرتے ہیں کہ لفظ ''بعبدہ'' کا اطلاق جس کے معنی اپنے بندہ کے ہیں روح اور جسم دونوں پر ہوتا ہے کیونکہ انسان دونوں چیزوں سے مرکب ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ وہ سفر یعنی معراج جسمانی ہوئی ہو۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ لفظ رویا کے معنی دیکھنے کے ہیں اگرچہ اس سے بالعموم خواب میں دیکھنے کے معنی لئے جاتے ہیں لیکن اس کا اطلاق فی الواقع آنکھ کے دیکھنے پر بھی ہو سکتا ہے اور اس لئے ممکن ہے کہ ''رویا'' کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اس سے پچھلے معنی مراد ہوں۔ اس پر وہ یہ دلیل اور اضافہ کرتے ہیں کہ ابن عباس کی روایت میں جو لفظ ''رویا عین'' استعمال ہوا ہے تو ''عین'' کی قید لگانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ رویاء کے لفظ سے فی الواقع آنکھ کا دیکھنا مراد ہے۔

باقی حدیثوں کا جن میں آنحضرت ﷺ کا سوتا ہوا ہونا مذکور ہے یوں فیصلہ کرتے ہیں کہ یا تو آنحضرت ﷺ معراج کے شروع ہونے کے وقت اس طرح پر لیٹے ہوئے ہوں گے جیسے کہ عموماً لوگ سونے کے واسطے لیٹتے ہیں یا معراج سوتے میں شروع

ہوئی ہوگی اور پھر جاگ گئے ہوں گے اور جاگنے کی حالت میں ختم ہوئی ہوگی۔

مگر ہر شخص جس میں ذرا بھی سمجھ ہے اور ذرا بھی استدلال کا مادہ رکھتا ہے واضح ہوگا کہ مذکورہ بالا دلیلیں کیسی پوچ اور ضعیف ہیں۔ ان دلیلوں کے پیش کرنے والے صرف وہی لوگ ہیں جو جوش مذہبی میں اندھے ہو کر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان تمام روایتوں پر جو ذرا بھی مذہب سے علاقہ رکھتی ہیں گو وہ کیسی ہی بیہودہ اور محال اور قابل تضحیک ہی کیوں نہ ہوں آمنا وصدقنا کہنا چاہیے۔ بلا شبہ ان مسلمانوں کا یہ جاہلانہ اعتقاد ان کی نامعقولیت پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن عیسائیوں کا یہ بیان کہ ہر مسلمان کو ان سب بیہودہ باتوں کو امور دینی سمجھ کر بلا وسواس ان پر اعتماد رکھنا واجب ہے اور بھی زیادہ بیہودہ پن ہے۔ دیدہ دانستہ ناانصافی اور عامیانہ جہالت کس قدر گہرے اور تاریک گڑھے میں پڑ دھنسا ہوا ہوگا جس وقت کہ اس نے یہ کہا کہ جملہ مسلمان اس کو ایک اصل امر دینی سمجھتے ہیں اور اس مذہب کے تمام لوگوں کا اس قصے پر ایسا مستحکم اعتقاد ہے جیسے کہ عیسائی انجیل کے کسی امر پر عقیدہ رکھتے ہیں۔

عیسائیوں کی عادت ہے کہ جب وہ کوئی کتاب مذہب اسلام یا اس کے بانی کے حالات میں لکھتے ہیں تو ان کا ارادہ انصاف یا تحقیق حق کا نہیں ہوتا بلکہ قلم اٹھانے سے پہلے وہ قصد کر لیتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے اس کو لغو اور بیہودہ ظاہر کیا جائے۔ پس وہ ان تمام لغو اور مہمل روایتوں کو جن کو خود مسلمان تسلیم نہیں کرتے ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر مسلمانوں کے خاص امور دینی بغیر کسی دلیل کے قرار دیتے ہیں اور اس پر زبان طعن وتشنیع دراز کرتے ہیں۔ عیسائیوں نے باستثنائے معدودے چند کے اس مقدس شخص کے احکام وطریقہ کو جس کے پیرو وہ اپنے تئیں بتاتے ہیں اور جس کے علم اور نیک خصلت سے وہ محض بے بہرہ ہیں بالائے طاق رکھ کر ان لوگوں پر جو خدائے واحد پر برحق پر ایمان رکھتے ہیں ایسے الفاظ سے طعن وتشنیع کی ہے جن کا ملحد اور لامذہب لوگوں پر بھی استعمال کرنا نازیبا ہے اسی قسم کی ناانصافانہ سخت کلامیاں ہیں جو عیسائیوں نے معراج اور شق صدر کے باب میں لغو اور نامعتبر روایتوں کی بنیاد پر مسلمانوں پر کی ہیں۔

مگر ہم ان عیسائی مصنفوں کا شکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے انصافانہ تسلیم کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ ہمیشہ اس واقع کو خواب کا واقعہ بیان کرتے تھے اور انہوں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ راویوں نے جو زیادتیاں اس میں کر دی ہیں ان سے بانی مذہب اسلام پر کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اکتوبر کے کوارٹرلے ریویو نمبر ۲۵۴ میں ایک عیسائی مصنف نے یہ رائے لکھی ہے کہ ''جو کچھ ہم کو اس مقام پر بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اپنے بعض سرگرم پیروؤں کا ذمہ دار نہیں قرار دینا چاہیے جب کہ انہوں نے اس خواب کو (جس کے ہم پلہ تمام ڈوائن کامڈی میں شاید ہی کوئی خواب ہو اور جس نے البتہ کسی قدر رنگ اس سے نادانستہ اڑایا ہے لیکن محمد (ﷺ) اس کو ہمیشہ خواب کہتے کہتے تھک گئے) ایک مہمل اور لایعنی چیز کے ساتھ بدل دیا۔

اگر چہ ہم نے ان روایتوں کی جو معراج سے متعلق ہیں بخوبی قدر ومنزلت جیسی کہ ان کی ہے بیان کر دی ہے لیکن اب ہم ان تمام نامعتبر روایتوں کو اور ان تمام بے بنیاد قصوں کو جو ان میں مذکور ہیں بغرض اتمام حجت واقعی تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان تمام قصوں پر اعتقاد رکھنا مسلمانوں کے ہاں ایک خاص امر دینی ہے اور پھر ہم ان متعصب عیسائیوں سے جو ان روایات کی بنا، پر مذہب اسلام پر طعن وتشنیع کرتے ہیں پوچھتے ہیں کہ وہ کیوں اس قدر رند مچاتے ہیں جب کہ وہ خود اس سے بھی زیادہ عجیب باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ کیا ان کا یہ اعتقاد نہیں ہے اور وہ اس بات کو دینی امر خیال نہیں کرتے کہ حضرت الیاس آسمان پر انسانی جسم وشکل کے ساتھ بدوں چکھے ذائقہ موت۔ کے ایک آتشیں گاڑی میں بذریعہ ایک آندھی کے اٹھالئے گئے ہیں؟ اور کیا عیسائی اس بات

پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ حضرت عیسیٰ مسیح مرنے کے بعد اٹھے اور آسمان پر چلے گئے اور خدا تعالیٰ کے دست راست کی طرف بیٹھے یعنی خود اپنی ہی دست راست کی طرف کیونکہ وہ خود خدا تھے؟ (متی باب ۲۸ آیت ۷ مرقس باب ۱۶ آیت ۱۹)۔

اس واسطے ہم تمام عیسائیوں کو جو ایسی خراب اور ایذا رساں نظیر کی تقلید کی جانب مائل ہیں ان کے احکام مرقومۃ الذیل کی پیروی کرنے کی صلاح دیتے ہیں کہ ''تو اس ذرہ کو جو تیرے بھائی کی آنکھ میں ہے دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ میں جو شہتیر ہے اس کو نہیں دیکھتا۔ تو اپنے بھائی سے کس طرح کہہ سکتا ہے کہ بھائی تو مجھ سے اپنی آنکھ کا ذرہ نکلوا لے جب کہ تجھ کو خود اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ اے مکار پہلے تو اپنی آنکھ میں شہتیر تو نکال لے تب تجھ کو اپنے بھائی کی آنکھ میں کا ذرہ نکالنے کے لئے صاف نظر آنے لگے گا۔'' (لوقا باب ٦ آیت ۴۱، ۴۲)

گرم جوش پیرو ہمیشہ اس قسم کے واقعات کو جب نظم یا نثر میں بیان کرتے ہیں تو اس میں شاعرانہ خیالات ملا دیتے ہیں۔ اسی طرح معراج کے حالات نظم و نثر میں لوگ بیان کرتے ہیں تو اس میں بھی شاعرانہ خیالات ملا دیتے ہیں۔ یہ امر مسلمان گرمجوش پیروؤں پر موقوف نہیں ہے بلکہ عیسائی گرمجوش پیروؤں کا بھی یہی حال ہے۔ ایک مقدس عیسائی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر چلے جانے کے قصہ کو نہایت شاعرانہ رنگینی سے نظم کیا ہے جس کا ترجمہ ہم لکھتے ہیں۔

''اس نے آسمان کی طرف مراجعت کی اور اس کے پیچھے صدائے مرحبا اور دس ہزار چنگوں کی سریلی آوازیں تھیں جو زمزمہائے ملکوتی کا سماں باندھ رہی تھیں۔ زمین اور ہوا ان کی آواز سے گونج رہی تھی تمام افلاک و بروج سے صدائے باز گشت آ رہی تھی۔ سیارے اپنے اپنے مقامات پر سننے کے لئے ٹھہر گئے تھے جب کہ یہ نورانی جلوس طنطنہا۔ شادکامی کے ساتھ عالم بالا کا عازم ہوا۔ انہوں نے یہ نغمہ گایا اے لازوال دروازو کھل جاؤ۔ اے آسمانوں اپنے دروازوں کو وا کرو اور اس بڑے نجات دہندہ کو جو اپنے کام کو اختتام پر پہنچا کر شان و شوکت کے ساتھ آتا ہے اندر لے لو اور اب خدا تعالیٰ نظر عاطفت سے نیک لوگوں کے مکانوں میں قدم رنجہ کرے گا اور اپنی خوشی سے اپنے قاصدان اولی الاجنحہ کو رحمت آسمانی کے پیغام دے کر متواتر وہاں بھیجا کرے گا۔

پس کیا کسی مسلمان کو زیبا ہے کہ ان شاعرانہ خیالات کو مذہب عیسوی میں داخل قرار دے کر ان پر بیہودہ طعن و تشنیع شروع کرے۔

اب ہم اس طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ اس رات آنحضرت ﷺ نے خدا کی کیا نشانیاں دیکھیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں بجز اس کے کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کی کچھ نشانیاں دیکھیں اور کچھ مذکور نہیں ہے۔ مگر قرآن مجید کے طرز کلام پر اگر ہم غور کریں اور اس سے ان نشانیوں کا استنباط کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ قران مجید میں آیت اور آیات کا لفظ احکام پر اطلاق ہوا ہے اور دکھانے کا لفظ کسی بات پر کامل یقین کرا دینے کی نسبت بولا جاتا ہے۔ پس آیت معراج کے ان الفاظ کے ''لنریه من ایاتنا'' کے یہ معنی ہوئے ''تا کہ یقین کرا دیں ہم اس کو اپنے بعض حکموں سے'' پس وہ نشانیاں وہی احکام تھے جو عالم رویا میں ان کو وحی کیئے گئے۔ اب ہم کو تلاش کرنی چاہیے کہ وہ احکام کیا تھے۔ جب ہم اس مقدس سورت کو بغور پڑھتے ہیں اور بخوبی چھان بین کرتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکام جو آنحضرت ﷺ پر منکشف ہوئے اور جو اسی سورت میں مذکور ہیں وہ یہ ہیں۔

''لا تجعل مع الله الها اخر فتقعد موما مخذ ولا.'' (آیت ۲۳)

''مت مقرر کر ساتھ اللہ کے معبود اور پس بیٹھ رہے گا تو مذمت کیا گیا ہلاکت میں مونپا ہوا۔''

"واقضی ربک الا تعبدو الا ایاہ و بالوالدین احسانا اما یبلغن عندک الکبر احد ھما او کلا ھما فلا تقل لھما اف و لا تنھرھما وقل لھما قولا کریما (آیت ۲۴)"

"اور حکم کیا تیرے پروردگار نے کہ نہ پوجو مگر اسی کو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔ اگر پہنچیں تیرے نزدیک بڑھاپے کو دونوں میں سے ایک یا دونوں۔ پس مت کہو ان کو اف اور مت ڈانٹ ان کو۔ اور کہہ ان کو معزز کہنا۔"

"واخفض لھما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا" (آیت ۲۵)

"اور نیچا کر ان دونوں کے لئے ذلت کا بازو مہربانی سے اور کہہ اے پروردگار رحم کر ان پر جس طرح پالا انہوں نے مجھ کو بچپن میں۔"

وات ذا القربی حقه و المسکین و ابن السبیل و لا رتبذ وتبزیرا. (آیت: ۲۸)

"اور دے رشتہ دار کو اس کا حق اور مسکین کو اور مسافروں کو اور فضول خرچی مت کر۔"

و لا تجعل یدک مغلولة الیٰ عنقک و لا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما محسورا. (آیت ۳۱)

"اور مت کر اپنے ہاتھ کو بندھا ہوا اپنی گردن کی طرف اور مت کھول دے اس کو بالکل کھول دینا۔ کہ بیٹھ رہے تو ملامت کیا ہوا درماندہ۔"

و لا تقتلوا اولادکم خشیة املاق نحن نرزقھم و ایاکم ان قتلہم کان خطاء کبیرا. (آیت ۳۳)

"اور مت مار ڈالو اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے ہم ان کو اور تم کو روزی دیتے ہیں۔ بیشک ان کا مارڈالنا بڑا گناہ ہے۔"

و لا تقربوا الزنا انه کان فاحشة وساء سبیلا. (آیت ۳۴)

اور زنا کے پاس مت جاؤ۔ بے شک وہ بے حیائی اور بُری راہ ہے۔

"و لا تقربوا النفس التی حرم الله الا بالحق" (آیت ۳۵)

"اور مت مار ڈال اس جان کو جس کو خدا نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔"

و لا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن حتی یبلغ اشدہ واوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا" (آیت ۳۶)

"اور مت چھوؤ یتیم کے مال کو مگر پسندیدہ طریقہ سے یہاں تک کہ وہ پہنچے اپنی جوانی کو اور پورا کرو عہد کو بیشک عہد پوچھا جائے گا۔"

"واوفوا الکیل اذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم" (آیت ۳۷)

"اور پورا کرو پیمانہ کو جب ناپو اور وزن کرو سیدھے ترازو سے"

"ولا نقف ما لیس لک به علما ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنه مسئولا" (آیت ۳۸)

"اور اس بات کے پیچھے مت پڑ جس کا تجھ کو علم نہیں ہے بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہوگا۔"

ولا تمش فی الارض مرحاً انک لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولا" (آیت ۳۹)

''اور زمین میں اکڑتا ہوا مت چل' یقیناً تو زمین کو پھاڑ نہ ڈالے گا اور لمبائی میں پہاڑوں کو نہ پہنچے گا۔''

"کل ذلک کان سیئہ عند ربک مکروھا" (آیت ۴۰)

''ان سب باتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔''

"ذلک مما اوحی الیک ربک من الحکمۃ ولا تجعل مع اللہ الھا اخر فتلقی فی جھنم ملوما مدحورا" (آیت ۴۱)

''یہ ان چیزوں میں سے ہے کہ تیرے پروردگار نے وحی بھیجی تیرے طرف حکمت سے اور مت قرار دے خدا کے ساتھ دوسرا خدا کہ ڈالا جائے تو دوزخ میں ملامت کیا ہوا' راندہ ہوا۔''

پچھلی آیت سے صاف پایا جاتا ہے کہ ان احکام کی وحی خدا تعالیٰ نے دی تھی اور جو کہ یہ تمام احکام اسی سورۂ معراج میں بہ لفظ وحی بیان ہوئے ہیں اس سے یقین ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو شب معراج میں احکام کا انکشاف ہوا تھا۔

بعض روایتیں اس خواب میں اور بہت سی چیزوں کے ظاہر ہونے کا بیان کرتی ہیں مگر ان کی صحت کے واسطے کوئی بھی معتبر سند نہیں ہے اور ایسی بہت کم روایتیں ہیں جن کے راویوں کا سلسلہ پیغمبر خدا تک پہنچتا ہو۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان راویوں نے کوئی بات قرآن مجید سے اور کوئی بات حدیثوں سے بلا تنقیح ان کی صحت کے اور کوئی بات کسی راوی کی زبانی روایت سے اور کوئی دوسری بات کسی دوسرے راوی کی زبانی روایت سے چن کر اور ان سب پر اپنے بے دلیل اور وہمی خیالات کا اضافہ کر کے ایک قصہ گھڑ لیا ہے۔ علاوہ اس کے یہ سب روایتیں کچھ عقل ہی کے برخلاف نہیں ہیں بلکہ خود دین اسلام کے عقائد اصولی کے اس قدر خلاف ہیں کہ ان پر ذرہ برابر بھی اعتقاد رکھنا محال ہے۔

علاوہ اس کے یہ روایتیں ایک دوسری سے ایسی مخالف اور متناقض ہیں کہ ہم کو کوئی شخص ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک کی دوسری تطبیق کر سکے۔ اس مقصد سے کہ جو کچھ ہم نے اوپر کیا ہے ہمارے اس کتاب کے پڑھنے والوں کے ذہن میں بخوبی آ جانے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان سب روایتوں کو اس مقام پر نقل کریں اور ان کے اختلافات دکھانے کو ان کو علیحدہ علیحدہ اٹھارہ حصوں میں تقسیم کریں۔

اول۔ ان اختلافات کو دکھلایا جاتا ہے جو مقام وقوع معراج سے متعلق ہیں

"عن قتادۃ عن انس بن مالک عن مالک بن صعصعۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدثھم عن لیلۃ اسری بہ بینما انافی الحطیم وربما قال فی الحجر" (قتادہ)

''مالک بن صعصعہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں سے شب معراج کا قصہ بیان کیا تو فرمایا کہ اس درمیان میں کہ ''میں حطیم میں تھا'' اور کبھی فرمایا کہ حجر میں۔''

"عن ابن شھاب عن انس قال کان ابو ذریحدث ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فرج عنی سقف بیتی وانا بمکۃ" (ابن شھاب)

''انس سے روایت ہے کہ ابو ذر حدیث بیان کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے گھر کی چھت شق ہوئی

اور میں مکہ میں تھا۔"

"عن ام هانی انها قالت ما اسری برسول الله صلی الله علیه وسلم الا وهو فی بیتی تلک اللیلة" (ام هانی)

"ام ہانی نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کو معراج نہیں ہوئی' مگر یہ کہ وہ اس رات کو میرے گھر میں تھے۔"

وقدروی عمر بن الخطاب فی حدیث الاسراء عنه علیه السلام انه قال ثم رجعت الیٰ خدیجة وما تحولت عن جانبها" (شفاء)

"حضرت عمر بن خطاب نے معراج کی حدیث میں آنحضرت سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا پھر واپس آیا میں خدیجہ کی طرف اور انہوں نے کروٹ نہیں بدلی تھی۔"

دوم۔ان اختلافات کو دکھلایا جاتا ہے جو بروقت شروع معراج آنحضرت ﷺ کی حالت سے متعلق ہیں

"مضطجعا" (قتادہ)"

"لیٹے ہوئے تھے۔"

"وعن الحسن بینما انا نائم فی الحجر جاء نی جبرائیل فهمزنی بعقبه لقمت فجلست فلم اراحدا فعدت الی مضجو ذکر ذلک ثلثا فقال فی الثالثة فاخذ بعضدی فجرنی الی باب المسجد" (حسن)

"اس درمیان میں کہ میں حجر میں سویا ہوا تھا جبرائیل میرے پاس آئے پھر ٹھوکا دیا ایڑی سے پس میں اٹھ بیٹھا سو مجھ کو کوئی شخص نظر نہ آیا۔ پھر میں اپنے خواب گاہ کی طرف پھرا۔ آپؐ نے اس کو تین بار ذکر کیا اور تیسری بار فرمایا کہ میرے بازو کو پکڑا اور مسجد کے دروازہ تک کھینچ لائے۔" (حسن)

"عن انس وهونائم فی المسجد الحرام وذکر القصة ثم قال اخرها فاستیقظت وانا با المسجد الحرام" (شفاء قاضی عیاض)

"انس سے روایت ہے کہ وہ "سوئے ہوئے تھے مسجد حرام میں" قصہ کو بیان کیا' پھر آخر میں کہا کہ جاگا میں' اور میں مسجد حرام میں تھا۔" (شفاء قاضی عیاض)

"صلی العشاء الاخرة ونام بیننا فلما کان قبل الفجر اهبنا رسول الله صلی الله علیه وسلم فلما صلی الصبح وصلینا قال یا ام هانی لقد صلیت معکم العشاء الاخرة کمارایت بهذ الوادی ثم جئت بیت المقدس فصلیت فیه ثم صلیت الغداة معکم الان کما ترون" (ام هانی)

"آنحضرت ﷺ نے آخری عشاء پڑھی اور ہم لوگوں میں سوئے۔ فجر سے پہلے آنحضرت ﷺ نے ہم لوگوں کو جگایا۔

پھر جب آپؐ نے صبح کی نماز پڑھ لی اور ہم لوگوں نے پڑھ لی۔ آپؐ نے فرمایا اے ام ہانی میں نے تم لوگوں کے ساتھ آخری عشاء پڑھی جیسا کہ تو نے اس میدان میں دیکھا' پھر میں بیت المقدس پہنچا اور وہاں نماز پڑھی' پھر صبح کی نماز اس وقت تم لوگوں کے ساتھ پڑھی جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔'' (ام ہانی)

"فی روایة عبد بن حمید عن همام بیننا انانایم وربما قال مضطجع وفی الروایة الاخری بین النایم والیقطان " (شفاء قاضی عیاض)

''ہمام سے روایت ہے کہ اس درمیان میں کہ میں سویا ہوا تھا اور کبھی فرمایا لیٹا ہوا تھا' اور دوسری روایت میں ہے کہ سونے اور جاگنے کے درمیان میں'' (شفاء عیاض)

"وحکو اعن عائشة انها قالت ما فقدت جسد رسول الله صلی الله علیه وسلم" (شفاء)

''عائشہؓ سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کا جسم گم نہیں کیا۔'' (شفاء)

سوم۔ متعلق شق صدر

"اذا تانی ات فشق مابین هذه الی هذه یعنی من ثغذة نحره الی شعرته " (قتاده)

''کہ میرے پاس آنے والا آیا اور یہاں سے یہاں تک چاک کر دیا یعنی سینہ کی ہڈی سے بالوں تک۔'' (قتادہ)

"فنزل جبرئیل ففرج صدری " (ابن شهاب)

''پس اترے جبرائیل اور چاک کیا میرا سینہ۔'' (ابن شہاب)

چہارم۔ واقعات بعد شق صدر

"فاستخرج قلبی ثم اتیت بطست من ذهب مملو ایمانا فغسل قلبی ثم حشی ثم اعید" (قتاده)

''پس میرا دل نکالا پھر ایک طشت سونے کا لائے جو ایمان سے بھرا ہوا تھا پھر میرے دل کو دھویا گیا پھر بھر دیا گیا اور ویسا ہی کر دیا گیا۔'' (قتادہ)

"وهی روایة ثم غسل البطن بماء زمزم ملا ایمانا و حکمة " (قتاده)

''اور روایت میں ہے کہ پھر پیٹ کو زمزم کے پانی سے دھویا جو ایمان اور حکمت سے بھرا ہوا تھا۔'' (قتادہ)

"ثم غسله بماء زمزم ثم جاء بطست من ذهب ممتلی حکمة و ایمانا نافرغه فی صدری ثم اطبقه" (ابن شهاب)

''پھر اس کو دھویا یا زمزم کے پانی سے پھر ایک طشت سونے کا لایا گیا جو حکمت و ایمان سے بھرا ہوا تھا۔ پس اس کو میرے سینے میں انڈیلا اور پھر برابر کر دیا۔'' (ابن شہاب)

پنجم۔ متعلق براق

"ثم اتیت بدابة دون البغل وفوق الحمار ابیض یقال له البراق یضع خطوه عند اقصٰی طرفه" (قتاده)

''پھر ایک چوپایہ میرے پاس لایا گیا خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا۔ سفید رنگ کا جس کا نام براق تھا' جس حد تک اس کی نظر جاتی تھی اس کا قدم وہیں پڑتا تھا۔'' (قتادہ)

"عن ثابت البنانی عن انس ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اتیت بالبراق وهودابة ابیض طویل فوق الحمارودون البغل یقع حافره عنه منتهی طرفه" (ثابت)

''ان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس براق لایا گیا جو ایک سفید' لمبا چار پایہ ہے' گدھے سے اونچا اور خچر سے چھوٹا۔ اس کا سم وہاں پڑتا تھا جہاں تک اس کی نگاہ جاتی تھی۔'' (ثابت)

"عن انس ان النبی صلی الله علیه وسلم اتی بالبراق لیلة اسری به ملجما مسرجا" (انس)

''انس سے روایت ہے کہ جس رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی' براق لایا گیا' زین کسا ہوا اور لگام چڑھا ہوا۔'' (ابن شہاب)

ششم' متعلق سواری براق

"فحملت علیه" (قتاده)

''پس میں اس پر سوار کرایا گیا'' (قتادہ)

"فرکبته" (ثابت)

''پس میں اس پر سوار ہوا'' (ثابت)

"فاستصعب علیه فقال له جبرائیل بمحمد تفعل هذا فمارکبک احد اکرم الله منه فارفض عرقا وقال الترمذی هذا حدیث غریب" (انس)

''پس اس کو دشوار گزرا۔ جبرئیل نے اس سے کہا ارے تو محمد کے ساتھ ایسا کرتا ہے' کوئی شخص ان سے زیادہ بزرگ تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے۔ پس وہ پسینے سے تر ہو گیا ترمذی نے کہا یہ حدیث غریب ہے۔'' (انس)

ہفتم۔ واقعات بیت المقدس پہنچ کے

''حتی اتیت بیت المقدس فربطته بالحلقة التی یربط بها الانبیاء '' (ثابت)

''یہاں تک کہ میں بیت المقدس آیا۔ پس میں نے اس کو اسی حلقہ میں باندھ دیا جس میں اور انبیا باندھا کرتے ہیں''

''عن بریدة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لما انتهینما الی بیت المقدس قال جبرئیل

باصبعه فخرق بها الحجر فشدبه البراق" (رواه الترمذی)

''بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب ہم بیت المقدس پہنچے جبرائیل نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا' پس پتھر پھٹ گیا اور اس سے براق کو اٹکا دیا۔'' (ترمذی نے اس کو روایت کیا ہے)

قتادہ اور اس کے سوا اور راویوں نے جناب پیغمبر خدا ﷺ کے بیت المقدس میں جانے اور وہاں چند رسوم کے ادا کرنے کا جن کو اب ہم بیان کریں گے کچھ ذکر نہیں کیا ہے۔

ہشتم۔ رسوم جو بیت المقدس میں ادا کی گئیں

"قال ثم دخلت المسجد فصليت فيه ركعتين" (ثابت)

''فرمایا آنحضرت ﷺ نے پھر داخل ہوا میں مسجد میں اور دو رکعت نماز اس میں پڑھی۔'' (ثابت)

"عن ابی هريره قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لقد رائيتني في الحجر و قريش تسالني عن مسرای فسا لتنی عن اشياء من بيت المقدس لم اثبتها فكربت كر باما كربت مثله فرفعه لی انظر اليه ما يسا لونی عن شی الا بناتهم وقد رايتنی فی جماعة من الا ابناتهم فی جماعة من الانبياء فاذا موسى قايم يصلی فاذا رجل ضرب جعد كانه من رجال شنوه و اذا اعيسى قايم يصلی اشبه الناس به صاحبكم يعنی نفسه فحانت الصلوة (صلوة العصر) فاممتهم فلما فرغت من الصلوة قال لی قايل يا محمد هذا مالک خازن النار فلم عليه فالتفت اليه فبد الی بالسلام " (رواه مسلم)

''فرمایا رسول اللہ ﷺ نے میں حجر میں تھا قریش میری معراج کا حال پوچھ رہے تھے۔ پس انہوں نے مجھ سے بیت المقدس کے متعلق چند باتیں پوچھیں جو مجھے یاد نہیں رہی تھیں۔ اس پر مجھ کو ایسا صدمہ ہوا کہ کبھی نہیں ہوا تھا پس خدا نے بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا کہ میں اس کو دیکھنے لگا۔ پھر جو بات انہوں نے پوچھی میں نے سب بتائی' اور میں نے اپنے کو جماعت انبیاء میں دیکھا۔ یکا یک موسیٰ (علیہ السلام) نظر آئے کہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ وہ ایک پیچیدہ مو آدمی تھے گویا شنوۃ کے لوگوں میں سے تھے۔ پھر عیسیٰ (علیہ السلام) نظر آئے کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ عروۃ بن مسعود ثقفی ان سے صورت میں بہت ملتے ہیں۔ پھر ابراہیم (علیہ السلام) نظر آئے کھڑے نماز پڑھ رہے تھے ان سے بہت ملتا ہوا تمہارا ساتھی ہے (حضرت نے اس سے اپنے کو مراد لیا) پھر نماز عصر کا وقت ہوا۔ میں نے ان سب کا امام بنا۔ پھر جب نماز سے فارغ ہوا تو کسی کہنے والے نے مجھ سے کہا اے محمد (ﷺ) یہ مالک ہے دوزخ کا داروغہ سو اس کو سلام کرو۔ میں ان کی طرف متوجہ ہوا تو انہوں نے خود سلام میں پیش دستی کی۔'' (اس کو مسلم نے روایت کیا ہے)

"عن جابرانه سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لما كذبنی قريش قمت فی الحجر فجلی الله لی بيت المقدس نطقفت اخبرهم عن اياته و انا انظر اليه" (متفق عليه)

''جابر سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا جب قریش نے مجھ کو جھٹلایا تو میں حجر میں کھڑا ہوا

تھا۔ پس خدا نے بیت المقدس کو میرے سامنے کر دیا۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور بیت المقدس کی علامتیں بتاتا جاتا تھا۔" (متفق علیہ)

"وفی حدیث ابی هریرة ثم سارحتی اتی بیت المقدس فنزل فربط فرسه الی صخرة فصلی مع الملئکة فلما قضیت الصلوة قالوا یا جبرائیل من هذا معک قال هذا محمد رسول الله خاتم النبیین قالوا وقد ارسل الیه قال نعم قالوا حیاه الله من اخ وخلیفة فنعم الاخ ونعم الخلیفة ثم قوا ارواح الانبیاء فاثنوا علی ربهم و ذکر کلام کل واحد منهم وهم ابراهیم و موسیٰ وعیسیٰ و داؤد و سلیمان ثم ذکر کلام النبی صلی الله علیه وسلم اثنی علی ربه فقال کلهم اثنی علی ربه وانا اثنی علیٰ ربی الحمد الله الذی ارسلنی رحمة للعالمین و کافة للناس اجمعین بشیرا و نذیرا و انزل علی القرآن فیه تبیان کل شئی وجعل امتی خیر امة وجعل امتی وسط وجعل امتی هم الا ولون وهم الاخرون وشرح لی صدری ووضع عنی وزدی ورفع لی ذکری جعلنی فاتحا وخاتما فقال ابراهیم بهذا فضلکم یا محمد" (شفاء قاضی عیاض)

"ابوہریرہ کی حدیث میں ہے پھر چلے آنحضرت ﷺ یہاں تک کہ بیت المقدس آئے پھر اتر کر اپنے گھوڑے کو ایک پتھر سے باندھ دیا۔ پھر فرشتوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب نماز ہو لی تو لوگوں نے پوچھا اے جبرائیل تمہارے ساتھ یہ کون ہیں۔ جبرائیل نے محمد رسول اللہ خاتم الانبیاء لوگوں نے کہا کیا ان کے پاس پیغام بھیجا گیا۔ انہوں نے کہا ہاں۔ سب نے کہا خدا ان کو زندہ رکھے بڑے اچھے بھائی اور خلیفہ ہیں۔ پھر انبیاء کی روحوں سے ملاقات ہوئی سب نے اپنے خدا کی تعریف بیان کی اور ہر ایک کا کلام بیان کیا (ابوہریرہ نے) پس کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خدا کی تعریف بیان کی تو کہا کہ تم سب لوگوں نے اپنے خدا کی تعریف کی اور اب میں اپنے خدا کو جس نے مجھ کو تمام عالم کے لئے رحمت کر کے بھیجا اور تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بھیجا اور مجھ پر قرآن اتارا جس میں ہر ایک شے کی توضیح ہے اور میری امت کو اور امتوں سے افضل کیا اور میری امت کو وسط کیا اور میری امت کو قرار دیا کہ وہی پہلے ہیں اور وہی پچھلے ہوں گے۔ اور میرا سینہ کھول دیا اور بوجھ مجھ سے اتار دیا اور میرا چرچا بلند کیا اور مجھ کو فاتح کیا اور خاتم کیا۔ پس ابراہیم نے کہا اسی سے محمد تم سب سے بڑھ گئے۔" (شفاء قاضی عیاض)

"وانکر ذلک (ای الصلوٰة فی البیت) حذیفة بن الیمان وقال والله مازال عن ظهر البراق حتی رجع" (شفاء)

"اور ان کا کیا اس کا (یعنی بیت المقدس میں نماز کا) حذیفہ بن یمان نے اور کہا بخدا رسول براق کی پیٹھ سے الگ نہیں ہوئے واپس آنے تک۔" (شفاء)

نہم۔ واقعات بروقت خروج از بیت القدس

"ثم خرجت فجاء فی جبرائیل باناء من خمر واناء من لبن فاخترت اللبن فقال جبرائیل اخترت

الفطرة" (ثابت)
''پھر میں نکلا پس جبرائیل میرے پاس شراب کا ایک ظرف اور دودھ کا ایک ظرف لائے پس میں نے دودھ کو اختیار کیا۔ جبرائیل نے کہا تم نے فطرت کو اختیار کیا۔'' (ثابت)

دہم۔ واقعات فلک اول

"فانطلق جبرائیل حتی اتی السماء لدنیا فاستفتح قیل من هذا قال جبرنیل قیل ومن معک قال محمد قیل وقد ارسل الیه قال نعم قیل مرجا فنعم المجی جاء ففتح فلما خلصت فاذا فیها ادم فقال هذا ابوک ادم فلم علیه فسلمت علیه فرد السلام ثم فال مرحبا بالابرار الصالح والنبی الصالح" (قتاده)
''پس چلے جبرائیل یہاں تک کہ آسمان دنیا تک پہنچے اور کھلوایا۔ لوگوں نے کہا یہ کون ہیں۔ کہا جبرائیل' پھر لوگوں نے کہا اور تمہارے ساتھ کون ہے۔ کہا محمدؐ لوگوں نے کہا کیا وہ بلائے گئے ہیں۔ کہا ہاں۔ لوگوں نے کہا مرحبا خوب آئے پھر کھل گیا (آسمان) پھر میں جب پہنچا تو آدم نظر پڑے۔ جبرائیل نے کہا' تمہارے باپ آدم ہیں' ان کو سلام کرو۔ میں نے سلام کیا' انہوں نے سلام کا جوب دیا پھر کہا اچھے بیٹے کو مرحبا' اچھے نبی کو مرحبا۔'' (قتادہ)
"ثم عرج بنا الی السماء (وساق مثل معناه) قال اذانا بادم فرحب بی ودعالی بخیر" (ثابت)
''پھر مجھ کو آسمان پر لے کر چڑھے (اور اسی طرح بیان کیا) فرمایا یکا یک آدم نظر پڑے پس مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی'' (ثابت)

فلما جنت الی السماء الدنیا (وساق مثل معناه) اذا رجل قاعد علی یمینه اسورة وعلی یساره اسورة اذا نظر قبل یمینه ضحک واذا انظر قبل شماله یبکی فقال مرحبا بالنبی الصالح والا بن الصالح قلت لجبرنیل من هذا قال هذا ادم وهذا الا سورة عن یمینه وعن شماله نسم بنیه فاهل الیمین منهم اهل الجنة والا سورة التی عن شماله اهل النار فاذا نظر عن یمینه ضحک واذا نظر قبل شماله بکی" (ابن شهاب)
''پس جب میں آسمان دنیا تک پہنچا (اور اس کے مثل بیان کیا) یکا یک ایک شخص نظر پڑے جن کے دائیں بائیں سیاہ شکلیں ہیں۔ جب دہنی جانب دیکھتے ہیں تو ہنس پڑتے ہیں اور بائیں جانب نگاہ کرتے ہیں تو رو دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا اچھے نبی کو مرحبا اچھے بیٹے کو مرحبا۔ میں نے جبرائیل سے کہا یہ کون ہیں کہا یہ آدم ہیں۔ اور ان کے دائیں اور بائیں جانب کی سیاہ صورتیں ان کی اولاد کی روحیں ہیں۔ سو دہنی جانب والے اہل جنت ہیں اور بائیں طرف والے اہل دوزخ ہیں پس جب وہ دہنی طرف دیکھتے ہیں تو ہنس پڑتے ہیں اور بائیں جانب دیکھتے ہیں تو رو دیتے ہیں۔''
"عن انس قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم بینا انا قاعد ذات یوم اذ دخل جبرنیل علیه السلام فرکز بین کتفی فقست الی شجرة فیها مثل وکری الطائر فقعد فی واحدة وقعدت فی

الاخری فنمت حتی سلمت الخافقین ولوشئت لمست السماء وانا اقب ونظرت جبرائیل کانه حلس لا طنی فعرفت فضل علمه بالله علی فتح باب السماء ورایت النور الاعظم واذا دونی الحجاب و فرجة الدراء الیاقوت ثم اوحیٰ لله الیٰ ماشاء ان یوحی" (شفاء قاضی عیاض)

"انس سے روایت ہے کہ فرمایا آنحضرت ﷺ نے میں بیٹھا ہوا تھا ایک دن یکا یک جبرائیل آئے اور میرے دونوں شانوں کے درمیان ذرا دبایا پس میں ایک درخت کی طرف گیا جس میں پرند کے گھونسلے بنے ہوئے تھے۔ پس ایک میں جبرائیل بیٹھے اور ایک میں میں، پھر میں سو گیا یہاں تک کہ خافقین سے آگے بڑھ گئے۔ اور اگر میں چاہتا تو آسمان کو چھو لیتا۔ اور میں پلٹے کھتا تھا مگر جبرئیل کو دیکھا تو وہ گویا عرق گیر تھے (یعنی اپنی جگہ جمے رہے) پس میں نے ان کا افضل ہونا علم الٰہی میں اپنے سے جان لیا اور میرے لئے آسمان کے دروازے کھولے گئے اور میں نے نور اعظم دیکھا۔ اور یکا یک میرے سامنے حجاب تھا اور موتی و یاقوت کے دریچے۔ پھر خدا نے میری طرف وحی کی جو وحی چاہی۔"

"وذکر البزار عن علی ابن ابی طالبؓ لما اراد الله تعالیٰ ان یعلم رسوله الا ذان جاء ه جبرئیل بدابة یقال لها البراق فذهب یرکبها فاستصعب علیه فقال لها جبرئیل علیه السلام اسکنی ذوالله مارکبک غیر اکرم علی الله من محمد صلی الله علیه وسلم فرکبتها حتی اتی بها الی حجاب الذی یلی الرحمن تعالیٰ فبینا هو کذالک اذ خرج ملک من الحجاب فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم یا جبرائیل من هذا قال والذی بعثک بالحق نبیا انی لا قرب الخلق مکانا وان هذا الملک ما رائیته منذ خلقت قبل ساعتی هذه فقال الملک الله اکبر الله اکبر فقیل له من وراء الحجاب صدق عبدی انا اکبرانا اکبر ثم قال الملک اشهدان لا اله الا الله فقیل من وراء الحجاب صدق عبدی انا الله لا اله الا انا وذکر مثل هذافی بقیة الاذان الا انه لم یذکر جوابا من قوله حی علی الصلوة حی علی الفلاح و قال ثم اخذ الملک ید محمد صلی الله علیه وسلم فقدمه فام اهل السماء فیهم ادم و نوح قال ابو جعفر محمد بن علی الحسین راویه اکمل الله محمد صلی الله علیه وسلم اشرف علی السموات والارض" (شفاء)

"حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب خدا نے چاہا کہ اپنے رسول کو اذان سکھائے تو جبرائیل ان کے پاس ایک چار پایہ لائے جس کو براق کہتے ہیں۔ پس آپ اس پر چڑھنے گئے۔ سو اس کو دشوار لگا۔ جبرائیل نے اس سے کہا ٹھہر بخدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی اچھا شخص خدا کے نزدیک تجھ پر نہیں سوار ہوا ہے۔ پس میں اس پر سوار ہوا۔ یہاں تک کہ اس پردہ کے اس آیا جو خدا کے قریب ہے۔ اسی درمیان میں پردہ سے ایک فرشتہ نکلا۔ پس آنحضرت نے کہا اے جبرائیل یہ کون ہے۔ جبرئیل نے کہا اس کی قسم جس نے تجھے نبی برحق مبعوث کیا میں خلق اللہ میں سب سے زیادہ مقرب بارگاہ ہوں مگر اس فرشتہ کو اس وقت سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا جب سے میں پیدا ہوا۔ پس فرشتہ نے کہا اللہ اکبر اللہ اکبر۔ پس پردہ کی اوٹ سے آواز آئی سچ کہا میرے بندہ نے۔ میں بڑا ہوں۔ میں بڑا ہوں۔ پھر فرشتہ نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر اللہ پردہ سے آواز آئی کہ سچ کہا میرے بندہ نے میں خدا ہوں اور میرے سوا کوئی خدا نہیں

ہے اوراسی طرح ذکر کیا اذان کے بقیہ میں' مگر حی علی الصلوٰۃ حی علی الفلاح کا جواب نہیں ذکر کیا۔اور کہا پھر فرشتہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھایا پس آنحضرت ﷺ کو اہل زمین اور آسمان دونوں پر بزرگی بخشی۔"

یازدہم۔واقعات فلک دوم

"ثم صعد بی حتی اتی السماء الثانیه (وساق مثل معناه) اذا یحییٰ و عیسیٰ وهما ابنا خالة (وساق مثله) قالا مرحبا بالاخ الصالح والنبی الصالح" (قتاده)

"پھر مجھ کو لے کر چڑھے یہاں تک کہ دوسرے آسمان پر آئے (اوراسی کے ہم معنی مضمون بیان کیا) ناگاہ وہاں یحییٰ و عیسیٰ تھے اور دونوں بھائی ہیں (اوراسی طرح بیان کیا) ان دونوں نے کہا نیک بھائی اور نیک نبی کو مرحبا"

"ثم عرج بنا الی السماء الثانیه (وساق مثله) فاذا انا بابنی الخالة عیسیٰ بن مریم ویحییٰ بن ذکریا علیهما السلام فرحبالی و دعوالی بخیر" (ثابت)

"پھر مجھ کو دوسرے آسمان پر لے کر چڑھے (اوراسی طرح بیان کیا) پس ناگاہ میں دو بھائیوں عیسیٰ بن مریم و یحییٰ بن ذکریا کے پاس تھا۔انہوں نے مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی۔"

"حتی عرج بی الی السماء الثانية (وساق مثلة) قال الانس فذ کرانه وجد فی السموات ادم و ادریس و موسیٰ و عیسیٰ و ابراهیم ولم یثبت کیف منازلهم غیر انه ذکر انه وجد ادم فی السماء الدنیا وابراهیم فی السماء السادسة" (ابن شهاب)

"یہاں تک کہ مجھ کو دوسرے آسمان تک چڑھائے گئے (اوراسی طرح بیان کیا) انس نے کہا کہ پس ذکر کیا۔آنحضرت ﷺ نے پایا آسمانوں میں آدم وادریس وموسیٰ وعیسیٰ وابراہیم کو اوران کے مقامات نہیں متعین کئے۔ہاں اس قدر ذکر کیا کہ آدم کو آسمان دنیا میں پایا اورابراہیم کو چھٹے آسمان میں۔"

"وفی روایة رای یوسف فی الثانیة ویحییٰ و عیسیٰ فی الثالثة" (لمعات)

"ایک روایت میں ہے کہ یوسف کو دوسرے آسمان میں دیکھا اور یحییٰ وعیسیٰ کو تیسرے آسمان میں۔"

دوازدہم۔واقعات فلک سوم

"ثم صعد بی الی السماء الثالثة (وساق مثله) اذا یوسف (وساق مثله) قال مرحبا بالاخ الصالح والنبی الصالح " (قتاده)

"پھر مجھ کو لے کر تیسرے آسمان پر چڑھے (اوراسی طرح ذکر کیا) ناگاہ یوسف (اوراسی طرح ذکر کیا) انہوں نے کہا نیک بھائی ونیک نبی کو مرحبا۔"

"ثم عرج بنا الی السماء الثالثة (وساق مثله) فاذا هو یوسف علیه السلام واذا هو قد عطی شطر الحسن ورحب لی ودعالی بخیر" (ثابت)

''پھر مجھ کو لے کر تیسرے آسمان پر چڑھا اور اسی طرح ذکر کیا' پس ناگاہ وہ یوسف علیہ السلام تھے اور ان کو حسن کا ایک حصہ ملا ہے۔ مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی۔''

"وفی روایة رای ادریس فی الثالثة" (لمعات)

''اور ایک روایت میں ہے' ادریس کو تیسرے آسمان میں دیکھا''

وفی روایة رای یحیی و عیسی فی الثالثة. (لمعات)

اور ایک روایت میں ہے یحیٰ وعیسیٰ کو تیسرے آسمان میں دیکھا۔

سیزدہم۔ واقعات فلک چہارم

ثم صعد بی حتی اتی السماء الرابعة (دساق مثلة) فاذ ادریس (وساق مثله- (قتاده)

پھر مجھ کو لے کر چڑھے یہاں تک کہ چوتھے آسمان پر آئے (اور اسی طرح بیان کیا) ناگاہ ادریس نظر پڑے (اور اسی طرح بیان کیا)۔

ثم عرج بنا الی السماء الرابعة و ذکر مثله فاذا انا بادریس فرحب لی و دعالی بخیر قال الله و رفعناه مکانا علیا (ثابت)

پھر چوتھے آسمان پر لے کر چڑھے (اور اسی طرح ذکر کیا) ناگاہ وہاں ادریسؑ نظر پڑے سو مجھ کو مرحبا کہا اور دعائے خیر دی خدا نے کہا ہے ہم نے ان کا درجہ اونچا کیا۔

و فی راویة رای ادریس فی الثالثة و هارون فی الرابعة. (لمعات)

ایک روایت میں ہے ادریس کو تیسرے آسمان میں دیکھا اور ہارون کو چوتھے میں۔

چہاردہم۔ واقعات فلک پنجم

ثم صعدبی حتی اتی السماء الخامسة (فذکر مثله) فاذا هارون (فذکر مثله) (قتاده)

''پھر مجھ کو لے کر چڑھے یہاں تک کہ پانچویں آسمان پر آئے (پس اسی طرح ذکر کیا) یکایک وہاں ہارون تھے' (پاس اسی طرح ذکر کیا)''

"ثم عرج السماء الخامسة (فذکره) فاذابهارون فرحب لی دعا لی بخیر" (ثابت)

''پھر پانچویں آسمان کی طرف چڑھے (پس اسی طرح ذکر کیا) یکایک وہاں ہارون تھے انہوں نے مجھ کو مرحبا کیا اور دعائے خیر دی۔''

"وفی راویة اخری رای ادریس فی الخامسة" (لمعات)

''دوسری روایت میں ہے کہ ادریس کو پانچویں آسمان میں دیکھا۔''

پانزدہم۔ واقعات فلک ششم

"ثم صعد بی حتی الی السماء السادسة (فذکر مثله) فاذا موسیٰ (فذکرمثله)" (قتادہ)
"پھر مجھ کو چھٹے آسمان تک لے کر چڑھے (پس اسی طرح بیان کیا) وہاں موسیٰ تھے' (پس اسی طرح بیان کیا)"
"ثم عرج بنا الی السماء السادسة (فذکر مثله) فاذا انا بموسیٰ فرحب لی ودعالی" (ثابت)
"پھر مجھ کو چھٹے آسمان کی طرف لے کر چڑھے (پس اسی طرح بیان کیا) وہاں موسیٰ تھے سو مجھ کو مرحبا کہا اور دعا دی۔"
"فلما جاوزت بکی قیل له ما یبکیک قال ابکی لان غلاما بعث بعدی یدخل من امته الجنة اکثر ممن یدخلها من امتی" (قتادہ)
"پس جب میں آگے بڑھ گیا تو وہ روئے۔ ان سے پوچھا گیا کیوں روئے۔ کہا میں اس لئے روتا ہوں کہ ایک نوعمر میرے بعد مبعوث ہوا ہے اور اس کی اُمت کے لوگ میری اُمت سے زیادہ جنت میں جائیں گے۔"
"انه وجد.... ابراهیم فی السماء السادسة" (ابن شهاب)
"انہوں نے پایا۔۔۔۔ابراہیم کو چھٹے آسمان میں۔"
"وفی حدیث شریک انه رای موسیٰ فی السابعة" (شفاء قاضی عیاض)
"اور شریک کی حدیث میں ہے کہ موسیٰ کو ساتویں آسمان میں دیکھا۔"

شانزدہم۔ واقعات فلک ہفتم

"ثم صعد بی الی السماء السابعة (فذکر مثله) فاذا ابراهیم قال هذا ابوک ابراهیم (فذکر مثله) قال مرحبا بالا بن الصالح والنبی الصالح" (قتادہ)
"پھر مجھ کو ساتویں آسمان پر لے کر چڑھے (پس اسی طرح بیان کیا) ناگاہ وہاں ابراہیم تھے۔ جبرائیل نے کہا کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم ہیں ((پس اسی طرح بیان کیا) انہوں نے کہا کہ اچھے بیٹے اور اچھے نبی کو مرحبا۔" (قتادہ)
"ثم صعد بی الی السماء السابعة (فذکر مثله) فاذ بابراهیم مسند الظهره الی البیت المعمور و اذا هو ایدخله کل یوم سبعون الف ملک لایعودون الیه" (ثابت)
"پھر مجھ کو ساتویں آسمان پر لے کر چڑھے (پس اسی طرح بیان کیا) وہاں ابراہیم تھے۔ بیت معمور کی طرف اپنی پیٹھ ٹیکے تھے اور وہاں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں اور دوبارہ کر نہیں آتے۔"
"وفی حدیث شریک انه رای موسیٰ فی السابعة (شفاء قاضی عیاض)
"شریک کی حدیث میں ہے کہ موسیٰ کو ساتویں آسمان میں دیکھا۔"

ہفت وہم۔ واقعات سدرۃ المنتہیٰ

"ثم رفعت بی ابی سدرة المنتهیٰ فاذا بنقها مثل قال هجر واذا فرقها مثل اذان الفیلة وقال هذا سدرة المنتهیٰ" (قتاده)

پھر میں سدرۃ المنتہیٰ پہنچا سواس کے پھل ہجر (ایک گاؤں کا نام ہے) کی پکھال کے برابر تھے اور اس کے پتے ہاتھی کے کان کے سے تھے۔ جبرئیل نے کہا کہ یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔

"ثم ذهب بی الی سدرة المنتهی واذا اور قها کاذان الفیلة واذا ثمرها کا لقلال" (ثابت)

"پھر مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک لے گئے۔ سواس کے پتے ہاتھی کے کان کے سے تھے اور پھل پکھال کے برابر۔"

"واذا اربعة انهار نهران باطنان ونهران ظاهران قلت ماهذان یا جبریل قال اما الباطنان فنهران فی الجنة واما الظاهران فالنیل والفرات (قتاده)

"وہاں چار نہریں تھیں دو باطن میں دو ظاہر میں۔ میں نے کہا اے جبرئیل یہ دونوں کیا ہیں۔ کہا دونوں باطن کی تو جنت کی دو نہریں ہیں اور جو ظاہر ہیں وہ نیل وفرات ہیں۔

وفی روایة ابی هریرة من طریق الربیع بن انس فقیل لی هذه السدرة المنتهی ینتهی الیها کل واحد من امتک خلی احد علی سبیلک وهی السدرة المنتهی یخرج من اصلها انهار من ما ء غیر من اصلها انهار من ما ء غیر اسن وانهار من لبن لم یتغیر طعمه وانهار من خمر لذة للشاربین وانهار من عسل مصفی وهی شجرة بسیر الراکب فی ظلها سبعین عاما وان ورقه منها مظلة الخلق فغشیها نور وغشیها الملائکة قال فهو قوله تعالیٰ اذ یغشی السدرة ما یغشی فقال الله تبارک وتعالی له سل فقال صلی الله علیه وسلم یا رب انک اتخذت ابراهیم خلیلا واعطیته ملکا عظیما وکلمت موسیٰ تکلیما واعطیت داؤد ملکا عظیما والنت له الحدید وسخرت له واعطیت سلیمان ملکا عظیما وسخرت له الجن والانس والریاح والشیاطین واعطیته ملک لا ینبغی لاحد من بعده وعلمت موسیٰ التوراة وعیسیٰ الانجیل وجعتله یبری الاکمه و الابرص عذته من الشیطان الرجیم فلم یکن علیهما سبیل فقال له ربه تعالیٰ اتخذتک حبیباً فهو مکتوب فی التوراة محمد حبیب الرحمن و ارسلنک الی الناس کافه وجعلت امتک لا تجوز لهم خطیئة حتی یشهد وانک عبدی ورسولی وجعلتک اول النبیین خلقا واخوهم بعثا واعطیتک سبعا من لمثانی ولم اعطیها بنیا قبلک و جعلتک فاتحا وخاتماً (شفاء قاضی عیاض)

"اور ابوہریرہ کی ایک روایت میں ہے پس مجھ سے کہا گیا یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ تیری امت میں سے ہر ایک کی پہنچ یہیں تک ہے سوائے ایک کے جو تیرے رستہ پر ہے اور یہی سدرۃ المنتہیٰ ہے جس کی جڑ سے پانی کی نہریں نکلی ہیں جو بگڑتا نہیں اور دودھ کی نہریں جس کا مزہ بدلا نہیں اور شراب کی نہریں جو پینے والوں کے لئے لذت بخش ہیں اور صاف شہد کی نہریں

اور وہ ایک درخت ہے کہ سوار اس کے سایہ میں ستر برس چلا جاتا ہے اور اس کا ایک پتا تمام خلق پر سایہ کرتا ہے پس او پر نور چھارہا ہے اور فرشتے چھارہے ہیں خدا کے اس قول سے **اذ یغشی السدرۃ ما یغشی** (یعنی جب سدرۃ المنتہیٰ کو چھا لیا اس چیز نے جس نے چھالیا) یہی مراد ہے پس کہا خدائے برتر و پاک نے محمد ﷺ سے مانگ پس کہا آپ ﷺ نے اے پروردگار تو نے ابراہیم کو خلیل بنایا اور اس کو ایک بڑا ملک عنایت کیا۔ اور موسیٰ سے کلام کیا اور داؤد کو ایک بڑی سلطنت عطا کی اور ان کے لئے لوہے کو نرم کر دیا اور مسخر کر دیا اور سلیمان کو ایک بڑا ملک عطا کیا اور جن اور آدمی اور ہوائیں اور شیاطین مسخر کر دیئے اور ایسا ملک دیا کہ ان کے بعد پھر کسی کو نہیں مل سکتا اور موسیٰ کو تورات سکھائی اور عیسیٰ کو انجیل اور ان کو ایسا کر دیا کہ وہ کوڑھی اور مبروص کو اچھا کر دیتے تھے اور ان کو مردود شیطان سے محفوظ رکھا سو شیطان ان دونوں پر قابو نہیں پاسکتا پس کہا خدا نے محمد ﷺ سے میں نے تجھ کو حبیب بنایا۔ سو تورات میں لکھا ہے کہ محمد حبیب الرحمٰن ہیں اور میں نے تجھ کو تمام خلق اللہ پر بھیجا اور میں نے تیری امت کو ایسا کیا کہ وہ اگلے بھی ہیں اور پچھلے بھی اور تیری امت کی خطا محسوب نہیں ہوتی جب تک وہ یہ گواہی دیتے رہیں کہ تو میرا بندہ اور پیغمبر ہے۔ اور میں نے تجھ کو سب نبیوں سے پہلے پیدا کیا اور سب کے آخر میں بھیجا اور میں نے تجھ کو دوہرے لفظوں سات آیتوں والی دی اور تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی۔ اور میں نے تجھ کو فاتح اور خاتم کیا۔"

"قال فلما غشیھا من امر اللہ ماغشی تغیرت فما احد من خلق اللہ یستطیع ان ینعتھا من حسنھا"

"فرمایا کہ جب چھا گیا اس پر خدا کے حکم سے جو چھا گیا تو وہ متغیر ہو گیا اور خلق اللہ میں سے کوئی شخص اس کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کرسکتا۔" (ثابت)

"وقال ابن شھاب حتی اتیت سدرۃ المنتھیٰ فغشیھا الوان لادری ماھی وقال ثم ادخلت الجنۃ فاذا فیھا جنابذ الولو واذا ترابھا المسک" (کما سیجیی)

"اور ابن شہاب نے کہا یہاں تک کہ میں سدرۃ المنتہیٰ پہنچا سو اس کو ایسے رنگوں نے ڈھک لیا کہ میں جانتا تھا وہ کیا ہیں اور کہا پھر داخل کیا گیا میں بہشت میں سو وہاں موتی کے گنبد تھے اور اس کی مٹی مشک ہے (جیسا کہ آگے آتا ہے)

"وعن عبد اللہ قال لما سری برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتھی بہ الی سدرۃ المنتھیٰ وھی فی الماء السادسۃ الیھا ینتھیٰ مایھبط بہ من فوقھا فیقبض منھا قال اذ یغشی السدرۃ ما یغشی قال فراش من ذھب"

"اور عبداللہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو معراج ہوئی۔ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچائے گئے۔ اور وہ چھٹے آسمان پر ہے۔ اسی تک ختم ہوتا ہے جو اس پر او پر سے اترتا ہے۔ سو وہ اس کو پکڑ لیتا ہے کہا **اذ یغشی السدرۃ ما یغشی** سے مراد سونے کا بچھونا ہے۔" (عبداللہ ابن مسعود)

وفی حدیث شریک انہ رای موسیٰ فی السابعۃ بتفصیل کلام اللہ تعالی لہ قال ثم علی بہ فرق ذلک بما لا یعلمہ الا اللہ تعالیٰ فقال موسیٰ لم اظن ان یرفع علی احد" (شفاء قاضی عیاض)

"اور شریک کی حدیث میں ہے کہ موسیٰ کو ساتویں آسمان میں دیکھا۔ خدا کی باتوں کی تفصیل ان سے بیان کی۔ کہا کہ پھر

اتنے اوپر گئے کہ سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا پس کہا موسیٰ نے مجھ کو گمان نہیں تھا کہ مجھ سے اوپر بھی کوئی جائے گا۔"

"ثم رفع لی البیت المعمور" (قتادہ)

"پھر میرے سامنے بیت المعمور لایا گیا۔"

"ثم اتیت بانا من خمر وانا ء من لبن واناء من عسل فاخذت اللبن فقال ھی الفطرۃ انت علیھا وامتک" (قتادہ)

"پھر میرے سامنے شراب اور دودھ اور شہد کے ظروف لائے گئے پس میں نے دودھ کو لے لیا۔ پس کہا کہ یہی فطرت ہے تو اور تیری امت اس پر ہے۔"

"قال ابن شھاب فاخبرنی ابن حزم عن ابن عباس واباحیۃ الا نصاری کانا یقولان قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم عرج بی حتی ظھرت المستویٰ سمع فیہ صریف الا قلام" (ابن شھاب)

"ابن شہاب نے کہا کہ مجھ کو ابن حزم نے خبر دی کہ ابن عباس اور ابو حیہ انصاری دونوں کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر مجھ کو اوپر لے گئے یہاں تک کہ میں ایسی جگہ پر پہنچا جہاں قلم کے لکھنے میں چلنے کی آواز مجھ کو سنائی دیتی تھی۔"

ہشت وہم۔ احکام جو عنایت ہوئے

"فاوحی اللہ الی ما اوحی" (ثابت)

"پس وحی کی خدا نے میری طرف جو کی"

"ثم فرضت علی الصلوۃ خمسین صلوۃ کل یوم" (قتادہ)

"پھر مجھ پر ہر روز پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔"

"ففرض علی خمیسن صلوۃ فی کل یوم ولیلۃ" (ثابت)

"پھر مجھ پر ہر دن رات میں پچاس نمازیں فرض کیں۔"

"قال ابن حزم و انس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ففرض اللہ علی امتی خمسین صلوۃ" (ابن شھاب)

"ابن حزم وانس نے کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پس فرض کیں خدا نے میری امت پر پچاس نمازیں۔"

"فرجعت فمررت علی موسی فقال بما امرت قلت امرت بخمیسن صلوۃ کل یوم قال ان امتک لا تستطیع خمسین صلوۃ کل یوم وانی واللہ قد جربت الناس قبل وعالجت بنی اسرائیل اشد المعابحۃ فارجع الی ربک فسئلہ التخفیف لا متک فرجعت فوضع عنی عشرا فرجعت الی موسٰی فقال مثلہ فرجعت فوضع عشرا فرجعت الی موسٰی فقال مثلہ فرجعت فوضع عنی عشر افامرت بعشر صلوۃ کل یوم فرجعت الی موسٰی فقال مثلہ فرجعت فامرت بخمس صلوۃ کل

یوم'' (قتادہ)

''پھر میں لوٹا اور موسیٰ پر گزرا انہوں نے کہا تم پر کیا فرض ہوا۔ میں نے کہا ہر روز پچاس نمازیں۔ موسیٰ نے کہا' تمہاری امت ہر روز پچاس نمازیں نہیں ادا کر سکے گی' اور میں بخدا تم سے پہلے لوگوں کا تجربہ کر چکا ہوں۔ اور بنو اسرائیل کو خوب اچھی طرح آزما چکا ہوں۔ تم خدا کی طرف واپس جاؤ اور کم کراؤ اپنی امت کے لئے۔ پس میں واپس گیا سو خدا نے دس نمازیں گھٹا دیں پھر میں واپس آیا موسیٰ کی طرف موسیٰ نے پھر وہی کہا میں پھر لوٹا' خدا نے دس اور بھی کم کر دیں۔ پھر میں موسیٰ کے پاس آیا۔ موسیٰ نے پھر وہی کہا۔ میں پھر لوٹا' خدا نے دس اور بھی کم کر دیں۔ پس مجھ کو ہر روز دس نمازوں کا حکم ہوا۔ پس پھر میں موسیٰ کے پاس آیا' موسیٰ نے پھر وہی کہا۔ میں پھر لوٹا پس مجھ کو ہر روز پانچ نمازوں کا حکم ہوا۔''

فنزلت موسیٰ فقال ما فرض ربک علی امتک فقلت خمسین صلوۃ فی کل یوم ولیلۃ قال ارجع الی ربک فاسئلہ التخفیف فان امتک لاتطیق ذلک فانی قد بلوت بنی اسرائیل و خبرتھم قال فرجعت الی ربی فقلت یا رب خفف عن امتی فحط علی خمسًا فرجعت الیٰ موسیٰ فقلت حط عنی خمسًا قالا ان امتک لا یطیق ذلک فارجع الی ربک فاسئلہ التخفیف قال فلم ازل ارجع بین یدی ربی تعالیٰ وبین موسیٰ حتیٰ قال یا محمد انھن خمس صلوۃ کل یوم ولیلۃ'' (ثابت)

''پس میں اترا موسیٰ کی طرف۔ انہوں نے کہا خدا نے تیری امت پر کیا فرض کیا۔ میں نے کہا ہر رات دن میں پچاس نمازیں۔ موسیٰ نے کہا' پھر خدا کے پاس جاؤ اور کہو کہ کم کر دے کیونکہ تمہاری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ میں نے بنی اسرائیل کو آزما لیا ہے اور دیکھ لیا ہے فرمایا آنحضرت نے پس میں واپس گیا خدا کی طرف اور کہا کہ اے خدا میری امت پر تخفیف کر۔ پس پانچ نمازیں گھٹا دیں پھر میں موسیٰ کے پاس آیا اور کہا کہ پانچ کم ہوئیں۔ موسیٰ نے کہا تمہاری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی۔ تم پھر خدا کے پاس جاؤ اور کمی کی درخواست کرو۔ فرمایا کہ میں برابر خدا اور موسیٰ کے درمیان آیا اور گیا یہاں تک کہ خدا نے کہا اے محمد وہ پانچ نمازیں ہیں ہر دن رات میں۔''

"فرجعت بذلک حتی مررت علی موسی فقال ما فرض اللہ لک علیٰ امتک قلت فرض خمسین صلوۃ قال فارجع الی ربک فان امتک لا تطیق فراجعنی فوضع شطرھا فرجعت الی موسیٰ فقلت وضع شطرھا فقال لھم الی ربک فان امتک لا تطیق ذلک فراجعتہ فقال ھی خمس وھی خمسون لا یبدل القول لدی فرجعت الی موسیٰ فقال راجع ربک فقلت استحییت من ربی'' (ابن شھاب)

''میں اس کے ساتھ لوٹا یہاں تک کہ موسیٰ پر گزرا موسیٰ نے کہا خدا نے تمہاری امت پر کیا فرض کیا۔ میں نے کہا پچاس نمازیں۔ موسیٰ نے کہا تم لوٹ جاؤ اپنے خدا کی طرف۔ کیونکہ تمہاری امت سے یہ نہ ہو سکے گا۔ میں واپس گیا تو ایک حصہ معاف ہوا موسیٰ نے کہا پھر خدا سے گفتگو کرو۔ تمہاری امت سے اتنا نہ ہو سکے گا۔ میں واپس گیا اور دوبارہ سوال کیا۔ ایک حصہ اور معاف ہو۔ میں پھر موسیٰ کی طرف آیا انہوں نے کہا پھر جاؤ تمہاری امت سے اتنا نہ ہو سکے گا میں نے دوبارہ سوال کیا خدا نے کہا کہ یہ پانچ ہیں اور وہ (دراصل) پچاس ہیں میری بات دوسری نہیں ہوتی پھر موسیٰ کے پاس آیا

انہوں نے کہا تم پھر خدا کے پاس جاؤ میں نے کہا اب تو میں خدا سے شرما گیا"

"لکل عشرة فتلک خمسون صلوة" (ثابت)

"ہر نماز کے لیے دس ہیں۔ پس وہ پچاس نمازیں ہوئیں۔"

"قال فاعطی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلثا اعطی الصلوة الخمس واعطی خواتیم سورة البقرة وغفر لمن لا یشرک باللہ من امته شیئًا المقحمات"

"کہا پس حضرت کو تین چیزیں عطا ہوئیں پانچ نمازیں اور سورۂ بقرہ کے خاتمہ کی آیتیں۔ اور بخش دیا گیا اس کو حضرت کی امت میں سے جو خدا کا کسی کو ساجھی نہیں کرتا۔" (عبداللہ بن مسعود)

"ومن هم بحسنة فلم یعملها کتب له حسنة فان عملها کتبت له عشرا ومن هم بسیئة فلم یعملها لم تکتب علیه شیئًا فان عملها کتبت له سیئة واحدة"

"اور جس شخص نے نیکی کا قصد کی اور کی نہیں اس کے لئے ایک نیکی لکھی جائے گی اور اگر کرے تو دس لکھی جائے گی اور جو شخص کسی برائی کا قصد کرے اور کرے نہیں تو کچھ نہ لکھا جائے گا اور اگر کر لے تو ایک برائی لکھی جائے گی۔" **(ثابت)**

"فرجعت الی موسی فقال بما امرت بخمس صلوٰة کل یوم قال ان امتد لا تستطیع خمس صلوة کل یوم وانی قد جبت الناس قبلک وعالجب بنی اسرائیل اشد المعالجة فارجع الی ربک فسئله التخفیف لا متک قال سالت ربی حتی استحییت ولکنی ارضی واسلم"

"پس میں موسیٰ کی طرف واپس آیا۔ انہوں نے کہا تم کو کیا حکم ہوا' میں نے کہا ہر روز پانچ نمازوں کا۔ موسیٰ نے کہا تمہاری امت ہر روز پانچ نمازیں نہ پڑھ سکے گی اور میں تم سے پہلے لوگوں کو آزما چکا ہوں اور بنی اسرائیل کو خوب اچھی طرح آزما لیا ہے۔ تم خدا کی طرف لوٹ جاؤ اور اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کرو۔ فرمایا میں خدا سے سوال کرتے کرتے شرما گیا اب میں اسی پر راضی ہو جاؤں گا اور تسلیم کرلوں گا۔" (قتادہ)

"قال فنزلت حتی انتهیت الی موسیٰ فاخبرته فقال ارجع الی ربک فاسئله التخفیف فقال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فقلت قد رجعت الی ربی حتی استحییت منه"

"کہا' پس میں اتر آیا یہاں تک کہ موسیٰ کے پاس پہنچا اور ان کو خبر دی۔ موسیٰ نے کہا اپنے خدا کی طرف واپس جاؤ اور تخفیف کی درخواست کرو۔ پس فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے' میں نے کہا کہ میں خدا کی طرف پھر پھر کے گیا یہاں تک کہ اب میں اس سے شرما گیا۔" (ثابت)

"قال فلما جاء وزت مناد امضیت فریضتی و خففت عن عبادی" (قتادہ)

"کہا پس جب آگے بڑھا ایک پکارنے والے نے آواز دی' میں نے اپنا فرض نافذ کیا اور اپنے بندوں سے تخفیف کی۔"

"ثم انطلق بی حتی انتهٰی بی الی سدرة المنتهٰی وغشیها الوان لا ادری ماهی ثم ادخلت الجنة فاذا فیه جنا بذ اللؤلؤ اذا اترابها المسک"

"پھر مجھ کو لے کے چلے (جبرائیل) یہاں تک کہ سدرۃ المنتہیٰ پہنچے اور اس کو رنگوں نے ڈھک لیا کہ میں ان کو نہیں جانتا

تھا۔ پھر میں جنت میں داخل کیا گیا۔ ناگاہ وہاں موتی کے گنبد تھے اور اس کی مٹی مشک تھی۔" (ابن شہاب)

یہ سب روایتیں ایک دوسری سے اس قدر مختلف ومتناقض ہیں کہ ان کے قواعد کے پیش کرنے کی جن سے ان کا باطل اور موضوع ہونا ثابت ہوسکتا ہے غیرضروری ہے۔ کیونکہ یہ خود روایتیں صراحۃً ایک دوسری کی تردید کرتی ہیں اور اپنی صحت اور اعتبار کو خود کھودیتی ہیں۔

مصنف لمعات کا بیان ہے کہ یہ روایتیں ایک دوسری سے اس قدر اختلاف رکھتی ہیں کہ ان کا تطبیق کرنا بالکل غیرممکن ہے تاوقت یہ کہ تعدد معراج کو تسلیم نہ کرلیا جائے یا ایک کو دوسری پر ترجیح نہ دی جائے یعنی ان میں سے کسی کو مانا جائے اور باقیوں کو غلط اور بے اصل قرار دیا جائے۔

"وعلی تقدیر صحة الروایات یتعذر الجمع الا ان یقال یتعدد المعراج یرجح بعض الروایات علی بعض" (لمعات)

وہ عیسائی مصنف جنہوں نے پیغمبر خدا کی سوانح عمری لکھی ہے ایک درجہ اور بھی بڑھ گئے ہیں اور ان تعریفوں اور منظوم نعتوں کو جو مسلمان شاعروں نے اپنی شاعرانہ طرز سے مختلف امور متعلق بہ معراج مثلاً آنحضرت ﷺ کی زینت اور شان، براق کی شکل، فرشتوں کے جلوس وغیرہ پر لکھی ہیں روایات مستند شمار کرلیا ہے مگر انہوں نے اسلام کے حق میں یہ بہت بڑی عمدہ بات کی ہے اور اسلام کو ہمیشہ ان کی محنتوں اور جان فشانیوں کا مشکور ہونا چاہیے۔ کیونکہ جب کوئی منصف مزاج اور ذی فہم شخص ایسی تصنیفات کے مجموعہ پر نظر ڈالے گا تو ہم کو امید ہے کہ وہ اس نتیجہ کے استنباط سے باز نہ رہ سکے گا کہ یہ تصنیفات امر حق کی تحقیق اور تدقیق کے سوا اور کسی غرض کے لئے کی گئی ہیں اور بیہودگی اور یاوہ گوئی میں گردشیں کے کبوتر کے قصہ کے ساتھ ہمسری کرتی ہیں۔

شق صدر اور معراج اگر مذہب اسلام سے تعلق رکھتے ہیں تو بہت سیدھا سادھا تعلق رکھتے ہیں اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے جسم مبارک میں یا اس واقعہ کے خواب میں ہونے سے انکار کرے اور یہ کہے کہ اس قسم کی کوئی چیز ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی اور یہ تمام روایتیں جو اس وقعہ کے حقیقی یا خیال وقوع کو بیان کرتی ہیں بلا استثنا بالکل غلط اور سراسر بے اصل موضوع اور جعلی ہیں تو بھی اس کے ایمان میں ذرہ برابر بھی خلل واقع نہ ہوگا بلکہ وہ پورا پکا اور سچا مسلمان رہے گا۔

معراج کا خواب اس قبیل سے ہے جیسا کہ حضرت یعقوب نے دیکھا تھا جو معراج یعقوب کہا جاتا ہے چنانچہ توریت میں لکھا ہے کہ "پس بخواب دید کہ اینک زدبانے بہ زمین برپا گشتہ سرش بآسمان میخورد واینک فرشتگاں خدا ازاں بہ بالا وزیری رفتند واینک خداوند براں ایستادہ ی گفت من خداوند خدائے پدرت ابراہیم وہم خدائے اسحٰق ام۔ ایں زمینے کہ براں میخوابی تبو وبذریعہ تو می وہم و ذریہ تو مانند خاک زمین گردیدہ بہ مغرب ومشرق وشمال وجنوب منتشر خواہند شود اینک من باتوام وہرجائے کہ میروی ترا نگاہ حاشتہ بایں زمین باز پس خواہم آورد۔ تابوقتیکہ آنچہ بتو گفتہ ام بجا آورم ترا وانخواہم گذاشت ویعقوب ازخواب خود بیدار شدہ گفت بدرستی کہ خداوند دریں مکان است ومن ندانستم۔ پس ترسیدہ گفت کہ ایں مکان چہ ترسناک است ایں نیست مگر خانہ خدا وایں است دروازۂ آسمان (سفرتکوین باب ۲۸ آیت ۱۲۔۱۷)

معراج کی نسبت جس چیز پر کہ مسلمانوں کو ایمان لانا فرض ہے وہ اس قدر ہے کہ پیغمبر خدا نے اپنا مکہ سے بیت المقدس پہنچنا ایک خواب میں دیکھا اور اسی خواب میں انہوں نے درحقیقت اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں مشاہدہ کیں۔ خواہ وہ شخص ان

نشانیوں کو لامعلوم نشانیاں کہے' خواہ نشانیوں کے دیکھنے سے عمدہ ترین احکام وحی کا ہونا مراد لے' مگر اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ نے جو کچھ خواب میں دیکھا یا جو وحی ہوئی یا انکشاف ہوا وہ بالکل سچ اور برحق ہے۔

اگر کوئی مسلمان مذکورہ بالا عقیدہ پر ایمان رکھ کر ان سب روایتوں کو جو معراج کے قصہ میں آئی ہیں نہ مانے اور سب کو موضوع اور نہایت قابل الزام خیال کر کے چھوڑ دے تو اس کے دین و ایمان میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا اور وہ اس شخص کے ہم پایہ ہوگا جو کسی چیز پر بلا تحقیق و تفتیش کے ایمان نہیں لاتا۔

اگر ان روایتوں کی نسبت یہ خیال کی جائے کہ ان سے ایک شان آنحضرت ﷺ کی پائی جاتی ہے تو اس کی نسبت ہماری یہ رائے ہے کہ اگر یہ سب باتیں جو ان روایتوں میں مندرج ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کی جائی تو بھی آنحضرت ﷺ کی شان کچھ بڑھ نہیں جائے گی اور نہ اس بے انتہا اعلیٰ درجہ کی شان میں کچھ زیادتی ہوگی اور اگر ان کا عشر عشیر بھی آنحضرت ﷺ کی طرف نہ منسوب کیا جائے تو بھی اس جناب کی عظمت و شان میں کچھ فرق نہیں آئے گا۔

ہم مسلمان اپنے نبی کو "ابن اللہ" بنانا نہیں چاہتے اور نہ ان کو "اللہ تعالیٰ کے دست راست" پر بٹھانے کے مشتاق ہیں۔ ہم ان کی سب سے بڑی عزت اس میں خیال کرتے ہیں جو خود انہوں نے اپنی نسبت فرمایا کہ "**انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد. امنا باللہ وما جاء بحمد صلی اللہ علیہ وسلم**۔

☆☆☆

الخطبة الثانی عشر

فی

ولادته وطفولية عليه الصلوة والسلام

وانک لعلی خلق عظیم

اس خطبہ میں آنحضرت ﷺ کی ولادت سے آپ کی بارہ برس کی عمر تک کا حال

عبداللہ بن عبدالمطلب ولد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی چوبیس برس کی عمر تھی جب کہ انہوں نے آمنہ بنت وہب سے شادی کی۔ آمنہ بنت وہب قریش کے قبیلہ سے تھیں جو عرب کے قبیلوں میں نہایت معزز اور شریف قبیلہ تھا۔ حضرت آمنہ حمل ہی سے تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد عبداللہ نے بغرض تجارت یثرب یعنی مدینہ کی طرف سفر کیا اور قبل پیدا ہونے آنحضرت ﷺ کے انہوں نے وفات پائی اور بنی نجار کے دار عبغہ میں مدفون ہوئے۔

ان کی وفات کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ جمہور مورخین کی یہ رائے ہے کہ آنحضرت ﷺ بارھویں ربیع الاول کو عام الفیل کے پہلے برس یعنی ابرہہ کی چڑھائی سے پچپن روز بعد پیدا ہوئے۔ مگر اس بات میں کہ عام الفیل سنہ عیسوی کے کون سے سال میں واقع ہوا تھا مورخوں کی رائے میں اختلاف ہے منقح امر جو قرار پایا ہے وہ یہ ہے کہ عام الفیل ۵۷۰ء کے مطابق تھا کیونکہ سب مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ۶۲۲ء میں مکہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت کی تھی۔ یعنی نزول وحی سے تیرہویں برس اور وحی چالیس برس کی عمر میں نازل ہوئی تھی۔ ان برسوں کو اگر جمع کیا جائے تو ترپن قمری سال ہوتے ہیں اور جب کہ ان میں سے ایک برس قمری سال شمسی سال سے مطابقت کرنے کے لئے منہا کیا جائے تو باون برس باقی رہتے ہیں اور جب ان باون برس کو چھ سو بائیس میں سے نکال دیا جائے تو پانچ سو ستر باقی رہتے ہیں اور اس حساب سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت ۵۷۰ء میں ہوئی۔

آنحضرت ﷺ کی ولادت نسبت بہت ہی عجیب روایتیں مشہور ہیں کہ ولادت کی رات کو کسریٰ کے محل میں زلزلہ آیا اور اس کے چودہ کنگرے گر پڑے۔ فارس کا مقدس آتشکدہ جس میں سالہا سال سے برابر آگ جلتی چلی آتی تھی دفعتہً بجھ گیا۔ وہاں کے موبدوں نے عجیب عجیب خوابیں دیکھیں اور چشمہ سادہ دفعتہً خشک ہوگیا۔ مگر ان روایتوں کی معتبری کی قابل اعتماد سندیں نہیں ہیں اور نہ ہی مذہبی روایتیں سمجھی جاسکتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات کے سبب اسلام نے رونق پائی اور مسلمانوں کو فتوحات نمایاں حاصل ہوتی گئیں اور تمام مملکت فارس مسلمان کے ہاتھ پر فتح ہوئی اور وہاں کے قدیم آتشکدے برباد ہوئے اور کسریٰ کے محلوں میں زلزلہ ڈال دیا۔ ان واقعات کو جو بعد کو وقوع میں آئے شاعروں نے اپنے شاعرانہ خیالات میں آنحضرت ﷺ کی

ولادت سے منسوب کیا کہ گویا ان کا پیدا ہونا ہی فارس کے آتشکدوں کا بجھنا اور کسریٰ کے محل میں زلزلہ پڑنا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ شاعرانہ خیال بطور روایت کے مروج ہونے لگے اور عین روز ولادت ہی سے منسوب کر دیئے گئے۔ پس ان روایتوں کو مذہبی روایتیں تصور کرنا ان لوگوں کی غلط فہمی ہے جو مسلمانوں کی مذہبی روایتوں کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

علاوہ ان کے اور بھی روایتیں آنحضرت ﷺ کی ولادت کی نسبت کتب سیر میں مذکور ہیں۔ اگرچہ ان کی صحت کے لئے بھی کافی ثبوت موجود نہیں ہے مگر ان کے غلط ہونے کے لئے بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان روایتوں سے پایا جاتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے تو حضرت آمنہؓ نے کسی کو عبدالمطلب کے پاس بھیجا اور آپؐ کے پیدا ہونے کی اطلاع کی۔ عبدالمطلب فی الفوز وہاں آئے اور آنحضرت ﷺ کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر کعبہ میں لے گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی۔

سرولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ عبدالمطلب کی دعا کا جو مضمون بیان کیا گیا ہے وہ صریح مسلمانی طرز کا ہے اور اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ کعبہ میں عبدالمطلب کا دعا مانگنا صرف مسلمانوں کی بنائی ہوئی بات ہے۔ مگر ہم کو اس بات سے کہ عبدالمطلب نے جو دعا مانگی تھی وہ مسلمانی طرز کی دعا تھی کچھ تعجب نہیں ہوتا کیونکہ ہم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بزرگوں میں سے خدا پرستی بالکل معدوم نہیں ہوئی تھی اور اس بات کا بڑا قوی ثبوت یہ ہے کہ عبدالمطلب نے اپنے بیٹے یعنی آنحضرت ﷺ کے والد کا نام عبداللہ رکھا تھا جو خاص خدا پرستوں کا طریقہ ہے۔

چند روز تک ثویبہ نے جو آنحضرت کے چچا ابولہب کی آزاد کی ہوئی لونڈی تھیں آنحضرت ﷺ کو دودھ پلایا' ثویبہ نے آنحضرت ﷺ کے چچا حمزہ کو بھی دودھ پلایا تھا اور اس سبب سے حمزہ اور مسروق ابن ثویبہ آنحضرت ﷺ کے دودھ بھائی تھے۔

عبدالمطلب نے آنحضرت ﷺ کا نام محمد رکھا حضرت آمنہ نے خواب میں ایک فرشتہ دیکھا تھا جس نے آپ کا نام احمد رکھا۔ اس لئے انہوں نے آنحضرت ﷺ کا نام احمد رکھا اور اس طرح توریت اور انجیل دونوں کی بشارتوں کی تصدیق ہوگئی۔ جن کا بیان ہم نے خطبہ بشارات میں کیا ہے۔ ولادت کے ساتویں روز عبدالمطلب نے قربانی کی اور تمام اراکین قبیلہ قریش کو دعوت میں بلایا۔

شرفاء مکہ کا دستور تھا کہ آب وہوا کے لحاظ سے اور اس غرض سے کہ بچوں کے لہجہ اور زبان میں غیر زبان کا اثر نہ ہونے پائے اپنے بچوں کو جب کہ وہ آٹھ دن کے ہو جاتے تھے دودھ پلانے والیوں کے سپرد کر کے باہر بھیج دیا کرتے تھے۔ اسی رسم کے موافق آنحضرت ﷺ کو بھی حلیمہ سعدیہ کے سپرد کر دیا گیا اور وہ اپنے گھر لے گئیں اور ہر چھٹے مہینے لا کر ان کی والدہ اور دیگر اقربا کو دکھلا جاتی تھیں۔ دو برس بعد آپؐ کا دودھ چھڑایا گیا اور حضرت آمنہ کے پاس آئیں مگر حضرت آمنہ نے اس خیال سے کہ مکہ کی آب و ہوا آپ کو موافق نہ ہوگی پھر حضرت حلیمہ کے سپرد کر دیا اور وہ ان کو اپنے ہاں لے گئیں اور ہر چھٹے مہینے لا کر بلا جاتی تھیں۔ جب آنحضرت ﷺ کی عمر چار برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ نے آپ کو اپنے پاس رکھ لیا۔ پس حضرت حلیمہ آنحضرت ﷺ کی دودھ پلائی ماں اور ان کے خاوند حارث ابن عبدالعزیٰ دودھ کے رشتہ کے باپ اور ان کی اولاد عبداللہ اور انیسہ اور خدیمہ عرف شیما دودھ بھائی اور دودھ بہن ہیں۔

آنحضرت ﷺ دودھ کے رشتہ کو خون کے رشتہ کے برابر سمجھتے تھے اور حضرت حلیمہ سے نہایت محبت رکھتے تھے اور ان کا ادب اور ان کی تعظیم ماں کے برابر کرتے تھے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے اپنی ردائے مبارک جس کو مسلمان سر پر رکھنے اور آنکھوں سے لگانے کے لائق سمجھتے ہیں حضرت حلیمہ کیلئے بچھا دی تا کہ وہ اس پر بیٹھیں۔ دودھ کے رشتہ کا ایسا بڑا پاس ولحاظ جو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے اور جو محبت اور الفت کہ حضرت حلیمہ اور اس کی اولاد کے ساتھ برتتے تھے اور جس احسان مندی کا اظہار دودھ کے رشتہ داروں کے ساتھ کیا کرتے تھے نہایت اعلیٰ اور عمدہ مثالیں آنحضرت ﷺ کے اخلاق حمیدہ نیک خوئی اور نرم دلی کی ہیں جس کی نظیر اس سے پہلے کبھی نہیں پائی گئی۔

بنی قریش اور بالتخصیص اس کی وہ شاخ جو بنی سعد کہلاتی تھی جن میں آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ طفولیت میں پرورش پائی تھی تمام ملک عرب میں زبان کی شستگی اور فصاحت کے لئے مشہور تھی اور اسی سبب سے جناب پیغمبر خدا ﷺ بھی نہایت زبردست اور پراثر فصاحت و بلاغت رکھتے تھے۔ اہل عرب درحقیقت فصاحت و بلاغت کی نہایت قدر کرتے تھے اور جو شخص فصیح و بلیغ نہ ہوتا تھا اس کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور ذلیل سمجھتے تھے گو وہ کیسے ہی نامور اور شریف خاندان کا کیوں نہ ہو۔

سر ولیم میور صاحب اپنی کتاب میں فرماتے ہیں کہ اس سبب سے آنحضرت ﷺ کی گفتگو جزیرہ نما عرب کی خوشنما زبان کے خالص ترین نمونہ پر بن گئی تھی۔ جب کہ ان کی فصاحت و بلاغت ان کی کامیابی میں بڑا کام دینے لگی تو ایک خالص زبان اور ایک دلفریب گفتگو سے فائدہ عظیم مرتب ہوا۔ مگر ایک بات سر ولیم میور صاحب کی نگاہ سے رہ گئی کہ جب آنحضرت ﷺ کی کسی متواتر یا مشہور حدیث کو پڑھتے ہیں جس میں یقین کیا جاتا ہے کہ خاص لفظ آنحضرت ﷺ کے محفوظ ہیں جیسے دعائیں وغیرہ تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرز کلام اور فصحائے عرب کے طرز کلام سے کچھ غیر مشابہ نہیں ہے۔ لیکن جب ہم قرآن مجید کے مقدس صفحوں کو پڑھتے ہیں تو ہم کو حیرت ہوتی ہے اور ہمارا تعجب بے انتہا بڑھ جاتا ہے کہ وہ دونوں کلام ایک ہی شخص کے نہیں معلوم ہوتے اور دونوں میں بہت بڑا فرق پاتے ہیں اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتی کہ اول کلام انسانی ہے اور دوسرا کلام ربانی۔

جب کہ آنحضرت ﷺ کی عمر چھ برس کی ہوئی تو حضرت آمنہ آپ کو اپنے عزیز واقربا سے ملانے کے لئے مدینہ منورہ لے گئیں۔ کچھ عرصہ تک وہاں ٹھہریں اور پھر مکہ معظمہ کو مراجعت کی اور راستہ میں بمقام ابواء وفات پائی۔ جب کہ آنحضرت ﷺ مکہ میں پہنچے تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پرورش اور نگرانی اپنے ذمہ لی اور ہمیشہ آپؐ کے ساتھ شفقت پدری سے پیش آتے رہے۔

سر ولیم میور نے اپنی کتاب میں آنحضرت ﷺ کے زمانہ طفولیت یعنی بارہ برس کی عمر تک کے بعض واقعات تعریضاً بیان کیے ہیں مثلاً مدینہ کی چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ ان کا کھیل کود میں مصروف رہنا اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو اڑا دینا اور رضاعی بہن کی پیٹھ میں کاٹ کھانا اور مدینہ سے حدیبیہ کو جاتے وقت اپنی ماں کی قبر پر رونا۔ اگرچہ ان باتوں کی اور اسی قسم کی اور باتوں کی تصدیق کی جو انہوں نے بیان کی ہیں کوئی معتبر سند نہیں ہے لیکن اگر یہ سب باتیں تسلیم بھی کر لی جائیں تب بھی یہ ایسی باتیں ہیں جیسی کہ ایام طفولیت میں انسانی فطرت کے موافق ہوتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نہ خدا تھے اور نہ خدا کے بیٹے۔ انہوں نے اپنے آپ کو صرف یہ کہا کہ ”انا بشر مثلکم یوحی الی“ پس ایسی باتیں اگر ہوئی بھی ہوں تو انسانی فطرت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتیں۔

جب کہ آنحضرت ﷺ کو آٹھواں برس شروع ہوا تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے بیاسی برس کی عمر میں وفات پائی۔ سر ولیم میور صاحب لکھتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ جنازہ کے ہمراہ قبرستان حجر کو گئے تو لوگوں نے ان کو روتے دیکھا۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس سے برخلاف منشاء سر ولیم صاحب کے کچھ تعجب نہیں ہوتا بلکہ اگر نہ روتے تو نہایت تعجب ہوتا۔ آنحضرت ﷺ اس وقت کم

عمر تھے اور ایسے موقعوں پر آنسوؤں کا نکلنا اور دل کا جوش مارنا خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ رنج کے وقت دل کا ملائم ہونا اور محبت آمیز جوش کا اٹھنا اور آنکھوں کی راہ سے آنسوؤں کا بہنا خدائے رحیم نے انسان کے دل کی تسلی اور اس کے رنج کی تسکین کا ذریعہ بنایا ہے پس آنحضرت ﷺ نے بھی اسی فطرت کی پیروی کی تھی جو خدا نے انسان میں بنائی ہے۔

عبدالمطلب کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ کی پرورش ابو طالب آپؐ کے چچا نے جو آپؐ کے والد عبداللہ کے حقیقی بھائی تھے اپنے ذمہ لی۔ یہ بھی آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہایت محبت سے پیش آتے رہے اور مثل پدر مہربان کے ہر طرح سے خبر گیری کی۔ جب آپؐ کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو ابو طالب کو تجارت کے سبب سے شام کا سفر پیش آیا اور اس کے سرانجام کے بعد پھر مکہ کو واپس آئے۔ سر ولیم میور صاحب نے جو لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ ابو طالب کے ہمراہ شام کو گئے تھے اور ابو طالب نے اول تو اپنے ہمراہ لے جانے سے انکار کیا تھا مگر آنحضرت ﷺ کی روانگی کے دن اتنی لمبی مفارقت کے خیال سے افسردہ دل ہو کر اپنے عربی سے لپٹ گئے اور ابو طالب کو بھی جوش الفت آ گیا اور اپنے ہمراہ لے گئے۔ اس روایت کی کوئی معتبر سند نہیں ہے آنحضرت ﷺ کا ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر میں جانا کسی طرح ثابت نہیں۔

جب کہ آنحضرت ﷺ بارہ برس کی عمر کو پہنچے تو زمانہ طفولیت کا منقضی ہو گیا تھا اور نوجوانی کا آغاز تھا اور جمیع اوصاف حمیدہ سے جن سے انسان ہر دلعزیز ہو جاتا ہے آراستہ تھے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کا اخلاق اور صبر اور مردانگی جن کو اوضاع واطوار کی خوبی اور فصاحت وخوش بیانی سے دوبارہ جلا ہو گئی تھی آپ کی ذات بابرکات میں اس طرح مجتمع ہوئے تھے کہ عالم شباب ہی میں آپ نے امین عرب کا لقب حاصل کیا تھا۔

آنحضرت ﷺ کے زمانہ طفولیت کے صحیح حالات صرف اسی قدر ہیں جو ہم نے بیان کئے اور اس کے سوا جو باتیں اس زمانہ کی مشہور ہیں وہ سب بے سند اور نامعتبر ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی بارہ برس کی عمر تک کے تاریخی واقعات جو ہم نے اوپر بیان کئے ان کے علاوہ سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب مسمیٰ لائف آف محمدؐ میں اور بھی کچھ واقعات بیان کئے ہیں جو نہایت ضعیف اور نامعتبر روایتوں پر مبنی ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت کے متعلق معجزات حال کے مسلمانوں کے نزدیک بہت دل پسند مضامین ہیں، مگر اس امر کی کچھ تحقیقات نہیں کی کہ کچھ تحقیقات نہیں کی کہ کن معجزات کو حال کے زمانہ کے مسلمان بھی معتبر سمجھتے ہیں اور کون سے معجزات کو نامعتبر بطور قصہ اور کہانی کے اور یہ بھی نہیں بتایا کہ حال کے مسلمانوں کی جو انہوں نے قید لگائی ہے اس سے ان کا کیا مطلب ہے۔ غالباً یہ مطلب ہوگا کہ متقدمین مسلمان اول ان کو قابل التفات نہیں سمجھتے تھے اگر یہی مطلب ہو تو صاف اس بات کا اقرار ہے کہ وہ روایتیں جن کو سر ولیم میور صاحب نے بیان کی ہے نامعتبر اور غیر صحیح ہیں۔ جس قدر کتب سیر یا کتب سوانح عمری آنحضرت ﷺ کی علمائے اسلام نے لکھی ہیں اور جو روایتیں ان میں بیان کی ہیں تمام مسلمان ان روایتوں کو ایسی روایتیں خیال کرتے ہیں کہ قبل اس کے کہ وہ صحیح مانی جائیں روایتاً اور درایتاً کامل تحقیق وتدقیق کی محتاج ہیں۔ اس قسم کی روایتوں کو تاوقتیکہ ان کی تصدیق کی کوئی کافی دلیل نہ ہو مسلمان مطلقاً قابل اعتبار تصور نہیں کرتے بلکہ خود علمائے محققین نے ان روایتوں کو نامعتبر قرار دیا ہے۔ علمائے محققین اسلام اور ذی علم مسلمانوں نے ان روایات پر ذرا بھی اطمینان نہیں کیا ہے بلکہ ہمیشہ ان کی کوششیں اس بات کی تحقیق میں کہ کونسی ان میں سے صحیح اور کونسی غیر صحیحہ ہیں مصروف رہی ہیں۔

سرولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں جہاں روایتوں کے درجہ اعتبار کو بیان کیا ہے ان تمام روایات کی نسبت جن میں صحیح روییتیں اور موضوع اور نامعتبر روایتیں بلاتمیز شامل ہیں صرف اتنی بات کہہ کر فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ سب بے اصل اور راویوں کی محض اختراعات ہیں۔ مگر ہم باوجود اس کے کہ سرولیم میور صاحب کے علم اور مرتبہ کا بہت ادب کرتے ہیں یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ دعویٰ بلا دلیل قابل پذیرائی نہیں ہوسکتا اس لئے کہ اگر وہ بالعموم مان لیا جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ استدلال محض بیکار چیز ہے اور اس کی ایسی مثال ہوتی ہے جیسے کہ یونان کے مشہور کاشتکار مسمی گارڈین کی گاڑی کے جوئے کی گرہ کو ایران کی بادشاہت کے طمع میں ہاتھ سے کھولنے کے عوض تلوار سے کاٹ دیا جائے جیسے کہ سکندر نے کیا تھا۔

فرض کرو کہ اگر کوئی یہ کہے[1] (جیسے کہ لوگوں نے کہا ہے) کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام محض عوام الناس میں سے اور یہود کے فرقہ اسینین میں سے تھے اور حضرت عیسیٰ ان کے مرید تھے۔ ان کے مصلوب ہونے کے بعد ان کے مریدوں نے شان الوہیت اور قدرت اعجاز کو ان پر لگا دیا ورنہ وہ محض ایک عام یہودی تھے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ اس کہنے میں اور مسلمانوں کی تمام روایتوں کی نسبت اس بات کے کہہ دینے میں کہ وہ سب بے اصل اور راویوں کی اختراعات ہیں' کیا فرق ہے؟

زندگی کے عام معاملات میں بھی کسی شخص پر واجب نہیں کسی شخص کے محض زبانی بیان پر چاہے وہ کیسا ہی معزز اور ذی فہم کیوں نہ ہو یقین لے آئے تو ایسے بڑے معاملات میں کسی مصنف کے بیان یا رائے کو کیونکر قطعی مان لیا جاسکتا ہے۔ اس لئے ہم قابل معافی ہیں اگر ہم سرولیم میور صاحب کی اس رائے کو کہ ''ان روایات ہی کو غیر معتبر سمجھ کر خارج کر لینا چاہیے' قابل تسلیم نہ خیال کریں جب تک کہ دلیل اور واقعات سے اس رائے کی صحت کا ثبوت نہ ملے۔

جاننا چاہیے کہ مسلمانوں کے نزدیک روایتیں تین قسم کی ہیں۔ اول تو وہ روایتیں ہیں کہ ان کی صحت و اعتبار کی معقول دلیلیں موجود ہیں اور علی العموم مسلم ہیں۔ دوسری قسم میں وہ مشہور روایتیں شامل ہیں جن کا وقوع قوانین فطرت کے برخلاف نہیں ہے اور جن کی بے اصلی اور غیر معتبری کی نسبت کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ یہ روایتیں نہ تو بلاتحقیق نامعتبر کرنے کے قابل ہیں اور نہ اس قابل ہیں کہ آنکھ بند کر کے ان پر اعتماد کر لیا جائے۔ تیسری قسم میں وہ روایتیں ہیں جو بظاہر بالکل محال معلوم ہوتی ہیں اور ان کے ثبوت کی کوئی معتبر دلیل نہیں ملی ہے اور اس لئے غلط اور نامعتبر قرار دی گئی ہیں۔ پس اس سے زیادہ غلطی کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ اہل اسلام کی نسبت یہ کہا جائے کہ وہ ان سب قسم کی روایتوں کو برحق سمجھتے ہیں اور ان سب پر بلاامتیاز ایمان رکھتے ہیں جیسے کہ ہم نے اپنے خطبہ **''الروایات المرویات فی الاسلام''** میں بیان کیا ہے۔

اب ہم ان روایات کی نسبت بحث کرتے ہیں جن کو سرولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں لغویت مذہب اسلام ثابت کرنے کی منشاء سے بیان کیا ہے اور بتاتے ہیں کہ وہ روایتیں اقسام روایت متذکرہ بالا میں سے کونسی قسم کی روایتوں میں داخل ہیں۔ سرولیم میور صاحب نے آنحضرت ﷺ کے زمانہ ولادت میں جو حضرت آمنہ کا ایک خوفناک اور نامعلوم آواز سن کر ڈر جانا یا ایک سفید مرغ کا دفعتہً نمودار ہونا اور حضرت آمنہ کے سینہ پر اپنے بازو کو پھیرنا اور اس سے حضرت آمنہ کے اضطراب کو تسکین کا ہونا یا حضرت آمنہ کے لئے خوشگوار شربت کے پیالہ کا ایک نامعلوم ہاتھ سے ظاہر ہونا یا ملائکہ کی آوازیں آنی یا بغیر اس کے کہ کوئی شخص دکھائی دیتا

---

[1] دیکھیے کتاب موسوم بہ ''اے والیس فرام دی گنجز''

ہو پاؤں سے پھرنے کی آہٹ کا محسوس ہونا آنحضرت ﷺ کی آدمیوں کی نظر سے چھپا لینے کے لئے آسمان سے ایک نور کی چادر کا اترنا بہشت کے پرندوں کا چہچہانا بہشت کی خوشبوؤں کا مہکنا یہ سب شاعرانہ مضمون ہیں جو غالباً سر ولیم میور صاحب نے کسی مولود نامہ سے اخذ کئے ہیں اور ہر مسلمان جس کو ذرا سا بھی علم ہو گا سمجھتا ہے وہ یہ تمام باتیں شاعروں کے گرمجوش شاعرانہ خیالات ہیں جو انہوں نے اپنے مضامین کی تزئین اور آنحضرت ﷺ کی تاریخ کی رونق کے لیے بیان کرنے کی ہیں جیسے کہ شاعروں کا اور خصوصاً مشرقی شاعروں کا شاعرانہ مضمون میں اس قسم کے واقعات بیان کرنے کا دستور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت بھی گرمجوش خیال کے عیسائی شاعروں نے اسی قسم کے خیالات نظم میں بیان کئے ہیں جن کا نمونہ ہم نے اپنے خطبہ **"فی حقیقة شق الصدر وما هية المعراج"** میں دکھایا ہے اور ملٹن کی تمام پیراڈائز لاسٹ انہیں خیالات سے بھری ہوئی ہے۔ پس نہایت افسوس کی بات ہے کہ ایک عیسائی عالم اپنے ہاں کے اس قسم کے خیالات کو تو شاعرانہ خیالات سمجھے اور مسلمانوں کی اس قسم کی باتوں کو بطور مذہبی روایتوں کے قرار دے اور اس کا فیصلہ یوں کر دے کہ وہ سب راویوں کی اختراعات ہیں۔

اسی قسم کے وہ مضامین ہیں جن کو سر ولیم میور صاحب نے بطور مذہبی روایتوں کے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پیدا ہوتے ہی زمین پر سجدہ کیا اور اپنی امت کی بخشش کی دعا مانگی اور کلمہ پڑھا اور تین نورانی فرشتے آسمان پر سے اترے ایک کے ہاتھ میں چاندی کی چھاگل تھی، دوسرے کے ہاتھ میں ایک زمرد کا لگن اور اور تیسرے کے پاس ایک ریشمی رومال اور آنحضرت ﷺ کو سات مرتبہ غسل دے کر آپ کو خیر البشر کا خطاب دیا۔

ہم کو کس قدر تعجب آتا ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے آنحضرت ﷺ کے مختون پیدا ہونے کو بھی انہی مخترع روایات میں شمار کیا ہے جن کو وہ عجیب و غریب بعید از قیاس اور خلاف قانون فطرت قرار دیتے ہیں، مگر یہ بات نہ معجزہ سے علاقہ رکھتی ہے نہ عجائبات سے بلکہ محض تلونات فطرت سے متعلق ہے۔ ایسے تلونات فطرت کی بہت سی نظیریں بتلائی جاسکتی ہیں مثلاً ایسے اشخاص کا پیدا ہونا جن میں علامت تذکیر و تانیث دونوں موجود ہوں۔ ایسے واقعات اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ قوانین فطرت کے مطابق قدرت کا اتفاقیہ انحراف کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اس زمانہ میں بھی بعض اوقات مختون لڑکے پیدا ہوتے ہیں جن سے بلا توسل معجزہ یا عجائبات کے آنحضرت ﷺ کا بھی مختون پیدا ہونا یقیناً قرین قیاس ثابت ہوتا ہے اور اس کا ثبوت اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ بوجود یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ختنہ کی رسم نہایت استحکام سے قرار پاگئی تھی اور عرب جاہلیت بھی اس کا ترک کرنا گناہ عظیم سمجھتے تھے مگر آنحضرت ﷺ کے ختنہ کی رسم کا ہونا کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی بیان نہیں کیا گیا۔

مہر نبوت کی نبوت سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ "صفیہ سے نقل ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مہر نبوت ان کی پشت پر نور کے حرفوں میں مرقوم تھی"، تمام مستند حدیثیں بالاتفاق بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک سیاہ غدود سا تھا اور اس پر بال تھے۔ خود آنحضرت ﷺ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ میری رسالت کی مہر ہے اور نہ کبھی اس کو اپنی رسالت کے برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کیا۔ جس طرح کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ید بیضا کو نبوت کے ثبوت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ہر چیز کی حرمت اور تعظیم کی جاتی تھی اور اسی خیال سے بعض لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی پشت کے غدود کو عام نام سے بولنا ایک بے ادبی اور گستاخی خیال کر کے استعارةً اس کو مہر نبوت کے معزز اور گرامی نام سے موسوم کیا ہوگا۔

"واما رواية كاثر الحجم او كركبة عنواو كشامة خضراء اوسوده ومكتوب فيها محمد رسول

اللہ اوسطر فانک المنصور لم یثبت منھا شئی کما قالہ العسقلانی و تصحیح ابن حبان لذلک وھم وقال بعض الحافظ من رویٰ انہ کان علیٰ خاتم النبوۃ کتابۃ محمد رسول اللہ فقداشتبہ علیہ خاتم النبوۃ بخاتم الید اذا لکتابۃ المذکورۃ انما کانت علی الثانی دون الاول (حاشیۃ الباجوری علی الشمائیل)

بعض لوگوں کے اس خیال کو کہ اس پر حرف لکھے ہوئے تھے جمیع علمائے اسلام نے نہایت صراحت کے ساتھ رد کیا ہے۔ پس کیا ایک عیسائی عالم کو یہ بات ناز یبا نہیں ہے کہ مسلمانوں پر ان کے نبی کی رسالت کے ثبوت میں ایسے امر کے اعتقاد رکھنے کا اتہام لگائے جس سے وہ خود انکار محض کرتے ہوں۔ شمائل ترمذی کے حاشیہ مسمیٰ باجوری میں لکھا ہے کہ" یہ جو روایت ہے کہ اس پر پچھنے کے سے نشان تھے یا جانور کے گھٹنے کی مانند یا غدود سبز یا سیاہ رنگ کا تھا اور اس پر محمد رسول اللہ ﷺ لکھا ہوا تھا یا یہ لکھا ہوا تھا" ایک منصور" ان میں سے کچھ بھی ثابت نہیں ہے جیسے عسقلانی نے کہا ہے اور ابن حبان نے جو اس کی تصحیح کی ہے وہ صرف اس کا وہم ہے بعض حفاظ حدیث نے کہا ہے کہ جس شخص نے یہ بیان کیا ہے کہ مہر نبوت پر یعنی اس شے پر جو آنحضرت ﷺ کی پشت پر تھی الفاظ محمد رسول اللہ لکھے ہوئے تھے اس کو دھوکا ہو گیا ہے ہاتھ کی مہر میں اور اس پشت کے غدود میں جس کو خاتم نبوت کہتے تھے کیونکہ وہ عبارت ہاتھ کی مہر میں کندہ تھی نہ پشت کی چیز پر" پس جو محقق امر باجوری اور عسقلانی نے لکھا ہے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ علمائے اسلام نے ان روایتوں کو جن کو سر ولیم میور صاحب نے بیان کیا ہے خود رد کیا ہے اور مہر نبوت سے وہ کیا مراد لیتے تھے۔

عن ابی رمثہ... قال دخلت مع ابی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرایٰ ابی الذی بظھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال رعنی اعالج الذی بظھرک فانی طبیب فقال انت رفیق واللہ الطبیب (رواہ فی شرح السنۃ)

شرح السنہ میں ابی رمثہ سے منقول ہے کہ" وہ اپنے باپ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ ان کے باپ نے اس چیز کو دیکھا جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر تھی۔ ان کے باپ نے کہا کہ آپ مجھ کو اجازت دیجیے کہ جو چیز آپ کی پیٹھ پر ہے اس کا علاج کروں کیونکہ میں طبیب ہوں۔ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ تم رفیق ہو اور اللہ طبیب ہے۔" اس روایت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو مہر نبوت کہتے تھے وہ کیا چیز تھی اور صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود اس زمانے کے مسلمان جو آنحضرت ﷺ کے اصحاب تھے اس کو کیا سمجھتے تھے۔ پس سر ولیم میور صاحب نے جو اس کو بطور عجائبات اسلام کے بیان کیا ہے محض بے جا ہے۔

سر ولیم میور صاحب نے روایتیں لکھی ہیں جن میں بیان کیا ہے کہ حضرت آمنہ سے ایک نور پیدا ہوا جس نے شام کی تمام گلیوں اور مکانوں کو روشن کر دیا اور آنحضرت ﷺ پیدا ہوتے ہی اپنے ہاتھوں کو ٹیک کر اٹھ بیٹھے اور ایک خاک کی مٹھی بھر کر آسمان کی طرف پھینکی۔ اور ایک روایت لکھی ہے کہ حضرت آمنہ کو ایام حمل میں کچھ بوجھ یا تکلیف نہیں معلوم ہوتی تھی اور دوسری روایت اس کے برخلاف لکھی ہے کہ حضرت آمنہؓ کہتی تھیں کہ میں نے کسی بچہ کو پیٹ میں آنحضرت ﷺ سے زیادہ بھاری نہیں پایا۔ یہ روایتیں اس قسم کی اور سب روایتیں بالکل سند سے معرا ہیں اور خود علمائے اسلام ان کو غیر صحیح اور نامعتبر قرار دیتے ہیں اور یہ سب گرم جوش خیالات کے نتیجے ہیں جن کو سر ولیم میور صاحب اسلام کی مذہبی روایتوں کی طرز پر بیان کرتے ہیں۔ اس منشاء سے کہ اسلام کی ایک

بے وقعتی ظاہر کریں۔

وہ روایت جس میں حضرت آمنہ سے نور کا ظاہر ہونا منقول ہے اور جو کتاب شرح السنہ میں بیان کی گئی ہے اس طرح پر نہیں ہے جس طرح کہ سرولیم میور صاحب نے بیان کی ہے۔ اس لئے ہم اس روایت کو بلفظ نقل کرتے ہیں۔ شرح السنہ میں عرباض ابن ساریہ سے منقول ہے کہ:

"عن العرباض بن ساریه عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال... ساخبرکم باول امری انادعوة ابراهیم و بشارة عیسٰی ورویا امی التی رات حین وضعتنی وقد خرج لها نوراضاء بها قصور الشام"

"رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ میں تم کو اپنے پہلے حال سے مطلع کروں، میں دعا ہوں ابراہیم کی اور بشارت ہوں عیسیٰ کی اور خواب ہوں اپنی ماں کا جس نے میرے پیدا ہونے کے زمانہ میں دیکھا تھا کہ اس سے ایک نور پیدا ہوا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔"

پس جن روایتوں میں حضرت آمنہ سے نور کا پیدا ہونا منقول ہے اگر چہ ان کی بھی کوئی کافی سند صحت کی موجود نہیں ہے لیکن اگر ہم ان کو تسلیم کر لیں اور صحیح قرار دیں تو ان سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آمنہ نے ایسا ایک خواب دیکھا تھا اور اس قسم کا خواب دیکھنا نہ تعجب انگیز ہے نہ خلاف قیاس ہے اور نہ برخلاف فطرت۔

سرولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ تمام راوی آنحضرت ﷺ کی تاریخ میں دوشنبہ کو ایک مشہور اور معروف دن خیال کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اسی دن آپ کی زندگی کے سب سے بڑے واقعات ظہور میں آئے تھے لیکن اس متجر عالم نے اس جگہ کسی قدر غلطی کی ہے کیونکہ مسلمانوں کے ہاں دوشنبہ کے دن کو کوئی مذہبی شرف حاصل نہیں ہے۔ صرف یہ بات ہے کہ جب علماء نے ان مشہور و معروف واقعات پر غور کیا جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ظہور میں آئے تھے تو اکثر کو دوشنبہ کے دن واقع ہونا پایا۔ اس لئے انہوں نے ایک اتفاقی مطابقت کے خیال سے اپنی تصنیف میں دوشنبہ کا ذکر کیا۔ حالانکہ بعض علماء نے اس اتفاقی مطابقت سے بھی اختلاف کیا ہے۔ پس یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے کہ جس کے سبب اسلام کی طرف کسی منشا سے کوئی اشارہ کیا جائے۔

سرولیم میور صاحب نے تاریخ واقدی کے چند اختراعات بیان کرنے کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ اس مصنف نے بیان کیا ہے کہ حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے فرشتہ کا یہ حکم بیان کیا کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا۔ اس کے بعد صاحب ممدوح فرماتے ہیں کہ "حمد کے مادہ سے جو نام مشتق ہوتے ہیں عرب میں مروج تھے مگر احمد عرب میں بہت کم نام ہوتا تھا اور آنحضرت ﷺ کے سوا پانچ مختلف اشخاص اور بھی گزرے ہیں جن کا نام محمد تھا۔

واقدی کے حوالہ سے صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ "یہ نام عرب کے وہ لوگ رکھا کرتے تھے جنہوں نے یہود اور نصاریٰ اور کاہنوں کی زبانی سنا تھا کہ عرب میں ایک نبی اس نام کا عنقریب ہونے والا ہے اور اکثر شخص اپنے لڑکوں کے یہی نام رکھتے تھے۔ اور ہر شخص یہ امید کرتا تھا کہ میرا ہی بیٹا نبی آخر الزماں ہونے کی شرف و عزت حاصل کرے۔

مگر ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اگر حضرت آمنہ نے عبدالمطلب سے کہا ہو کہ ایک فرشتہ نے مجھ سے کہا ہے کہ اس لڑکے کا نام احمد رکھنا تو سرولیم صاحب نے اس بات پر کیوں تعجب کیا ہے۔ اگر توریت مقدس کی آیت کہ "اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ دیکھ تو حمل

سے ہے اور تیرے ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام اسمٰعیل رکھنا۔'' (کتاب پیدائش باب ۱۶ ورس ۱۱) اور نیز یہ آیت کہ ''اللہ تعالیٰ نے کہا کہ سارا تیری بیوی کے بیشک ایک لڑکا پیدا ہوگا اور اس کا نام اسحٰق رکھنا۔'' (کتاب پیدائش باب ۱۷ آیت 19) اور نیز انجیل کی یہ آیت ''اور اس کے (یعنی مریم کے) ایک بیٹا پیدا ہوگا اور تجھ کو (یوسف کو) چاہئے کہ اس کا نام عیسیٰ رکھے کیونکہ وہ اپنی امت کو گناہوں سے نجات دے گا۔'' (متی باب ۱ آیت ۳۰) صحیح ہے اور عیسائی اس کو تسلیم کرتے ہیں تو کس بناء پر وہ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو بھی ایک فرشتہ نظر آیا تھا اور جو لڑکا پیدا ہونے والا تھا احمد اس کا نام رکھنے کو کہا تھا۔

اس روایت کی صداقت کا ایک نہایت تسکین بخش ثبوت وہ ہے جو ہم نے اپنے خطبہ بشارات میں بیان کیا ہے یعنی عہد عتیق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت محمد کے نام سے آئی ہے اور انجیل میں احمد کے نام سے اور اس لئے ان بشارات کے پورا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ حضرت آمنہ کو احمد کا نام بتا دیا جائے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا نام تھا جس کو اہل عرب کبھی نہیں یا شاذ و نادر رکھتے تھے۔

مگر سر ولیم میور صاحب کا یہ بیان نہایت عجیب ہے کہ ''لفظ احمد'' انجیل یوحنا کے کسی قدیم عربی ترجمہ میں بجائے لفظ ''تسلی دہندہ'' کے براہ غلطی واقع ہوا ہوگا یا آنحضرت ﷺ کے وقت میں کسی جاہل یا متنفی راہب کی جعلسازی سے بجائے یونانی لفظ پیریکلیٹوس کے لفظ پیریکلیوٹوس کر دیا گیا۔' سر ولیم میور صاحب نے یہ بات اس لئے بیان کی ہے کہ پہلے یونانی لفظ پیریکلیٹوس کا ترجمہ تسلی دہندہ ہے اور دوسرے یونانی لفظ پیریکلیوٹوس کا ترجمہ احمد ہے۔ مگر مسلمانوں نے ان یونانی لفظوں کو معرب کر کے فارقلیط بنا لیا ہے اور اس سبب سے کہ مسلمان فارقلیط کا ترجمہ احمد کرتے ہیں ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے یونانی لفظ پیریکلیوٹوس کو معرب کر کے فارقلیط کیا ہے۔

سر ولیم صاحب نے جو یہ بیان کیا ہے کہ عرب میں محمدؐ نام کے اور لوگ بھی گذرے ہیں اس سے کچھ فائدہ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ علمائے اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب میں اس نام کا اور کوئی نہیں ہوا۔ بلکہ برخلاف اس کے انہوں نے اس قسم کی تمام روایتوں کو رد کر دیا اور نہایت تدین و ایمانداری سے اس امر کے دریافت کرنے میں کامیاب کوشش کی۔ اس نام کے عرب میں اور لوگ بھی گزرے تھے اور واقدی کو بھی ہم ان ہی لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔ مگر یہ بات کہ ان ناموں کے لوگ بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے درحقیقت گزرے تھے۔[1] یا یہ کہ اس نام کا مادہ حمد ہے اور حمد کے مادہ سے اہل عرب ناموں کو مشتق کیا کرتے تھے یہ یا یہ بیان کہ یہ نام اکثر والدین اپنے لڑکوں کا اس قوی امید پر رکھتے تھے کہ شاید ہمارے ہی لڑکے کی قسمت میں نبی موعود ہونا ہو کسی طرح عہد عتیق اور عہد جدید کی بشارتوں پر مؤثر نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی لڑکے کے والدین نے اس کے حق میں کچھ ہی تمنا کیوں نہ کی ہو اور نبی موعود کا نام اس لڑکے کے نبی ہونے کی طمع پر کیوں نہ رکھا ہو مگر نبی وہی ہوا جس کو درحقیقت خدا تعالیٰ نے نبی آخر الزمان کرنا منظور تھا۔ ہماری اس رائے کی تائید اس وقت اور بھی ہوتی ہے جب کہ ہم ان بڑے بڑے کاموں میں غور کرتے ہی ہیں جو آنحضرت سے ظہور میں آئے تھے اور وہ ایسے کام ہیں جو تمام جہان کی تاریخ میں اپنا نظیر نہیں رکھتے اور جب کہ ہم اس

---

[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام کی نسبت بھی ہم یہی حال پاتے ہیں۔ رینن صاحب کی لائف آف کرائیسٹ میں لکھا ہے کہ ''عیسیٰ جوان کا نام رکھا گیا تھا لفظ یوشع کا تبدیل کیا ہوا ہے یہ نہایت مروج نام تھا لیکن بعد کو اس نام میں اسرار اور امت کی نجات دہندہ کا اشارہ اپنی طرف سے اس میں لگا دیا گیا تھا۔''

روحانی سرور کو دیکھتے ہیں جو دین حق کا طفیل ہے جس کو آنحضرت ﷺ نے رائج کیا اور جو زمانہ کی گردشوں کے بعد بھی غیر مبدل اور بے نقص رہی ہیں اور ابد الاباد تک اسی ہی رہیں گی تو ہم کو کامل یقین ہوتا ہے کہ جس محمد اور احمد کی بشارت عہد عتیق اور عہد جدید میں دی گئی تھی وہ وہی تھے جو عبداللہ کے بیٹے اور آمنہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔

حضرت آمنہ کا اگر رویا میں فرشتوں کی صورتوں کو دیکھ کر ڈر جانا اور عرب جاہلیت کے دستور کے موافق لوہے کے ٹکڑوں کو گلے میں لٹکانا یا بازوؤں پر بطور عمل تعویذ کے باندھنا اگر صحیح تسلیم کیا جائے تو کسی طرح تعجب انگیز بات نہیں ہے بلکہ اس کے برخلاف اس امر کی تائید کرتا ہے کہ حضرت آمنہ نے درحقیقت اپنے رویا میں آسمانی فرشتوں کو دیکھا تھا ہاں اسپر نگر صاحب کی عقل اور ایمانداری پر نہایت تعجب ہے کہ وہ اس وقعہ سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت آمنہ کو ضعف دماغ اور صرع کی بیماری تھی اور حضرت سارا اور حضرت مریم نے جو فرشتوں کو دیکھا تھا اس کو صرع کی بیماری نہیں قرار دیتے۔

سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں کسی منشاء سے اور بھی چند تعجب انگیز باتیں بیان کی ہیں کہ حضرت آمنہ کو خواب میں اطلاع ہوئی تھی کہ اس لڑکے کو قبیلہ ابوذیب میں سے ایک عورت دودھ پلائے گی اور حلیمہ سعدیہ کو بڑا تعجب ہوا جب بلا دریافت اس کے شوہر کا نام اس کو بتلا دیا اور جب حلیمہ سعدیہ آنحضرت ﷺ کی لے آئی تو دفعتہً اس کا اور اس کی اونٹنی کا دودھ بہت زیادہ ہو گیا اور جب کہ حلیمہ سعدیہ آنحضرت ﷺ کو لے کر چلی تو اس کا سفید گدھا سب سے زیادہ تیز رفتار ہو گیا اور اس کے مویشی نہایت فربہ ہو گئے اور کثرت سے دودھ دینے لگے یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کی سند بجز حلیمہ کے بیان کے اور کوئی نہیں ہے اور اسی لئے یہ روایتیں مستند اور معتبر نہیں ہیں لیکن اتفاقات سے ایسے امور کا واقعہ ہونا کچھ ناممکن بھی نہیں ہے۔ مگر عیسائی عالم جو ایسی باتوں کو بطور دور از قیاس باتوں کے بیان کرتے ہیں تو بلاشبہ ہم کو تعجب آتا ہے کیونکہ جب وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ''لابان نے اس سے کہا کہ میں التجا کرتا ہوں کہ اگر تجھ کو میرا خیال ہے تو ٹھہر جا کیونکہ مجھ کو تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیری وجہ سے مجھ کو برکت دی ہے۔'' (کتاب پیدائش باب ۳۰ آیت ۲۸) اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ یعقوب نے کہا کہ ''میرے آنے سے پیشتر تیرے پاس بہت تھوڑا تھا اور اب وہ کثیر التعداد ہو گیا ہے اور جب سے کہ میں آیا ہوں اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برکت دی ہے۔'' (کتاب پیدائش باب ۳۰ آیت ۳۰) اور اسی طرح کتاب پیدائش کے باب ۳۰ آیت ۳۶ سے ۴۲ کے مضمون سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لابان کے مویشی کو حضرت یعقوب علیہ السلام کے مویشی سے کمزور پیدا کیا تھا تو کیا وجہ ہے کہ اگر حلیمہ کے مویشی میں بھی برکت دی ہو تو اس کو دور از قیاس اور تعجب انگیز طرز پر بیان کیا جائے۔

سر ولیم میور صاحب واقدی کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے شق الصدر اور دل کے دھونے کا واقعہ چار برس کی عمر میں واقع ہوا تھا اور ہشامی کے حوالہ سے اس بات کا استنباط کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو صرع کا عارضہ تھا۔ ہم نے اپنے خطبہ "حقیقة شق صدر وماهية المعراج" میں اس مضمون پر شرح وبسط سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ شق صدر آنحضرت ﷺ کی شب معراج کے خواب کا ایک جزو تھا نہ یہ کہ درحقیقت وہ جسمانی طور پر واقع ہوا تھا' مگر راویوں نے ان اسباب سے جو اکثر روایات کے بیان کرنے میں واقع ہوتے ہیں مختلف طور پر بیان کیا ہے اور اس کے وقوع کے زمانہ میں بھی انہی اسباب سے اختلاف ہو گیا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ عہد طفولیت میں واقع ہوا تھا۔ بعض کا بیان ہے کہ اس کا وقوع ایام شباب میں ہوا تھا اور بعض کے نزدیک شب معراج میں وقوع میں آیا تھا۔ ہم کو اس واقع کی حقیقت کا دوبارہ اس مقام پر بیان کرنا ضروری نہیں ہے

بلکہ اس مقام پر ہم کو یہ بیان کرنا منظور ہے کہ ہمارے ذی علم اور لائق مصنف سر ولیم میور صاحب نے جو ہشامی کی روایت سے (اگر وہ بالکل صحیح بھی مان لیا جائے) یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو صرع کا عارضہ ہو گیا تھا وہ کیسا غلط اور بے اصل ہے۔

سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ ہشامی اور دیگر متاخرین بیان کرتے ہیں کہ حلیمہ کے شوہر کو گمان ہوا کہ اس لڑکے کو "عارضہ ہو گیا ہے" جس لفظ کا ہم نے عارضہ ترجمہ کیا ہے وہ انگریزی لفظ "فٹ" ہے جو سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے "فٹ" کے معنی اخت میں کسی مرض کے ایسے سخت اور یکبارگی حملہ کے ہیں جس سے بدن کپکپانے لگے اور بعض اوقات غشی طاری ہو جائے جس سے غالباً صاحب ممدوح نے صرع مراد لی ہے مگر ہشامی میں جو لفظ واقع ہے اس کا "فٹ" ترجمہ کرنا بالکل غلط ہے۔ سر ولیم میور صاحب کو اس لفظ کے صحیح پڑھنے میں بالکل غلطی ہوئی ہے جیسا کہ ہم آگے ثابت کریں گے۔

ہمارے پاس سیرت ہشامی موجود ہے جو ۱۸۵۸ء میں بمقام گاٹجن زیر اہتمام و نگرانی ڈاکٹر فرڈی نینڈ وسٹن فیلڈ کے چھپی ہے اس کتاب سے ہم وہ عبارت جو اس بحث سے متعلق ہے بلفظہ نقل کرتے ہیں۔

"قالت وقال لی ابوہ یا حلیمۃ لقد خشیت ان یکون ھذ الغلام قد اصیب فالحقیہ باھلہ"

یعنی حلیمہ نے کہا اس کے باپ (یعنی زمانہ میں بھی انہی کے دودھ باپ یعنی شوہر حلیمہ) نے کہا اے حلیمہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا ہے اس لئے اس کو اس کے گھر والوں کے پاس پہنچا دے۔

مگر جب حلیمہ آنحضرت ﷺ کو حضرت آمنہ کے پاس لے کر آئیں تو حضرت آمنہ نے ان کو نہیں لیا اور حلیمہ سے کہا کہ اس کو واپس لے جاؤ۔ اس وقت حضرت آمنہ نے حلیمہ سے کہا کہ کیا تجھ کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ اس پر شیطان مسلط ہو گیا ہے۔ یہ کلام بطور استفہام انکاری کے تھا اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلیمہ کے شوہر کو جو یہ گمان ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو کچھ ہو گیا ہے وہ صحیح نہیں تھا۔

سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب لائف آف محمدؐ کے صفحہ ۲۱ کے حاشیہ پر بجائے لفظ اصیب کے امیب لکھا ہے یعنی صاد کی جگہ میم لکھا ہے اور اس کے معنی "فٹ" یعنی عارضہ ہونے کے لکھے ہیں۔ مگر یہ لفظ تاریخ ہشامی میں ہم کو نہیں ملتا ہے اور نہ اس کے معنی عارضہ ہونے کے پائے جاتے ہیں۔ ہشامی میں اصیب کا لفظ ہے اور یہ صحیح معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آگے ثابت ہوگا اور چونکہ ان دونوں لفظوں کی شکل میں بہت ہی کم فرق ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے کسی غلط قلمی نسخہ سے اس کو نقل کیا ہو گا۔

تمام عیسائی مصنف سوائے ایک دو کے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی سوانح عمری لکھی ہے اس بات کو بطور ایک امر واقعی کے بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو عارضہ صرع لاحق ہوا تھا۔ اولاً ہم متحیر تھے کہ یہ خیال گردشیں کے کبوتر کے قصہ کی طرح عیسائیوں کے دماغوں میں کیونکر سمایا؟ کسی تاریخ سے نہیں پایا جاتا کہ کوئی ڈاکٹر آنحضرت ﷺ کی جسمانی حالت کا امتحان کرنے کو عرب میں گیا ہو اور نہ ایشیائی مصنفوں نے اس امر کی نسبت کچھ تذکرہ کیا ہے پھر اس خیال کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور کس نے اس کو پھیلایا۔ آخر کار بہت ہی تلاش کے بعد ہم کو تحقق ہوا کہ یہ خیال خام عیسائیوں میں دو وجہ سے پیدا ہوا۔ اول عیسائیوں کے توہمات مذہبی کے سبب اور دوسرا عربی عبارت کے زبان لیٹن میں غلط ترجمہ ہونے سے۔

کتاب لائف آف محمدؐ مصنفہ پریڈو مطبوعہ لندن ۱۷۱۲ء صفحہ ۲۰ سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خیال کی ابتدا وہاں سے ہوئی ہے اور تاریخ ابوالفدا کے بعض مقامات کے غلط ترجمہ سے بھی جو ڈاکٹر پوکاک نے لیٹن زبان میں کیا ہے اس کی بناء معلوم ہوتی ہے

یہ ترجمہ مع اصل عبارت عربی کے پوکاک کے مسودہ سے ۱۷۲۳ء میں بمقام آکسفورڈ چھپا تھا اول ہم اس چھاپہ سے اس عبارت کو نقل کرتے ہیں اور پھر اس کی عبارت اور نیز اس کے ترجمہ کی متعدد غلطیاں بتاتے ہیں۔

اس چھاپہ میں عبارت مذکورہ اس طرح پر لکھی ہے:

"فقال زوج حليمة لها قد خشيت ان هذا الغلام قد اصيب بالحقية باهله فاحتملته حليمة وقدمت به الى امه"

اس عبارت کا جو لیٹن میں ترجمہ کیا ہے اس کا ترجمہ اردو میں اس طرح پر ہوتا ہے "تب حلیمہ کے شوہر نے کہا کہ مجھ کو بہت خوف ہے کہ اس لڑکے نے کسی اپنے ساتھی سے دماغی بیماری کو اخذ کر لیا ہے۔ اس لئے اس کو حلیمہ سے لے کر اس کی ماں آمنہ کے پاس لے گیا۔ اس مترجم نے دماغی بیماری سے غالباً صرع کا عارضہ یا بے ہوش کرنے والی بیماری مراد لی ہے۔

اول تو ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کتاب سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ سر ولیم میور صاحب نے جس لفظ کو امیب پڑھا ہے وہ اصیب ہے اور پھر ہم بتاتے ہیں کہ کتاب مذکورہ بالا کے مصنف نے جس لفظ کو **بالحقية** پڑھا ہے وہ بھی غلط پڑھا ہے وہ لفظ **فالحقيه** اور ترجمہ میں یہ غلطی کی کہ جب مترجم نے دیکھا کہ لفظ **بالحقية** کے معنی عبارت کے مناسب نہیں ہو سکتے تو اس کا ترجمہ بالکل چھوڑ دیا اور جب لفظ اصیب پر پہنچا تو اس کا ترجمہ اخذ گیا اور جب کہ عبارت میں نہ کسی شے ماخوذ کا ذکر تھا اور نہ اس کا ذکر تھا جس سے اخذ کی اور بلحاظ قواعد نحوی اور ربط عبارت کے ان دونوں کا ہونا ضرور تھا اس لئے مترجم نے انکل پچو لفظ **باهله** سے الفاظ "کسی اپنے ساتھی سے" اور الفاظ "دماغی بیماری" کو یا "بیہوش کرنے والی بیماری" کو بڑھا دیا حالانکہ وہ اصل عبارت میں نہیں ہیں۔

اگر عبارت مذکورہ کو صحیح طور پر پڑھا جائے تو صحیح ترجمہ اس کا یوں ہوتا ہے "تب حلیمہ کے شوہر نے اس سے کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ یہ لڑکا مبتلا ہو گیا ہے پس اس کو اس کے لوگوں کے پاس پہنچا دو پس اٹھا لیا اس کو حلیمہ نے اور لے آئی اس کو اسکی ماں کے پاس"

اہل عرب ایسے مبہم کلمات کو ایسی بیماریوں کی نسبت استعمال کیا کرتے تھے جن کا سبب ان کو معلوم نہیں ہوتا تھا اور غالباً ان کا خیال تھا کہ کسی مخفی قوئی یا ارواح کا اثر ہے اور جن بیماریوں کا سبب ان کو نہ معلوم ہوتا تھا ان کو شیطان کے اثر کی طرف بھی منسوب کرتے تھے۔

قدیم اہل یونان اپنے توہمات مذہبی سے صرع کی بیماری جو ایک عجیب و غریب قسم کی بیماری ہے یقین کرتے تھے کہ دیوتاؤں یا خبیث ارواح کے اثر سے ہوتی ہے۔ اسی بناء پر عیسائی مصنفوں نے لفظ اصیب سے بالتخصیص صرع کی بیماری سمجھ لی۔ حالانکہ ایسا سمجھنا عرب کے محاورہ کے برخلاف ہے کیونکہ عرب صرف صرع ہی کی بیماری کو لامعلوم اثر کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے بلکہ ہر ایک چیز کو جس کا سبب ان کو معلوم نہ ہوتا تھا مخفی قوی یا شیطان یا جن کے اثر کی طرف منسوب کرتے تھے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ لفظ اصیب سے صرع کا عارضہ مراد لیا جائے۔

اس بیان کی تائید ہم ایک نہایت ذی علم اور ذی فہم غیر متعصب مصنف کی رائے کو نقل کرتے ہیں جو کہتا ہے کہ یہ متواتر بیان کہ آنحضرت ﷺ کو عارضہ صرع لاحق تھا یونانیوں کی ایک ذلیل اختراع ہے جنہوں نے اس عارضہ کے لحوق کو ایک نئے مذہب کے بانی کی طرف اس غرض سے منسوب کیا ہوگا کہ ان کے اخلاقی چال چلن پر ایک دھبہ ہو جو عیسائیوں کی طعنہ زنی تنفر کا مستوجب ہو۔

نہایت مشہور اور لائق مؤرخ یعنی گبن نے آنحضرت ﷺ کے ان صرعی حملوں کی نسبت یہ لکھا ہے کہ "یونانیوں کا ایک

نامعقول اتہام ہے۔" اور ایک اور مقام پر اسی مورخ نے لکھا ہے کہ "آنحضرت ﷺ کے عارضہ صرع یا بیہوش کر دینے والی بیماری کو تھیوفنیز زوناس اور یونانیوں نے بیان کیا ہے اور ہالنجر اور پریڈو اور مراکشی نے اپنے سخت تعصب کے سبب اس کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر نگل لیا ہے۔ قرآن میں جو دو سورتیں ہیں جن میں سے ایک کا نام مزمل ہے اور ایک کا نام مدثر ہے ان میں سے صرع کی بیماری کی تاویل کرنی مشکل ہے۔ مسلمان مفسرین کا سکوت اور صرع کی بیماری سے ناواقفیت ان کے قطعی انکار کی نسبت زیادہ تر قاطع اور مرجح ہے اور آزادانہ رستہ آکلی گیگنیز اور سیل نے اختیار کیا ہے۔

اب ہم اس غلط اور بے اصل اتہام پر کہ آنحضرت ﷺ کو عارضہ صرع لاحق تھا بلحاظ طب کے غور کرتے ہیں۔ چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ "صرع اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں دفعتہً بیہوشی طاری ہو اور اعصاب تنفس کے تشنج اور سانس لینے کے منفذ کے بند ہونے سے اعصاب اختیاری بے اختیار شدت سے پھڑکنے لگیں اور کبھی کبھی سانس بالکل بند ہو جائے۔ اس بیماری کا مریض اکثر پاگل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس کا حافظہ جاتا رہتا ہے اور اس میں تیزی چستی نہیں رہتی اور ایسی مردہ دلی اس پر چھا جاتی ہے جو اس کو دنیا کے بے قاعدہ کاروبار سے معذور کر دیتی ہے۔ بدہضمی بھی اکثر ہوتی ہے اور تمام قوائے جسمانی میں ضعف اور ناطاقتی گھر کر جاتی ہے جس کی وجہ سے مصروع کے چہرہ سے دائمی نقاہت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ بات کچھ بعید نہیں ہے کہ اسی کے ساتھ مصروع کے ذہن میں اپنے ضعیف و نقاہت کا یقین بخوبی جم جاتا ہے اور مشقت طلب اشغال سے نفرت ہو جاتی ہے بالخصوص ایسے اشغال سے جن میں اس پر عام اندازہ سے زیادہ نظریں پڑیں۔

اب ہمارا کام یہ ہے کہ اس امر کی تنقیح کریں کہ آیا یہ سب آثار یا ان میں کوئی آنحضرت ﷺ کی عمر کے کسی حصہ طفولیت سے لے کر وفات تک پائے گئے تھے یا نہیں۔

کوئی مورخ مسلمان یا عیسائی یہ نہیں بیان کرتا کہ منجملہ آثار مذکورہ بالا کے ایک بھی آنحضرت ﷺ میں پایا گیا تھا بلکہ برخلاف اس کے سب کے سب متفق اللفظ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اپنے بچپن اور جوانی میں نہایت تندرست اور قوی تھے۔ خود سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ "دو برس کے سن میں حلیمہ نے ان کا دودھ چھڑوایا اور ان کے گھر لے گئیں اور آمنہ اپنے لڑکے کی تندرست اور قوی ہیئت کو دیکھ کر جو آپ سے دو چند عمر والے لڑکے کے برابر معلوم ہوتا تھا اس قدر خوش ہوئیں کہ حلیمہ سے کہا کہ اس کو پھر صحرا کو لے جا" لڑکپن اور جوانی کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ مضبوط اور تندرست اور قوی الجثہ تھے۔ وہ بہت تیز چلا کرتے تھے اور زمین پر مضبوطی سے قدم رکھتے تھے۔ تمام عمر پھر ان کو بڑے بڑے خطرے اور تکلیفیں پیش آئیں اور ان سب کو انہوں نے کمال صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ انہوں نے خدائے واحد کی پرستش و عبادت کی تجدید ایسے طور پر کی جس کی کوئی نظیر و مثال نہیں پائی جاتی اور علم الٰہیات کو ایسے پختہ و معقول اصول پر قائم کیا جن کا ہمسر جہان سے معدوم ہے۔ انہوں نے قوانین تمدن و اخلاق کو ایسے کمال پر پہنچا دیا جو اس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا۔ انہی کی وساطت سے انسانوں کی بہبودی اور رفاہ کے واسطے وہ ملکی و مالی و دینی و دنیوی قوانین کا مجموعہ حاصل ہوا جو اپنے نوع میں یکتا و بے نظیر ہے۔ آنحضرت ﷺ ہی وہ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں تمام جزیرہ عرب کو فتح کیا اور مختلف قبیلوں کو مجتمع کر کے ایک مضبوط اور طاقتور عظیم الشان قوم بنا دیا جس نے اس زمانہ کی مہذب دنیا کے ایک جزو اعظم کو ایک عرصہ قلیل میں مفتوح و مسخر کر لیا۔ کیا اس بات کا خیال کرنا قرین عقل و انصاف ہے کہ ایسے کارہائے نمایاں ایک لاچار اور ناتواں مصروع شخص سے عمل میں آئے ہوں گے؟ ایسے کارہائے نمایاں کا عمل میں آنا بجز اس شخص کے جس

کے قوائے روحانی وجسمانی کامل صحیح وسالم ہوں اور کسی شخص سے غیر ممکن معلوم ہوتا ہے اور اس کی ماہیت تائید ربانی پر دلالت کرتی ہے۔

سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ "حلیمہ پھر ایک بادل کو آنحضرت ﷺ کے سر پر سایہ افگن دیکھ کر متوحش ہوئی اور انجام کار ان کو ان کی ماں کے پاس پہنچانے کے لئے روانہ ہوئی۔" اس فقرہ پر صاحب موصوف یہ رائے دیتے ہیں کہ اگر اس روایت میں کچھ صدق ہو تو غالباً عارضہ سابق کے یعنی صرع کے آثار کے عود سے مراد ہو گی تعجب ہے کہ بادل کو سایہ کرتے ہوئے تو دیکھا حلیمہ نے اور سر ولیم میور صاحب نے اس سے آنحضرت ﷺ کے عارضہ صرع کے آثار کا موعود خیال کیا۔ اگر حلیمہ کی نسبت آثار صرع کا خیال فرماتے تو شاید زیادہ مناسب ہوتا۔ پھر دوسرے مقام پر صاحب موصوف بیان فرماتے ہیں کہ ان کے دوروں سے جن کو حلیمہ صرع کی قسم کے حملے سمجھ کر ڈر گئی تھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں ان مضطر حالتوں اور بیہوش کنندہ غشوں کے صریح آثار نمودار تھے جو نزول وحی کے ہوتے تھے اور شاید جن کے سبب ان کے دل میں نزول کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور ان کے متبعین نے ان اضطرابوں اور غشوں کو نزول وحی کا شاہد قرار دیا تھا۔

سر ولیم میور صاحب نے اپنی تمام کتاب میں ایسی روایتوں کو اپنی کتاب کی بنیاد ٹھہرایا ہے جن کی صحت خود اہل اسلام کے نزدیک مشتبہ اور غیر ثابت ہے۔ یہ روایت کہ آنحضرت ﷺ پر بادل کا سایہ رہتا تھا محض باطل ہے۔ اگر ایسا امر فی الحقیقت واقع ہوا کرتا تو آنحضرت ﷺ کے اکثر صحابہ ورفقا اس کا تذکرہ کرتے اور احادیث مستند میں اس کا ذکر ہوتا۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ تمام معتبر حدیثوں میں اس کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ بلکہ برخلاف اس کے بعض حدیثوں میں جو نماز کے بارے میں ہیں آنحضرت ﷺ کے جسم اطہر پر مثل دیگر اشخاص کے دھوپ کا پڑنا ثابت ہوتا ہے۔ غلط روایت کی اشاعت کے بیشمار اسباب میں سے ایک یہ سبب بھی ہے کہ شے مرویہ کا اتفاقی وقوع ہونا۔ لہٰذا یہ امر از قبیل ممکنات ہے کہ کسی شخص نے آنحضرت ﷺ کو اتفاقیہ ایک بادل کے ٹکڑے کے سایہ میں دیکھا ہو اور یہ ماجرا دوسرے شخص سے بیان کیا ہو اور دوسرے نے تیسرے سے اور اس طرح رفتہ رفتہ عام شہرت ہو گئی ہو اور آخر الامر عام اعتقاد ہو گیا ہو کہ بادل آنحضرت ﷺ کے سر پر ہمیشہ سایہ ڈالے رہتا تھا۔ اس قسم کی روایتیں جن کی صحت کی کوئی سند نہیں ہے محققین علمائے اسلام نے کبھی تسلیم نہیں کی ہیں۔

نزول وحی کے وقت اضطرار اور غشی کی روایتیں ویسی ہی نامعتبر اور بے سند ہیں۔ ان روایتوں میں خود راویوں کے خیالات اور توہمات ہیں۔ ہم نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ عیسائیوں کا اتہام آنحضرت ﷺ کو بیماری صرع کے ہونے کا صدق سے محض معرا ہے تاہم سر ولیم میور صاحب کی اس رائے کو کہ آنحضرت ﷺ کے صرعی غشوں نے ان کے ذہن میں اپنی رسالت کا خیال پیدا کر دیا تھا اور ان کے متبعین کا بھی یہی اعتقاد تھا تمام منصف مزاج اور غیر متعصب لوگوں کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ سوال کرتے ہیں کہ آیا یہ بات قرین قیاس ہے کہ ایسا آدمی جس کو ہر شخص مصروع جانتا ہو اپنے صرعی غشوں کو اپنے رسول برحق ہونے کے ثبوت میں پیش کرے جو اپنی قوم کی بت پرستی کے استیصال کے واسطے بھیجا گیا ہو اور تمام لوگ جو اس کی اس بیماری سے واقف ہوں اس کے عزیز واقارب اور جمیع اکابر عرب اس کی رسالت کو دل سے تسلیم کر لیں اور ہر شخص اپنے دین آبائی سے منحرف ہو کر اس کے قول وفعل پر ایمان کامل لے آئے۔

جن نامعتبر روایتوں پر عیسائیوں نے اتہام عارضہ صرع آنحضرت ﷺ کی نسبت قائم کیا ہے وہ روایتیں زیادہ ترشق صدر کی

روایتوں سے علاقہ رکھتی ہیں۔ہم نے حقیقت شق صدر کو اپنے ایک خطبہ میں بیان کیا ہے اور جو غلطیاں واقعات کے بیان کرنے میں راویوں کو واقع ہوئی ہیں ان سب کو دکھایا ہے۔پس ان کے جاننے کے بعد عیسائیوں کا یہ اتہام سر کے بل گر پڑتا ہے۔

سر ولیم میور صاحب نے اپنی کتاب آنحضرت ﷺ کا اپنی والدہ کی قبر پر تشریف لے جانے کا حال لکھ کر اپنی والدہ کے لئے بخشش کی دعا مانگنے کا ذکر کیا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ "یہ بات یعنی ان لوگوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت کرنا جو حالت کفر میں مرے ہوں پیغمبر صاحب کے احکامات کی سختی اور شدت کی ان لوگوں کے حق میں جو دین سے جہالت کی حالت میں مرے ہوں ایک عجیب مثال ہے۔" ہم اس روایت کی صحت اور غیر صحت کی بحث کو چھوڑ کر یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ان لوگوں کے حق میں دعائے مغفرت نہ کرنے میں جو خدائے واحد پر ایمان نہ رکھتے ہوں اور انبیائے سابقین کے دین کو بھی نہ مانتے ہوں بلکہ محض بے ایمانی کی حالت میں مر گئے ہوں کسی طرح کی سختی اور شدت نہیں ہے بلکہ زندہ آدمیوں کو بت پرستی کے چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار کی ترغیب دینے کے لئے ایک نہایت کارآمد اور عمدہ ذریعہ ہے۔پس جو شخص کہ ایسا کرے اس پر سختی کا الزام نہیں ہوسکتا۔مگر ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اگر مذکورہ بالا امر کے سبب آنحضرت ﷺ کے احکامات پر سختی اور شدت کا الزام لگایا گیا ہے تو رحیم عیسائی مذہب میں ان لوگوں کے واسطے جو اللہ تعالیٰ کو مانتے ہوں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے سے انکار کرتے ہوں کونسا نرم فیاضانہ اور ترحم آمیز سلوک کیا گیا ہے۔مگر افسوس ہے کہ ہماری یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ہمارے خلاف توقع رحیم مذہب عیسائی میں غیر معتقدین کے لئے اس سے بھی زیادہ سخت احکام معلوم ہوئے۔اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ ایتھینیسین خطبہ کو جو انگلستان کے تمام پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں بروز ہائے معین پڑھا جاتا ہے اور تمام اہل کلیسا کی منظوری سے منظور ہوا ہے ان سب عقائد کے بیان کرنے کے بعد جن کا ماننا ہر شخص پر خواہ نخواہ فرض ہے بالتصریح یہ لکھا گیا ہے کہ "یہ عیسوی عقیدہ ہے،جس پر بدوں اعتقاد رکھنے کے کوئی آدمی نجات نہیں پاسکتا۔" پس جب کہ رحیم مذہب عیسوی کے بموجب ایسا شخص نجات کا مستحق نہیں ہے اور اس لئے کسی کی دعائے مغفرت بھی اس کے حق میں مفید نہیں ہے تو عیسوی مذہب کو اس باب میں مذہب اسلام پر کیا فوقیت ہے۔

سر ولیم میور صاحب اپنی کتاب میں کسی منشاء سے اس روایت کو بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ کھانے پر موجود نہ ہوتے تھے تو تمام خاندان اپنے کفایت شعار کھانے سے بھوکا اٹھتا تھا۔لیکن جب آنحضرت ﷺ بھی کھانے میں شریک ہوتے تھے تو سب کا پیٹ بھر جاتا تھا اور یہ فرماتے ہیں کہ اس سے عروج پذیر نبی کی بڑائی مظنون ہوتی تھی مگر اہل اسلام تو ایسی روایتوں کو معتبر نہیں سمجھتے اور نہ ان کے معتبر ہونے کی کوئی کافی سند موجود رکھتے ہیں لیکن ہم کو تعجب آتا ہے جب عیسائی ایسی روایتوں کو کسی اشارہ آمیز ارادہ سے نقل کرتے ہیں کیونکہ ان کو ایسے واقعہ کے امکان پر اعتقاد نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے جبکہ وہ متی کے باب ۱۴ آیت ۱۹۔۲۰ کے اس بیان پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ "اس نے (یعنی حضرت مسیح نے) جماعت کو (جن کی تعداد پانچ ہزار تھی) گھاس پر بیٹھنے کا حکم دیا اور پانچوں روٹیاں اور دونوں مچھلیاں نکالیں اور آسمان کی جانب نظر اٹھا کر دعا کی اور ان کو توڑا اور روٹیاں اپنے حواریوں کو دیں اور حواریوں نے جماعت کو تقسیم کیں اور ان سب نے پیٹ بھر کر کھائیں اور بچے ہوئے ٹکڑوں کو جن سے بارہ ٹوکرے بھر گئے اٹھالیا۔

اس کے بعد سر ولیم میور صاحب ایک اور روایت لکھتے ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ ملک شام کو گئے تو بحیرہ راہب نے آنحضرت ﷺ کو تمام جماعت میں سے اس نشان سے پہچان لیا تھا کہ ان کے سر پر ایک بادل سایہ ڈالے ہوئے چلتا تھا اور

درختوں کی شاخیں ان کی دھوپ روکنے کے واسطے جھک جاتی تھیں اور بحیرہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے اور بتلاش مہر نبوت ان کے جسم کا معائنہ کیا۔

جس اشارہ سے کہ سر ولیم میور صاحب نے اس روایت کو لکھا ہے اس کی نسبت ہم بیان کرتے ہیں کہ اگر یہ یقین کیا جائے کہ آنحضرت ﷺ فی الواقع اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ ملک شام کو بغرض تجارت گئے تھے تو یہ بات ہرگز قابل تعجب کے نہیں ہے کہ بحیرہ نے ایسا خیال کیا ہو کیونکہ اس وقت یہود اور نصاریٰ ایک مسیحا اور ایک فارقلیط کے منتظر تھے۔ مگر افسوس ہے کہ محققین علمائے اسلام اس روایت کو معتبر روایتوں میں نہیں سمجھتے۔ وہ روایت جس میں بحیرہ کا حال اور آنحضرت ﷺ کا ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر میں جانے کا ذکر ہے اس میں یہ بیان بھی ہے کہ ابو طالب نے آنحضرت ﷺ کو بمعیت نگرانی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت بلالؓ کے ساتھ شام سے واپس بھیج دیا تھا۔ بخاری اور مسلم میں جو سب سے زیادہ معتبر حدیث کی کتب ہیں یہ روایت مذکور نہیں ہے۔ مگر ترمذی اور دیگر کم محتاط محدثوں نے بشوق تمام اس روایت کو اپنی کتابوں میں لکھا ہے۔ منجملہ ان بہت سی وجوہات کے جن سے ان روایتوں کی نامعتبری کا کافی ثبوت ملتا ہے ہماری رائے میں ڈاکٹر اسپرنگر صاحب کے قول کا جس کو خود سر ولیم میور صاحب نے بیان کیا ہے اور جس سے اس روایت کی نامعتبری بخوبی ثابت ہوتی ہے اس جگہ بجنسہ نقل کرنا کافی ہوگا اور وہ یہ ہے کہ ترمذی کی یہ روایت کہ ابو طالب نے محمد ﷺ کو حضرت ابو بکر اور حضرت بلالؓ کے ہمراہ شام سے واپس بھیجا تھا' اس لئے لغو اور مہمل معلوم ہوتی ہے کہ ابو بکر آنحضرت ﷺ سے دو سال چھوٹے تھے اور بلال اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

آنحضرت ﷺ کے سفر شام کا حال ابو طالب کے ہمراہ بیان کرنے کے بعد جب کہ آنحضرت ﷺ کی عمر بارہ برس کی تھی اور جس کی نسبت ہم نے ابھی بیان کیا کہ وہ صحیح نہیں ہے۔ سر ولیم میور صاحب فرماتے ہیں کہ ''زمانہ سابق کے منہدم اور اجڑے ہوئے مقاموں نے جن کو خیالی قصوں اور عجیب وغریب بیانوں اور دل انگیز روایتوں نے اور بھی پر اثر کر دیا تھا اور گرجاؤں کو صلیبوں اور مورتوں اور دینی علامتوں سے آراستہ کرنے اور گھنٹوں کے بجنے کی قوی رسموں نے آنحضرت ﷺ کے خوض کنندہ دل و دماغ پر ایک گہرا نقش اور پائیدار اثر کر دیا تھا۔

ہم نہایت ادب سے سر ولیم میور صاحب سے پوچھتے ہیں کہ کیا ایک مصروع شخص کا دل و دماغ ایسا اثر قبول کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک مصروع شخص خوض کنندہ دل و دماغ رکھتا ہے؟ اگرچہ یہ بیان سر ولیم میور صاحب کا نہایت دلچسپ ہے مگر افسوس ہے کہ ہم اس بیان سے اتفاق نہیں کر سکتے کیونکہ اسی لڑکے نے جس کا دماغ صلیبوں اور مورتوں اور علامات دین عیسوی کی دیکھ کر اس قدر اثر پذیر ہوا تھا بعد کو انہی چیزوں سے مخالفت اختیار کی صلیب کو توڑا مورتوں کو پھوڑا ان کی پرستش سے منع کیا اور یہ بتایا کہ خدا کا کوئی بیٹا نہیں ہے' تثلیث کے عقیدہ کو جھٹلایا خدا کو وحدہ لاشریک بتلایا اور اسی کی عبادت کا وعظ کیا اور تمام دنیا میں اسی کو رواج کر دیا۔

لیکن اس بات کو تسلیم کر کے کہ مذکورہ بالا چیزوں نے اس لڑکے کے دل پر درحقیقت اثر پیدا کیا تھا ایک اور خیال خود بخود دل میں آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسا لڑکا جس کے ابتدائی چار برس ایک صحرا میں کٹے تھے اور پھر آٹھ برس تک مشرک اور بت پرست لوگوں میں گھرا رہا صرف بارہ برس کی عمر میں ایک ایسا دل رکھتا تھا کہ ہر چیز سے جو اس کی نظر سے گزرتی تھی پرانی منہدم عمارتوں کے آثار سے گرجاؤں اور صلیبوں اور مورتوں اور علامات دین عیسوی کے دیکھنے سے ایک گہرا اثر قبول کرنے کے قابل تھا اور اس قدر عقل وفہم وذکاء سے آراستہ تھا کہ ان چیزوں سے ان کے برخلاف ایسے کامل نتائج اور معبود غیر ظاہر اور بقائے روح انسانی کے بارے میں

ایسے ایسے عالی خیالات مستنبط کر سکا وہ لڑکا بلاشبہ مادرزاد پیغمبر برحق تھا جس کی فطرت خود اس کی معلم تھی اور وہ وہی تھا جس کی نسبت خود حضرت عیسیٰ نے یہ کہہ کر بشارت دی تھی کہ ''سچ تو یہ ہے کہ میرا چلا جانا تمہارے لئے ضروری ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط یعنی احمد مصطفیٰ تمہارے پاس نہیں آئے گا اور اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔''

خاتمہ

الحمدللہ کہ کتاب خطبات اردو زبان میں مرتب ہو کر چھپ گئی انگریزی پڑھنے والے جب اس اردو کتاب کو انگریزی کتاب سے جو ۱۸۷۰ء میں چھپی ہے مقابلہ کر کے پڑھیں تو علاوہ اس اختلاف کے جو انگریزی زبان کی طرز تحریر اور اردو زبان کی طرز تحریر میں ہے اس اردو زبان کی کتاب کے ہر ایک مضمون کو زیادہ تر وسیع پائیں گے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ انگریزی کتاب درحقیقت بطور خلاصہ ان مضامین جن کی یادداشت اول اردو زبان میں لکھی گئی تھی بنظر تسہیل ترجمہ انگریزی مرتب کی گئی تھی اور اس اردو کتاب کو ہم نے اپنی اردو یادداشتوں سے مرتب کیا ہے اور مضامین کو اسی وسعت سے لکھا ہے جس وسعت سے کہ یادداشتوں میں تھی۔

والسلام علی من اتبع الھدی

☆☆☆